تشنہ لب

بلقیس کنول

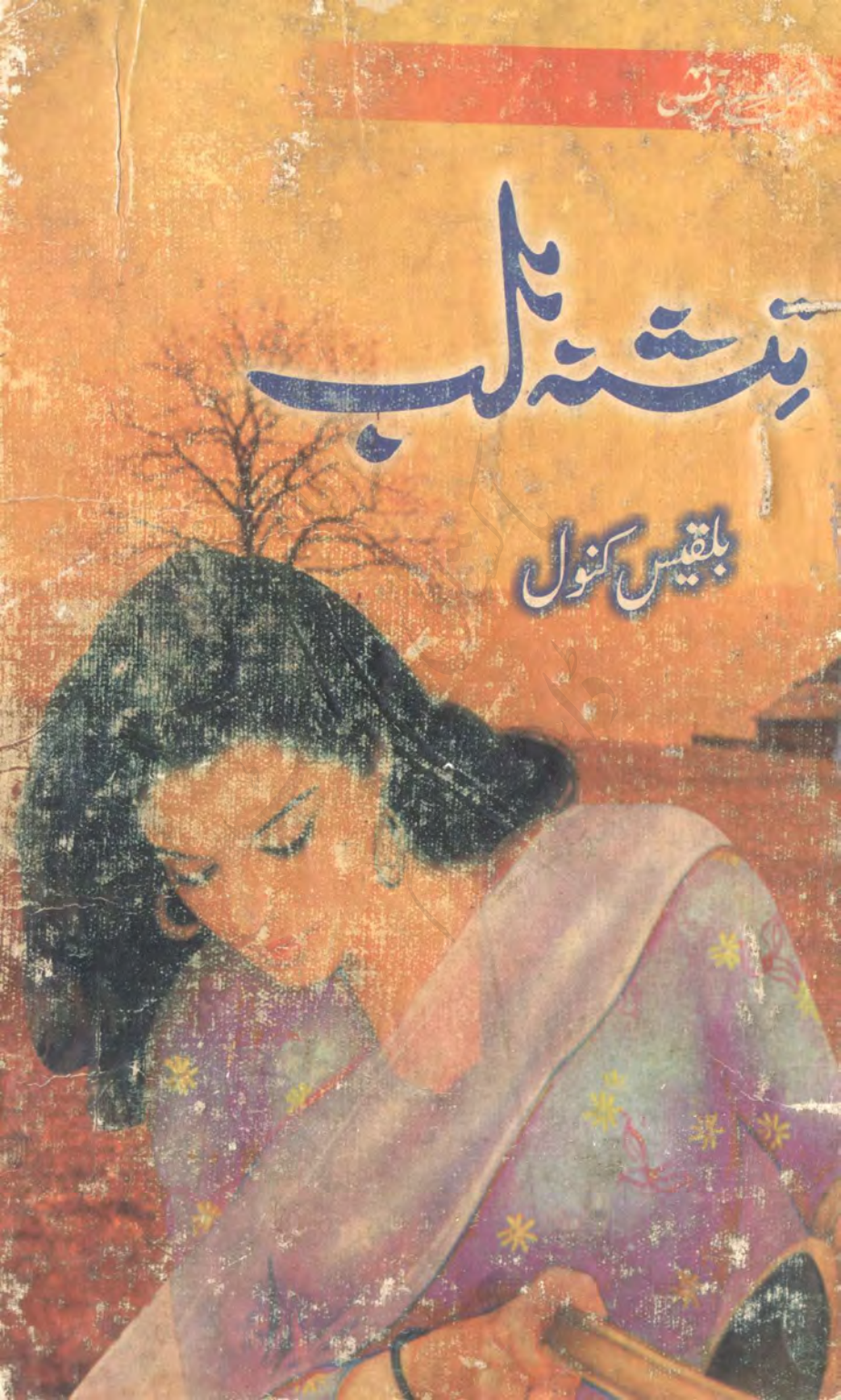

پیش لفظ

کیا کیوں ___؟

''تشنہ لب'' کے سلسلے مین جناب مبین خٹک صاحب کا اصرار ہے کہ میں کچھ لکھوں۔

اس سے پیشتر میرے پانچ مجلّہ ناول۔ ''عامری''..... ''مہندی رچے ہاتھ''..... ''شارقہ''..... ''گرداب'' اور ''سیپ'' شائع ہو چکے ہیں۔ میں نے صرف سیپ کے بارے میں کچھ کہنے کی گستاخی کی تھی۔ آپ خود غور کریں' کیا یہ عجیب سا نہیں لگتا کہ تخلیق کار خود اپنی تخلیق کے بارے میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے بیٹھ جائے۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننے اور زبردستی اپنی رائے دوسروں کے سر پر مسلط کرنے کی کوشش کرے۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی----!!

آپ میرے ناول اور افسانے اگر پڑھتے رہے ہیں تو آپ کو یقیناً میری طرز تحریر اور انداز بیان کی خوبیوں اور خامیوں کا اندازہ بخوبی ہوگا۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ آپ ''تشنہ لب'' پڑھیں اور مجھے اپنی قیمتی آراء سے مطلع کریں تاکہ میں اپ کی تنقید اور تبصروں کی روشنی میں اپنی اصلاح کر سکوں۔

''تشنہ لب'' کے بارے میں صرف یہ عرض کروں گی کہ یہ ماہنامہ ''پاکیزہ'' میں قسط وار شائع ہوتا رہا ہے۔ قسط وار شائع ہونے والے ناولوں کا کینوس عام ناولوں سے قدرے مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے کہ لکھنے والے کو ہر ماہ پڑھنے والوں کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کی خاطر قدم قدم بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔ ایک ذرا کہیں جھول آ جائے تو تنقیدی خطوط کی بوچھاڑ شروع ہو جاتی ہے۔ پھر نوک پلک کو نئے سرے سے بنانا سنوارنا پڑتا ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ قارئین کو پیوند کاری کا احساس نہ ہو۔ چنانچہ میرا ذاتی خیال ہے کہ قسط وار شائع ہوئے ناول کہانی اور واقعات کے اعتبار سے زیادہ مربوط اور گندھے ہوتے ہیں___ آپ کا کیا خیال ہے۔؟

''تشنہ لب''، تسلسل کے اعتبار سے ''سیپ'' سے بہت پہلے لکھا گیا تھا' لیکن کتابی صورت میں بعد میں شائع کیا جا رہا ہے---اس کی پسند اور ناپسند کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔ مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے۔ کہ میں نے اپنی ہر تحریر کی طرح اس کو بھی پوری دیانت' محنت اور توجہ سے لکھا تھا چنانچہ مجھے اعتماد ہے۔ کہ آپ میری حوصلہ افزائی میں کسی بخل سے کام نہیں لیں گے۔ یہ اعتماد بھی مجھے آپ نے عطا کیا ہے۔

مجھے آپ کے بے لاگ تبصروں اور تعمیری تنقید کا بڑی شدت سے انتظار رہے گا۔ کیا میں امید رکھوں کہ آپ مجھے ''تشنہ لب'' کے بارے میں اپنی قیمتی رائے سے (معرفت ناشر) آگاہ کرنے کی زحمت گوارا کریں گے؟

بلقیس کنول

اس کی بوڑھی اور پتھرائی ہوئی نگاہوں سے جیسے آنسوؤں کے تار بندھ گئے تھے۔ شبنمی قطرے اُس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مچل مچل کر اُبل رہے تھے اور لرزتی کپکپاتی پلکوں سے ڈھلک ڈھلک کر زمین کی بے پناہ وسعتوں میں گم ہو رہے تھے۔ وہ قرب و جوار کے ماحول اور ہر شے سے بے نیاز تھا۔ اُس کی توجہ کا مرکز وہ تابوت تھا جو تازہ قبر کے کنارے ناہموار زمین پر رکھا ہوا تھا' اُس کی نظریں جیسے اس تابوت پر جم کر رہ گئیں تھیں۔

تابوت۔۔جس کے اندر فائزہ کا خاکی پیکر اُجلے اور مہکے کفن میں لپٹا بے حس و حرکت پڑا تھا۔!

فائزہ۔۔جس نے موت کو گلے لگا کر زندگی کے تمام ہنگاموں سے ہمیشہ کے لئے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔۔۔اور

موت۔۔جو رشتے ناطوں کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج بن کر حائل ہو گئی تھی۔

وہ حسرت بھری نظروں سے ٹکٹکی باندھے فائزہ کے تابوت کو تکے جا رہا تھا۔۔طوفانی رات کی ہنگامہ خیزیاں بھی اُس کی توجہ میں کوئی خلل نہیں ڈال سکی تھیں۔ سیاہ آسمان پر منڈلاتے بادل پوری شدت سے گرج گرج کر اُس کے انہماک کو للکار رہے تھے۔ بجلی رہ رہ کر تڑپتی اور کڑک کر پورے ماحول کو چکا چوند کر دیتی لیکن وہ جیسے پتھر کا بے جان مجسمہ بن گیا تھا۔۔۔گنگ سا ہو گیا تھا۔۔۔فائزہ کی موت نے جیسے اُسے بھی حال سے لاتعلق کر دیا تھا۔۔ماضی! جہاں بچپن سے لے کر جوانی تک کہ ایک اک بات' ایک ایک لمحہ محفوظ تھا' جہاں زندگی تھی' قہقہے تھے' شہنائیوں کی گونج تھی' سہمے سہمے نازک نازک سے ارمان تھے جو دل میں ہلچل سی پیدا کر دیتے۔۔سہانے سہانے خواب تھے جو وجود کو زندگی کی حرارتوں سے گدگداتے رہتے۔

ابھی کل ہی کی تو بات تھی جب فائزہ دلہن بنی تھی' سرخ عروسی جوڑے میں گھونگھٹ نکالے کمٹی سمٹائی کسی اجنبی قدموں کی آہٹ پر کان لگائے بیٹھی تھی۔۔اُس کے معصوم خیالوں میں جانے کیسے کیسے خوابوں نے جنم لیا ہوگا۔۔وہ خود اپنے ہی خیالوں کے ہجوم میں گم ہو کر بہت دُور نکل گئی ہوگی۔۔سرسبز وادیوں میں' گل پوش پہاڑیوں میں' اپنے خوابوں کے شہزادے کے ساتھ' ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے' ہنستی' مسکراتی۔۔بات بات پر قہقہے بکھیرتی۔۔اور پھر۔۔

پھر اجنبی قدموں کی آہٹ سُن کر وہ یکلخت سہم گئی ہوگی۔۔زندگی کے سفر کا آغاز کرتے ہوئے اُس کا دل ضرور دھڑکا ہوگا۔۔جذبات میں طغیانی بھی آئی ہوگی لیکن پھر اُس نے خود کو حالات کے دھاروں پر چھوڑ دیا ہوگا۔۔وہ رات یقیناً پلکوں کے سایوں تلے ہنستے مسکراتے بیت گئی ہوگی۔ اس رات نہ جانے کیا کیا عہد و پیمان کئے گئے ہوں گے۔۔وہ رات۔۔جو زندگی میں دوبارہ پلٹ کر کبھی واپس نہیں آتی۔۔لیکن۔۔۔

اُسے کیا حق تھا۔۔۔مرنے والے کی نجی زندگی میں جھانکنے کا۔۔۔؟ بوڑھے نے چونک کر اطراف میں نظر ڈالی' گورکن اسے بڑی تیکھی نظروں سے گھور رہا تھا' اُس کے ساتھ جنازے کا کاندھا دینے والے چاروں افراد بھی سرد رات کے بدلتے تیور کو دیکھ کر کچھ دل برداشتہ سے نظر آ رہے تھے۔

ممدو کے دل پر ایک چوٹ سی لگی ـــــ اُس نے سوچا، موت کتنی سنگدل اور بے رحم ہوتی ہے، پل بھر میں زندگی سے قطع تعلق کر لیتی ہے، تمام جذبوں کی شدتوں کو لمحوں میں سرد کر دیتی ہے، یوں اپنے اور پرایوں سے منہ موڑ لیتی ہے جیسے کبھی کوئی شناسائی نہ ہو ـــ جیسے .....

"ممدو بھائی ـــــ اب کس کا انتظار ہے" ایک ساتھی نے اُکتائے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"انتظار ـــــ" ممدو کے ہونٹ سوکھے پتوں کی طرح کھڑکھڑا کر رہ گئے۔ اُس نے پلکوں پر لرزتے آنسوؤں کو ہاتھ سے اُٹھا کر آستین میں جذب کیا پھر ایک حسرت بھری نگاہ تابوت پر ڈالتے ہوئے تھکی تھکی آواز میں بولا ـــــ "چلو، بسم اللہ کرو ـــــ"

ممدو کے ساتھیوں نے مل جُل کر میت کو قبر میں اتار دیا۔ سردی کی شدت ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ موسم کے تیور خطرناک ہو رہے تھے، گورکن اپنے کام میں بڑی تیزی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ پھر سطحِ زمین پر ایک نئی اور تازہ قبر کا نشان واضح ہو گیا تو ممدو کے ساتھ ساتھ اُس کے چاروں ساتھیوں نے بھی فاتحہ کے لئے ہاتھ بلند کر لئے۔ قبر کے قریب رکھی ہوئی لالٹین کی مدھم اور زرد روشنی نے ماحول کو اور زیادہ سوگوار کر دیا تھا۔

فاتحہ پڑھ کر ممدو نے واپسی کے لئے قدم موڑے تو اُس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اندھیرے کے باوجود اُس نے اپنے جوان اور کڑیل بیٹے رحیم کو پہچان لیا تھا جو مرنے والی کی آخری نشانی کو سینے سے لگائے گم صُم بُت بنا کھڑا تھا۔

"رحیمو ـــــ تُو، تُو اس ننھی سی جان کو یہاں کیوں لے آیا" ممدو نے اپنے غموں کو سینے میں دفن کرتے ہوئے کہا، "کتنے کڑاکے کی سردی ہو رہی ہے"

"بابا ـــــ اپنے اپنے نصیب کی بات ہے" رحیمو سرد آہ بھر کر بولا "ماں کی گرم آغوش چھن جائے تو ـــ"

"نہیں۔ نہیں ـــــ نہیں، تجھے اس معصوم کو یہاں نہیں لانا چاہیئے تھا" ممدو نے غصّہ بھرے لہجے میں بیٹے کی بات کاٹتے ہوئے کہا "مرد بن رحیمو ـــــ مرد بن، ابھی تو دنیا میں بہت کچھ دیکھنا ہے۔ بہت کچھ سیکھنا ہے"

"ایک نظر اسے بھی ماں کی قبر کا دیدار کرا دو بابا" رحیم کی آواز بھرا گئی "بڑی ہو کر شکوہ کرے گی تو کیا جواب دو گے ـــــ"

"تُو ـــــ تُو اسے نہیں سنبھال سکتا تو لا ـــــ مجھے دے دے" ممدو نے بچی کو رحیم سے لے کر اپنی بوڑھی آغوش میں سمیٹتے ہوئے بڑے عزم سے کہا "اسے میں پالوں گا ـــــ میں، ..... میں اسے ماں کی کمی کا احساس کبھی نہ ہونے دوں گا"

"بابا ـــــ"

"جلدی کر رحیمو ـــــ برکھا شروع ہو گئی تو واپسی مشکل ہو جائے گی"

ممدو نے ایک بار پھر اپنے سوگوار بیٹے کی بات کاٹی پھر واپسی کے لئے قدم اٹھانے لگا۔ اُس نے بیٹے کے قریب ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا تھا، کہیں رحیم اُس کی پلکوں کی اوٹ میں مچلتے ہوئے آنسوؤں کے سیلاب کو دیکھ لیتا تو شاید وہ بھی پھوٹ پڑتا، اسی لئے تو ممدو نے جلدی سے گردن جھکا کر تین ماہ کی معصوم عائشہ کو چُوما پھر لمبے لمبے قدم مارتا سب سے آگے ہو لیا تھا۔ اُس نے بڑی کوشش کی تھی کہ اب ایک آنسو بھی اُس کی پلکوں سے نہ ڈھلکے لیکن اس کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں، صبر و ضبط کے تمام بند ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے اور ایک بار پھر اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

ممدو کے ذہن کے دریچے آنسوؤں کے طوفان کی ہوا پا کر کھُل گئے ـــــ فائزہ کا معصوم چہرہ اُس کی نگاہوں کے سامنے اُبھر آیا ـــــ فائزہ جسے قدرت نے اُس کے گھر کی آبرو اور دہلیز کی عزت بنا دیا تھا۔ فائزہ کے آجانے سے اُس کے گھر کی ویرانیاں اور اُداسیاں جیسے یکلخت دُور ہو گئی تھیں، پت جھڑ کے موسم کے بعد جیسے اچانک بہار آ گئی ہو۔

فائزہ کے دم سے جہاں گھر کا سونا پن دُور ہوا وہاں رحیمو کی زندگی میں بھی انقلاب آ گیا، پہلے وہ ہر وقت چُپ چُپ اور اُداس رہا کرتا تھا، تنہا جو تھا لیکن فائزہ کو پا کر تو جیسے اُس کی زندگی میں عید آ گئی تھی ـــــ کچھ دنوں تک دونوں کے درمیان ایک حجاب سا رہا لیکن پھر وہ ممدو کی موجودگی میں بھی دل کھول کر آپس میں ہنسنے بولنے لگے، ایک دوسرے کو چھیڑنے سے باز نہیں آتے تھے۔ زیادہ بے تکلف ہونے لگتے تو ممدو خود ہی نظریں جھکا کر کچھ سوچتا ہوا مکان سے

باہر آ کر یا تو مختصر سے سائبان کی چھاؤں تلے بیٹھ جاتا یا پھر اپنے کسی پڑوسی واقف کار کے پاس جا کر مہنگائی اور جنگ کی باتیں کرنے لگتا ـــــ اکثر وہ رحیمو کی شوخیاں دیکھ کر اُس پر برس بھی پڑتا تھا۔

"کیا ہر وقت گھر میں گھسا جیسی نکالے رہتا ہے کچھ کام کاج کی بھی فکر ہے یا ساری زندگی قیمتوں پر گزارنے کا ارادہ ہے؟"

"بابا ـــــ آج اتوار ہے ـــــ چھٹی کا دن ہے" رحیمو اُسے یاد دلاتا تو وہ اپنی جھینپ مٹانے کی خاطر بڑبڑانا شروع کر دیتا۔

وقت اسی انداز میں گزرتا رہا ـــــ پھر قدرت نے ممدو کو ایک نئی خوشی بخش دی، فائزہ کے ہاں جس روز ولادت ہوئی اس روز ممدو کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، رحیمو بھی مارے خوشی کے پھرکی کی طرح ادھر اُدھر ناچتا پھر رہا تھا ممدو نے اس خوشی کے موقع پر پاس پڑوس میں باجرے کے میٹھے لڈو بنوا کر تقسیم کرائے تھے، کئی دنوں تک ہنگامہ رہا تھا۔

بچی کی پیدائش نے فائزہ کی زندگی میں ایک خوشگوار اضافہ کر دیا تھا ـــــ سارا سارا دن وہ بچی کو گود میں لئے ٹہلاتی رہتی اُسے لوریاں سُناتی، اُس کے ننھے منّے روئی کے نرم گالوں جیسے ہونٹوں کو بار بار چومتی ـــــ رات کو بچی ذرا کسمساتی تو وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھتی، تھپک تھپک کر اُسے سُلاتی، غرضیکہ زندگی کی مصروفیات بڑھ گئی تھیں لیکن پھر اچانک وہ بجھی بجھی سی نظر آنے لگی، جانے کیوں اُداس اُداس سی رہنے لگی، رحیمو اُس کی اُداسی کا سبب دریافت کرتا تو وہ مسکرا کر اُسے ٹال جاتی ـــــ ممدو اُسے ٹٹولنے کی خاطر پوچھتا۔

"بیٹی ـــــ تم آجکل چُپ چُپ کیوں رہتی ہو ـــــ کیا رحیمو سے کوئی شکایت ہے؟ کچھ کہا سُنا ہے اُس نے؟"

"نہیں تو بابا ـــــ" وہ جلدی سے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر کہتی "کچھ تھکن سی ہے ـــ جاتی رہے گی"

ممدو فائزہ کا جواب سُن کر مطمئن ہو جاتا مگر یہ اطمینان زیادہ عرصے تک برقرار نہ رہ سکا، فائزہ کو تو ہر وقت ہلکا ہلکا سا بخار رہنے لگا تھا، دوا دارو سے وہ دو چار روز تک ٹھیک رہتی پھر اُس کے چہرے کی رنگت ہلدی کی طرح زرد پڑنے لگتی۔ ممدو نے ایک حکیم سے لگ کر علاج بھی کرایا لیکن فائزہ کی حالت سنبھلنے کے بجائے روز بروز بگڑتی چلی گئی۔ جیسے اندر ہی اندر کوئی دُکھ ـــ کوئی غم اُسے کھائے جا رہا تھا۔

گزشتہ تین چار دنوں سے تو وہ بہت زیادہ بدلی بدلی اور بیمار نظر آنے لگی تھی، ہر پل ہر لمحے کسی سوچ میں گم، گم سی کھوئی کھوئی نظر آتی، رحیمو کام کے سلسلے میں ایک ہفتے سے لاہور گیا ہوا تھا، ممدو نے بھی خیال کیا کہ فائزہ رحیمو کے نہ ہونے سے زیادہ اداس ہو گئی ہے، وہ فائزہ کا خیال بھی تو بہت زیادہ رکھتا تھا، ہر وقت اُسے خوش رکھنے کے لئے اپنی سی کوشش کرتا رہتا اور ـــــ ننھی عائشہ کو تو وہ ٹوٹ کر پیار کرتا تھا، اُس کا بس چلتا تو دن رات عائشہ کو گود یوں میں لئے پھرتا۔ ایک پل کو بھی خود سے جُدا نہ کرتا۔

ممدو رحیمو کی واپسی کی راہ دیکھتا رہا، اُس کو بھلا کیا خبر تھی کہ موت کے سرد اور بے رحم ہاتھ فائزہ کے گرد اپنا حلقہ تنگ کر کے اس بھرے آنگن کی خوشیوں کو سُونا کر دینے کے لئے مچل رہے تھے، دو روز تک وہ خاموشی سے فائزہ کی حالت کو دیکھتا رہا پھر تیسرے روز اُس سے صبر نہ ہو سکا۔

"کیا بات ہے بیٹی ـــــ تم اداس اُداس سی کیوں ہو؟" اُس نے فائزہ سے پوچھ ہی لیا۔

"بابا ـــــ" اُس نے ننھی عائشہ کو پیار کرتے ہوئے پوچھا "یہ تمہیں کیسی لگتی ہے ـــــ؟"

"بڑی ہی پیاری اور نیک بچی ہے ـــــ خدا اس کے نصیب اچھے کرے"

"اِس کا نصیب خدا کے بعد تمہارے سپرد ہو گا بابا ـــــ"

"فائزہ بیٹی ـــــ" ممدو تڑپ اُٹھا "یہ آج تم کیسی باتیں کر رہی ہو ـــــ؟"

"پریشان مت ہو بابا" وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی "ہر بات کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے ـــــ کل کیا ہو گا کون جانے، لیکن جو لوگ کل سے بے نیاز ہو جاتے ہیں وہ اکثر نقصان میں رہتے ہیں اس لئے میں چاہتی ہوں کہ آج ہی تم سے سب کچھ کہہ ڈالوں ـــــ"

"تجھے ـــــ تجھے کیا ہو رہا ہے بیٹی؟" ممدو نے فائزہ کو بہت غور سے تکتے ہوئے سوال کیا "کیا تجھے باپ

کی موت کا غم ہے؟"

"باپ کی موت کے وقت تو میں اُن کے سرہانے تھی بابا:" فائزہ سسک اٹھی "میں قدرت کے فیصلے کے خلاف اپنے بل بوتے کو موت کے شکنجوں سے نہیں بچا سکی لیکن ـــــ مجھے خوشی ہے کہ آخری وقت میں ابو اور میں ایک دوسرے سے بہت قریب تھے ـــــ موت برحق ہے بابا مگر تم ان رشتوں کا کیا کرو گے جو جیتے جی ٹوٹ جاتے ہیں، بچھڑ جاتے ہیں۔"

ممدو نے کوئی جواب نہ دیا، فائزہ کے زخم تازے ہوتے دیکھ کر وہ بھی اندر ہی اندر دل مسوس کر رہ گیا۔

"ناخن گوشت سے جُدا ہو جائے تو تکلیف تو ہوتی ہے ـــــ آرام اور صبر آتے آتے آتا ہے۔" فائزہ نے بجھی آواز میں کہا پھر ممدو کے سوگوار چہرے پر نظر پڑی تو ایک پھیکا سا بے جان تبسم ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولی "بھائی جان کی شکل سامنے ہے۔ میرے خطوط کا جواب دینا تو درکنار، انھوں نے آج تک پلٹ کر ابو کی موت کی خبر بھی نہ پوچھی۔"

"سمندر پار کی دنیا ہماری دنیا سے بڑی مختلف ہوتی ہے بیٹی، میں نے اپنے یار دوستوں سے یہی سُنا ہے۔" ممدو نے کہا "تم دل چھوٹا نہ کرو، قدرت نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"بابا ـــــ ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو بیٹی ـــــ"

"تم ـــــ تم مجھ سے کتنا پیار کرتے ہو؟"

"بہت ڈھیر سارا ـــــ" ممدو نے وضاحت کرتے ہوئے جواب دیا "اتنا ہی جتنا تمہارے ابو تم سے کرتے تھے۔"

"سچ بابا ـــــ" فائزہ کی دراز پلکوں پر نمی آگئی، آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے۔

"کیا میں اس عمر میں تم سے جھوٹ بولوں گا؟"

"بابا ـــــ مجھ سے ایک وعدہ کرو گے؟" فائزہ یکلخت بے حد سنجیدہ ہوگئی۔

"کیا ـــــ؟"

"میں مرجاؤں تو میری عائشہ کا خیال رحیمو کے بجائے تم رکھو گے۔" فائزہ کے لہجے میں حسرتیں تڑپ اٹھیں۔

"فائزہ بیٹی ـــــ" ممدو چیخ اٹھا۔

"ہاں بابا ـــــ مجھے تمہارے سوا اور کسی مرد پر اعتبار نہیں رہا۔" فائزہ تڑپ کر بولی پھر عائشہ کو سینے سے بھینچ کر تیزی سے پلٹی اور تیز تیز قدم اُٹھاتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

فائزہ کی باتوں نے ممدو کو بے چین کر دیا، وہ دن بھر اُداس رہا، سُورج ڈھلے رحیم واپس آیا تو ممدو نے اُسے باہر ہی روک کر سب کچھ بتا دیا۔ رحیم نے پوری بات سُنی تو لاپرواہی سے مسکرا کر بولا،

"تم فکر مت کرو بابا ـــــ میں ابھی اندر جا کر سب ٹھیک کیے لیتا ہوں۔"

رحیم باپ کو دلاسہ دے کر اندر چلا گیا لیکن ممدو کے دل کو کسی پل چین نہیں آرہا تھا۔ وہ دروازے کے باہر مختصر سے سائبان کے نیچے ٹہلنے لگا۔ بار بار اُس کی بوڑھی نظریں کھلے دروازے سے اندر بچھے صحن کی جانب اُٹھ جاتیں، جو نہ جانے کیوں بڑا سونا سونا لگ رہا تھا، وہ منتظر تھا کہ کب رحیم اور فائزہ کمرے سے برآمد ہوں گے اور کب آنگن کا سُونا پن دُور ہوگا ـــــ وہ بڑی شدّت سے اس لمحے کا منتظر تھا لیکن دوسرے ہی پل وہ رحیم کی چیخ سُن کر خود بھی بے اختیار چیخ اُٹھا ـــــ پاگلوں کی طرح دیوانہ وار بھاگتا ہوا صحن عبور کر کے کمرے میں پہنچا تو دھک سے رہ گیا ـــــ اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

فائزہ اُس کے آنگن کو سُونا کر کے بہت دُور جا چکی تھی، رحیم معصوم اور ننھی عائشہ کو سینہ سے لگائے کھڑا پھٹی پھٹی نگاہوں سے فائزہ کو دیکھ رہا تھا ـــــ یوں جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو ـــــ یا اُسے ابھی تک فائزہ کی موت کا یقین نہیں ہوا تھا۔ ممدو نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے، آہستہ سے آگے بڑھ کر اُس نے رحیم کے شانوں کو تھپتھپایا پھر گردن ڈالے باہر آگیا ـــــ فائزہ کے آخری سفر کی تیاری کا بوجھ بھی قدرت نے اُس کے ناتواں کاندھوں پر ڈال دیا تھا ـــــ اور اسی وقت بھی جب وہ فائزہ کو دفنا کر واپس لوٹ رہا تھا فائزہ کے الفاظ اُس کے کانوں میں صدائے بازگشت بن کر بار بار گونج رہے تھے ـــــ "بابا ـــــ مجھ سے ایک وعدہ کرو گے؟..... میں مرجاؤں تو میری عائشہ کا خیال

رحیمو کے بجائے تم رکھو گے ـــــ"

ممدو نے ایک بار پھر ننھی عائشہ کو گردن گھما کر چوم لیا ـــــ بچی اُس کی آغوش میں کسمسا کر رہ گئی ـــــ آسمان کی دھڑکنیں رفتہ رفتہ بڑھنے لگی تھیں، سیاہ بادلوں کے اندر بجلی رہ رہ کر کوند رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی اور ہواؤں کی شدت بتا رہی تھی کہ کوئی طوفان سر اُٹھانے کو ہے ـــــ ممدو نے آنے والے طوفان کی شدّتوں کا اندازہ لگایا تو معصوم عائشہ کو پوری طرح اپنی باہنوں میں چھپا لیا ـــــ!!

بیرسٹر محمود حسین کی عالیشان کوٹھی آج بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ سرِ شام ہی سے مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، کوٹھی کا گوشہ گوشہ جگمگا رہا تھا، برقی قمقموں کو بڑی نفاست اور خوبصورتی سے مناسب جگہوں پر لگایا گیا تھا، رنگ برنگی روشنیوں نے پورے ماحول کو گنگا جمنی بنا رکھا تھا۔

کوٹھی کے باہر وسیع و عریض سبزہ زار پر بیرسٹر محمود حسین بنفسِ نفیس مہمانوں کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ اور زنان خانے میں اُن کی شریکِ حیات شمسہ بیگم آنے والیوں کی آؤ بھگت میں مصروف نظر آرہی تھیں۔ گھریلو ملازم بھی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

آج محمود حسین کی اکلوتی اور نازوں کی پلی بیٹی ناجیہ کی چھٹی سالگرہ تھی۔ ماں کی علالت کے سبب محمود حسین اس تقریب کو نہایت سادگی اور خاموشی سے نپٹانا چاہتے تھے لیکن ناجیہ کو جب معلوم ہوا تو اُس نے رو رو کر سارا گھر سر پر اُٹھا لیا، دادی کے لاڈ پیار نے اُس کی عادتیں بگاڑ رکھی تھیں چنانچہ جب ناجیہ نے بسور بسور کر باپ کے ارادے کو دادی کے گوش گزار کیا تو صوفیہ خاتون کے بیمار زرد چہرے پر خون کی سُرخی شفق کی مانند پھیل گئی۔ ہاتھ بڑھا کر انھوں نے پوتی کی سینکڑوں بلائیں لے ڈالیں پھر اسی وقت بیٹے اور بہو کی طلبی بھی ہو گئی۔

محمود حسین اور شمسہ بیگم کمرے میں داخل ہوئے تو ناجیہ نے دادی کا لاڈ کرنے کی خاطر دونوں ہاتھ اُن کے گلے میں ڈال دیے اور لپٹ کر بیٹھ گئی۔ محمود حسین نے بیٹی کو دادی کے لئے قریب دیکھا تو اُن کا ماتھا ٹھنکا، ناجیہ کی آنکھوں میں اُبھرنے والی چمک اور فتح کا احساس دیکھتے ہی وہ سمجھ گئے تھے کہ اس وقت ماں کے سامنے اُن کی طلبی کا سبب کیا ہے۔

آج صبح ہی کی بات تھی جب انھوں نے ناجیہ کو بڑے پیار سے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ سالگرہ کے لئے اپنی ضد چھوڑ دے، ناجیہ نے باپ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا، منہ بنا کر خاموش ہو گئی تھی، شمسہ بیگم نے بھی بیٹی کو اس بات کا احساس دلانے کی بھرپور کوشش کی تھی کہ صوفیہ خاتون کی طبیعت ناساز ہے اور ایسے حالات میں سالگرہ کی تقریب دھوم دھام سے منانا قطعی نامناسب ہوگا۔ ناجیہ نے ماں کی بات سُن کر بھی چُپ سادھ لی تھی اور اُس کی خاموشی کا پیش خیمہ تھا کہ اس وقت وہ اپنی دادی کے گلے میں ننھی منی بانہیں ڈالے بڑی شان سے لپٹی بیٹھی تھی، اُس کی معصوم آنکھوں میں شوخیاں رقص کر رہی تھیں۔

شوخیاں ـــــ جس میں فتح کا احساس جھلک رہا تھا۔

احساس ـــــ جو ابھی نابالغ تھا۔

کمسن تھا ـــــ

معصوم تھا ـــــ

کم عمر تھا ـــــ لیکن کم عمری کے باوجود اُس میں پختگی کا رنگ ڈھنگ نمایاں تھا، دادی کے بے جا لاڈ پیار نے اُسے سرکش بنا دیا تھا، وہ ماں باپ کو روبرو جواب دینے سے گریز کرتی لیکن دادی ایک ایسا ذریعہ تھیں جس کی حمایت لے کر وہ اپنی ہر جا بے جا خواہش پوری کرا لیتی اور خواہشات کی ان ہی تکمیل کا سبب تھا کہ ابھی تک مایوسی اور ناکامی کا مفہوم بھی اسے نہیں معلوم ہو سکا تھا، وہ صرف ایک بات جانتی تھی ـــــ جو کام وہ اپنی مرضی سے نہ کر سکے یا جس بات کے لئے اُسے ماں باپ کی طرف سے تنبیہ کی جائے وہ دادی کی حمایت حاصل کر کے بڑی آسانی سے پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتی تھی اور صوفیہ خاتون کی ان ہی حمایتوں اور طرف داریوں نے طرح دے کر ناجیہ کے معصوم دل میں من مانی کرنے اور اپنی ہر ضد پوری کرانے کے جذبے کو سر اُبھارنے کا گن سکھا دیا تھا۔

شمسہ بیگم بیٹی کی تربیت کو دوسری تمام مصروفیات سے زیادہ اہم خیال کرتی تھیں، وہ ناجیہ کو مشرقی تہذیب کے خوبصورت اور حسین سانچوں میں ڈھالنا چاہتی تھیں، وہ بیٹی کو ایسے ماحول میں پروان چڑھانا چاہتی تھیں جو اُن کا اپنا ماحول تھا لیکن ساس کے سامنے سر اُٹھانا، اُن کی کسی بات یا حکم سے سرتابی کرنا یا نگاہیں چار کر کے گفتگو کرنا اُن کی سرشت کے خلاف تھا، وہ جب سے اس گھر میں بیاہ کر آئی تھیں انھوں نے کبھی ساس کو کسی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ ناجیہ کے سلسلے میں البتہ انھیں صوفیہ خاتون کی جانبے جا حمایت اکثر گراں گزرتی لیکن آج تک شمسہ بیگم نے کبھی اُف تک نہ کی تھی، اندر ہی اندر گھٹ کر خاموش ہو جاتی تھیں۔

محمود حسین اس گھر کے واحد چشم و چراغ تھے، ماں باپ کے بے حد لاڈلے تھے، انھیں دنیا جہاں کی آسائشیں اور آرام حاصل تھا لیکن والدین کے حکم کے خلاف سر اُٹھانے کی جرأت انہیں کبھی نہ ہو سکی، جب تک باپ کا سایہ سر پر قائم رہا وہ اکثر و بیشتر کبھی ہونٹ کاٹ کر کبھی پیشانی پر شکنیں اُبھار کر اپنی گھٹن کا اظہار ضرور کر دیا کرتے تھے لیکن لب کھولنے یا حرفِ احتجاج زبان تک لانے کی ہمت کبھی نہ ہوئی ——— والد کے انتقال کے بعد تو محمود حسین نے خود کو یکسر تبدیل کر لیا تھا، ان کا شمار ملک کے بہترین اور ذہین ترین بیرسٹروں میں ہوتا تھا، جس مقدمے کی پیروی کے لئے اُن کا نام عدالت میں داخل کیا جاتا اُسے کامیابی کی دلیل اور ضمانت تصوّر کیا جاتا، وہ بڑی سی بڑی عدالت اور بڑے سے بڑے ججوں کے سامنے سر بلند کر کے اور سینہ تان کر نہایت پُروقار لب و لہجے میں بحث کرنے کے عادی تھے لیکن ماں کے سامنے انھوں نے خود کو ہمیشہ سرنگوں رکھا تھا اس لئے کہ وہ ماں تھی۔

ماں ——— جس نے انھیں جنم دیا تھا ——— ممتا کی گرمی سے دل کو دھڑکنیں عطا کی تھیں۔
ماں ——— جس نے انھیں بولنا سکھایا تھا۔
اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا تھا۔ لب و لہجہ دیا تھا۔
ایک ننھے اور معصوم پودے کو سرد و گرم سے محفوظ کر کے پالا پوسا تھا ——— تناور درخت بنا دیا تھا۔
ماں کی دعائیں ہی تو تھیں جو ان کا مقام اتنا بلند ہو گیا تھا ——— پھر ———
وہ ماں کو کیسے ناراض کر سکتے تھے ———
ماں ——— جس کے قدموں تلے اولاد کی جنت ہوتی ہے۔

اور محمود حسین نے ہمیشہ اسی جنت میں اپنا سکون تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ باپ جب تک زندہ رہے محمود حسین کو اُن کی حمایت حاصل رہی، باپ کی محبت اور شفقتوں کی آڑ لے کر وہ اکثر اپنی من مانی کر گزرتے لیکن اتنی خاموشی اور رازداری کے ساتھ کہ ماں کو کانوں کان خبر تک نہ ہوتی، باپ کے لاڈ پیار نے محمود حسین کو آزادی کا وہ مفہوم سمجھنے کا موقع بھی دیا تھا جو مشرقی تہذیب کا بیری تھا لیکن صوفیہ خاتون کی سخت طبیعت اور کڑی نگہداشت نے ہر ہر قدم بیٹے کو گرتے سے سنبھالا تھا، اس ماحول سے دُور رکھنے کی کوشش کی تھی جس کے راستے تاریک اور مخدوش تھے۔

شوہر کی موت کے بعد صوفیہ خاتون کی طبیعت کی سخت گیری دوچند ہو گئی، پہلے وہ محمود حسین پر صرف گھر کی چہار دیواری کے اندر نظر رکھتی تھیں لیکن اب اُن کی ذمہ داریوں کا دائرہ پھیل کر اچانک بہت وسیع ہو گیا تھا شاید یہی وجہ تھی کہ وہ کچھ چڑچڑی بھی ہو گئی تھیں، شوہر نے جس انداز میں اُن سے ٹوٹ کر محبت کی تھی، سیاہ و سپید کا مالک بنا رکھا، کبھی کسی بات سے اختلاف نہیں کیا تھا۔ ان کی طبیعت میں سربلندی روزِ اوّل سے تھی، شوہر کے پیار نے ان سربلندیوں کو اور جلا بخش دی تھی۔

احمد حسین (مرحوم) کا شمار ہائیکورٹ کے صفِ اوّل کے ججوں میں ہوتا تھا۔ وہ نہایت متکبر مزاج، خوش پوش اور خوش گفتار طبیعت کے مالک تھے، انصاف کی ترازو پر اُن کی گرفت ہمیشہ نہایت مضبوط رہی، اُن کے فیصلے مثالی ہوا کرتے تھے، عدالت میں منصف کی حیثیت میں وہ اپنے اصولوں پر سختی سے کاربند رہتے، مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانے اور مناسب سزا دینے میں وہ بلا جھجک فیصلہ صادر کرنے کے عادی تھے، قانون اور حالات کے خلاف ایک قدم بھی اُٹھانا انھیں پسند نہیں تھا۔ ایک جج کے روپ میں وہ نہایت سخت اور ٹھوس طبیعت کے مالک تھے، انصاف کی کرسی پر بیٹھ کر کسی کو خاطر میں لائے بغیر دو ٹوک فیصلہ کر گزرتے لیکن گھر کی چہار دیواری کے اندر ——— ایک شوہر کے رُوپ میں وہ اپنے بیرونی کردار کی ضد نظر آتے۔

صوفیہ خاتون کے سامنے وہ کبھی اونچی اور تیز آواز میں بات نہیں کرتے تھے، بیوی کی ہر خواہش کا احترام اپنے اوپر فرض سمجھتے، بیوی کو خوش رکھنا اور خوش دیکھنا اُن کا سب سے محبوب مشغلہ تھا، بیوی کے ہر فیصلے کے آگے وہ اس طرح مسکرا کر سرِ تسلیم خم کر دیتے جیسے اس فیصلے کے خلاف پیل ان کے اختیار سے باہر کی بات تھی۔

شوہر کے اسی لاڈ پیار نے صوفیہ خاتون کو قطعی طور پر خود مختار بنا دیا تھا، اگر احمد حسین عدالت میں فیصلے صادر کرنے کے مجاز تھے تو صوفیہ خاتون گھر کے اندر کے فیصلے سُنانے کی عادی بن گئی تھیں۔ ایسے فیصلے جن کے خلاف کوئی اپیل ——— کوئی احتجاج ممکن نہ تھا، فریقِ دوم کو صرف بغاوت کا اختیار تھا لیکن خاموش بغاوت ——— گھر کے کسی فرد میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ بغاوت کا اظہار بھی کھل کے کر سکتا۔!!

شوہر کی موت کے بعد جب صوفیہ خاتون نے اچانک بیٹے کو بیرسٹری پڑھنے کا مشورہ دیا تو محمود حسین تلملا کر رہ گئے، اُن کا ذہن شروع سے تجارت کی طرف مائل تھا، انھوں نے نظریں جھکا کر ماں کے سامنے پہلی بار اپنی خواہش کا اظہار دبی زبان میں کیا لیکن صوفیہ خاتون کا فیصلہ اٹل تھا ——— جس کرسی پر وہ ایک طویل عرصے تک شوہر کو سربلند دیکھ چکی تھیں بیٹے کے حق میں بھی انھوں نے اسی کرسی کا انتخاب کیا تھا۔ محمود حسین ماں کے حکم سے سرتابی نہ کر سکے، باپ کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد وہ ماں کو خوش رکھنا اپنا اوّلین فرض سمجھتے تھے اس لئے انھوں نے خاموشی سے قانون پڑھنا شروع کر دیا اور پھر ——— آج محمود حسین کو جو عزت، مرتبہ، شہرت اور مقام حاصل تھا وہ سب ماں کی دعاؤں کی بدولت تھا، باپ کی طرح محمود حسین کا کردار بھی گھر کی چہار دیواری کے باہر کچھ اور تھا لیکن گھر کے حدود کے اندر وہ قطعی مختلف نظر آتے۔

غرضیکہ۔ اس وقت بھی جب انھوں نے ماں کے کمرے میں قدم رکھا تو ناجیہ کی معصوم آنکھوں میں اُبھرنے والی شوخیاں دیکھ کر بات کی تہہ تک پہنچ گئے لیکن انجان بنے رہے، ماں کے قریب جا کر نہایت ادب سے سلام کیا اور خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گئے، شمسہ بیگم ساس کے بستر پر بیٹھ کر اُن کے پاؤں دبانے لگیں۔

"خوش رہو بہو ———" صوفیہ خاتون نے شمسہ بیگم کو پیار سے دیکھتے ہوئے بڑی شفقت سے کہا۔
"امی حضور ——— اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" محمود حسین نے پوچھا۔
"خدا کا شکر ہے، پہلے سے بہت بہتر ہے۔" صوفیہ خاتون بیٹے کو دیکھتے ہوئے بولیں۔
"امی جان" شمسہ بیگم نے کہا "میری مانیں تو آپ کچھ دنوں کے لئے تبدیلِ آب و ہوا کی غرض سے پہاڑ پر چلی جائیں، ڈاکٹروں کا بھی یہی مشورہ ہے۔"
"ناجیہ کا سالانہ امتحان ختم ہو لینے دو۔ پھر تمہارے مشورے پر غور کر دوں گی۔" صوفیہ خاتون نے ناجیہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "اب تو اس بچی کے بغیر ایک پل کو بھی میرا جی نہیں لگتا۔"

دادی کی بات سُن کر ناجیہ کی آنکھوں میں چھلکنے والی شوخیاں کچھ اور گہری ہو گئیں۔
"محمود ——— آج فروری کی غالباً آٹھ تاریخ ہے۔"
"جی ہاں امی حضور ———" محمود حسین نے جان بوجھ کر ایک بار پھر انجان بنتے ہوئے کہا "کوئی خاص بات ہے کیا؟"
"ہاں ———" صوفیہ نے والہانہ انداز سے ناجیہ کو دیکھتے ہوئے جواب دیا "دس روز بعد میری ناجیہ کی سالگرہ ہو گی ———"
"امی حضور ——— آپ کی طبیعت ....."
"میں چاہتی ہوں اس بار میری بچی کی سالگرہ زیادہ دھوم دھام سے منائی جائے، وقت کم رہ گیا ہے اس لئے کل صبح ہی دعوت نامہ بھیجنے کے لئے بھیج دو۔" صوفیہ خاتون نے اپنا فیصلہ صادر کرتے ہوئے کہا "مہمانوں کی فہرست بھی کل شام تک تیار کر کے مجھے دکھا دینا۔"
"جی ——— بہتر ہے۔" محمود حسین نے کنکھیوں سے ناجیہ کی طرف دیکھا جو بڑے پُروقار انداز میں دادی سے لگی بیٹھی فاتحانہ انداز میں مسکرا رہی تھی، اُس کے معصوم وجود کا ایک ایک حصہ خوشی کے احساس سے دمک اُٹھا تھا۔

"امی جان ——" شمسہ بیگم نے ہمت کی —— "ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ آپ کو آرام اور سکون کی شدید ضرورت ہے۔"

"کیا کہنا چاہتی ہو ——" صوفیہ خاتون نے بہو پر نظریں جما کر سوال کیا۔

"میں —— دراصل یہ کہنا چاہ رہی ہوں امی جان کہ سالگرہ کے ہنگاموں سے ——"

"میرے سکون اور آرام میں خلل آئے گا۔" صوفیہ خاتون بولیں "یہی کہنا چاہتی ہو نا ——"

"جی —— جی ہاں۔"

"ایک بات کہوں بہو —— برا تو نہیں مناؤ گی؟"

"میری کیا مجال ہے جو آپ کے کسی حکم سے سرتابی کر سکوں۔" شائستہ بیگم گڑبڑا کر بولیں۔

"گھبراؤ نہیں —— میں صرف تمہیں یہ باور کرانا چاہتی ہوں کہ ابھی تم لوگوں نے زندگی کی ابتدا کی ہے۔ ابھی سکون و آرام کے مفہوم تمہاری سمجھ میں نہیں آئے —— کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں سمجھنے کی خاطر انسان کو کچھ قربانیاں دینی پڑتی ہیں —— کچھ کھونا ہوتا ہے —— کچھ زخم سہنے پڑتے ہیں۔"

صوفیہ خاتون کی پلکوں کے گوشے بھیگنے لگے تو محمود حسین بے چین ہو گئے، شمسہ خاتون مجسم التجا بن کر بولیں۔

"امی جان، میں گستاخی کی معافی چاہتی ہوں —— روانی میں ایک غلط بات کہہ گئی تھی۔"

"میرا سکون —— میرا آرام —— میرے کلیجے کی ٹھنڈک اور میری زندگی —— سب کچھ میری ناجیہ کے دم سے ہے۔" صوفیہ خاتون نے ناجیہ کو پیار بھری نظروں سے تکتے ہوئے کہا۔

"آپ مطمئن رہیں امی حضور۔" محمود حسین جلدی سے بولے۔ "ہم ناجیہ کی سالگرہ ہمیشہ کی طرح نہایت دھوم دھام سے کریں گے۔"

"خدا تم دونوں کو سلامت رکھے۔"

محمود حسین اور شائستہ بیگم سالگرہ کی ہامی بھر کر چلے گئے تو ناجیہ نے خوش ہو کر بے اختیار دادی کو چوم لیا۔ پھر بڑی معصومیت سے بولی۔ "دادی اماں —— آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

"اچھا —— یہ شکریہ کس بات کا ادا کیا جا رہا ہے؟" صوفیہ خاتون نے پوچھا۔

"آپ نے جو میری سالگرہ والی بات پکی کرا دی —— ایمان سے آپ نہ ہوتیں تو امی ابو کبھی میری سالگرہ نہ مناتے —— نہ میں اپنی سہیلیوں کو بلا سکتی نہ کیک کاٹ سکتی۔"

"اب تم سب کچھ کر سکو گی ——"

"اب تو دادی اماں زندہ باد۔"

ناجیہ نے ایک بار پھر دادی اماں کو معصوم باہنوں میں لے کر پیار کیا پھر "دادی اماں زندہ باد" کے نعرے لگاتے ہوئے اچھلتی کودتی کمرے سے باہر چلی گئی۔ صوفیہ خاتون کی بوڑھی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھرتھرانے لگے۔

کوٹھی کے بیرونی، وسیع و عریض ہال کو سالگرہ کی تقریب کی خاطر دلہن کی طرح سجایا گیا تھا، رنگ برنگی کاغذ کی پٹیوں کو لہریے دے کر بڑی نفاست سے آڑا ترچھا لگایا گیا تھا، درمیان میں قیمتی فانوس کے ساتھ اور دیواروں پر چاروں طرف سالگرہ کے غبارے ٹنگے ہوئے تھے، فرش پر دبیز اور قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ ہال کے تمام وزنی فرنیچر کو باہر نکال دیا گیا تھا البتہ کرسیوں اور صوفوں کو دیوار کے ساتھ رکھ دیا گیا تھا، رنگا رنگ کے برقی قمقموں کو بطور خاص اس گول میز کے اوپر لگایا گیا تھا جہاں سالگرہ کا کیک دوسری بے شمار لوازمات کے ساتھ موجود تھا۔

ناجیہ اور اس کی ہمجولیاں پورے ہال میں ناچتی پھر رہی تھیں، معصوم قہقہوں سے کوٹھی کا گوشہ گوشہ گونج رہا تھا، ناجیہ کی کچھ سہیلیوں نے سوانگ بھی بھر رکھا تھا اور اسی مناسبت سے وہ مہمانوں کے درمیان شوخیاں اور شرارتیں کرتی پھر رہی تھیں غرضیکہ پورا گھر خوشیوں اور مسرتوں کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔

مقررہ وقت پر ناجیہ ایک شان بے نیازی سے چلتی ہوئی گول میز کے قریب آ گئی، اس کے انداز میں تمکنت تھی، معصومیت تھی، بھولپن تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ امارت کا احساس بھی جھلک رہا تھا، ہم عمر لڑکیوں اور لڑکوں نے میز کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ محمود حسین ماں کے حکم کے بموجب کیک کٹنے سے پیشتر جا کر انھیں پہیوں والی کرسی پر بٹھا کر لے آئے، معتبر عورتیں اور معزز مہمان صوفیہ خاتون کے استقبال کی خاطر اپنی اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہو گئے۔ ایک طویل عرصے

کے بعد صوفیہ خاتون نے آج کسی اجتماع میں شرکت کی تھی —— شوہر کی موت کے بعد سے انھوں نے ہر تقریب سے منہ موڑ رکھا تھا۔

ماں کی کرسی گول میز کے قریب لائی گئی تو ناجیہ نے بڑے ادب سے جھک کر دادی کو سلام کیا، صوفیہ خاتون نے ہاتھ بڑھا کر پوتی کی بلائیں لیں پھر اپنے گلے میں پڑی ہوئی موتیوں کی مالا اتار کر ناجیہ کے گلے میں ڈال دی۔ یہ گویا تقریب کے آغاز کا اعلان تھا۔ شمسہ بیگم ساس کے سیدھے ہاتھ پر ناجیہ کے قریب موجود تھیں۔

"دادی اماں —— اجازت ہو تو کیک کاٹوں۔" ناجیہ نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"بسم اللہ کرو میری جان، میں واری۔"

دادی کا حکم پا کر ناجیہ نے کیک کاٹنے والی چھری ہاتھ میں اٹھا لی، ایک نظر اس نے میز کے اطراف موجود لڑکوں اور لڑکیوں پر ڈالی پھر یکلخت اس کی نظر ہال کے مغربی دروازے پر کھڑی عائشہ پر جا کر تھم گئی، اس کے معصوم اور یاقوتی لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھر آئی، چہرہ میز پر رکھ کر وہ سہیلیوں کے جھرمٹ سے نکل کر عائشہ کے قریب چلی گئی، صوفیہ خاتون کی نگاہیں پوتی کا تعاقب کرتی ہوئی عائشہ کے وجود سے ٹکرائیں تو ان کی کشادہ اور اجلی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں، شمسہ بیگم نے ساس کی تیوری پر بل آتے دیکھا تو سہم کر رہ گئیں۔ محمود حسین نے بھی ماں کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو دیکھا تو بیوی کے قریب جا کر دبی زبان میں پوچھا۔

"کون بچی ہے ——؟"

"اپنے مالی بابا کی نواسی ہے —— عائشہ، لیکن ناجیہ اسے پیار میں عاشی کہتی ہے۔" شمسہ بیگم نے شوہر کو صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ "امی جان ناجیہ اور عاشی کا میل جول پسند نہیں کریں۔"

"کیوں ——؟" محمود حسین نے تعجب سے پوچھا پھر نرم پڑتے ہوئے بولے۔ "سمجھ گیا ——"

"آپ جا کر ناجیہ کو سمجھائیں —— امی جان اگر روٹھ کر اندر واپس چلی گئیں تو رنگ میں بھنگ پڑ جائے گا۔"

محمود حسین نے پلٹ کر ماں کی جانب دیکھا جو سنجیدگی سے کسی گہری سوچ میں غرق نظر آ رہی تھیں، وہ آہستہ سے ماں کے قریب گئے، جھک کر بڑے لاڈ سے دریافت کیا۔

"امی حضور، نصیبِ دشمناں، آپ کی طبیعت ناساز تو نہیں ہے؟"

"آں ——" صوفیہ خاتون بیٹے کی آواز سن کر چونک اٹھیں پھر اپنی کیفیت کو ایک بزرگانہ تبسم کی اوٹ میں چھپاتے ہوئے بولیں "نہیں تو —— میں تو بہت مسرور و شاداں ہوں، آج میری پوتی کی سالگرہ جو ہے۔"

ناجیہ عاشی کا ہاتھ تھامے میز کے قریب آ گئی۔ محمود حسین سہمی سہمی اور سمٹی سمٹی عاشی کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ عاشی کے جسم پر معمولی درجے کا اُجلا لباس تھا لیکن اس کے باوجود وہ سب سے منفرد اور علیحدہ نظر آ رہی تھی، قدرت نے اُسے حسن کی بے پناہ دولت سے نوازنے میں بڑی فیاضی سے کام لیا تھا۔ کس قدر معصوم اور بھولی بھولی سی نظر آ رہی تھی، اُس کی سادگی میں بھی پرکاری موجود تھی۔ چہرے سے ذہانت ٹپک رہی تھی لیکن شاید عزت کے احساس نے اُس کی شوخیوں اور معصوم شرارتوں کو اُس کے ننھے وجود کے اندر محبوس کر رکھا تھا —— یہی وجہ تھی کہ وہ بھری محفل میں ہم عمر سہیلیوں کے جھرمٹ میں بھی بڑی تنہا تنہا سی لگ رہی تھی۔ ناجیہ کی چاہت اُسے جگمگاتے ہال تک کھینچ لائی تھی لیکن وہ دُور ہی رک گئی تھی۔ اگر ناجیہ کی نگاہ نہ اٹھتی تو شاید وہ دُور دُور ہی سے اس کی خوشیوں میں شرکت کا اظہار تالیوں کی زبانی کر کے اُلٹے قدموں خاموشی سے واپس چلی جاتی۔

محمود حسین نے آج پہلی بار عاشی کو دیکھا تھا، اُس کی معصومیت اور بھولپن نے انھیں بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔ آج محمود حسین کو ناجیہ بھی بہت بلند نظر آ رہی تھی، اس لئے کہ وہ بڑے گھر اور بڑے باپ کی بیٹی تھی اور اس لئے بھی کہ آج اُس نے خود آگے بڑھ کر عاشی کا استقبال کیا تھا، وہ عاشی کو دیکھنے میں اتنے محو تھے کہ چند لمحوں کو اطراف سے بھی بے نیاز ہو گئے، پھر جب ناجیہ نے پھونک مار کر روشن موم بتیوں کو گل کیا اور کیک کاٹا اور "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو" کا شور تالیوں کی گونج میں بلند ہوا تو وہ بھی چونک کر محفل کے ہنگاموں میں شریک ہو گئے۔

صوفیہ خاتون نے ایک بار پھر ناجیہ کو گلے لگا کر اُسے پیار کیا، بلائیں لیں پھر اندر واپس چلی گئیں۔ محمود حسین ماں کو

کمرے تک چھوڑ کر واپس آئے تو ہال میں ہر جانب قہقہوں کا طوفان امڈ رہا تھا۔ ایک جانب بڑی میز پر تحفوں کا انبار بڑھتا جا رہا تھا۔ دوسری جانب بزرگ مہمانوں کی ٹولی خوش گپیوں میں مصروف تھی اور ایک طرف ناجیہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ شرارتوں اور اچھل کود میں مگن تھی۔ محمود حسین بیٹی کی سالگرہ کی مبارکباد وصول کرتے ہوئے ہال کے درمیان میں آئے تو شائستہ بیگم اچانک سامنے آگئیں۔

• "بیٹی کی سالگرہ مبارک ہو محمود ——" شائستہ بیگم نے جو محمود حسین کے رشتے کی بہن تھیں اور کوٹھی کی اکسی (ANNEXE) میں اپنے بیٹے فراز کے ساتھ ہوگی کے دن پورے کر رہی تھیں محمود حسین کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا "خدا تمہیں ناجیہ کی ایسی ہزاروں لاکھوں خوشیاں دیکھنی نصیب کرے۔"

"آپ کو بھی مبارک ہو آپا —— فراز کہاں ہے، نظر نہیں آرہا؟"

"یہیں کہیں ہوگا —— امی جان کہاں ہیں؟"

"کیا مطلب ——؟" محمود حسین نے چونک کر شائستہ بیگم کو دیکھا "کیا ایک کٹتے وقت آپ موجود نہیں تھیں؟"

"نہیں ——" شائستہ بیگم نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا "مجھے فراز کو تیار کرانے میں ذرا دیر ہوگئی تھی۔"

"امی حضور اپنے کمرے میں ہیں" محمود حسین بولے "طبیعت ناساز ہے اس لئے کیک کی رسم پوری کر کے وہ واپس چلی گئی تھیں۔"

"میں اُن کو مبارک باد دے کر آتی ہوں۔"

شائستہ بیگم اپنا غرارہ سنبھالتی اندر چلی گئیں تو محمود حسین مہمانوں کی آؤ بھگت میں مصروف ہوگئے۔ شمسہ بیگم دوسری عورتوں میں گھری بیٹھی تھیں۔

رات گئے مہمان ایک ایک کر کے واپس ہوئے تو شمسہ بیگم تھک کر چُور ہو چکی تھیں، ملازم سامان سمیٹنے میں مصروف تھے۔ شمسہ بیگم دن بھر کی تکان کے باوجود ملازموں کا ہاتھ بٹا رہی تھیں، شائستہ بیگم بھی اُن کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ محمود حسین باہر مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد اندر آئے تو اُن کی نگاہوں میں بھی نیند کا خمار موجود تھا۔ بُری طرح تھکے تھکے نظر آرہے تھے، بیوی کے پاس آکر جما ہی لیتے ہوئے بولے،

"میرا خیال ہے کہ اب آرام کیا جائے، باقی کام صبح ہو جائیں گے۔"

"آپ چل کر لباس تبدیل کریں، میں ملازموں کو چند ایک ہدایتیں دے کر ابھی آتی ہوں" شمسہ بیگم نے شوہر کی تکان کو محسوس کرتے ہوئے بہت پیار سے کہا۔

"تم بھی جا کر آرام کرو شمسہ" شائستہ بیگم نے دونوں کی گفتگو سُن کر قریب آتے ہوئے کہا "صبح سے پھرکی کی طرح کام میں جُتی ہوئی ہو، تھک کر چُور ہوگئی ہوگی۔ محمود کو صبح کچہری جانا ہے۔ بے آرام ہوں گے تو کیا خاک مقدمہ لڑ سکیں گے؟"

"تھوڑا سا کام باقی رہ گیا ہے آپا، ابھی نپٹ جائے تو ذہن سے بوجھ اُتر جائے گا ورنہ آپ تو ملازموں کی عادت سے واقف ہی ہیں۔"

"تم فکر مت کرو، میں جو موجود ہوں، جاؤ، تم دونوں جا کر آرام کرو۔"

شائستہ بیگم نے اس بار پیار اور حکم کا ملا جُلا انداز اختیار کیا تو شمسہ بیگم جانے کے لئے آمادہ ہوگئیں۔ بڑی میز پر تحفوں کا انبار ابھی تک موجود تھا۔

"آپا —— ذرا ان تحفوں کا خیال رکھئے گا" شمسہ بیگم نے مدھم آواز میں کہا۔

"تم پریشان مت ہو، میں جانے سے پہلے ہال کو باہر سے مقفل کرنا نہیں بھولوں گی ——"

"ناجیہ کہاں ہے ——؟" محمود حسین نے اُجاڑ ہال کی بے سروسامانی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی تو یہیں تھی —— میرا خیال ہے اپنے کمرے میں چلی گئی ہوگی" شمسہ بیگم نے جواب دیا۔

"آپا ——" محمود حسین نے بہن کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا "وہ آپ کا ننھا بھونڈو فراز کہاں ہے؟"

"میں ایک گھنٹہ پیشتر ہی اُسے جا کر سُلا آئی تھی" شائستہ بیگم نے بھائی کے لاڈ پر مسکراتے ہوئے کہا "تم تو جانتے ہو کہ وہ نیند کے معاملے میں کس قدر کچا ہے، یہاں بیٹھے ہی بیٹھے سو گیا تھا۔"

"خدا اس کو نظرِ بد سے بچائے، بڑا ہی پیارا اور نیک بچہ ہے" شمسہ بیگم بولیں

"اسی لئے تو میں اُسے پیار میں بھونڈو کہتا ہوں —— ایک دن صاحبزادے بڑی سنجیدگی سے مجھ سے بھونڈو کا مطلب پوچھ رہے تھے" محمود حسین نے دوبارہ جما ہی لی، نیند کے مارے اُن کا بُرا حال ہو رہا تھا اس لئے شائستہ بیگم کو خدا حافظ کہا پھر بیوی کے ساتھ اپنی خواب گاہ میں آگئے، راہداری سے گزرتے ہوئے انھوں نے ناجیہ کے کمرے میں بھی جھانکا اور یہ دیکھ کر مطمئن ہوگئے کہ ناجیہ اپنے بستر پر بے سُدھ پڑی سو رہی تھی۔

محمود حسین بیوی کے ساتھ چلے گئے تو شائستہ بیگم نے بقیہ کاموں کو نپٹانے کا چارج سنبھال لیا اور ملازموں کا ہاتھ بٹانے میں مصروف ہوگئیں، آج اُن کو رہ رہ کر شوہر کی جُدائی کا خیال آرہا تھا —— دس گیارہ مہینے پہلے ہی کی تو بات تھی جب ہوگی کے غم نے اُن کے دروازے پر دستک دی تھی اور وہ مشیتِ ایزدی کے اس اچانک فیصلے پر ہکا بکا رہ گئی تھیں۔ چند ساعتوں کے اندر اُن کی مانگ کی افشاں یوں راستے کی دھول بن جائے گی یہ بات تو شائستہ بیگم نے کبھی بھول کر بھی نہ سوچی تھی۔

شائستہ بیگم کے ٹوٹے ہوئے دل اور منتشر ذہن پر اس منحوس گھڑی کا ایک ایک لمحہ جیسے نقش ہو کر رہ گیا تھا، اس روز صبح ہی سے اُن کی آنکھ پھڑپھڑا رہی تھی۔ اُن کے شوہر نیاز احمد کمرشل پائلٹ تھے۔ ہوا کے دوش پر دیو ہیکل جہازوں کو اُڑاتے اُنھیں آٹھ سال بیت گئے تھے، کمپنی کے تمام بڑے افسران نیاز احمد کے وسیع تجربے اور مہارت کے قائل تھے اور خاص پروازوں پر ہمیشہ اُن ہی کو تعینات کیا جاتا تھا۔ اس روز بھی وہ ایک خاص پرواز پر جا رہے تھے لباس تبدیل کر کے وہ فراز کو گود میں لئے بیوی کے قریب آئے تو شائستہ بیگم کی آنکھوں کے گوشے نمناک ہوگئے، دل اچانک اس زور سے دھڑکا جیسے پہلو کو چیر کر جسم کی قید سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جانے کا آرزومند ہو۔

"خیریت تو ہے ——" نیاز احمد نے بیوی کے چہرے کے تغیر کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا "آج آپ خلافِ توقع کچھ اُداس نظر آرہی ہیں؟"

"ایک بات کہوں —— آپ میرا مذاق تو نہیں اُڑائیں گے؟" شائستہ بیگم نے دل کی بے قرار دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"میں صرف آہنی اور بھاری بھرکم جہاز اُڑانے کا عادی ہوں شائستہ بیگم، بھلا آپ کا مذاق کیسے اڑا سکتا ہوں؟" نیاز احمد شوخی سے بولے۔

"ایسے نہیں، پہلے وعدہ کیجئے کہ جو کچھ میں کہوں گی آپ بلا کسی حیل وحجت کے مان جائیں گے؟"

"میری پرواز میں صرف ڈیڑھ گھنٹہ باقی رہ گیا ہے" نیاز احمد نے دستی گھڑی پر نظر ڈال کر وقت کا حساب کرتے ہوئے کہا "مجھے بیس منٹ کے اندر اندر ایئرپورٹ پہنچ کر ڈیوٹی رپورٹ کرنی ہے۔"

"ایک چھوٹی سی درخواست ہے میری" شائستہ بیگم نے دبی زبان میں کہا "آج آپ ڈیوٹی پر نہ جائیں۔"

"ڈیوٹی پر نہ جاؤں —— میں سمجھا نہیں، آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟"

"آج —— آج صبح سے میری الٹی آنکھ بار بار پھڑک رہی ہے، یہ اچھا شگون نہیں ہوتا۔"

"یہ سب فرسودہ اور روایتی باتیں ہیں بیگم" نیاز احمد نے فراز کو چوم کر گود سے اتارتے ہوئے کہا "چلئے جلدی سے اپنے خوبصورت اور نازک ہونٹوں پر وہی جذباتی سا الوداعی تبسم سجا لیجئے جس کی حدت پرواز کے دوران مجھے زندگی کا احساس دلاتی رہتی ہے۔"

"صرف آج آپ میری بات ——"

"پلیز شائستہ —— ڈونٹ بی سلی (DON'T BE SILLY)" نیاز احمد نے بیوی کی بات کو ہنسی میں اڑاتے ہوئے کہا "صرف آٹھ گھنٹے کی تو بات ہے، میں مغرب سے پہلے دوبارہ آپ کے پاس موجود ہوں گا اور پھر ——"

"میں آپ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر آئس کریم کھانے چلوں گا" فراز نے جلدی سے جملہ مکمل کر دیا۔

"اوہ نو فراز ——" نیاز احمد نے بڑی خوشی سے بیوی کو گھورتے ہوئے بیٹے سے کہا "آئس کریم کھانے سے جذبات سرد پڑ جاتے ہیں اور میں ....."

"کچھ شرم کیجئے ——" شائستہ نے تیزی سے شوہر کو ٹوک دیا' بات کچھ ایسی ہی تھی کہ شرم سے اُس کا پسینہ بھی سُرخ ہوگیا' حیا کی سُرخی لطیف بادلوں کی طرح اُن کے پورے وجود پر چھانے لگی تو لجا کر بولیں "فراز اب بچہ تو نہیں ہے' آٹھ سال کا ہوگیا ہے"

"بڑا ہوکر میں بھی جہاز اُڑایا کروں گا —— ہے نا پاپا" فراز نے بڑی معصومیت سے باپ سے کہا۔

"فی الحال تو آپنے میری بات اُڑا دی ہے" نیاز احمد نے جھک کر ننھے فراز کے نرم گالوں کو چوما' پھر بیوی کو بازوؤں سے تھام کر دبی زبان میں شرارت بھرے انداز میں بولے —— "میری واپسی کے بعد کے پروگرام کی تبدیلی نوٹ کر لیجئے' پہلے فراز کو آئس کریم کھلانے لے چلیں گے اور اس کے بعد....."

"اس کے بعد آپ بھی اچھے بچوں کی طرح بستر پر لیٹ کر نندی نندی کریں گے" شائستہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ تو آنے والا وقت بتائے گا کہ کیا ہوگا" نیاز احمد نے شوخی سے کہا پھر بیوی کو خدا حافظ کرتے ہوئے اپنی ڈیوٹی پر چلے گئے۔

شائستہ بیگم اس روز سارا دن پریشان پریشان سی رہیں' خدا خدا کر کے مغرب کا وقت ہوا تو اُن کی بے چینی بڑھ گئی پھر باہر دروازے پر ہوائی کمپنی کی گاڑی کے مانوس ہارن کی آواز سُنائی دی تو شائستہ بیگم کا دل اُچھل کر حلق میں آگیا' وہ خوش خوش ننگے ہی پیروں بھاگتی ہوئی ڈیوڑھی میں آگئیں' دروازے کی جھری سے باہر نظر ڈالی تو دل دھک سے رہ گیا' دروازے کی دوسری سمت نیاز احمد کے بجائے اُن کا ایک دوست کیپٹن فرخ موجود تھا۔ شائستہ بیگم کے دل کی دھڑکنیں یکلخت تیز ہوگئیں' فرخ اس سے پہلے بھی متعدد بار نیاز احمد کے ساتھ اُس کے گھر آچکے تھے لیکن آج —— آج کی بات کچھ اور تھی —— آج تو اُسے صرف اور صرف نیاز احمد کی واپسی کا بڑی شدّت سے انتظار تھا —— پھر —— فرخ کیوں آئے تھے —— اور وہ بھی تنہا —— تنہا اور اُداس اُداس —— شائستہ نے دیوانگی کے عالم میں دروازے کے دونوں پٹ کھول دیئے۔

"فرخ ——" وہ چیخ اٹھی "تمہارے دوست کہاں ہیں ——؟"

"بھابی —— وہ —— میرا دوست اتنی بلندیوں پر پرواز کر گیا ہے کہ اب ----؟"

"نہیں —— نہیں' نہیں" وہ فرخ کا گریبان تھام کر پاگلوں کی طرح چیخنے لگی "تم جھوٹے ہو —— دروغ گوئی سے کام لے رہے ہو —— فراز مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتے —— وہ —— وہ مجھ سے وعدہ کر کے گئے تھے کہ واپس آکر فراز کو آئس کریم کھلانے لے چلیں گے —— وہ مجھ سے' اپنی شائستہ سے جھوٹا وعدہ نہیں کر سکتے —— بولو جواب دو' کہاں ہے میرا سہاگ —— کہاں ہیں میرے آنگن کی خوشیاں ——؟"

فرخ خاموش کھڑے رہے' شائستہ بیگم دیوانوں کی طرح شوہر کو یاد کرتی رہیں اور دھاڑیں مار مار کر روتی رہیں۔ انھیں اتنا ہوش بھی نہیں تھا کہ قریب کھڑے ہوئے معصوم فراز ہی کو ایک نظر دیکھ لیتیں جو ہکا بکا کھڑا ماں کی چیخ و پکار کی وجہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا —— وہ دونوں ہاتھوں سے سینہ کوبی کر رہی تھیں' چیخ چیخ کر شوہر کو آوازیں دے رہی تھیں' پھر اُن کی ہمت جواب دینے لگی' اُن کی آنکھوں کے نیچے تاریکی کے لہریئے کوندنے لگے' وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکیں' اگر کیپٹن فرخ نے سہارا نہ دیا ہوتا تو بیہوش ہوکر فرش پر اوندھے منہ اُلٹ جاتیں۔

شائستہ بیگم کو دوبارہ ہوش آیا تو اُن کی خوشیاں روٹھ کر بہت دُور جا چکی تھیں' حسرتیں یاماں ہوکر رہ گئی تھیں' ارمان دل کے نہاں خانوں میں گھٹ گھٹ کر دم توڑ چکے تھے۔ انھوں نے مزید بین کرنے کے بجائے اپنے آنسوؤں کو پی لیا' انھیں زندہ رہنا تھا —— اپنے لئے نہیں بلکہ فراز کے لئے ——

فراز —— جو اُن کی خوشیوں کی آخری سہارا تھا۔
فراز —— جو اُن کے سہاگ کی واحد اور زندہ نشانی تھا۔
فراز —— جس کی معصوم اور شوخ باتوں نے اُن کی بیوگی کے غم کو بھلا دیا۔
فراز —— جسے قدرت کی ستم ظریفیوں نے نشیب میں دھکیل دیا تھا۔
باپ کے سائے سے محروم کر کے اُس کے مستقبل کو ڈھلمل یقین کر دیا تھا۔

چھ ماہ تک شائستہ بیگم فراز کو سینے سے لگائے اسی گھر کے در و دیوار میں جو کمپنی کی جانب سے اُن کے شوہر کو ملا تھا پھرا رہیں' گھر چھوڑنے کا نوٹس مل گیا' کمپنی کی طرف سے جو رعایت ملی تھی اُس کی مدت ختم ہو چکی تھی البتہ مرحوم نیاز احمد کی خدمات کے عوض شائستہ بیگم کو خاصی معقول رقم ملی تھی اور فراز کی تعلیم کے اخراجات بھی دیئے گئے تھے۔

شائستہ بیگم نے ملنے والی رقم کو بینک میں محفوظ کر دیا' شوہر کی موت کے بعد اگر اُن کے دل کو کوئی دوسرا دھچکا لگا تو وہ اس گھر کی دلبر جھیڑنے کا تھا جہاں اُن کے سہاگ کی خوشیوں کی نہ جانے کتنی ان گنت یادیں وابستہ تھیں۔ اس دلبر کو عبور کرتے وقت اُن کے وجود پر لگے زخموں کی کھرنڈ ایک بار پھر اکھڑ گئی' زخم دوبارہ —— ہرے ہوگئے لیکن شائستہ بیگم نے نوشتۂ تقدیر کے آگے سر جھکا دیا —— اور صوفیہ خاتون اور محمود حسین کے بے حد اصرار پر ان کی کوٹھی کی انکسی میں آگئیں۔

ہر چند کہ شائستہ بیگم محمود حسین کی دُور پرے کی بہن تھیں لیکن محمود حسین انھیں سگی بہن کی طرح پیار کرتے تھے' صوفیہ خاتون کے رویّے نے بھی کبھی شائستہ بیگم کو اپنوں یا پرایوں کا احساس نہیں ہونے دیا بلکہ انھوں نے تو یہاں تک اصرار کیا تھا کہ شائستہ بیگم کوٹھی کے ایک حصے میں ہی رہیں لیکن شائستہ بیگم نے اُن کی اس پیشکش کو نہایت خوبصورتی سے ٹال کر اپنے اور فراز کے لئے انکسی کا انتخاب کیا تھا۔

فضائی کمپنی نے جو رقم نیاز احمد کی خدمات اور ملازمت کے صلے میں دی تھی وہ کچھ دنوں تک بینک میں پڑی رہی پھر محمود حسین اور صوفیہ خاتون کے باہمی مشورے پر شائستہ بیگم نے اس رقم سے ایک چھوٹا سا مکان خرید کر اُسے کرائے پر دے دیا جس سے ماہانہ آمدنی کا ایک معقول ذریعہ پیدا ہوگیا۔ فراز کی پڑھائی کے تمام اخراجات کمپنی برداشت کر رہی تھی' رہا گھر کے دیگر اخراجات کا مسئلہ تو وہ صوفیہ خاتون نے اپنے ذمّہ لے لیا تھا' شائستہ بیگم نے اس سلسلے میں زبان کھولنی چاہی لیکن صوفیہ خاتون کے اٹل فیصلے کے آگے اُن کی ایک نہ چلی' چار و ناچار انھیں سر تسلیم خم کرنا پڑا۔

محمود حسین اور شائستہ بیگم میں دُور رہنے کے باوجود بے حد خلوص و محبت تھی' محمود حسین نیاز احمد کی زندگی میں بھی ہفتے میں کم از کم دو بار شائستہ بیگم سے ملنے ضرور جاتے' عمر میں وہ چھوٹے تھے اس لئے شائستہ بیگم کا ادب بھی کرتے تھے لیکن ان تمام ادب و لحاظ کے باوجود وہ ایک دوسرے کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے' دونوں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے اس لئے بھی ایک دوسرے نے باہمی میل و محبت سے بھائی اور بہن کی کمی کو دُور کر لیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے رازدار بھی تھے' محمود حسین چونکہ ماں کے سامنے زبان کھولنے سے گھبراتے تھے اس لئے جب کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو شائستہ بیگم کو وکیل بنا کر آگے کر دیا کرتے' اگر شائستہ بیگم کو کوئی دشواری پیش آتی تو محمود حسین اُسے دُور کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے۔

محمود حسین اور شمسہ بیگم کی شادی میں شائستہ بیگم نے نہایت اہم کردار ادا کیا تھا' محمود حسین اس شادی پر رضامند نہیں تھے' شمسہ بیگم نہ صرف یہ کہ اُن کی قریبی عزیز دار تھیں بلکہ محمود حسین انھیں بارہا دیکھ بھی چکے تھے' شادی سے قبل دونوں ایک دوسرے سے بخوبی واقف اور بے تکلف بھی تھے' صورت اور سیرت' رنگ و روپ اور ناک نقشے کے اعتبار سے بھی شمسہ بیگم محمود حسین کو پسند تھیں لیکن وہ ان تمام خوبیوں کے باوجود شادی پر آمادہ نہیں تھے' ماں کے اچانک فیصلے نے انھیں بوکھلا دیا تھا' بیرسٹری کی ڈگری لے کر انھوں نے ابھی پردیس سے واپس آکر گھر کی دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ صوفیہ خاتون نے اُن پر شادی کرنے کا حکم صادر فرما دیا' محمود حسین کو ماں کا یہ اچانک فیصلہ پسند نہیں آیا' وہ بالغ تھے تعلیم یافتہ تھے' اپنی شادی کے سلسلے میں انھوں نے بھی کچھ معیار طے کر رکھے تھے' لندن سے واپسی کے دوران انھوں نے سوچا تھا کہ پہلی فرصت میں ماں کے سامنے اس اہم موضوع پر گفتگو کا موقع نکال کر دل کی تمام بات کہہ ڈالیں گے وہ زندگی کے طویل سفر میں کسی بے بسی اور گھٹن کا شکار نہیں ہونا چاہتے تھے۔ جب سے انھوں نے ہوش سنبھالا تھا کبھی ماں کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کی تھی' ماں کے ہر فیصلے کے آگے سرنگوں ہوگئے تھے اسی لئے انھیں مکمل یقین تھا کہ اہم شادی کے سلسلے میں صوفیہ خاتون اُن کی باتوں کو ضرور تسلیم کر لیں گی لیکن جب ماں نے شمسہ بیگم کے حق میں اپنا اچانک اور آخری فیصلہ سُنایا تو وہ گھٹن کے احساس سے اندر ہی اندر جھلس کر رہ گئے۔ ماں کے سامنے وہ مہر بلب رہے لیکن اسی روز انھوں نے شائستہ بیگم سے مل کر کھلے الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اگر ماں نے شادی کے معاملے میں اپنے فیصلے میں لچک

پیدا نہ کی تو وہ مجبوراً گھر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔

شائستہ بیگم نے محمود حسین کو سمجھانے بجھانے کی بہتیری کوشش کی، انھیں اس بات کا بخوبی علم تھا کہ اگر حالات نزاکت کا علم صوفیہ خاتون کو ہو گیا تو قیامت آجائے گی، ایک طرف تو وہ محمود حسین کو نشیب و فراز سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتیں، دوسری طرف صوفیہ خاتون کی ہاں میں ہاں ملاتی رہتیں اور دبی زبان میں یہ بھی کہہ گزرتیں کہ شادی بیاہ کے معاملے میں اس قدر جلدی بھی مناسب نہیں، محمود جوان ہیں، تازہ تازہ ولایت سے واپس لوٹے ہیں اس لئے انھیں بھی سوچنے سمجھنے کا موقع دیا جائے لیکن صوفیہ خاتون نے اس دلیل کو ہر بار بیک جنبش زباں رد کر دیا تھا۔

محمود حسین کے پاس فرار کا کوئی دوسرا ذریعہ باقی نہ رہا تو وہ کچھ دنوں کے لئے لاہور چلے گئے، اس منزل کی تلاش میں سرگرداں و پریشاں رہے جو اُن کے ذہن و قلب کو سکون فراہم کر سکتی، اس گوہر کی جستجو میں مارے مارے پھرتے رہے جس کے تصور نے انھیں ماں کے خلاف بغاوت پر اکسا دیا تھا لیکن اُن کے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے، وہ جہاں جہاں گئے مایوسی اُن کے آڑے آتی رہی، تلاش بسیار کے باوجود وہ ذہن کا کھویا ہوا سکون اور خوابوں کی زندہ تعبیر نہ پا سکے تو بے نیل و مرام تھک ہار کر واپس کراچی آگئے اور ماں کی ضد کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ صوفیہ خاتون ان دنوں علیل تھیں وہ اپنی خوشیوں کی خاطر ماں کی آرزوؤں کو روندنے کی ہمت نہ کر سکے۔

شائستہ بیگم نے محمود حسین کی شادی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ـــــ شمسہ بیگم بہو بن کر صوفیہ خاتون کے گھر میں آئیں تو اُن کی ممتا کی تڑپ کو جیسے قرار آگیا۔ محمود حسین ہرچند کہ اس شادی پر دل سے تیار نہ تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اُن کے خیالات میں بھی تبدیلی آتی گئی شمسہ بیگم نے جس انداز میں شب و روز ایک کر کے محمود حسین کی خدمت کی اُس نے بھی اپنا اثر دکھایا اور رفتہ رفتہ محمود حسین ماضی کی باتوں کو یکسر فراموش کر کے بیوی اور بیٹی کی محبت میں گم ہو گئے۔ دن بھر وہ گھر سے باہر ہوتے تو مقدمے کی فائلوں میں کھوئے رہتے۔ گھر میں قدم رکھتے تو شمسہ بیگم کی بلا زوال محبت اور ناجیہ کی میٹھی میٹھی باتوں میں گم ہو کر سب کچھ بھول جاتے۔

ناجیہ جہاں اپنے ماں باپ اور دادی کی روح کی ٹھنڈک اور آنکھوں کا تارا تھی وہاں شائستہ بیگم کی نگاہوں کا مرکز بھی تھی، انھوں نے روزِ اوّل ہی سے ناجیہ کو اپنے فراز کے لئے پسند کر لیا تھا، وہ چاہتی تھیں کہ کسی مناسب موقع پر سب کی موجودگی میں اپنا دستِ سوال دراز کر کے ناجیہ کو فراز کے لئے مانگ لیں، انھیں یقین تھا کہ صوفیہ خاتون یا محمود حسین اُن کی درخواست کو رد نہیں کریں گے لیکن قدرت نے اُن کی حسرتوں کو دل کے دل میں پامال کر دیا، منٹوں میں اچانک موت نے اُن کے حالات بدل دیئے اور پھر قسمت نے انھیں اُسی گھر کی دہلیز پر لا ڈالا جہاں سے روشنی کی ایک معصوم کرن لے کر وہ اپنے گھر کو منوّر کرنے کی خواہشمند تھیں ـــــ اور

اس وقت بھی جب کوٹھی کے تمام ملازمین سالگرہ کی تقریب کے سبب بکھرے ہوئے سامان کو سمیٹ رہے تھے وہ اپنے خیالوں میں گم تھیں، بڑی حسرت سے سوچ رہی تھیں۔ کیا ناجیہ اُن کے فراز کو مل سکے گی؟ کیا اُن کے خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکیں گے؟

سرسبز لان پر کلپٹس کی چھاؤں تلے گلاب کی کیاریوں کے قریب بیٹھی وہ عاشی کے ساتھ کھیلنے میں مگن تھی۔ بے شمار قیمتی کھلونے اُس کے اردگرد بکھرے نظر آرہے تھے۔

صبح اُٹھتے ہی اُس نے سالگرہ کے تحفوں کی جانچ پڑتال شروع کر دی تھی، سینکڑوں ڈبے، پیکٹ اور پارسل موجود تھے۔ وہ ان تحفوں کو کھولتے کھولتے تھک سی گئی، ایک بار تو وہ تلملا کر رہ گئی۔ اُس کے جی میں آئی کہ تمام پیکٹوں کو اُٹھا کر باہر سڑک پر پھینک آئے ـــــ کیا مصیبت تھی، مہمانوں نے تحفے کیا دیئے تھے جیسے بڑا احسان کیا تھا ـــــ اللہ توبہ ـــــ اکثر تحفوں کو تو دیکھ کر اس کی جان ہی جل گئی، بڑا سا پارسل پیکٹ دیکھ کر اُس نے سوچا تھا کہ اس کے اندر بیٹری سے چلنے والی پولیس کی موٹر گاڑی ہوگی، ویسی ہی جیسی اُس کی پڑوس کی سہیلی فرحت کے پاس تھی، جسے وہ پیار سے فرحی کہا کرتی تھی، فرحی کے پاپا وہ گاڑی باہر سے لائے تھے، بس بیٹری کا کمال تھا سارا، بٹن دبا کر چھوڑ دو، باقی کام وہ خود ہی کر لیا کرتی تھی، راستے میں کوئی رکاوٹ آجاتی تو کیسا شور مچاتی پھر از خود وہ اپنا رُخ موڑ کر

دوبارہ صاف راستے پر چل پڑتی، ناجیہ نے اسی گاڑی کے تصور میں اس پیکٹ کو جلدی جلدی کھول ڈالا، اندر ڈھیر ساری رنگ برنگی ردی بھری ہوئی تھی، اُس نے ساری ردی نکال کر دیز اور اُجلے قالین پر بکھیر دی پھر یکلخت اُس کا چہرہ غصّے کی شدّت سے تپ کر گلنار ہو گیا۔

اتنے بڑے اور خوبصورت بنڈل کے اندر سے پلاسٹک کا ہوا نکلا تھا جس کے منہ میں دودھ کی بوتل لگی ہوئی تھی، چند لمحوں تک وہ غصّے سے ہوے کو گھورتی رہی، اگر ہوے کی جگہ کوئی نازک اور خوبصورت سی گڑیا نکلتی تو شاید وہ برداشت کر لیتی لیکن ذرا سی چڑھی ہوئی ننگ دھڑنگ ہوا دیکھ کر وہ اپنی بھبھلاہٹ کو کسی طور برداشت نہ کر سکی۔

"ہونہہ۔ زہر لگ رہے ہو" وہ تلملا کر بولی پھر اُس نے ہوے کو پوری طاقت سے دیوار سے کھینچ مارا، ہوے کی بوتل اُس کے منہ سے چھوٹی تو اندر لگی ہوئی نازک سی مشین سے رونے اور ہچکنے کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ ناجیہ نے پلٹ کر اُسے دیکھا، ہوے کی چیخ و پکار کو سن کر اُسے بڑی مسرّت ہوئی تھی، وہ ہچکیاں لے لے کر مستقل رو رہا تھا۔ سسکیاں بھر رہا تھا، دودھ کی ننھی بوتل اُس کے قریب ہی پڑی تھی، ناجیہ نے ٹھوکر مار کر بوتل کو اُس سے اور دُور کر دیا، اُس کے رونے پر مسکراتی رہی پھر اس کا پارہ اچانک چڑھ گیا، ابھی اسے کتنے ڈھیر سارے پیکٹ اور کھولنے تھے، ہوے کے ناپسندیدہ وجود میں اُلجھ کر وہ اپنا قیمتی وقت ضائع کر رہی تھی، نفرت سے منہ موڑ کر وہ دوبارہ میز کی جانب پلٹی اور دوسرے تحفوں کو کھولنے لگی۔ ہوے کے اندر لگی خودکار مشین سے برابر ہچکیوں اور سسکیوں کے ساتھ پھوٹ پھوٹ کر اور ہِلک ہِلک کر رونے کی آواز بلند ہو رہی تھی، ناجیہ کچھ دیر تک برداشت کرتی رہی پھر وہ جھلا کر پلٹی اور اس وقت تک ہوے کو پیروں تلے کچلتی رہی ـــــ روندتی رہی جب تک اُس نے رونا بند نہیں کر دیا۔

تحفوں کو کھولتے کھولتے اُسے دو گھنٹے ہو گئے، ماں نے ناشتے کے لئے بُلایا تو وہ مجبوراً دو چار لقمے کھا کر واپس آگئی، اُس کا بس چلتا تو اس دن وہ اسکول بھی نہ جاتی، رات کی تقریب کے ہنگاموں اور تحفوں کے انبار نے اُسے کتنا تھکا دیا تھا لیکن باپ کے خوف سے وہ مجبوراً یونیفارم پہن کر تیار ہو گئی۔

سارا دن اسکول میں بھی اس کا جی ذرا نہ لگا ـــــ تصوّر میں خوبصورت، نازک اور قیمتی کھلونے رقص کرتے رہے، جو کھلونے اس کے معیار پر پورے نہ اُترے انھیں اُس نے بڑی حقارت سے ایک طرف پھینک دیا تھا، کچھ کھلونے گوارا تھے جنھیں ناجیہ نے کچھ سوچ کر ایک بڑے سے گتے کے ڈبے میں رکھ دیئے تھے۔

شام کو اسکول سے گھر واپس لوٹی تو بستہ پھینک کر وہ پھر اپنے کھلونوں کی طرف جانے کے لئے لپکی لیکن ماں کی آواز سُن کر رک گئی۔

"کیا وحشت ہے ناجیہ ـــــ کہاں بھاگی جا رہی ہو؟"

"امّی ـــــ وہ، میرے کھلونے۔۔۔"

"کھلونے کہیں بھاگے تو نہیں جا رہے" شمسہ بیگم نے سرزنش کی "چلو، پہلے لباس تبدیل کرو، منہ ہاتھ دھو کر تھوڑا سا ناشتہ کر لو پھر جا کر آرام سے کھیلنا"

"ہونہہ ـــــ" اُس نے منہ پھیر کر دبی زبان میں کہا۔ پیر فرش پر مارتی ہوئی اپنی خواب گاہ میں چلی گئی۔

منہ ہاتھ دھو کر لباس تبدیل کر کے وہ ڈائننگ ہال میں میز پر آئی تو شائستہ بیگم کے ساتھ محمود حسین بھی موجود تھے، آج وہ خلافِ توقع جلدی آگئے تھے ورنہ عام طور پر تو چراغ جلے ہی اُن کی واپسی ہوتی تھی، ناجیہ کو اپنے کھلونوں سے ایک پل کی بھی دوری منظور نہیں تھی، شاید اس لئے کہ ابھی وہ نئے نئے تھے۔ بہرحال ماں کے حکم پر وہ ناشتے کی میز پر آگئی لیکن ناراض ناراض سی تھی۔

"کیا بات ہے بھئی ـــــ آج میری چاند سی گڑیا کچھ تھکی تھکی سی نظر آرہی ہے؟" محمود حسین نے بیٹی کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

"خاک ـــــ" شائستہ بیگم سر جھٹک کر بولیں "لاڈلی بیگم ناراض ہیں"

"ناراض ہے ـــــ کیوں؟"

"میں نے جو یہ کہہ دیا کہ پہلے منہ ہاتھ دھو کر لباس تبدیل کرو، ناشتہ کرو پھر کھیلنا" شائستہ بیگم نے ناجیہ کو خفگی سے تکتے ہوئے کہا "بس اتنی سی بات پر پھول کر بیٹھ گئی ہیں"

ناجیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ سنجیدہ سی بیٹھی ناشتہ کرتی رہی، یوں جیسے وہ ان باتوں پر دھیان دینا بھی ضروری نہیں سمجھتی تھی جو اُس کے متعلق ہو رہی تھیں۔

"ناجیہ بیٹی ——" محمود حسین نے بیوی کو بات درگزر کرنے کے لئے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے ناجیہ کو بڑے لاڈ سے مخاطب کیا۔

"جی ——" ناجیہ نے نظریں اُٹھا کر باپ کی جانب دیکھا، اُس کی معصوم اور خوبصورت آنکھوں میں بلا کی معصومیت تھی، بچپنا تھا، مریم کا تقدس جھلکتا تھا، پاکیزگی اور بھولپن تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ بے بسی کا احساس بھی موجود تھا۔

"میری بیٹی نے اپنے تحفے دیکھے —— کیسے تھے، پسند بھی آئے یا نہیں؟"

"اچھے تھے ——" ناجیہ نے بڑا مختصر سا جواب دیا۔

"ارے ہاں —— تحفوں میں پیاری پیاری مٹی سی گڑیاں بھی تھیں یا نہیں؟" محمود حسین نے بیٹی کو خوش کرنے کی خاطر لہک کر سوال کیا۔

"بہت ساری ہیں ——" اس بار بھی ناجیہ کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا۔

شمسہ بیگم کنکھیوں سے بیٹی کو دیکھ کر اندر ہی اندر جھلس رہی تھیں، انھیں علم تھا کہ دادی کے بے جا لاڈ پیار اور جائز و ناجائز ہر ضد پر حمایت نے ناجیہ کے معصوم اور کچے ذہن کو بگاڑ دیا ہے لیکن وہ مجبور تھیں —— ساس کے سامنے زبان کھولنا اُن کے اختیار کی بات نہیں تھی۔

"کیا خیال ہے ناجیہ بیٹے ——" محمود حسین نے کچھ سوچتے ہوئے ذرا رازداری سے بیٹی سے پوچھا "آج رات سمندر کے کنارے گھومنے نہ چلا جائے"

"سچ پپا ——" ناجیہ ایک دم ہی تازہ گلاب کے مانند کھل اٹھی۔

"آج تمہارے چنداماما کی بھی تو چودھویں تاریخ ہے"

"ایمان سے۔ پھر تو مزہ ہی آجائے گا" وہ خوشی سے تالی بجاتے ہوئے بولی "میں چاند کی روشنی میں ساحل پر سیپیاں بھی تلاش کروں گی، گھونگے تو میں نے ڈھیر سارے جمع کر لئے ہیں"

"ہمیں تو تم نے دکھایا ہی نہیں ——"

"آپ کو فرصت کہاں ملتی ہے" ناجیہ نے معصوم شکایت کی

"مجھے بھی ساتھ لے چلو گی یا صرف تم اور تمہارے لاڈلے پپا ہی جائیں گے" شمسہ بیگم نے اپنی جھلاہٹ کو بچی کی معصومیت پر قربان کرتے ہوئے پوچھا۔

"امی کو لے چلیں —— کیوں پپا؟" ناجیہ نے ماں کو پیار سے دیکھ کر اتراتے ہوئے کہا۔

"تمہارا کیا مشورہ ہے؟" محمود حسین نے کہنی کے بل ناجیہ کی طرف جھکتے ہوئے مدھم آواز میں دریافت کیا۔

"ضرور لے چلیں گے" وہ پُرزور الفاظ میں ماں کی حمایت کرتے ہوئے بولی "امی کے بغیر کیا خاک لطف آئے گا"

"چلو ٹھیک ہے، تم کہتی ہو تو لے چلیں گے"

اور باپ کی شفقت نے ناجیہ کے ذہن پر چھائی ہوئی ساری دُھند ختم کر دی، ناشتے سے فارغ ہو کر وہ باہر لان پر آگئی، پہلے اُس نے فری کو بلا کر اُس کے ساتھ کھیلنے کا ارادہ کیا تھا لیکن وہ کہیں گئی ہوئی تھی، اس لئے وہ مالی کے کوارٹر کی طرف جا کر عاشی کو پکلائی، عاشی عمر میں ناجیہ سے تقریباً چار سال بڑی تھی لیکن ناجیہ اُسے اپنے برابر ہی کا سمجھ کر بات کرتی تھی۔

"عاشی —— تم نے دیکھا کتنے ڈھیر سارے کھلونے میرے پاس جمع ہو گئے ہیں" اُس نے سبزے پر بکھرے

ہوئے کھلونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اب تو الماری میں اتنی جگہ بھی نہیں ہے کہ ان سب کو سجا سکوں —— میں پپا سے کہہ کر ایک اور خوبصورت سی الماری منگا لوں گی"

"بڑے پیارے اور خوبصورت کھلونے ہیں" عاشی نے کھلونوں کے انبار پر ایک نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

"اور قیمتی بھی تو ہیں ——" ناجیہ نے بڑی شان سے گردن ہلاتے ہوئے کہا "تمہارے ابو کی تو اتنی تنخواہ بھی نہ ہو گی جتنی بیٹ ایک کھلونے کی قیمت ہے"

"مجھے تو ان باتوں کا کوئی اندازہ نہیں ہے ناجیہ" عاشی نہایت سادگی سے بولی "کیا قیمت ہو گی ان کھلونوں کی؟"

"قیمت ——" ناجیہ نے اپنی نازک نازک انگلیوں سے بڑی بوڑھیوں کی طرح بالوں کو کھجلا کر اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا "یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم"

عاشی کو ناجیہ کی بات پر ہنسی آگئی، ناجیہ بھی مسکرا دی پھر دونوں کھلونوں سے کھیلنے لگیں۔ اچانک ناجیہ کو کچھ یاد آگیا، اُس نے وہیں بیٹھے بیٹھے بلند آواز میں شرفو کو پکارا —— شرفو اوپر کے کام کرنے کے لئے ملازم رکھا گیا تھا۔ چودہ پندرہ برس کا لڑکا تھا لیکن اپنی ذمہ داریوں کو بڑی دیانتداری سے پوری کرتا تھا، بھاگ بھاگ کر اس طرح کام کرتا جیسے اُس کے جسم کے اندر بجلی بھری ہو، ناجیہ چونکہ گھر بھر کی لاڈلی تھی اس لئے شرفو اس کے کام بڑی احتیاط اور نفاست سے کرتا تھا۔ ناجیہ کی دوسری ہی آواز پر وہ تیر کی طرح اڑتا ہوا اُس کے قریب آگیا۔

"سنو، میرے کمرے کے باہر ریک پر گتے کا ایک ڈبہ رکھا ہوا ہے، اُسے اُٹھا لاؤ"

"ابھی لایا چھوٹی بی بی" شرفو نے بڑی سعادتمندی سے کہا پھر پلٹ کر سرپٹ دوڑتا ہوا اندر چلا گیا، دوسرے ہی لمحے وہ گتے کا ڈبہ لئے دوبارہ ناجیہ کے قریب موجود تھا۔

"اسے نیچے رکھ دو اور جا کر اپنا کام کرو"

ناجیہ نے قدرے تلخ لہجے میں کہا تو شرفو کے چہرے کے کھلے کھلے نقوش یکلخت مرجھا سے گئے۔ سہمے ہوئے انداز میں اُس نے ڈبہ بڑی احتیاط سے سنبھال کر سبزے پر رکھا پھر پلٹ کر تھکے تھکے انداز میں واپس چلا گیا۔ عاشی کو شرفو کے چہرے کی بدلتی کیفیت دیکھ کر دکھ ہوا لیکن وہ چپ ہی رہی، ناجیہ بڑے باپ کی بیٹی تھی اس لئے عاشی نے اُسے ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا، خود اُس کی حیثیت بھی تو اس کوٹھی کے کمینوں کے ملازموں ہی جیسی تھی —— کچھ ہی عرصے میں وہ ناجیہ کی طبیعت سے بھی بڑی حد تک واقف ہو گئی تھی۔ ناجیہ پارے کے اُتار چڑھاؤ سے بھی زیادہ حساس اور تیز تھی۔ ایک پل میں ہنستے ہنستے وہ اپنے لب و لہجے میں شدید کڑواہٹ اور روکھائی پیدا کر لیتی۔ پیار کرتے کرتے حقارت سے منہ بھی پھیر لیا کرتی تھی، بلندیوں اور پستیوں کو پھلانگ جانا اُس کی عادت تھی اسی لئے عاشی ہمیشہ اُس کی پیشانی پر ابھرنے والی سلوٹوں پر نظر رکھتی تھی —— غریب ماحول کی پروردہ تھی اس لئے سرد و گرم کا احساس بھی اُسے ناجیہ کے مقابلے میں بہت زیادہ تھا۔

شرفو چلا گیا تو ناجیہ نے گتے کے ڈبے کو اُٹھا کر سبزے پر پلٹ دیا، ننھے منے، اُجلے صاف اور نئے نئے کئی کھلونے فرش پر بکھر گئے۔ عاشی انھیں غور سے دیکھنے لگی۔ دبی زبان میں پوچھا۔

"یہ سارے بھی تمہیں تحفے میں ملے ہوں گے۔ کیوں ناجیہ؟"

"ہاں ——" وہ بُرا سا منہ بنا کر بولی "کیسے ہیں ——؟"

"بہت پیارے اور اچھے ہیں"

"یہ سب کے سب تم لے لو"

"میں ——؟" عاشی نے حیرت سے پوچھا، وہ ناجیہ کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھی اس لئے گڑبڑا سی گئی۔

"ہاں عاشی —— یہ کھلونے مجھے پسند نہیں آئے" ناجیہ حقارت سے بولی "تمہارا خیال نہ ہوتا تو میں انھیں شرفو سے کہہ کر باہر کوڑے دان میں پھنکوا دیتی"

"نہیں —— ان میں کیا خرابی ہے" عاشی نے بڑی معصومیت سے پوچھا "اچھے بھلے تو ہیں"

"اسی لئے تو تمہیں دے رہی ہوں" ناجیہ کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ اُبھر آئی، عاشی کا مذاق

اڑاتے ہوئے بولی: "تمہارے پاس تو کھیلنے کے لئے کپڑوں کی سڑی بھسی گڑیا بھی نہیں اسی لئے تمہیں اچھے لگ رہے ہیں ـــــ جب جانا تو انھیں ڈبے میں بھر کر ساتھ لے جانا۔"

"شکریہ ناجیہ ـــــ" عاشی نے آہستہ سے کہا۔

"عاشی ـــــ" اچانک ناجیہ نے بڑی معصومیت اور پیار سے عاشی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ "تم نے کبھی گڈے اور گڑیا کا بیاہ رچانے والا کھیل کھیلا ہے؟"

"سنا ہے ـــــ" عاشی نے مسکرا کر جواب دیا "کھیلا کبھی نہیں۔"

"ہم تم گڈے گڑیا کا بیاہ رچائیں گے ـــــ گڈا میرا اور گڑیا تمہاری، کیوں ـــــ ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں ـــــ ٹھیک ہے۔"

"اچھا ایک بات تو بتاؤ ـــــ" ناجیہ نے نہایت ہی بھولپن سے سوال کیا "تم اپنی گڑیا کو جہیز میں کیا دو گی؟"

"جو تم کہو گی ـــــ وہ دوں گی۔" عاشی بڑی سادگی سے بولی۔

"مالی بابا سے کہہ کر منے خوبصورت پھولوں کے گہنے بنوا لینا ـــــ ہے نا، ایمان سے کتنے اچھے لگیں گے۔ کیوں عاشی؟" ناجیہ بڑی اپنائیت سے مسکراتے ہوئے کہا "پھر جب تمہاری گڑیا اور میرے گڈے کی شادی ہو جائے گی تو ہم دونوں ایک دوسرے کے رشتے دار بھی تو بن جائیں گے ـــــ ابھی تو ہم صرف سہیلیاں ہیں نا ـــــ"

"آں ـــــ ہاں۔" عاشی نے سہم کر ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

وہ ناجیہ کے ذہنی اُتار چڑھاؤ اور پل پل بدلتے برتاؤ پر غور کر رہی تھی، ابھی کل رات ہی کی تو بات تھی جب کیک کاٹتے وقت ناجیہ کی نظر اچانک اُس پر پڑی تھی، کس قدر اپنائیت اور خلوص سے وہ اُسے دروازے کے قریب سے کھینچ کر اپنے پاس لے گئی تھی، پھر اُس نے صوفیہ خاتون کے چلے جانے کے بعد عاشی کو اپنی دوسری سہیلیوں سے بھی ملوایا تھا، اپنے ساتھ ساتھ رکھا تھا ـــــ اُس وقت عاشی خود کو کس قدر بلند محسوس کر رہی تھی، بڑا خوش قسمت سمجھ رہی تھی جب ناجیہ نے اپنے برابر کی سہیلیوں کے سامنے اُس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اُسے اپنے ساتھ بٹھایا تھا ـــــ فری تو جیسے جل بھن کر کباب ہو گئی تھی، اُسے اس طرح عاشی کا کھری محفل میں ناجیہ کے قریب بیٹھنا کچھ اچھا نہیں لگا تھا، وہ بُرا سا منہ بنا کر اور غبارے پھوڑ پھوڑ کر اپنا غصہ اتارنے لگی، عاشی نے فری کی تلملاہٹ کو بطور خاص محسوس کیا تھا، پہلی بار اُسے ایک انجانی مسرت کا احساس ہوا تھا ـــــ بڑائی کے ایک غیر مانوس جذبے نے پہلی بار اُس کے معصوم وجود میں انگڑائی لی تھی ـــــ اپنی جیت کے تصور نے اُسے زمین سے اُٹھا کر آسمانوں پر پہنچا دیا تھا۔ کتنی خوش خوش اور سرشار تھی وہ ـــــ بات بات پر ناجیہ کے ساتھ مل جل کر قہقہے بلند کر رہی تھی، برابر سے ہنس بول رہی تھی ـــــ اچھل کود میں حصہ لے رہی تھی اور پھر ـــــ پھر اچانک ہی سب کچھ خواب کی مانند ٹوٹ کر بکھر گیا۔ ناجیہ... ہنستے کھیلتے ہوئے یکلخت اس سے پوچھ بیٹھی،

"عاشی ـــــ تم میرے لئے کیا تحفہ لائی ہو؟"

"میں ـــــ میں ـــــ" عاشی سٹپٹا کر ہکلانے لگی، بڑی مشکل سے بولی "میں تو کوئی تحفہ نہیں لائی۔"

"پھر ـــــ؟ کیا یہاں مفت میں کیک کھا کر اچھلنے کودنے کے لئے آئی ہو؟" ناجیہ نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ "جو تحفہ نہ لا سکے اُسے سالگرہ میں شریک ہونے کا بھی کوئی اختیار نہیں ہوتا ـــــ"

"ناجیہ ـــــ میں تو تمہاری محبت کی خاطر چلی آئی تھی۔" عاشی نے روہانسی ہو کر جواب دیا "میں ـــــ میں تحفہ کہاں سے لا سکتی تھی؟"

"اور ذرا کپڑے تو دیکھو ـــــ" فری کو بولنے کا موقع مل گیا "ایسا لگ رہا ہے جیسے کسی سے اُدھار لے کر پہنے ہیں ـــــ وہ بھی پرانے، بھلا سالگرہ میں کوئی ایسے کپڑے پہن کر آتا ہے۔"

"آؤ فری ـــــ ہم لوگ آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔ ایمان سے بڑا لطف آئے گا۔"

ناجیہ فری کو ساتھ لے کر عاشی کو نفرت سے گھورتی چلی گئی تو عاشی کو ایسا محسوس ہوا جیسے بھرے بازار میں کسی نے بلاوجہ اُس کے گالوں پر بھرپور طمانچے مار دیئے ہوں ـــــ اُس کی معصوم آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی جھلملانے لگے، اُس نے ناجیہ کو دوسری سکھیوں کے ساتھ کھیلتے دیکھا تو دل مسوس کر رہ گئی، چپکے سے پلٹی اور جھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی اپنے کوارٹر میں واپس آ گئی۔

رات بھر ناجیہ کی بے رخی اُسے پریشان کرتی رہی اور ـــــ اس وقت وہی ناجیہ گڈے گڑیا کی شادی رچا کر اُس کے ساتھ عزیز داری قائم کرنے کی بات کر رہی تھی، دھوپ چھاؤں جیسا یہ برتاؤ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ سہم کر رہ گئی۔

"کیا بات ہے عاشی ـــــ تم کیا سوچ رہی ہو؟" ناجیہ نے بڑی سادگی سے کہا۔ "کیا تمہیں میرے گڈے سے اپنی گڑیا کی شادی.....؟"

"نہیں نہیں ناجیہ ـــــ" عاشی جلدی سے بول پڑی "ایسی بات نہیں ہے، میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ تمہارا گڈا میری گڑیا کو پسند بھی کرے گا یا نہیں۔"

"یہ بات تو سوچنے کی ہے۔" ناجیہ نے بڑی بوڑھیوں جیسے انداز میں ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر کہا پھر مسکرا کر بولی۔ "میں اپنے گڈے کو سمجھانے کی کوشش کروں گی ـــــ ہاں اگر وہ نہ مانا تو تمہاری گڑیا کی قسمت ـــــ میں اپنے گڈے راجہ کے ساتھ زبردستی تو کبھی نہیں کروں گی۔"

"اور اگر میری گڑیا نے تمہارے گڈے کو ناپسند کر دیا تو ـــــ؟" عاشی نے معصومیت سے ایک نیا مسئلہ کھڑا کیا تو ناجیہ اُسے حیرت سے تکتی رہ گئی، یوں جیسے اُسے عاشی سے اتنی جرأت کی اُمید نہ تھی، چند لمحے وہ عاشی کو گھورتی رہی پھر غصے سے بولی،

"تمہاری گڑیا کی کیا مجال ہے جو میرے گڈے کو ناپسند کرے ـــــ چٹیا پکڑ کر اپنی کوٹھی سے باہر نہ نکال دوں گی، پپا سے کہہ کر جیل کی سزا کرا دوں گی ـــــ بڑی آئیں کہیں سے گڑیا کی اماں بن کر ـــــ ہونہہ۔"

"تم بُرا مان گئیں ناجیہ ـــــ میں تو مذاق کر رہی تھی۔" عاشی نے ایک دم سہم کر کہا۔

"میں ایسا مذاق پسند نہیں کرتی۔" ناجیہ بدستور خفگی سے بولی

"لیکن ـــــ لیکن میرے پاس گڑیا ہے کہاں؟" عاشی نے معاً ایک حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ارے ہاں ـــــ" ناجیہ بڑے بھولپن سے چونکتے ہوئے بولی "یہ تو میں بھول ہی گئی تھی کہ تمہارے پاس کوئی گڑیا نہیں ہے۔"

"جب گڑیا نہیں ہے تو پھر گڈے گڑیا کی شادی بھی نہیں ہو سکے گی۔" عاشی نے بات ختم کرنے کی خاطر مسکرا کر جواب دیا۔

"نہیں ـــــ شادی ضرور ہو گی، یہ میرا فیصلہ ہے۔" ناجیہ نے تیزی سے کہا پھر اپنے کھلونوں میں سے سب سے قیمتی اور خوبصورت گڑیا اٹھا کر عاشی کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی "یہ لو ـــــ یہ آج سے تمہاری گڑیا ہے۔"

"ناجیہ ـــــ" عاشی گڑیا لیتے ہچکچا رہی تھی۔

"عاشی ـــــ کیا تم میری بہن نہیں ہو؟ میری پیاری سی سہیلی نہیں ہو؟ ـــــ اگر تم نے گڑیا لینے سے انکار کیا تو میں روٹھ جاؤں گی ـــــ" ناجیہ کے لہجے میں بلا کی اپنائیت تھی، پیار تھا، خلوص تھا۔

عاشی نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھا کر گڑیا کو احتیاط سے لے کر سینے سے لگایا تو ناجیہ اُٹھ کر بے اختیار عاشی سے لپٹ گئی، بھولپن سے بولی "آج سے میں تم سے کبھی نہیں لڑوں گی، ہم دونوں اچھی سہیلیوں کی طرح ساتھ ساتھ کھیلیں گے۔"

"ہاں ـــــ" عاشی دلی زبان میں بولی، اُس کی پلکوں کے گوشے ناجیہ کے پیار کی ٹھنڈک سے بھیگنے لگے۔

"مجھ سے کوئی بھول ہو جایا کرے تو معاف کر دیا کرو ـــــ تم مجھ سے بڑی بھی تو ہو۔" ناجیہ کے لہجے میں مریم کا تقدس، حوروں کی سادگی جھلک رہی تھی۔

"ناجیہ ـــــ میری گڑیا۔"

عاشی نے پلاسٹک کی گڑیا کو سینے پر ایک سمت رکھ کر بے اختیار ہاتھ بڑھا کر ناجیہ کو اپنے کشادہ سینے کی وسعتوں میں چھپا لیا، اُس کی دراز و راز پلکوں پر خوشی کے شبنمی موتی جھلملا اٹھے۔ اس کا ننھا سا دل ان جانے اور معصوم جذبوں سے

دھڑکنے لگا، معصوم اور پاکیزہ جذبوں کا سا خوبصورت اور حسین ملاپ دیکھ کر فضا بھی جھوم جھوم اٹھی۔ آسمان پر اودے بادلوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بھی رقص کرتی ہوئی ایک دوسرے میں گڈمڈ ہونے لگیں۔ ہوا کے تیز جھونکوں نے اٹھلا کر گلاب کے پودوں کو سوتے سے بیدار کیا تو فضا بھی مہک اٹھی ـــــ یوکلپٹس کا درخت بھی مست ہو کر ہوا کے دوش پر جھومنے لگا، کسی بہکے ہوئے مست شرابی کی طرح۔

"عاشی ـــــ" ناجیہ نے اچانک عاشی کی بانہوں سے نکلتے ہوئے کہا "آؤ ـــــ جھولا جھولتے ہیں"

"چلو ـــــ"

عاشی تیزی سے اُٹھ کر ناجیہ کے ساتھ ہولی ـــــ مغرب میں غروب ہوتے ہوئے سورج کی الوداعی کرنیں بھی بلند درختوں کی اوٹ سے جھانک جھانک کر دو معصوم دلوں کے پیار پر نچھاور ہو رہی تھیں ـــــ!!

شوہر کی موت کے بعد سے صوفیہ خاتون نے خود کو دنیا کے تمام ہنگاموں سے دُور کر کے محض اپنی خواب گاہ تک محدود کر لیا تھا۔ احمد حسین کی موت نے اُن کے دل و دماغ پر بڑا گہرا اثر ڈالا اور اسی صدمے نے انھیں ہر چیز سے بے نیاز کر دیا تھا لیکن اب بھی اُن کی پیشانی پر اُبھرنے والی ایک معمولی سی شکن دوسروں کو خوفزدہ کر دینے کے لئے کافی تھی۔

صوفیہ خاتون نے برسوں جس سر بلندی اور آن بان سے گھر پر راج کیا تھا اُس کے نقش ہر چند کہ زندگی کے ہم سفر کے جُدا ہو جانے سے کمزور پڑ گئے تھے لیکن اتنے دھندلائے بھی نہیں تھے کہ کچھ کے دوسرے لیکن اُن کے کسی حکم کی خلاف ورزی کر سکتے یا اُن کی ناراضی مول لینے کی جسارت کر سکتے ـــــ صوفیہ خاتون کا رعب و دبدبہ اُن کے بڑھاپے کے باوجود برقرار تھا۔

احمد حسین کی موت، وقت کے تغیر اور کچھ اندرونی ریشہ دوانیوں نے مل جل کر صوفیہ خاتون کے ذہن کو بُری طرح متاثر کیا ـــــ مگر انھوں نے حالات کے آگے سرنگوں ہونا نہیں سیکھا تھا ـــــ وہ خود بوڑھی ہو گئی تھیں لیکن اُن کے حوصلے اب بھی جوان تھے ـــــ اُن کے قویٰ وقت کے ساتھ ساتھ جواب دیتے جا رہے تھے لیکن اُن کی پلکوں کی ایک جنبش ابھی تک گھر والوں کے لئے حکم کا درجہ رکھتی تھی ـــــ محمود حسین کو خدا نے اُن کی حیثیت سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر نوازا تھا لیکن وہ بھی ماں کے سامنے نظریں اٹھانے سے گریز کرتے تھے ـــــ شمسہ بیگم کو اتنی جرأت کبھی نہیں ہوئی تھی کہ ساس کو سلام کرتے وقت اُن کی نگاہوں سے نگاہیں چار کر سکیں، اس گھر کی بہو وہ... صوفیہ خاتون ہی کی بدولت بنی تھیں اور یوں بھی صوفیہ خاتون چونکہ عمر اور رشتے کی نوعیت کے اعتبار سے اُن سے بڑی تھیں اس لئے بھی شمسہ بیگم اُن کا بے حد ادب کرتی تھیں۔ انھیں اس بات کا بھی بخوبی علم تھا کہ صوفیہ خاتون اُن کی بیٹی ناجیہ کو کس قدر چاہتی ہیں اور اُن کی اسی چاہت اور لاڈ و پیار نے ناجیہ کو سرکش بنا دیا تھا۔

معالجوں نے صوفیہ خاتون کو اُن کے بڑھاپے اور بیماریوں کے پیشِ نظر بارہا یہ مشورہ دیا کہ وہ خود کو تفکرات سے بے نیاز رکھیں اور تبدیلِ آب و ہوا کی غرض سے چند مہینوں کے لئے کسی پہاڑی مقام پر چلی جائیں، محمود حسین کو ماں کا سایہ بے حد عزیز تھا اس لئے انھوں نے بھی کئی بار انھیں معالجوں کے مشوروں پر عمل کرنے کے لئے کہا لیکن صوفیہ خاتون نے ہر بار خوبصورتی سے اُن کے اصرار کو رد کر دیا اس لئے کہ

ناجیہ اُن کی زندگی تھی۔
ناجیہ کی محبت اُن کے زخموں کے لئے تریاق تھی۔
زخم ـــــ جو شوہر کی موت نے اُن کے وجود کو عطا کئے تھے۔
وقت نے ان زخموں کو گھاؤ کی شکل دی تھی ـــــ اور
حالات نے اس گھاؤ کو ناسور کر دیا جو اندر ہی اندر پک رہا تھا۔

اگر ناجیہ کی معصوم اور بھولی بھالی باتوں نے انھیں سہارا نہ دیا ہوتا تو وہ نہ جانے کب کی مر گئی ہوتیں۔
ناجیہ کے پیار ہی نے تو ماضی کی تلخیوں کو مٹھاس دی تھی ـــــ پھر
وہ ناجیہ کو جھوڑ کر دُور کیسے جا سکتی تھیں۔

انھیں ناجیہ سے ایک پل کی دُوری بھی منظور نہیں تھی ـــــ اُن کا بس چلتا تو ایک لمحہ کے لئے بھی ناجیہ کو اپنی نگاہوں سے دُور نہ ہونے دیتیں۔

صوفیہ خاتون کو اپنے معالجوں سے زیادہ بہتر طور پر اپنی کیفیت اور بیماری کا اندازہ تھا۔ وقت اور حالات نے اُن کے دل و دماغ کو جو زخم دیئے تھے، چرکے لگائے تھے، وہ ـــــ ڈاکٹروں کے علم میں نہیں تھے، ان باتوں کو تو انھوں نے خود اپنی زبان تک آنے کی اجازت نہیں دی تھی ـــــ اپنے زخمی دل کے نہاں خانوں میں بڑی احتیاط سے چھپا رکھا تھا ـــــ انھیں ایک مناسب وقت کا انتظار تھا اور وہ وقت ناجیہ کے معصوم وجود کی شکل میں اُن کی نگاہوں کے سامنے موجود تھا چنانچہ وہ اس وقت کے ایک ایک لمحے ـــــ ایک ایک ساعت ـــــ اور ـــــ ہر ہر پل کا حساب رکھنا چاہتی تھیں ـــــ وقت کی کسی گردش اور کسی حرکت کو اپنی نگاہوں سے ایک ثانیے کے لئے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتی تھیں ـــــ یہی تو وہ وقت تھا جس کا انھیں برسوں سے انتظار تھا۔

انتظار ـــــ جس نے انھیں وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔
کمزور ـــــ نحیف ـــــ اور لاغر کر دیا تھا۔
اندر اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔
اُن کی ٹھوس شخصیت کے اندر دراڑیں پیدا کر دی تھیں ـــــ اور اب ـــــ
ـــــ اب وہ ناجیہ کو اپنا مناسب سچا سونپ دینا چاہتی تھیں ـــــ اور

اسی مقصد کی خاطر انھوں نے آج اپنے خاندانی وکیل اور مرحوم شوہر کے پُرانے رفیق شریف الدّین کو بُلایا تھا، شروع میں انھوں نے بطورِ خاص تاکید کر رکھی تھی کہ جب تک شریف الدّین اُن کے کمرے میں موجود رہیں کسی اور کو اِدھر آنے کی اجازت نہ دی جائے اور اگر کوئی اُن کی خواب گاہ کی طرف آئے تو فوری طور پر انھیں آگاہ کر دیا جائے۔

کچھ دیر تک وہ شریف الدّین سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں پھر سنجیدگی سے بولیں،

"شریف الدّین صاحب ـــــ آج در اصل میں نے آپ کو ایک خاص مقصد کے لئے یاد کیا ہے"

"اگر میں آپ کے کسی کام آسکا تو یہ میری خوش نصیبی ہوگی" شریف الدّین نے نہایت سعادت مندی سے جواب دیا "فرمائیے ـــــ میرے لئے کیا حکم ہے؟"

"میں اپنا وصیت نامہ لکھوانا چاہتی ہوں" صوفیہ خاتون نے ٹھوس لہجے میں کہا "لیکن اس وصیت نامے کا میری زندگی میں کسی اور کو مطلق علم نہیں ہونا چاہیئے ـــــ یہ میری خاص ہدایت ہے"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر بیگم صاحبہ لیکن کیا گھر کے بیرسٹر کی موجودگی میں یہ مناسب ہوگا کہ وصیت نامہ میں تیار کروں"

"وصیت نامہ ایک قانونی دستاویز کا نام ہے شریف الدّین صاحب" صوفیہ خاتون نے اپنا نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے قدرے تلخ انداز میں کہا "کچھ مصلحتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنھیں قبل از وقت ظاہر کرنا مناسب نہیں ہوتا"

"میں سمجھتا ہوں ـــــ مگر محمود میاں تو آپ کی پیٹ کی اولاد ہیں" شریف الدّین صاحب نے بڑی انکساری سے جواب دیا "میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ کہیں بعد میں اُن کو قلق نہ ہو"

"ٹھیک ہے ـــــ اگر آپ کو وصیت نامہ تیار کرنے میں کوئی عذر ہے تو جانے دیجئے" صوفیہ خاتون کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ بے رُخی کا اظہار کرتے ہوئے بولیں "میں کسی اور وکیل کا بندوبست کر لوں گی"

"بخدا ـــــ آپ میرا مقصد نہیں سمجھ سکیں" شریف الدّین نے پہلو بدلتے ہوئے جلدی سے کہا "میں نے تو یوں ہی دیرینہ تعلقات کے پیشِ نظر ایک بات کہہ دی تھی، آگے آپ کی مرضی، آپ اگر نہیں چاہتیں کہ محمود میاں کو درمیان میں لایا جائے تو یہی، میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی قانونی دستاویز نہایت رازداری اور دیانت داری سے تیار کروں گا"

"وصیت نامہ سیدھا سادہ اور مختصر ہوگا" صوفیہ خاتون نے دروازے کی جانب ایک نظر ڈالی پھر مدھم آواز میں بولیں "میں اپنے نام کی تمام جائیداد منقولہ و غیر منقولہ اپنی پوتی ناجیہ کے نام کرنا چاہتی ہوں، البتہ مہر کے قریب ۱۱ لا

پُرانا مکان شائستہ بیگم بیوہ نیاز احمد کے نام کرنا چاہتی ہوں ــــــ"

شریف الدین نے صوفیہ خاتون کی بات نہایت حیرت سے سُنی پھر یوں اُن کی صورت تکنے لگے جیسے انھیں اُن کی صحیح الدماغی پر شبہے کا گمان ہو رہا ہو ــــــ چند ساعت وہ خاموش رہے پھر دبی زبان میں پوچھا،

"کیا آپ محمود میاں اور اُن کی بیگم کو اُن کے حق سے محروم کرنا چاہتی ہیں؟"

"بات حق یا ناحق کی نہیں ــــــ میرے فیصلے اور اختیار کی ہے" صوفیہ خاتون نے پُروقار لب و لہجے میں تیزی سے کہا پھر کچھ سوچ کر بولیں "ناجیہ بھی کوئی غیر تو نہیں ــــــ جس طرح محمود حسین میرے پیٹ کی اولاد ہیں اسی طرح ناجیہ اُن کی بیٹی ہے، رہا شمسہ کا سوال تو وہ اور محمود الگ الگ نہیں ہیں"

"جیسی آپ کی مرضی ــــــ مگر کیا یہ ضروری ہے کہ صرف ناجیہ ہی محمود میاں کی واحد اولاد ہو۔ کوئی اور بھی ہو سکتی ہے"

"میں ــــــ آپ کا مطلب نہیں سمجھی" صوفیہ خاتون نے حیرت سے شریف الدین کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"میرا اشارہ بہت واضح اور صاف ہے بیگم صاحبہ" شریف الدین وضاحت کرتے ہوئے بولے "ناجیہ کے علاوہ بھی تو محمود میاں کے ہاں کوئی اور اولاد ہو سکتی ہے ــــــ"

"ہو سکتی ہے ــــــ لیکن میں صرف اور صرف ناجیہ کے نام اپنا سب کچھ کرنا چاہتی ہوں" صوفیہ خاتون نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔

"بہتر ہے ــــــ میں دو تین روز میں کچا مسودہ تیار کر کے آپ کو دکھا دوں گا"

"اس بات کا خیال رہے شریف الدین صاحب کہ ہمارے درمیان اس وقت جو گفتگو ہوئی ہے اس کا علم کسی اور کو نہیں ہونا چاہیئے"

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ کوئی بات آپ کے حکم یا مزاج کے خلاف نہیں ہوگی"

شریف الدین چلے گئے تو صوفیہ خاتون نے یوں سکون کا سانس لیا جیسے اُن کے کاندھے سے کوئی وزنی بوجھ اُتر گیا ہو، کچھ دیر تک وہ اپنے خیالوں میں گم خالی خالی نظروں سے چھت کو گھورتی رہیں پھر کچھ سوچ کر انھوں نے شرفو کو آواز دی اور اُسے حکم دیا کہ اسی وقت جا کر شائستہ بیگم کو بلا لائے ــــــ شرفو اُن کے حکم کی تعمیل میں پلٹ کر تیزی سے کمرے سے باہر نکلا تو وہ ایک بار پھر ناجیہ کے بارے میں سوچنے لگیں ــــــ نہ جانے کیوں رہ رہ کر انھیں صبح ہی سے ناجیہ کا خیال بار بار آ رہا تھا۔

گرتی ہوئی صحت اور گزرتے ہوئے وقت نے صوفیہ خاتون کے کچھ خوابوں کو پریشان کر دیا تھا، اگر زندگی اُن کے اختیار میں ہوتی تو وہ اُس وقت تک زندہ رہتیں جب تک ناجیہ کلی سے شگفتہ اور تر و تازہ پھول بن کر کسی دوسرے کے آنگن میں مہکنے کے قابل نہ ہو جاتی، ناجیہ کی پیدائش نے انھیں بے چین کر دیا تھا، ایک خلش تھی جو انھیں کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتی تھی، ایک خوف تھا جو اُن کے وجود کو ہر ساعت تڑپاتا رہتا۔

محمود حسین نے اپنی شادی کے سلسلے میں کھل کر ماں کے روبرو انکار نہیں کیا تھا لیکن صوفیہ خاتون کے سینے میں ایک ماں کا دل تھا جو اولاد کی ناگوار خاموشی کے ڈھکے چھپے مفہوم کو بھی سمجھ سکتا تھا، محمود حسین کی بلا وجہ بتائے ہوئے لاہور روانگی محض یونہی تو نہیں تھی، کوئی وجہ ضرور تھی جو وہ شادی سے کترا رہے تھے ــــــ اُن کی سرکش جوانی نے مغربی تہذیب میں چار سال گزارے تھے اور غالباً اسی تہذیب کے جراثیم اُن کو لپٹ گئے تھے جو وہ اپنی پسند کی شادی کرنے کے خواہشمند تھے لیکن ــــــ صوفیہ خاتون اولاد کی اِس خواہش کے سامنے سپر ہو گئی تھیں، وہ محمود حسین کو کسی قیمت پر من مانی کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھیں اس لئے نہیں کہ انھیں اولاد سے محبت یا پیار نہیں تھا بلکہ اس لئے کہ انھوں نے اپنے اطراف شرافت اور سربلندی کا جو حصار تعمیر کر رکھا تھا وہ اسے برقرار رکھنا چاہتی تھیں، مرحوم شوہر اور اپنے خاندانی وقار کو مجروح ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھیں ــــــ حسب نسب کی مربوط اور مضبوط کڑیوں کے درمیان وہ کوئی جھول برداشت کرنے کو تیار نہیں تھیں ــــــ مخمل کے کپڑے میں ٹاٹ کا کوئی پیوند انھیں کسی قیمت پر منظور نہ تھا، اسی لئے وہ شمسہ بیگم کو بہو بنا کر لے آئی تھیں اور اب ــــــ اب ناجیہ کے احساس نے انھیں پریشان کر رکھا تھا ــــــ

اُن کی خواہش تھی کہ ناجیہ بھی اُن کی نگاہوں کے سامنے جوان ہو اور وہ اُس کی شادی بھی اپنی مرضی کے مطابق کسی ایسے ہی خاندان میں کر سکیں جو اُن کے برابر کا ہو، اُن کا ہم پلہ ہو ــــــ اور ــــــ ان ہی خوابوں کی تکمیل کا تصوّر اُن کے وجود کو اندر ہی اندر سے گھُن کی طرح چاٹے جا رہا تھا ــــــ ہر لمحہ موت کے دہانے کے قریب کر رہا تھا ــــــ!!

"تسلیم عرض کرتی ہوں خالہ جان ــــــ"

شائستہ بیگم کی آواز اُن کے کانوں سے ٹکرائی تو صوفیہ خاتون چونک اٹھیں، یوں جیسے اُن کے خواب اچانک ٹوٹ گئے ہوں اور ان خوابوں کی کرچیاں اُن کے وجود میں گھُستہ بن کر اُتر گئی ہوں، وہ مضطرب ہو کر ہونٹ کاٹنے لگیں احساسات کو اچانک ٹھیس سی لگی تو اُن کی بوڑھی پلکیں بھیگنے لگیں، چہرہ حسرت و یاس کی جیتی جاگتی تصویر بن گیا۔

"خیریت تو ہے خالہ جان" شائستہ بیگم نے اُن کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے بے چینی سے پوچھا "نصیبِ دشمناں، کہیں طبیعت تو خراب نہیں ہو رہی ــــــ؟"

"میرے قریب بیٹھ جاؤ شائستہ" وہ نحیف آواز میں بولیں "مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں"

شائستہ بیگم جلدی سے صوفیہ خاتون کے قریب بیٹھ کر آہستہ آہستہ اُن کے کان سہلانے لگیں۔

"ناجیہ کہاں ہے ــــــ؟" صوفیہ خاتون نے تھوڑے توقف کے بعد سوال کیا۔

"یہیں کہیں گھر میں ہو گی ــــــ بلواؤں ــــــ"

"نہیں ــــــ رہنے دو" صوفیہ خاتون بولیں "یوں ہی پوچھ رہی تھی"

"آپ نے مجھے یاد کیا تھا ــــــ کوئی خاص بات؟"

"شائستہ ــــــ" صوفیہ خاتون نے شائستہ بیگم کو غور سے تکتے ہوئے کہا "خدا گواہ ہے کہ میں نے تمہیں کبھی اپنے پیٹ کی اولاد سے کم نہیں سمجھا، اگر میری کوئی بیٹی ہوتی تو شاید میں اس سے بھی اتنا ہی پیار کرتی جتنا تم سے کرتی ہوں"

"میں جانتی ہوں خالہ جان ــــــ" شائستہ بیگم کے لہجے میں اظہارِ تشکر تھا "خدا آپ کا سایہ ہم سب کے سروں پر تا قیامت رائم و قائم رکھے"

"شائستہ ــــــ آج میں تم سے کچھ مانگنا چاہتی ہوں ــــــ وعدہ کرو کہ مجھے مایوس نہیں کرو گی"

"خالہ جان ــــــ" شائستہ بیگم تڑپ اٹھیں "آپ حکم دیں، آپ کے ایک اشارے پر میں اپنی جان تک قربان کر سکتی ہوں"

"میں ناجیہ کی طرف سے بہت فکر مند ہوں" صوفیہ خاتون تھکے تھکے انداز میں بولیں "محمود نے میری زندگی میں میرے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کی لیکن میری موت کے بعد وہ صاحب اختیار ہوں گے"

"خالہ جان ــــــ یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟" شائستہ بیگم نے تیزی سے کہا "آپ کا مرض لاعلاج تو نہیں۔ ڈاکٹروں کو یقین ہے کہ آپ بہت جلد صحت مند ہو جائیں گی"

"ڈاکٹر اگر مریض کو زندگی کی نوید دیں تو پھر اُن کو مسیحا کون کہے گا" صوفیہ خاتون کے روکھے ہونٹوں پر ایک پھیکا سا تبسم تڑپ کر نڈھال ہو گیا "میرا مسئلہ بڑا مرض میرا بڑھاپا ہے اور ناجیہ کی فکر ہے جو مجھے کسی کروٹ قرار نہیں لینے دیتی"

"ناجیہ کی فکر؟ ــــــ ابھی تو وہ بچی ہے خالہ جان"

"آج بچی ہے لیکن کل جوان ہو جائے گی اور اُس وقت ــــــ" صوفیہ خاتون دل کی بات زبان تک لاتے لاتے خاموش ہو گئیں پھر ایک سرد آہ بھر کر بولیں "شائستہ ــــــ میری خواہش ہے کہ میرے مرنے کے بعد تم ناجیہ کا خیال رکھنا"

"خالہ جان ــــــ آپ ....."

"بات کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کرو" صوفیہ خاتون نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا "اپنی شادی کے موقع پر بھی محمود نے اپنی پسند کو خاندانی روایت اور وقار پر مسلط کرنے کی کوشش کی تھی، مجھے اندیشہ ہے کہ میری آنکھ بند ہو جانے کے بعد وہ بیٹی کو بھی آزاد فضاؤں میں پرواز کرنے کا موقع دیں گے۔ اگر ناجیہ کی شادی خدانخواستہ کسی

ایسے ویسے خاندان میں ہو گئی تو میری روح کو بھی کسی کروٹ چین نصیب نہ ہوگا۔"

"ایسی فال زبان سے کیوں نکالتی ہیں۔" شائستہ بیگم بولیں۔ "خدا شاہد ہے کہ میں ناجیہ کو فراز سے کم نہیں سمجھتی۔ لیکن محمود اور شمسہ کی موجودگی میں بھلا میں کون ہوتی ہوں اس معصوم بچی کی قسمت کا فیصلہ کرنے والی ——— میں تو خود حالات کی ستم ظریفیوں کا شکار ہو کر آپ کے در پر آ پڑی ہوں۔"

"کیا محمود یا شمسہ نے تمہیں کبھی اس بات کا طعنہ دیا ہے؟" صوفیہ خاتون کی تیوری پر اچانک بل آ گئے۔

"جی نہیں ——— مگر حقیقت سے انکار بھی تو نہیں کیا جا سکتا۔" شائستہ بیگم گلوگیر آواز میں بولیں۔ "میں تو اس بات سے ڈرتی ہوں کہ خدانخواستہ آپ کی آنکھ بند ہو گئی تو میرا کہاں ٹھکانا ہوگا۔"

"تم پریشان مت ہو شائستہ، میں نے نہر والا پرانا مکان تمہارے نام کر دیا ہے، تم بلاشرکتِ غیرے اُس کی مالک ہو گی۔"

"خدا آپ کو زندہ سلامت رکھے۔" شائستہ بیگم نے رندھی آواز میں کہا۔ "مجھے آپ کی محبت اور پیار کے سوا اور کچھ نہیں چاہیئے البتہ ایک خواہش تھی جو بڑے عرصے سے میرے سینے میں مچل رہی ہے، میں کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھی لیکن تقدیر نے میرا سہاگ اُجاڑ کر میرے ہونٹوں پر تالے ڈال دیئے۔ برسوں کی آرزو دل کی دل ہی میں رہ گئی۔"

"مجھے بتاؤ شائستہ ———" صوفیہ خاتون نے شائستہ بیگم کو نہایت غور سے گھورتے ہوئے پوچھا "تمہاری کیا خواہش تھی؟"

"دراصل ——— میں ——— اپنے فراز کے لئے ناجیہ کو مانگنا چاہتی تھی مگر.....؟"

شائستہ بیگم اپنا جملہ مکمل نہ کر سکیں، مرحوم شوہر کی یاد نے انھیں تڑپا دیا۔ الفاظ اُن کے حلق سے اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئے، سفید دوپٹے کے پلو سے وہ اپنی آنکھوں میں مچلتے ہوئے آنسوؤں کو خشک کرنے لگیں۔

"دل چھوٹا نہ کرو شائستہ۔" صوفیہ خاتون نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "ہونی کا غم کیا ہوتا ہے، یہ میں بھی جانتی ہوں رہا فراز کا مسئلہ تو وہ ابھی بچہ ہے لیکن اگر بڑا ہو کر وہ نیاز احمد کے نقشِ قدم پر چل نکلے تو پھر ناجیہ کی تقدیر اس کے ساتھ بھی وابستہ کی جا سکتی ہے ——— مگر ابھی اس بات کو چھیڑنا مناسب نہ ہوگا ——— تم وقت کا انتظار کرو، ہاں اگر صحت نے ساتھ دیا اور تقدیر نے تمہاری یاوری کی تو میں کسی وقت موقع محل دیکھ کر اس سلسلے میں محمود اور شمسہ بیگم کا عندیہ معلوم کرنے کی کوشش ضرور کروں گی۔"

"اللہ آپ کو سلامت رکھے۔" شائستہ بیگم نے خوش ہوتے ہوئے کہا پھر دبی زبان میں بولیں۔ "محمود اور شمسہ دونوں آپ کی دل و جان سے عزت کرتے ہیں، آپ اگر اشارہ بھی کر دیں تو میرے فراز کی تقدیر سنور سکتی ہے۔"

صوفیہ خاتون نے کوئی جواب نہیں دیا، اسی وقت کمرے کے باہر راہداری میں کچھ آہٹ ہوئی تو شائستہ بیگم بھی چونک اُٹھیں،

"کون ہے؟" صوفیہ خاتون نے دروازے کی سمت دیکھتے ہوئے بلند آواز میں پوچھا پھر شائستہ بیگم سے بولیں۔ "ذرا دیکھنا تو ——— میرا خیال ہے کہ کوئی باہر راہداری میں ضرور موجود ہے۔"

شائستہ بیگم تیزی سے اٹھیں، لمبے لمبے قدم اٹھاتی کمرے کی دہلیز عبور کر کے آئیں تو دل دھک سے رہ گیا۔ راہداری کی موڑ سے انھوں نے شمسہ بیگم کو گھومتے دیکھ لیا تھا، ایک لمحے میں ساری حقیقت شائستہ بیگم کے ذہن میں واضح ہو گئی ——— اُن کے دل کی دھڑکنیں تیز سے تیز تر ہو رہی تھیں ——— چکراتے ذہن میں آندھیوں کے جھکڑ چلنے لگے ——— وسوسے بیدار ہونے لگے۔

شمسہ بیگم نہ جانے کتنی دیر سے راہداری میں موجود تھیں۔ انھوں نے صوفیہ خاتون اور شائستہ بیگم کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ سُن لیا تھا اور پھر ——— اُلٹے قدموں واپس لوٹ گئیں۔

مگر ——— کیوں؟

———

شمسہ بیگم کے ذہن میں تیز و تند ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ صوفیہ خاتون کے جملے ابھی تک اُن کے دل و دماغ پر ہتھوڑوں کی مانند آہنی ضرب لگا رہے تھے، صدائے بازگشت بن کر گونج رہے تھے۔

انھیں ساس سے ایسی تلخ اور زہریلی باتوں کی توقع نہیں تھی۔ آج تک انھوں نے ساس کی ہر بات کو ہنس کر برداشت کیا تھا، اُن کے سامنے کبھی سر اُٹھانے یا نگاہیں ملا کر گفتگو کرنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ ہمیشہ ہر بات پر سرِ تسلیم خم کر لیا تھا، وہ دل و جان سے اُن سے محبت کرتیں، اُن کی عزت اور تعظیم اپنا فرض سمجھتیں۔ اُن کے ہر اشارے اور ہر جنبشِ پلک کا احترام کرنا اپنا ایمان تصور کرتیں ——— لیکن آج ———

آج حالات کی ایک ہی کروٹ نے اُن کو بہو سے ماں بننے پر مجبور کر دیا، اس لئے کہ وہ ناجیہ کی ماں تھیں۔ نو ماہ تک انھوں نے اس ننھی سی جان کو اپنی کوکھ میں سردو گرم سے محفوظ رکھا، جانے کتنے درد سہے، کتنی کالیف برداشت کیں تب کہیں جا کر اُن کے خوابوں کو قدرت نے ایک تعبیر دی، تصور کو ایک خوبصورت اور معصوم روپ دیا تھا۔

ناجیہ کے لئے ہر ماں کی طرح شمسہ بیگم کے دل میں بھی روزِ اوّل ہی سے ہزاروں معصوم خواہشات نے سر اُبھارنا شروع کر دیا تھا، آرزوؤں اور تمناؤں کا ایک ہجوم وقت کے ساتھ ساتھ ممتا کے بھرے دل میں اپنی جڑیں مضبوط کرتا رہا لیکن ساس کی خوشنودی کی خاطر انھوں نے اپنی خواہشات کو دل کے نہاں خانوں تک محدود کر لیا تھا۔

صوفیہ خاتون کی بے جا حمایت اور بے صلا ڈوپیار نے ناجیہ کے کچے ذہن میں آزادی اور خود مختاری کا تصور بیدار کرنا شروع کر دیا تھا، اُسے ضدی اور خود سر بنا دیا تھا، شمسہ بیگم سب کچھ دیکھتی رہیں، محسوس کرتی رہیں لیکن کبھی زبان سے اُف تک نہ کی۔ اس اُمید پر ہر حجاب کو تھپک تھپک کر لوریاں دیتی رہیں کہ ایک نہ ایک دن ناجیہ کی پرورش کی باگ ڈور مکمل طور پر اُن کے ہاتھ میں ہوگی۔ اس وقت وہ ناجیہ کو اپنی مرضی اور خواہشات کے سانچوں میں ڈھال سکیں گی، ان خوابوں کی تکمیل کر سکیں گی جو ایک مدت سے اُن کے دل میں تڑپ تڑپ کر پروان چڑھ رہے تھے، جب کبھی اُن کے احساسات کو ساس کے کسی عمل سے ٹھیس پہنچتی وہ اپنے دل کو یہ کہہ کر بہلا لیتیں ——— ابھی ناجیہ کی عمر ہی کیا ہے ——— چھ سال کی بچی ہی تو ہے ——— یہی دن تو بچوں کے ہنسنے بولنے، کھیلنے کودنے اور اپنے ناز و نخرے اٹھوانے کے ہوتے ہیں ——— شعور جیسے جیسے بیدار ہوگا سوچ کے زاویے بھی بدلتے جائیں گے ——— نرم ٹہنی کو بس ایک ذرا سنبھالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

وہ اِن ہی سوچوں کے سہارے اپنے دل کو بہلا لیا کرتیں، مگر آج ———

آج صوفیہ خاتون کی باتوں نے شمسہ بیگم کی ممتا پر بڑی کاری ضرب لگائی تھی ——— وہ درد کی شدت سے بلبلا اُٹھیں ——— تڑپ کر رہ گئیں..... کتنے کڑوے اور کس قدر زہریلے تھے وہ الفاظ جو نکلے ہوئے تیر کی مانند کانوں سے گزر کر وجود کی اتھاہ گہرائیوں تک اُترتے چلے گئے تھے ——— کیسے صبر آزما اور اذیتناک تھے وہ لمحے جب انھوں نے اپنے ڈولتے وجود کو لڑکھڑاتے قدموں پر سنبھالا اور ویران راہداری میں گرتے سے سنبھالا تھا۔ دل کی بیقرار دھڑکنوں کو سینے میں سمیٹے وہاں سے اُلٹے قدموں واپس آ گئی تھیں ——— ایک لمحہ وہاں اور ٹھہر جاتیں تو شاید صبر کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک اُٹھتا ——— دل پھٹ کر خون ہو جاتا ——— سینے میں دبی دبی چنگاریاں ایک

ذرا ہوا پا لیتیں تو بھڑک کر شعلے کا رُوپ اختیار کر لیتیں اور پھر ——— پھر سب کچھ جل بھُن کر راکھ ہو جاتا ——— خاکستر ہو جاتا ——— !!

ڈگمگاتے قدموں سے وہ راہداری سے گزر کر اپنی خواب گاہ میں آ گئیں ——— بے سُدھ ہو کر بستر پر گر پڑیں، وقت کی ایک ہی کروٹ، حالات کی ایک ذرا سی گردش نے انھیں کیسا مضطرب اور بے چین کر دیا تھا ——— آج اپنے ہی گھر میں وہ خود کو کس قدر اجنبی اجنبی سا محسوس کر رہی تھیں، در و دیوار جیسے اُن کی نگاہوں کے سامنے ناچتے اور رقص کرتے نظر آ رہے تھے۔

صوفیہ خاتون کے جذبوں نے اُن کے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا ——— اتنا شدید ذہنی جھٹکا پہنچا تھا کہ ابھی تک وہ خود کو سنبھال نہ سکی تھیں ——— دل و دماغ جیسے گنگ ہو کر رہ گیا ہو ——— یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی برف پوش پہاڑ کی بلندیوں کو سر کرتے کرتے اچانک توازن بگڑ جانے سے نشیب کی طرف لڑھک گئی ہوں ——— خود کو سنبھالنے کے لئے ہاتھ پیر مارنے کی سعی کرتی رہیں لیکن ابھی تک خود پر قابو نہ پا سکی تھیں۔ اُلجھے اُلجھے پریشان کُن سوالات بگولوں کی مانند اُن کے ذہن میں اُبھرتے بیٹھے، صدائے بازگشت بن کر گونج رہے تھے۔

آخر ——— انھیں ناجیہ کے حق سے کیوں محروم کیا جا رہا ہے ——— ؟

ممتا کے اُس مقدس اور انمول جذبے کا مذاق کیوں اڑایا جا رہا تھا جس کے آگے دنیا کے تمام جذبے ہیچ ہیں۔ اُن کے صبر و ضبط کو آزمانے کی کوشش کیوں کی جا رہی تھی۔

آخر کیوں ——— ؟

کس لئے ——— ؟

وہ ناجیہ کی ماں تھیں ——— پھر ———

انھیں ناجیہ کے وجود اور اُس کے مستقبل سے کھرچ کر علیحدہ کرنے کی سازش کیوں ہو رہی تھی۔

کیا وہ یہ سب کچھ آسانی سے برداشت کر لیں گی ——— ؟

اُن کا قصور کیا تھا ——— کیا جُرم تھا جس کی اتنی کڑی سزا تجویز کی جا رہی تھی۔

اُنھوں نے ہمیشہ دوسروں کے لئے اچھا سوچا تھا ——— اچھا کیا تھا ———

ہر زخم کو ہنس ہنس کر سہنے اور برداشت کرنے کی عادت ڈال لی تھی ——— لیکن ———

آج شیشے کی وہ دیوار ٹوٹ کر چکنا چور ہو گئی ——— ریزہ ریزہ ہو گئی جو انھوں نے اپنے اور صوفیہ خاتون کے درمیان تعمیر کر رکھی تھی ——— انھیں ان کی وفاؤں اور خاموشی کی اتنی بھاری قیمت ادا کرنی پڑ رہی تھی جو اُن کے اختیار کی بات نہ تھی، پانی سر سے اونچا ہو گیا تھا۔

خواب گاہ کی وحشتناک خاموشی اور سناٹے میں انھیں اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا تو وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑی ہوئیں ——— کھُلی کھُلی آنکھوں میں لہو کا رنگ چھلک رہا تھا، پلکوں پر آنسوؤں کے شبنمی قطرے موتیوں کی طرح جیسے تھم کر ساکت ہو گئے تھے ——— چند لمحے وہ ساکت و جامد اپنی جگہ کسی پتھر کے بے جان بُت کے مانند کھڑی خالی خالی نظروں سے ماحول کی بے کیفی کا اندازہ لگاتی رہیں پھر دوپٹے کے پلّو سے بھیگی آنکھوں کو خشک کرتیں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتیں کمرے سے نکل کر باہر لان پر آ گئیں جہاں پیڑوں کے سائے لمبے ہو کر مغربی سمت پر چڑھنے لگے تھے۔ خنک ہوا کے معطر جھونکوں نے شمسہ بیگم کے ذہن کو قدرے سکون بخشا تو وہ تھکے تھکے انداز میں پھولوں کے کنج کے قریب پڑی آرام کرسی پر بیٹھ گئیں۔ اُنھوں نے نئے سرے سے بدلتے حالات پر غور کرنا شروع کیا۔

شائستہ بیگم اگر صوفیہ خاتون اور محمود حسین کو عزیز تھیں تو شمسہ بیگم بھی ان کی ممنونِ احسان تھیں، محمود حسین اور اُن کی شادی میں شائستہ بیگم نے نہایت نمایاں کردار انجام دیا تھا۔ یوں بھی وہ بے حد مہذب ملنسار اور وضعدار خاتون تھیں، شوہر کی موت نے انھیں ہوگ کا غم دے کر صوفیہ خاتون کی جھولی پر لا ڈالا تھا لیکن اس میں بھی ... شائستہ بیگم کی اپنی مرضی سے زیادہ محمود حسین اور صوفیہ خاتون کے اصرار کو دخل تھا ورنہ شائستہ بیگم نے متعدد بار ڈھکے چھپے لفظوں میں اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ اپنے اُس گھر میں منتقل ہو جائیں جو اُن کی اپنی ملکیت تھی اور جس

کے کرائے سے وہ اپنا اور اپنی معصوم اولاد کا مستقبل سنوارنا چاہتی تھیں۔

صوفیہ خاتون نے یہ بھی چاہا تھا کہ شائستہ بیگم کوٹھی کے ہی ایک حصے میں رہیں لیکن شائستہ بیگم وضعدار خاتون تھیں اس لئے انھوں نے اپنے لئے الگ کا انتخاب کیا تھا، فراز اُن کی زندگی میں روشنی کی واحد کرن تھا جس کے سہارے وہ زندگی گزار رہی تھیں، انھوں نے فراز کو نہایت عمدہ تربیت دی تھی اور بڑے سلیقے سے اُسے پروان چڑھا رہی تھیں

فراز کی عمر ابھی صرف آٹھ سال کی تھی لیکن ماں کی تربیت اور حالات کی ستم ظریفیوں نے اس معصوم کو بھی خاصا سنجیدہ اور کم سخن بنا دیا تھا، اس کا بیشتر وقت درسی کتابوں میں گزرتا، شام کو وہ ماں کے ساتھ سبزے پر آ کر کچھ دیر کھیل لیا کرتا جہاں اکثر ناجیہ اور عاشی بھی موجود ہوتیں لیکن کھیل کود کے دوران بھی وہ ماں کی نگاہوں کے ایک ایک اشارے پر نظر رکھتا اور مشینی انداز میں ماں کے ہر حکم پر عمل کرنا اپنا فرض سمجھتا ——— وہ ذہین بھی تھا اور صورت و شکل کے اعتبار سے خوبصورت بچے جانے کا مستحق بھی۔

شمسہ بیگم کو شائستہ بیگم کے حالات سے گہری ہمدردی تھی، خود صاحبِ اولاد تھیں اس لئے فراز سے بھی وہ ہمیشہ سگی ماں جیسا برتاؤ کرتی تھیں۔ گول مٹول، اُجلے کپڑوں میں ملبوس، سنجیدہ سنجیدہ سا فراز انہیں ہمیشہ بے حد پیارا نظر آتا۔ انھوں نے فراز کو کبھی غیر نہیں سمجھا تھا ہمیشہ گھر کا ایک فرد جانا تھا، اپنوں کی طرح اُسے چاہا تھا پیار کیا تھا لیکن حالات کی ایک ہی کروٹ نے فراز کی معصوم اور بھولی بھالی شخصیت کو اُن کے لئے سوالیہ نشان بنا دیا تھا اس لئے کہ فراز کو شمسہ بیگم کی مرضی اور مشورے کے بغیر ناجیہ کے مستقبل کا ساتھی چنا جا رہا تھا، ہم سفر بنایا جا رہا تھا۔

اگر عام حالات میں صوفیہ خاتون نے شمسہ بیگم سے فراز اور ناجیہ کے مستقبل کے بارے میں بات کی ہوتی تو شاید وہ ساس کے مشورے کو خوشی خوشی منظور کر لیتیں، اس لئے کہ فراز دیکھا بھالا تھا، سیدھا سادھا معصوم سا بچہ تھا، اپنوں میں سے تھا اور شمسہ بیگم کو انسانیت کے ناتے بھی فراز کے مستقبل کا تحفظ عزیز تھا ——— وہ نہایت کشادہ دلی سے فراز کو سینے سے لگانے پر آمادہ ہو جاتیں لیکن ایسا نہیں ہوا تھا ——— اور پھر جو بات شمسہ بیگم کو سب سے زیادہ گراں گزری وہ یہ تھی کہ صوفیہ خاتون نے اُن کے جیتے جی ناجیہ کی نگہداشت شائستہ بیگم کے سپرد کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ ایک ایسا فیصلہ تھا جسے وہ کسی قیمت پر ماننے کو تیار نہ تھیں اور اسی ایک فیصلے نے آج شمسہ بیگم کے دل میں شائستہ بیگم کی طرف سے میل ڈال دیا تھا۔

ہر چند کہ ناجیہ کے مستقبل کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ صوفیہ خاتون نے کہا تھا لیکن شائستہ بیگم کی شخصیت کو بھی قطعی طور پر غیر جانب دار نہیں کہا جا سکتا تھا، اگر انھیں فراز کے لئے ناجیہ کا رشتہ درکار تھا تو وہ شمسہ بیگم کے سامنے بھی اپنی اس دیرینہ آرزو کا اظہار کر سکتی تھیں مگر انھوں نے بھی شمسہ بیگم کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا ——— شاید اس لئے کہ وہ اپنے دگرگوں حالات اور فراز کے مستقبل سے مطمئن نہیں تھیں اس لئے قبل از وقت اپنی زبان کھولنا مناسب نہیں سمجھتی تھیں یا پھر اس لئے کہ وہ براہِ راست صوفیہ خاتون کی ہمدردیاں حاصل کر کے شمسہ بیگم پر فراز اور ناجیہ کے مستقبل کا فیصلہ مسلط کرنا چاہتی تھیں۔

شمسہ بیگم اپنے خیالات میں مستغرق تھیں کہ قدموں کی آہٹ سُنکر چونک اُٹھیں، نظریں گھما کر دیکھا، عاشی روشوں پر نظریں جھکائے چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی اپنے کوارٹر کی طرف جا رہی تھی، کچھ سوچ کر شمسہ بیگم نے آواز دی تو عاشی کے بڑھتے ہوئے قدم بیلخت رک گئے، ٹھٹھک کر اُس نے سہمی ہوئی نظروں سے شمسہ بیگم کو دیکھا پھر گردن جھکائے اُن کے قریب آ گئی۔

"جی ——— بیگم صاحبہ" عاشی کے لہجے میں افلاس جھلک رہا تھا، نظریں سبزے پر مرکوز تھیں۔

"عاشی ———" شمسہ بیگم کا لہجہ اچانک گمبھیر ہو گیا۔ "میری جانب دیکھو ———"

"جی ———" عاشی نے ڈرتے ڈرتے چہرہ اُٹھایا، اُس کی معصوم اور پیاری پیاری آنکھوں میں خوف تھا۔

"تم ناجیہ کے ساتھ کھیلتی ہو ———"

"جی؟ ——" عاشی کا ننھا سا دل دھک سے رہ گیا۔ ڈرتے ڈرتے بولی: "جی ہاں۔"
"ناجیہ تمہیں اپنی سہیلی بھی سمجھتی ہے —— کیوں؟" شمسہ بیگم نے عاشی کو گھورتے ہوئے پوچھا۔
"جی —— جی ہاں۔" عاشی کو اپنا سانس جکڑاتا ہوا محسوس ہونے لگا۔
"ناجیہ اور تم کھڑے لورگڑیا کا بیاہ رچانا چاہتی ہو؟"
"جی ——" عاشی نے سہمے انداز میں مشکل کہا "وہ —— ناجیہ بی بی کہہ رہی تھیں ——"
"تم نے ناجیہ کی سالگرہ میں بھی شرکت کی تھی؟"
"ہاں ——" اُس نے اثبات میں سر کو جنبش دی، حلق خشک خشک ہو رہا تھا۔
"ناجیہ تم سے پیار بھی کرتی ہے ——"
"جی —— جی ہاں۔" عاشی کو اپنی آنکھوں کے نیچے اندھیرے پھیلتے محسوس ہو رہے تھے، دل تھا کہ ڈوبا جا رہا تھا۔
"اور تم مجھے بیگم صاحبہ کہہ کر مخاطب کرتی ہو۔" یکلخت شمسہ بیگم کے لب و لہجے میں دنیا جہاں کی مٹھاس سمٹ آئی، والہانہ انداز میں عاشی کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں: "کیا تم مجھے آنٹی نہیں کہہ سکتیں؟"
"جی —— وہ —— میں ——" عاشی کو جیسے اپنی قوت سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔
"میرے اور قریب آؤ عاشی بیٹی ——" شمسہ بیگم نے بڑی اپنائیت سے کہا۔
"جی ——" عاشی نے ڈرتے ڈرتے قدم آگے بڑھایا۔
"آئندہ سے تم مجھے صرف آنٹی کہو گی۔" شمسہ بیگم نے عاشی کے ملائم اور نرم ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر نہایت محبت سے کہا پھر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے لاڈ سے پوچھا "کیا کہو گی ——؟"
"آ..... آنٹی۔" عاشی نے رُک رُک کر کہا۔
"آؤ میرے پاس بیٹھو —— یہاں، میرے برابر، اس کرسی پر۔" شمسہ بیگم بدستور محبت سے بولیں۔
عاشی نے شمسہ بیگم کے لہجے میں مٹھاس محسوس کی تو اُس کے معصوم دل سے خوف کے بادل جیسے یکلخت چھٹ گئے، آہستہ سے قریب پڑی دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔
"تم پڑھتی بھی ہو ——؟"
"جی ہاں بیگم صاحبہ —— آنٹی۔" عاشی نے جلدی سے بیگم صاحبہ کہتے کہتے آنٹی کہا تو شمسہ بیگم آہستہ سے مسکرا دیں۔
"شاباش بیٹی —— اچھی بچیاں اسی طرح اپنے بزرگوں کا کہنا مانتی ہیں۔"
"بابا نے کہا تھا کہ میں آپ کو ——" وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی، معصوم نظروں سے شمسہ بیگم کو تکنے لگی۔
"میں مالی بابا کو سمجھا دوں گی۔" اُنھوں نے عاشی کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا: "اچھا، تم نے یہ تو بتایا نہیں کہ کس کلاس میں پڑھتی ہو؟"
"دوسری جماعت میں۔" عاشی نے نہایت ادب سے جواب دیا۔
"ناجیہ بھی دوسری کلاس میں ہے، یہ تو اور بھی اچھی بات ہے کہ تم دونوں ایک ہی جماعت میں ہو —— لیکن تمہاری عمر ——؟"
"میں سمجھ گئی آنٹی۔" عاشی نے شمسہ بیگم کی یکلخت خاموشی کا مفہوم بھانپتے ہوئے آہستہ سے کہا: "میری عمر ناجیہ بی بی سے چار سال زیادہ ہے لیکن میرے حالات اس قابل نہیں تھے کہ میں اسکول میں پڑھ سکتی —— بابا مجھے گھر پر ہی پڑھاتے تھے۔"
عاشی کی معصوم باتوں نے شمسہ بیگم کے دل پر بڑا گہرا اثر کیا، اتنی کم عمری میں بھی وہ کس قدر سوجھ بوجھ کی باتیں کر رہی تھی، کتنی معصوم، کتنی حسین اور کس قدر بھولی بھالی سی تھی عاشی، بالکل چینی کی نازک گڑیا جیسی، ہو بہو ناجیہ کی طرح لیکن امارت کے فرق نے ان دونوں کے درمیان بلندیوں اور پستیوں کی خلیج حائل کر دی تھی، وہ پیار بھری نظروں سے عاشی کو دیکھتی رہیں پھر بولیں،
"تم کس اسکول میں پڑھتی ہو؟"

"گورنمنٹ اسکول میں۔" عاشی بولی۔
"عاشی بیٹی ——" شمسہ بیگم تھوڑے توقف سے بولیں: "تم بھی کونونٹ میں داخلہ کیوں نہیں لے لیتیں، اس طرح ناجیہ اور تمہارا ساتھ بھی ہو جائے گا پھر تم دونوں ایک ساتھ بیٹھ کر پڑھا کرنا۔"
"میں نے بابا سے کہا تھا مگر ——" عاشی بولتے بولتے ایک دم چُپ سی ہو گئی۔
"مگر کیا —— مجھے بتاؤ بیٹی، کیا بات ہے؟"
"بابا کہتے ہیں کہ بڑے اسکولوں کی فیس بھی بڑی ہوتی ہے۔" وہ شمسہ بیگم کے لہجے کی مٹھاس سے بیسج کر بولی "پھر بس کا خرچ بھی تو دینا پڑتا ہے۔"
اسی وقت ناجیہ اور فراز آگے پیچھے دوڑتے ہوئے سامنے آئے تو شمسہ بیگم کی توجہ اُن کی طرف مبذول ہو گئی، وہ عاشی سے کہنا چاہتی تھیں کہ وہ اُسے سینٹ لارنس میں داخلہ دلائیں گی، اُس کی تعلیم کے تمام اخراجات خود برداشت کریں گی مگر فراز اور ناجیہ کے آجانے سے وہ دل کی بات زبان تک نہ لا سکیں۔
فراز آگے آگے تھا اور ناجیہ اُسے پکڑنے کے لئے دوڑ رہی تھی، ناجیہ کو فراز کے پیچھے بھاگتا دیکھ کر شمسہ بیگم کی کشادہ پیشانی پر بل آ گئے، چند لمحے تیکھی نظروں سے وہ اس بھاگ دوڑ کو دیکھتی رہیں پھر اونچی آواز میں بیٹی کو مخاطب کیا۔
"ناجیہ —— یہ کیا بدتمیزی ہے، چلو —— ادھر آ کر تمیز سے بیٹھو۔"
ناجیہ ماں کی آواز سن کر رک گئی۔ پہلے اُس نے گھور کر فراز کو دیکھا جو اُس سے تین چار قدم آگے خاموش کھڑا تھا پھر اُس نے ایک نظر عاشی پر ڈالی جو شمسہ بیگم کے قریب بیٹھی تھی۔ ایک لمحے تک وہ اپنی جگہ کھڑی رہی پھر چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی ماں کے قریب جا کر دوسری کرسی پر بیٹھ گئی، چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس وقت اُسے ماں کی دخل اندازی ناگوار خاطر گزری ہے، اُس نے زبان سے کسی بات کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن خاموش مظاہرے سے باز بھی نہ رہ سکی تھی۔
"کیا بات ہے فراز ——" شمسہ بیگم نے خشک لہجے میں فراز کو گھورتے ہوئے کہا: "یہ کیا دھما چوکڑی مچا رکھی تھی؟"
"میں کوئی شرارت نہیں کر رہا تھا مامی جان۔" فراز نے بڑے بھولپن سے کہا پھر ناجیہ کی سمت اشارہ کرتے ہوئے بولا: "یہ ناجیہ مجھے گول مٹول، پھٹا ڈھول کہہ کر چھیڑ رہی تھی اور مجھے مارتی بھی ہے۔"
فراز کی بات پر ناجیہ کے چہرے کے تیور اور تیکھے ہو گئے، اُس نے یوں پلٹ کر فراز کو خفگیں نظروں سے گھورا جیسے کہنا چاہ رہی ہو —— بچو —— امی کے سامنے تم زبان چلا لو، کر لو میری شکایت —— اکیلے میں ملو پھر بتاؤں گی۔
"اچھا —— چلو جا کر اپنا کام کرو۔" شمسہ بیگم نے آج پہلی بار فراز کو جھڑکتے ہوئے کہا —— فراز ناجیہ کو گھورتا اور منہ بسورتا انکسی کی طرف چلا گیا تو انھوں نے بیٹی کو مخاطب کیا: "تم کیوں بلاوجہ اسے چھیڑتی رہتی ہو؟"
ناجیہ نے اس بار بھی کوئی جواب نہیں دیا، ماں کو دیکھ کر نظریں جھکا لیں مگر اُس کی اس معصوم ادا میں بھی سعادتمندی کے مقابلے میں خفگی اور ناراضی کو زیادہ دخل تھا۔
"میں تم سے کچھ کہہ رہی ہوں ناجیہ ——" شمسہ بیگم نے تیز آواز میں بیٹی کو دوبارہ مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "آئندہ سے تم فراز کے ساتھ اس طرح بھاگ دوڑ، اور اچھل کود نہیں کرو گی۔"
"نہیں کروں گی ——" ناجیہ نے روٹھے ہوئے لہجے میں جواب دیا پھر ماں کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے عاشی سے بولی: "آؤ عاشی —— چل کر گڑیا کھیلتے ہیں ——"
"جاؤں آنٹی ——" عاشی نے ڈرتے ڈرتے شمسہ بیگم سے مدھم آواز میں اجازت چاہی تو شمسہ بیگم کا سارا غصہ عاشی کی معصوم ادا دیکھ کر کافور ہو گیا، بڑے پیار سے بولیں۔
"ضرور جاؤ بیٹی ——" اُنھوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا: "تمہیں اور ناجیہ کو ساتھ ساتھ کھیلتے دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی ہے۔"
"لیکن وہ دادی اماں تو منع کرتی ہیں مجھے ....."

"بُری بات ہے ناجیہ۔" شمسہ بیگم نے جلدی سے بیٹی کو ٹوکتے ہوئے کہا "بزرگوں کی بات سُن کر نہ چڑا کرتے ہیں، اسے دوسروں کے سامنے دوہرایا نہیں کرتے ——— سمجھیں؟"

"سمجھ گئی ———" ناجیہ نے شوخی سے عاشی کو دیکھتے ہوئے جواب دیا پھر اٹھی اور عاشی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئی۔

شمسہ بیگم تنہا ہوئیں تو ایک بار پھر اُن کے ذہن میں صوفیہ خاتون اور شائستہ بیگم کے درمیان ہونے والی گفتگو کے جملے صدائے بازگشت بن کر گونجنے لگے ——— !!

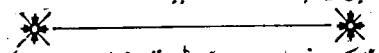

وقت کا پنچھی گردشِ ایام کو اپنے بال و پر میں سمیٹے برق رفتاری سے پرواز کرتا رہا۔

صوفیہ خاتون کی طبیعت دن بدن گرتی جا رہی تھی۔ صبح و شام دونوں وقت ڈاکٹر انھیں دیکھنے آتے، آرام و سکون کا مشورہ دیتے لیکن صوفیہ خاتون بستر پر لیٹے لیٹے بھی اپنے خیالات کی دنیا میں الجھی رہتی تھیں، وہ اپنے پیروں پر چلنے کے قابل نہ تھیں لیکن دل و دماغ برابر کام کر رہے تھے۔

شوہر کی جُدائی کا صدمہ، ناجیہ کے مستقبل کی فکر اور خاندانی آن بان کا خیال انھیں ہر وقت ذہنی طور پر الجھائے رکھتا، عمر کی شام جوں جوں ڈھلتی جا رہی تھی صوفیہ خاتون کے وسوسے اُتنے ہی بڑھتے جا رہے تھے، یہ باتیں طبعی کمزوری سے بھی اُن کے خون میں زہر تھیں لیکن وقت کی نزاکتیں اور حالات کے نشیب و فراز برابر انھیں اُلجھائے رکھتے۔

گزشتہ کئی دنوں سے وہ محسوس کر رہی تھیں کہ بہو اور شائستہ بیگم کے درمیان کوئی اندرونی کشمکش جاری ہے دونوں ایک دوسرے سے کھنچی کھنچی نظر آتی تھیں، صوفیہ خاتون نے اپنے شبہے کو دُور کرنے کی خاطر دونوں کو علیحدہ علیحدہ کریدنے کی کوشش کی لیکن کوئی حتمی نتیجہ نہ اخذ کر سکیں، شائستہ بیگم اس لئے بات کو درگزر کر جاتیں کہ وہ صوفیہ خاتون کو اپنی محسنہ سمجھتی تھیں اور بیماری کی حالت میں اُن کے ذہن کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھیں ——— اور شمسہ بیگم اس وجہ سے مسکرا کر حقیقت سے انحراف کر جاتیں کہ انھوں نے شادی کے بعد سے کبھی بھی ساس کے سامنے زبان کھولنے یا نظریں ملا کر دل کی بات کہہ گزرنے کی جسارت نہیں کی تھی چنانچہ وہ بیماری کی حالت میں ساس کے دکھ کو مزید کوئی صدمہ نہیں پہنچانا چاہتی تھیں۔

لیکن صوفیہ خاتون بچہ نہ تھیں جو باتوں سے بہل جاتیں، نہایت جہاندیدہ اور معاملہ فہم خاتون تھیں، طویل علالت اور سہاگ اُجڑ جانے کے غم نے اُن کے ذہن کو کمزور ضرور کر دیا تھا لیکن نگاہیں اب بھی حالات کے نشیب و فراز کو سمجھنے کی طاقت رکھتی تھیں، وہ دیکھ رہی تھیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ شائستہ اور شمسہ بیگم دونوں اُن کی خدمت و تیمارداری میں شب و روز مصروف رہتی تھیں، اُنھوں نے اپنے فرائض سے ایک ذرا کوتاہی نہیں کی تھی، ابھی تک دونوں اُن کی جنبش پلک اور اشاروں پر عمل کرنے میں پیش پیش تھیں لیکن وہ ایک دوسرے سے صوفیہ خاتون کی موجودگی میں گزر جانے کے موقع کی تلاش میں رہتی تھیں۔ خاص طور پر شمسہ بیگم اس بات کو پسند نہ کرتی تھیں کہ وہ شائستہ بیگم کی موجودگی میں ساس کے کمرے میں ٹھہریں، کوئی نہ کوئی خوبصورت بہانہ تلاش کر کے چلی جاتی تھیں۔

محمود حسین کی مصروفیات میں بھی روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا، ماں کی دعائیں شاملِ حال تھیں اس لئے اُن کی شہرت کا چرچا دُور دُور ہونے لگا تھا، ہر وقت اُن کے دفتر میں مؤکلوں کی بھیڑ رہتی ——— مقدمات کی فائلیں دیکھنے اور عدالت کے روبرو کھڑے ہو کر ٹھوس دلائل دیتے دیتے اُن کا سارا وقت گزر جاتا، سر اُٹھانے کی مہلت بھی نہ ملتی لیکن ماں کی طرف سے وہ کبھی غافل نہیں ہوئے جتنی دیر دفتر میں رہتے بار بار فون پر بیوی سے خیریت دریافت کرتے تھکے ماندے گھر آتے تو بیوی اور بیٹی کو بھی نظر انداز کر کے سب سے پہلے ماں کی خواب گاہ میں جا کر اُن کی خیریت پوچھتے تک ماں کے قدموں میں بیٹھے انھیں دلاسہ دیتے پھر ڈھیر ساری دعائیں لے کر اس وقت اٹھتے جب ماں از خود اٹھ جا کر لباس وغیرہ تبدیل کرنے کا حکم دیتیں۔

آج بھی معمول کے مطابق محمود حسین چراغ جلے گھر لوٹے، چہرے سے تھکن کے گہرے تاثرات صاف عیاں تھے شمسہ بیگم نے حسبِ دستور مسکرا کر شوہر کا خیر مقدم کیا، ناجیہ اپنے کمرے میں بیٹھی ٹیچر سے پڑھ رہی تھی، محمود حسین نے برآمدے

بیوی کے حوالے کیا، کوٹ اتار کر صوفے پر ڈالا، ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی پھر حسبِ عادت گرما گرم چائے کی ایک پیالی کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے ماں کے کمرے کی طرف چلے گئے۔

صوفیہ خاتون نے بیٹے کو دیکھا تو اُن کے چہرے پر ممتا کا پیار اُبھر آیا۔ زرد چہرے پر خوشی کی چمک ایک لمحے کو اُبھر کر منڈھلا گئی، خلافِ معمول آج وہ زیادہ بیمار نظر آ رہی تھیں، محمود حسین سلام کرتے ہوئے ماں کے قریب آ گئے، شائستہ بیگم نے جو وہاں پہلے سے موجود تھیں اشارے سے محمود حسین کو بتایا کہ آج بیمار کی حالت کچھ تشویشناک ہے، محمود حسین تڑپ اُٹھے، ماں کے سامنے چہرے سے کسی غم کا اظہار نہیں ہونے دیا لیکن اندر ہی اندر ——— مضطرب ہو گئے۔ خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"امی حضور ——— اب طبیعت کیسی ہے؟"

"آج کچھ نقاہت کا احساس زیادہ ہو رہا ہے" صوفیہ خاتون نے کمزور آواز میں آہستہ سے کہا

"فکر کی کوئی بات نہیں" محمود حسین ماں کے استخوانی ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلاتے ہوئے بولے "ایک ذرا کمزوری ہے، جاتی رہے گی"

"شاید ———" صوفیہ خاتون ایک سرد آہ بھر کر بولیں پھر چھت کو گھورنے لگیں۔

"کیا بات ہے امی حضور؟" محمود حسین نے ماں کی آنکھوں میں مچلنے والی حسرتوں کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا "کیا سوچ رہی ہیں آپ؟"

"کچھ بھی نہیں ———" صوفیہ خاتون نے جلدی سے کہا، بیٹے کی طرف دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی تو ہونٹ خشک پتوں کی مانند کپکپا کر رہ گئے، ایک بیمار تبسم سوکھے لبوں پر تڑپ کر رہ گیا۔

"امی حضور ——— میں سوچ رہا ہوں کہ پندرہ بیس دنوں کے لئے تمام دفتری امور سے کنارہ کش ہو جاؤں"

محمود حسین نے کچھ سوچتے ہوئے "کام کرتے کرتے اعصاب پر تھکن جم کر رہ گئی ہے، سوچتا ہوں آرام کر لوں"

"مصروفیات زندگی کی علامتیں ہیں، بیٹے" صوفیہ خاتون نحیف آواز میں بولیں "جمود اور ٹھہراؤ انسان کو ناکارہ بنا دیتا ہے"

"ڈاکٹروں نے آپ کو بھی پہاڑ پر جانے کا مشورہ دیا ہے" محمود حسین نے ماں کے جملے کی گہرائی کو ٹالتے ہوئے کہا "آپ کے بہانے میں بھی تبدیلِ آب و ہوا کر لوں گا ——— کیا خیال ہے آپ کا"

"تم سے پہلے شائستہ بھی یہی کہہ رہی تھی لیکن ——— میں آخری وقت میں سب کے سامنے رہنا چاہتی ہوں" صوفیہ خاتون نے درد بھری آواز میں کہا۔

"امی حضور ——— ایسی بُری فال زبان سے کیوں نکالتی ہیں، خدا نے چاہا تو آپ بہت جلد روبصحت ہو جائیں گی" محمود حسین تڑپ کر بولے۔

"یہ سب بہلاوے کی باتیں ہیں ——— جو وقت مقرر ہو چکا ہے اُسے نہ اولاد کی محبت ٹال سکتی ہے نہ ڈاکٹروں کی مسیحائی"

"وہ تو ٹھیک ہے خالہ جان لیکن مایوسی بھی تو گناہ ہے" شائستہ بیگم بولیں "بندے کو ہمیشہ اس کی رحمتوں پر نظر رکھنی چاہیئے"

"تم ———" صوفیہ خاتون نے شائستہ بیگم پر نظر ڈالتے ہوئے آہستہ سے کہا "کچھ دیر کے لئے جا کر آرام کر لو ——— فی الوقت محمود میرے پاس ہیں، اگر کوئی ضرورت درپیش ہوئی تو میں بلوا لوں گی"

شائستہ بیگم کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ ایک لمحے کو بھی وہاں سے ہٹیں لیکن صوفیہ خاتون کی بات ٹالنا بھی انھیں منظور نہیں تھا لہٰذا وہ سر جھکا کر خاموشی سے خواب گاہ سے باہر چلی گئیں۔

"ماحول کی تبدیلی آپ کی صحت پر خوشگوار اثر ڈالے گی امی حضور" محمود حسین نے ماں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے لاڈ سے کہا "اگر آپ کی خواہش ہے کہ سب نظروں کے سامنے رہیں تو ہم سب آپ کے ساتھ چلیں گے"

"مجھے تم سے اسی بات کی توقع تھی لیکن ———" صوفیہ خاتون نے کچھ کہنا چاہا لیکن دل بھر آیا تو یکلخت خاموش

ہوگئیں، پلکوں کے گوشے نمناک ہونے لگے۔

"امی حضور ——" محمود حسین نے بے چین ہو کر کہا "خدارا —— آپ اپنا نہیں تو ہم سب کا خیال رکھیں —— ڈاکٹروں نے آپ کو پُرسکون رہنے کا مشورہ دیا ہے، آپ کو صرف آرام اور سکون کی ضرورت ہے۔"

"ناجیہ کہاں ہے —— بہت دیر سے نظر نہیں آئی" صوفیہ خاتون نے بات کا رُخ بدلتے ہوئے پوچھا۔

"اپنے کمرے میں بیٹھی پڑھ رہی ہے —— بلواؤں؟"

"نہیں —— پڑھنے دو" صوفیہ خاتون نے آہستہ سے کہا پھر کچھ توقف کے بعد بیٹے کو دیکھتے ہوئے بولیں، "مجھے اور کسی کی نہیں —— صرف ناجیہ کے مستقبل کی فکر پریشان کرتی رہتی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں —— ناجیہ کے مستقبل سے آپ کی کیا مراد ہے —— ابھی تو وہ محض چھ سال کی بچی ہے۔"

"میری بڑی آرزو تھی کہ اپنی زندگی میں اپنی آنکھوں سے اس کے مانگ کی افشاں بھی دیکھ لیتی۔"

"وہ وقت بھی انشاء اللہ ضرور آئے گا" محمود حسین نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "خدا نے چاہا تو آپ ہی اپنے مبارک ہاتھوں سے ناجیہ کو دلہن بنا کر رخصت کریں گی ——"

صوفیہ خاتون نے زبان سے کچھ نہ کہا لیکن ناجیہ کے دلہن بننے کے تصور ہی سے اُن کا دل خوشی سے بھر آیا، مسرتوں کے نایاب اور انمول موتی آنسوؤں کی شکل میں پلکوں تک آگئے، خوشی کے ایک معمولی سے احساس ہی سے اُن کے لاغر اور نحیف وجود کو جھنجھوڑ کر بے حال کر دیا، دل کی دھڑکنیں آپ ہی آپ تیز ہونے لگیں، محمود حسین نے ماں کی تکلیف محسوس کی تو مضطرب ہوگئے، جلدی سے بولے

"اگر آپ دل پر بوجھ محسوس کر رہی ہوں تو ڈاکٹر کو بلواؤں؟"

"پریشان مت ہو جانِ مادر —— یہ خوشی کے آنسو ہیں"

"زیادہ خوشی بھی آپ کے لئے نقصان دہ ہے امی حضور" محمود حسین روانی میں بولے "ڈاکٹر نے آپ کو صرف پُرسکون رہنے کی تاکید کی ہے"

"یہ بھی خوب مسیحائی ہے ——" صوفیہ خاتون نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا "خوشی اور سکون کو بھی علیحدہ علیحدہ کیا جا رہا ہے"

"آپ کو سیب کا رس دوں، دل کو ذرا تقویت ہوگی"

"رہنے دو —— میرے پاس بیٹھے رہو، مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں"

"میں تمام رات آپ کے پاس اسی انداز میں بیٹھنے کو تیار ہوں لیکن —— ایک شرط پر —— آپ کوئی تکان بالکل نہیں لیں گی"

"اچھا ——" صوفیہ خاتون نے نحیف آواز میں جواب دیا پھر بولیں "تم نے ناجیہ کے بارے میں کیا سوچا ہے"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ" محمود حسین بچوں جیسے انداز میں بولے "بھلا آپ کے ہوتے ہوئے میں کون ہوتا ہوں ناجیہ کے بارے میں سوچنے والا"

"خدا انہیں ہمیشہ شاد و آباد رکھے لیکن جو کچھ تم نے کہا وہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے"

"یہی تو سوچ رہا ہوں کہ کیا جواب دوں" محمود حسین نے مسکراتے ہوئے شوخ انداز میں کہا "ابھی تو ناجیہ سلیقے سے گڈے اور گڑیا کا بیاہ رچانے کے قابل بھی نہیں ہے اور آپ اس کے مستقبل کی بات کر رہی ہیں"

"تم مرد ہو اس لئے نہیں سمجھ سکتے ورنہ لڑکیوں کے تو پیدا ہوتے ہی ماؤں کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں" صوفیہ خاتون نے ... ایک طویل سانس لے کر کہا "لڑکیاں پرایا دھن ہوتی ہیں میرے چاند اس لئے روزِ اوّل ہی سے ان کی فکر لاحق ہو جاتی ہے —— عین وقت پر تو انسان کچھ نہیں کر سکتا"

"درست فرمایا آپ نے ——" محمود حسین نے ماں کی خوشنودی کی خاطر سنجیدگی اختیار کر لی پھر بڑے بوڑھوں جیسے انداز میں بولے "آپ نے کہا امی حضور تو مجھے یاد آیا کہ لڑکیاں تو لکڑی کی بیل کی طرح بڑھتی ہیں، مجھے اب واقعی سنجیدگی سے ناجیہ کے بارے میں سوچنا پڑے گا اور وہ بھی آپ کے ساتھ سر جوڑ کر"

"مذاق میں بات اُڑانے کی کوشش مت کرو محمود" صوفیہ خاتون نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے بولیں "میں تم سے ناجیہ کے سلسلے میں سنجیدگی سے کچھ کہنا چاہتی ہوں"

"آپ حکم دیں، میں سرتابی کی گستاخی نہیں کروں گا" محمود حسین سچ مچ سنجیدہ ہوگئے۔

"مجھ سے وعدہ کرو کہ تم ناجیہ کی شادی کسی ایسے گھرانے میں نہیں کرو گے جو ہم سے کم تر درجے کا ہو"

"انسان کے درمیان یہ درجہ بندیاں خدا نے نہیں خود انسان نے بنائی ہیں امی حضور" محمود حسین یکلخت جذباتی ہوگئے پھر ماں کے خیال سے فوراً ہی خود پر قابو پاتے ہوئے کہا "خدا کی نظروں میں سب برابر ہیں"

"ہاں۔ لیکن انسان کو دنیاداری کے لئے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر ——" محمود حسین نے نہایت سعادت مندی سے جواب دیا "میں وعدہ کرتا ہوں کہ ناجیہ کی شادی کسی اچھے اور اونچے خاندان میں کروں گا ——"

"اور —— اونچے کی شادی اس کی اپنی مرضی سے نہیں —— تمہاری پسند سے ہوگی"

صوفیہ خاتون کی نحیف آواز میں نہ جانے وہ کون سی تلوار کی کاٹ تھی کہ محمود حسین ایک لمحے کو تڑپ کر رہ گئے، ایک نظر بھر کر ماں کو دیکھا پھر جلدی سے نگاہیں نیچی کر لیں۔

"میں نے تم سے کچھ کہا ہے محمود"

"میں نے سُن لیا امی حضور" محمود حسین نے قدرے بجھی ہوئی آواز میں جواب دیا "ناجیہ کی شادی بھی اس کے ماں باپ کی پسند سے ہوگی"

"ایک بات پوچھوں ——" صوفیہ خاتون نے بیٹے کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"میں حاضر ہوں امی حضور ——"

"کیا تمہیں میری بات سے کوئی صدمہ، کوئی دُکھ پہنچا ہے؟"

"جی ——" محمود حسین ایک ثانیے کو رُکے پھر جلدی سے کہا "جی نہیں ——"

صوفیہ خاتون بیٹے کے چہرے کے تاثرات کو بغور دیکھ رہی تھیں۔ خواب گاہ میں کچھ دیر تک سوگوار سی سنجیدگی اور گھٹن طاری رہی، محمود حسین نظریں نیچی کئے سر جھکائے کسی سوچ میں گم تھے اور صوفیہ خاتون کی دُور رس نگاہیں اس گم شدگی کے راز کی تہہ تک پہنچنے کے لئے اُن کے چہرے پر اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔

"ماں باپ اولاد کے حق میں جو فیصلے کرتے ہیں وہ اکثر صحیح ضرور سمجھے جاتے ہیں لیکن ——"

"امی حضور ——" محمود حسین تڑپ کر بولے "اگر زندگی میں کبھی میری ذات سے آپ کو کوئی تکلیف پہنچی ہو تو میں ہاتھ جوڑ کر آپ سے دست بستہ معافی کا خواستگار ہوں لیکن خدارا اس وقت آپ اپنے ذہن پر کوئی بوجھ نہ ڈالیں"

صوفیہ خاتون کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن شمسہ بیگم کے آجانے سے اُن کے دل کی حسرت دل ہی میں رہ گئی، شمسہ بیگم شوہر کی فرمائش پر اُن کے لئے اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر لائی تھیں۔ محمود حسین نے چائے کا کپ بیوی کے ہاتھ سے لے لیا تو شمسہ بیگم نے ساس سے پوچھا۔

"کیسی طبیعت ہے امی جان ——؟"

"خدا کا شکر ہے —— پہلے سے کچھ بہتر محسوس کر رہی ہوں"

محمود حسین چائے پینے میں مصروف تھے، شمسہ بیگم ساس سے گفتگو کرنے اور اُن کی دلجوئی میں لگی ہوئی تھیں کہ ناجیہ اچھلتی کودتی خواب گاہ میں داخل ہوئی، صوفیہ خاتون نے ناجیہ کو دیکھا تو اُن کے چہرے پر زندگی آگئی۔ ناجیہ نے پہلے باپ کو سلام کیا پھر دادی کے قریب جا کر بڑی سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"دادی اماں —— آپ تو ٹھیک ہیں نا ——؟"

"ہاں میری گڑیا —— میں بالکل ٹھیک ہوں" صوفیہ خاتون نے والہانہ نظروں سے ناجیہ کو دیکھتے ہوئے کہا پھر بولیں "تمہاری مس چلی گئیں؟"

"ہاں ـــــ خدا خدا کر کے چلی گئیں" ناجیہ..... نے کڑوا سا منہ بنا کر اتنی معصومیت سے کہا کہ محمود جسے بھی مسکرا دیئے۔

"کیا بات ہے میری لاڈلی" صوفیہ خاتون نے پوتی کی ادا پر نچھاور ہوتے ہوئے پوچھا "کیا آج مس عار سے کچھ کسی بات پر تمہاری ان بن ہو گئی؟"

"ڈانٹنے کے علاوہ اُن کو اور آتا بھی کیا ہے" ناجیہ نے بدستور کڑوے لہجے میں جواب دیا "ہر وقت پرس سے شیشہ نکال کر اپنا کالا کلوٹا چہرہ دیکھتی رہتی ہیں اور مجھ سے ذرا سی غلطی ہو جائے تو جنگلی بلی کی طرح غرّانے لگتی ہیں"

"اچھا ـــــ" صوفیہ خاتون نے لطف اندوز ہوتے ہوئے دریافت کیا "آج کیا غلطی ہو گئی تم سے میری لاڈلی سے، ذرا میں بھی تو سنوں"

"دادی اماں ـــــ میری کوئی غلطی نہیں تھی" ناجیہ نے تفصیل بتانی شروع کی "مس نے مجھے ڈکٹیشن دی تھی، میں نے ساری کی ساری ڈکٹیشن ایک دم صحیح لکھی، مس نے دیکھا تو ذرا تعریف نہ کی، اتراکر بولیں کہ ہاں ٹھیک ہے، میں نے جل کر پوچھ لیا..... مس آپ کو گڈ کی اسپیلنگ آتی ہے یا نہیں ـــــ بس اتنی سی بات تھی جو اُنھوں نے مجھے ڈانٹنا شروع کر دیا اور بار بار اپنی خوفناک آنکھوں سے گھورتی بھی رہیں ـــــ آپ ہی بتائیں دادی اماں، جب میں نے ساری ڈکٹیشن ٹھیک ٹھیک لکھی تھی تو مس کو گڈ تو دینا چاہیئے تھا نا ـــــ"

"بالکل دینا چاہیئے تھا" صوفیہ خاتون نے حسب دستور ناجیہ کی حمایت کرتے ہوئے کہا "تم دل چھوٹا نہ کرو میری بچی ـــــ کل میں خود مس عالیہ سے دریافت کروں گی کہ انھوں نے تمہیں گڈ کیوں نہیں دیا ـــــ"

"آپ بھی مس کو خوب ڈانٹئے گا ـــــ یوں یوں گھورتی ہیں" ناجیہ نے اپنی آنکھیں خوفناک بناتے ہوئے کہا "ایمان سے بڑا مزہ آئے گا"

"بُری بات ہے ناجیہ" شمسہ بیگم نے بیٹی کو تنبیہہ کی "مس کے لئے ایسی باتیں نہیں کرتے"

صوفیہ خاتون کو بہو کی دخل اندازی پسند نہ آئی، چہرے کی بشاشت ناگوار خاطر سنجیدگی میں تبدیل ہو تو شمسہ بیگم کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن اوّل تو اُنھوں نے کوئی غلط بات نہیں کی تھی پھر تیر کمان سے بھی نکل چکا تھا اس لئے اس کی واپسی مشکل تھی پھر بھی انھوں نے فوری طور پر بات بنانے کی کوشش کی۔

"میرا مطلب یہ ہے ناجیہ بیٹی کہ بزرگوں کی کسی بات پر ناراض نہیں ہوتے، چپ ہو جاتے ہیں"

"جو بات دل میں رہ جائے وہ اکثر پک کر ناسور بن جاتی ہے" صوفیہ خاتون نے شمسہ بیگم کی وضاحت کے حالات کی روشنی میں غلط رنگ دیتے ہوئے کہا "ناجیہ تو ابھی معصوم ہے، اس غریب کو ابھی اتنی عقل کہاں کہ یہ مصلحتوں کو سمجھ کر بات کر سکے"

"آپ کی دوا کا وقت ہو گیا ہے امی جان" شمسہ بیگم نے جلدی سے بات کا رُخ موڑتے ہوئے کہا پھر دوا کی شیشی کی جانب بڑھنا چاہتی تھیں کہ صوفیہ خاتون نے انھیں روکتے ہوئے کہا۔

"رہنے دو بہو ـــــ منہ کا ذائقہ اس وقت ٹھیک نہیں، کچھ دیر بعد پی لوں گی"

شمسہ بیگم کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے، محمود حسین کو چونکہ اندرونی باتوں کا علم نہیں تھا اس لئے وہ ماں اور بیوی کی باتوں کا مفہوم نہ بھانپ سکے لیکن شمسہ بیگم نے وہاں مزید رکنا مناسب نہ سمجھا مبادا کہ کوئی بات ایسی ہو جو ساس کی گرتی ہوئی صحت کے لئے مفید نہ ہو، یہی سوچ کر انھوں نے ایک شدید ضروری کام کا بہانہ کیا اور دل... کی دھڑکنوں کو سمیٹتی باہر چلی گئیں۔

"محمود بیٹے ـــــ" شمسہ بیگم کے جانے کے بعد صوفیہ خاتون نے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے فیصلہ کُن انداز میں کہا "ناجیہ کے لئے کسی ایسی ٹیچر کی ضرورت ہے جو بچوں کی نفسیات اور ذہنی رجحان سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہو ـــــ مس عالیہ کی شکایت میں پہلے بھی متعدد بار کہہ چکی ہوں ـــــ تم کل ہی ان کا حساب کر دینا"

"جو حکم امی حضور" محمود حسین نے چائے کا کپ رکھتے ہوئے فوری طور پر ماں کے حکم کو قبول کر لیا۔

"دادی اماں" ناجیہ نے کہا "میرے لئے بھی ویسی ہی مس لگوا دیجئے جیسی فرّی کو پڑھانے آتی ہے"

"کیوں نہیں ـــــ" صوفیہ خاتون نے ناجیہ کے شانے پر اپنے نحیف ہاتھ رکھتے ہوئے نہایت پیار سے جواب دیا "ہم اپنی لاڈلی بیٹی کے لئے اس سے بھی زیادہ اچھی اور قابل ٹیچر کا انتظام کریں گے"

"فرّی کی مس کیسی ہیں ـــــ مجھے بھی تو بتاؤ ناجیہ بیٹی" محمود حسین نے بیٹی سے دریافت کیا۔

"ہیں ایک مس ڈیسوزا" ناجیہ کے بجائے صوفیہ خاتون بول پڑیں "کونونٹ میں ٹیچر ہیں، سُنا ہے بہت اچھا پڑھاتی ہیں"

"بڑی پیاری مس ہیں پیاری ـــــ" ناجیہ بولی "فرّی تو فر فر انگریزی بولتی ہے"

"اگر یہ بات ہے تو ہم دو ایک دن کے اندر ہی مس ڈیسوزا کو اپنی بیٹی کے لئے رکھ لیں گے"

"پپا بھی زندہ باد ـــــ" ناجیہ نے خوش ہو کر تالی بجاتے ہوئے کہا پھر اچھلتی کودتی کمرے سے باہر چلی گئی۔

"خدا اُس کو شاد و آباد رکھے، بڑی پیاری اور ذہین بچی ہے" صوفیہ خاتون نے ناجیہ کے جانے کے بعد کہا پھر بیٹے سے بولیں "تم دن بھر کے تھکے ماندے آئے ہو، جا کر کچھ دیر آرام کر لو"

"میں آپا کو بھیجے دیتا ہوں" محمود حسین نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"محمود ـــــ" صوفیہ خاتون نے بیٹے کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "ناجیہ کے مستقبل کے سلسلے میں میں نے جو کچھ کہا ہے اس کا خیال رکھنا"

"امی حضور ـــــ آپ مطمئن رہیں"

محمود حسین ماں کے پاس سے اُٹھ کر سیدھے انکی کی طرف گئے، شائستہ بیگم کو ماں کی طرف روانہ کر کے خود اپنی خواب گاہ میں آ گئے، دن بھر کی تکان دور کرنے کے لئے غسل خانے میں چلے گئے، نیم گرم پانی سے نہا کر لباس تبدیل کر کے باہر آئے تو تکان جاتی رہی، شمسہ بیگم شوہر کی منتظر تھیں غسل خانے سے نکلتا دیکھ کر بولیں۔

"یہ آپ نے اچھا کیا کہ غسل کر لیا ورنہ چہرے سے تھکن برس رہی تھی"

"اب چشم بد دور کیا لگے ہائے ہوں" محمود حسین نے بیوی کو شرارت بھری نگاہوں سے گھورتے ہوئے شوخ لہجے میں دریافت کیا۔

"آئینہ دیکھ لیجئے، آپ کو خود ہی اندازہ ہو جائے گا" شمسہ بیگم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"آئینے کی کیا ضرورت ہے بیگم، آپ کی مسکراہٹ اس بات کی چغلی کھا رہی ہے کہ نہا دھو کر غالب پھر سے جوان نظر آنے لگا ہے" محمود حسین نے تولیئے سے بالوں کو خشک کرتے ہوئے کہا پھر بیوی کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر بولے "کیوں ـــــ میں نے کچھ غلط اندازہ تو نہیں لگایا"

"غلط فہمی کا علاج تو لقمان حکیم کے پاس بھی نہیں تھا" شمسہ بیگم شوخی سے بولیں۔

"نہ سہی، لیکن یہ بات بہرحال آپ کو تسلیم کرنا پڑے گی کہ یہی غلط فہمی اب تک مجھے جوان بنائے ہوئے ہے ورنہ کب کا بوڑھا ہو چکا ہوتا"

"آپ بال درست کریں میں آپ کے لئے جوس تیار کر کے لاتی ہوں"

شمسہ بیگم مسکراتی ہوئی باہر چلی گئیں، محمود حسین بال درست کر کے فارغ ہوئے تو شمسہ بیگم جوس کا گلاس لئے دوبارہ آ گئیں، شوہر کو گلاس پیش کیا تو زمانے اُن کی آنکھوں میں کیا بات تھی کہ شمسہ بیگم نے جلدی سے شرما کر نظریں جھکا لیں

"ایسی بھی کیا بے رخی بیگم" محمود حسین نے بیوی کو چھیڑتے ہوئے کہا "ہم باقاعدہ نکاح کر کے آپ کو اپنی شریک حیات... نا کر اس گھر میں لائے ہیں"

"یہ آج آپ کو ہو کیا رہا ہے" شمسہ بیگم نے شوخی سے تنک کر جواب دیا "جوس پی لیں جلدی سے۔ مجھے ابھی جا کر امی جان کو دوا پلانی ہے"

ماں کے ذکر پر محمود حسین یکلخت سنجیدہ ہو گئے، جوس کے دو گھونٹ لیتے ہوئے کرسی پر بیٹھے تو شمسہ بیگم نے شوہر کے چہرے کی بدلتی ہوئی رنگت کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"خیریت ـــــ یہ اچانک چہرے پر سنجیدگی کیوں طاری کرلی۔ ابھی چند لمحہ پیشتر تو آپ خاصے ہنس رہے تھے۔"

"مجھے امی حضور کا خیال آگیا۔" محمود حسین نے جوس لیتے ہوئے جواب دیا۔

"کوئی خاص بات۔" شمسہ بیگم نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"دفتر سے واپسی پر آج میں ڈاکٹر سے ملتا ہوا آیا ہوں ـــــ اُن کا خیال ہے کہ اب امی حضور کو دواؤں سے زیادہ دعاؤں کی ضرورت ہے۔"

"خدا پر بھروسہ رکھئے، وہ جو کرے گا بہتر کرے گا۔" شمسہ بیگم نے شوہر کے ہاتھ سے خالی گلاس لیتے ہوئے کہا۔ "موت اور زندگی پر بندے کا کیا اختیار۔"

محمود حسین چند ثانیے کے لئے خاموش رہے پھر بولے "امی حضور آج بطور خاص ناجیہ کے مستقبل کے پریشان تھیں۔"

"ناجیہ کے مستقبل کے لئے۔" شمسہ بیگم چونک اُٹھیں۔

"میرا خیال ہے کہ امی حضور مجھ سے بھی کچھ خفا ہیں۔" محمود حسین ایک سرد آہ بھر کر بولے۔ "میں نے ان میں شاید اپنے کسی عمل سے اُن کا دل دکھایا تھا۔ وہ اسی کی روشنی میں ناجیہ کے مستقبل کا تحفظ چاہتی ہیں۔"

"کیا آپ کو یاد نہیں کہ آخر آپ سے ایسی کون سی گستاخی سرزد ہوگئی تھی جس کا تدارک وہ ناجیہ کی زندگی میں کرنا چاہتی ہیں۔" شمسہ بیگم نے معنی خیز نظروں سے شوہر کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو دیکھتے ہوئے کہا پھر خود جلدی سے بولیں۔ "لڑکے اور لڑکیوں میں یوں بھی زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے، لڑکے بالغ ہوتے ہی خود کو آزادی کے نام پر اپنانے کی کوشش کرتے ہیں اور من مانی کرنا چاہتے ہیں جبکہ لڑکیاں بے چاری گھر کی چہار دیواری میں بند رہتی ہیں کام کاج سے ان کو اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ آسمانوں پر اُڑنے کے بارے میں سوچ سکیں۔"

محمود حسین نے پہلی بار بیوی کی زبان سے اتنا طویل جملہ سُنا تھا۔ اس جملے کی گہرائی بے پناہ تھی۔ محمود حسین اس کی گہرائی میں ڈوبتے چلے گئے، چہرے پر سنجیدگی کے تاثرات پھیل کر اور گہرے ہوگئے لیکن جب ڈوب کر اُبھرے تو اُن کے ہونٹوں پر بڑا کرب ناک تبسم رقصاں تھا۔

"غالباً آپ کو بھی میرے ماضی کے کسی پہلو سے دکھ پہنچا ہے۔"

"یہ اندازہ آپ نے کس طرح کرلیا جبکہ شادی کے بعد سے آج تک ....."

"میں شادی سے پہلے کی بات کر رہا ہوں۔" محمود حسین تیزی سے جملہ کاٹتے ہوئے بولے ـــــ "میں تسلیم کرتا ہوں کہ شادی کے سلسلے میں میں نے امی حضور کے حکم سے کچھ عرصے کے لئے نافرمانی ضرور کی تھی لیکن پھر سر تسلیم خم کرلیا تھا۔"

"آپ کی حکم عدولی کا کوئی نہ کوئی سبب بھی ضرور ہوگا۔" شمسہ بیگم بدستور سنجیدگی سے بولیں۔ "ممکن ہے وہ ایک بات ابھی تک امی جان کے دل میں کھٹک رہی ہو اور اسی وجہ سے وہ ناجیہ کی طرف سے زیادہ فکرمند ہوں۔"

"آپ نے درست کہا بیگم۔" محمود حسین ہاتھ ملتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے، خلا میں گھورتے ہوئے بولے۔ "کچھ زخم ایسے بھی ہوتے ہیں جو اوپر سے بظاہر مندمل نظر آتے ہیں لیکن اندر ہی اندر ناسور سے زیادہ مہلک تا زیست رستے رہتے ہیں۔"

محمود حسین کے لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ شمسہ بیگم حیرت سے اُن کا چہرہ تکنے لگیں، آج پہلی بار انہوں نے شوہر کو اس قدر درد بھرے لہجے میں بولتے سُنا تھا ـــــ نہ جانے وہ کون سا کرب تھا جو آج پھر ان کے چہرے پر یادوں کی پرچھائیاں بن کر اُبھر آیا تھا، شمسہ بیگم محو حیرت ـــــ سکتے کی کیفیتوں سے دوچار ـــــ گنگ سی کھڑی شوہر کو تکتی رہیں پھر آہستہ سے بولیں۔

"اگر آپ کو میری کسی بات سے دکھ پہنچا ہے تو میں معافی کی خواستگار ہوں۔"

"غلط نہ سمجھیں بیگم ـــــ" محمود حسین نے تیزی سے پلٹ کر اپنا ہاتھ بیوی کے شانے پر رکھتے ہوئے

نہایت اپنائیت سے کہا۔ "بخدا، مجھے آپ سے کوئی شکوہ، کوئی گلہ ـــــ کوئی شکایت نہیں، آپ کا وجود تو میرے لئے ایک سہارا ہے۔"

شمسہ بیگم ابھی تک حیران و ششدر تھیں، کچھ کہنا چاہتی تھیں کہ شائستہ بیگم بدحواسی کے عالم میں ہانپتی کانپتی کمرے میں داخل ہوئیں، اُن کے بال کھلے ہوئے تھے، چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، کمرے میں داخل ہوتے ہی بلا کسی تمہید کے بوکھلائے ہوئے لہجے میں محمود حسین کو مخاطب کر کے بولیں،

"محمود ـــــ ذرا چل کر دیکھو، خالہ جان کو کچھ ہو رہا ہے، میری کسی بات کا جواب نہیں دے رہی ہیں، بس پتھرائی ہوئی نظروں سے ایک ٹک چھت کو گھورے جا رہی ہیں۔"

محمود حسین نے شائستہ بیگم کی حالت دیکھی تو تڑپ کر کمرے سے باہر چلے گئے، شمسہ بیگم کا دل بھی کسی انجانے خوف سے دھڑک اُٹھا، ہر چند کہ شائستہ بیگم کی طرف سے اُن کے دل میں ایک گرہ سی موجود تھی لیکن جلدی سے بولیں،

"آپا ـــــ امی جان کی حالت خدانخواستہ زیادہ خراب تو نہیں؟"

"شمسہ ـــــ" شائستہ بیگم بدستور بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولیں۔ "جلدی چلو ـــــ کہیں ہمیں دیر نہ ہوجائے۔"

"میرے مالک ـــــ رحم۔" یہ کہتی ہوئی شمسہ بیگم بھی شائستہ بیگم کے ساتھ ساتھ باہر آئیں، تیز تیز قدم اُٹھاتی صوفیہ خاتون کی خواب گاہ میں داخل ہوئیں تو دھک سے رہ گئیں۔

محمود حسین کسی کٹے ہوئے سرافراز و ہارے ہوئے جواری کی طرح ماں کے بستر کے قریب کھڑے پھٹی پھٹی نگاہوں سے ممتا کے اس عظیم اور مقدس جذبے کو تکتی باندھے دیکھ رہے تھے جو صوفیہ خاتون کی پتھرائی ہوئی نظروں میں سمٹ کر ہمیشہ کے لئے منجمد ہوگیا تھا۔

"محمود ـــــ" شائستہ بیگم نے دیوانوں کی طرح اُن کے قریب جا کر سوال کیا۔ "خالہ جان ـــــ"

"امی حضور کی شفقتوں نے ہم سے منہ موڑ لیا ہے آپا۔" محمود حسین کی آواز بھرا گئی۔ "پہلے میں یتیم ہوا تھا۔ آج یسیر بھی ہوگیا۔"

"خالہ جان ـــــ" شائستہ بیگم دہاڑیں مارتی ہوئی صوفیہ خاتون کے بے جان جسم سے لپٹ گئیں۔

"امی جان ـــــ" شمسہ بیگم چیخ اٹھیں اور پھر ـــــ

صوفیہ خاتون کی موت کی خبر پھیلی تو پوری کوٹھی میں کہرام مچ گیا۔

ہر آنکھ پرنم تھی ـــــ

ہر دل فگار تھا ـــــ لیکن

موت کا فرشتہ اپنا کام پورا کر کے کسی اور منزل کی جانب کوچ کر گیا تھا ـــــ !!

صوفیہ خاتون کی موت نے گھر کے ہر فرد کو متاثر کیا تھا۔ محمود حسین کے سر سے ماں کا سایہ اُٹھ گیا تھا، اب اُن کو زندگی کی شاہراہ پر ماں کی دعاؤں کے بغیر قدم آگے بڑھانا تھا، شمسہ بیگم نے اپنے دل میں شرمندہ تھیں کہ آخری وقت میں الفاظ کے الٹ پھیر نے ساس کو اُن کی طرف سے بددل کر دیا تھا۔ پھر قدرت نے اُن کو اتنا موقع بھی نہ دیا کہ وہ صوفیہ خاتون کے سامنے انہیں اپنا مطیع کرلیتیں، ایک خلش تھی جو انہیں ہر لمحہ پریشان کئے رہتی۔ ایک ملال تھا جو جمود کی کیفیتوں کا شکار ہو کر اُن کے ذہن کا ایک حصہ بن گیا تھا۔

شائستہ بیگم نے اس غم کا سب سے زیادہ اثر لیا تھا۔ صوفیہ خاتون نے انھیں ہمیشہ اپنا سمجھا، ہر موڑ پر اُن کی خضر منزلت کی، ہر آڑے وقت میں اُن کا ساتھ دیا، شوہر کی موت کے بعد اُن ہی کا دم تھا جس نے شائستہ بیگم کو اپنے سینے سے لگا کر بیوگی کا غم بھلانے میں ان کی مدد کی تھی، صوفیہ خاتون نے انہیں گھر میں جگہ دی تھی اپنے دل میں جگہ دی تھی۔ اور مرتے وقت مستقبل کو سہارا دینے کے لئے ایک مکان بھی اُن کے نام کر گئیں لیکن ان تمام باتوں سے زیادہ شائستہ بیگم کو اس بات کا صدمہ تھا کہ اُن کی ایک دیرینہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔ حالات نے اُن کی تمناؤں کا خون ایسے وقت

میں کیا جب وہ بالکل ہی بے دست و پا ہو گئی تھیں۔

شائستہ بیگم کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ شمسہ بیگم اُن سے خفا ہیں اور اس خفگی کی وجہ وہ باتیں تھیں جو انھوں نے صوفیہ خاتون کی خوابگاہ کے باہر کھڑے ہو کر سُن لی تھیں۔ شائستہ بیگم نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا، محض اپنی ایک خواہش کا اظہار کیا تھا، اس خواب کو زبان تک لے آئی تھیں جو ایک مدت سے اُن کے دل کے نہاں خانوں میں محفوظ تھا، انھوں نے باہمی رشتوں کو مضبوط اور مربوط کرنا چاہا تھا۔ ان تعلقات کو خون کے رشتوں میں بدلنا چاہا تھا جو اُن کے اور صوفیہ خاتون کے گھرانوں کے درمیان ایک مدت سے قائم تھے لیکن شمسہ بیگم نے ان باتوں کا غلط نتیجہ اخذ کیا، آپ ہی آپ کھنچ گئی تھیں اور اب ——— اب قدرت نے مفاہمت کی صورت بھی ختم کر دی تھی۔

ایک بزرگ کا سایہ اُٹھ جانے سے حالات کیسے اچانک اور یکسر بدل گئے تھے ——— ہر شیرازہ جیسے منتشر ہو کر رہ گیا تھا ——— موت کی ایک ہچکی نے رشتوں اور ناتوں کے درمیان کیسی عجیب سی خلیج پیدا کر دی ——— دراڑیں ڈال دی تھیں۔

صوفیہ خاتون کی موت کا اثر جہاں بزرگوں نے لیا وہاں ناجیہ کا معصوم ذہن اور نازک وجود بھی اس صدمۂ جانکاہ سے لرز اٹھا، وہ ذہنی طور پر اتنی بالغ تو نہ تھی کہ موت اور زندگی کے درمیانی فاصلوں اور دوریوں کی پیمائش کر سکتی۔ اُس خلاء کے بارے میں اس حقیقت کو سمجھ سکتی کہ اُسے پُر نہیں کیا جا سکتا۔ اُسے تو صرف اتنا معلوم تھا کہ جب کوئی ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں موند لیتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ وہ مر گیا، اُس کی موت پر آنسو بہائے جاتے ہیں چنانچہ دادی کی موت پر ناجیہ نے بھی دوسروں کی دیکھا دیکھی آنسو بہائے پھر دوسروں کی پیروی کرتے ہوئے اُس نے بھی اپنی آنکھوں کو خشک کر لیا تھا۔

ابھی تو وہ زندگی کے اس سنگ میل تک پہنچی تھی جہاں صرف تقلید کی جاتی ہے ——— ابھی تو اس کا ذہن بہت کچا تھا، نرم ٹہنیوں کی طرح جو ہوا کے بوجھ سے بھی لچک جانے پر مجبور ہو جاتی ہیں لیکن ان تمام حقیقتوں کے باوجود اُسے صوفیہ خاتون کے یوں اچانک بچھڑ جانے پر شدید دکھ ہوا تھا، وہ اس بے چینی کو کوئی نام نہیں دے سکتی تھی جو اس کے ذہن میں ہر وقت کسی کیڑے کی طرح سرسراتی رہتی، اس اضطراب کو سمجھنے سے قاصر تھی جو اسے ہر وقت نہ جانے کیوں اُلجھائے رکھتا تھا۔

دادی کی موت کی اچانک خبر سُن کر اُس کا معصوم دل بھی یکلخت تیزی سے دھڑکنے لگا تھا، وہ بھی دوڑی دوڑی اس خواب گاہ تک گئی جہاں گھر والے مرنے والی کے گرد جمع تھے، دوسروں کو بین کرتے دیکھ کر اُس کا دل بھی بھر آیا، اُس نے سب کی دیکھا دیکھی بلا کچھ سوچے سمجھے رونا شروع کر دیا تھا لیکن پھر ان آنسوؤں نے ساون بھادوں کی جھڑی کی شکل کیوں اختیار کر لی تھی؟ ——— روتے روتے وہ بے حال کیوں ہو گئی تھی؟ ——— ہچکیاں کیوں بندھ گئی تھیں؟ ——— وہ ان سوالوں کے جواب سے ناواقف تھی، اس لئے کہ جذبے ابھی معصوم تھے ——— احساس ابھی پختہ نہیں ہوا تھا اور شعور ابھی کمسن تھا ——— لیکن وہ اتنی ناسمجھ بھی نہ تھی کہ ان آسائشوں کے بارے میں نہ سوچتی جن سے قدرت نے اُسے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا تھا۔

دادی کے لاڈ پیار نے اُسے سربلندی عطا کی تھی ——— خودسری کا احساس بیدار کیا تھا ——— وہ خود کو بہت بلند محسوس کرنے لگی تھی، جو اُس کے جی میں آتا کر گزرتی ——— خواہشات کی تکمیل میں کوئی دشواری پیش آتی تو وہ دبکا کی بھاگی سیدھی صوفیہ خاتون کے پاس جاتی ——— منہ بسور کر اور مسمسی صورت بنا کر اپنا دکھڑا رونا شروع کر دیتی پھر جب صوفیہ خاتون کی حمایت اُسے کامیابی کی نوید دیتی تو وہ خوش ہو کر بے اختیار "دادی اماں زندہ باد" کے نعرے لگانا شروع کر دیتی۔

دادی کا وجود ناجیہ کے لئے اس مضبوط اور سایہ دار درخت سے کم نہ تھا جس کے سائے تلے اس کے نازک بدن پروان چڑھ رہے تھے لیکن وقت کی ایک ہی جنبش نے اس درخت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور ناجیہ کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ گھنے آسمان کے نیچے کڑی دھوپ میں تنہا کھڑی رہ گئی ہو ——— اُس کے پاؤں جھلس

رہے ہوں ——— اور اجنبی ماحول میں جیسے اُس کا دم گھٹ رہا ہو۔

ہر چند کہ صوفیہ خاتون کی موت کے بعد شمسہ بیگم نے اس خیال سے بیٹی کی دیکھ بھال زیادہ کر دی تھی کہ کہیں اُسے دادی کی کمی کا احساس نہ ہو لیکن ناجیہ کی نگاہیں ہر وقت کوٹھی کے در و دیوار پر بھٹکتی رہتیں جیسے وہ کسی پسندیدہ مگر گم شدہ چیز کی تلاش میں ہو ——— جیسے وہ رہ رہ کر یہ سوچنے لگتی ہو کہ اب اُس کی حمایت میں آواز بلند کرنے والا اُس سے ہمیشہ کے لئے روٹھ گیا ہو ——— جیسے اب اس کی کوئی ضد پوری نہ ہو سکے گی ——— جیسے وہ اب زندگی کے تند و تیز میدان میں بالکل اکیلی رہ گئی ہو ——— اکیلی اور تنہا۔

اس وقت بھی وہ اسکول سے واپس لوٹی تو کچھ گم صم سی تھی ——— لباس تبدیل کر کے ناشتے کی میز پر ماں باپ کے درمیان آئی تو کھوئی کھوئی سی نظر آ رہی تھی، کُندن کی طرح دمکتے گالوں اور خوبصورت و معصوم چہرے پر وقت کی دھول نے جم کر ایسی سنجیدگی کو اُجاگر کر دیا تھا جسے دیکھ کر شمسہ بیگم بھی تڑپ اٹھیں۔ محمود حسین بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئے۔

"کیا بات ہے ناجیہ بیٹی ——— تم چُپ چُپ کیوں ہو" شمسہ بیگم نے بڑے لاڈ سے بیٹی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "کیا اسکول میں کوئی بات ہوئی ہے ——— کسی سہیلی سے جھگڑا ہو گیا کیا ———؟"

"نہیں ———" وہ سپاٹ آواز میں بولی۔

"کیا شرفو نے تمہارے کسی کام میں دیر کی ہے؟"

"نہیں ———" وہ بدستور روکھے لہجے میں بولی

"سمجھی ———" شمسہ بیگم نے بیٹی کو گدگدانے کی خاطر کہا "فراز نے تمہارا کوئی کھلونا پھر توڑ دیا ہو گا؟"

"یہ بات بھی نہیں ہے ———" اُس نے اُلجھتے ہوئے جواب دیا۔

"عاشی نے کچھ کہا ہے؟"

"نہیں ———"

"ناجیہ بیٹے ———" محمود حسین نے بیٹی کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو محسوس کرتے ہوئے کہا "میں نے تمہارے لئے ایک بڑے شوکیس کا آرڈر دے دیا ہے، اب تم اپنے سارے کھلونے سلیقے سے سجا کر رکھنا"

"تھینک یو پپا ———" اُس نے نظریں اُٹھا کر باپ کو دیکھا پھر چائے کا کپ اُٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

"کیا خیال ہے ———" محمود حسین نے بیٹی کی کمزوری کو اکسانے کی خاطر شمسہ بیگم سے کہا "آج کچھ دیکھنے نہ چلا جائے، سُنا ہے سندباد جہازی کی ایک نئی فلم چل رہی ہے جس میں جنگلی جانور بھی ہیں اور سمندری سفر کے بڑے خوبصورت مناظر بھی"

"اچھا ———" شمسہ بیگم نے شوہر کا مفہوم سمجھتے ہوئے کہا پھر بیٹی سے بولیں "کیوں ناجیہ بیٹی ——— چلو گی فلم دیکھنے؟"

"نہیں ——— میرا دل نہیں چاہ رہا"

جب تک ناشتے کی میز پر رہی شمسہ بیگم اور محمود حسین نے اسے بہلانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اداس اداس سی رہی اُسے خود بھی اپنی خاموشی اور اُداسی کا سبب نہیں معلوم تھا، ناشتے سے فارغ ہو کر وہ سیدھی لان پر آ گئی، کچھ دیر یونہی بڑی بوڑھیوں کی طرح ایک درخت سے ٹیک لگائے کھڑی خلاؤں میں گھورتی رہی پھر دل گھبرایا تو جا کر عاشی کو بُلا لائی، سبزے پر پولیتھن کے درخت کے قریب بیٹھ کر کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی پھر سنجیدگی سے بولی۔

"عاشی ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو ———"

"دادی اماں کیوں مر گئیں ———؟" ناجیہ کے لہجے میں بڑا معصوم کرب مچل رہا تھا۔

"اللہ کی مرضی" عاشی نے سیدھا سا جواب دیا "لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"اس لئے کہ دادی اماں کے مرجانے سے مجھے اب ڈر لگنے لگا ہے۔"

"ڈر ——" عاشی نے حیرت سے پوچھا۔ "ڈر کس بات کا؟"

"پہلے میں شرارت کرتی تھی تو دادی اماں مجھے امی اور پپا سے بچا لیتی تھیں —— میں ضد کرتی تھی تو دادی اماں میری ہر بات پوری کرا دیتی تھیں لیکن اب ——" ناجیہ ایک لمحہ کو چپ ہوئی پھر بولی "اب بڑا ڈر لگتا ہے کہ کہیں امی اور پپا میری شرارت پر مجھے مارنے نہ لگیں۔"

"دیوانی ہو تم تو ——" عاشی نے ناجیہ کی معصوم سوچ پر زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا "تمہاری امی اور پپا تو تم سے بے انتہا پیار کرتے ہیں، وہ بھلا تم کو کیوں ماریں گے۔"

"اچھا —— تو کیا میں اب بھی ضد کر سکتی ہوں۔" ناجیہ یکلخت کھل اٹھی۔ "مجھے شرارتوں پر ڈانٹ پھٹکار تو نہیں پڑے گی؟"

"ضد کرنا تو بری بات ہے ناجیہ، عاشی نے اُسے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "رہیں شرارتیں تو وہ بھی اچھے بچے نہیں کرتے۔"

"کیا مطلب۔" ناجیہ نے اُسے تیکھی نظروں سے گھورا۔ "کیا میں اچھی بچی نہیں ہوں؟"

"یہ میں نے کب کہا۔" عاشی ایک دم سہم کر جلدی سے بولی۔ "میں تو تمہیں یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ شرارتیں گندے بچے کرتے ہیں اور تم —— تم تو بہت اچھی، نیک اور سمجھدار ہو ——"

"تم ——" ناجیہ کے چہرے پر خون کی تمازت پھیل کر گہری ہونے لگی، عاشی کو غصے سے گھورتے ہوئے بولی "تم مجھے بیوقوف بنا رہی ہو۔"

"نہیں ناجیہ —— میں تو ——"

"بکو مت ——" وہ تلملا کر بل کھاتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ حقارت بھرے لہجے میں بولی "تم مجھے گندی سمجھتی ہو؟ —— اگر دادی اماں زندہ ہوتیں تو میں —— میں تمہارا منہ نوچ لیتی۔"

"ناجیہ —— میری بات تو سنو۔" عاشی نے اُٹھتے ہوئے اُسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ اور بگڑ گئی۔

"نہیں سنوں گی تمہاری بات۔" اُس نے بپھرے ہوئے انداز میں کہا "کروں گی —— کروں گی —— ہزار بار کروں گی شرارت، دیکھتی ہوں کوئی میرا کیا بگاڑتا ہے —— میں ڈرتی نہیں کسی سے اور تم —— تم خود ہو گندی —— دادی اماں اسی لئے مجھے تمہارے ساتھ کھیلنے سے منع کرتی تھیں ——"

"ناجیہ ——" عاشی سہمے ہوئے لہجے میں بولی "اگر مجھ سے کوئی بھول ہو گئی ہو تو مجھے معاف کر دو۔"

"نہیں کروں گی معاف۔" ناجیہ نے غصے سے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا پھر کچھ سوچ کر بولی "میں مالی بابا سے تمہاری شکایت کروں گی، تم کو ڈانٹ پڑواؤں گی ——"

"صرف ایک بار مجھے معاف کر دو ناجیہ۔" عاشی نے لجاجت سے کہا "پھر کبھی غلطی کروں تو تم بابا سے شکایت کر دینا۔"

"پکا تم کبھی مجھے گندی تو نہیں کہو گی؟" ناجیہ نے اُسے گھورتے ہوئے خشک آواز میں پوچھا۔

"نہیں کہوں گی —— وعدہ کرتی ہوں۔"

"ایسے نہیں —— کان پکڑ کر وعدہ کرو۔" ناجیہ کے انداز میں غرور تھا، امارت کا احساس جھلک رہا تھا۔

"یہ لو ——" عاشی نے جلدی سے دونوں کان پکڑ لئے "پکا وعدہ ——"

"جو میں کہوں گی —— مانو گی؟"

"ہاں —— مانوں گی۔" عاشی نے فوراً ہامی بھر لی۔

"مجھے شرارت کرنے سے تو منع نہیں کرو گی؟" ناجیہ نے اُسے بدستور گھورتے ہوئے دریافت کیا۔

"نہیں کروں گی۔"

"امی یا پپا سے میری شکایت کبھی نہیں کرو گی؟" ناجیہ نے اس بار قدرے کمزور آواز میں کہا۔

"کبھی نہیں کروں گی —— بلکہ میں بھی تمہارے ساتھ مل کر شرارتیں کروں گی۔"

"سچ ——" ناجیہ خوش ہو گئی۔

"ہاں ——"

"پھر تو بڑا مزہ آئے گا۔" ناجیہ خوش خوش بولی پھر بڑی فراخ دلی سے کہا "جاؤ —— میں نے تمہیں معاف کر دیا۔"

جواب میں عاشی بھی مسکرا دی —— خوف کے تاثرات اُس کے معصوم چہرے سے آہستہ آہستہ زائل ہو رہے تھے۔

صوفیہ خاتون کے چالیسویں کی رسم کی ادائیگی کے بعد غم کے وہ بادل جو گھر والوں کے ذہنوں پر چھا گئے تھے آہستہ آہستہ چھٹنے لگے، جمود کی کیفیت بتدریج ٹوٹنے لگی، زندگی کے وہ ہنگامے جو ایک بزرگ کی کمی کے سبب وقتی طور پر تھم گئے تھے پھر سے شروع ہونے لگے۔ وقت کی گردش مرہم بن کر زخموں کو مندمل کر رہی تھی۔

تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔

ایک روح، جسد خاکی سے جدا ہو کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملی تھی۔

رشتوں اور ناتوں کے درمیان اچانک ایک خلا پیدا ہو گیا تھا۔

ایک درمیانی کڑی ٹوٹ کر علیحدہ ہوئی تو گردش کے عمل میں ٹھہراؤ آ گیا ——

خدائی کا احساس تازہ تھا اس لئے لبوں پر گھبیتی مجلتی مسکراہٹوں میں کمی آ گئی ——

لیکن ——

وقت نے موسم کی طرح کروٹ بدلی تو ہنگامے پھر سے بیدار ہونے لگے۔

یہی ازل سے ہوتا چلا آیا ہے ——!

یہی زمانے کی ریت ہے ——!!

یہی رسمِ دنیا ہے ——!!!

شائستہ بیگم نے بھی دوسروں کی طرح ہنسنا بولنا شروع کر دیا تھا لیکن صوفیہ خاتون کی جدائی کے احساس نے انہیں بہت زیادہ محتاط اور خوف زدہ کر رکھا تھا، وقتی طور پر شمسہ بیگم نے کبھی حالات سے مفاہمت کر لی تھی، دنیا دکھاوے کے لئے اور خاص طور پر شوہر کی خوشنودی کی خاطر انھوں نے شائستہ بیگم سے بول چال شروع کر دی تھی لیکن شائستہ بیگم سمجھ رہی تھیں کہ اب محمود حسین کی کوٹھی میں اُن کا اور معصوم فرار کا وجود شمسہ بیگم کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا ہے، صوفیہ خاتون زندہ تھیں تو پورے گھر کی لگام اُن کے ہاتھوں میں تھی مگر اب وقت نے شمسہ بیگم کو حاوی کر دیا تھا —— آہستہ آہستہ وہ تمام امور پر اپنی گرفت مضبوط کرتی جا رہی تھیں۔

شمسہ بیگم کو جہاں مرحوم ساس کا فیصلہ ناجیہ کے مستقبل کے سلسلے میں گراں گزرا تھا وہاں انہیں صوفیہ خاتون کی وصیت سے بھی دکھ پہنچا تھا، انھوں نے کھل کر شوہر کے سامنے کبھی اس سلسلے میں زبان نہیں کھولی تھی لیکن شائستہ بیگم محسوس کر رہی تھیں کہ جس دن بھی دلوں کی کدورتوں میں اُبال آیا اس دن کچوکے لگا جائے گا۔ وہ اس آنے والے طوفان سے بچنا چاہتی تھیں، وقت کی گردشوں نے انھیں پہلے ہی بہت زخم دے رکھے تھے۔ وہ کسی نئے زخم کو زندگی کا روگ نہیں بنانا چاہتی تھیں۔

اس وقت بھی وہ انگنی کے برآمدے میں تنہا بیٹھی حالات پر غور کر رہی تھیں کہ محمود حسین کی گاڑی کے ہارن کی آواز سن کر چونک اُٹھیں، شام ڈوبنے لگی تھی، فضا پر ملگجا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ شائستہ بیگم نے جلدی سے اُٹھ کر برآمدے کا بلب روشن کر دیا پھر پلٹ کر دیکھا تو محمود حسین اسی طرف آ رہے تھے۔ وہ اپنی جگہ ساکت رہ گئیں، دل کی دھڑکنیں آپ ہی آپ تیز ہونے لگیں، شمسہ بیگم اس بات کو پسند نہیں کرتی تھیں کہ محمود حسین

تنہائی میں اُن سے ملیں۔

"یہاں برآمدے میں کیا کر رہی ہیں آپا؟" محمود حسین نے قریب آکر پوچھا تو شمسہ بیگم کے خوف نے جیسے شائستہ بیگم کی زبان گنگ کر دی، کوئی جواب نہ دے سکیں، بس ایک پھیکا سا تبسم ہونٹوں پر بکھیر کر رہ گئیں۔

"وہ میرا بھوندو فراز کہاں ہے؟" محمود حسین نے دوبارہ مخاطب کیا تو شائستہ بیگم نے دل کی دھڑکنوں کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

"کہیں کھیل رہا ہوگا ——— آؤ بیٹھو۔"

"جی نہیں اس وقت بیٹھنے کے ارادے سے نہیں آیا تھا" محمود حسین نے تکان دُور کرنے والے انداز میں جماہی لیتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر ———"

"آپ نے اچانک روشنی کی تو یونہی چلا آیا" محمود حسین بولے پھر شائستہ بیگم کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا، "کیا بات ہے آپا، آپ اس وقت مجھے کچھ اُلجھی اُلجھی سی نظر آرہی ہیں ——— کوئی خاص بات؟"

"نہیں ——" شائستہ بیگم نے کچھ سوچ کر کہا۔ "ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

"عام بات ہی سہی، لیکن آپ کا چہرہ اس بات کی چغلی کھا رہا ہے کہ آپ کچھ سوچ رہی تھیں۔"

"محمود ———" شائستہ بیگم دبی زبان میں بولیں "کیا تمہیں علم ہے کہ خالہ جان نے مرنے سے کچھ دن قبل ایک وصیت تیار کرائی تھی؟"

"جی ہاں" محمود حسین ماں کے ذکر پر سنجیدہ ہوگئے۔ "مجھے شریف الدین وکیل کے ذریعے امّی حضور کی وصیت مل چکی ہے۔"

"خالہ جان نے نہر والا مکان ———" شائستہ بیگم اپنا مدعا بیان کرنا چاہتی تھیں لیکن ان کی آواز گلوگیر ہوگئی۔

"میں سمجھتا ہوں کہ امّی حضور نے جو کچھ کیا سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا" محمود حسین بولے۔ "ہمیں اُن کے فیصلوں کا احترام کرنا ہوگا۔"

"اگر ——— اگر میں یہ انکسی چھوڑ کر نہر والے مکان میں منتقل ہو جاؤں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا" شائستہ بیگم نے دل پر جبر کر کے کہا۔

"یہاں اگر آپ کو کسی قسم کی تکلیف ہے تو اور بات ہے ورنہ ———"

"بات تکلیف کی نہیں محمود، خالہ جان کے فیصلے اور اُن کے حکم کی ہے۔" شائستہ بیگم جلدی سے بولیں "نہر والے مکان کی بات انھوں نے مجھے اپنی زندگی میں بتا دی تھی اور ——— اور اُن کا حکم تھا کہ میں اُن کے بعد اس مکان میں منتقل ہو جاؤں۔"

"یہ اگر امّی حضور کا حکم ہے تو میں آپ کو روکوں گا نہیں" محمود حسین ایک سرد آہ بھر کر بولے۔ "یہ اور بات ہے کہ آپ کے چلے جانے سے یہ گھر اور سُونا سُونا ہو جائے گا۔"

"کیسی بے تکی بات کرتے ہو" شائستہ بیگم نے جلدی سے بزرگی کی آڑ میں اپنے دل کے زخموں کو چھپاتے ہوئے کہا۔ "خدا سلامت رکھے شمسہ اور ناجیہ کو جن کے دم سے اس گھر کی رونق قائم ہے، بھلا گھر سُونا کیسے لگے گا۔"

"آپ نے شمسہ سے ذکر کیا تھا یہاں سے جانے کا؟"

"نہیں ——— تمہارے کان میں بات ڈال دی، کسی وقت موقع دیکھ کر شمسہ سے بھی بات کر لوں گی۔"

"میرا خیال ہے کہ شمسہ آپ کو آسانی سے اجازت نہیں دے گی" محمود حسین بولے "آپ کے چلے جانے سے وہ خود کو بڑا تنہا محسوس کرے گی۔"

"تم تو ایسا کہہ رہے ہو جیسے میں کسی دوسرے دیس جا رہی ہوں۔" شائستہ بیگم نے نہایت خوبصورتی سے بات بناتے ہوئے مسکرا کر کہا "آنا جانا تو لگا رہے گا اور پھر نہر والا مکان ہے کتنی دور، مشکل یہاں سے تین میل بھی نہ ہوگا۔"

"جیسی آپ کی مرضی لیکن اتنی جلدی بھی کیا ہے۔"

"میں بھی کونسی کل ہی روانگی پر کمر بستہ ہوں، تیاری میں کچھ وقت تو بہرحال لگے گا۔" شائستہ بیگم نے کہا پھر گفتگو کا رخ بدل کر بولیں "تم بیٹھو، میں تمہارے لئے گرما گرم چائے تیار کرتی ہوں۔"

"آپ کیوں زحمت کرتی ہیں، چائے تو ملازم نے تیار کر رکھی ہوگی، میرا خیال ہے کہ آپ بھی چل کر میرے ساتھ ہی شریک ہو جائیں۔"

"ابھی فراز کو مار باندھ کر پڑھانے کے لئے بٹھانا ہے۔" شائستہ بیگم نے بہانہ کرتے ہوئے کہا "اگلے مہینے سے اس کے امتحان شروع ہو رہے ہیں اور وہ ——— جب دیکھو کھیل میں لگا رہتا ہے۔"

"ابھی اس بھوندو کی عمر ہی کیا ہے آپا ——— یہی دن تو بچوں کے کھیلنے کودنے کے ہوتے ہیں اور پھر فراز تو خاصا ذہین بچہ ہے۔"

"کسی روز دو گھڑی کے لئے پڑھانے بیٹھ جاؤ ——— خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ پڑھنے میں کیسی کیسی شوخی اور شرارت کرتا ہے۔"

"یہ تو ذہانت کی دلیل ہے۔" محمود حسین بولے۔ "جو بچے گم صم اور چُپ چُپ رہتے ہیں نرے بدھو ثابت ہوتے ہیں۔"

"لیکن عاشی بھی تو ہے۔" شائستہ بیگم نے کہا۔ "ہر وقت اگ تھلگ اور خاموش خاموش رہتی ہے، کہنے کو ایک معمولی ملازم کی بچی ہے لیکن پڑھائی کے معاملے میں بے حد ذہین اور ہوشیار ہے، فراز بتا رہا تھا کہ اپنی کلاس میں ہمیشہ اوّل آتی ہے۔"

"گدڑی کا لال اسی کو کہتے ہیں۔" محمود حسین نے مسکرا کر کہا پھر جماہی لیتے ہوئے واپس چلے گئے۔

شائستہ بیگم نے محمود حسین کے جانے کے بعد اطمینان کا سانس لیا، اُن کے ذہن سے ایک بڑا بوجھ اُتر گیا تھا، اُن کا خیال تھا کہ محمود حسین آسانی سے انھیں اجازت نہیں دیں گے، اسی لئے انھوں نے مصلحتاً ایک جھوٹ بات کو صوفیہ خاتون کی ذات سے منسوب کر دیا تھا۔

اگر حالات سازگار ہوتے اور بات شائستہ بیگم کے اپنے اختیار کی ہوتی تو شاید وہ تمام عمر اس چوکھٹ کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوتیں جہاں انھیں پناہ ملی تھی ——— ایک بزرگ کا محبت اور شفقت بھرا سایہ نصیب ہوا تھا، اس گھر کی دہلیز سے نہ جانے کتنی خوشگوار یادیں وابستہ تھیں ——— پھر وہ اُسے اپنی مرضی سے کیسے چھوڑ سکتی تھیں لیکن حالات کی ستم ظریفیوں نے انھیں مجبور و بے بس کر دیا تھا، وہ زبان کھول کر اس گھر کی خوشیاں برباد نہیں کرنا چاہتی تھیں، چپ چاپ اپنے وجود کو درمیان سے ہٹا لینے کی خواہشمند تھیں۔

برآمدے میں کھڑی، محمود حسین کے جانے کے بعد بھی وہ بڑی دیر تک اپنے خیالات میں کھوئی رہیں پھر فراز کی آواز سُنائی دی تو اُن کے خیالات کا شیرازہ بکھر گیا، اُنھوں نے نظریں گھما کر دیکھا، فراز منہ بسورتا چلا آرہا تھا، ممتا کے جذبے میں اُبال آیا تو وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی خود ہی اس کے قریب چلی گئیں، جھک کر جلدی سے پوچھا،

"کیا بات ہے بیٹے ——— تم یہ رو کیوں رہے ہو؟"

"وہ ——— وہ ممانی جان نے مجھے ڈانٹ کر بھگا دیا۔" فراز نے آنکھ ملتے ہوئے جواب دیا۔

"کیوں ———" شائستہ بیگم تڑپ اُٹھیں "تم نے کیا قصور سرزد ہوا تھا؟"

"میں اور ناجیہ لوڈو کھیل رہے تھے ——— ممانی جان آگئیں ——— مجھے غصے سے گھورنے لگیں پھر کہنے لگیں کہ جاؤ ——— جا کر پڑھو۔" فراز نے بڑے معصوم انداز میں سسکتے ہوئے کہا "ناجیہ نے بھی کہا تھا کہ بازی پوری کرنے کے بعد پڑھیں گے لیکن ممانی جان ——— وہ ایک دم گندی ہیں ——— گندی ہیں، ہر وقت مجھے ڈانٹتی رہتی ہیں۔"

"بُری بات ہے بیٹے ——— بڑوں کے لئے ایسی بات نہیں کرتے۔" شائستہ بیگم نے فراز کو چومتے ہوئے

کہا "چلو، چل کر منہ ہاتھ دھو کر پہلے ناشتہ کرو پھر پڑھنے کے لئے بیٹھ جاؤ۔"

"میں کل پھر ناجیہ کے ساتھ کھیلوں گا ——" فراز نے ضد کی۔

"ضرور کھیلنا بیٹے لیکن پہلے پڑھائی اس کے بعد کھیل —— کیا سمجھے؟"

"امی —— ناجیہ کہہ رہی تھی کہ وہ بڑی ہو کر لیڈی ڈاکٹر بنے گی ——" فراز نے بڑی سادگی سے سوال کیا "میں بڑا ہو کر کیا بنوں گا؟"

"تم —— تم بڑے ہو کر فوجی بنو گے۔" شائستہ بیگم نے بیٹے سے لاڈ کرتے ہوئے کہا "کیوں ٹھیک ہے نا ——"

"ہاں —— میں بڑا ہو کر فوجی بنوں گا۔" فراز نے جوش میں کہا "میرے پاس بندوق بھی ہوگی۔ پھر ممانی جان نے مجھے ڈانٹا یا ناجیہ کے ساتھ کھیلنے کو منع کیا تو میں ٹھائیں سے گولی مار دوں گا۔"

"پھر تم نے گندی بات کی۔" شائستہ بیگم فراز کو سمجھاتے ہوئے بولیں "فوجی کسی کو گولی نہیں مارتے، ملک و قوم کی خدمت کرتے ہیں۔"

"لیکن دشمن کو گولی بھی تو مارتے ہیں۔" فراز نے سنجیدگی سے کہا۔

"اچھا —— چلو، پہلے چل کر پڑھ لکھ لو، پھر بڑے ہو کر خود ہی فیصلہ کر لینا کہ دشمن کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" فراز نے خوش ہو کر کہا۔ پھر لفٹ رائٹ کی آوازیں منہ سے نکالتا انکسی کی طرف مارچ کرنے لگا۔

✶

حسب دستور ممدو اپنے سرونٹ کوارٹر کے باہر نیم کے تناور درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا عاشی کی واپسی کی راہ تک رہا تھا، وقت کی رفتار دیکھنے اور اندازہ لگانے کے لئے اُس کے پاس کوئی دستی گھڑی یا کلاک نہیں تھی، عمر کی پختگی اور گردش لیل و نہار نے جو تجربے سکھائے تھے ممدو کے لئے وہی بہت تھے، بدلتے موسم میں چڑھتی اُترتی دھوپ اور پیڑوں کے گھٹتے بڑھتے سائے اُسے وقت کا احساس دلاتے رہتے، آج تک اُس نے وقت کا اندازہ لگانے میں کبھی غلطی نہیں کی تھی اس لئے کہ حالات نے اُسے وقت اور گزرتی ساعتوں کے ایک ایک پل کی اہمیت کا اندازہ لگانے کا عادی بنا دیا تھا۔

زمانے کی رفتار اور راستوں کے نشیب و فراز نے ممدو کو اُس کی حیثیت کا بارہا احساس دلایا تھا، لیکن یہی تجربے اُس کے لئے بہترین اتالیق، بہترین رہبر اور بہترین دوست ثابت ہوئے، ان ہی تجربات کی روشنی میں اُس نے جینے کا ڈھنگ پا لیا تھا، زندگی گزارنے کا سلیقہ سیکھ لیا تھا۔

قدرت نے اُسے دوسروں کی خدمت کرنے کے لئے پیدا کیا تھا، وہ جانتا تھا کہ خدمت کرتے وقت نظریں اُٹھا کر نہیں، گردن جھکا کر کرنی پڑتی ہے، صبر و ضبط و تحمل سے کام لینا پڑتا ہے، رگوں میں دوڑتے لہو کی گرمی کو نوکِ برداشت سے سرد کرنا پڑتا ہے، اپنی مرضی، اپنی خواہشات اور ذاتی پسند و ناپسند کو یکسر فراموش کر کے دوسروں کے اشاروں پر عمل کرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر محنت مشقت اور جانفشانی کا صلہ ملتا ہے۔

ممدو نے اپنی زندگی کے بچپن سے جو تجربے حاصل کئے تھے وہی اس کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوئے تھے —— ان ہی تجربات کی روشنی میں وہ عاشی کو پروان چڑھانے کا خواہشمند تھا —— پڑھا لکھا کر زندگی کے ٹھوس راستوں کی شناخت کرانے کا آرزومند تھا —— اس مقام تک پہنچانا چاہتا تھا جس کا خواب عاشی کی ماں کی بیمار پلکوں نے دیکھا تھا لیکن یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے، فائزہ کے ساتھ ہی دفن ہو گئے، زمین کی بے پناہ وسعتوں میں گم ہو گئے لیکن ——

بوڑھے ممدو کی نگاہوں میں ایک مجبور و بے بس ماں کی ممتا کی تڑپ کا وہ سماں آج بھی محفوظ تھا وہ الفاظ آج بھی ممدو کے کانوں میں گونجتے رہتے جو فائزہ نے مرنے سے پہلے اس سے کہے تھے، کتنی حسرت تھی

اس ایک جملے میں، کتنے ارمان تھے جو پایۂ تکمیل تک پہنچنے کی آرزو میں وقت سے بہت پہلے ڈوبتی نبضوں کے ساتھ ہمیشہ کے لئے ڈوب گئے تھے پھر وقت کی دھول نے ایک ماں کی تمناؤں کو گردشِ حالات کے بھنور میں پھنسا کر راہوں کے پیچ و خم میں بھٹکا دیا تھا —— مگر ممدو نے بیتی باتوں کے ایک ایک نقش کو اپنے ذہن میں محفوظ کر رکھا تھا۔ اُسے اپنی زندگی سے کوئی لگاؤ، کوئی دلچسپی نہیں تھی —— وہ صرف عاشی کے لئے زندہ رہنا چاہتا تھا۔

عاشی —— جو ابھی کمسن تھی، نادان تھی۔
عاشی —— جو ابھی تک سرد و گرم کی تمیز سے بے خبر تھی ——
عاشی —— جو معصوم تھی —— مظلوم تھی۔
ایک مجبور ماں کی نگاہوں سے ٹپکا ہوا آنسو تھی۔
ایک ادھورا خواب تھی —— قدرت نے اُس کی تکمیل ممدو کے ذمہ ڈال دی تھی —— !!

نیم کا سایہ کیاریوں سے گزر کر حد بندی کی دیوار تک پہنچا تو ممدو اُٹھ کر کھڑا ہو گیا، عاشی کو آج اسکول سے واپسی میں دیر ہو گئی تھی، ممدو کا دل بے چین ہونے لگا، اُس نے روش پر نظر ڈالی جو لکڑ و ندوں کی باڑھ کے ساتھ ساتھ چھوٹے پھاٹک تک چلی گئی تھی لیکن عاشی اُسے بھاٹک کے اُس پار کبھی نظر نہیں آئی، آج پہلا موقع تھا جو ممدو کو نہ جانے کیوں عاشی کی واپسی کا بڑی شدت سے انتظار تھا، جانے کیا بات تھی جو اُس کی بوڑھی نظریں بار بار پھاٹک کی جانب اُٹھ جاتیں —— وہ اس انتظار کو کوئی خوبصورت سا نام دینے سے قاصر تھا، بس اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ عاشی جلدی سے واپس آ جائے۔

کچھ دیر وہ یونہی کھڑا روش کی طرف دیکھتا رہا پھر اچانک اُسے یاد آیا کہ آج عاشی کے سالانہ امتحان کا نتیجہ آنے والا ہے، اسکول جاتے وقت خود عاشی نے اُسے بتایا تھا۔ ممدو کو اپنے آپ پر غصہ آنے لگا، دل ہی دل میں وہ خود کو ملامت کرنے لگا کہ اتنی ضروری بات اُس کے دماغ سے کس طرح نکل گئی —— ابھی تو دوسری جماعت کا نتیجہ آ رہا تھا —— ممدو کو تو ایسے بہت سارے نتیجوں تک عاشی کا ساتھ دینا تھا —— لیکن وہ شاید بہت تیزی سے بوڑھا ہو رہا تھا یا پھر بیٹے کی وقتی جُدائی نے اُس کی ذہنی صلاحیتوں کو اثر انداز کیا تھا۔

ممدو کے ذہن میں رحیمو کا خیال آیا تو اُس کی الجھن دوچند ہو گئی —— فائزہ کی موت کے بعد رحیمو نے کچھ عرصے تک تو عاشی کا بے حد خیال رکھا پھر اُس کے ذہن میں بس ایک ہی دُھن بس کر رہ گئی تھی —— وہ گاؤں سے باہر جا کر کمائی کرنا چاہتا تھا، اسی خیال نے اُسے عاشی کی طرف سے بھی لاپرواہ کر دیا تھا، ممدو نے اُسے بہتیرا سمجھایا، اپنے بڑھاپے اور عاشی کی کمسنی کا احساس دلایا لیکن رحیمو کے سر میں جو سودا سما گیا تھا وہ کسی طرح کم نہ ہوا اور ایک دن وہ خاموشی سے دولت کما کر بڑا آدمی بننے کے خواب کی تکمیل کی خاطر گاؤں چھوڑ کر باہر چلا گیا —— ممدو کو یہ بات رحیمو کے جانے کے بعد اُس کے دوست نے بتائی تھی۔

"واپسی کا بھی کچھ بولا ہے —— یا وہیں پردیس میں مرکھپ جانے کے ارادے سے گیا ہے۔" ممدو نے جھلا کر دریافت کیا۔

"کیسی بات کرتے ہو چاچا —— رحیمو تمہارا اپنا خون ہے، کوئی غیر تو نہیں اور پھر وہ کمانے کے لئے باہر گیا ہے، چار پیسے جمع ہو جائیں گے تو واپس آ کر اپنا کاروبار شروع کر دے گا۔" رحیمو کے دوست نے ممدو کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا "چاچا، تم تو بس اب اُس کی واپسی کا انتظار کرو اور اُس کے حق میں کامیابی کی دعا مانگو —— رحیمو کہہ رہا تھا کہ اپنا کاروبار شروع کرنے کے بعد وہ تمہیں ملازمت نہیں کرنے دیگا۔"

"پھر —— کیا گھر میں رکھ کر میرا اچار ڈالے گا۔" وہ تلملا کر بولا "سچ سچ بتا، وہ کب تک واپسی کا کہہ رہا تھا۔"

"اس کا اندازہ تو اُسے پردیس پہنچنے کے بعد ہی ہوگا۔" رحیمو کے دوست نے اپنی جان چھڑانے کی خاطر کہا "رحیمو کہہ رہا تھا کہ ملازمت ملتے ہی تمہیں تفصیل سے خط لکھے گا۔"

"خاک سیکھے گا ——" ممدو غصے سے بیچ و تاب کھانے لگا "ایک معصوم بچی کی پرورش کا بوجھ برداشت نہ کر سکا، گیا ہے پردیس میں قارون کا خزانہ تلاش کرنے —— کم بخت کہیں کا"

"آج تم جھلا رہے ہو چاچا لیکن کل جب ڈاکیہ رحیمو کی طرف سے بھیجی ہوئی بڑی بڑی رقموں کا منی آرڈر لے کر آیا کرے گا تو تم بھی بیٹے کے گن گانا شروع کر دو گے"

"چل —— دفع ہو جا ادھر سے —— بڑا آیا کہیں سے رحیمو کا خیر خواہ بن کر" ممدو نے ڈانٹ کر اُسے بھگا دیا پھر عاشی کو اٹھا کر سینے میں چھپا لیا۔

کچھ دنوں بعد اُسے رحیمو کا خط ملا۔ اُس نے باپ کو اطلاع دی تھی کہ اُسے قسمت سے ایک اچھی ملازمت مل گئی ہے، تنخواہ بھی معقول ہے اور آئندہ ترقی کے امکان بھی ہیں —— کچھ باتیں پردیس کے بارے میں تحریر کی تھیں، عاشی کی خیریت بھی دریافت کی تھی۔ اور —— روانگی کے وقت باپ سے ملے بغیر چلے جانے پر کھل کر شرمندگی کا اظہار بھی کیا تھا لیکن ممدو پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا، اُس نے رحیمو کو اس خط کا جواب بھی نہیں دیا —— دل پر جبر کر کے خاموش رہنے کی ٹھان لی۔

ممدو کو اپنے اکلوتے اور جوان بیٹے سے بے پناہ محبت تھی مگر اُسے رحیمو کا یوں کچھ کہے سنے بغیر اچانک چلا جانا ناگوار گزرا تھا، اُسے اس بات کا ملال بھی تھا کہ رحیمو نے عاشی کے سلسلے میں اس کا ہاتھ بٹانے کے بجائے اپنے مستقبل کی زیادہ فکر کی تھی سو رحیمو سے خفا تھا، اُس نے طے کر لیا تھا کہ جب تک رحیمو پردیس سے واپس آ کر اس سے معافی نہیں مانگے گا وہ، اس سے کوئی واسطہ کوئی رابطہ نہیں رکھے گا ——!!

جب تک عاشی کمسن رہی ممدو اپنے گھر تک محدود رہا پھر وقت کے تقاضوں نے اُسے بیرسٹر محمود حسین کے ہاں ملازمت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا، اُس نے طے کر لیا تھا کہ اگر زندگی نے وفا کی تو عاشی کو وہ مقام ضرور دلائے گا جس کی وہ مستحق تھی اور ان خوابوں کی تکمیل میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرے گا جو فائزہ نے عاشی کے لئے دیکھا تھا۔

اپنے خیالوں میں گم وہ آنے والی کل کے بارے میں اتنا محو ہو گیا کہ اُسے عاشی کی آمد کی ایک ذرا خبر تک نہ ہوئی، پھر عاشی کی معصوم آواز اُس کے کانوں میں گونجی تو یوں چونکا جیسے کچی نیند میں کوئی خواب دیکھتے دیکھتے اچانک بیدار ہو گیا ہو —— عاشی اس کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی، ممدو نے نظر بھر کر عاشی کو دیکھا، اُسے زبان ہلانے کی ضرورت پیش نہیں آئی، عاشی کی معصوم آنکھوں میں فرشتوں جیسی چمک دیکھ کر ہی اُسے نتیجے کا اندازہ ہو گیا تھا، وہ گھٹنے توڑ کر عاشی کے سامنے بیٹھ گیا، اُس کی پلکوں کے گوشے نمناک ہونے لگے، یہ خوشی کے انمول آنسو تھے جو ایک غریب کے دل سے اُبھر کر اُس کی آنکھوں تک آ گئے تھے۔

"بابا —— تم نے پوچھا نہیں کہ میرے نتیجے کا کیا ہوا؟" عاشی نے اپنا بستہ زمین پر رکھ کر ممدو کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بڑے لاڈ سے کہا۔

"ارے ہاں —— میں تو بھول ہی گیا تھا" اُس نے عاشی کی خوشی کی خاطر انجان بنتے ہوئے جواب دیا پھر چہرے پر سنجیدگی سجا کر پوچھا "کیا ہوا میری گڑیا کے نتیجے کا ——؟"

"تمہارا دل کیا کہتا ہے بابا ——" عاشی کے چہرے پر مسرتیں رقصاں تھیں۔

"میرا دل —— میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ میری بیٹی پاس ہو گئی"

"پورے کلاس میں اوّل آئی ہوں" عاشی نے ممدو کے گلے میں بانہیں ڈال کر جھولتے ہوئے کہا "اسکول کھلے گا تو میں تیسری جماعت میں ہوں گی"

"اسکول کب کھلے گا ——؟" ممدو نے عاشی کے بالوں کو چومتے ہوئے دریافت کیا۔

"گرمیوں کی چھٹی کے بعد ——" عاشی نے بتایا۔

"پھر تو میری گڑیا دو مہینے تک خوب آرام کرے گی" ممدو اُس کی پیشانی سے بالوں کی لٹ ہٹاتا ہوا بولا "ہر وقت اپنے بابا کی نظروں کے سامنے رہے گی —— ہم دونوں مل کر کھیلا کریں گے"

"تم —— میرے ساتھ کھیلو گے بابا" عاشی نے بڑی بوڑھیوں کی طرح اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کو چھپانے کی خاطر منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں —— کیوں، کیا اس میں کوئی حرج ہے؟" ممدو نے حیرت سے پوچھا۔

"کوئی بھی نہیں ——" عاشی نے کہا پھر جلدی سے بات بدل کر بولی "ایک بات کہوں بابا؟"

"کہو میری گڑیا ——"

"تم مجھے تیسری جماعت کی کتابیں لا دو"

"اتنی جلدی کیا ہے ——" ممدو بولا "ابھی تو تمہاری چھٹیاں شروع ہوئی ہیں"

"تم نہیں سمجھتے بابا ——" عاشی نے بڑے بھولپن سے کہا "میں چھٹیوں میں اگلی جماعت کی ساری کتابیں پہلے ہی سے پڑھ لوں گی تو کلاس میں سب سے آگے رہوں گی ——"

"ٹھیک ہے" ممدو نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا پھر کچھ سوچ کر پوچھا "ناجیہ بی بی کا کیا بنا —— اُس نے بھی تو دوسری جماعت کا امتحان دیا تھا، آج شاید اس کا نتیجہ بھی آ گیا ہو"

"میرا دل کہتا ہے کہ ناجیہ بھی ضرور پاس ہو جائے گی" عاشی نہایت سادگی سے بولی "اُسے مس بھی تو پڑھانے آتی ہیں"

"دو چار جماعتیں اور نکال لو —— پھر میں تمہارے لئے بھی ایک اچھی سی مس کا بندوبست کر دوں گا" ممدو نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا "جب تو بڑی ہو جائے گی تو میں تیرا داخلہ بھی بڑے اسکول میں کرا دوں گا ——"

"بابا —— آنٹی کہہ رہی تھیں کہ اس بار وہ مجھے بھی ناجیہ بی بی کے ساتھ بڑے اسکول میں داخل کرائیں گی" عاشی نے اچانک بتایا تو ممدو چونک اُٹھا "سچ" اُس نے عاشی کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بابا ——" عاشی نے کہا "ان ہی نے تو ہمارا شاکر میں بیگم صاحبہ کے بجائے انہیں آنٹی کہا کرو"

"یہ اُن کی مہربانی ہے —— ورنہ ہمارے اور اُن کے درمیان تو زمین و آسمان کا فرق ہے" ممدو سرد آہ بھر کر بولا پھر اچانک اُس نے بڑی فراخ دلی سے پوچھا "میری گڑیا اپنی کامیابی پر کیا انعام لے گی؟"

"انعام ——" عاشی نے معصومیت سے ممدو کے چہرے پر اُبھرنے والی خوشیوں کو دیکھا پھر بہت غور کرنے کے بعد بڑی سنجیدگی سے بولی "بابا —— سُنا ہے اللہ میاں بزرگوں کی دُعا ضرور قبول کر لیتے ہیں"

"ہاں بیٹی —— وہ مانگنے والوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا"

"پھر تم مجھے یہی دعا دو بابا کہ میں ہمیشہ ہر کلاس میں اوّل آتی رہوں"

"خدا تجھے ہمیشہ کامیاب کرے" ممدو نے فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر عاشی کو کھینچ کر اپنے سینے کی گہرائیوں میں چھپاتے ہوئے کہا "میری دعا ہے کہ تو زندگی کے ہر امتحان میں کامیاب ہو، خوشیاں تیرے قدم چومیں اور تجھے کبھی مایوسی کا منہ نہ دیکھنا پڑے"

"آمین کہو نا بابا" عاشی نے ممدو کے خاموش ہونے پر اُسے نصیحت کرتے ہوئے کہا "فرازکی امی ایک دن بتا رہی تھیں کہ اگر دعا کے ساتھ آمین نہ کہا جائے تو وہ پوری نہیں ہوتی ——"

"آمین —— آمین" ممدو نے جلدی سے دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرتے ہوئے کہا تو عاشی بے اختیار کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"بابا ——" اُس نے ممدو کو مسکراتی نظروں سے تکتے ہوئے پوچھا "تم نے کہاں تک پڑھا ہے ——؟"

"میں نے ——" ممدو نے پُرخیال انداز میں سر کھجایا پھر مسکراتے ہوئے بولا "میں نے پھولوں کے بیج سے لے کر بڑے بڑے تناور درخت تک سب کچھ پڑھا ہے، اگر میں نے یہ سب کچھ نہ پڑھا ہوتا تو تم ناجیہ بی بی کے ساتھ سبزے پر بیٹھ کر کیسے کھیل سکتی تھیں"

عاشی کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی لیکن ناجیہ کی آواز سُن کر اُس کی توجہ دوسری جانب مبذول ہوگئی۔ پلٹ کر دیکھا تو ناجیہ دوڑتی ہوئی اُسی کی سمت آ رہی تھی، عقب میں شمسہ بیگم بھی خوش خوش نظر آ رہی تھیں۔

"عاشی ـــــ عاشی ـــــ میں نے دوسری جماعت بھی پاس کر لی۔" ناجیہ نے اس کے قریب آ کر ہانپتے ہوئے پوچھا "تمہارا کیا ہوا ـــــ؟"

"میں بھی پاس ہوگئی۔" عاشی نے اُسے بتایا۔

"مبارک ہو ـــــ" ناجیہ نے اُس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں بھی مبارک ہو ـــــ" عاشی نے گرمجوشی سے جواب دیا۔

شمسہ بیگم قدم بڑھاتی قریب آئیں تو ممدو جلدی سے ہاتھ باندھ کر اُن کے سامنے جھک گیا۔

"سلام عرض کرتا ہوں بیگم صاحبہ۔"

"عاشی کے نتیجے کا کیا رہا مالی بابا۔" شمسہ بیگم نے عاشی پر محبت سے نظر ڈالتے ہوئے ممدو سے پوچھا۔

"آپ کی دعا اور اللہ کی مہربانی سے پاس ہوگئی ہے۔"

"مجھے یہی اُمید تھی۔" شمسہ بیگم نے کہا پھر عاشی کو شاباش دیتی ہوئی فیصلہ کُن انداز میں بولیں "اب تیسری جماعت میں تم اور ناجیہ ساتھ ساتھ پڑھو گی ـــــ"

"بیگم صاحبہ ـــــ میں....."

"مالی بابا ـــــ" شمسہ بیگم نے ممدو کا جملہ کاٹتے ہوئے کہا "میں نے عاشی سے وعدہ کیا تھا کہ تیسری جماعت میں اُسے بھی ناجیہ کے ساتھ کونٹ میں داخل کراؤں گی ـــــ کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے ـــــ؟"

"بات اعتراض کی نہیں بیگم صاحبہ ـــــ لیکن میں ـــــ"

"تمہیں اس سلسلے میں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" شمسہ بیگم بولیں "عاشی کے پڑھائی وغیرہ کے تمام اخراجات میں برداشت کروں گی۔"

"خدا آپ کو اس مہربانی کا اجر دے گا ـــــ" ممدو نے دبی زبان میں کہا۔

"چلو عاشی ـــــ آج ہم دونوں پاس ہونے کی خوشی میں خوب جی بھر کر ہنگامہ کریں گے اور ہاں ـــــ پپا سے انعام بھی تو لینا ہے۔" ناجیہ نے کہا پھر عاشی کا ہاتھ تھام کر اُسے سبزے کی طرف گھسیٹ لے گئی۔

شمسہ بیگم دونوں معصوم بچیوں کو مسکراتی نظروں سے دیکھتی رہیں پھر پلٹ کر ممدو سے بولیں۔

"مالی بابا ـــــ میں نے عاشی کے سلسلے میں جو کچھ کہا ہے وہ میری اپنی خوشی ہے، آپ اسے احسان نہ سمجھیے گا۔"

"میں ـــــ میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں بیگم صاحبہ۔" ممدو کی آواز بھرا گئی۔

"اس میں شکریہ کی کیا بات ہے، عاشی جیسی ذہین بچی کو تو اعلیٰ تعلیم دلوا کر مجھے بے حد مسرت ہوگی اور پھر میری یہ خواہش بھی ہے کہ ناجیہ اور عاشی ساتھ ساتھ پڑھیں۔" شمسہ بیگم نے کہا "اس طرح ناجیہ بھی عاشی سے بہت کچھ سیکھ لے گی۔"

"میں آپ کا یہ احسان تمام زندگی فراموش نہیں کروں گا۔" ممدو نے ہاتھ باندھ کر کہا "جب تک زندہ رہوں گا آپ کے قدموں میں پڑا رہوں گا ـــــ آپ لوگوں کی خدمت کرتا رہوں گا۔"

"ایک بات پوچھوں مالی بابا ـــــ"

"پوچھئے بیگم صاحبہ ـــــ"

"کیا تم ناجیہ سے اتنا پیار نہیں کرتے جتنا عاشی سے کرتے ہو۔"

"میں مالی ہوں بیگم صاحبہ ـــــ" ممدو نے دبی زبان میں کہا "ننھے پودوں کی دیکھ بھال کرنا اور پھلتے پھولتے دیکھنا میری عادت ہے ـــــ میرے لئے رات کی رانی اور گلاب دونوں برابر ہیں۔"

"میں بھی تم سے یہی کہنا چاہ رہی تھی کہ عاشی مجھے ناجیہ سے کم عزیز نہیں۔"

"کیا بیرسٹر صاحب اس بات کو پسند کریں گے کہ عاشی اور ناجیہ بی بی ایک ہی اسکول میں ایک ساتھ پڑھیں؟" ممدو نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"کیوں؟ ـــــ" شمسہ بیگم نے وضاحت طلب نظروں سے پوچھا "کیا تمہیں ہمارے خلوص پر شبہ ہے؟"

"بات خلوص کی نہیں ـــــ وقت کی ہے بیگم صاحبہ اور وقت کو بدلتے دیر نہیں لگتی ـــــ"

"پھر تم یہی سمجھ لو کہ قدرت نے عاشی کے دن پھیر دیئے ہیں اور اب وہ ہماری سرپرستی میں تعلیم حاصل کرے گی۔" شمسہ بیگم نے ایک خاص ادا سے بالوں کی آوارہ لٹ کو گردن جھٹک کر پشت کی سمت اچھالا پھر آہستہ سے گھومیں اور چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی کوٹھی کی طرف چل گئیں۔

ممدو مجسمۂ حیرت بنا اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا رہا، اُس نے عاشی کے لئے جو خواب دیکھے تھے وہ اب پورے ہوتے نظر آ رہے تھے، شمسہ بیگم کی محبت اور اپنائیت عاشی کے مستقبل کو تابناک بنانے کی ضمانت تھی۔ اُسے یقین تھا کہ اب عاشی کو وہ مقام ضرور مل جائے گا جس کی تمنا حسرت بن کر فائزہ کے ساتھ دفن ہوگئی تھی۔

بڑی دیر تک وہ اپنے خیالوں میں گم عاشی کے بارے میں حسین تانے بانے بنتا رہا، اُمیدوں کے دوش پر آرزوؤں کے محل تیار کرتا رہا، وقت کی ایک کروٹ نے جیسے اُس کے سر سے سارے بوجھ اتار دیئے تھے ـــــ وہ خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا ـــــ حالات نے اُس کی ذمہ داریوں کو جیسے پلک جھپکتے میں پورا کر دیا تھا ـــــ قدرت اچانک کس قدر مہربان ہوگئی تھی، اُس نے گزرے ہوئے کل کے بارے میں سوچا۔

کل ـــــ جو بے حد تاریک اور کربناک تھا ـــــ!

اُس نے حال پر ایک نظر ڈالی جو عاشی کے حق میں بے حد سازگار ہوگیا تھا۔ اور مستقبل ـــــ مستقبل کے بارے میں وہ بدلتے حالات کے پیشِ نظر بہت زیادہ پُر اُمید تھا ـــــ لیکن ـــــ

اچانک ایک خیال ممدو کے ذہن میں کانٹوں کی چبھن بن کر بڑی سرعت سے ابھرا۔

کہیں وہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ـــــ؟

شائستہ بیگم ایک خاموش تماشائی کی حیثیت سے بدلتے ہوئے حالات کا جائزہ لے رہی تھیں۔
صوفیہ خاتون کی اچانک موت نے حالات کو اُن کے حق میں ہموار سازگار کر دیا تھا۔ کل تک جس گھر میں اُن کی بھی کوئی آواز تھی آج وہاں صرف شمسہ بیگم کا راج تھا اور شمسہ وقت کی رفتار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حالات پر پوری طرح حاوی تھیں۔ گھر کے سارے نظام کی کایا ایک بزرگ کا سایہ اُٹھتے ہی پلٹ گئی تھی۔

ہر چیز کو آہستہ آہستہ ایک نئی ترتیب دی جا رہی تھی، نئے رنگ اور نئے سانچوں میں ڈھالا جا رہا تھا، پرانے اطوار کو بتدریج بدلا جا رہا تھا، غرضیکہ اب کوٹھی میں صرف شمسہ بیگم کی حکومت تھی، وہ جو چاہتیں کر گزرتیں کوئی روک ٹوک اور دخل اندازی کرنے والا نہیں تھا ـــــ یوں بھی وہ گھر کی مالکن تھیں ـــــ!

شائستہ بیگم محمود حسین سے نہر والے مکان میں منتقل ہونے کی اجازت حاصل کر چکی تھیں اور اب کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھیں کہ اپنا عندیہ شمسہ بیگم پر بھی ظاہر کر دیتیں، اُن کی خواہش تھی کہ صوفیہ خاتون کی دلیر جھپٹے سے پہلے اس غلط فہمی کو دور کر دیں جو شمسہ بیگم کے دل میں اُن کے خلاف گھر کر چکی تھی ـــــ اگر وہ چاہتیں تو شمسہ بیگم سے اجازت حاصل کئے بغیر بھی محمود حسین کی کوٹھی کو خیرباد کہہ سکتی تھیں لیکن وہ جانتی تھیں کہ اگر ایسا ہوا تو شمسہ بیگم کو بات بنانے کا موقع مل جائے گا ـــــ وہ خلیج جو دلوں کے درمیان پیدا ہو چکی تھی اور بڑھ جائے گی۔

شائستہ بیگم اس خلیج کو پاٹنا چاہتی تھیں۔ وہ اس دلیر سے ہمیشہ کے لئے منہ نہیں موڑ سکتی تھیں جس نے زندگی کے نشیب و فراز میں ہر دور میں اور ہر موڑ پر اُن کا ساتھ دیا تھا، اُن کے زخموں کو مرہم عطا کیا تھا، سہارا دیا تھا اور شوہر کی موت کے بعد اُن کی ہوگی کو عزت سے سر چھپانے کے لئے ایک محفوظ پناہ گاہ فراہم کی تھی۔ وہ اتنی خود غرض نہیں تھیں کہ صوفیہ خاتون کی آنکھ بند ہوتے ہی ... اُن احسانوں کو یکسر فراموش کر دیتیں جو بے حساب تھے۔ ان مہربانیوں کو بھلا دیتیں جنھوں نے قدم قدم پر اُن کی ڈگمگاتی زندگی کو سنبھالا دیا تھا اور ـــــ

ابھی تو اس دلیر سے شائستہ بیگم کی بہت ساری اُمیدیں اور تمنائیں وابستہ تھیں ـــــ فراز اور ناجیہ کے لئے اُن کے سُو نے دل میں جس حسین خواب نے کروٹ لی تھی اُس کی تعبیر بھی اسی چوکھٹ سے وابستہ تھی، انھیں نے ناجیہ کو مستقبل میں اپنی بہو بنانے کا جو ارادہ کیا تھا وہ اب بھی اُن کے دل کے نہاں خانوں میں محفوظ تھا ـــــ یہ اور بات تھی کہ عارضی طور پر وقت کی رفتار اور بدلتے حالات کو دیکھتے ہوئے شائستہ بیگم نے خود کو نہر لیب کر لیا تھا لیکن وہ نا اُمید نہیں ہوئی تھیں۔

ایک اپنی تنہا ذات ہوتی تو شائستہ بیگم کو شاید زندگی کی طویل، سنسان اور ویران راہوں پر یوں پھونک پھونک کر قدم اُٹھانے کی ضرورت پیش نہ آتی جیسے کبھی ہوا رکھی سوکھی کھا کر تنگی و ترشی سے گزر بسر کر لیتیں لیکن فراز کے مستقبل کے خیال نے انھیں بہت زیادہ محتاط اور حساس بنا دیا تھا۔

فراز ـــــ جو شائستہ بیگم کے ڈھلتے ہوئے پیار ـــــ اور اُجڑتے ہوئے سہاگ کی آخری نشانی تھا۔
فراز ـــــ جس کے دم سے شائستہ بیگم کا ماضی ابھی زندہ تھا ـــــ تابندہ تھا۔
فراز ـــــ جس نے شائستہ بیگم کو بیوگی کے جانکاہ صدمے کے باوجود زندگی کی نوید دی تھی۔
فراز ـــــ جو ابھی کمسن تھا۔

معصوم تھا۔
جسے ماں کے سائے کی ضرورت تھی ـــــ
ایک ایسے اتالیق کی ضرورت تھی جو اُس کی انگلی تھام کر حالات کے بھنور سے نکال سکتا۔
ایک ایسے اتالیق کی ضرورت تھی جو اُس کی انگلی تھام کر حالات کے بھنور سے نکال سکتا۔
خضر نصرت کر سکتا۔

ان ہی خیالات نے شائستہ بیگم کو زمانے کی سرد و گرم سہنے اور برداشت کرنے کا عادی بنا دیا تھا لیکن اُن کا دامن پھر بھی نہیں تھا کہ اس پر جوٹ لگتی اور وہ نہ تڑپتا چنانچہ آج کل اُن کی کیفیت کبھی کچھ ایسی ہی تھی۔

فراز کے مقابلے میں عاشی پر شمسہ بیگم کی بڑھتی ہوئی عنایتیں اور مہربانیاں شائستہ بیگم کے دکھے دل کے لئے کسی تازیانے سے کم نہ تھیں لیکن وہ سب نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کر رہی تھیں۔

شمسہ بیگم جو کل تک عاشی کے وجود کو بھی ناجیہ کے قرب میں دیکھنے کو تیار نہ تھیں اُس پر اپنی نوازشوں کی بارش کر رہی تھیں، عاشی کے لئے نئے نئے لباس سلوائے جا رہے تھے۔ نئی نئی کتابیں آ رہی تھیں، ناجیہ کے ساتھ پڑھنے کی خاطر ایک علیحدہ کمرے کو نئے سرے اور نئی ترتیب سے سنوارا گیا تھا، نئے نئے فرنیچر خریدے گئے تھے، عاشی کو ناجیہ کے برابر لانے کے لئے ان تمام باتوں کا اہتمام کیا جا رہا تھا جو شمسہ بیگم کے خیال میں اشد ضروری تھے۔ وہ تمام آسائشیں فراہم کی جا رہی تھیں جو ناجیہ کو حاصل تھیں۔

شائستہ بیگم دل پر جبر کئے سب کچھ دیکھتی رہیں ـــــ انھیں عاشی کی معصوم ذات سے کوئی بیر نہیں تھا، فراز کی طرح وہ عاشی کو بھی محبت اور پیار کا مستحق سمجھتی تھیں لیکن وقت نے انھیں بے حد حساس بنا دیا تھا، وہ اس بات کو بھی سمجھ رہی تھیں کہ عاشی کے لئے جو کچھ بھی کیا جا رہا ہے اُس میں شمسہ بیگم کی اپنی مصلحتیں اور اپنی غرض پوشیدہ تھی، کسی ہمدردی یا انسانیت کے جذبوں کا کوئی دخل نہیں تھا۔

صوفیہ خاتون کے لاڈ پیار نے ناجیہ کو بڑائی کا جو احساس دلایا تھا وہ اُس کے حق میں زہر تھا۔ امارت کے اس احساس اور برتری کے گھمنڈ نے ناجیہ کو غلط راہ پر لگا دیا تھا۔ وہ ذہین تھی لیکن پڑھائی سے کتراتی تھی... آئے دن اُس کے لئے ایک نئی مس کا بندوبست کیا جاتا ـــ کچھ دنوں تک وہ بڑی توجہ سے کتابوں میں دل لگاتی نئی ٹیچر کا احترام کرتی لیکن پھر اسے برتری کا احساس ہوتا تو وہ ٹیچر کی بڑائی کو یکسر نظر انداز کر کے اس پر بچکانہ تنقید شروع کر دیتی۔

ناجیہ معصوم تھی، کمسن تھی ـــــ غلط تربیت اور بے جا لاڈ پیار نے اُسے بگاڑ دیا تھا، وہ ضدی ہو گئی تھی، ٹیچر کو اس کا انداز ناپسند ہوتا تو اُسے ڈانٹتی ڈپٹتی پھر محمود حسین یا شمسہ بیگم سے شکایت ہوتی۔ ناجیہ کو خبر ہوتی تو اُس کے معصوم دل میں ٹیچر کے خلاف بغاوت، نفرت اور حقارت کا غیر مانوس احساس جاگ اٹھتا ـــــ وہ ماں باپ کے سامنے زبان کھولنے یا بحث کرنے سے کتراتی تھی لیکن اسے دادی کی ذات پر بڑا گھمنڈ اور اعتماد تھا، قبل اس کے کہ شمسہ بیگم یا محمود حسین ناجیہ کو ٹیچر کے سلسلے میں کوئی نصیحت یا تنبیہ کرتے وہ دادی کے پاس پہنچ کر کچھ ایسے معصوم اور موثر انداز میں اپنا دکھڑا روتی کہ صوفیہ خاتون بیک جنبش زباں ٹیچر کی چھٹی کر دیتیں اور ناجیہ ـــــ

ناجیہ اپنی فتح پر دل کھول کر ہنستی، خوش ہوتی اور اسی فتحمندی کے احساس اور غرور و تمکنت نے آہستہ آہستہ اس کے معصوم اور بچے ذہن میں اپنی جڑیں مضبوط کرنی شروع کر دی تھیں، ـــــ دادی کی اچانک موت کے بعد ناجیہ سہم گئی تھی، یہی وہ وقت تھا کہ اگر شمسہ بیگم ذرا عقلمندی اور دور اندیشی سے کام لیتیں تو ناجیہ غلط راہ روی کا شکار ہونے سے بچ جاتی لیکن شمسہ بیگم نے ایسا نہیں کیا۔ اس خیال سے کہ صوفیہ خاتون کی موت کا صدمہ کہیں ناجیہ کے ذہن کو نہ اکھاڑ دے، شمسہ بیگم نے اس پر نوازشیں دوچند کر دیں اور اس طرح اُن کے طرز عمل نے ناجیہ کے ذہن سے وہ تمام خوف اور اندیشے یکسر ختم کر دیئے جو دادی کی موت کے سبب سوا لیہ نشان بن کر اُس کے ذہن میں کھبنے لگے تھے۔

شمسہ بیگم اپنے نرم برتاؤ سے مٹی کا دل بھی اپنی مٹھی میں کر لینا چاہتی تھیں لیکن اُن کی ڈھیل نے ناجیہ کو کرنے کا عادی ہوتی جا رہی تھی، شمسہ بیگم کو اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن اس وقت جب پانی سر سے اونچا ہو گیا۔

بات اُن کے اختیار سے باہر ہونے لگی' اگر وہ چاہتیں تو اپنے سخت برتاؤ سے بھی ناجیہ کی تربیت کر سکتی تھیں لیکن انھیں اندیشہ لاحق تھا کہ کہیں اُن کی سختی بیٹی کے دل میں اُن کے خلاف نفرت کی چنگاریاں نہ بھر دے ـــــ دونوں ایسا راستہ اختیار کرنے کی خواہشمند تھیں جس سے سانپ بھی مر جاتا اور لاٹھی ٹوٹنے کا احتمال بھی نہ ہوتا اور اس ذہنی کشمکش کے دوران اُن کی دُور رس نگاہوں نے ناجیہ کی اصلاح کے لئے عاشی کا انتخاب کر لیا۔

شائستہ بیگم حالات کی نزاکتوں اور وقت کے تقاضوں کو بخوبی سمجھ رہی تھیں' اگر ایک ذرا سی غلط فہمی شمسہ بیگم کے دل میں گھر کر لیتی تو عاشی کی جگہ فراز بھی لے سکتا تھا لیکن قدرت کی ستم ظریفیوں اور فلک کج رفتار کی گردشوں نے شائستہ بیگم کے ٹوٹے ہوئے دل پر ایک اور چرکہ لگانے کی ٹھان رکھی تھی ـــــ آج بھی وہ کھلے آسمان کے نیچے لان پر بیٹھی قدرت کی کارگزاریوں پر غور کر رہی تھیں کہ فراز نے اُن کے قریب آ کر کہا۔

"امی' امی ـــــ میں بھی اپنے پڑھنے کے لئے ویسی ہی میز کرسی لوں گا جو ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہوتی ہیں جیسی تمہاری کلاس میں ہے" شائستہ بیگم نے گھوم کر فراز کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ویسی نہیں ـــــ ویسی جیسی مانی جان نے عاشی باجی کے لئے منگائی ہے" فراز نے ضد کرنے والے انداز میں تفصیل بتاتے ہوئے کہا "کتابیں رکھنے کے لئے ایک شیشے کی الماری بھی ہے اور ـــــ بہت سارے سٹکر اور پنسلیں بھی ہیں"

شائستہ بیگم کے دل پر گھونسہ سا لگا' ایک ہی گھر میں' ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہوئے چھوٹائی بڑائی کا یہ احساس اور امیری غریبی کا فرق فراز کے حق میں نفسیاتی طور پر مناسب نہیں تھا ـــــ لیکن وہ بچہ بھی تو نہیں تھا کہ اُسے بہلا کر خاموش کرا دیا جاتا یا کوئی خوبصورت سا کھلونا دے کر وقتی طور پر اُسے ٹال دیا جاتا ـــــ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ جانے اور نقل مکانی جیسے تکلیف دہ حالات نے اُسے خاصا سمجھ دار اور حساس بنا دیا تھا' شائستہ بیگم کی تربیت نے اُسے سنوارنے اور بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی لیکن وہ بچہ ہی تو تھا ـــــ اپنی عمر سے قبل از وقت فراز کیسے حاصل کر سکتا تھا ـــــ؟

"ٹھیک ہے ـــــ" شائستہ بیگم فراز کو دلاسہ دیتے ہوئے بولیں "میں تمہارے لئے نئی میز کرسی منگا دوں گی اس سے بھی اچھی اور خوبصورت جیسی عاشی کے لئے آئی ہے"

"سچ امی ـــــ" فراز کا چہرہ کسی شگفتہ پھول کی طرح کھل کر تر و تازہ نظر آنے لگا' ماں کی گردن میں بانہیں ڈال کر بولا "آپ میری چیزیں کب منگائیں گی؟"

"بہت جلد ـــــ"

"دو چار روز کے اندر ـــــ" فراز نے معصومیت سے پوچھا۔

"ابھی ضد نہیں کرتے بیٹے" شائستہ بیگم اُسے سمجھاتے ہوئے بولیں "کچھ دنوں بعد ہم نئے گھر میں چل کر رہیں گے پھر وہاں تمہارے لئے نئی نئی چیزیں منگا کر اپنے ہاتھوں سے سجاؤں گی"

"نئے گھر میں ـــــ" فراز چونکا' ماں کو وضاحت طلب نظروں سے گھورتے ہوئے بولا "اس گھر میں کیا خرابی ہے امی؟"

"یہ گھر ـــــ یہ گھر بہت چھوٹا ہے فراز بیٹے" شائستہ بیگم نے ہاتھ ملتے ہوئے جواب دیا "نئے گھر میں کمرے بھی زیادہ ہوں گی اور کمرے میں بھی ـــــ میں تمہارے لئے ایک کمرہ علیحدہ کر دوں گی جہاں بیٹھ کر میرا بیٹا خوب دل لگا کر پڑھا کرے گا"

"اکیلے کمرے میں مجھے ڈر بھی تو لگے گا" فراز نے نہایت سادگی سے کہا "یہاں تو پڑھتے وقت آپ میرے قریب ہوتی ہیں"

"وہاں بھی میں اپنے بیٹے کے بالکل قریب رہوں گی" شائستہ بیگم نے انگلیوں سے فراز کے بال سنوارتے ہوئے کہا "رہا ڈر کا سوال تو ڈر تو صرف بزدل بچوں کو لگتا ہے ـــــ بہادر بچے کبھی نہیں ڈرتے۔"

"لیکن نئے گھر میں عاشی باجی اور ناجیہ کہاں ہوں گی" فراز نے سنجیدگی سے اپنا مسئلہ پیش کیا "وہاں میں

کس کے ساتھ کھیلا کروں گا"

"جب تمہارا دل گھبرائے گا میں تمہیں لے کر یہاں آ جایا کروں گی ـــــ تم عاشی اور ناجیہ کے ساتھ کھیل لینا پھر میں تمہیں واپس لے جایا کروں گی" شائستہ بیگم نے فراز کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بڑے لاڈ سے کہا

"کیوں ـــــ ٹھیک ہے"

"نہیں ـــــ" فراز نے بدستور سنجیدگی سے جواب دیا "یہاں مجھے زیادہ اچھا لگتا ہے۔ یہاں ماموں جان بھی تو ہیں جو مجھے پیار کرتے ہیں اور مالی بابا مجھے پھولوں کا گلدستہ بنا کر دیتے ہیں"

"اور مانی جان ـــــ" شائستہ بیگم نے دل ہی دل میں پوچھا۔

"وہ تو ہماری کلاس ٹیچر جیسی ہیں ـــــ ہر وقت غصہ کرتی رہتی ہیں" فراز نے شوخی سے کہا پھر جلدی سے ماں کی آنکھوں میں انکھیں ڈال کر پوچھا "میں سب سمجھ رہا ہوں ـــــ آپ مجھے بہلانے کی کوشش کر رہی ہیں لیکن میں ویسی ہی میز اور کرسی لوں گا جیسی عاشی کے لئے آئی ہے"

"بُری بات ہے بیٹے ـــــ اچھے بچے ضد نہیں کیا کرتے' اور ـــــ"

"اپنی امی کا کہنا فوراً مان لیتے ہیں" فراز نے ماں کا جملہ جسے وہ ہزار بار سُن چکا تھا پورا کرتے ہوئے کہا۔

"میں ضد تو نہیں کر رہا ہوں امی"

"پھر یہ بار بار میز کرسی کی کیا رٹ لگا رکھی ہے" شائستہ بیگم نے قدرے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"یہ تو فرمائش ہے امی جان ـــــ" فراز نے بڑے بھولپن سے کہا "آپ ہی نے تو کہا تھا کہ امتحان میں بچے جب اچھے نمبروں سے پاس ہوتے ہیں تو بڑے لوگ انھیں تحفہ دیتے ہیں اور جب بچوں کی کوئی فرمائش ہوتی ہے تو اسے بھی پوری کرتے ہیں ـــــ جیسے مانی جان نے ناجیہ کی فرمائش پر عاشی باجی کے لئے میز کرسی منگائی ہے"

"اچھا ـــــ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میز کرسی کی فرمائش ناجیہ نے کی تھی"

"اور کیا ـــــ انھوں نے کی ہوگی ورنہ ہماری عاشی باجی تو بہت اچھی ہیں' وہ تو کبھی مانی کے لئے بھی فرمائش نہیں کرتیں"

فراز کی معصوم ذہانت اور اُس کے پیش کردہ جواز پر شائستہ بیگم اپنی سنجیدگی برقرار نہ رکھ سکیں' مسکرا کر بولیں ـــــ "اچھا' ایک بات بتاؤ ـــــ تمہیں کون زیادہ اچھا لگتا ہے' ناجیہ ـــــ یا ـــــ عاشی"

"دونوں ـــــ" فراز شوخی سے گردن منکا کر بولا۔

"شاباش ـــــ مجھے تم سے اسی جواب کی اُمید تھی لیکن پڑھائی کے معاملے میں زیادہ اچھا کون ہے"

"پڑھائی میں عاشی باجی سب سے آگے ہیں ـــــ شرارت ناجیہ زیادہ کرتی ہے لیکن وہ میرے ساتھ لوڈو بھی تو کھیلتی ہے"

"لوڈو تم اپنی عاشی باجی کے ساتھ بھی کھیل سکتے ہو"

"خاک ـــــ" فراز نے بُرا سا منہ بنا کر جواب دیا "انھیں تو ٹھیک سے چال چلنی بھی نہیں آتی"

"تو تم سکھا دو ـــــ" شائستہ بیگم نے کہا "تمہیں تو بڑی اچھی آتی ہے"

"سکھا دوں گا لیکن ایک شرط پر ـــــ"

"شرط ـــــ وہ کیا"

"پہلے آپ وعدہ کریں کہ میرے لئے بھی ویسی ہی میز کرسی منگا دیں گی جیسی عاشی باجی کے لئے آئی ہے"

"چلو وعدہ ـــــ مگر ایک شرط میری بھی ہوگی" شائستہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا ـــــ" فراز نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"پہلے تم بھی خوب جی لگا کر محنت سے پڑھو' عاشی باجی کی طرح پوری کلاس میں اوّل آؤ پھر میں بھی تمہارے لئے میز کرسی منگا دوں گی"

"ٹھیک ہے ـــــ لائیے ملائیے ہاتھ"

شائستہ بیگم نے ہاتھ آگے کیا تو فراز نے ہاتھ ملاتے ہوئے نہایت معصومیت سے کہا۔
"میں اب کی بار عاشی باجی سے بھی زیادہ نمبر لاکر پوری کلاس میں فرسٹ آؤں گا۔"
"پھر تو میں تمہیں عاشی والی میز کرسی سے بھی زیادہ بڑھیا اور اچھی میز کرسی دلاؤں گی۔"
فراز کا چہرہ کھل اُٹھا' وہ ابھی تک ماں کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا' پھر ناجیہ اور عاشی کی آواز سنائی دی تو اُس نے ماں کا ہاتھ چھوڑ دیا' دونوں اسی طرف آ رہی تھیں۔
"تم یہاں چھوپھی جان کے پاس ہو اور ہم تمہیں پورے گھر میں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔" ناجیہ نے قریب آتے ہوئے فراز سے کہا۔
"کیوں' ـــــ مجھے تلاش کر رہی تھیں۔" فراز نے پوچھا۔
"کیرم کھیلیں گے۔" ناجیہ بولی۔ "عاشی کو تو بالکل کھیلنا نہیں آتا ـــــ اپنی گوٹ کے بجائے دوسرے کی گوٹ کھیلنے لگتی ہے۔"
عاشی قریب ہی کھڑی تھی' ناجیہ نے اُس کے کھیل کا مذاق اڑایا تو اُس نے بُرا نہیں مانا' مسکرا کر رہ گئی۔
"نہیں ـــــ اب میں کیرم نہیں کھیلوں گا۔" فراز نہایت سنجیدگی سے بولا۔ "لوڈو بھی نہیں کھیلوں گا۔"
"پھر ـــــ" ناجیہ نے شوخی سے دریافت کیا۔ "کیا لڑکیوں کی طرح گڑیا کھیلو گے۔"
"نہیں ـــــ" فراز نے نہایت ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ "میں اب کھیل میں اپنا وقت برباد نہیں کروں گا ـــــ خوب دل لگا کر پڑھوں گا اور عاشی باجی کی طرح پوزیشن کلاس میں فرسٹ آؤں گا ـــــ" فراز نے ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "پھر امی جان مجھے بھی میری فرمائش کا تحفہ دلائیں گی۔"
"کیوں کچھو چھپی جان ـــــ" ناجیہ نے شائستہ بیگم کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"ہاں بیٹی ـــــ میں نے فراز سے وعدہ کیا ہے۔"
"لیکن مالی بابا نے تو عاشی کو فرسٹ آنے پر بھی کوئی تحفہ نہیں دیا۔" ناجیہ نے کڑوا سا منہ بنا کر کہا پھر نہایت غرور بھرے لہجے میں بولی۔ "میری ... امی اور پاپا نے تو مجھے بہت سارے کھلونے اور تحفے دلائے ہیں۔ میں تو فرسٹ بھی نہیں آئی تھی۔"
"جاؤ فراز بیٹے ـــــ" شائستہ بیگم نے جلدی سے کہا۔ "جا کر کیرم کھیل لو ناجیہ کے ساتھ لیکن کوئی شرارت نہ کرنا۔"
"کیرم نہیں' میں لوڈو کھیلوں گا۔" فراز بولا۔ "اور عاشی باجی بھی ہمارے ساتھ کھیلیں گی۔"
"ہاں ـــــ" عاشی نے خوش ہو کر کہا۔ "چلو ـــــ لوڈو کھیلتے ہیں۔ بڑا مزہ آئے گا۔"
"نہیں ـــــ میں لوڈو نہیں' کیرم کھیلوں گی۔" ناجیہ کا فیصلہ اٹل جگہ اٹل رہا۔
"اس لئے کہ تم لوڈو میں ہمیشہ ہار جاتی ہو۔" فراز نے ناجیہ کا مذاق اڑایا۔
"تم بے ایمانی جو کرتے ہو۔" ناجیہ تنک کر بولی۔ "بڑے آئے جیتنے والے ـــــ"
"اور اس دن تم نے بھی تو نظریں بچا کر اپنی ایک گوٹ اٹھائی تھی۔" فراز نے احتجاج کیا۔ "میں نے تمہاری چوری پکڑی تو تم نے سارا کھیل بگاڑ دیا تھا۔"
"بُری بات ہے فراز ـــــ" شائستہ بیگم نے بات ختم کرانے کی خاطر بیٹے کو ڈانٹا۔ "اچھے بچے آپس میں لڑائی جھگڑا نہیں کرتے ـــــ مل جل کر کھیلتے ہیں اور پھر ناجیہ تو تمہاری منی سی بہن ہے۔"
"منی سی بہن ہے تو پھر میرے کہنے پر لوڈو ـــــ"
"نہیں کھیلوں گی لوڈو ـــــ" ناجیہ نے فراز کو غصے سے گھورتے ہوئے کہا پھر منہ بسورتی ہوئی پلٹی اور چلنے کے لئے تیز تیز قدم اُٹھانے لگی۔
"ناجیہ بیٹی ـــــ میری بات تو سنو۔" شائستہ بیگم ناجیہ کو آواز دیتی ہوئی اٹھیں پھر اُس کے پیچھے پیچھے اندر چلی گئیں' ناجیہ نے پلٹ کر ایک بار بھی پھوپھی کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں محسوس کی بلکہ اُن کی آواز سن کر بھی اور

زیادہ تیز ہو گئی تھی۔
"ہونہہ ـــــ" فراز نے ناجیہ کے جانے کے بعد کہا۔ "نہیں کھیلتی تو نہ کھیلے ـــــ میں خوشامد تو نہیں کروں گا۔"
عاشی چپ چاپ سہمی کھڑی تھی' اُس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کس کا ساتھ دے ـــــ ناجیہ کی ماں نے اُس پر جو احسان کیا تھا' اُس کا تقاضہ یہ تھا کہ وہ ناجیہ کا ساتھ دیتی لیکن فراز ـــــ وہ فراز کو بھی خفا نہیں کرنا چاہتی تھی اس لئے کہ فراز اُسے اچھا لگتا تھا اور اس لئے بھی کہ شائستہ بیگم اُسے شمسہ بیگم کے مقابلے میں پیار کرتی تھیں' زیادہ محبت اور اپنائیت کا سلوک کرتی تھیں! ـــــ کچھ دیر تک وہ یونہی گم صم سی کھڑی رہی پھر آہستہ سے بولی۔
"فراز ـــــ تمہیں ناجیہ کو ناراض نہیں کرنا چاہیئے تھا ـــــ"
"کیوں ـــــ" فراز نے عاشی کو گھورتے ہوئے کہا۔ "کیا میں نے کوئی غلط بات کہی تھی۔"
"یہ تو مجھے نہیں معلوم فراز لیکن ـــــ"
"آپ ڈرتی ہیں تو ڈریں۔" فراز نے عاشی کا جملہ کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں ڈرتا ناجیہ سے ـــــ"
"اچھا ـــــ تو چلو ہم دونوں بیٹھ کر کہانیاں پڑھتے ہیں۔" عاشی نے فراز کو غصے میں دیکھ کر خوش کرنے کی کوشش کی۔
"ہاں ـــــ چلو ـــــ" فراز نے جلدی سے کہا پھر عاشی کے ساتھ اس کے کوارٹر کی طرف قدم بڑھانے لگا۔

گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہوئے اور اسکول کھلنے میں صرف ایک مہینہ رہ گیا تھا۔
شمسہ بیگم نے عاشی پر اپنی توجہ دوچند کر دی ـــــ کوئنٹ کی پڑھائی کا معیار سینئر کیمبرج کی بنیاد پر رکھا گیا تھا' تیسری جماعت میں ناجیہ کے ساتھ داخلہ حاصل کرنے کے لئے عاشی کو شب و روز محنت کرنی تھی' اس درمیانی تعلیمی معیار کو پورا کرنا تھا جو عام گورنمنٹ اسکول اور کوئنٹ کے درمیان مائل تھا۔
عاشی نے جب محمود حسین کی کوٹھی میں قدم رکھا تھا اس وقت وہ شمسہ بیگم کو بس یونہی ایک عام سی بچی لگی تھی جیسی سب بچیاں ہوتی ہیں بلکہ انہیں عاشی اور مدد کا ساتھ ایک اعتبار سے ناگوار بھی گزرا تھا اس لئے کہ مدد کی عمر پہنے والے مالی سے کہیں زیادہ تھی' ایک بچی کی موجودگی میں ظاہر تھا کہ وہ پودوں کی طرف پوری اور بھرپور توجہ نہیں دے سکتا تھا۔
بہرحال شمسہ بیگم نے اگر عاشی کی آمد پر کوئی اعتراض نہیں کیا تو انہیں مسرت بھی نہیں ہوئی تھی۔ پھر جب انھوں نے پہلی بار اپنی نازوں کی پلی اکلوتی بیٹی ناجیہ کو عاشی کے ساتھ کھیلتے دیکھا تو اُن کی اجلی اور کشادہ پیشانی شکن آلود ہو گئی' ناجیہ بڑے باپ کی بیٹی تھی' اس کا ایک عام ملازم کی لڑکی کے ساتھ کھیلنا اور میل جول بڑھانا انہیں پسند نہیں تھا' دبی زبان میں انھوں نے ناجیہ کو سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی کہ وہ عاشی کے ساتھ رہنے کے بجائے اس سے دُور رہنے کی کوشش کرے۔ ناجیہ نے ماں کی بات کو تعجب اور حیرت سے سنا' کچھ دیر اس پر غور کیا پھر جب ماں کی مصلحت اس کی معصوم سمجھ میں نہ آ سکی تو اُس نے ذہن سے ماں کے اس جملے کو یکسر فراموش کر دیا۔
شمسہ بیگم نے ناجیہ کو زیادہ سرزنش کرنی مناسب نہیں سمجھی' وہ جانتی تھیں کہ اگر بات بڑھی اور ناجیہ نے صوفیہ خاتون کی حمایت حاصل کر لی تو عاشی کا پتہ بھی نہ ہو گا' اسی مصلحت کی بنا پر انھوں نے وقتی طور پر خاموشی اختیار کر لی تھی لیکن جب خود صوفیہ خاتون نے ایک دن ناجیہ اور عاشی کے میل جول پر اعتراض کیا تو شمسہ بیگم کو ہنسی آ گئی لیکن ساس کی موجودگی میں انھوں نے اپنی ہنسی کو محض دل کے نہاں خانوں تک محدود کر لیا تھا۔
"یہ عاشی کون ہے۔" صوفیہ خاتون نے دریافت کیا تھا۔ "ناجیہ اکثر مجھ سے اس کا تذکرہ کرتی ہے۔"
"اپنے مالی کی پوتی ہے۔" شمسہ بیگم نے مدوکی زبانی سنی سنائی تفصیل دہراتے ہوئے کہا۔ "بے چاری کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے' باپ تلاش معاش میں ملک سے باہر گیا ہوا ہے اس لئے عاشی اپنے دادا کے ساتھ رہتی ہے۔"

"قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے" صوفیہ خاتون نے عاشی کے حالات سن کر ہمدردی کا اظہار کیا تو اس کے خیال سے جلد ہی پشیمانی پر سلوٹیں نمایاں کر کے بولیں "اگر تم مناسب سمجھو تو ممدو کی تنخواہ میں عاشی کی ہمدردی کے پیش نظر تھوڑا بہت اضافہ کر دو لیکن جہاں تک ناجیہ اور عاشی کے میل جول کا تعلق ہے تو یہ بات مجھے اچھی نہیں ـــــ تم ممدو کو تاکید کر دو کہ وہ عاشی کو سرونٹ کوارٹر تک محدود رکھے، نہ عاشی ہماری طرف آئے گی نہ اس کا دل اس کے ساتھ کھیلنے کو چاہے گا"

"ٹھیک ہے۔ میں ممدو کو سمجھا دوں گی"

"عاشی کے بارے میں تمہاری ذاتی رائے کیا ہے" صوفیہ خاتون نے دریافت کیا تھا "میرا مطلب وہ نچلے طبقے کی عام لاوارث بچیوں کی طرح بے راہ روی کا شکار تو نہیں ہے، پڑھتی لکھتی ہے یا ہر وقت کھیل کود میں اپنا وقت ضائع کرتی ہے۔ اس کے طور طریقے کیسے ہیں، اٹھنے بیٹھنے کے ڈھنگ کیا ہیں ـــــ میں یہ سب کچھ جاننا چاہتی ہوں کہ مجھے ناجیہ کے مستقبل کا خیال ہے ـــــ بنیاد اگر کمزور ہو یا عدم توجہی کا شکار ہو جائے تو عمارت کی پختگی پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا"

"آپ مطمئن رہیں۔ میں اس بات کا خیال رکھوں گی کہ ناجیہ غلط صحبت میں نہ پڑنے پائے"

شمسہ بیگم کو یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ صوفیہ خاتون کا ووٹ عاشی کے سلسلے میں ناجیہ کے بجائے ان کے حق میں تھا چنانچہ دوسرے ہی دن سے انھوں نے عاشی کے بارے میں تفتیش اور چھان بین شروع کر دی۔ پہلے ملازموں کو اس کام پر مامور کیا گیا کہ وہ ممدو اور عاشی کے سلسلے میں دور رہ کر زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کریں۔ پھر جب ملازموں نے کوئی ایسی کارآمد بات نہیں بتائی جو صوفیہ خاتون یا شمسہ بیگم کے ذاتی اندیشوں کی تصدیق کرتی تو انھوں نے خود حالات کا جائزہ لینے کی ٹھان لی۔

ایک دن یونہی خود اس کوارٹر تک چل گئیں جو ممدو کو رہائش کے لئے دیا گیا تھا۔ ممدو اس وقت باہر کیاریوں میں پانی دے رہا تھا۔ عاشی اس وقت کمرے میں تنہا تھی لیکن پڑھائی میں اس درجہ منہمک تھی کہ اسے کسی کی موجودگی کا ایک ذرا شبہ تک نہ ہوا۔ شمسہ بیگم تنقیدی نظروں سے کمرے کا جائزہ لیتی رہیں ـــــ ہر چیز سلیقے اور نفاست سے ترتیب دی گئی تھی۔ کمرے اور برآمدے میں کہیں مٹی یا دھول کا نام تک نہیں تھا۔ پلنگ پر بچھی میز پوش اجلی چادر نظر آ رہی تھی۔ خود عاشی کے کپڑے بھی صاف ستھرے اور اجلے نظر آئے تھے۔ کوارٹر کے صفائی کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔

شمسہ بیگم ایک ایک چیز کا بنظر غور جائزہ لیتی رہیں۔ خاص طور پر انھیں "اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْن" کا کارڈ بہت زیادہ پسند آیا جو ایک طرف دیوار پر بڑے سلیقے سے فریم میں لٹکا ہوا تھا، چند لمحے تک وہ نظریں جمائے طغرے کو دیکھتی رہیں پھر انھوں نے عاشی کو متوجہ کرنے کی خاطر دروازے پر انگلیوں سے دستک دی تو عاشی چونک کر کتاب بند کر کے وہ سہمے ہوئے انداز میں ہڑبڑا کر اٹھی، خلاف توقع وہ ناجیہ کی ماں کو اپنے کمرے کی چوکھٹ پر کھڑا دیکھ کر بوکھلا سی گئی تھی۔

"آپ ـــــ" اس نے شمسہ بیگم کو دیکھتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا پھر جلدی سے لیکن مہذب انداز میں سیدھا ہاتھ پیشانی تک اٹھاتے ہوئے کہا "بیگم صاحبہ ـــــ آداب"

"جیتی رہو ـــــ" شمسہ بیگم نے تیکھے انداز میں سرسری جواب دیا پھر بولیں "ممدو کہاں ہے"

"بابا ـــــ وہ باہر پودوں کو پانی دینے گئے ہیں" عاشی نے بڑی سادگی سے پوچھا "بلاؤں ـــــ"

"نہیں ـــــ" شمسہ بیگم نے عاشی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا پھر تھوڑے توقف سے بولیں "کیا کر رہی تھیں"

"پڑھ رہی تھی ـــــ" عاشی نے جواب دیا "پندرہ روز بعد میرے امتحان ہونے والے ہیں"

"اس کمرے کی صفائی کس نے کی ہے" شمسہ بیگم نے دریافت کیا۔

"میں نے ـــــ" عاشی نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

"جھاڑو پونچھا اور میلے کپڑوں کی دھلائی کون کرتا ہے"

"وہ ـــــ وہ بھی میں کرتی ہوں ـــــ" عاشی نے آہستہ سے کہا۔

"یہ طغرا دیوار پر کس نے لگایا ہے" شمسہ بیگم نے عاشی کی شخصیت سے متاثر ہوتے ہوئے دریافت کیا، اس کے مطلب کیا ہوتے ہیں"

"اللہ میاں صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتے ہیں" عاشی بولی "بابا نے یہی مطلب بتائے تھے"

"شاباش ـــــ" شمسہ بیگم جس مقصد سے آئی تھیں اسے بھول کر روانی میں کہہ گئیں "تم خاصی ذہین اور تہذیب یافتہ بچی ہو"

"آپ ـــــ آپ بیٹھئے بیگم صاحبہ، میں آپ کے لئے اچھی سی چائے بناتی ہوں" عاشی نے خوش ہو کر کہا۔

"اچھا ـــــ تو چائے بھی تم بناتی ہو"

"جی ہاں ـــــ آپ بیٹھئے نا ـــــ"

"نہیں ـــــ اس وقت میں جلدی میں ہوں، دوبارہ آؤں گی تو تمہارے ہاتھ کی تیار کی ہوئی چائے ضرور پیوں گی"

شمسہ بیگم معصوم عاشی کو ششدر چھوڑ کر واپس آ گئیں۔ عاشی کی معصوم باتوں نے انھیں توقع سے بڑھ کر متاثر کیا تھا اس لئے اس روز سے انھوں نے ذاتی طور پر عاشی کی مخالفت ترک کر دی۔ البتہ وہ مکمل کر اس کی حمایت نہیں کر سکتی تھیں اس لئے کہ صوفیہ خاتون کو کسی طور بھی ناجیہ اور عاشی کا میل جول پسند نہیں تھا ـــــ لیکن صوفیہ خاتون کی موت اور شائستہ بیگم کی طرف سے پیدا ہونے والی رنجش نے شمسہ بیگم کو اچانک عاشی کے حق میں بہت ہمدرد اور جانب دار بنا دیا تھا۔ وہ ہر قیمت پر عاشی کو فرش سے اٹھا کر عرش کی بلندیوں تک پہنچانے کا فیصلہ کر چکی تھیں کہ انھیں ناجیہ کے لئے ایک ساتھی، ایک ہم جولی اور ایک رہبر کی ضرورت تھی اور اس لئے بھی کہ وہ ناجیہ کو فرار کے راستے سے ہٹا کر عاشی کے ساتھ خلط ملط کرنا چاہتی تھیں ـــــ شائستہ بیگم کو اپنے طرز عمل سے یہ باور کرانا چاہتی تھیں کہ انھوں نے ناجیہ کے سلسلے میں براہ راست صوفیہ خاتون کو ہموار کرنے کی جو کوشش کی تھی وہ فرار کے حق میں کتنی نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ دکھانا چاہتی تھیں کہ ان کی ایک نگاہ کرم عاشی کو کہاں سے کہاں تک لے جا سکتی ہے۔

غرضیکہ آجکل شمسہ بیگم کی پوری توجہ عاشی پر مرکوز تھی، کونونٹ میں عاشی کے داخلے کو انھوں نے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا اس لئے کہ کچھ دنوں پیشتر ان کی پڑوسن اور ناجیہ کی سہیلی فری کی امی بیگم اکرام نے عاشی کے سلسلے میں ان پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا

"بہن ـــــ آپ بلاوجہ ایک مالی کی لڑکی پر اپنا وقت ضائع کر رہی ہیں، اسے کونونٹ میں داخلہ ملنا ناممکن ہے"

"کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے" شمسہ بیگم نے کہا تھا "اگر عاشی کی قسمت میں ہوگا تو اسے ضرور داخلہ مل جائے گا ورنہ گورنمنٹ اسکول میں تو وہ پہلے بھی پڑھ رہی تھی"

"ایک بات پوچھوں بیگم محمود، آپ برا تو نہیں مانیں گی"

"ایسی بھی کیا بات ہے جو آپ کو میری ناراضگی کا خیال آ گیا" شمسہ بیگم مسکرا کر بولیں "پوچھئے ـــــ کیا پوچھنا چاہتی ہیں آپ"

"آپ آخر عاشی ہی کو کونونٹ میں کیوں داخل کرانا چاہتی ہیں" بیگم اکرام نے اپنے لب و لہجے سے اپنے تجسس کا بھرپور اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی ـــــ" شمسہ بیگم کا ماتھا ٹھنکا، یکلخت سنجیدگی اختیار کر کے بولیں "آپ کہنا کیا چاہتی ہیں"

"برا نہ ماننا بہن ـــــ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر آپ ایک ملازم کی پوتی پر اس قدر مہربان کیوں ہیں" بیگم اکرام نے کہا "فرار بھی تو آپ کا خون ہے ـــــ اگر کونونٹ میں ناجیہ کے ساتھ کسی کو داخل ہی

کرانا تھا تو فراز میں کیا بُرائی تھی۔"

"میں نے یہ کب کہا کہ فراز میں کوئی بُرائی ہے۔" شمسہ بیگم تلملا اٹھیں، کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے خشک لہ
میں بولیں: "خدا سلامت رکھے فراز کی ماں کو اُن کی زندگی میں بھلا میں کون ہوتی ہوں فراز کے مستقبل کے بارے
فیصلہ کرنے والی ——— وہ اگر چاہیں تو ہزار بار فراز کو کونونٹ اسکول میں داخل کرا دیں، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا
ہے ——— رہا عاشی کا سوال تو وہ بن ماں کی بچی ہے، اُس کا باپ بھی ملازمت کی تلاش میں پردیس گیا ہوا ہے
اور پھر اُن کے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ وہ عاشی کو اعلیٰ تعلیم دلوا سکیں، ان حالات میں اگر میں اُس غریب
بچی کے ساتھ خدا ترسی کا برتاؤ کرنا چاہتی ہوں تو آپ یا دنیا والوں کو اس پر اعتراض کرنے کا کیا حق ہے۔"

"آپ شاید میری بات کا بُرا مان گئیں۔" بیگم اکرام نے شمسہ بیگم کے تیور بدلتے دیکھے تو جلدی سے بات
بناتے ہوئے بولیں: "میں نے تو یونہی ایک بات کہہ دی تھی اگر آپ کو ناگوارِ خاطر گزری ہو تو میں اپنے الفاظ وا
لیتی ہوں۔"

"مجھے آپ کی بات خیر بُری تو نہیں لگی لیکن دُکھ ضرور ہوا ہے۔" شمسہ بیگم نے بیگم اکرام کو کُریدنے کی خا
"پڑوسیوں کا حق دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے لیکن آپ نے میرے بجائے شائستہ بیگم کو ترجیح دی
وہ بھی بے بنیاد بات پر۔"

"آپ مجھے غلط نہ سمجھیں بیگم محمود۔" بیگم اکرام نے شمسہ بیگم کی باتوں کا مفہوم سمجھتے ہوئے جلدی سے کہا
"خدا گواہ ہے کہ شائستہ بہن نے مجھ سے عاشی یا فراز کے سلسلے میں ایک لفظ بھی کبھی نہیں کہا۔"

"وہ اگر کہیں بھی تو میری صحت پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔" شمسہ بیگم ہونٹ کاٹتے ہوئے بولیں: "خدا کا
ہے کہ میں کسی کا دیا نہیں کھاتی ———"

بیگم اکرام کے جانے کے بعد شمسہ بیگم بہت دیر تک غصّے میں پیچ و تاب کھاتی رہیں، انھیں اس بات
مکمل یقین تو نہیں تھا کہ شائستہ بیگم نے بیگم اکرام سے آپس کے اختلافات کے سلسلے میں کچھ کہا سُنا ہوگا لیکن
بہر حال انھیں عاشی کے سلسلے میں بیگم اکرام کی دخل اندازی بہت گراں گزری تھی اور انھوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ
قیمت پر عاشی کو ناجیہ کے ساتھ داخلہ دلا کر رہیں گی۔ اسی ضد کے پیشِ نظر انھوں نے عاشی کے لئے ایک ٹیچر علیحدہ
رکھ دی تھی جو اُسے کونونٹ کے معیار کے مطابق نوک پلک سے سنوار رہی تھی۔ ٹیچر کے علاوہ شمسہ بیگم خود بھی اکثر و
عاشی کی کتاب اُٹھا کر اس کا امتحان لینے بیٹھ جاتیں۔

اس وقت بھی وہ عاشی سے سوال جواب میں مصروف تھیں کہ محمود حسین آ گئے، خلافِ توقع آج اُن کی واپ
جلدی ہو گئی تھی، بیٹی کو عاشی کے ساتھ مصروف دیکھ کر انھیں تعجب بھی ہوا لیکن وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چ
شمسہ بیگم کو شوہر کے ذریعے شوہر کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ عاشی کو پڑھنے کی تاکید کر کے اٹھیں اور شوہر کے پاس
جو بستر پر نیم دراز آنکھیں بند کئے نہ جانے کن خیالوں میں محو تھے، قدموں کی آہٹ پا کر انھوں نے آنکھیں کھو
تو شمسہ بیگم تیزی سے قدم اُٹھاتی اُن کے قریب گئیں اور آنکھوں میں تیرنے والی سُرخیوں کو دیکھ کر بولیں۔

"خیریت تو ہے ——— نصیب دشمناں، آپ کی طبیعت کچھ ناساز نظر آ رہی ہے۔"

"تھوڑی تکان ہے ——— ذرا دیر آرام کروں گا تو جاتی رہے گی۔"

"آپ اُٹھ کر لباس تبدیل کریں، میں کافی بنا کر لاتی ہوں۔"

"اس وقت خواہش نہیں ہو رہی۔" محمود حسین تھکے ہوئے انداز میں بولے: "میں نے دفتر میں سر د
گولی اور چائے لے لی تھی۔"

"صبح سے شام تک کولھو کے بیل کی طرح کام میں جُتے رہیں گے تو طبیعت تو خراب ہونی ہے۔" شمسہ بیگم
لاڈ سے بولیں: "میں تو کہتی ہوں کہ آپ کچھ دنوں کے لئے دفتر بند کر کے تبدیلیِ آب و ہوا کے لئے کسی پُرفضا مق
چلے جائیں۔"

"اس عمر میں ———" محمود حسین نے بیوی کو گھورتے ہوئے قدرے مسکرا کر کہا۔

"مجھے ٹالنے کی کوشش مت کیجئے۔" شمسہ بیگم بدستور سنجیدگی سے بولیں: "آخر امّی جان کی زندگی میں

آپ نے باہر جانے کا پروگرام بنایا تھا۔"

"وہ محض امّی حضور کی خاطر تھا ———"

"اب اگر آپ میری اور ناجیہ کی خاطر اپنی صحت کا خیال رکھیں تو کیا حرج ہے۔"

"فی الحال ایسا ممکن نہیں، دو چار اہم کیس ہاتھ میں ہیں انھیں نپٹا لوں تو پھر تفریح کی غرض سے کہیں باہر جانے
کے بارے میں سوچوں گا ——— لیکن تنہا نہیں!..... آپ اور ناجیہ بھی ساتھ ہوں گی۔"

"یہ بات تو آپ پہلے بھی سیکڑوں مرتبہ مجھے سُنانے کے لئے کہہ چکے ہیں لیکن نتیجہ آج تک صفر ہی رہا۔"

"اس بار بالکل پکا وعدہ کر رہا ہوں۔" محمود حسین نے والہانہ انداز میں بیوی کو دیکھتے ہوئے کہا پھر اُٹھ کر
جوتے موزے اتارے اور نہانے کے ارادے سے غسل خانے میں چلے گئے۔

شمسہ بیگم اُن کے اتارے ہوئے لباس کو سلیقے سے تہہ کر کے ہینگر میں لٹکانے لگیں، بستر کی شکنوں کو دور کیا،
ملازم کو بلا کر تاکید کی کہ جلدی سے سیب اور انار کا جوس تیار کر کے لے آئے، پھر وہ یونہی خود کو مصروف رکھنے کے
لئے چیزوں کی ترتیب الٹ پلٹ کر رہی تھیں کہ ناجیہ آ گئی۔

"امّی ——— پپا کہاں ہیں۔" اُس نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے ماں سے پوچھا۔

"نہا رہے ہیں ——— کیوں۔"

"کل میں نے پپا سے چاکلیٹ کی فرمائش کی تھی۔" ناجیہ بولی: "لائے ———"

"آج تمہارے پپا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لئے شاید بھول گئے ——— کل ضرور لے آئیں گے۔"

"کل بھی پپا نے آج کے لئے کہا تھا۔" ناجیہ روٹھ سی گئی۔

"بُری بات ہے ناجیہ ———" شمسہ بیگم بولیں: "ذرا ذرا سی بات پر یوں خفا نہیں ہوا کرتے ——— میں
پہلے بھی تمہیں کئی بار منع کر چکی ہوں۔"

"ٹھیک ہے ———" ناجیہ بدستور بگڑے ہوئے تیور سے بولی: "میں آئندہ پپا سے کسی چیز کی فرمائش نہیں
کروں گی۔" وہ اپنا جُملہ مکمل کر کے جانے کے لئے مڑی۔

"ناجیہ ———" شمسہ بیگم نے اُسے آواز دی تو وہ دروازے کے قریب پہنچ کر تھم گئی، آہستہ سے پلٹی،
زبان سے کچھ نہیں کہا، وضاحت طلب نظروں سے ماں کو دیکھنے لگی، شمسہ بیگم کو بیٹی کا یہ انداز پسند نہیں آیا تھا،
کوئی اور موقع ہوتا تو شاید وہ اسے ڈانٹ دیتیں لیکن اس وقت شوہر کی طبیعت کے خیال کے پیشِ نظر انھوں
نے بڑے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا: "کہاں جا رہی ہو ———"

"اپنے کمرے میں ———" ناجیہ نے رُکھائی سے جواب دیا۔

شمسہ بیگم کچھ کہنا چاہتی تھیں کہ محمود حسین غسل خانے کا دروازہ کھول کر تولئے سے بال خشک کرتے باہر
آ گئے، ناجیہ نے باپ کو دیکھ کر نظریں نیچی کیں تو محمود حسین سمجھ گئے کہ یہ خاموش احتجاج ہو رہا ہے، مسکرا کر بولے:

"ہماری بیٹی کچھ ناراض سی نظر آ رہی ہے ———"

ناجیہ نے باپ کی بات پر بھی کوئی جواب نہیں دیا، روٹھے انداز میں سر جھکائے کھڑی رہی۔

"ناجیہ ———" شمسہ بیگم نے قدرے خشک لہجے میں اُسے مخاطب کیا: "تم نے آج پپا کو سلام بھی نہیں کیا۔"

"سوری ———" ناجیہ نے اپنی غلطی کا اعتراف نظریں اٹھا کر کیا پھر ——— "گڈ ایوننگ پپا ———" کہہ کر
دوبارہ نظریں جھکا لیں۔

محمود حسین نے بیٹی کی ادا دیکھی تو مسکرانے لگے پھر جلدی سے آگے بڑھ کر بریف کیس کھولا، اندر سامنے ہی...
کیڈ بری کی چاکلیٹ کا خوبصورت پیکٹ موجود تھا، پیکٹ اُٹھا کر وہ بیٹی کے قریب گئے، گھٹنوں کے بل جھک کر
ناجیہ سے پوچھا۔

"کیا بات ہے ——— کیا ممی سے کوئی جھگڑا ہو گیا۔"

ناجیہ نے زبان سے کچھ نہیں کہا، نفی میں گردن کو جنبش دینے لگی۔

"کسی ملازم نے ہماری بیٹی کی شان میں کوئی گستاخی کی ہے۔" محمود حسین نے آہستہ سے پوچھا' چاکلیٹ پیکٹ انھوں نے پشت پر چھپا رکھا تھا۔

"نہیں ـــــ" ناجیہ نے مدھم مگر مختصر سا جواب دیا۔

"کسی سہیلی سے لڑائی ہو گئی ـــــ"

"جی نہیں ـــــ" اُس نے بدستور روٹھے ہوئے انداز میں کہا۔

"سمجھا ـــــ پپا سے کسی بات پر خفا ہو ـــــ کیوں؟"

اس بار ناجیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"ذرا دیکھنا تو ـــــ یہ کیا ہے" محمود حسین نے پشت والا ہاتھ ناجیہ کے سامنے کرتے ہوئے بڑی دلار سے کہا۔

"چاـــ کو ـــ لیٹ ـــــ" ناجیہ کیڈ بری کا بڑا پیکٹ دیکھ کر کھل اٹھی' ایک ہی جھپٹے میں اُس پیکٹ باپ کے ہاتھ سے لیا پھر حسب عادت "پپا زندہ باد ـــــ" کے نعرے لگاتی ہوئی باہر بھاگ گئی۔

محمود حسین بیٹی کی خوشی پر خود بھی مسکرانے لگے۔

"آپ کی ان ہی باتوں نے ناجیہ کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے" شمسہ بیگم نے شوہر سے کہا۔

"بہت خوب ـــــ پہلے یہ تہمت امّی حضور کے سر تھی اب مجھے مورد الزام ٹھہرایا جا رہا ہے۔"

"بات کو سمجھنے کی کوشش کیجئے" شمسہ بیگم بولیں "میں یہ منع نہیں کرتی کہ آپ خدانخواستہ ناجیہ کے لاڈ کریں یا اُس کی فرمائش پوری نہ کریں ـــــ بات صرف اتنی سی ہے کہ بچے جس بات کی ضد کریں اُسے فوری طور پر اُن کی خواہش کے مطابق پورا نہیں کرنا چاہیئے ورنہ وہ اس کے عادی ہو جاتے ہیں اور اپنی ہر بات منوانے کے لئے اسی کا حربہ استعمال کرتے ہیں۔"

"درست فرمایا آپ نے لیکن ایک چھوٹا سا سوال میں بھی دریافت کرنا چاہوں گا ـــــ اجازت ہے۔" محمود حسین نے بال خشک کر کے تولیہ اسٹینڈ کی جانب اچھالتے ہوئے بیوی سے کہا۔

"کوئی نئی منطق ـــــ"

"منطق نہیں ـــــ ٹھوس دلیل کہیئے" محمود حسین بدستور بیوی کو شوخ نظروں سے گھورتے ہوئے بولے "بچے اگر شرارتیں نہ کریں ـــــ ضد نہ کریں تو پھر انہیں بچہ کون کہے گا ـــــ"

"بالکل غلط ـــــ" شمسہ بیگم نے کہا "ضد اور شرارت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔"

"مثلاً ـــــ" محمود حسین نے جرح کی

"مثلاً یہ کہ شرارت بچوں کی ذہانت کی دلیل ہوتی ہے اور ضد اُن کی اچھی عادتوں اور ذہانت کے لئے نقصان دہ ہوتی ہے" شمسہ بیگم نے اپنے دلائل پیش کرتے ہوئے کہا "بچہ ایک بار ضد کا عادی ہو جائے تو اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے کے بجائے محض ضد کا حربہ استعمال کر کے خواہشات کی جلد تکمیل کا عادی ہو جاتا ہے اور یہی عادت بچے کی ذہانت کو زنگ کی طرح چاٹ جاتی ہے۔"

"بہت خوب ـــــ" محمود حسین نے بیوی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شوخی سے کہا "گویا آپ باور کرانا چاہتی ہیں کہ ضد بچوں کو نہیں بلکہ صرف بچوں کے باپ کو کرنی چاہیئے ـــــ"

"طبیعت اگر ناساز ہو تو بچوں کے باپ کو بھی بے جا ضد سے پرہیز لازم ہے ورنہ انھیں بھی ڈانٹ پڑ سکتی ہے ـــــ" شمسہ بیگم نے قدرے شرماتے ہوئے کہا ـــــ "آپا مزاج شریف ہیں ـــــ"

محمود حسین بیوی کی باتوں کا جواب دینا چاہتے تھے کہ شرفو جوس کی ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ شمسہ بیگم کے اشارے پر وہ جوس کے گلاس درمیانی میز پر رکھ کر جانے کے لئے پلٹا تو وہ بولیں۔

"شرفو ـــــ ایک گلاس جوس لے جا کر عاشی کو بھی دے دینا اور کہنا کہ وہ پڑھتی رہے' میں ابھی آ رہی ہوں۔"

"جی اچھا ـــــ"

شرفو خالی ٹرے ہاتھ میں لئے کمرے سے چلا گیا تو محمود حسین نے جوس کا گلاس اٹھاتے ہوئے بیوی سے کہا ـــــ "آجکل آپ عاشی پر بہت زیادہ مہربان نظر آتی ہیں۔"

"کوئی اعتراض ہے آپ کو ـــــ" شمسہ بیگم نے قدرے سنجیدگی سے دریافت کیا

"بالکل نہیں ـــــ" محمود حسین جوس کا گھونٹ لے کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے "کسی مستحق کے ساتھ نیکی اور ہمدردی کا برتاؤ تو عین عبادت ہے۔"

"میں چاہتی ہوں کہ امسال عاشی کو بھی ناجیہ کے ساتھ داخل کرا دوں' اس طرح جہاں دونوں کا ساتھ ہو جائے گا وہاں ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ دونوں گھر میں بھی ساتھ ساتھ پڑھا کریں گی ـــــ"

"عاشی پہلے کہاں پڑھتی تھی ـــــ"

"گورنمنٹ اسکول میں" شمسہ بیگم بولیں "بڑی ذہین بچی ہے' اپنی کلاس میں ہمیشہ اوّل آتی ہے' نہایت سلیقہ مند اور تہذیب یافتہ بھی ہے۔"

"ہاں ـــــ چار سال بڑی ہے لیکن بے چاری کے حالات ایسے نہیں تھے کہ وہ پڑھ سکتی" شمسہ بیگم نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا "مدد بتا رہا تھا کہ عاشی کے سر سے ماں کا سایہ بچپن ہی میں چھوٹ گیا تھا' اس وقت بہت چھوٹی تھی عاشی ـــــ پھر عاشی کا باپ بھی روزگار کی تلاش میں کہیں باہر چلا گیا اور اُس کے بعد سے آج تک اُس نے بھی پلٹ کر معصوم کی کوئی خبر نہ لی۔"

"کیا مطلب ـــــ" محمود حسین نے حیرت سے پوچھا "کیا مدد اور اُس کے بیٹے کے درمیان خط و کتابت بھی نہیں ہوتی؟"

"مجھے بھی اس بات پر حیرت ہوئی تھی لیکن مدد بھی اپنی جگہ حق بجانب ہے" شمسہ بیگم نے کہا "دراصل عاشی کا باپ اُس کی ماں کے انتقال کے فوراً بعد ہی بچی کو چھوڑ کر چلا گیا تھا' یہ بات مدد کو پسند نہ آئی چنانچہ اُس نے عاشی کی پرورش اور اپنے گزارے کے لئے ہمارے ہاں ملازمت اختیار کر لی۔"

"لیکن مدد کو اس بات کا علم ضرور ہوگا کہ اس کا بیٹا پردیس میں کہاں ملازم ہے۔"

"میں نے اتنی تفصیل دریافت نہیں کی' وہ خود ہی بتا رہا تھا کہ شروع شروع میں اُس کے بیٹے نے خط و کتابت بھی لکھے تھے لیکن جب مدد نے کوئی جواب نہیں دیا تو اُس نے بھی اپنی خیریت بھیجنی بند کر دی۔"

"اور بے چاری عاشی کو حالات کا شکار ہونا پڑا" محمود حسین نے جوس کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے کہا "دس سال کی جدائی کوئی معمولی بات نہیں ہوتی ـــــ خدا جانے کل باپ اور بیٹی کا آمنا سامنا ہوا تو وہ ایک دوسرے کو شناخت بھی کر سکیں گے یا نہیں۔"

"میرا تو خیال ہے کہ اُس نے پردیس میں جا کر دوسری شادی کر لی ہوگی" شمسہ بیگم نے ایک سرد آہ بھر کر کہا "اگر اُسے اپنی بچی کا خیال ہوتا تو کم از کم ایک بار پلٹ کر خبر تو ضرور لیتا ـــــ"

"ہو سکتا ہے حالات کے بھنور میں پھنس کر وہ بے بس ہو گیا ہو" محمود حسین نے خلا میں گھورتے ہوئے جواب دیا پھر چونک کر بولے "عاشی بڑی ہوگی تو اُس کے دل پر کیا بیتے گی' ماں کی موت اور باپ کی جدائی کا صدمہ تو اُسے نڈھال کر دے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ کچھ دیر آرام کر لیں" شمسہ بیگم نے شوہر کو عاشی کے ذکر پر اُداس ہوتا دیکھ کر اُٹھتے ہوئے کہا "تھوڑی دیر سو لیں گے تو تکان بھی جاتی رہے اور طبیعت بھی بحال ہو جائے گی۔"

محمود حسین نے کوئی جواب نہیں دیا' بیوی کی بات سُن کر آہستہ سے اُٹھے' چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے مسہری کے قریب گئے پھر تھکے ہوئے انداز میں بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں' شمسہ بیگم نے اُٹھ کر کھڑکی اور دروازے کے پردوں کو کھینچا تو خواب گاہ میں گھپ اندھیرا پھیل گیا پھر ایک ہلکی سی چادر شوہر پر ڈال کر وہ دبے قدموں خواب گاہ سے باہر چلی گئیں ـــــ

!!

سبزے کو پانی دینے اور پودوں کی کتر بیونت کے بعد وہ اپنے کوارٹر میں آیا تو وہاں ملگجا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ آج لکڑ ہنڈے کی باڑھ کو چھانٹنے اور سنوارنے میں اُسے کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی تھی لیکن آج خلاف توقع اُسے تھکن کا احساس نہیں ہوا تھا۔ شاید اس لئے کہ حالات نے وقتی طور پر اُسے عاشی کی فکر سے آزاد کر دیا تھا۔ اُس کا کام کر دیا تھا۔

کل تک ممدو کو اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ بے حد عزیز تھا۔ معصوم عاشی کو دیکھ کر اُسے بڑی شدت سے اپنے بڑھاپے کا احساس ستانے لگتا، ہونٹوں پر مسکراہٹیں سجائے وہ عاشی کے ساتھ گھنٹوں بیٹھا دنیا جہان کی باتیں کرتا رہتا لیکن اندر ہی اندر ایک خوف اُس کے ناتواں وجود کو کسی زہریلے ناگ کی طرح ڈستا رہتا۔ وہ سوچتا اگر قسمت نے اس کا ساتھ نہ دیا اور عمر کی ڈور اچانک کھنچ کر ٹوٹ گئی تو عاشی کا کیا بنے گا۔

عاشی ——— جس نے ابھی تک اپنی زندگی کا صحیح طور پر آغاز بھی نہیں کیا تھا۔

عاشی ——— ابھی تو صرف ابتدا رہی تھی۔

اور ———

انتہا تک پہنچنے کے لئے ابھی اسے طویل مسافت طے کرنی تھی۔

کئی موڑ کاٹنے تھے۔

نادیدہ اور انجانے راستوں سے گزرنا تھا ———

ان گنت سنگ میلوں کو عبور کرنا تھا ——— لیکن۔

ممدو کی اپنی عمر بڑی تیزی سے ڈھلتی جا رہی تھی۔ اب تو کام کرنے سے اُس کے جوڑ جوڑ میں درد ہونے لگا تھا۔ ہڈیاں چٹخنے لگتیں مگر وہ کام کرنے پر مجبور تھا۔ کام چھوڑ دیتا تو عاشی کی پرورش اور اس کی تعلیم کے اخراجات کہاں پورے ہوتے؟ ان ادھورے خوابوں کی تکمیل کا کیا بنتا جو ایک بدنصیب ماں نے دم توڑتے وقت اپنی بچی کے لئے دیکھا تھا۔ ان ہی خوابوں نے تو ممدو کو زندہ رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مستقبل کے دھندلکوں میں اُمید کا ایک موہوم کرن ہی تو تھی جس پر نظریں جمائے وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ اُسے منزل کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ راستوں کا کوئی اندازہ نہ تھا لیکن وہ زندگی کے اس سفر کو ہر قیمت پر جاری رکھنے کا خواہشمند تھا۔

عاشی کے لئے ———

صرف عاشی کے لئے ———

اور اگر ان راستوں میں کہیں اچانک ٹھہراؤ کا شبہ پیدا ہوتا تو وہ انگور کی اس نرم و نازک بیل کی طرح کانپ اُٹھتا جس کے وجود کو سوکھی لکڑیوں کے جال کا سہارا برقرار رکھتا ہے۔ سانس کی رفتار میں ذرا سا رکاوٹ پیدا ہوتی وہ تڑپ اٹھتا، خدا سے اپنی زندگی کی دعاؤں کے لئے بوڑھے اور ناتواں ہاتھ اٹھا کر گڑگڑاتا رہتا، آنسو بہاتا رہتا اور پھر

جب رات کے گھپ اندھیرے چھٹ جاتے، تاریکیوں کا سینہ چیر کر صبح کا نیا سورج طلوع ہوتا، ممدو بھی نئے جوش اور نئے ولولوں کے ساتھ نئے دن کا آغاز کرتا۔ خود کو بہلانے کی خاطر وہ ننھے منے پودوں کی تراش خراش نئی نئی تدبیریں کرتا، کیاریوں کو مضبوط کرنے کی خاطر اُن کے ٹوٹتے کناروں پر مٹی کی نئی تہیں جمانے لگتا۔ خود کو مصروف رکھنے کی خاطر وہ نت نئے منصوبے بناتا اور جب ان منصوبوں سے اس کا دل اکتانے لگتا تو وہ ماضی کی ان دریچوں کو دیکھنے لگتا جو آہستہ آہستہ اپنا قد بلند کر رہے تھے اور پھر اس کا ذہن ناریل کی چکنی چھال سے پھر دوبارہ عاشی کے معصوم وجود کے بارے میں سوچنے لگتا۔

"ممدو ——— اگر اچانک کسی روز تیری سانسوں کا طلسم ٹوٹ گیا اور آنکھ بند ہو گئی تو عاشی کا کیا ہوگا" اس کے ذہن کے کسی ویران گوشے میں یہ سوال تیزی سے ابھرتا تو اُس کی بوڑھی شریانوں میں خون کی گردش اچانک تیز ہو جاتی، اُس کے پاس اپنے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اس لئے کہ زندگی پر اُس کا اپنا کوئی اختیار نہیں تھا۔ اس کا وجود تو پانی کے اس بلبلے کی مانند تھا جو سطح آب پر بس کسی دم کا مہمان تھا، بچپن ہی سے

ایک ہلکا سا جھٹکا ہی اس کے لئے بہت تھا اور یوں بھی وہ اپنی زندگی کی تمام بہاریں پوری کر چکا تھا۔ اُسے اپنی ذات سے اگر کوئی لگاؤ تھا تو بس اتنا کہ عاشی کی پرورش کر کے اُسے اس قابل بنا دیتا کہ وہ زندگی کی راہوں پر اپنے قدم جمانے کے قابل ہو جاتی، اپنے بُرے اور بھلے کی تمیز کر سکتی، ان حالات کا مقابلہ کر سکتی جو تقدیر نے اُس کی قسمت میں رقم کر دیئے تھے۔ زندگی کے اسی ایک مقصد کو پورا کرنے کی خاطر وہ شب و روز خود کو زندہ رکھے ہوئے تھا۔ کبھی نبض ڈوبنے کا احساس اُبھرتا تو وہ خدا کے حضور سربسجود ہو کر گڑگڑانے لگتا۔

"میرے معبود ———

خداوندا ——— ابھی نہیں ——— ابھی نہیں ———

ابھی تو عاشی کسی قابل نہیں ہوئی ———

ابھی تو وہ اس نازک پودے کی مانند ہے جسے ایک سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔

سہارے نہ ہوں تو وہ ٹوٹ جاتا ہے ——— !!

نہیں میرے مالک ——— میرے پروردگار ——— ابھی نہیں ———

ابھی تو عاشی کو اس کی منزل تک پہنچانے کے لئے مجھے کچھ زندگی کی اور ضرورت ہے۔

حرارتیں اگر منجمد ہو گئیں تو منزل کا نشان گم ہو جائے گا۔

ایک معصوم وجود زندگی کی راہوں میں بھٹک کر دربدر ہو جائے گا۔

نہیں ———

نہیں ——— میرے مولا ———

ابھی نہیں ———

مجھے صرف اتنی مہلت اور عطا کر دے کہ میں عاشی کو اُس کی منزل کا نشان بتا دوں ———

بس چند قدم چلنے کی ہمت اور دے دے میرے معبود ———

اس کے بعد میں تجھ سے زندگی کی بھیک بھی نہیں مانگوں گا ———

ہاں میرے مالک ———

بس چند قدم اور ———

منزل کے قریب پہنچ کر اگر عاشی پھر بھٹک گئی تو پھر اُسے منزل تک کون پہنچائے گا ———

نہیں ——— میرے پروردگار ———

ابھی نہیں ——— ابھی نہیں ———"

وقت کے ساتھ ساتھ ممدو کا اضطراب بھی بڑھتا جا رہا تھا لیکن اچانک قدرت نے اُس کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخش دیا۔ شمسہ بیگم نے جس انداز میں عاشی کے سر پر ہاتھ رکھا وہ ممدو کے لئے بہت اُمید افزا تھا۔ اُس کے اندر کا خوف یکلخت ختم ہو گیا تھا۔ اُس کی بے چینیوں کو جیسے قرار مل گیا تھا ——— جیسے عاشی کو اس کی منزل مل گئی تھی۔ اور اسی یقین نے ممدو کو بہت ہلکا کر دیا تھا۔ اب اسے تھکن کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ اب اسے بڑھاپے کی بھی کوئی فکر نہیں تھی، بس ایک ہی خواہش باقی رہ گئی تھی۔

عاشی نے جو منزل پا لی تھی وہ اس سے بھی پھسلنے نہ پائے ——— !!

کوارٹر میں گھپ اندھیرا دیکھ کر وہ جان گیا تھا کہ عاشی وہاں موجود نہیں ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر اطمینان سے دروازے کی کنڈی کھولی، ہاتھ بڑھا کر سوئچ آن کیا تو ہر چیز روشن ہو گئی، مگر سیدھی کرتا دہ مختصر سے صحن میں لگے ہوئے نلکے پر گیا، منہ ہاتھ دھو کر اٹھا تو ہوا کے نرم و تازہ جھونکوں نے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ اعصاب پر جو تھکاوٹ کی ہیبت سوار تھی وہ بھی جاتی رہی۔

صحن سے ملحقہ کمرے میں آ گیا جو اس کوارٹر کی کل کائنات تھی اور اس کائنات میں اُس کی زندگی کا مختصر سا سفر بھی مختصر تھا جسے وہ اپنے وجود کے ساتھ اٹھائے اٹھائے پھر رہا تھا۔ پلنگ پر بیٹھ کر وہ کچھ دیر تک سستاتا رہا

پھر کچھ سوچ کر اُس نے پلنگ کے نیچے رکھا ہوا ٹین کا زنگ آلود ٹرنک کھینچ کر باہر نکالا، ٹرنک کے تالے پر مٹی گرد جمع تھی جسے ممدو نے ہاتھ سے صاف کیا، نیفے سے چابی نکال کر تالے کو بڑی احتیاط سے کھولا پھر چوروں کی طرح گھبرا کر اطراف کا جائزہ لینے لگا جیسے اُسے شبہ تھا کہ کوئی دوسرا اس کی حرکات و سکنات کو دیکھ رہا ہو۔ اس کے دل کی دھڑکنیں آپ ہی آپ تیز ہونے لگیں۔

آہستہ سے اُس نے ٹرنک کا ڈھکنا کھولا پھر ان چیزوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا جو ایک عرصے سے اُس کے اندر بند تھیں ـــــ چند ثانیے تک وہ اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھا زندگی کے اس اثاثے کو دیکھتا رہا جو اُس نے بڑی احتیاط سے سمیٹ کر رکھا تھا پھر اُس نے ہاتھ بڑھا کر اُس سُرخ جوڑے کو اٹھا لیا جو کہ مرنے والی کے سہاگ کی نشانی تھا۔ جوڑے کے نیچے لکڑی کا ایک ڈبہ تھا جس کے اندر کچھ زیورات رکھے تھے چوڑیاں، بُلاق، کانوں کے آویزے، ماتھے کا ٹیکہ اور سُرخ نگینے والی وہ انگوٹھی بھی جو ممدو نے خود اپنے ہاتھ سے مرنے والی کی انگلی سے اتاری تھی۔

اس انگوٹھی کو اُس نے مرنے والی کے ساتھ دفن نہیں ہونے دیا تھا اس لئے کہ اس انگوٹھی سے بہت سی یادیں وابستہ تھیں، سہاگ کی بھولی بسری یادیں، دو زندگیوں کے ملاپ کی خوشگوار یادیں جو ماضی میں دفن ہو چکی تھیں لیکن ممدو ان یادوں کی گواہی دینے کے لئے ابھی تک زندہ تھا ـــــ وہ ایک ایک چیز کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا، بیتی باتوں کا زخم تازہ ہوا تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں، اُس نے ان آنسوؤں کو خشک نہیں کیا اس لئے کہ وہ کسی کی یاد کا سہارا لے کر اُس کے دل کی گہرائیوں سے مچل کر اس کی پلکوں تک آگئے تھے۔

یہی آنسو تو تھے جنھوں نے ممدو کو زندہ رہنے پر مجبور کیا تھا، اکسایا تھا ـــــ وہ اب ان آنسوؤں کو ہمیشہ کے لئے خشک کر ڈالنے کا خواہشمند تھا لیکن اس سے پیشتر وہ ٹرنک میں رکھی ہوئی ان چیزوں کو جو عاشی کے حوالے کر دینا چاہتا تھا۔ وہ چیزیں جو کبھی فائزہ کی ملکیت تھیں اور اب عاشی کی امانت بن کر ممدو کے پاس محفوظ تھیں وہ ان امانتوں کو اس کے حقدار تک پہنچا کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جانے کا آرزومند تھا لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا ـــــ ابھی اسے عاشی کے سمجھدار ہونے کا انتظار تھا!

ٹرنک کھولے بیٹھا وہ ماضی کے دھندلکوں میں گم رہا پھر اُس نے کچھ سوچ کر جلدی جلدی تمام چیزیں دوبارہ سلیقے سے رکھا، بہت احتیاط سے تالہ بند کیا اور ٹرنک کو پلنگ کے نیچے دُور تک سرکا کر خود پلنگ پر بیٹھ گیا، اُس کے دل کی دھڑکنیں بتدریج مدھم ہو رہی تھیں، آنسوؤں کے شبنمی قطرے آنکھوں میں ابھی تک جھلملا رہے تھے پھر باہر عاشی کے مانوس قدموں کی آہٹ سنائی دی تو ممدو نے جلدی سے ان آنسوؤں کو اپنی آنکھ میں جذب کر لیا۔

عاشی دوڑاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی، اُس کے معصوم چہرے پر بے پناہ مسرتیں رقص کرتی نظر آتی تھیں، آنکھوں میں زندگی سے بھرپور خوشیاں دمک رہی تھیں، ممدو کو دیکھ کر وہ ایک لمحے کو چوکھٹ پر جھجک کر رکی پھر آگے بڑھ کر اپنے نرم و نازک ہاتھ اُس کے گلے میں ڈالتے ہوئے بولی۔

"تم کب آئے بابا ـــــ"

"بس ـــــ ابھی ابھی تو آیا ہوں" ممدو نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اِدھر میں نے آکر دروازہ کی اور اُدھر تُو بھاگتی ہوئی آگئی۔"

"سوری بابا ـــــ" عاشی نے بڑی معصومیت سے اپنی شرمندگی کا اظہار کیا "آج مجھے دیر ہو گئی۔ آنٹی آج میرا امتحان لینے بیٹھ گئی تھیں۔"

"اچھا ـــــ" ممدو نے خوش ہو کر جلدی سے پوچھا "پھر کیا رہا تمہارے امتحان کا ـــــ پاس ہو گئی میری گڑیا ـــــ"

"آج تو میں نے کمال ہی کر دیا بابا ـــــ" عاشی نے پُرجوش لہجے میں بتانا شروع کیا۔ "آنٹی نے مجھ سے اتنے مشکل مشکل سوال کئے تھے لیکن میں نے بھی بھٹا پھٹ تمام سوالوں کے جواب دے ڈالے، ایک بھی غلطی نہیں کی ـــــ آنٹی بہت خوش تھیں، وہ کہہ رہی تھیں کہ اب میرا داخلہ ناجیہ کے اسکول میں بڑی آسانی

ہو جائے گا۔"

"خدا تجھے زندگی کے تمام راستوں میں کامیاب کرے ـــــ آمین" ممدو نے اُس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے دعا دی۔

"آنٹی نے آج مجھے خوش ہو کر ڈھیر سارا پیار بھی کیا تھا ـــــ"

"آنٹی نے آج تجھے خوش ہو کر ڈھیر سارا پیار بھی کیا تھا ـــــ"

"آنٹی نے آج مجھے خوش ہو کر ڈھیر سارا پیار بھی کیا تھا ـــــ"

"خدا کے فضل و کرم سے میری گڑیا کے نصیب جاگ اُٹھے ہیں" ممدو کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔

"آج ایک مزیدار بات اور بھی ہوئی ہے ـــــ" عاشی نے ممدو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا پھر مسکرانے لگی۔

"میں بھی تو سُنوں، آخر وہ کونسی مزیدار بات ہے" ممدو نے عاشی کی خوشی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"اوں ـــــ" عاشی اٹھلا کر بولی "تم بھی تو بوجھنے کی کوشش کرو نا بابا ـــــ میں نے پھٹ سے بتا دیا تو کیا خاک مزا آئے گا۔"

"اچھا ـــــ" ممدو نے اپنے چہرے پر غور و فکر کے تاثرات پیدا کرتے ہوئے کہا پھر تھوڑے توقف سے بولا "بیگم صاحبہ نے میری گڑیا کی کامیابی پر کوئی اچھا سا قیمتی انعام دینے کا وعدہ کیا ہوگا۔"

"نہیں ـــــ" عاشی نے مسکراتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی۔

"نئے کپڑے آئے ہوں گے میری گڑیا کے لئے ـــــ"

"اوہو نہہ ـــــ"

"اچھا ـــــ تو پھر بیگم صاحبہ نے میری گڑیا کے لئے کتابوں کا بستہ منگایا ہوگا" ممدو نے یونہی قیاس آرائی کی "ویسا ہی جیسا ناجیہ بی بی کے پاس ہے۔"

"بستہ تو پہلے ہی آگیا ہے۔ میں نے بتایا تو تھا تمہیں" عاشی تیزی سے بولی "ایک اور بات ہے، بالکل نئی۔"

"بالکل نئی بات ـــــ کیا ہو سکتی ہے" ممدو نے عاشی کو خوش کرنے کی خاطر کنپٹی پر ہاتھ رکھ کر سوچنا شروع کر دیا۔

عاشی اُسے گھورتی رہی جب بہت دیر تک اُسے کوئی جواب نہ ملا تو اکتا کر بولی

"تم ہار مان لو بابا تو میں بتائے دیتی ہوں ـــــ"

"چلو ـــــ مان لی ہار ـــــ"

"بتا دوں ـــــ" عاشی نے شوخی سے کہا، نہ جانے کیا بات تھی جو وہ رہ رہ کر مسکرائے جا رہی تھی، خوشیاں اُس کے وجود پر ٹوٹ کے برس رہی تھیں۔

"بتائے ـــــ"

"وہ ـــــ وہ جو ناجیہ کے پاپا ہیں نا ـــــ آج انھوں نے بھی مجھے پہلی بار پیار کیا تھا" عاشی نے خوشی سے جھومتے ہوئے کہا۔

"اچھا ـــــ بڑے سرکار نے بھی پیار کیا تھا" ممدو کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے۔

"اور نہیں تو کیا ـــــ" عاشی نے لہرا کر جواب دیا "آنٹی نے انھیں بتایا تھا کہ میں نے اُن کا امتحان پاس کر لیا ہے، بس اسی بات پر انکل نے بھی میری پیشانی چوم لی اور ـــــ اور انھوں نے مجھے انعام دینے کا وعدہ بھی کیا ہے۔"

"یہ تو تیری خوش نصیبی ہے میری گڑیا جو بیگم صاحبہ کے ساتھ ساتھ بڑے سرکار بھی تجھ پر مہربان ہو گئے۔" ممدو نے فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر عاشی کو اپنے ہاتھوں کے حلقوں میں لے کر بے اختیار پیار کرتے ہوئے کہا "خدا تجھے ہمیشہ سلامت رکھے ـــــ ہمیشہ شاد و آباد رکھے۔"

ممدو کی پلکوں کی اوٹ میں چھپے ہوئے آنسو اُمڈ اُمڈ کر آنکھوں سے ڈھلکنے لگے تو عاشی پریشان ہو گئی۔

"کیا بات ہے پاپا ـــــ تم رونے کیوں لگے" اُس نے اپنے دامن سے ممدو کے آنسوؤں کو خشک کرتے ہوئے بڑی معصومیت سے پوچھا "تم نے آج چائے بھی پی یا نہیں ـــــ"

"چائے نہیں ملی اسی لئے تو رو رہا ہوں" ممدو نے بسورتے ہوئے بات بنائی تو عاشی نے اُسے بوڑھیوں جیسے انداز میں چمکارتے ہوئے کہا

"چپ ہو جاؤ میرے اچھے بابا ——— میں ابھی تمہارے لئے اچھی سی چائے بنا کر لاتی ہوں"

عاشی اسے دلاسہ دے کر تیز تیز قدم اٹھاتی صحن میں بنے رسوئی گھر میں چلی گئی تو ممدو کی آنکھوں سوتے ایک بار پھر اُبل پڑے ——— شاید اس لئے کہ عاشی کو آج ایک اور محفوظ سہارا مل گیا تھا ——— سہارا ——— جس کی تلاش میں ممدو نہ جانے کب سے اپنے بوڑھے اور ناتواں وجود کو قسمت کے بنائے ہوئے سنگلاخ راستوں پر گھسیٹ رہا تھا، آج اُس کے زخموں پر وقت نے مرہم کا کام کیا تو اس کی روح کو جیسے آکسیجن آگیا اور خوشی کے وہ انمول خزینے جو اُس نے اپنے دل کی گہرائیوں میں چھپا رکھے تھے بے اختیار آنسوؤں کی دھار کر اُس کی کپکپاتی پلکوں تک آگئے۔ اُس نے ڈبڈبائی نظروں سے دیوار پر لگے طغرے کی جانب دیکھا۔ اس کے ہونٹوں کو جنبش سی ہوئی۔

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْن ———

اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ——— !!

ممدو نے ایک لمحے کے لئے طغرے پر نظر جمائے رکھی پھر اُس کی عظمت کے آگے سر جھکا لیا۔

✱ ——— ✱

شمسہ بیگم اور شائستہ بیگم کے درمیان جو خلیج پیدا ہو گئی تھی وہ وقت کے ساتھ ساتھ کم ہونے کے بجائے اور بڑھتی جا رہی تھی ایک ہی گھر میں ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے دونوں کا ایک دوسرے سے آمنا سامنا ناگزیر تھا، ایسے موقعوں پر دونوں ہی کے دلوں میں شکوے اور شکایتیں جاگ اُٹھتیں۔ دونوں اپنے اپنے دل کی بھڑاس نکالنا چاہتیں لیکن یا تو مصلحتیں آڑے آجاتیں یا پھر وقت کی نزاکتیں ان کو لب کشائی کا موقع نہ دیتیں اور یہی سبب تھا کہ دونوں طرف دلوں کی گھٹن کم ہونے کے بجائے اور بڑھتی جا رہی تھی۔

شمسہ بیگم اپنے گھر میں تھیں، ساس کے انتقال کے بعد تمام سیاہ و سفید کی مالک تھیں لیکن شوہر کی وجہ سے وہ بھی شائستہ بیگم کے ساتھ پہل کرنے سے گریز کرتیں، اُن کے دل میں جس غلط فہمی اور بدگمانی نے سر اُبھارا تھا اُس کی جڑیں آہستہ آہستہ اندر ہی اندر پھیلتی جا رہی تھیں، مضبوط ہو رہی تھیں ——— معصوم فراز کی ذات سے ..... کوئی رنجش کوئی اختلاف نہیں تھا لیکن شائستہ بیگم کی وجہ سے انھوں نے نہ صرف یہ کہ خود بات چیت کم کر دی تھی بلکہ ناجیہ کو بھی ..... دُور دُور اور الگ تھلگ رہنے کی تاکید وقتاً فوقتاً کرتی رہتیں۔

دوسری جانب شائستہ بیگم کے صبر کا پیمانہ بھی رفتہ رفتہ لبریز ہوتا جا رہا تھا، صوفیہ خاتون کی آنکھ بند ہوتے ہی حالات نے اُن کے خلاف اچانک جو بلیغار کی تھی وہ اس سے سہم کر رہ گئی تھیں۔ وقت نے انھیں شمسہ بیگم کی نگاہوں میں بے گناہ ہونے کے باوجود مجرم بنا دیا تھا، وہ اپنی صفائی میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن ہر خیال سے مہر بلب تھیں کہ بات اگر بڑھ کر محمود حسین کے کانوں تک جا پہنچی تو فضا اور مکدر ہو جائے گی، وہ گھر کی خوشیوں اور سکون کو عارضی طور پر بھی برباد نہیں کرنا چاہتی تھیں جس کے دروازے اُن کے استقبال کے لئے ہمیشہ کھلے رہے تھے۔ اس گھر نے اُن کی اپنی زندگی کی بھی اَن گنت خوشیاں وابستہ تھیں۔

پھر ——— وہ اپنے ہی ہاتھوں اپنی خوشیوں کو کیسے روند سکتی تھیں ——— لیکن وقت اور حالات کے نشیب و فراز نے اب انھیں مجبور کر دیا تھا کہ وہ اس گھر کی دہلیز کو فوری طور پر جتنی جلدی ممکن ہو سکے خیر کہہ دیں۔

بات اگر صرف شائستہ بیگم تک محدود ہوتی تو شاید وہ صبر کر جاتیں ——— شوہر کی موت کے بعد حالات سے مفاہمت کرتے کرتے غم سہنے کی عادی ہو گئی تھیں، فراز کے مستقبل کے پیش نظر انھیں ہر زخم سہنا تھا مگر بات فراز کے معصوم وجود تک جا پہنچی تھی، وہ بے قصور ہونے کے باوجود ماں کے ناکردہ گناہوں کی

بھگتنے پر مجبور کیا جا رہا تھا ——— ہدف بنایا جا رہا تھا ——— !!

شائستہ بیگم نے اپنا رختِ سفر باندھ کر جانے کی تیاری مکمل کر لی تھی لیکن وہ شمسہ بیگم کو مزید شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتی تھیں، جانے سے پہلے وہ اُن سے مل کر ——— کچھ کہنا چاہتی تھیں، کچھ سننا چاہتی تھیں اس لئے کہ ابھی اس گھر کی دہلیز سے اُن کی بہت ساری خواہشات وابستہ تھیں ———

فراز کے مستقبل کی خواہش ———

ناجیہ کو بہو بنانے کی خواہش ———

محمود حسین سے تعلقات برقرار رکھنے کی خواہش ———

اور ———

ان تمام خواہشات کی تکمیل کی خواہش ———

ان ہی خواہشات کے احترام کو دل میں سمیٹے وہ اس وقت شمسہ بیگم کی خواب گاہ میں ڈرتے ڈرتے داخل ہوئی تھیں، انھوں نے طے کر لیا تھا کہ قبل اس کے کہ فراز کے معصوم ذہن میں اپنے اور پرائے کا فرق نمایاں ہو یا وقت کے ہاتھوں پیش آنے والے تغیرات کے پیشِ نظر اُسے اپنی غربت اور کم مائیگی کا احساس ہو وہ اُسے لے کر وہاں سے چلی جائیں گی۔

شمسہ بیگم دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے اپنی خواب گاہ میں گئی تھیں، یہ اُن کا روزمرہ کا معمول تھا اور اس معمول میں وہ کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتی تھیں چنانچہ جب انھوں نے خلافِ توقع شائستہ بیگم کو آتے دیکھا تو ایک لمحے کو چونک اٹھیں لیکن دوسرے ہی لمحے جلدی سے سنبھل کر بیٹھ گئیں، اخلاقاً شائستہ بیگم کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولیں۔

"آیئے آپا ——— بیٹھئے! ..... اس وقت کیسے زحمت کی ———"

"مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی تھی ———" شائستہ بیگم نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"شرفو کو بھیج کر مجھے بُلا لیا ہوتا ——— میں آجاتی" شمسہ بیگم نے خشک آواز میں مروتاً کہا پھر پوچھا "کوئی خاص بات ہے کیا ———"

"ہاں ———" شائستہ بیگم مدھم آواز میں بولیں "میں تمہیں یہ بتانے کے لئے آئی تھی کہ دو چار دنوں میں میرا ارادہ نہر والے مکان میں منتقل ہونے کا ہے، محمود سے میں پہلے ہی تذکرہ کر چکی ہوں"

"مجھے علم ہے کہ امی جان نے مرنے سے بیشتر نہر والا مکان بطورِ خاص آپ کے نام کر دیا تھا ——— لیکن یہاں آپ کو کیا تکلیف ہے جو آپ جانا چاہتی ہیں"

"تکلیف تو کچھ نہیں ہے مگر خالہ جان کی خواہش تھی کہ اُن کے بعد نہر والے مکان کو غیر آباد نہ رہنے دیا جائے" شائستہ بیگم نے مصلحتاً جھوٹ بولا

"اگر امی جان کی وصیت تھی تو میں آپ کو بھلا کیا مشورہ دے سکتی ہوں" شمسہ بیگم نے سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے کہا پھر مناسب سوچ کر بولیں "ویسے میرا خیال ہے کہ محمود آپ کو جانے کی اجازت نہیں دیں گے"

"میں ——— محمود سے اجازت لے چکی ہوں"

"کب تک ارادہ ہے جانے کا ———" شمسہ بیگم نے دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے دریافت کیا۔

"فراز کے اسکول کھلنے میں ہفتہ عشرہ باقی رہ گیا ہے، سوچتی ہوں کہ جب جانا ہی ہے تو دو ایک دن میں کیوں نہ چلی جاؤں" شائستہ بیگم نے اپنے بکھرتے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا "نئے گھر کو ضرورت کے مطابق ٹھیک ٹھاک بھی تو کرنا ہوگا"

"آپ مناسب سمجھیں تو شرفو کو ساتھ لے جائیں" شمسہ بیگم نے طنز کرتے ہوئے جواب دیا "میرا مطلب ہے کہ یہاں تو آپ کو ہر قسم کا آرام تھا سکین نئے گھر کی ترتیب میں بغیر ملازم کے آپ کو زحمت ہوگی"

"شمسہ ——" شائستہ بیگم نے اس طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا: "جانے سے پہلے میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"ضرور پوچھیے ——" شمسہ بیگم پہلو بدل کر بولیں: "آپ کو بھلا تکلف کی کیا ضرورت ہے۔"

"تم ——— تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو؟"

"یہ خیال آپ کو کیسے آگیا کہ میں آپ سے کسی بات پر ناراض ہوں؟" شمسہ بیگم نے زہر خند سے دریافت کیا۔

"یونہی ——" شائستہ بیگم نے دبی زبان میں کہا: "ایک شبہ سا تھا۔"

"اس شبے کی کوئی وجہ بھی ضرور ہوگی ——" شمسہ بیگم نے کریدنے کی کوشش کی۔

"ہاں ——" شائستہ بیگم خود کو سنبھالتے ہوئے بولیں: "خالہ جان کے انتقال کے بعد سے، تمہارے اندر کچھ تبدیلیاں محسوس کر رہی ہوں۔"

"تبدیلی سے تمہاری کیا مراد ہے ——؟"

"میری بات سمجھنے کی کوشش کرو شمسہ! ۔ انسان اکثر غلط فہمی کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔" شائستہ بیگم نہایت خلوص سے کہا: "کچھ ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں جن کی بظاہر کوئی اہمیت نہیں ہوتی مگر انسان اگر ان باتوں کو اپنی انا کا مسئلہ بنالے تو آپس کی رنجشیں دُور ہونے کے بجائے اور بڑھتی چلی جاتی ہیں ——"

"آپ کا اشارہ کس سمت ہے؟" شمسہ بیگم نے تنک کر پوچھا: "آپ کھل کر بات کریں تو پھر میں بھی جواب دوں۔"

"میں ہمیں کسی بات پر قائل کرنے یا شکوہ شکایت کرنے کی غرض سے نہیں آئی ہوں بلکہ صرف اتنا کہنے خاطر آئی ہوں کہ اگر تمہارے دل میں میری طرف سے کوئی میل ہے تو اُسے دُور کر دو ——" شائستہ بیگم نے کہا: "میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتی ہوں کہ میں نے دیدہ و دانستہ کبھی کسی کا بُرا نہیں چاہا اور تم لوگوں کے بارے میں تو میں ایسا سوچنا بھی گناہ سمجھتی ہوں اس لئے کہ تم لوگ میرے محسن ہو —— اس گھر کے ہزاروں احسان ہیں مجھ پر —— میں مرتے دم تک ان احسانوں کا کوئی بدل نہیں پیش کر سکتی۔"

"یہ آپ کی اپنی مرضی پر منحصر ہے کہ اس گھر انے کے احسانوں کو یاد رکھیں یا فراموش کر دیں! —— رہا دل میل کا مسئلہ تو اس کا سبب آپ کو بھی معلوم ہوگا۔" شمسہ بیگم نے قدرے تیزی سے جواب دیا: "تالی کبھی ایک ہاتھ سے نہیں —— دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔"

"میں تسلیم کرتی ہوں شمسہ ——" شائستہ بیگم نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا: "خالہ جان کی اچانک موت نے میری پوزیشن اور خراب کر دی ہے، وہ اگر زندہ ہوتیں تو شاید میں اپنی صفائی میں بہت کچھ کہہ سکتی تھی، نہیں اتنے دنوں تک پریشان نہ رہنے دیتی۔"

"آپ کو اگر میری اتنی ہی خاطر منظور تھی تو جو باتیں آپ نے امی جان سے کہی تھیں وہ مجھ سے بھی کہہ سکتی تھیں۔" شمسہ بیگم نے کھل کر شکایت کی: "رہا صلح صفائی کا مسئلہ تو آپ نے اس سلسلے میں بھی خاموشی اختیار کر لی تھی۔ مجھے کیا ضرورت تھی پہل کرنے کی۔"

"میں تمہاری شکایت تسلیم کرتی ہوں لیکن مجھے مصلحت ایسی تھی جو میں نے چپ رہنا زیادہ مناسب تصور کیا۔"

"یہ بھی آپ ہی بہتر سمجھ سکتی ہیں ——"

"مجبوریاں کبھی کبھی انسان کو وقت اور حالات کے سامنے بے بس کر دیتی ہیں۔" شائستہ بیگم نے آہ سرد آہ بھر کر کہا: "میں تمہیں اپنی بے گناہی کا یقین نہیں دلاؤں گی لیکن —— اتنا ضرور کہوں گی کہ ناجیہ ہمیشہ فراز سے زیادہ عزیز رہی ہے۔"

"میں نے بھی فراز کو کبھی غیر نہیں سمجھا مگر جیتے جی کوئی ماں یہ بھی برداشت نہیں کر سکتی کہ اُس کی اولاد زبردستی اُس کی مرضی کے بغیر کسی اور کے سپرد کر دی جائے اور وہ خاموش بیٹھی تماشہ دیکھتی رہے۔" شمسہ بیگم نے کہا: "ہو سکتا ہے یہ مشورہ محض امی جان کا ہو لیکن آپ پر کیا لازم تھا —— آپ بعد میں مجھے صورتِ حال سے آگاہ کر سکتی تھیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو شمسہ —— میں اپنی کوتاہیوں کو تسلیم کرتی ہوں۔"

شائستہ بیگم نے بات ختم کرنے کی خاطر اپنے ناکردہ گناہوں کا اعتراف کر لیا تو شمسہ بیگم چین بجبیں ہو کر رہ گئیں۔ کھل کر بھڑاس نکالنے کی جو حسرت تھی وہ دل کی دل ہی میں رہ گئی، اپنی جگہ خاموش بیٹھی پیچ و تاب کھاتی رہیں۔ کمرے میں کچھ دیر تک گھٹن آمیز خاموشی طاری رہی پھر شائستہ بیگم نے دوبارہ مہرِ سکوت توڑی —— دل گرفتہ انداز میں بولیں

"خالہ جان کی عنایتوں اور محمود کی بے لوث محبت نے مجھے میری حیثیت کا احساس بھلا دیا تھا ——۔ آنکھ کھل تو کب..... جب ہر خواہش، ہر تمنا خاک ہو کر رہ گئی ——"

"قسمت کا لکھا کون مٹا سکتا ہے۔" شمسہ بیگم نے آہستہ سے کہا لیکن اُن کے اس ایک جملے میں جو طنز تھا جو تیر و نشتر پوشیدہ تھے وہ شائستہ بیگم کے زخمی دل کو چھلنی کرنے کے لئے بہت کافی تھے۔ وہ تڑپ کر رہ گئیں بھرائی آواز میں بولیں

"انسان تقدیر کے آگے بے بس نہ ہوتا تو در بدر کی خاک کیوں چھانتا —— اپنی خواہش سے تو جانور بھی اپنے آشیانوں کو نذرِ آتش کر کے خاکستر نہیں کرتے —— سب نصیب کے کھیل ہوتے ہیں۔"

شائستہ بیگم نے کچھ ایسے لب و لہجے اور ایسے ٹوٹے ہوئے انداز میں کہا کہ شمسہ بیگم کو بھی اچانک اپنی غلطی کا احساس ہوا —— لیکن جو تیر اُن کے ترکش سے نکل کر کسی کے زخمی دل میں ترازو ہو چکے تھے اُن کی واپسی مشکل ہی نہیں ناممکن تھی چنانچہ وہ اپنی جگہ کسمسا کر رہ گئیں۔ البتہ اُن کی پیشانی پر جو سلوٹیں موجود تھیں وہ ایک ایک کر کے دور ہو گئیں۔

"میں تم سے جاتے جاتے ایک درخواست کرنا چاہتی ہوں۔" شائستہ بیگم نے تھکے ہوئے انداز میں اٹھتے ہوئے کہا پھر بڑی اپنائیت اور لجاجت سے شمسہ بیگم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولیں —— "محمود کو حالات کا علم نہیں ہے —— کوشش کرنا کہ وہ بے خبر ہی رہیں اور —— اور ہو سکے تو اپنی آپا —— اپنی بدنصیب آپا کو معاف کر دینا۔"

شائستہ بیگم اپنا جملہ مکمل کر کے تیزی سے پلٹیں اور گردن جھکا کر خواب گاہ سے نکل گئیں، شمسہ بیگم کو اپنی قوتِ سماعت پر دھوکہ ہو رہا تھا —— انھیں اتنی جلدی حالات کے پلٹا کھانے کی توقع نہیں تھی —— شائستہ بیگم اس طرح سرنگوں ہو کر اپنی تمام غلطیوں کا اعتراف کر لیں گی۔ یہ بات تو انھوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچی تھی۔

ہر چند کہ حالات نے شمسہ بیگم کو اپنی جگہ کھنچ جانے اور شائستہ بیگم سے متنفر ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا لیکن وہ برسوں کے ساتھ کو اتنی جلدی ختم بھی نہیں کرنا چاہتی تھیں، شائستہ بیگم نے اُن کے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہ بھی شمسہ بیگم کے دل پر نقش تھا —— انھوں نے تو محض حالات کے پیشِ نظر ایک بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ اُن کی خواہش تھی کہ شائستہ بیگم بس اس حد تک اپنی غلطی کا اعتراف کر لیں کہ ناجیہ کے سلسلے میں انھوں نے شمسہ بیگم کی شخصیت کو نظر انداز کر کے بھول کی تھی۔

صوفیہ خاتون کی موت کے بعد شائستہ بیگم کی ذات ہی تو اس گھر میں ایک بزرگ کی حیثیت سے باقی رہ گئی تھی۔ شمسہ بیگم کو قوی اُمید تھی کہ شائستہ بیگم اپنی بزرگی کے وقار کو قائم رکھنے کی خاطر خود ان باتوں کا ذکر ضرور چھیڑیں گی جو شمسہ بیگم کے ذہن میں کانٹوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور انجام کار دونوں کے درمیان جو فاصلے پیدا ہوئے تھے وہ کم ہونے کے بجائے اور وسیع ہوتے چلے گئے —— نفرت اور انا کے جس جذبے نے شمسہ بیگم کے دل و دماغ میں سر اُبھارا تھا وہ اپنی جڑیں مضبوط کرتا گیا —— اور اب جبکہ شائستہ بیگم نے خود کو مجبور و بے بس سمجھتے ہوئے حالات کے سامنے سرنگوں کر دیا تو شمسہ بیگم تڑپ اٹھی تھیں اُن کا دل چاہا تھا کہ آگے بڑھ کر شائستہ بیگم کا راستہ روک لیں —— ان کو بے اختیار سینے سے لگا کر اتنا روئیں —— اتنے آنسو بہائیں کہ دلوں کے تمام میل اور کدورتیں ہمیشہ کے لئے دھل جائیں۔

دل شیشے کی مانند چمک اُٹھے ——
صاف و شفاف ہو کر نکھر جائے ——
اور پھر ——
شیشۂ دل پر کوئی بال نہ آسکے ——

لیکن کچھ دل کی گھٹن باقی تھی اور کچھ احساسِ ندامت تھا جس نے شمسہ بیگم کو قدم آگے بڑھانے سے روک لیا اور —— شائستہ بیگم تیسرے روز خاموشی سے اپنا اسباب سمیٹ کر نہر والے مکان میں منتقل ہو گئیں۔

سبزے پر موسمِ سرما کی خوشگوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی، محمود حسین مشرقی گوشے میں بنے ہوئے کمرے کے اُس سائبان کے نیچے آرام کرسی پر نیم دراز کسی فائل کے مطالعے میں مصروف تھے جس پر پھولوں کی بیل نہایت نفاست سے چڑھائی گئی تھی، شمسہ بیگم اُن کے برابر دوسری کرسی پر بیٹھی ناجیہ کا سوئٹر بن رہی تھیں۔ ناجیہ اور عاشی قریب ہی ہار سنگھار کے نیچے بیٹھی لوڈو کھیل رہی تھیں اور بوڑھا مالی اس وقت گلاب کے نئے پودوں کو موسم کے اعتبار سے کیاری میں اتارنے کے کام میں مصروف تھا۔

شمسہ بیگم سوئٹر بنتے بنتے کبھی نظریں اٹھا کر شوہر کو بھی دیکھ لیا کرتی تھیں جو اپنے مطالعے میں مستغرق تھے۔

آج کافی عرصے کے بعد محمود حسین گھر میں صبح سے نظر آئے تھے اور اُس کی وجہ ایک جج کی حادثاتی موت تھی جس کے انتقال پر عدالتوں میں اظہارِ تاسف کا اعلان کر دیا تھا، شمسہ بیگم کو جہاں اس جج کی موت پر افسوس ہوا وہیں اس بات کی خوشی بھی تھی کہ آج شوہر کو دن بھر آرام و سکون نصیب ہو جائے گا، یہی وجہ تھی کہ جو وہ صبح ہی سے شوہر کے ساتھ ساتھ لگی ہوئی تھیں۔

محمود حسین بیوی کے احساسات اور اُن کی سوچ سے بے نیاز ان کاغذات کے مطالعے میں غرق تھے جو ایک کیس کے سلسلے میں اُن کے نائب نے تیار کئے تھے اور عدالت میں چھٹی کا اعلان سُن کر فائل گھر بھیج دی تھی۔ محمود حسین کی عادت تھی کہ وہ ہر کیس کو نہایت دلچسپی اور توجہ سے دیکھتے، اُس کے ایک ایک پہلو پر ماہرانہ انداز میں غور کرتے، کہیں معمولی سا جھول نظر آتا تو قانون کی کتابوں کے مستند حوالوں سے اس نکتے کی خامی کو دور کرتے اور جب تک پوری طرح مطمئن نہ ہو جاتے عدالت کے روبرو پیش ہونے سے گریز کرتے، یہی وجہ تھی کہ جو انھیں شاذ و نادر ہی اپنے کسی کیس میں ناکامی یا مایوسی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ اس وقت بھی حسبِ عادت وہ ایک نئے مقدمے میں عقلی گھوڑے دوڑانے میں مصروف تھے کہ ملازم نے چائے کی ٹرالی لا کر سامنے رکھی اور اُلٹے قدموں واپس ہو گیا۔

محمود حسین کی توجہ ذرا مبذول ہوئی تو انھوں نے ایک لمبا سانس لیا پھر فائل بند کر کے چھوٹی میز پر رکھ دیا، شمسہ بیگم نے شوہر کو فائل بند کرتے دیکھا تو جلدی سے اون سلائی رکھ کر چائے کی ٹرالی اپنے قریب کھینچتے ہوئے بولیں۔

"خدا کا شکر ہے کہ آپ نے فائل بند تو کی ——"

"آپ بھی تو سلائیوں پر اپنی ممتا کے تانے بانے بن رہی تھیں۔" محمود حسین نے مسکرا کر جواب دیا۔

"میرا بس چلے تو گھر میں آپ کے عدالتی کاغذات کا داخلہ بیک جنبشِ زباں بند کر دوں۔" شمسہ بیگم نے سوچا اتنی دیر میں کچھ ضروری کاغذات کا مطالعہ ہی کر لیا جائے۔"

چائے پیالیوں میں انڈیلتے ہوئے کہا: "ایسا بھی کیا کہ بھوبے بھٹکے تمہیت سے ایک دن آرام کا ملے اور فائلوں کے مطالعے میں ختم ہو جائے۔"

"اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو میں منشی جی کو سختی سے تاکید کر دوں گا کہ آئندہ سے دفتر کے کوئی کاغذات گھر پر نہ لائے جائیں۔ اب تو آپ خوش ہیں؟"

"تعجب ہے ——" شمسہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا پھر چائے کی پیالی شوہر کی جانب کھسکاتے

ہوئے بولیں: "آپ عدالت کے روبرو کھڑے ہو کر دوسرے وکیل یا جج سے کیا بحث کرتے ہوں گے۔"

"کیا مطلب ——"

"گھر میں تو آپ بڑی انکساری سے پیش آتے ہیں، اِدھر میری زبان سے کوئی بات نکلی اُدھر آپ نے صاد کیا۔"

"اوہ ——" محمود حسین مسکرا کر بولے "یہ بھی ایک راز ہے بیگم —— دراصل جو لوگ گھر کی چہار دیواری کے اندر گھن گرج کے ذریعے شیر بننے کی کوشش کرتے ہیں وہ گھر سے باہر گیدڑ ہی ثابت ہوتے ہیں اور پھر جہاں سابقہ ہو آپ جیسی ہونہار..... خدمت گزار..... نیک اور خوبصورت....."

"بس —— بس" شمسہ بیگم نے شوخی سے شوہر کو ٹوکتے ہوئے کہا "اب زیادہ بھی آسمان پر نہ چڑھائیں کہ مجھے بعد میں نیچے اُترنے میں تکلیف ہو۔"

"گھر کے ماحول کو خوشگوار اور پُرسکون رکھنے کے لئے دونوں فریق کی ذہنی ہم آہنگی نہایت ضروری ہے۔" محمود حسین بولے "بات اگر ضد اور بحث کی شروع ہو جائے تو پھر گھر —— گھر نہیں رہتا —— جہنم بن جاتا ہے اور بات دلہیز پار کر کے عدالتوں تک جا پہنچتی ہے۔"

"اے خدا نہ کرے ——" شمسہ بیگم یکلخت سنجیدہ ہو گئیں "ایسی بُری فال مذاق میں بھی زبان تک نہیں لانی چاہیئے۔"

"آپ غلط سمجھیں ——" محمود حسین نے چائے کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے جلدی سے کہا "میرا اشارہ اس فائل کی طرف تھا جو ابھی میرے مطالعہ میں تھی۔"

"میں سمجھی نہیں ——" شمسہ بیگم نے بڑی معصومیت سے پوچھا "اس فائل سے ہمارے گھریلو معاملات کا بھلا کیا سروکار۔"

"براہِ راست نہ سہی لیکن اس کیس میں بھی میاں بیوی کے درمیان جنم لینے والی چھوٹی چھوٹی تلخیوں کو بڑا دخل ہے۔" محمود حسین نے قدرے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا "مقدمہ بیوی کی طرف سے دائر کیا گیا ہے اور کاغذات کے مطابق —— شوہر پر یہ الزام عائد کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ نہ صرف گھریلو معاملات سے عدم توجہی کا مجرم ہے بلکہ اُس نے اپنے بیرونی سکون کی خاطر گھر کے سکون کو برباد کر رکھا ہے۔"

"یہ بیرونی سکون سے کیا مراد ہے ——"

"بیوی نے اپنے شوہر کو الزام لگایا ہے کہ وہ ایک دوسری عورت میں دلچسپی لے رہا ہے اور اسی کی خاطر اپنی منکوحہ کی حق تلفی کا مرتکب ہو رہا ہے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے۔" شمسہ بیگم نے پہلو بدل کر دبی زبان میں پوچھا "کیا یہ جھوٹا مقدمہ ثابت ہوگا۔"

"قبل از وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا —— ممکن ہے بیوی نے جو الزام عائد کئے ہیں وہ ان واقعات کے مقابلے میں بہت کم ہوں جو عملی زندگی میں اُسے پیش آ چکے ہوں —— اور —— یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شوہر کو عدالت کے کٹہرے تک گھسیٹنے میں بیوی کو محض یہ دکھانا منظور ہو کہ عورت زمانے کے ساتھ ساتھ اور وقت کی رفتار سے قدم ملا کر آگے بڑھ رہی ہے۔"

"آپ اس میں کوئی حرج سمجھتے ہیں۔"

"قطعاً نہیں ——" محمود حسین نے مسکرا کر نہایت فراخدلی سے جواب دیا "اگر مرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مردانگی کے زعم میں اپنے لئے دل بستگی کے راستے تلاش کرتا پھرے تو عورت بھی بے دست و پا نہیں —— وہ بھی خوشیوں کی تلاش میں سکون کے چند لمحے حاصل کرنے کی مجاز ہے۔"

"توبہ ہے ——" شمسہ بیگم نے چائے ختم کرتے ہوئے کہا "کیا عدالتوں میں ایسے ہی قصے اور کہانیاں دہرائی جاتی ہیں۔"

"اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے، آپ سنیں گی تو کانوں میں روئی ٹھونس لیں گی۔"

"چھوڑیئے اس بے تکے موضوع کو ——" شمسہ بیگم نے باتوں کا رُخ بدلتے ہوئے پوچھا "آپ کے

لئے اور چائے بناؤں "

" چائے کے بجائے اگر تھوڑی سی چاہ ہو جائے تو ——— "

محمود حسین کا لہجہ معنی خیز تھا، شمسہ بیگم لجا کر رہ گئیں پھر شرفو نے شام کی ڈاک لا کر بڑے میں رکھی تو محمود حسین ڈاک کی طرف متوجہ ہو گئے۔

" کیا دفتر میں بھی روزانہ اتنے ڈھیر سارے خطوط آتے ہیں " شمسہ بیگم نے دریافت کیا

" جی ہاں ——— لیکن مطمئن رہیئے، یہ تمام خطوط محض کاروباری نوعیت کے ہوتے ہیں ——— ان میں لیلیٰ مجنوں کے قصے مطلق نہیں ہوتے "

" ہو بھی سکتے ہیں " شمسہ بیگم نے شوہر کے چہرے کو تکتے ہوئے شوخی سے جواب دیا " مجنوں تو خدا رکھے ابھی جوان بھی ہے اور حسین بھی ..... "

" یہ آپ کا حسن ظن ہے جو ایسا سمجھتی ہیں ورنہ من آنم کہ من دانم ——— "

" میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کہی ——— " شمسہ بیگم نے شوہر کو چھیڑنے کی خاطر کہا " یقین نہیں آتا تو آئینہ دیکھ لیجئے "

" اگر آپ کا اصرار ہے تو چلئے مانے لیتا ہوں کہ میں کسی یوسفِ ثانی سے کم نہیں لیکن ——— آپ جیسی زلیخا بھی تو کہیں سے دستیاب ہو "

" بس رہنے دیجئے ——— بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے "

شمسہ بیگم شوہر کی زبان سے اپنی تعریف سُن کر کھل اٹھیں، مسکرا کر اُون سلائی اُٹھائی اور سوئٹر بننے میں مصروف ہو گئیں محمود حسین نے ٹرے میں رکھے ہوئے لفافوں کو اُٹھا اُٹھا کر کھولنا شروع کر دیا ——— زیادہ تر کاروباری خطوط تھے، محمود حسین سرسری نظروں سے اُن کا مطالعہ کرتے رہے لیکن ایک لفافہ کھولتے ہی اُن کے دل کی دھڑکنیں یکلخت تیز ہو گئیں خط کا پہلا ہی جملہ اُن کے لئے باعثِ حیرت تھا۔

" جانِ من ——— جب تک زندہ رہو، خوش رہو ——— آباد رہو ..... "

محمود حسین نے تیزی سے کاغذ پلٹ کر اُس کی پشت پر نظر ڈالی، آخر میں ——— " ذیشان " کا نام دیکھ کر چونک اُٹھے پھر اُن کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں، انھوں نے خط پلٹ کر شروع سے پڑھنا شروع کیا، جوں جوں وہ مضمون کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے رہے اُن کے دل کی دھڑکنیں بتدریج بڑھتی گئیں ——— دو سال بعد اچانک ذیشان کا خط پا کر انھیں خوشی بھی ہوئی تھی لیکن اس خوشی میں کرب میں ڈوبے ہوئے کچھ ایسے جانگسل لمحات بھی شامل تھے جو ماضی کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ گئے تھے، ——— زخموں کے کچھ ایسے نشان بھی دابستہ تھے جو ایک ذرا سی ٹھیس لگنے پر درد کی شدتوں کو چھو لیتے تھے۔

محمود حسین خط پڑھنے میں اس قدر منہمک تھے کہ انھیں اس بات کا احساس بھی نہ ہوا کہ شمسہ بیگم کب اچانک اُن کی طرف متوجہ ہوئیں اور کب سے اُن کے چہرے کے بدلتے تاثرات کا بغور مطالعہ کر رہی تھیں، وہ اس وقت چونکے جب شمسہ بیگم نے انھیں صفحہ پلٹتے دیکھ کر ٹوکا۔

" کیا بات ہے ؟ ——— آپ کہاں گم ہو گئے ہیں "

" آں ——— " محمود حسین بیوی کی آواز سُن کر یوں چونکے جیسے کوئی حسین خواب دیکھتے دیکھتے اچانک اُن کی آنکھ کھل گئی ہو ——— ہاتھ میں دبے ہوئے خط کو جلدی سے تہہ کرتے ہوئے بولے " ذیشان کا خط ہے "

" ذیشان ——— وہی تو نہیں جو آپ کے ہم جماعت رہ چکے ہیں اور جن کے ساتھ آپ ملک سے باہر گئے تھے "

شمسہ بیگم نے کچھ یاد کرتے ہوئے پوچھا۔

" ہاں ——— وہی "

" کیا لکھا ہے ذیشان صاحب نے ؟ ——— اتنے عرصے تک کہاں غائب تھے " شمسہ بیگم نے بدستور چہرے پر نظریں جمائے ہوئے دریافت کیا ——— " خیریت تو ہے ——— "

" ہاں ——— سب ٹھیک ہے " محمود حسین نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا پھر پورا خط پڑھے بغیر اُسے لفافہ میں رکھ دیا۔

" ارے ——— آپ نے تو خط پڑھے بغیر بند کر دیا ——— " شمسہ بیگم نے اون سلائی رکھتے ہوئے کہا۔

" لائیے، میں دیکھوں ! ..... ایسی کیا بات ہے جو آپ اُلجھ کر رہ گئے ہیں "

" انتہائی لاابالی اور غیر ذمہ دار شخص واقع ہوا ہے، ——— دو سال بعد خط بھی لکھا تو اُس میں ..... بے سروپا اور بے تکی باتیں لکھ ماری ہیں " محمود حسین نے بیوی کو ٹالنے کی خاطر کہا پھر اچانک خط کو لفافے سمیت ریزہ ریزہ کر کے ہوا میں بکھیرتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور بات کو بنانے کی خاطر یوں ہی جھرجھری سی لیتے ہوئے بولے " ہوا میں خنکی بڑھتی جا رہی ہے ——— اندر چل کر بیٹھتے ہیں "

" میرا خیال ہے کہ آپ ذیشان صاحب کا خط پڑھ کر کچھ پریشان ہو گئے ہیں " شمسہ بیگم نے ولی زبان میں کہا پھر آہستہ سے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

محمود حسین نے بیوی کا جواب سُن کر ایک نظر بھر کر انھیں دیکھا ——— کچھ کہنے کے لئے لب کھولے پھر ارادہ ترک کر کے تیزی سے پلٹے اور لمبے لمبے قدم اُٹھاتے کوٹھی کے اندر چلے گئے، جانے کیا بات تھی جو بیوی کا جواب سُن کر اُن کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا تھا ——— !!

شمسہ بیگم نے شوہر کے چہرے کی بدلتی ہوئی رنگت کو بطورِ خاص محسوس کیا لیکن اس کی وجہ نہ جان سکیں۔ البتہ اُن کی نظریں بار بار زمین پر پڑے ہوئے کاغذ کے ان ٹکڑوں پر اُٹھ رہی تھیں جو ماحول کی تبدیلی کے ذمہ دار تھے۔

پھر ———

ہوا کا ایک تیز اور سرد جھونکا آیا اور کاغذ کے ان بے جان ٹکڑوں کو بھی اڑا لے گیا ——— !!

سُرخ لباس میں ملبوس۔ حنا سے معطر۔ پھولوں کی سیج پر وہ دلہن بنی بیٹھی اپنے وجود کو خود ہی سراپا میں سمیٹنے کی کوشش کر رہی تھی، دل کی دھڑکنیں تھیں کہ رکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں جبھی تو اس کی افشار سے دمکتی کشادہ پیشانی پر پسینے کے شبنمی قطرے بھی موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

گھونگھٹ کی اوٹ سے اُس نے ذرا پلکیں وا کر کے دیکھا تو ایک ٹھنڈی طویل سانس لے کر رہ گئی۔ ہر چند کہ وقت حجلۂ عروسی میں اُس کے اور ——— دل کی انجانی دھڑکنوں کے سوا کوئی اور نہیں تھا پھر بھی وہ بھاری جوڑے کے اندر گٹھری بنی رہنے پر مجبور تھی، شرم و حجاب کے مارے تو اس سے گردن بھی نہیں ہلائی جا رہی تھی ——— جانے کیسے ایک ہی انداز میں بیٹھے بیٹھے اُس کا وجود دکھنے لگا تھا لیکن "کسی" کے انتظار نے اس کی تمام تر توجہ کمرے کے اُس دروازے پر مرکوز کر رکھی تھی جس پر خوش آمدید تحریر تھا۔

کچھ دیر پہلے تک تو وہ آنکھیں بھی نہیں کھول سکتی تھی۔ بڑی بوڑھیوں اور شوخ و شنگ لڑکیوں کے درمیان گھری بیٹھی تھی، وہ اس ہجوم کا چہرہ دیکھنے سے قاصر تھی لیکن اُن کے قہقہے اور اُن کی باتوں نے اُسے ان کے چہرے کی تصوراتی شناخت کرا دی تھی، جانے کتنی دیر تک وہ اُن کے مذاق کا ہدف بنی رہی پھر کسی نے کمرے میں داخل ہو کر کہا تھا۔

"بھئی اب آپ لوگ باہر آ جائیں، دلہن کو ذرا کمر سیدھی کر لینے دیں، بے چاری ایک ہی رُخ بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہوگی۔"

"چلو بھائی چلو ——— آگئیں دلہن کی ہمدرد۔" ایک لڑکی نے دبی زبان میں کہا۔

"آنے جانے سے کیا بنے گا میری بنو ———" دوسری لڑکی سرد آہ بھر کر بولی۔ "جو گھڑی آنے والی ہے وہ تو آ کر رہے گی۔"

"چپ بے شرم ———"

"شرم کاہے کی بی بی ——— آج اگر اُن کی باری ہے تو کل خدا نے چاہا تو اپنا نمبر بھی آ ہی جائے گا۔"

"خدا سمجھے تجھ سے ——— دیدے کا پانی تو بالکل ہی مر گیا ———"

"اچھا دلہن بیگم ———" ایک لڑکی نے اُس کے قریب آ کر کان میں سرگوشی کی۔ "تمہارا خدا ہی حافظ ہم تو سدھارتے ہیں۔"

"ہمت سے کام لینا بی بی، یہ وقت تو آنا ہی تھا۔" دوسرے کان میں ایک شوخ سی آواز سرسرائی تو شرم سے دوہری ہو کر رہ گئی۔

"اے بی شائستہ، یہ لڑکیاں ایسے نہیں مانیں گی، صوفیہ بہن کو بلاؤ۔" کسی بزرگ خاتون نے کہا۔ "کتنی دیر سے میں بھی کہہ رہی ہوں کہ کچھ دیر دلہن غریب کو آرام کر لینے دو لیکن کیا مجال ہے جو اُن کے کانوں پر جوں تک رینگی ہو۔"

"ہم تو آپ کی وجہ سے بیٹھے تھے پھوپھی اماں۔" کسی لڑکی نے کہا۔ "چلے جاتے تو آپ کو یہ شکایت ہوتی کہ لڑکیاں تو ایک جگہ ٹک کر بیٹھ ہی نہیں رہیں ——— پھرکی کی طرح تمام گھر میں ناچتی پھر رہی ہیں۔"

"اے صغرا ——— سن رہی ہو تم اپنی لڑکی کی باتیں۔" بزرگ خاتون نے شکوہ کیا۔ "میں کہتی ہوں لگا بھینچ کر رکھو ورنہ یہ تو شیطان کے کان بھی کترے گی، غضب خدا کا ——— چل ہے مجھ سے ٹھٹھول بازی کرنے۔"

"بڑوں کا ادب نہ چھوٹوں کی تمیز۔" ایک اور بزرگ خاتون نے گرہ لگائی۔ "ان کو تو زمانے کی ہوا لگ گئی ہے۔"

"جانے بھی دیجئے حسینہ خالہ۔" شائستہ نے بزرگ خاتون کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "شادی بیاہ کے موقعوں پر تو اس قسم کی چھیڑ چھاڑ کی اجازت ہونی چاہیئے ورنہ دھوم دھڑکا کیسے ہوگا۔"

"اے تو کیا دھوم دھڑکے کے یہ مطلب ہوتے ہیں کہ جوان جہان لڑکیاں بزرگوں کو ٹھونگے مارتی پھریں۔" بزرگ خاتون نے شائستہ کی حمایت پر اور خفا ہوتے ہوئے کہا۔ "اگر یہی مقصد ہے تو پھر اُن ڈومنیوں کو بلوانے کی کیا ضرورت تھی جو تین روز سے صحن اور برآمدے میں بیٹھی گلا پھاڑ رہی ہیں ——— کھلی چھٹی دے دی ہوتی لڑکیوں کو ——— ہو جاتا دھوم دھڑکا۔"

"آپ تو برا مان گئیں حسینہ خالہ، میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ ———"

"بس رہنے دو بی بی ———" بزرگ خاتون نے تیزی سے کہا۔ "ہم خوب جانتے ہیں تمہارا مطلب، اگر گھر بلا کر ایسا ہی ذلیل کرنا مقصود تھا تو پہلے بتا دیا ہوتا ——— ہماری جوتی کو کیا پڑی تھی نصیحت کرنے کی۔"

پھر بزرگ خاتون کمرے سے باہر چلی گئیں تو لڑکیوں کے ہجوم میں نکتہ چینی شروع ہو گئی۔ ایک بولی

"جواب نہیں خالہ حسینہ کا ——— اس بڑھاپے میں یہ عالم ہے تو جوانی میں کیا رہی ہوں گی۔"

"پٹاخہ ———" دوسری نے تیزی سے کہا۔

"میک اپ نہیں دیکھا ———" تیسری نے تنقید کی۔ "یوں لگتا ہے جیسے چہرے پر سفیدی پوت رکھی ہو ———"

"ایک ہمارا زمانہ تھا بی بی ——— کیا مجال ہے جو کبھی بھولے سے بھی پوڈر کا خشک پف بھی منہ سے لگایا ہو۔" دوسری نے آہ بھری۔

"سچ کہتی ہو دادی اماں ———" تیسری نے برجستہ جملہ چست کیا۔ "جب بغیر سرخی پوڈر ہی کے پورے محلہ کا راجہ چھتا تو پھر غازہ سرخی کی کیا ضرورت تھی ———"

"تم کیوں جلتی ہو بی بی ———" دوسری نے پلٹ کر جواب دیا۔ "اپنی اپنی قسمت کی بات ہے ———"

"میں تو کہتی ہوں کہ خالہ حسینہ کو اپنی نجمہ کی ساس ہونا چاہیئے تھا۔" ایک اور لڑکی نے درمیان میں بولتے ہوئے کہا۔ "آٹے دال کا بھاؤ بتا دیتیں۔"

"ایمان سے ——— اگر میری ساس ایسی آفت کی پرکالہ ہوتیں تو میں تو دوسری ہی دن شوہر کی رسّی تڑا کر فرّہ دو گیارہ ہو گئی ہوتی۔"

"اچھا جناب ——— اب آپ سب لڑکیاں جلدی سے یہاں سے نو دو گیارہ ہو جائیں ورنہ میں بُلاتی ہوں خالہ جان کو۔" شائستہ بیگم نے صوفیہ خاتون کو بلانے کی دھمکی دی تو یکے بعد دیگرے تمام لڑکیاں حجلۂ عروسی سے باہر چلی گئیں، اُن کے جوان اور کھنکتے قہقہے دُور تک سُنائی دیتے رہے۔ شائستہ بیگم نے کمرہ خالی دیکھا تو اطمینان کا سانس لیا پھر دلہن کے قریب جا کر بولیں۔ "اب تم آرام سے بیٹھ جاؤ شمسہ ——— یہاں میرے سوا کوئی نہیں ہے ———"

جواب میں وہ صرف اپنی جگہ کسمسا کر رہ گئی، منہ سے کوئی جواب نہ دے سکی۔

"اچھا بھئی ——— لو میں بھی چلی جاتی ہوں اور تمہارے "ان" کو بھیجے دیتی ہوں۔"

شائستہ کے قدموں کی آہٹ دروازے سے گزر جانے کے باوجود وہ بڑی دیر تک اپنی جگہ سمٹی سمٹائی بیٹھی رہی پھر اُس نے نظریں اٹھا کر گھونگھٹ کی آڑ سے دیکھا، کمرے میں کوئی نہیں تھا، اُس نے جلدی سے پہلو بدل لیا، ایک کا جائزہ لیا، چھت پر فانوس اور قندیلوں کی جگمگاہٹ اور دیواروں پر رسمی پردوں کی سرسراہٹ نے ماحول کو بڑا

خواب آلود کر دیا تھا، پھولوں اور عطر کی مہکتے ماحول میں نشہ سا گھول دیا تھا۔

چند لمحے وہ ماحول کا جائزہ لیتی رہی پھر دروازے پر ایک ذرا آہٹ ہوئی تو اُس نے جلدی سے لمبی لمبی پلکوں کو آنکھوں پر جھکا لیا، دل سینے میں زور زور سے دھڑکنے لگا، کان دروازے کی آہٹ پر لگے ہوئے تھے ذہن میں رہ رہ کر ایک ہی سوال گونج رہا تھا۔

"جانے ——— آنے والے لمحات اُس کے لئے کیسے ثابت ہوں؟"

وہ گردن جھکائے آنے والی آہٹوں پر کان لگائے رہی۔ آنے والے لمحوں کے بارے میں سوچتی رہی، مختلف خیال اُس کے معصوم ذہن میں گڈمڈ ہوئے تھے ——— وہ محمود حسین سے واقف تھی ——— متعدد بار انھیں دیکھ چکی تھی، ایک دو بار نظروں کا تصادم بھی ہو چکا تھا لیکن پھر بھی وہ سہمی سہمی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ نہ جانے زندگی کا آغاز کیسا ہوگا۔

خوابناک ——— ؟

حسین؟ ——— یا ——— بھیانک ——— ؟

ایک انسان کی حیثیت سے اُس نے محمود حسین کی بہت تعریف سُن رکھی تھی لیکن زندگی کی طویل راہوں پر ایک ہمسفر کی حیثیت سے وہ کیسے ثابت ہوں گے اُسے مطلق علم نہیں تھا ——— پھر اُس کے کانوں میں ہمجولیوں کی سکھیوں کے جُملے صدائے بازگشت بن کر گونجنے لگے، اُسے دلہن بناتے وقت نہ جانے کیا کیا مذاق ہوئے تھے۔

"ایمان سے شمسہ ——— تو تو ابھی سے قیامت لگ رہی ہے، دلہن بن کر کیا غضب ڈھائے گی!"

"مجھے تو اندیشہ ہے کہ محمود صاحب ہماری شمسہ کو دیکھتے ہی ہوش و حواس کھو بیٹھیں گے۔"

"پھر تو دلہن کے جہیز کے ساتھ ساتھ تجلّی بھی ہونا چاہیئے تاکہ دولہا میاں کو دوبارہ ہوش میں لانے پر زیادہ دشواری نہ ہو" ایک بے تکلف سہیلی نے مسکراتے ہوئے مشورہ دیا۔

شمسہ لجا کر رہ گئی، گردن جھکا کر مسکرانے لگی۔

"اے ہے ——— " ایک شریر سہیلی نے شمسہ کو مسکراتے دیکھ کر کہا "کلیجہ ہے یا کلیجگ ——— دیکھو تو سہی، دلہن بیگم اپنے میاں کی بیہوشی کے تذکرے پر بیٹھ کر ٹسوے بہانے کے بجائے تبسم فرما رہی ہیں۔"

"قریب قیامت کی دلہیل ہے بہن" دوسری نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا

"اللہ اکبر ——— تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے اور ابھی کتنے سارے کام پڑے ہیں" شمسہ کی پڑوسن نگہت نے سہیلیوں کو وقت کی کمی کا احساس دلانا چاہا ——— "چچا جان نے کہا تھا کہ برات ٹھیک مغرب کے وقت دروازے پر ہوگی۔"

"ہو جائے گی تیاری۔ اب ایسی جلدی بھی کیا ہے" ایک لڑکی بولی۔

"اور نہیں تو کیا ———" دوسری نے منہ بنا کر کہا "شادی کوئی روز روز تو ہوتی نہیں۔"

"نگہت باجی تو اس طرح بول رہی ہیں جیسے اُن کی اپنی برات آنے والی ہے۔"

"توبہ ہے ———" نگہت نے اپنی جان چھڑانے کی خاطر کہا "میں نے تو محض تم سب کو وقت کا احساس دلایا تھا ——— ہنسی مذاق کے ساتھ ساتھ اگر کام بھی ہوتا رہے تو کیا مضائقہ ہے۔"

"اے بی بی ——— ابھی سے اتنے کام کاج کی عادت بھی نہ ڈالو ورنہ سسرال جا کر صرف رسوئی گھر کی رہ جاؤ گی۔" ایک طرحدار لڑکی بولی۔

"اپنے گھر کا کام کاج کرنا کچھ ایسا بُرا بھی نہیں" نگہت نے جواب دیا "یوں بھی لڑکیاں گھر کی زینت ہوتی ہیں۔"

"اچھا زینت بی بی ——— خدا کے لئے تم اپنا یہ فرسودہ لکچر بند کرو ورنہ تمہاری حمایت میں کوئی اور اٹھ کھڑا ہوا تو شادی کی اس محفل میں بھی وعظ شروع ہو جائے گا ———"

شمسہ خاموشی سے گردن جھکائے سہیلیوں کی شوخیوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

"تم کس سوچ میں گم ہو دلہن بیگم" دردانہ نے جو شمسہ کی ہم عمر تھی اور چکی تھی گفتگو کا رُخ پھیرتے ہوئے کہا "اتنی بے صبری بھی اچھی نہیں ——— مغرب ہونے میں اب دیر ہی کتنی رہ گئی ہے ——— کچھ دیر ہمسے بھی

بول لو ———"

"ٹھیک کہا دردانہ نے ——— مغرب کے بعد تو ادھر قاضی صاحب نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر نکاح کے دو بول پڑھے اور اُدھر تم پرائی ہو جاؤ گی ——— ہم سہیلیوں کو بھول کر میاں کی للو چپو میں لگ جاؤ گی۔"

"اور پھر کچھ عرصے بعد تمہارے پاؤں بھاری ہو جائیں گے" ایک بے تکلف سہیلی نے مسکرا کر کہا۔

"اور جب پاؤں بھاری ہوں گے تو گود بھاری ہو جائے گی" دوسری نے ذرا سنجیدگی سے گرہ لگائی۔

"پھر تو ہمارے دودھ بھائی کی مصیبت ہو جائے گی" دردانہ بولی۔

"وہ کیوں ——— ؟" ایک شوخ سی لڑکی نے وضاحت چاہی۔

"وہ اس لئے میری بہو کہ جب شمسہ کی گود بھاری ہو جائے گی تو محمود حسین کہاں بسیرا کریں گے۔"

"لعنت ہے تم پر ———" جس لڑکی نے وضاحت چاہی تھی وہ شرما کر بولی "زبان کے آگے تو خندق ہے، جو منہ میں آتا ہے بک دیتی ہے۔"

"فکر مت کرو میری صبر پری" دردانہ نے لباس کی مناسبت سے لڑکی کا نام رکھتے ہوئے کہا "کل جب تم ہماری شمسہ کی طرح گردن جھکائے بیٹھی دل ہی دل میں منوں لڈو پھوٹ رہی ہوگی اس وقت پوچھوں گی کہ ہاں بی بی۔ اب بتاؤ، کتنے بیسی کے ساٹھ ہوتے ہیں۔"

لڑکیوں کی شریر باتوں نے کمرے کو زعفران زار بنا رکھا تھا، شمسہ سب ہی سے بے تکلف تھی ہر لمحہ چہچہاتی لیکن کچھ دنوں سے نہ جانے کیا بات تھی جو اُس کے ہونٹوں پر شرم و حیا کی مُہر سی لگ گئی تھی، کوئی ذرا اُس کے شادی بیاہ کے بارے میں کچھ کہتا تو وہ جلدی سے لجا کر گردن جھکا لیتی، دوپٹے کے آنچل کو یونہی انگلیوں کے درمیان ڈھکا ملتی تھی، کوئی اُس کے زندگی کے ہمسفر کے بارے میں کوئی خوبصورت بات کہتا تو وہ سرتاپا ساز کے نازک تاروں کی مانند گنگنا اٹھتی اور اگر کوئی مذاق میں بھی محمود حسین کی بُرائی کرتا تو اُس کی روح پر ایک نشتر سا چبھتا محسوس ہوتا، اس کا دل چاہتا کہ مذاق اُڑانے والے کا منہ نوچ لے لیکن وہ اچانک ایسی کیوں ہو گئی تھی۔

آخر کیوں ——— ؟

ابھی تو نئی زندگی کے آغاز میں کچھ دن باقی تھے ———

ابھی تو وہ اپنوں کی تھی ———

پرائی نہیں ہوئی تھی ——— پھر ———

اُسے اپنوں کا مذاق کیوں بُرا لگتا تھا ——— ؟

کیوں وہ اپنے ہونے والے ہمسفر کے بارے میں کسی کی زبان سے ایک غلط لفظ بھی سننا پسند نہیں کرتی تھی؟

اُسے کیا ہو گیا تھا

وہ خود سے بیگانہ کیوں ہوتی جا رہی تھی ——— ؟

کیا

کیا اسی کا نام محبت ہے ——— ؟؟

وہ پہروں اپنے خیالوں سے کھیلتی رہتی، خود ہی اُلجھتی اور آپ ہی سلجھتی رہتی اور پھر سوچتی، اُس کی سہیلیاں اُسے اپنے جھرمٹ میں لئے دلہن بنا رہی تھیں اور چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں تو وہ اندر ہی اندر مارے شرم کے کٹی جا رہی تھی۔

باہر برآمدے میں مراثنوں اور لڑکیوں نے مل جل کر ایک ہنگامہ بپا کر رکھا تھا، ڈھولک کی تھاپ پر خوشیوں اور اُمنگوں کے گیت بلند ہو رہے تھے، رخصتی اور ملاپ کے کیسے کیسے انوکھے اور عجیب گیت تھے جن کے بول سن کر وہ جلدی سے اس ڈر سے آنکھیں موند لیتی کہ کہیں کوئی اس کے احساسات کو اُس کی آنکھوں سے نہ پڑھ لے۔ دل کی دھڑکنیں نہ جانے کیوں تیز سے تیز تر ہونے لگتیں، کنپٹی کی رگیں تناؤ سے اُس کے دل کو گدگدانے لگتا، اُس کے پپوٹے بوجھل ہونے لگتے وہ خود کو بادلوں کے درمیان تیرتا محسوس کرنے لگتی، خوابوں کی سیر کرتی اور سحر انگیز وادیوں میں مست خرام ہرنیوں

کی مانند کلیل کرتی پھرتی ـــــ اس کا دل چاہتا، یوں ہی آنکھیں موندے رہے، نشاط انگیز لمحوں میں ڈوب جا
اور خوابوں کا یہ سلسلہ ـــــ یہ تسلسل بھی منتشر نہ ہو ـــــ کبھی نہ ٹوٹے۔

کچھ ایسے ہی احساسات اس پل بھی اُس کی رُوح کو گدگدا رہے تھے جب باہر سے "برات ..... برات" کا شور بلند ہوا، لڑکیاں اُٹھ کر باہر کی جانب دوڑ پڑیں، خود اُس کے دل کی دھڑکنیں بھی اچانک تیز ہو گئیں، جانے کیوں، ایک لمحے کے لئے وہ خوفزدہ سی ہو گئی، پھر نہ جانے کیا خیال اُس کے ذہن میں ابھرا کہ وہ چھوئی موئی کے معصوم پودے مانند خود اپنے ہی وجود میں سمٹ کر رہ گئی۔

باہر براتیوں کے گیت اور ڈھولک کی تھاپ میں بھی تیزی اور طراری آگئی تھی ـــــ برات دیکھنے کے لیے لڑکیوں کا غول ہنستا بولتا دوبارہ اُس کے کمرے میں آیا تو اُسے اپنی جان چھڑانی مشکل ہو گئی۔

"اری شمسہ، تیرا ہونے والا، وہ" تو بڑا ہی ندیدہ ہے" عذرا ہانپتے ہوئے بولی "سہرے کے درمیان دیدے پھاڑے اوپر ہی کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا ـــــ"

"جب ہی تو چوٹ کھائے ہوئے پرندے کی طرح ہانپ رہی ہو" دردانہ نے شمسہ کی حمایت میں علم جہاد بلند کیا تو لڑکیاں بے اختیار ہنس پڑیں۔ عذرا جھینپ کر رہ گئی۔

"ویسے ایک بات تو خطرناک ہی ہے" رخشندہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا "دولہا کی مونچھیں خاصی بڑی ہیں" اس بات کا ڈر ہے کہ اپنی شمسہ کو مونچھوں میں ڈوبا ہوا دودھ پینے کو ملے گا"

"گاڑی پر کیسے اکڑے بیٹھے تھے حضرت" شہناز بولی "جیسے پانی پت کا میدان مار لیا ہو"

"قد ذرا کچھ لمبا ہے لیکن بے ڈول نہیں لگتا ـــــ" رفعت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اب کیڑے نکالنے سے کیا فائدہ" عذرا بولی "اب تو جیسا بھی ہے شمسہ کو نبھانا پڑے گا"

"تمہیں اگر شمسہ سے ہمدردی ہے تو دلہن کا جوڑا پہن کر تم چڑھ جاؤ سولی پر" دردانہ نے عذرا پر چوٹ کی تو عذرا ہونٹ چباتی ہجوم میں جگہ بناتی باہر جانے لگی۔

"کہاں جا رہی ہو عذرا ـــ؟" رفعت نے پوچھا۔

"دلہن کا جوڑا لینے جا رہی ہیں ـــ" دردانہ نے برجستہ کہا تو کمرہ ایک بار پھر مصنوعی قہقہوں سے گونج اٹھا

"اے بی ـــ کچھ تم بھی بتاؤ، تمہارے دل پر اس وقت کیا بیت رہی ہے" رخشندہ نے شمسہ کے لپٹتے ہوئے شوخی سے پوچھا۔

"یہ تو ہواؤں میں اڑ رہی ہوں گی" شہناز نے اپنا خیال ظاہر کیا "پہلو میں گدگدی سی محسوس کر رہی ہو گی"

"دل میں پٹاخے پھوٹ رہے ہوں گے" رفعت نے شوخی کا مظاہرہ کیا تو دردانہ نے چمک کر کہا۔

"یہ لڈو والا محاورہ تو خیر ہم نے بھی سنا ہے لیکن پٹاخے ـــــ"

"میں بتاتی ہوں ـــــ" رخشندہ جلدی سے بولی "رفعت کے پڑوس میں پٹاخوں کی دوکان ہے"

"تیرے منہ میں خاک ـــــ" رفعت نے رخشندہ کو گھورتے ہوئے قدرے برہمی کا مظاہرہ کیا "خیر نے کوئی اُول جلول بات کی"

"اے واہ بی بی ـــــ" دردانہ نے منک کر بڑی بوڑھیوں کے لہجے میں کہا "پاس پڑوس میں دل پھڑ اور باتیں (دوسروں کو سُننی پڑیں، یہ تو وہی مثل ہوئی کہ دکھ سہیں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں"

"چلو یہ بھی غنیمت ہے کہ بات ابھی انڈوں تک ہے" شہناز شوخی سے بولی "اگر معاملہ بچوں تک آ مشکل ہو جاتی"

"تمہاری لڈو بھی چلنے لگی" رفعت نے شہناز کو گھورتے ہوئے کہا "پٹاخے والی بات تو خیر رخشندہ نے میں کہی تھی لیکن تم کہو تو میں کچھ حقیقتوں کا انکشاف بھی کر دوں ـــــ"

"سب ہی مذاق کر رہے ہیں اس لئے میں بھی بول پڑی ـــــ" شہناز نے جلدی سے کہا "اگر تمہیں برا بُری لگی ہے تو میں آئندہ سے تم سے مذاق نہیں کروں گی ـــــ"

محفل میں ایک لمحے کو سنجیدگی طاری ہوئی لیکن عورتیں دلہن کا جوڑا لئے اندر آئیں تو ہنگامے پھر سے جوان ہو گئے، کچھ بڑی بوڑھیاں بھی ہجوم میں شامل تھیں اس لئے زیادہ تر باتیں اشاروں کنایوں میں یا پھر سرگوشیوں میں ہو رہی تھیں لیکن مسکراہٹوں اور قہقہوں میں کوئی کمی نہیں آسکی تھی۔

نکاح کی رسم بخیر و خوبی ادا ہو گئی تو ہر طرف سے مبارک سلامت کا شور بلند ہونا شروع ہو گیا، بڑی بوڑھیاں شمسہ کو لڑکیوں کے حوالے کر کے چلی گئیں تو سہیلیوں نے نازِ سرِ نوشمسہ کو چھیڑنا شروع کر دیا۔

"شمسہ، ذرا ہاتھ پاؤں سنبھال کر زندگی کا آغاز کرنا" ایک لڑکی نے کہا "میں نے سُنا ہے کہ "گربہ کشتن روزِ اوّل" کے مصداق یہ شوہر حضرات روزِ اوّل ہی سے بیوی پر رعب جمانا شروع کر دیتے ہیں"

"عورت اگر ذرا عقلمندی اور احتیاط سے کام لے تو یہی مرد حضرات پالتو بندر کی طرح اس کے اشارے پر ناچنا بھی فخر سمجھتے ہیں" دردانہ بولی۔

"لیکن اپنی شمسہ بے چاری بھلا کیا کر سکے گی" رفعت نے کہا "اِدھر وہ حضرت بیرونِ ملک سے بیرسٹری کی ڈگری لے کر واپس آئے ہیں اور اِدھر ہماری معصوم گائے ـــــ"

"گائے ہے تو کیا ہوا ـــــ سینگ تو مار سکتی ہے" دردانہ نے اکڑ کر کہا "بعد میں فوجداری کا مقدمہ قائم ہوتا ہے تو ہوتا رہے لیکن ان حضرت کو کم از کم احساس تو ہو جائے گا کہ ہماری شمسہ کے منہ میں زبان نہیں تو سر پر سینگ تو ہے"

"یہ بھی ٹھیک ہے لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری یہ دلہن بیگم اپنے سرتاج کی صورت دیکھتے ہی اُس پر نثار جان سے فدا ہو جائیں اور اُس کے عشق میں دیوانگی اور جنون کی اس حد تک پہنچ جائیں کہ خود ہی کہنہ بیٹھیں ـــــ "آ بیل مجھے مار" رفعت نے کچھ ایسے انداز میں یہ بات کہی کہ لڑکیاں بے ساختہ قہقہے لگانے پر مجبور ہو گئیں، اسی وقت عذرا جو بہت دیر سے غائب تھی دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی تو دردانہ نے نظر پڑتے ہی ـــــ "باادب۔ باملاحظہ ہوشیار" کا نعرہ بلند کرتے ہوئے کہا

"لو ـــــ وہ اب آئی ہیں جب شمسہ کو قاضی نکاح کی سولی پر چڑھا چکا"

"یہ بھی کیا کم ہے کہ آگئیں ـــــ" شہناز نے فقرہ چست کیا "کسی کا ہاتھ تھام کر نکل گئی ہوتیں تو کہرام ہی مچ جاتا"

"کیوں جی ـــــ کہاں غائب تھیں تم" رفعت نے قدرے تیز لہجے میں سوال کیا۔

"پوچھنے گئی تھی کہ دولہا کا کوئی بھائی بند بھی باقی ہے یا نہیں" عذرا نے ایک سرد آہ بھر کر کہا "معلوم ہوا کہ پورے خاندان میں ایک ہی پیس (PIECE) بچا تھا جو ہماری شمسہ نے چوری چوری ہتھیا لیا"

"برات میں جا کر تانکا جھانکی کرو ـــــ ہو سکتا ہے تمہارے نصیب سے کوئی اچھا دانہ نکل آئے" دردانہ بولی۔

"وہ بھی دیکھ لیا ـــــ" عذرا نے اس بار ڈھٹائی سے جواب دیا "وہاں بھی اپنے مطلب کا کوئی نہیں ہے"

"پھر تو ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے" شہناز نے مشورہ دیا "کچھ دے دلا کر شمسہ کو راضی کر لو اور نکاح اپنے نام کرا لو ـــــ ابھی وقت ہے ـــــ سوچ لو، سونے کا چڑا ہاتھ سے نکل گیا تو عمر بھر پچھتاؤ گی"

"مجھے منظور ہے" عذرا نے مسکراتے ہوئے کہا پھر شمسہ کے قریب منہ لے جا کر آہستہ سے پوچھا "کیا خیال ہے، میرے حق میں دست بردار ہو گی یا پھر شراکت نامہ مرتب کرا لیا جائے"

شراکت نامہ کا لفظ سُن کر شمسہ بھی اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکی تو شرم سے کچھ اور سمٹ گئی۔

نکاح کے بعد دوسری رسمیں پوری ہوئیں، سمدھنیں دولہا کے ساتھ اندر داخل ہوئیں تو مراثنوں نے انھیں گھیر کر گالیوں والے گیت سُنانا شروع کر دیئے ـــــ آرسی مصحف کا وقت آیا تو دردانہ اور اُس کی سہیلیوں نے مل جل کر دولہا کو اتنا پریشان کیا کہ شمسہ کی والدہ کو انھیں سمجھانا بجھانا پڑا تب کہیں جا کر رسم کی ادائیگی ممکن ہوئی اور اُس کے بعد اسے اسکبار ہو گئیں لیکن وہ گھونگھٹ کے اندر گردن جھکائے بیٹھی رہی اس لئے کہ رسم دنیا یہی تھی ـــــ!

وہ پرایا دھن تھی ——— !!

اپنی دہلیز پر کب تک بیٹھی رہ سکتی تھی ——— ؟

شمسہ بیگم اپنے بستر پر لیٹی ان لمحات کو تصورات میں تازہ کر رہی تھیں جو ماضی میں گم ہو چکے تھے لیکن ابھی تک اُن کے ذہن میں محفوظ تھے، انھیں اپنی زندگی کی اس خوبصورت ترین رات کے وہ حسین ترین لمحے ابھی تک یاد تھے جب محمود حسین نے نئے دولہا کے جوڑے میں ملبوس جملہ عروسی میں بڑے فاتحانہ انداز میں قدم رکھا تھا اور اُن کے دل کی دھڑکنیں دوچند ہو گئی تھیں اور جب قدموں کی آہٹ آہستہ آہستہ اُن کے قریب آئی، پھولوں سے بھری مسہری پر کوئی آہستہ سے بیٹھا اور انھیں اپنا گھونگھٹ دھیرے سے سرکتا محسوس ہوا تو وہ مارے شرم کے پانی پانی ہو گئی تھیں، بڑی شدت سے آنکھیں بھینچ کر گردن کو کچھ اور خم دے لیا تھا، دل کی دھڑکنیں کسی طرح تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھیں اور پھر کسی کی گرم گرم سانسیں اُن کے رخسار سے ٹکرا گئیں ——— ایک سرگوشی اُبھر کر کانوں میں گونجی تو خون کی گردش یکلخت کیسی تیز ہو گئی تھی۔

"شمسہ ——— نام ہی کی طرح آپ خود بھی بے حد حسین ہیں ——— تابناک، روشن، چندے آفتاب چندے ماہتاب۔"

انھوں نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لئے، ایک اجنبی مگر مانوس آواز نے نہ جانے اُن کے وجود کو کس طرح گدگدا دیا تھا۔

"خدا نظر بد سے محفوظ رکھے ——— آمین۔"

وہ بدستور گٹھری بنی بیٹھی اپنی دھڑکنوں کو شمار کرتی رہیں۔

"خاکسار کو محمود حسین کہتے ہیں۔" فضا میں ڈوبتی آواز ایک بار پھر ماحول کی رنگینیوں میں سرسراتی ہوئی اُبھری۔

"آپ کا تابعدار ——— آپ چاہیں تو کچھ اور بھی کہہ سکتی ہیں، میرا مطلب ہے آپ جس نام سے بھی مجھے یاد کریں گی مجھے منظور ہوگا ———"

وہ اب بھی خاموش رہیں، کیا جواب دیتیں، شرم و حیا نے دمکتے ہونٹوں پر جیسے مہر لگا دی تھی، وہ جانتی تھیں کہ محمود حسین اُن کے شوہر ہیں ——— نئی زندگی کی نئی راہوں کے ہم سفر جن کا ہاتھ تھام کر انھیں عمر کی طویل مسافت طے کرنی تھی لیکن نہ جانے کیوں دراز پلکیں بار بار تھرتھرا کر رہ جاتی تھیں، وہ انھیں جی بھر کر دیکھنے کی خواہش کو بھی پورا کرنے سے قاصر ہو رہی تھیں۔

"میرے خدا ——— کہیں مجھے دھوکہ تو نہیں ہوا۔" محمود حسین نے سنجیدگی سے کہا۔

شوہر کی زبان سے دھوکے کا لفظ سن کر وہ پریشان ہو گئیں۔

"شائستہ سے تو آپ واقف ہوں گی ———"

شمسہ بیگم نے بمشکل اثبات میں گردن کو جنبش دی۔

"وہ میری بڑی بہن کی طرح ہیں ———" محمود حسین نے کہا پھر کچھ توقف سے بڑی گمبھیر اور سنجیدہ آواز میں بولے "مجھے شائستہ بہن سے اس بات کی توقع نہیں تھی ——— انھوں نے تو کہا تھا آپ ——— آپ بولتی بھی ہیں، بڑی پیاری آواز ہے آپ کی ——— لیکن آپ تو ———"

اور شمسہ بیگم نے شوہر کا مفہوم سمجھا تو بے اختیار مسکرا دیں، حیا کی سرخی چہرے پر پھیل تو پنڈا کچھ اور اُٹھا، ہونٹ کچھ کہنے کے لئے کپکپا کر رہ گئے۔

"آپ کو میری قسم ——— کچھ تو بولئے۔" محمود حسین نے اصرار کیا۔

"جی" ——— انھوں نے مدھم لہجے میں بمشکل کہا۔

"انگریزی میں نہیں ——— میں نے اُردو میں بات کرنے کی درخواست کی تھی۔"

شمسہ بیگم اس خوبصورت اور برجستہ مذاق پر کھل اٹھیں پھر جب محمود حسین نے آہستہ سے اُن کا ہاتھ تھاما تو وہ دھک سے رہ گئیں، ایک عجیب سا احساس پورے وجود میں بجلی بن کر سرایت کر گیا، حلق خشک خشک ہونے لگا، پپوٹے کچھ اور بوجھل ہو گئے۔

"زندگی میں آج کی یہ رات پھر کبھی پلٹ کر واپس نہیں آئے گی ———" محمود حسین نے اُن کے ہاتھوں کو ہلکا سا دباؤ ڈال کر کہا۔ "آیئے اس رات کو مل جل کر ——— ہنس بول کر، عہد و پیمان کر کے ایک یادگار رات بنا دیں۔"

شمسہ بیگم آنے والے لمحوں کے تصور سے کچھ اور شرما کر رہ گئیں ——— پھر حجاب ٹوٹا تو وہ پلکوں

یوں چپکے سے بیت گئی کہ دونوں میں سے کسی کو اُس کے گزرنے کا ایک ذرا احساس تک نہ ہوا۔ اسی رات محمود حسین نے اُسے بتایا تھا۔

"ذیشان میرا واحد دوست ہے، ہم ایک دوسرے سے بے انتہا بے تکلف ہیں، ایک دوسرے کے رازدار بھی ہیں اور ——— اور یوں سمجھ لیجئے کہ دو جان ایک قالب ہیں، ذیشان سرجری کی تعلیم حاصل کر رہا ہے، میرا خیال ہے دو ایک سال میں واپس آجائے گا، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پردیس ہی کا ہو کر رہ جائے ——— دراصل ذیشان کو سفید چمڑی والی بے تکلف اور بے باک لڑکیاں بہت پسند ہیں، میرے سامنے بھی وہ جولیا نامی ایک لڑکی کے عشق میں گرفتار تھا اور پیار میں اُسے جولیا کے بجائے جمیلہ کہا کرتا تھا۔"

"آپ بھی تو تین سال باہر رہے ہیں۔" شمسہ بیگم نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا ——— "کہیں آپ نے تو وہاں ———"

"دیکھیں شمسہ ——— ہم نے آج کی تاریخ سے زندگی کے ایک نئے باب کا آغاز کیا ہے۔" محمود حسین نے قدرے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔ "ہمیں اپنے ماضی کو یکسر فراموش کر کے ایک نئی منزل کی طرف بڑھنا چاہیئے ——— ماضی کو کریدنے سے اکثر غلط فہمیاں اور بے کار روسو سے جنم لینے لگتے ہیں اس لئے ہم آئندہ سے ایک دوسرے کے ماضی میں... جھانکنے کی کوشش نہیں کریں گے۔"

محمود حسین کچھ دیر تک سنجیدگی سے بولتے رہے پھر یکلخت مسکرا کر کہا۔

"جہاں تک اپنے دیس کا تعلق ہے، میں آپ کا اور بلا شرکت غیرے صرف آپ کا ہوں ——— رہا بدیسی ملکوں کا معاملہ تو وہاں صرف عارضی داستانیں جنم لیتی ہیں اور ——— یہ داستانیں جتنی تیزی سے جنم لینے کے لئے اُبھرتی ہیں اتنی ہی تیزی سے قصۂ پارینہ بن کر دفن بھی ہو جاتی ہیں۔"

"آپ کے ساتھ وہاں کتنی داستانوں سے وابستگی رہی۔" شمسہ بیگم نے ایک نئے انداز میں مسکراتے ہوئے شوہر کو کریدنے کی کوشش کی۔

جواب میں محمود حسین نے اُسے مسکرا مسکرا کر بے شمار نام گنوا ڈالے ——— انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ مذاق کر رہے ہوں، خود شمسہ بیگم نے بھی اُن باتوں کو اُس وقت محض مذاق سمجھا تھا لیکن آج ———

آج جب محمود حسین نے ذیشان کا خط انھیں دکھائے بغیر ریزہ ریزہ کر دیا تو ماضی کا مذاق ایک سنجیدہ اور بھیانک رُوپ اختیار کر کے اُن کے سامنے سوالیہ نشان بن کر آگیا اور یہ نشان اُن کے ذہن میں اپنا حجم بڑھاتا جا رہا تھا۔ پریشان کن سوالات رہ رہ کر اُبھرتے اور آپس میں گڈمڈ ہو کر رہ جاتے ———

آخر اس خط میں ایسی کونسی بات تھی جو اُسے تلف کر دیا گیا ———

وہ کیا راز تھا جو پوشیدہ رکھنا ضروری تھا ———

آج سے پہلے تو ایسا نہیں ہوا تھا ———

ذیشان کے تمام خطوط بطور خاص اُسے دکھائے جاتے تھے۔

وہ کیا بات تھی جس نے محمود حسین کے خوشگوار موڈ کو اچانک تبدیل کر دیا تھا۔

وہ ہنستے ہنستے یکلخت سنجیدہ کیوں ہو گئے تھے ———

کیوں؟ ——— کیوں؟ ——— آخر کیوں ——— ؟؟

شمسہ بیگم نے کروٹ بدل کر دیکھا، محمود حسین بے خبر سو رہے تھے، خواب گاہ میں مدھم پاور کا نائٹ بلب بھی بجھ گیا تھا رات کے سناٹے میں اونگھتا نظر آرہا تھا، دیوار گیر کلاک میں رات کے دو بج رہے تھے، شمسہ بیگم نے ایک سرد آہ بھری پھر پلکیں موندلیں، کچھ دیر تک وہ اپنے خیالوں سے اُلجھتی رہیں پھر نیند کی آغوش میں گم ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئیں ——— !

دو سال تک ناجیہ کا نتیجہ عاشی کے مقابلے میں بہتر آتا رہا۔ اُسے خوشی تھی کہ عاشی اُس کے مقابلے پر نہیں آسکی، وہ عاشی کو پسند کرتی تھی، چاہتی تھی، ایک ساتھ رہتے رہتے دونوں ایک دوسرے سے بہت قریب ہو گئی تھیں لیکن دادی نے اُسے امارت اور شان و شوکت کا جو احساس بخشا تھا وہ وقت کے ساتھ بڑھتا جا رہا تھا، اسی لئے وہ

عاشی کی ہار پر بے حد خوش ہوتی۔ دنیا دکھاوے کے لئے اور عاشی کا دل رکھنے کے لئے وہ یہی کہتی ——

"گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں ——

فکر کیوں کرتی ہو —— پاس تو ہو گئیں ——

اور کوشش کرو —— ہو سکتا ہے اگلے سال تمہارا نتیجہ کچھ اور بہتر ہو جائے ——

گورنمنٹ اسکول اور کونونٹ اسکول کی پڑھائی میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے ——

حوصلے سے کام لو عاشی —— سولہویں پوزیشن بُری تو نہیں ہوتی۔

میرا کیا ہے —— میں تو ہمیشہ اچھے نمبروں سے کامیابی حاصل کرتی ہوں، ہاں میٹرک کا امتحان ہوگا تو محنت زیادہ کروں گی اور پھر —— پھر تم دیکھنا کہ میں پورے صوبے میں اوّل نمبر پر آؤں گی ——

پہلی دوسری جماعت میں فرسٹ آنے سے کیا ہوتا ہے —— میٹرک میں اچھی پوزیشن آئے تو اخباروں میں تصویر بھی چھپتی ہے ——"

ناجیہ عاشی کا دل رکھنے کے ساتھ ساتھ ڈھکے چھپے جملوں میں اس کا مذاق بھی اُڑاتی لیکن عاشی نے کبھی اُس کی کسی بات کا بُرا نہیں مانا، وہ ناجیہ کی ہر بات کو سمجھتی تھی لیکن ہمیشہ زیرِ لب مسکرا کر چپ ہو جاتی اس لئے کہ ناجیہ بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ اونچے گھرانے کا چشم و چراغ تھی اور اسی گھرانے کی پروردش عاشی کی پرورش ہو رہی تھی، اُسے بہتر اسکول، بہتر ماحول میں پڑھنے کا موقع مل رہا تھا —— پھر، وہ اگر کچھ کہنا بھی چاہتی تو کیسے کہہ سکتی تھی۔

اِس کے علاوہ عاشی کو ناجیہ سے بے انتہا محبت بھی تھی، وہ اس کی ایک ایک بات کا خیال رکھتی، اسی کے ساتھ پڑھتی اور اُسی کے ساتھ اسکول آتی جاتی، جب ناجیہ کا نتیجہ اس کے مقابلے میں بہتر آتا تو وہ بے حد خوشی کے ساتھ اسے مبارک دیتی، خلوصِ دل سے کہتی ——

"ناجیہ —— تمہیں تمہاری شاندار کامیابی مبارک ہو۔

کلاس میں گیارہویں پوزیشن حاصل کرنا بھی بڑی بات ہے —— لیکن

میری اچھی بہن —— تم تھوڑی توجہ پڑھائی پر اور دو تو فرسٹ پوزیشن بھی لا سکتی ہو ——

ایمان سے ناجیہ —— تم کلاس میں اوّل آؤ گی تو مجھے بہت خوشی ہوگی ——

میرے ابا بھی تمہاری کامیابی کی دعائیں کرتے ہیں ——"

فیّاض مندی کے احساس اور بڑائی کے غرور نے ناجیہ کو گھمنڈی بھی بنا دیا تھا، اُس کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی کہ عاشی کے مقابلے میں اُس کا نتیجہ بہتر ہے، وہ عاشی کے مقابلے میں بہت زیادہ قیمتی اور اعلیٰ لباس زیبِ تن کرتی، اُس کے بالوں کے اسٹائل اور گفتگو میں بھی رکھ رکھاؤ ہوتا —— عاشی کو اُس کے مقام کا احساس دلانے کی خاطر وہ اکثر اُسے جان بوجھ کر نظر انداز کر دیتی اور فری کے ساتھ ہنسنا بولنا شروع کر دیتی، اسکول میں بھی وہ اپنی باتوں کے ذریعے اپنی ہم جماعت لڑکیوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتی کہ اس کا اور عاشی کا کوئی مقابلہ کوئی جوڑ نہیں ——

شروع شروع میں جب تیسری جماعت میں عاشی کا داخلہ ہوا تھا تو ناجیہ اُسے اپنے ساتھ ہی بٹھایا کرتی تھی لیکن فری نے اُسے ایک دن اس بات کا احساس دلایا کہ اُس کا عاشی کے ساتھ بیٹھنا مناسب نہیں، گھر کی بات اور ہے لیکن باہر اُسے والد کی شہرت، عزت اور خاندانی وقار کی بلندی کا خیال رکھنا چاہیئے —— اُس وقت فری کی بات ناجیہ کی سمجھ میں نہیں آسکی تھی چنانچہ اُس نے فری سے پوچھ لیا تھا۔

"عاشی اگر کلاس میں میرے ساتھ بیٹھے گی تو اس میں کیا حرج ہے؟"

"یہ میں نہیں جانتی لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ عاشی تمہارے ملازم کی لڑکی ہے" فری نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"وہ تو ہے —— لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے" ناجیہ نے معصومیت سے دریافت کیا۔

"ہاں —— یہ تو ہے"

"امی تو ملازموں کو ہمیشہ ڈانٹتی ڈپٹتی بھی رہتی ہیں" ناجیہ نے اُسے اپنے گھر کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہوئے کہا "میں نے ایک بار اپنی ایک تصویروں والی کتاب اپنے ملازم کو دے دی تھی، امی کو خبر لگی تو انہوں

نے مجھے بھی ڈانٹا اور کتاب ملازم سے چھین کر اُسے جلا دیا"

"کیوں —— کیا تمہارا ملازم پڑھنا لکھنا نہیں جانتا" ناجیہ نے بڑی سادگی سے دریافت کیا۔

"جانتا کیوں نہیں —— لیکن امی اُسے پڑھنے کا موقع ہی نہیں دیتیں" فری بولی "جہاں اُس نے پڑھنے کے لئے کتاب اُٹھائی، امی نے آواز دے کر اُسے کسی کام پر لگا دیا ——"

"یہ تو بُری بات ہے فری ——" ناجیہ نے محسوس کرتے ہوئے کہا "وہ بے چارہ اگر پڑھے گا نہیں تو امتحان میں کیسے پاس ہوگا"

"یہ سب باتیں تم میری امی سے پوچھ لینا ——" فری نے اُکتاتے ہوئے جواب دیا "مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ امی کا کہنا ہے کہ ملازم نے پڑھ لکھ لیا تو وہ کل کو ہمارے ساتھ برابری کرنے کے لئے بھی کھڑا ہو سکتا ہے"

"اب سمجھی میں ——" ناجیہ نے گردن ہلاتے ہوئے کہا "ہاں —— یہ بات تو ہے"

"اسی لئے تو میں کہتی ہوں کہ تم عاشی کے برابر نہ بیٹھا کرو ——"

اور فری کے سمجھانے پر ناجیہ نے دوسرے ہی پیریڈ سے عاشی کے ساتھ بیٹھنا ترک کر دیا، عاشی نے اس عمل کو محسوس کیا لیکن چپ رہی، شاید اس لئے کہ اُسے ناجیہ کے مقابلے میں اپنی حیثیت کا احساس کچھ زیادہ ہی تھا اور یوں بھی وہ ہر قیمت پر ناجیہ کو خوش رکھنا اور خوش دیکھنا چاہتی تھی اس لئے کہ ناجیہ اُس کی محسنہ تھی۔

سہیلی تھی ——

ہم جماعت تھی —— اور

اُسے بے حد عزیز تھی —— !!

لیکن

پانچویں جماعت میں جب عاشی نے اپنی تمام کلاس میں پہلی پوزیشن حاصل کی تو ناجیہ خوش ہونے کے بجائے اندر ہی اندر سلگ کر رہ گئی، خود اُس کی تیسری پوزیشن آئی تھی، پہلی بار اُس نے عاشی کو اپنے مقابلے میں آگے نکلتے دیکھا تو نہ جانے کیوں تڑپ کر بے چین سی ہو گئی —— اُسے فری کی بات کا خیال بھی آیا، فری نے ٹھیک ہی کہا تھا —— اگر عاشی کو پڑھائی کا موقع نہ دیا جاتا تو آج کلاس میں اوّل آنے کی خبر سُن کر اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کبھی نہ پیدا ہوتی جسے دیکھ کر ناجیہ کو احساسِ کمتری کا شکار ہونا پڑا تھا۔

اُس روز اسکول میں نتیجے کے اعلان کے بعد ایک لمحہ کو بھی اس کا دل نہ لگ سکا، وہ بار بار حاسد نظروں سے عاشی کو تکنے لگتی اور ہونٹ چبانے لگتی —— اُس روز عاشی کی ایک ایک ادا اُسے زہر لگے رہی تھی۔ نتیجہ سُن کر عاشی کا بے اختیار کھل اُٹھنا —— پھر ناجیہ کی سمت دیکھ کر اُس کا یکلخت سنجیدہ ہو جانا —— کلاس میں سر جھکائے بیٹھے رہنا —— چور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنا —— یہ تمام باتیں ناجیہ کو سخت ناگوار محسوس ہو رہی تھیں۔

چھٹی کے بعد عاشی نے اُس کے قریب آنے کی کوشش کی تو وہ فوراً کترا کر فری کے قریب چلی گئی تھی، فری نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ناجیہ کو اور اُکسا دیا۔

"دیکھ رہی ہو تم ——"

"کیا ——" اُس نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"عاشی کے متعلق کہہ رہی ہوں" فری نے حقارت سے کہا "اتفاق سے اس بار پہلی پوزیشن کیا حاصل کر لی۔ دماغ ہی نہیں مل رہا، کیسی اِترا اِترا کر چل رہی ہے ——"

"اس بار میں نے پڑھائی پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی" ناجیہ نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا "چھٹی جماعت میں دیکھنا —— اگر میں نے عاشی کو شکست نہ دی تو میرا نام بھی ناجیہ نہیں ——"

"اگلے سال کی بات اگلے سال دیکھی جائے گی لیکن اس وقت تو عاشی کو بڑائی جتانے کا موقع مل گیا" فری نے کہا "امی جان اسی لئے اپنے ملازموں کو پڑھانے لکھانے کے خلاف ہیں —— دو چار جماعت پڑھ کر یہ اپنی اوقات بھول جاتے ہیں"

ناجیہ نے کوئی جواب نہیں دیا، اندر ہی اندر جھلس کر رہ گئی، تیز تیز قدم اٹھاتی اسکول سے باہر آئی جہاں

اُس کے باپ کی جھلملاتی، چمکتی، لمبی سی گاڑی موجود تھی، باوردی ڈرائیور اُس کا منتظر تھا جس نے اُسے دیکھتے ہی بڑی مستعدی سے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول دیا، اُس نے پلٹ کر عاشی کی طرف دیکھا، وہ دو قدم پیچھے سر جھکائے آ رہی تھی، ناجیہ لپک کر پچھلی نشست پر بیٹھ گئی اُس نے سوچا تھا کہ دروازہ بند کرلے تاکہ عاشی اس کے ساتھ اس کے برابر نہ بیٹھ سکے لیکن کچھ سوچ کر اُس نے اپنا ارادہ ترک کردیا۔

عاشی گاڑی میں داخل ہو کر اُس کے قریب بیٹھی تو ناجیہ نے حقارت سے اپنا منہ دوسری طرف کرلیا، ڈرائیور نے حسبِ معمول نہایت ادب سے دروازہ بند کیا اور پھر اگلی نشست پر جا کر بیٹھ گیا ـــــ کچھ فاصلہ خاموشی سے کٹ گیا۔ لیکن عاشی کو یہ خاموشی بہت گراں گزر رہی تھی، دو ایک بار اُس نے کنکھیوں سے ناجیہ کی سمت دیکھا جو بدستور اُس کی جانب سے منہ پھیرے بھاگتے نظاروں کو دیکھ رہی تھی۔ اُسے ناجیہ کی خاموشی اور سرد مہری کا سبب معلوم تھا، وہ جانتی تھی کہ اُس کی کامیابی ناجیہ کے لئے تازیانہ بن گئی ہے ـــــ اُسے علم تھا کہ ناجیہ اپنے مقابلے میں کسی اور کی کامیابی برداشت کرنے کی عادی نہیں تھی ـــــ لیکن عاشی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ روٹھی ہوئی ناجیہ کو کس طرح منائے اگر اُس کے اختیار میں ہوتا تو وہ کبھی فرسٹ پوزیشن لانے کی کوشش نہ کرتی، ناجیہ سے اپنا نتیجہ تبدیل کرا لیتی۔

اُس نے تو محض دل لگا کر محنت کی تھی، جو کچھ پڑھا تھا ناجیہ کے ساتھ ہی پڑھا تھا، امتحان دیتے وقت اُس نے پوری توجہ سے ایک ایک سوال کو پڑھا تھا، خوب غور و خوض سے سوچ سمجھ کر جواب لکھے تھے، اُس کی محنت رائیگاں نہیں گئی تھی، اُسے اپنی محنت کا پھل شاندار کامیابی کی صورت میں ملا تھا۔

قدرت نے اُسے سرفراز کیا تھا ـــــ
قدرت نے اسے سربلندی کا موقع عنایت کیا تھا ـــــ
قدرت نے اُس کے ساتھ انصاف کیا تھا ـــــ
لیکن ـــــ قدرت کے انصاف نے اُسے خوفزدہ بھی کر دیا تھا ـــــ!
حالات نے اُسے ناجیہ کی نظروں میں چور سا بنا دیا تھا ـــــ!!
وہ مجرم بن کر رہ گئی تھی ـــــ!!!

چپ چاپ بیٹھی وہ ناجیہ کی ناراضی پر غور کرتی رہی پھر سہمے سہمے لہجے میں آہستہ سے بولی

"ناجیہ ـــــ"

"کیا بات ہے ـــــ" ناجیہ نے پلٹ کر اُسے غصے سے دیکھا اور وہ سہم گئی۔

"تم ـــــ تم چپ چپ کیوں ہو" اُس نے بڑی سادگی سے کہا "کیا سوچ رہی ہو"

"کچھ بھی نہیں ـــــ" ناجیہ نے سپاٹ آواز میں جواب دیا پھر زہر خند سے بولی "تم کس لئے سہمی سہمی ہو، کیا تمہیں یقین نہیں آ رہا کہ اندھے کے ہاتھ بٹیر لگ گئی ہے"

"ہاں آں ـــــ" عاشی نے دل گرفتہ لہجے میں آہستہ سے کہا "مجھے توقع نہیں تھی کہ ایسا ہوگا"

"ارے ہاں ـــــ میں تمہیں مبارکباد دینا تو بھول ہی گئی" ناجیہ نے اُس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا "تمہیں تمہاری اتفاقیہ پوزیشن مبارک ہو"

"شکریہ ناجیہ ـــــ" عاشی کے ہونٹوں پر ایک تبسم لرز کر مٹ کر رہ گیا۔

"اس بار میں ڈیڈی سے ضد کر کے اپنے لئے ریڈیو سے اُڑنے والا ہوائی جہاز منگاؤں گی ـــــ فری ہاتھ تھی کہ تین چار ہزار کا ملتا ہے" اس نے عاشی پر اپنی امارت کا رعب ڈالنے کی خاطر کہا پھر یکلخت خشک آواز میں بولی "تم اپنے بابا سے کیا انعام لوگی ـــــ میرا مطلب ہے کہ مالی بابا کی تنخواہ تو بہت کم ہے، پھر بھی کوئی چھوٹا موٹا تحفہ تو تمہیں ضرور دیں گے"

"مجھے بابا کے تحفے کی نہیں ـــــ اُن کی دعاؤں کی ضرورت ہے"

عاشی نے سر جھکا کر دبی زبان میں جواب دیا پھر ان آنسوؤں کو پینے کی ناکام کوشش کرنے لگی جو حالات کی ستم ظریفی اور کم مائیگی کا احساس جیتے اُس کی پلکوں پر کپکپا رہے تھے، ناجیہ نے عاشی کی نمناک آنکھیں دیکھیں تو مسکرا دی۔

شمسہ بیگم کو نتیجے کا علم ہوا تو ایک لمحے کو انھیں بھی ناجیہ کے پیچھے رہ جانے کا دکھ ہوا لیکن انھوں نے قدرت کے اس فیصلے کو قبول کر لیا اس لئے کہ یہ عاشی کی محنت اور دن رات ناجیہ کے ساتھ لگے رہنے کا نتیجہ تھا کہ اس بار وہ بھی تیسری پوزیشن حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی، شمسہ بیگم نے بیٹی کو سینے سے لگا کر مبارکباد دی مگر ناجیہ کے بگڑے تیور دیکھ کر انھیں اس بات کا اندازہ بھی ہوگیا کہ وہ اپنے مقابلے میں عاشی کی کامیابی کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھ رہی ہے۔

عاشی ایک طرف خاموش کھڑی شمسہ بیگم کے چہرے کے تاثرات اور ناجیہ کے بدلتے تیوروں کا جائزہ لیتی رہی۔ شمسہ بیگم نے جب ناجیہ کو آگے بڑھ کر ممتا کے جذبوں سے سرشار ہو کر اپنی چھاتی سے لگایا تو نہ جانے کیوں عاشی کا دل تڑپ اُٹھا، اُسے آیک لمحے کو اپنی یسیری کا خیال آیا تو یوں لگا جیسے کوئی شے اُس کے احساسات کی گہرائیوں میں چبھ کر ٹوٹ گئی ہو، اُس کی معصوم آنکھوں کے پیالے چھلک اُٹھنے کو بیقرار ہو گئے مگر اُس نے بڑے ضبط سے کام لیا، یوں ہی تصویرِ حیرت بنی کھڑی شمسہ بیگم کو تکتی رہی۔

"جاؤ بیٹی ـــــ نہا دھو کر لباس تبدیل کر ڈالو" شمسہ بیگم نے ناجیہ کے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "تمہارے پپا نے وعدہ کیا تھا کہ اگر تمہارا نتیجہ پہلے سے بہتر رہا تو منہ مانگا انعام دلانے لے چلیں گے"

"سچ امی ـــــ" ناجیہ خوش ہوگئی۔

"اور کیا جھوٹ ـــــ کیا لے گی میری بیٹی"

"ریڈیو سے اُڑنے والا جہاز" ناجیہ نے تیزی سے کہا پھر کنکھیوں سے عاشی کی سمت دیکھتے ہوئے بولی "وہی جو ڈھیر سارے روپوں کا آتا ہے"

"خدا میری بچی کو سلامت رکھے، روپوں کی کیا کمی ہے تمہارے لئے"

ناجیہ ماں کا جواب سن کر باغ باغ ہوگئی، جس کامیابی کا سہرا عاشی کے سر بندھ چکا تھا وہ اُسے عاشی کے سر سے نوچ کر نہیں پھینک سکتی تھی لیکن اُسے خوش بھی نہیں دیکھ سکتی تھی عاشی کو خود سے کم تر ثابت کرنے کے لئے وہ ہر اُس ممکن پہلو کو اُجاگر کرنے کی خواہشمند تھی جو عاشی کی زندگی میں کمیاب تھا۔

عاشی کے قریب سے گزرتے ہوئے اُس نے ایک نفرت اور حقارت بھری نگاہ اُس پر ڈالی پھر منہ پھیر کر اپنی خوابگاہ کی طرف چل دی۔ عاشی گم صم کھڑی اس گناہ کا کفارہ ادا کرتی رہی جو قدرت نے امتحان کی کامیابی کی صورت میں اُس کے حساب میں رقم کر دیا تھا، ناجیہ کی بدلی ہوئی نگاہوں نے اُسے زخمی سا کر دیا تھا، اُس نے چاہا تھا کہ دوڑ کر ناجیہ سے بغلگیر ہو جائے، اُسے منا لے، اُسے یقین دلا دے کہ اُس کی خوشی کی خاطر وہ اپنی پڑھائی ترک کر دے گی، ان تمام کتابوں کو نذرِ آتش کر دے گی جس نے آج اُسے ایک مانوس ماحول میں اچانک اجنبی بنا دیا تھا لیکن ـــــ وہ چاہنے کے باوجود اپنی جگہ سے جنبش نہ کر سکی، گنگ سی کھڑی ناجیہ کو نظروں سے اوجھل ہوتا دیکھتی رہی۔

"عاشی ـــــ تم کس سوچ میں گم ہو"

شمسہ بیگم نے ناجیہ کے جانے کے بعد اسے مخاطب کیا تو وہ یوں چونک اُٹھی جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھتے دیکھتے اچانک آنکھ کھل گئی ہو، دل کی دھڑکنوں کو سمیٹتی وہ آہستہ سے پلٹی، شمسہ بیگم قریب کھڑی اُسے پیار بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں عاشی کو اپنی نظروں پر دھوکہ سا ہوا ـــــ اُس نے سوچا، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ناجیہ اُس سے ناراض ہو اور شمسہ بیگم اُس سے محبت کا برتاؤ کریں۔

"کیا بات ہے عاشی، تم چپ چپ کیوں ہو" شمسہ بیگم نے اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نرم لہجے میں پوچھا "کیا ناجیہ نے کچھ کہا ہے"

"جی نہیں ـــــ" وہ آہستہ سے بولی۔

"مجھے یقین تھا کہ تم ضرور فرسٹ پوزیشن حاصل کرو گی" شمسہ بیگم اُس کی پشت کو تھپکتے ہوئے بولیں "تمہیں تمہاری شاندار کامیابی بہت بہت مبارک ہو ـــــ"

"شکریہ آنٹی ـــــ" اُس نے بجھی ہوئی آواز میں کہا۔

"اچھا' اب یہ بتاؤ کہ تم اپنی کامیابی پر کیا تحفہ لوگی ـــــ" شمسہ بیگم نے اپنائیت سے پوچھا۔

"تحفہ ـــــ" وہ خالی خالی نظروں سے شمسہ بیگم کو تکنے لگی۔

"ہاں کچھ بھی تحفہ ـــــ" شمسہ بیگم نے مسکراتے ہوئے بڑے پیار سے کہا: "کیا ناجیہ کی طرح تم میری بیٹی نہیں ہو"

"کیوں نہیں آنٹی ـــــ میں بھی تو آپ کی ہوں" اُس نے ڈرتے ڈرتے مسکرانے کی جسارت کی۔

"پھر جلدی سے بتاؤ ـــــ کیا تحفہ چاہیئے تمہیں؟"

"آنٹی ـــــ آپ ـــــ آپ ناجیہ سے کہیں کہ وہ مجھے معاف کردے" عاشی نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"مجھے اُس کے سوا کوئی اور تحفہ نہیں چاہیے"

"تم بھی دار ہو بیٹی' ناجیہ کی باتوں کا خیال نہ کیا کرو" شمسہ بیگم نے بے اختیار عاشی کو چومتے ہوئے بھلانے کی کوشش کی۔ "زیادہ لاڈ پیار نے اُس کی عادتیں بگاڑ دی ہیں ـــــ میں اُسے سمجھا دوں گی"

"آنٹی ـــــ آپ تو مجھ سے خفا نہیں؟"

"میں بھلا تم سے کیوں خفا ہونے لگی" شمسہ بیگم نے عاشی کے احساسات کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو تم سے بہت خوش ہوں' اس لئے کہ تم نے یہ ہی تو توقعات کے مطابق کامیابی حاصل کی ہے"

"لیکن ناجیہ کو میری کامیابی کی خوشی نہیں ہوئی" عاشی نے بڑی معصومیت سے کہا پھر جلدی سے بولی "میں کوشش کروں گی کہ آئندہ سے میرے بائے ناجیہ کی پہلی پوزیشن آئے ـــــ"

"اچھا ـــــ وہ کس طرح؟"

"میں ـــــ میں جان بوجھ کر ایک دو سوال غلط کردوں گی تو ظاہر ہے کہ میرے نمبر کاٹ لیں گی اور جب میرے نمبر کم ہوں گے تو میری پوزیشن بھی ناجیہ سے اچھی نہیں ہوگی" عاشی نہایت سادگی سے بولی "پھر ناجیہ کبھی مجھ سے روٹھ نہ سکے گی"

"عاشی ـــــ" شمسہ بیگم نے عاشی کی معصوم آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا "ناجیہ تمہیں اچھی لگتی ہے؟"

"ہاں آنٹی ـــــ" وہ تیزی سے بولی "ناجیہ کے علاوہ میری اور کوئی سہیلی بھی تو نہیں ہے"

"لیکن وہ جب تم سے بات بات پر خفا ہو جاتی ہے تو پھر تم اس سے اتنی محبت کیوں کرتی ہو ـــــ؟"

"پھر ـــــ میں کیا کروں" عاشی نے بڑے بھولپن سے کہا۔

"تم بھی اُس سے ناراض ہو جایا کرو" شمسہ بیگم نے سنجیدگی سے مشورہ دیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے آنٹی ـــــ" اُس نے جلدی سے کہا "ناجیہ مجھ سے عمر میں چھوٹی بھی تو ہے' جب وہ سمجھ دار ہو جائے گی تو پھر ہمارے درمیان کبھی جھگڑا نہیں ہوا کرے گا ـــــ ہم دونوں مل جل کر رہا کریں گے"

"اگر یہ بات ہے تو پھر تمہیں ناجیہ کے اس وقت روٹھ جانے کا ملال کس لئے ہے ـــــ" شمسہ بیگم نے اُسے پیار سے گھورتے ہوئے کہا "چلو منہ جلدی سے اور کپڑے بدل جاؤ کہ ابھی کچھ دیر پہلے تم نے اپنی پڑھائی کے سلسلہ میں کیا کہا تھا"

"مجھ سے بھول ہوگئی تھی آنٹی ـــــ سوری" عاشی نے مسکراتے ہوئے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا پھر بڑی معصومیت سے بولی "میں بابا کو جا کر اپنا نتیجہ سنا کر آتی ہوں ـــــ آپ ناجیہ کو اتنی دیر میں سمجھا دیں پھر میں واپس آکر اُس کے ساتھ کھیلوں گی"

"ہاں ـــــ یہ ٹھیک ہے"

عاشی خوش خوش جانے کے لئے گھومی تو شمسہ بیگم نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بڑی محبت سے کہا۔

"اتنی جلدی کیا ہے ـــــ مجھے اپنی کامیابی کی خوشی میں ایک پیار تو کراتی جاؤ"

"سوری آنٹی ـــــ میں جلدی میں آپ کو پپی دینا بھول گئی تھی"

"شاباش ـــــ" شمسہ بیگم نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا "اپنے بابا کو میری طرف سے بھی بہت بہت مبارکباد دینا"

"جی اچھا ـــــ"

"اور ہاں ـــــ یہ بھی سوچ کر رکھنا کہ تم اپنی آنٹی سے کیا تحفہ لوگی"

"آنٹی ـــــ یو آر سوئٹ" عاشی نے خوشی سے جھومتے ہوئے کہا پھر تیزی سے پلٹی اور ممدو کو اپنی کامیابی کی خوشخبری سنانے کے لئے تیز تیز قدم اٹھاتی کمرے سے باہر چلی گئی ـــــ!

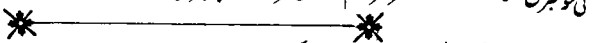

ناجیہ کو آج بڑی شدت سے باپ کی واپسی کا انتظار تھا۔

کشادہ لاؤنج میں ریڈیو گرام کے قریب بیٹھی وہ بار بار دروازے کی سمت دیکھ رہی تھی۔ شمسہ بیگم اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھی سوئٹر بننے میں مصروف تھیں' عاشی ناجیہ کے قریب ہی بیٹھی کہانیوں کی کتابیں اُلٹ پلٹ رہی تھی جو ممدو نے اُسے تحفے میں لاکر دی تھیں۔

شمسہ بیگم نے عاشی اور ناجیہ کے درمیان ازسرِنو دوستانہ تعلقات استوار کرا دیئے تھے' ناجیہ کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ عاشی کے ساتھ بات کرے لیکن ماں کے اصرار اور بابا کے کہنے پر اُس نے مصلحتاً اپنے رویئے میں تھوڑی سی تبدیلی کر لی تھی مگر ابھی تک اُس نے دل سے عاشی کو معاف نہیں کیا تھا' اُس کے ذہن میں رہ رہ کر یہی خیال اُبھرتا تھا کہ عاشی نے جان بوجھ کر اُسے نیچا دکھانے کی کوشش کی ہے' ورنہ جب دونوں ایک ساتھ ہی' ایک ہی کلاس میں ایک ہی کتابیں پڑھتی تھیں تو پھر ناجیہ کے پیچھے رہ جانے کا کیا سبب تھا۔

بہرحال ناجیہ کو اس بات کی مسرت بھی تھی کہ اس بار اُس کی تیسری پوزیشن آئی تھی جس پر اُسے اُس کی ہم جماعت لڑکیوں نے بھی مبارکباد دی تھی' اسکول کی ٹیچروں نے اس کی تعریف کی تھی اور اُس کے والدین نے اُس کی محنت اور کاوشوں کو بے حد سراہا تھا اور محمود حسین نے تو اُس کا من پسند تحفہ لانے کا پکا وعدہ بھی کر لیا تھا جبھی تو اُس کی نظریں بار بار دروازے کی سمت اُٹھ رہی تھیں۔ باہر کسی گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دیتی تو وہ خوشی سے اُچھل پڑتی پھر انتظار کی شدت طویل ہوتی تو خوشیوں میں غصے اور جھلاہٹ کا رنگ بھی شامل ہو جاتا۔

"اتنی بے چینی بھی کیا ہے ناجیہ ـــــ تمہارے پاپا بس آنے ہی والے ہوں گے" شمسہ بیگم نے بیٹی کے اضطراب کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"چھ تو بج چکے ہیں" ناجیہ نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

"ہو سکتا ہے کوئی کام نکل آیا ہو ـــــ"

"اگر ایسی بات تھی تو پپا فون کر سکتے تھے" وہ جھلا کر بولی۔

"پگلی ـــــ" شمسہ بیگم نے اُسے سمجھاتے ہوئے پیار سے لاڈ سے کہا "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہارے لئے تحفہ خریدنے میں دیر ہوگئی ہو"

"امی ـــــ" ناجیہ نے اچانک چونک کر پوچھا "کیا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پپا کو میرا کھلونا نہ مل رہا ہو"

"تم تو سچ مچ دیوانی ہوگئی ہو" شمسہ بیگم مسکرا کر بولیں "کھلونے کی کوئی ایک دوکان تو ہے نہیں ـــــ اگر تمہارا کھلونا ایک دوکان پر نہ ملا تو دوسری دُکان پر مل جائے گا ـــــ"

"پھر پپا نے اتنی دیر کیوں کر دی ـــــ" وہ اٹھ کر ٹہلنے لگی۔

عاشی نے کتابوں کو جلدی سے سمیٹ کر ایک طرف رکھا پھر ناجیہ کی بڑھتی بے چینی کو دیکھتے ہوئے بولی "ناجیہ ـــــ آؤ ہم دونوں مونوپلی (MONOPOLY) کھیلتے ہیں' وقت بھی گزر جائے گا اور انکل تمہارا تحفہ بھی لے کر آجائیں گے"

"نہیں ـــــ" اُس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے عاشی کا مشورہ رد کر دیا "میرا موڈ نہیں ہو رہا مونوپلی کھیلنے کا"

"تو پھر آؤ ـــــ کیرم کی ایک بازی ہو جائے" عاشی نے نئی تجویز پیش کی۔

"ہاں ـــــ کیرم ٹھیک ہے گا لیکن ـــــ" اچانک ناجیہ کا موڈ خراب ہوگیا "کل سے کوئن اور ایک سفید گوٹ کم ہے ـــــ شرفو ـــــ شرفو ـــــ"

شرفو نے ناجیہ کی آواز سنی تو بھاگتا ہوا آگیا۔

"تم نے ٹیم کی گوٹیں تلاش کیں ——" ناجیہ نے شرفو کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔
"تلاش تو کی تھیں چھوٹی بی بی مگر ——"
"مگر کیا ——" شرفو کو خاموش دیکھ کر اُس کا پارہ اور چڑھ گیا۔
"گوٹیں کہیں نہیں ملیں ——" شرفو نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نے پورا کمرہ دیکھ لیا ہے۔"
"کہاں گئیں پھر گوٹیں ——" اُس نے غصے سے شرفو کو گھورتے ہوئے غضبناک لہجے میں پوچھا۔
"نہیں مل رہیں تو جانے دو —— اور آجائیں گی۔" شمسہ بیگم نے معاملہ رفع دفع کرنے کی خاطر کہا۔ "جاؤ شرفو تم جاکر خانساماں سے کہو کہ ناشتہ تیار کرے، صاحب آتے ہی ہوں گے۔"
شرفو چلا گیا تو ناجیہ نے ایک بار پھر گھڑی پر نظر ڈالی پھر تیکھے انداز میں ماں سے بولی
"امی —— یہ شرفو کا بچہ ایک دم چور ہو گیا ہے —— اس کی چھٹی کر دیں۔"
"بُری بات ہے ناجیہ —— ذرا ذرا سی بات پر غصہ نہیں کیا کرتے اور اب تم سیانی بھی ہو گئی ہو خود پر قابو رکھنے کی عادت ڈالو۔"
ماں کی بات سُن کر ناجیہ کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا، دادی کی کمی کا احساس اُسے ایسے ہی موقعوں پر بڑی شدت سے ہوتا تھا جب اُس کی زبان سے نکلی ہوئی کوئی بات پوری نہیں ہوتی تھی، اس وقت بھی ماں کی نصیحت سُن کر وہ اندر ہی اندر جھلس کر رہ گئی، اُس نے ماں کی بات کا کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا لیکن اس بات کا تہیہ کر لیا کہ وہ ہر قیمت پر شرفو کی چھٹی کرا کے دم لے گی —— ایک ادنیٰ اور حقیر ملازم کے مقابلے میں اُس کی سبکی ہو —— یہ بات ناجیہ کے ضمیر کے خلاف تھی۔
عاشی خاموش بیٹھی ناجیہ کے چہرے سے اس کے غصے کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ باہر سے ہارن کی آواز سُنائی دی۔
"پپا آگئے ——" ناجیہ نے چونک کر کہا اور دروازے کی سمت دیکھنے لگی پھر جب محمود حسین مسکراتے ہوئے اندر آئے تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا دوڑ کر وہ باپ سے لپٹ گئی اور بولی "پپا —— آپ میرا جہاز لائے؟"
"لایا ہوں بھائی —— لایا ہوں، ذرا دم تو لینے دو۔" محمود حسین نے بیٹی کے نرم گالوں پر آہستہ سے چکی لیتے ہوئے جواب دیا پھر تھکے ہوئے انداز میں آگے بڑھ کر کرسی پر عاشی کے برابر بیٹھ گئے۔
ملازم نے ایک خوبصورت سا بڑا پیکٹ لاکر اُن کے سامنے رکھا پھر خاموشی سے گردن جھکا کر چلا گیا، ناجیہ کی نظریں پیکٹ پر مرکوز تھیں اور چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا، محمود حسین نے بیٹی کے چہرے کے تاثرات کو دیکھتے ہوئے اُس کی خوشی کا اندازہ لگایا تو اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹتے ہوئے پیار سے بولے۔
"یہ رہا تمہارا تحفہ —— ریڈیو سے اڑنے والا ہوائی جہاز۔"
"اوہ —— پپا زندہ باد" ناجیہ نے پلٹ کر تیزی سے باپ کے دونوں گالوں پر جلدی جلدی پیار کیا پھر قالین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس پیکٹ کو کھولنے لگی جسے بڑے بڑے پھولوں والے آسمانی رنگ کے خوبصورت سے کاغذ میں بڑی نفاست سے پیک کیا گیا تھا۔
"ذرا سنبھال کر پیکٹ کھولنا۔" محمود حسین نے بیٹی کو چھیڑتے ہوئے کہا "کہیں ایسا نہ ہو کہ ڈبہ کھلتے ہی تمہارا جہاز پھر سے اڑ جائے اور تم دیکھتی رہ جاؤ ——"
"میں اتنی بیوقوف نہیں ہوں ——" ناجیہ نے بدستور پیکٹ کھولتے ہوئے جواب دیا "مجھے خبر ہے کہ جہاز کو ریڈیو سے چلایا جاتا ہے —— جب میں ریڈیو آن ہی نہ کروں گی تو جہاز اُڑے گا کیسے ——"
"اس وقت تو میری بیٹی نے بڑی سمجھ داری کی بات کی ہے۔" شمسہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔
عاشی اپنی نشست پر چپ چاپ بیٹھی ناجیہ کو پیکٹ کھولتا دیکھ رہی تھی پھر جب پیکٹ کے اندر سے ایک خوبصورت سا جہاز اور کتھئی رنگ کا بڑا سا ریڈیو نکلا تو ناجیہ کسی تازہ گلاب کی طرح کھل اٹھی۔ "اوہ پپا —— یو آر گریٹ۔" اُس نے پلٹ کر باپ سے کہا پھر جہاز کے کل پُرزوں کو ڈبے سے نکال نکال کر قالین پر رکھنے لگی۔

"ناجیہ بیٹی ——" شمسہ بیگم بولیں "تم سب چیزوں کو دیکھ کر دوبارہ احتیاط سے رکھ دو، کل تمہارے پپا کی چھٹی ہے، تم آرام سے بیٹھ کر اُسے اُڑانے کا طریقہ سیکھ لینا اور ذرا احتیاط سے اسے سنبھال کر رکھنا ورنہ ٹوٹ گیا تو اس کا بننا بھی دشوار ہوگا۔"
"پپا ——" اُس نے ماں کی بات سُن کر باپ کی طرف وضاحت طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا اس وقت جہاز نہیں اُڑ سکتا؟"
"اس وقت اندھیرا جو ہو گیا —— کل صبح اُجالے میں دل بھر کر جہاز اُڑائیں گے۔" محمود حسین نے بیٹی کو سمجھایا۔
"لیکن جہاز تو رات کو بھی اڑتے ہیں۔" اُس نے بحث کی۔
"اڑتے کیوں نہیں —— لیکن وہ جہاز دوسری قسم کے ہوتے ہیں اور پھر تم نے جو جہاز منگایا ہے وہ تفریحی ہوائی جہاز ہے جسے بڑے سے میدان میں اُڑایا جاتا ہے اور —— ابھی تو مجھے وہ کتاب بھی دیکھنی ہوگی جس میں جہاز اڑانے کا طریقہ لکھا ہے۔"
"ٹھیک ہے —— ہم دونوں کل صبح جہاز اڑائیں گے۔" ناجیہ نے بڑی سعادت مندی سے کہا پھر دوبارہ تحفے کو دیکھنے میں مشغول ہو گئی۔
محمود حسین کچھ دیر تک بیٹی کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے رہے پھر اُنھوں نے عاشی کی طرف دیکھا اور جیب سے ایک خوبصورت سا پیکٹ نکالتے ہوئے بولے۔
"عاشی بیٹے —— تمہارے لئے میں پارکر پن کا سیٹ لایا ہوں، یہ میری پسند کا تحفہ ہے جسے میں نے تمہاری شاندار کامیابی کی مناسبت سے خریدا ہے ——"
"شکریہ انکل ——" عاشی نے پیکٹ لیتے ہوئے نہایت خلوص سے کہا۔
ناجیہ نے پلٹ کر تیزی سے باپ کی طرف دیکھا، وہ باپ کے جملے کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھی لیکن نہ جانے کیوں اُسے وہ جملہ کچھ پسند نہیں آیا، چند لمحے وہ اس پر غور کرتی رہی پھر اُس نے تحفے کی نوعیت پر غور کیا تو دل ہی دل میں مسکرا دی اس لئے کہ اُس کے اپنے پاس تو نہ جانے کتنے خوبصورت اور ایک سے ایک قیمتی پن موجود تھے، وہ دوبارہ اپنے تحفے کو سنبھال سنبھال کر پیکٹ میں رکھنے لگی۔
"ذرا میں بھی تو دیکھوں عاشی، تمہارے انکل کی پسند کیسی ہے۔"
شمسہ بیگم نے خوشی کا اظہار کیا تو عاشی آہستہ سے اُٹھ کر اُن کے قریب چلی گئی، کھڑے کھڑے اُس نے پیکٹ کھولا، اندر سے سنہری رنگ کے قلم کا سیٹ نکلا تو مارے خوشی کے اُس کی آنکھیں چمک اٹھیں، ایک ثانیے کے لئے وہ خوابوں کی دنیا میں کھو گئی پھر اُس نے قلم کا سیٹ شمسہ بیگم کے سامنے کر دیا۔
"ماشاءاللہ —— یہ تو بڑا ہی خوبصورت اور پیارا تحفہ ہے۔" شمسہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا پھر عاشی کو بڑے پیار سے اپنے ساتھ بٹھا کر لپٹاتے ہوئے بولیں "اب میری بیٹی اس قلم سے اور زیادہ اچھے نمبر حاصل کرے گی اور خوب نام پیدا کرے گی۔"
"شکریہ آنٹی ——" عاشی نے شمسہ بیگم کی مادرانہ شفقت سے مغلوب ہوتے ہوئے آہستہ سے کہا۔
ناجیہ "اچھے نمبروں" والی بات سُن کر کچھ چونکی، اُس نے پلٹ کر ماں کی سمت دیکھا، عاشی کو ماں کی بانہوں میں سمٹا دیکھ کر وہ تلملا اٹھی، اس جذبے کو وہ کوئی خوبصورت سا نام دینے سے قاصر تھی لیکن اُسے اپنے سوا کسی اور کا ماں کے اتنے قریب —— پھر لپٹ کر بیٹھنا منظور نہیں تھا —— وہ سب کچھ برداشت کر سکتی تھی لیکن ماں کی ممتا میں کسی اور کو اپنا شریک نہیں کر سکتی تھی —— اُس کے معصوم ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں —— اُس کے تصورات میں بجلیاں سی کوندنے لگیں ——
عاشی نے پہلے اُس کے گھر میں پناہ حاصل کی —— پھر
ماں کی توجہ حاصل کر کے اُس نے کونونٹ میں ناجیہ کے ساتھ داخلہ لے لیا ——
آہستہ آہستہ وہ اپنے قدم جما رہی تھی ——

تیسری اور چوتھی جماعت میں عاشی اس سے پیچھے رہی تھی ـــــ لیکن ـــــ
پانچویں جماعت میں اُس نے اچانک پہلی پوزیشن حاصل کر کے سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ـــــ
ناجیہ سے بھی آگے نکل گئی تھی ـــــ اور اب ـــــ
اب وہ اس کی ماں کی آغوش میں سمٹی بیٹھی کیسی پُرسکون نظر آ رہی تھی ـــــ
باپ نے تحفہ دیتے وقت کس پیار اور اپنائیت سے عاشی کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا ـــــ اور
ماں نے اس تحفے کی تعریف کرتے ہوئے اُسے سینے سے لگا لیا۔

مستقبل میں زیادہ اچھے نمبروں سے کامیابی کی دعا بھی دی تھی ـــــ
کیا وہ ان تمام باتوں کو برداشت کر سکے گی ـــــ ؟
کیا باپ کی شفقت اور ماں کی ممتا میں عاشی کو اپنے برابر کا حصہ دار بنا سکے گی ـــــ ؟
نہیں ـــــ نہیں ـــــ !!

ناجیہ تڑپ اٹھی، اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اُس کے منہ، اور معصوم وجود میں انگارے ہی انگارے بھر دیئے ہوں جو اُسے سرتاپا جھلسائے ڈال رہے تھے ـــــ وہ ماں کو تشکیتی نظروں سے گھور رہی تھی لیکن وہ ناجیہ سے بے خبر عاشی کو سینے سے لگائے پھولے پھلنے اور پروان چڑھنے کی دعائیں دے رہی تھیں۔

ناجیہ نے ایک نظر عاشی پر ڈالی، کچھ دیر تک ہونٹ کاٹتی رہی پھر اُس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز تبسم مچلا۔

تبسم ـــــ جو زہر میں بجھا ہوا تھا ـــــ
جس میں انتقام کے شعلے ناچ رہے تھے ـــــ
حسد کی چنگاریاں رقص کر رہی تھیں ـــــ
نفرت ـــــ اور ـــــ حقارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ـــــ !!

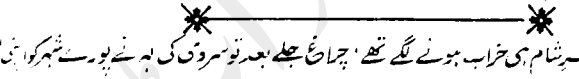

موسم کے تیور سرِ شام ہی خراب ہونے لگے تھے، چراغ جلے بعد تو سردی کی لہر نے پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ـــــ !

گزشتہ کئی دنوں سے ممدو کی حالت غیر ہو رہی تھی، کھانسی بھی بہت بڑھ گئی تھی اور جسم ہر وقت تپتا محسوس ہوتا، ڈاکٹروں کی دوا پیتے پیتے وہ اُکتا گیا تھا، دو روز سے اُس نے دیسی دواؤں سے اپنا علاج شروع کیا تھا لیکن ابھی تک کوئی افاقہ نظر نہیں آ رہا تھا، سردی کی شدت تو اُسے اور نڈھال کر دیتی، چنانچہ آج اُس نے چراغ جلتے ہی کوارٹر کا دروازہ کس کر بند کر لیا تھا۔

عاشی اپنے بستر میں گھسی کہانی کی کتاب پڑھ رہی تھی، ممدو اپنے بستر پر گرم چادر لپیٹے آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا، کچھ دیر تک عاشی اُسے کراہتا سنتی رہی پھر اُس نے کہانی کی کتاب بند کر کے تکیے کے نیچے رکھ دی، بڑے پیار سے کروٹ لی اور اپنا ہاتھ ممدو کی پیشانی پر رکھتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہو رہی ہے بابا ـــــ ؟"

"ٹھیک ہوں ـــــ" ممدو نے آنکھیں کھول کر نقاہت سے کہا پھر یکلخت اپنے چہرے پر زندگی کے تاثرات اُجاگر کرتے ہوئے بولا "ارے ـــــ تو نے اتنی جلدی کہانی کی پوری کتاب ختم کر ڈالی، مجھے بھی تو بتا کیا کہانی تھی؟"

"ابھی تو میں نے صرف آٹھ دس صفحے پڑھے ہیں" عاشی نے ممدو کی بات کو محسوس کیا تو مسکرا کر بولی "پوری کہانی پڑھ لوں گی پھر تمہیں رات کو خوب چٹخارے لے لے کر سناؤں گی۔"

"اب کیا نیند آ رہی ہے تجھے ـــــ"

"نیند تو نہیں آ رہی البتہ تمہارے کراہنے کی آواز مجھے پریشان کر رہی تھی" عاشی نے اپنا نرم و نازک مرجھائی پیشانی پر آہستہ آہستہ پھیرتے ہوئے بڑی اپنائیت سے کہا ـــــ "بابا ـــــ تم کسی اچھے ڈاکٹر سے

کیوں نہیں کراتے؟"

"کرایا تو تھا لیکن کیا فائدہ ہوا ـــــ" ممدو ہولے سے کھانستے ہوئے بولا "کھانسی کسی طرح رکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔"

"دوا نہیں پیو گے تو فائدہ کیسے ہو گا۔"

"ہو جائے گا فائدہ ـــــ" ممدو نے کراہ کا سامنہ بنا کر اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا "دو روز سے جڑی بوٹیاں بھی تو استعمال کر رہا ہوں، کل اور دیکھتا ہوں اس کے بعد کسی حکیم سے علاج کراؤں گا۔"

"تمہارے لئے چائے بنا کر لاؤں ـــــ"

"دماغ چل گیا ہے تیرا ـــــ" ممدو نے اُسے پیار سے گھورا "باہر اتنی سرد اور تیز ہوا چل رہی ہے اور تو چل ہے بابا کے لئے چائے تیار کرنے ـــــ دبکی پڑی رہ رضائی کے اندر، مجھے کسی چیز کی خواہش نہیں ہو رہی۔"

"اچھا ـــــ تو پھر تم آنکھ موندو، میں تمہارا سر دبائے دیتی ہوں۔"

عاشی کے لہجے میں اتنا پیار تھا کہ ممدو ساری جان سے لرز اُٹھا، جلدی سے اُس نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا اور یونہی جھوٹ موٹ کھانسنا شروع کر دیا، ایسا کرتا تو شاید اُس کی آنکھوں میں اچانک بھر آنے والے آنسو عاشی کو بھی مضطرب کر دیتے ـــــ پھر عاشی ان آنسوؤں کے بارے میں سوال کرتی تو وہ اُسے کیا جواب دیتا؟ ـــــ کیسے بتاتا کہ بڑھاپے نے اُس کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے ـــــ وقت کی گردشوں نے اُسے نڈھال کر دیا ہے ـــــ زندہ رہنے کی آرزو نے موت کے تصور کو اُس کے لئے بھیانک بنا دیا ہے ـــــ اور یہ کہ وہ اس وقت تک اپنی باقی ماندہ سانسوں کو بہت سنبھال سنبھال کر استعمال کرنا چاہتا تھا جب تک عاشی جوان نہ ہو جائے ـــــ سمجھ دار ہو جائے ـــــ اور اس قابل ہو جائے کہ زمانے کے نشیب و فراز کو سمجھنے اور سمجھ کر برداشت کرنے کا گن نہ سیکھ لے ـــــ اُس وقت سے پہلے تو وہ عاشی کو کچھ بھی نہیں بتا سکتا تھا ـــــ

حالات کی یہ کشمکش ہی تو تھی جس کے بوجھ تلے دبا وہ سسک سسک کر زندگی کے لمحوں لمحوں کا حساب کر رہا تھا۔ واقعات اور حادثات کا بار ہی تو تھا جو وہ کسی مشاق ملاح کی طرح اپنی کشتیٔ حیات کو آہستہ آہستہ کنارے کی سمت کھے رہا تھا ـــــ جس دن حالات کی کشمکش کا بوجھ اُس کے ناتواں کندھوں سے اُتر جاتا تو وہ اتنا ہلکا ہو جاتا کہ روح بن کر... فضاؤں میں تحلیل ہو جاتا ـــــ آنکھیں بند کر کے اس طرح ابدی نیند سو جاتا کہ پھر اُسے ماضی سے کوئی سروکار ـــــ کوئی تعلق نہ رہتا ـــــ ہمیشہ کے لئے پُرسکون ہو جاتا ـــــ !!

"بابا ـــــ" ممدو کی کھانسی رُکی تو عاشی نے سنجیدگی سے کہا "تم اُس ڈاکٹر سے اپنا علاج کیوں نہیں کراتے جس سے اکمل دوائیں لاتے ہیں، موسم بدلنے سے اکمل کو بھی نزلہ زکام اور کھانسی کی شکایت ہو گئی تھی لیکن دو روز دوا پینے سے وہ بالکل ٹھیک ہو گئے۔"

"اچھا بابا ـــــ اچھا" ممدو نے خود پر قابو پاتے ہوئے تھکے لہجے میں کہا "تو ضد کرتی ہے تو کل جا کر اسی ڈاکٹر سے دوائی لے آؤں گا۔"

"تم ـــــ تم کتنے اچھے ہو بابا ـــــ ہمیشہ میری بات مان لیتے ہو۔"

"تو بھی تو کبھی میری بات سے انکار نہیں کرتی۔"

"میں ـــــ ایک بات کہوں بابا" عاشی نے بڑے لاڈ سے ممدو کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اُس کے کچھ اور قریب ہو کر آہستہ سے پوچھا۔

"سمجھ گیا ـــــ" ممدو نے تیزی سے کہا "تو پھر اپنی کوئی نئی بات منوانے کے لئے بوڑھے بابا سے لاڈ کر رہی ہے ـــــ کیوں؟ سچ سچ بتانا ـــــ ہے نا یہی بات۔"

"تم تو پہلے ہی سے سب کچھ سمجھ لیتے ہو" عاشی نے شوخی سے کہا پھر بڑی معصومیت سے بولی "میں جب بڑی ہو جاؤں گی تو میں بھی تمہاری طرح دوسروں کی سب بات سمجھ لیا کروں گی۔"

"مجھے اسی دن کا انتظار ہے ـــــ" ممدو کے سینے سے ایک سرد آہ نکل کر کمرے کی گھٹن میں مدغم ہو گئی، ایک لمحے کے لئے اس کا وجود بھوڑے کی مانند دکھنے لگا لیکن دوسرے ہی لمحے ممدو نے خود کو سنبھالا، بے خیالی میں اُس کے قدم

ڈگمگانے لگے تھے۔ عاشی کو پیار سے گھورتے ہوئے بولا "تو ـــــ پھر مجھے بہلانے کی کوشش کر رہی ہے ـــــ جلدی سے بتا، ابھی تو مجھ سے کیا کہنا چاہ رہی تھی؟"

"کل بتاؤں گی ـــــ" عاشی نے اُسے ٹالنے کی خاطر جاہی لیتے ہوئے کہا "اس وقت مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"جھوٹ ـــــ سفید جھوٹ" ممدو نے اصرار کیا "سچ سچ بتا ـــــ کیا بات تھی؟"

"پہلے وعدہ کرو باکہ تم مجھے ڈانٹو گے نہیں ـــــ"

"بات کیا ہے ـــــ کچھ پتہ تو چلے؟"

"نہیں ـــــ پہلے وعدہ؟"

"اچھا..... وعدہ" ممدو نے وعدہ کر لیا تو عاشی نے سنبھل کر آہستہ سے کہا۔

"بابا ـــــ تم مالی کا کام چھوڑ دو ـــــ صرف آرام کیا کرو۔"

"اور پودوں کو پانی کون دے گا ـــــ سبزے کی سیرابی کا دھیان کون رکھے گا؟" ممدو نے پیار سے پوچھا "کیا یہ سارے کام تو کیا کرے گی؟"

"میں اس قابل ہوتی تو تمہیں کبھی بھی ـــــ"

"بس بس" ممدو نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "چل لیٹ کر سو جا۔"

"بابا ـــــ" اُس نے ممدو کو وضاحت طلب نظروں سے گھورتے ہوئے یاد دلایا "تم نے وعدہ کیا تھا کہ ڈانٹو گے نہیں۔"

"ڈانٹ کب رہا ہوں ـــــ تجھے سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ زیادہ 'دادی بُجھا' نہ بنا کر ـــــ" ممدو مسکرایا۔

"یہ دادی بُجھا کسے کہتے ہیں؟" عاشی نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"جو اپنی عمر سے زیادہ اونچی اونچی اور بڑی بڑی باتیں سوچتا ہے اسے کہتے ہیں" ممدو نے اپنی سمجھ کے مطابق عاشی کو سمجھاتے ہوئے کہا "جیسے تو ابھی کہہ رہی تھی کہ میں مالی کا کام چھوڑ دوں ـــــ صرف آرام کیا کروں۔"

"تو، اس میں بڑی بات کونسی ہو گئی؟" عاشی نے معصومیت سے کہا "تم مالی کا کام چھوڑ دو گے تو آنٹی اور کوئی نیا مالی رکھ لیں گی۔"

"پھر ہمیں تنخواہ کس بات کی ملے گی ـــــ پڑے پڑے آرام کرنے کی؟" ممدو نے سنجیدگی سے جواب دیا "نیا مالی آ گیا تو ہمیں اُس کیلئے یہ کوارٹر بھی خالی کرنا پڑے گا ـــــ پھر کیا ہم درختوں کے نیچے بسیرا کریں گے؟"

"ارے ـــــ" عاشی یکدم سہم سی گئی، سوچتے ہوئے بولی "یہ باتیں تو میں نے سوچی ہی نہیں تھیں۔"

"اسی لئے تو کہہ رہا تھا کہ دادی بُجھا کی طرح باتیں نہ کیا کر ـــــ" ممدو نے اُسے کھینچ کر اپنے قریب کر لیا، بالوں میں اپنی لاغر انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے بولا "چل بس سو جا ـــــ"

"اور یہ جو بتی جل رہی ہے اسے کون بند کرے گا؟" عاشی نے سر اُٹھا کر ممدو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اول سوال کیا جیسے وہ اُسے باور کرانا چاہتی ہو کہ وہ اس سے زیادہ سمجھ دار ہے۔

"میں بند کئے دیتا ہوں ـــــ" ممدو نے ہار ماننے والے انداز میں کہا پھر وہ اُٹھنا چاہتا تھا لیکن عاشی نے اُسے روک دیا۔

رضائی سے نکل کر اُس نے روشنی کا سوئچ آف کر دیا لیکن اسی لمحے بادل کی تیز گرج کے ساتھ زور سے بجلی چمکی تو وہ "بابا" کہہ کر تیزی سے لپکی اور بے تحاشا ممدو سے لپٹ گئی۔ اُس کا معصوم دل خوف سے دھڑکنے لگا۔

ممدو نے اُسے اپنی بوڑھی باہوں میں سمیٹ لیا اور اُس پر رضائی ڈال دی ـــــ!!

نئے گھر میں منتقل ہونے کے بعد شائستہ بیگم کو شروع شروع میں کچھ دشواریاں پیش آئی تھیں لیکن رفتہ رفتہ انھوں نے تمام مشکلات پر قابو پا لیا۔ نئے گھر کو نئے سرے سے ترتیب دینا کچھ آسان کام نہ تھا اور وہ بھی ایک تن تنہا عورت کے لئے مگر وقت اور حالات نے جہاں شائستہ بیگم کو بیوگی کا غم دیا تھا وہاں اُسے برداشت کرنے اور سہنے کا

حوصلہ بھی عطا کر دیا تھا۔

تنہائی کے خیال سے شائستہ بیگم نے ایک ادھیڑ عمر کی عورت کو اپنے ساتھ رکھ لیا تھا جو اوپر کے تمام کام انجام دیتی تھی، باورچی خانے کا کام شائستہ بیگم خود کرتی تھیں، غرضیکہ تین سال کے عرصے میں انھوں نے اپنی زندگی کو حالات کے نئے سانچوں میں جس خوبی ڈھال لیا تھا البتہ انھیں اگر کوئی فکر تھی تو وہ صرف فراز کی تھی۔

جہاں تک پڑھائی کا معاملہ تھا قدرت نے فراز کو اعلیٰ ذوق اور ذہن سے نوازا تھا، اسکول کے تمام امتحانات میں وہ سرفہرست رہتا، کھیل کے میدان میں بھی وہ ہمیشہ چاق و چوبند نظر آتا لیکن گھر کے اندر وہ بڑا تنہا تنہا سا نظر آتا، صوفیہ خاتون کے ہاں تھا تو عاشی اور ناجیہ کے ساتھ وقت گزر جاتا تھا لیکن نئے مکان میں آ کر وہ محض ماں کی ذات تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔

شائستہ بیگم کو اولاد کی پڑھائی اور اُس کے مستقبل کے ساتھ ساتھ اس بات کا قلق بھی تھا کہ انھیں ایک ذرا سی غلط فہمی کے سبب اس دلبیز کو خیر باد کہنا پڑا جس سے ماضی کی بے شمار یادیں وابستہ تھیں اور اسی دہلیز سے انھوں نے فراز کے مستقبل کو بھی وابستہ کرنے کی اُمید لگا رکھی تھی۔ فراز کی تنہائی کے پیشِ نظر اور اس خیال سے کہ شمسہ بیگم سے راہ و رسم برقرار رہے وہ ہفتے میں ایک چکر وہاں کا ضرور لگا لیا کرتی تھیں۔ مہینے میں دو تین بار محمود حسین بھی اُن کی خیریت پوچھنے ضرور آ جاتے تھے البتہ شائستہ بیگم کو اس بات کا ملال ضرور رہتا کہ شمسہ بیگم شاذ و نادر ہی اوندھ کا رُخ کرتی تھیں۔

آج چھٹی کا دن تھا، فراز صبح سے کئی بار ماں سے ناجیہ کی طرف جانے کی ضد کر چکا تھا لیکن شائستہ بیگم نے اُسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اُن کا جی اچھا نہیں ہے، فراز نے ماں کی بات کو نہایت سعادت مندی سے قبول کر کے اپنا اصرار ختم کر دیا تھا، یوں بھی وہ ماں کے اشاروں پر چلنا اپنا فرض سمجھتا تھا، اُس کی عمر ابھی محض گیارہ سال کی تھی لیکن حالات نے اُسے بے حد سمجھ دار اور حساس بنا دیا تھا، اُسے اپنی ذات کی اہمیت کا صحیح اندازہ تو نہ تھا مگر اتنا ضرور جانتا تھا کہ وہ اپنی ماں کا واحد سہارا ہے اسی لئے وہ اکثر ماں سے جہاں کسی بات کے لئے ضد کرتا وہاں فوراً ہی یہ سوچ کر ماں کی گردن میں بانہیں ڈال کر مسکرانے بھی لگتا کہ اگر ماں کے دل کو اس کے برتاؤ سے صدمہ پہنچا تو اُسے کون بہلائے گا۔

اس وقت بھی وہ شام کی چائے پینے کے بعد ماں کے پاس بیٹھا اپنا اسکول کا کام کر رہا تھا کہ باہر سے گاڑی کے ہارن کی آواز سُنائی دی اور فراز نے جلدی سے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی، اُس کے معصوم اور بھولے بھولے چہرے پر اُمید کی خوشیاں کرن بن کر پھوٹ آئی تھیں، شائستہ بیگم نے بیٹے کی اضطرابی کیفیت کو دیکھا تو دل مسوس کر رہ گئیں، آج سے پہلے بھی وہ فراز کی کیفیت کو بارہا محسوس کر چکی تھیں ـــــ جب بھی کسی گاڑی کے ہارن کی مانوس آواز دروازے کے باہر سنائی دیتی وہ یوں ہی چونک اُٹھتا، کام چھوڑ کر دروازے کی جانب تکنے لگتا ـــــ یوں جیسے گاڑی کے اس جانے پہچانے ہارن سے اُس کی زندگی کا کوئی گہرا تعلق ہو، جیسے وہ کسی کی آمد کا منتظر ہو ـــــ اس وقت بھی وہ ان ہی کیفیات سے دوچار ہوا تھا۔

"کیا بات ہے فراز؟" شائستہ بیگم نے پیار سے بیٹے کو ٹٹولتے ہوئے پوچھا "تم نے کتاب کیوں بند کر دی؟"

"وہ ـــــ وہ ہارن کی آواز" فراز نے بڑی معصومیت سے جواب دیا "بالکل ویسی ہی جیسی ماموں جان کی گاڑی کے ہارن کی ہوتی ہے" ـــــ میں نے سمجھا شاید ناجیہ آئی ہو۔"

"ناجیہ ـــــ" شائستہ بیگم ہاتھ مل کر رہ گئیں، بیٹے کی توجہ بٹانے کی خاطر بولیں "کل تو خیر نہیں لیکن پرسوں ہم ناجیہ کے ہاں ضرور ـــــ"

شائستہ بیگم اپنا جملہ مکمل نہ کر سکیں، دروازے پر دستک کی آواز سُنائی دی تو فراز تیر کی طرح اُٹھ کر دروازے کی طرف لپکا، اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے ناجیہ کو اپنی نظروں کے سامنے موجود پایا، آج ناجیہ اچانک آ کر سب کو ششدر کر دیا تھا۔ فراز اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا، اس وقت چونک کر دوبارہ ہوش میں آیا جب محمود حسین کی آواز اُس کے کانوں میں گونجی۔

"اور سناؤ بھئی ـــــ پڑھائی کیسی ہو رہی ہے؟"

"ایک دم فرسٹ کلاس ـــــ" اُس نے مسکرا کر کہا پھر راستہ چھوڑ کر ایک طرف ہٹ گیا۔

شمسہ بیگم کو دیکھ کر شائستہ بیگم بھی اُن کے استقبال کے لئے جلدی سے اُٹھ گئیں۔

"تسلیم آپا ——" شمسہ بیگم نے شائستہ بیگم کو سلام کیا تو شائستہ بیگم کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

"جیتی رہو —— خوش رہو۔ سدا سہاگن رہو" اُنھوں نے شمسہ بیگم کو سینے سے لگا کر ہزاروں دعائیں دے ڈالیں۔ بڑی آؤ بھگت سے لاکر اپنے مختصر مگر بنایت سلیقے سے سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں بٹھایا پھر اہتمام کے ارادے سے اُٹھیں تو محمود حسین بولے

"کوئی تکلیف نہ کیجئے گا آپا —— ہم لوگ ابھی ایک جگہ سے پیٹ بھر کر ناشتہ کر کے آرہے ہیں۔"

"تم سے کون پوچھ رہا ہے۔" شائستہ بیگم نے شمسہ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں تو شمسہ کو شربت پیئے بغیر ہرگز نہ جانے دوں گی۔"

"آپ کا اصرار ہے تو اور بات ہے آپا ورنہ ایمان سے اس وقت بالکل گنجائش نہیں ہے۔" شمسہ بیگم نے مسکرا کر کہا "پھر کبھی سہی ——"

"آٹھ ماہ بعد تو تم نے راستہ بھول کر ادھر قدم رکھا ہے، پھر نہ جانے کب آؤ گی۔"

"میں تسلیم کرتی ہوں آپ کی شکایت اور اُس کے ساتھ ہی یہ وعدہ بھی رہا کہ اب آتی جاتی رہوں گی۔"

"یہ بعد کی بات ہے لیکن فی الحال تو میں تمہیں بغیر شربت پیئے نہ جانے دوں گی۔"

شائستہ بیگم کھسکتی ہوئی باہر آگئیں اور جلدی سے شربت بنا کر لے آئیں، شمسہ بیگم کی خلاف توقع آمد اور اُن کے برتاؤ نے تو جیسے شائستہ بیگم کی اُمیدوں کو از سر نو جوان کر دیا تھا۔ فراز بھی ناجیہ اور ماموں اور ممانی کے آجانے سے بہت خوش خوش اور نہال نظر آرہا تھا۔

"اب تم تو ماشاء اللہ سائیوں جماعت میں لگ گئے ہو گے۔" شمسہ بیگم نے فراز کو پیار سے دیکھتے ہوئے پوچھا

"جی ہاں ——" فراز نے نہایت انکساری سے جواب دیا۔

"پوزیشن کیا آئی تھی تمہاری۔" ناجیہ نے اپنے بالوں کو ایک جھٹکے سے پشت کی جانب اچھالتے ہوئے سوال کیا

"بس ممانی کی دعاؤں سے پاس ہو گیا۔" فراز نے جان بوجھ کر اپنی پوزیشن نہیں بتائی اس لئے کہ وہ ناجیہ کی طبیعت سے واقف تھا اور اُس کی دل شکنی نہیں چاہتا تھا۔

"پیارے مجھے پاس ہونے کی خوشی میں ریڈیو سے اڑنے والا ہوائی جہاز کا تحفہ دیا ہے۔" ناجیہ نے اپنی برتری کا اظہار کرتے ہوئے کہا "چھٹی والے دن ہم لوگ اسی جہاز سے دل بہلاتے ہیں۔"

"میں بڑا ہو کر فوجی بنوں گا تو اصلی جہاز اُڑایا کروں گا۔" فراز نے سینہ تان کر بڑے فخر سے کہا

"کیوں نہیں ——" شمسہ بیگم نے جلدی سے کہا "خدا نے چاہا تو تم اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو گے بشرطیکہ خوب دل لگا کر پڑھتے رہو۔"

"بیٹا —— کیا فراز جہاز اُڑا سکتا ہے ——؟" ناجیہ نے سنجیدگی سے بات دریافت کیا۔

"کیوں نہیں اُڑا سکتا ——"

"لیکن آپ تو فراز کو بھوندو کہتے ہیں اور فرزی نے مجھے بتایا تھا کہ بھوندو بدھو لوگوں کو کہتے ہیں —— کیا بدھو لوگ بھی ہوائی جہاز اُڑا سکتے ہیں ——"

"بُری بات ہے ناجیہ۔" شمسہ بیگم نے بیٹی کو ٹوکتے ہوئے جلدی سے کہا "فراز تم سے عمر میں بڑا ہے، تمہیں اس کی عزت کرنی چاہیئے۔"

محمود حسین اور شائستہ بیگم ناجیہ کی دلیل سن کر مسکرانے لگے۔ فراز کو ناجیہ کی بات سن کر ایک لمحے کو غصہ تو آیا تھا، اُس نے غصہ کرتا ناجیہ کو دیکھا مگر پھر فوراً ہی خود بھی مسکرانے لگا اس لئے کہ وہ ناجیہ سے دشمنی کا نہیں —— کا خواہشمند تھا ——!!

"میں نے کیا کہا ہے۔" ناجیہ نے ماں سے جرح کی "بھونڈو تو بچا کہتے ہیں اور اس کے مطلب مجھے فرزی بتائے تھے —— میرا کیا قصور ہے۔"

"اور نہیں تو کیا ——" شائستہ بیگم نے قریب بیٹھی ناجیہ کو لپٹا کر پیار کرتے ہوئے کہا "میری بیٹی تو بڑی اچھی اور نیک ہے۔"

"فراز ——" ناجیہ نے فراز کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی شوخی سے کہا "کیا تم نے میری بات کا بُرا مانا ہے۔"

"نہیں تو ——" فراز نے جلدی سے کہا "میں نے تو کوئی بُرا نہیں مانا ——"

دو گھنٹہ تک شائستہ بیگم کے گھر میں بچوں اور بڑوں کے ملے جلے قہقہے گونجتے رہے پھر محمود حسین جانے کے لئے کھڑے ہوئے تو ناجیہ نے اچانک فراز سے کہا۔

"دو روز بعد اسکول کی چھٹی ہو گی، تم بھی آجانا سب مل کر ہوائی جہاز اُڑائیں گے ——"

"دو روز بعد ہی کیوں ——" شمسہ بیگم نے تجویز پیش کی "آج ہی سے فراز کو ساتھ کیوں نہ لے چلیں۔ دو روز تک تم جی بھر کر کھیل لینا پھر ہم فراز کو واپس چھوڑ جائیں گے۔"

"یہ ٹھیک ہے امی ——" ناجیہ نے خوش ہو کر پوچھا پھر فراز کو دیکھنے لگی۔

"کیوں آپا —— میں لے جاؤں فراز کو۔" شمسہ بیگم نے شائستہ بیگم سے دریافت کیا۔

"اس میں بھلا پوچھنے کی کیا بات ہے —— شوق سے لے جاؤ۔"

شائستہ بیگم نے خوشی خوشی فراز کو جانے کی اجازت دے دی اور پھر جب محمود حسین اور شمسہ بیگم فراز کو ساتھ لے گئے تو شائستہ بیگم نے جلدی سے وضو کیا اور خدا کا شکر ادا کرنے کی خاطر اُس کے حضور سجدہ ریز ہو گئیں ——!!

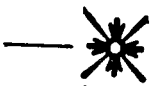

افتخار احمد نے آج پورے پندرہ سال بعد اپنے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا تھا لیکن آج اُن کا استقبال نہ باپ کی دعاؤں نے کیا نہ بہن کی مسکراہٹوں نے، خود اُن کے اپنے دل کی دھڑکنوں کی آواز تھی جو صدائے بازگشت بن کر اُن کے وجود کو زندگی کا احساس دلا رہی تھی —— پھر ان آوازوں کا دائرہ پھیل کر وسیع ہوتا ہوا ماضی کی ان سرحدوں سے جا ملا جہاں ایک بوڑھے باپ کا محبت اور شفقت بھرا سایہ اُن کے سر پر موجود تھا، ایک ہنستی مسکراتی بہن کا پیار اُن کا ہم رکاب تھا۔

ایک مختصر مگر آباد گھر تھا —— اس گھر کے آنگن میں خوشیاں کھیلتی تھیں ——
اور خوشیوں کا آپس میں جو رشتہ تھا وہ بڑا مربوط —— انتہائی ٹھوس تھا ——
لیکن ——

وقت کی ایک کروٹ نے اس آباد گھر کی تمام خوشیاں ایک ایک کر کے چھین لیں۔

اسرار احمد نے جوان بیٹے کے سر پر سہرے کی لڑیاں سجانے کی خاطر اپنی بیماری کو فراموش کر دیا، بیوی کی جدائی کے غم کو دل کے نہاں خانوں میں چھپا لیا اور اپنے ضعیف ہونٹوں پر دنیا جہان کی جوان مسکراہٹیں سجالی تھیں۔ صرف اس لئے کہ وہ اپنے گھر کے سونے آنگن میں خوشیوں اور مسرتوں کو نئے سرے سے زندہ اور رقصاں دیکھنا چاہتے تھے۔

انھیں افتخار احمد سے زیادہ اپنی جوان بیٹی فائزہ کا خیال تھا جو ماں کے سائے سے محروم ہو چکی تھی اور پرایا دھن بھی باپ کے قدموں سے لگی بیٹھی تھی، افتخار احمد کی شادی کے بعد انھیں یقین تھا کہ بہو آئے گی تو فائزہ کی تنہائیاں دُور ہو جائیں گی، وہ سکون سے موت کا استقبال کر سکیں گے، فائزہ کا بوجھ بھاوج کے دم قدم سے کچھ ہلکا ہو جائے گا۔

لیکن —— اسرار احمد کے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے، ایک ایک کر کے چکنا چور ہو گئے۔

راحیلہ خاتون بڑے باپ کی بیٹی تھیں اس لئے وہ زیادہ دنوں تک ایک نو بیاہتا دلہن کے کردار کو نہ نبھا سکیں اور جلد ہی اپنے اصلی رنگ و روپ میں سامنے آگئیں۔ چہرے سے گھونگھٹ پلٹا تو انھیں شوہر کے

گھر میں گھٹن کا احساس ستانے لگا ـــــ حجاب کے عارضی بندھن ٹوٹے تو بوڑھے سسر کی بیماری کے جراثیم انھیں اپنے جوان اور حسین وجود کے گرد موت بن کر منڈلاتے نظر آئے ـــــ پلکوں کا بوجھ آنکھوں سے دُور ہوا تو خوبصورت اور جوان نند کی موجودگی راحیلہ خاتون کو اپنی آزادی کے راستوں کی سب سے بڑی رکاوٹ محسوس ہوئی ـــــ کچھ دنوں تک وہ اپنی طبیعت کے برعکس ان تمام باتوں کو خون کا گھونٹ پی پی کر اور مصلحتوں کے پیشِ نظر درگزر کرتی رہیں پھر انھوں نے شوہر کو مکمل طور پر اپنی مٹھی میں کرنے کے بعد ہاتھ پیر نکالنے شروع کر دیئے ـــــ آہستہ آہستہ سسرال میں اپنے قیام کی مدت کم کرنے لگیں ـــــ

بوڑھے اور بیمار سسر سے اُن کا تعلق بڑا سرسری بن کر رہ گیا ـــــ

نوجوان نند کے حال سے دُور ہو کر وہ اس کے مستقبل سے بھی کنارہ کش ہونے لگی تھیں ـــــ

اگر انھیں کسی سے جذباتی لگاؤ تھا تو وہ صرف شوہر کی ذات سے تھا ـــــ

افتخار احمد کی ذات سے ـــــ جو

ایک شوہر کی حیثیت سے بیوی کا بینک بیلنس دیکھ کر اتنے مرعوب ہوئے کہ سرتاپا زن مُرید بن گئے ـــــ

ہر احساس کو فراموش کر کے مستقبل میں بڑا آدمی بننے کے خواب دیکھنے لگے ـــــ

ہر فرض کو پسِ پشت ڈال کر تیزی سے قدم آگے بڑھانے لگے ـــــ

اسرار احمد نے بیٹے اور بہو کے رنگ ڈھنگ دیکھے تو اُن کا دل اور زخمی ہو گیا، جوان بیٹی کا بوجھ اور اُس کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر نے ایک بار پھر انھیں زندگی سے رشتہ جوڑنے پر مجبور کر دیا ـــــ موت کا تصور ایک بار اُنھیں ڈرانے اور خوف زدہ کرنے لگا ـــــ ایک اہم فرض کی ادائیگی کا بوجھ دوبارہ اُن کے ناتواں کاندھوں پر پڑا تو بیماری اور ضعیفی کے احساس نے قدموں میں لڑکھڑاہٹ پیدا کر دی اور پھر جب انھیں اچانک ایک روز اس بات کا علم ہوا کہ افتخار احمد اپنی بیوی کے ساتھ کاروباری امور نپٹانے کے لئے بیرونِ ملک جا رہے ہیں تو اسرار احمد کی بے چینیاں یکلخت بڑھ گئیں ـــــ تنہائی کے اچانک احساس نے اُن کی رہی سہی اُمیدوں پر بھی پانی پھیرنے کی کوشش کی تو وہ چپ نہ رہ سکے، فائزہ کی خاطر ایک روز دل پر جبر کر کے لب کشائی کر بیٹھے

"افتخار بیٹے ـــــ سُنا ہے تم اور بہو کاروبار کے سلسلے میں کہیں باہر جا رہے ہو؟"

"جی ہاں ـــــ" افتخار احمد نے باپ کے لہجے میں پوشیدہ درد کو محسوس نہیں کیا، تابناک مستقبل پر نظر جما کر بولے "راحیلہ کے والد لندن میں اپنے کاروبار کی ایک شاخ قائم کرنا چاہتے ہیں، مجھے اور راحیلہ کو شب و روز محنت کر کے اس نئی شاخ کو مستحکم کرنا ہے ـــــ کامیابی کی صورت میں ہمیں ہر ماہ لاکھوں کا منافع ہو سکتا ہے"

خدا انہیں ہر کام میں کامیاب کرے" اسرار احمد دل مسوس کر رہ گئے، کچھ توقف سے بولے "کب تک واپسی کا ارادہ ہے؟"

"زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے تک ـــــ باقی تمام انتظامات تو مکمل ہو چکے ہیں، بس ٹکٹ آنے کی دیر ہے"

"افتخار بیٹے ـــــ" افتخار احمد نے دبی زبان میں کہا "فائزہ کے سلسلے میں تم نے کیا سوچا ہے"

"فائزہ کے سلسلے میں؟" افتخار احمد نے چونک کر باپ کو دیکھا پھر لاپروائی سے بولے "خدا آپ کو سلامت رکھے آپ کے ہوتے ہوئے بھلا میں کون ہوتا ہوں فائزہ کے بارے میں سوچنے والا"

"تم اُس کے بڑے بھائی ہو اور بڑا بھائی باپ کی جگہ ہوتا ہے"

"میں سمجھا نہیں ـــــ"

"یہی تو دُکھ ہے کہ تم جان بوجھ کر انجان بننے کی کوشش کر رہے ہو" اسرار احمد تڑپ اٹھے "تمہیں فائزہ کے مستقبل کی کوئی فکر نہیں"

"آپ غلط نہ سمجھیں ابا جان" افتخار احمد نے جھلا کر کہا "دنیا میں ایسا احمق شخص کون ہوگا جو اپنے مستقبل کو جان بوجھ کر برباد کر دے اور پھر میرا مستقبل اگر شاندار ہوا تو اس سے فائزہ کی ذات کو بھی فائدہ ہی پہنچے گا"

"نفع اور نقصان کی بات مت کرو" اسرار احمد نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا "جو لمحے گزر جاتے ہیں پلٹ کر

واپس نہیں آتے، آج میرا سایہ تم لوگوں کے سروں پر قائم ہے لیکن کل ـــــ"

"ابا جان ـــــ" افتخار احمد نے تیزی سے کہا "آپ کیسی باتیں کرنے بیٹھ گئے، موت اور زندگی پر بھلا انسان کا کیا اختیار ہے"

"یہی تو میں باور کرانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اگر بات میرے اختیار سے باہر ہو گئی تو فائزہ کے سر پر کون ہاتھ رکھے گا"

"لندن سے محض چند گھنٹوں میں واپس بھی آیا جا سکتا ہے" افتخار احمد نے باپ کو سمجھاتے ہوئے کہا "رہا موت کا مسئلہ تو انسان کو اپنی زندگی سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیئے ـــــ"

"اس لئے کہ مایوسی گناہ ہے ـــــ؟"

"جی ہاں ـــــ" افتخار احمد بولے "میری مثال لے لیجئے، کل تک میرے پاس کیا تھا ـــــ؟ کسے یقین تھا کہ میری زندگی میں کوئی ایسا لمحہ بھی آئے گا جب میں لندن جیسے شہر میں جا کر کسی کاروبار کا مالک بن جاؤں گا؟ کون کہہ سکتا تھا کہ میرے دن اتنی جلدی اور اس قدر اچانک پلٹا کھا لیں گے ـــــ؟"

"میں ـــــ میں جانتا تھا کہ ایک باپ کی دعائیں کبھی رائیگاں نہیں جائیں گی" اسرار احمد نے بے حد جذباتی انداز میں کہا "ایک بوڑھے باپ کو یقین تھا کہ قدرت اس کے اوپر ضرور مہربان ہوگی، رات کی تاریکی دن کے اجالوں کے سامنے ماند پڑ جائے گی ـــــ میں، میں پُر اُمید تھا کہ حالات ضرور بدلیں گے لیکن اس قدر بھی نہیں کہ خود میری دسترس سے باہر ہو جائیں گے"

"آپ ـــــ آپ مجھ سے چاہتے کیا ہیں" افتخار احمد جھنجھلا گئے "کیا میں لندن جانے سے انکار کر دوں۔ خود اپنے ہاتھوں سے اپنا گھر اور اپنا مستقبل برباد کر لوں"

"دنیا کا کوئی باپ اپنی اولاد کا بُرا نہیں چاہتا" اسرار احمد ایک سرد آہ بھر کر بولے "تم بڑے شوق سے لندن جاؤ لیکن ـــــ میں چاہتا تھا کہ تمہارے جانے سے پہلے فائزہ کی بات کہیں طے ہو جاتی اور اُس کے ہاتھ پیلے ہو جاتے تو مجھے اپنی بیماری اور تمہاری دوری کا اتنا احساس نہ ہوتا ـــــ میرا خیال ہے کہ تم میری بات سمجھ رہے ہو گے"

"آپ فکر نہ کریں ابا جان۔ خدا نے چاہا تو سارے مسائل ایک ایک کر کے حل ہو جائیں گے" افتخار احمد نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا "فائزہ کی بات ابھی تک طے نہیں ہوئی اور میرے جانے میں صرف چند دن رہ گئے ہیں، اتنی جلدی کچھ ہو بھی نہیں سکتا ـــــ اب تو خدا کو اگر منظور ہوا تو واپسی کے بعد ہی کچھ ہو سکے گا"

"یہی تو بندے کو علم نہیں ہوتا کہ خدا کو کیا منظور ہے" اسرار احمد نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا پھر کچھ سوچ کر پوچھا "تمہاری واپسی کب تک ہوگی؟"

"اجنبی دیس میں نئے سرے سے کسی کاروبار کو جمانے میں کچھ وقت تو لگے گا ـــــ ہو سکتا ہے دو تین سال لگ جائیں ـــــ ممکن ہے اس سے بھی کم وقت میں حالات موافق آ جائیں"

"تم نے ٹھیک کہا افتخار بیٹے ـــــ نئے کاروبار کو جمانے میں کچھ وقت لگتا ہے، پرانے کاروبار کا کیا ہے، کسی نہ کسی طرح چلتا رہتا ہے البتہ ایک بات کا خدشہ بھی لاحق ہوتا ہے ـــــ کون جانے کب ٹھپ ہو جائے"

"ابا جان ـــــ" افتخار احمد نے ناگواری کا اظہار کیا "یہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں"

"تم سے کوئی شکوہ یا شکایت تو نہیں کر رہا ہوں ـــــ اپنے آپ کو فریب دینے کی کوشش کر رہا ہوں" اسرار احمد نے نقاہت بھرے لہجے میں قدرے جذباتی انداز میں کہا "یہ فریب ہی تو زندگی کے بہلاوے ہیں"

افتخار احمد کچھ جواب دینا چاہتے تھے لیکن بیوی کے آجانے کے سبب ہونٹ کاٹ کر رہ گئے، راحیلہ خاتون نے سسر کے چہرے پر فکر اور تردد کے تاثرات دیکھے تو تاڑ گئیں کہ باپ بیٹے کے درمیان کیا مسئلہ زیرِ بحث ہوگا، ایک ناز سے انھوں نے شوہر کو دیکھا پھر سسر سے سپاٹ آواز میں مخاطب ہوئیں۔

"کیا بات ہے ـــــ آپ کے چہرے پر کچھ نقاہت نظر آ رہی ہے"

"وقت کا تقاضہ ہے بہو ـــــ تم پریشان مت ہو"

"یہی تو مشکل ہے کہ آپ ہماری بات کبھی نہیں سنتے" راحیلہ نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا "جب تک کسی اچھے اور ماہر

ڈاکٹر سے مشورہ نہیں لیا جائے گا مرض کی تشخیص کیسے ہوگی ـــــ صحیح علاج کیونکر ہوگا۔"

موسم اچانک بدل جائے تو طبیعت پر گرانی کا اثر ضرور ہوتا ہے۔" اسرار احمد نے چھت پر نظریں جماتے ہوئے جواب دیا۔" درد جب حد سے گزر جائے تو اُسے دوا سے زیادہ دُعا کی ضرورت ہوتی ہے۔"

" ابا جان کو اپنی نہیں ـــــ فائزہ کی فکر لاحق ہے۔" افتخار احمد نے دبی زبان میں بیوی سے کہا۔

اسرار احمد نے ایک بار تیزی سے نظریں گھما کر بیٹے کی سمت دیکھا، ایک لمحے کو دنیا جہان کی حسرتیں ـــــ اُن کے چہرے کی ناہموار سلوٹوں کے درمیان سمٹ کر اُبھر آئیں پھر ایک بیمار سے تبسم نے اُن کے خشک اور کپکپاتے ہونٹوں پر تڑپ کر دم توڑ دیا۔

" اس میں بھلا فکر کی کیا بات ہے۔" راحیلہ خاتون نے بوڑھے سسر کو سمجھانے کی کوشش کی۔" جوڑے تو آسمان پر لکھے جاتے ہیں۔ جب وقت آئے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ـــ "

" تم نہیں سمجھ سکو گی بہو ـــــ " اسرار احمد تڑپ کر بولے۔" ابھی تم صرف ایک نئی نویلی دلہن ہو ـــــ جب ماں بنو گی تو تمہیں شاید احساس ہو جائے کہ اولاد کی محبت کتنی زہر ـــــ کتنی قاتل ہوتی ہے۔"

" آپ تو بلاوجہ ـــــ اُلجھنے لگے۔" راحیلہ خاتون نے تیوری پر بل ڈال کر جواب دیا پھر ساڑی کے ڈھلکے پلو کو بڑی نفاست سے شانے پر سنبھالتے ہوئے بولیں ـــــ" اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں فائزہ کی دشمن ہوں تو اور بات ہے ورنہ ـــــ "

" یہ ـــــ یہ میں نے کب کہا کہ تم فائزہ کی دشمن ہو۔" اسرار احمد نے خود کو سنبھالتے ہوئے تیزی سے کہا، " میں تو افتخار سے اپنی مجبوریوں اور بے بسی کا ذکر کر رہا تھا۔"

" آپ بلاوجہ پریشان ہو کر خود کو ہلکان کر رہے ہیں۔" افتخار احمد نے اُلجھے ہوئے انداز میں بات کو سلجھانے کی کوشش کی۔" راحیلہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے ـــــ جب خدا کو منظور ہوگا فائزہ کا رشتہ بھی کہیں نہ کہیں ضرور طے ہو جائے گا ـــــ رہا آپ کی بیماری کا مسئلہ تو آپ اگر چاہیں تو شہر کے بڑے سے بڑے ڈاکٹر کو بلا کر آپ کا معائنہ کرایا جا سکتا ہے ـــــ تیمارداری کے لئے باقاعدہ کسی نرس کا بندوبست کیا جا سکتا ہے اور ـــــ "

" اور اگر میں بے غیرت بن کر تمہارے سامنے دستِ سوال پھیلا دوں تو شاید تم میرے اور جواہرات سے میری مٹھی بھی بھر سکتے ہو۔" اسرار احمد ضبط نہ کر سکے تو کسی جوالا مکھی کی طرح پھٹ پڑے۔" دل کے ہنہاں خانوں میں جو لاوا برسوں سے مچل رہا تھا ـــــ تڑپ رہا تھا ـــــ وہ ایک دم ہی سے اُبل کر زبان تک آ گیا ـــــ بیٹے کو سخت نظروں سے گھورتے ہوئے بولے " بدبخت، مجھے اس بڑھاپے میں دولت کی نہیں تیری ضرورت تھی ـــــ اولاد کا سہارا دولت کے سہاروں سے زیادہ مستحکم اور پائیدار ہوتا ہے ـــــ اس لئے کہ دولت قیمتی اور خوبصورت کفن تو فراہم کر سکتی ہے لیکن میت کو کاندھا نہیں دے سکتی۔"

" ابا جان ....."

" دُور ہو جا میری نظروں کے سامنے سے۔" اسرار احمد نے نفرت سے منہ پھیرا تو اُن کی پلکوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

افتخار احمد نے باپ کو بلکتا دیکھا تو مضطرب ہو کر آگے بڑھے لیکن راحیلہ خاتون نے ہاتھ تھام کر روکتے ہوئے کہا۔" رو لینے دیجئے دل بھر کر ـــــ جی کا غبار ڈھل جائے گا۔"

" راحیلہ ـــــ " افتخار احمد نے آبدیدہ نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا۔

" فائزہ کہاں ہے۔" راحیلہ خاتون نے شوہر کو گھورتے ہوئے دریافت کیا۔

" اپنے کمرے میں۔" افتخار احمد مدھم آواز میں بولے۔" رات کھڑکی تھلی ہوئی ہے۔ آرام کر رہی ہے۔"

" اسے جگا کر یہاں بھیج دیجئے اور تیار ہو کر گھر آ جائیے۔" راحیلہ خاتون نے اپنی جگمگاتی دستی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے قدرے تحکمانہ لہجے میں کہا۔" ڈیڈی نے کچھ لوگوں کو چائے پر مدعو کیا ہے ـــــ آپ کا ان لوگوں سے ملنا ہمارے کاروبار کے لئے اشد ضروری ہے۔"

" ٹھیک ہے ـــــ آپ چلئے، میں کچھ دیر بعد آ جاؤں گا ـــــ "

راحیلہ خاتون نے پلٹ کر ایک نظر سسر پر ڈالی، اسرار احمد ہونٹ کو دانتوں تلے دبائے اس طوفان کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے جو پھٹ پڑنے کو مچل رہا تھا ـــــ راحیلہ خاتون نے گردن کو ایک ذرا جھٹکا دیا اور قدموں کو سنوارتی تیز تیز قدم اُٹھاتی کمرے سے باہر چلی گئیں اور افتخار احمد تھکے تھکے انداز میں بہن کو جگا کر باپ کی خدمت پر مامور کرنے کے لئے اُس کی خواب گاہ کی جانب گھوم گئے۔ اور آج ـــــ

آج ماضی کے وہی پرانے زخم تازہ ہو کر افتخار احمد کو تڑپا رہے تھے ـــــ گھر کے ساز و سامان کی طرح بھولی بسری باتوں پر بھی گزرے وقت کی دھول کی تہیں جمی ہوئی تھیں، ہر سمت بُہو کا عالم تھا ـــــ

ویرانی تھی ـــــ

بیتے دنوں کی یادیں وحشت بن کر در و دیوار سے لپٹی نظر آ رہی تھیں ـــــ

کیسی ہولناک اور حسرتناک خاموشی کا سماں تھا ـــــ

کتنی کربناک ساعتیں تھیں جو گہنا کر ایک مانوس سے ماحول میں منجمد ہو گئی تھیں ـــــ

اپنا گھر بھی پرایا لگ رہا تھا ـــــ

لیکن ـــــ

وقت کا فسوں آہستہ آہستہ ـــــ رفتہ رفتہ ٹوٹ رہا تھا ـــــ

افتخار احمد نے حسرت بھری نگاہوں سے در و بام پر نظر ڈالی، ہر طرف خوفناک خاموشی مسلط تھی، ہر شے گرد آلود نظر آ رہی تھی۔ یوں جیسے ماحول میں زندگی کی ایک معمول سی رمق بھی باقی نہ رہی ہو، جیسے وہ سب کچھ ایک خواب ہو ـــــ بھیانک خواب جو پندرہ سال بعد حقیقت کا رنگ اختیار کر کے نظروں کے سامنے آ گیا تھا۔

افتخار احمد نے ایک سرد آہ بھر کر قدم آگے بڑھایا لیکن پھر ٹھٹھک کر رک گئے، فرش پر ایک گرد آلود لفافہ دیکھ کر اُن کے دل کی دھڑکنیں اچانک تیز ہونے لگیں، کچھ دیر تک وہ ٹکٹکی باندھے لفافے کو دیکھتے رہے پھر آہستہ سے جھک کر اُسے اُٹھا لیا۔ لفافے کے اوپر اُن کا اپنا ہی نام تحریر تھا ـــــ وقت کی گردشوں نے حروف دھندلا دیئے تھے، روشنائی کی چمک ماند پڑ گئی تھی لیکن ماضی کی کچھ یادیں اب بھی کاغذ کے اس بند ٹکڑے کے اندر محفوظ تھیں۔ افتخار احمد نے دھڑکتے ہوئے دل سے لفافہ چاک کیا، اندر سے تہہ کئے ہوئے کاغذ کو نکال کر کھولا اور اُس پر لکھے مضمون کو پڑھنے لگے۔

بہت ہی پیارے بھائی جان۔

دست بستہ آداب ـــــ!

خدا کرے آپ ساتھ خیریت ہوں ـــــ آمین! ایک طویل مدت کے بعد دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ خط خود ا۔ پنے ہی گھر کے پتے پر پوسٹ کر رہی ہوں اس لئے کہ آپ نے اگر کبھی بھولے بھٹکے گھر کا رُخ کیا تو یہ خط آپ کو ضرور یا بالضرور مل جائے گا!

ماضی کی داستانوں کے بارے میں آپ کو ندن کے پتے پر برابر خط لکھتی رہی لیکن شومئی قسمت کہ آپ نے پلٹ کر جواب دینا بھی گوارا نہ کیا ـــــ امّی کی موت کا تار آپ کو ملا تھا، آپ نے اس موڑ پر بھی پلٹ کر سوگوار بہن کے لئے ہمدردی کے دو جملے لکھنے گوارا نہ کئے ـــــ خدا جانے مجھ بدنصیب سے ایسی کونسی خطا سرزد ہو گئی تھی جس کے جُرم کی پاداش میں آپ نے ہماری جانب سے طویل خاموشی اختیار کر لی ـــــ بہرحال، اپنے اپنے نصیب کی بات ہے ـــــ!!

امّی نے آپ کو شادی کی اطلاع بھی دی تھی ـــــ اُنھیں آپ کے جواب کا بڑی شدت سے انتظار تھا، برات آنے تک وہ ہر لمحہ آپ کی راہ تکتے رہے ـــــ پھر خوشیوں کے بعد موت کی آخری سانس آنے تک اُن کی بوڑھی اور بیمار نظریں دروازے پر جمی رہیں لیکن ؎

"اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

آج اپنی تنہائیوں کو بہلانے کی خاطر ابھی اُٹھایا تو آپ کی تصویر سامنے آگئی ـــــ دل نہ مانا تو آپ کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ ہوسکتا ہے کہ میرا یہ خط کبھی آپ کو اُس وقت ملے جب قدرت مجھے دنیا کے ہنگاموں سے دور بہت دور موت کی وادیوں میں پہنچا چکی ہو۔ پچھلے کچھ عرصے سے میری طبیعت بہت خراب رہنے لگی ہے۔ ڈاکٹروں کی کوشش جاری ہے لیکن ـــــ میں سمجھتی ہوں کہ کاتبِ تقدیر نے جس طرح میرے چمن کو تاراج کیا ہے اُسی طرح فلک کج رفتار میری معصوم اور بے زبان بچی کو دربدر کی خاک چھنوانے کے لئے مضطرب ہے۔

جس طرح رشتے ایک ایک کرکے چھوٹتے گئے اسی طرح زندگی کی گنی چنی سانسیں بھی اپنا سفر ختم کرنے کو بے چین ہیں ـــــ میری خواہش تھی کہ مرنے سے پیشتر ایک بار ـــــ صرف ایک بار آپ کو قریب سے نہ سہی دور ہی سے دیکھ لیتی۔ جانے کیوں پلکیں اور روندی ہوئی تمنائیں اکثر اتنی شدت سے سر اُبھارنے لگتی ہیں کہ کسی کروٹ چین نصیب نہیں ہوتا ـــــ شاید بدی نیند ہی میری بے چینیوں کا علاج آخر ہو ـــــ

اور کیا لکھوں ـــــ لکھنے سے حاصل بھی کیا ہوگا ـــــ ہاں، ایک درخواست ضرور کروں گی ـــــ زندگی کے کسی موڑ پر اگر میری بدنصیب عائشہ آپ کے سامنے آجائے تو اس سے نفرت کا اظہار نہ کیجئے گا ـــــ حقارت سے منہ نہ موڑیئے گا، اس لئے کہ میں اس درد، اس کرب اور اس اذیت سے آشنا ہوں جو اپنوں کے بچھڑ جانے سے ہوتا ہے ـــــ سچ بھائی جان، اس درد کا احساس ہی ہے جو ناسور بن کر میرے وجود کو اندر ہی اندر کھوکھلا کرتا رہا اور ..... !!

اب اجازت چاہتی ہوں ـــــ اگر میری کوئی بات ناگوارِ خاطر گزری ہو تو اُسے معاف کردیجئے گا۔ یہ میری آخری درخواست ہے ـــــ والسّلام

حرماں نصیب ـــــ فائزہ

" فائزہ ـــــ میری بہن، میری گڑیا " افتخار احمد نے تڑپ کر کہا پھر خط کو مٹھی میں بھینچ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، سسکنے لگے، آہ و زاری کرنے لگے لیکن کون تھا جو اُن کی فریاد کو سنتا ـــــ اُن کی ندامت کو محسوس کرسکتا ـــــ ؟؟

محمود حسین اپنے کمرے کے باہر گیلری میں بیٹھے ایک اہم فائل کا مطالعہ کرنے میں محو تھے، شمسہ بیگم دوسری کرسی پر بیٹھی اُن کے لئے چائے بنا رہی تھیں، قریب ہی اخروٹ کی چھوٹی میز پر فون موجود تھا۔

" ایسی چھٹی سے کیا فائدہ کہ آپ یا تو فائل پڑھ رہے ہیں یا پھر فون پر دفتر سے رابطہ قائم کئے ہوئے ہیں " شمسہ بیگم نے چائے کی پیالی شوہر کے سامنے رکھتے ہوئے کہا " چھٹی کے معنی تو یہ ہوتے ہیں کہ انسان تمام کام کاج چھوڑ کر صرف آرام کرے "

محمود حسین نے بیوی کی بات سُنی تو فائل بند کرکے ایک طرف رکھ دی، مسکرا کر بیوی کی سمت دیکھا کچھ کہنا چاہتے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی اور انھوں نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اُٹھا لیا، کچھ دیر تک فون پر اپنے منشی سے گفتگو کرتے رہے اور پھر ریسیور رکھ کر بیوی سے بولے۔

" میں نے دراصل آج اسی فائل کے مطالعہ کی غرض سے دفتر سے چھٹی کی تھی "

" کوئی اہم کیس ہے ـــــ ؟ "

" کیس سارے ہی اہم ہوتے ہیں البتہ یہ کیس خاصا دلچسپ ہے " محمود حسین چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے بولے " دفتر میں موکل حضرات ایک لمحے کو سکون نہیں لینے دیتے اسی لئے میں کل دفتر سے آتے وقت فائل اپنے ہمراہ لیتا آیا تھا "

" تب اچھا کیا آپ نے لیکن اب ایسا بھی کیا کہ دو گھنٹے سے آپ نے فائل پر سے نظر ہی نہیں اٹھائی " شمسہ بیگم شوہر کو چھیڑنے کی خاطر دبی زبان میں کہا " کتنی دیر سے میں بھی ایک چشم کرم کی منتظر ہوں "

" بہت خوب ـــــ " محمود حسین نے مسکرا کر کہا " گویا ہماری قیمت اب بڑھتی جارہی ہے "

" میری نگاہوں میں تو آپ روزِ اوّل ہی سے انمول رہے ہیں البتہ اپنے بارے میں آپ کی رائے آج تک معلوم ہوسکی "

" اپنے دل سے پوچھ لیا ہوتا ـــــ " محمود حسین بولے

" وہ کم بخت بھی اپنے پاس کہاں رہا " شمسہ بیگم نے برجستہ کہا تو محمود حسین لاجواب ہوگئے۔

" میری نگاہوں میں جھانکا ہوتا " وہ بات بنا کر بولے " آپ کو اپنی قدر و منزلت کا اندازہ بھی ہوجاتا "

" کوشش تو کرتی ہوں لیکن آپ نگاہیں چار کرنے کا موقع کب دیتے ہیں " شمسہ بیگم نے ایک ادائے دلنواز سے کہا

" ہمیشہ کترا کر نکل جاتے ہیں "

" آج آپ کی طبیعت کچھ زیادہ ہی موزوں نظر آرہی ہے " محمود حسین نے بیوی کو شوخ نظروں سے گھورا۔

" آپ کے قرب کا نتیجہ ہے ورنہ میں کیا اور میری بساط کیا "

" پھر بھی نظر اتروا لیجئے گا "

" آپ شاید بنا رہے ہیں " شمسہ بیگم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

" ایک بات کہوں ـــــ " محمود حسین نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

" فرمایئے ـــــ "

" یوں نہیں ـــــ پہلے وعدہ کیجئے کہ آپ میری بات کو مذاق میں نہیں اُڑائیں گی "

" بات کیا ہے ؟ "

" پہلے وعدہ ـــــ بات بعد میں بتاؤں گا "

" دفتر سے متعلق کوئی بات ہے ؟ " شمسہ بیگم نے پوچھا۔

" جی نہیں ـــــ " محمود حسین نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

" ہماری آپس کی کوئی بات ہے " شمسہ بیگم نے شوہر کو کریدنے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے وضاحت چاہی " میرا مطلب کوئی ایسی بات جس کا تعلق ہماری ذات سے ہے "

" آپ پہیلیاں بجھوا رہی ہیں " محمود حسین نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔

" اچھا ـــــ چلئے وعدہ "

" صدقِ دل سے ـــــ "

" آپ کا کیا خیال ہے ـــــ کیا میں آپ سے جو وعدہ کروں گی وہ صدقِ دل سے نہیں ہوگا "

" بات منہ سے نکلتی ہے تو پرائی ہوجاتی ہے " محمود حسین نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر چائے کا کپ رکھتے ہوئے کہا " خدا جانے آپ میری بات کو کیا رنگ دے بیٹھیں ـــــ "

" اعتماد نہیں ہے مجھ پر ـــــ "

" یہ میں نے کب کہا لیکن ـــــ "

" اب آپ پہیلیاں بجھوا رہے ہیں " شمسہ بیگم نے شوہر کی سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے کہا " بتا بھی چکئے نا آخر بات کیا ہے "

" آپ خفا تو نہ ہوں گی ـــــ "

" اگر اب آپ نے کوئی دوسری بات کی تو ضرور خفا ہوجاؤں گی "

" اچھا ـــــ بتاتا ہوں " محمود حسین نے بڑی سنجیدگی سے کہا، ایک نظر بیوی پر ڈالی پھر آسمان کی طرف دیکھنے لگے، انداز ایسا تھا جیسے وہ کچھ کہنے سے گریز کررہے ہوں، چند لمحے اُن پر بڑی کیفیت طاری رہی پھر وہ آہستہ سے بولے

" آپ ..... ہوسکے تو میری بات پر یقین کرلیجئے کہ آپ ـــــ آپ آج بہت خوبصورت اور حسین لگ رہی ہیں "

" بس، ـــــ اتنی سی بات تھی جسے آپ طول دے رہے تھے " شمسہ بیگم نے لاپروائی سے کہا۔

" کیا مطلب ـــــ کیا آپ کو میری بات کا یقین نہیں "

"یقین تو اس وقت ہوتا جب مجھے خود اس بات کا احساس نہ ہوتا کہ میں چشم بد دُور بے حد حسین اور خوبصورت ہوں" شمسہ بیگم نے بڑے ناز سے کہا "آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ بندی کو آپ کی زندگی میں قدم رکھتے ہی اپنی قدر و قیمت کا اندازہ ہو گیا تھا"

"حیرت ہے ——" محمود حسین شانے اُچکاتے ہوئے بولے "آپ نے یہ بات مجھے پہلے کبھی نہیں بتائی"

"کبھی پوچھا ہی نہیں اس لئے میں نے بتانا کبھی مناسب نہیں سمجھا"

"بہرحال —— اب آپ نے باور کرانے کی کوشش کی ہے تو میں پہلی فرصت میں تصدیق کرنے کی کوشش کروں گا"

"اس کے علاوہ بھی کچھ آتا ہے ——" شمسہ بیگم نے جھینپتے ہوئے کہا پھر بات کا رُخ بدلنے کی خاطر بولیں۔ "ابھی تک ناجیہ اسکول سے واپس نہیں آئی —— کیا وقت ہو گا"

"پانچ بج کر دس منٹ ——" محمود حسین نے دستی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا "بس، آنے والی ہو گی"

اور ٹھیک اسی وقت پھاٹک سے جھلملاتی کار ڈی اندر داخل ہو گئی تو میاں بیوی دونوں کی نظریں اس پر مرکوز ہو گئیں، ڈرائیور نے گاڑی پورٹیکو میں لا کر روکی تو پچھلا دروازہ کھول کر ناجیہ تیزی سے اُتری اور اندر چلی گئی، ڈرائیور نے نیچے اُتر کر ناجیہ کا بستہ نکالا، اتنی دیر میں شہ فود وہاں پہنچ چکا تھا، ڈرائیور بستہ شہ فو کے حوالے کر کے دوبارہ گاڑی میں بیٹھنے لگا تو محمود حسین نے بیوی سے دریافت کیا۔

"کیا عاشی آج اسکول نہیں گئی تھی ——"

"گئی تو تھی ——" شمسہ بیگم نے اُٹھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا "میں ڈرائیور سے پوچھتی ہوں ——"

شمسہ بیگم قدم اُٹھاتی روش پر اُتر گئیں، ڈرائیور نے انھیں دیکھا تو گاڑی روک کر نیچے اُتر آیا، کچھ دیر تک ڈرائیور سے گفتگو کرنے کے بعد شمسہ بیگم شوہر کی سمت واپس آنے لگیں، ڈرائیور گاڑی کو پھاٹک کے احاطے سے باہر لے گیا۔

محمود حسین بیوی کے چہرے پر موجود تاثرات کو بغور دیکھ رہے تھے، کوئی بات یقیناً ایسی ہوئی تھی جس نے شمسہ بیگم کو یکلخت سنجیدہ ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"کیا بات ہے ——" شمسہ بیگم کے قریب آنے پر محمود حسین نے دریافت کیا "کیا بتایا ڈرائیور نے"

"وہ —— وہ اب عاشی کو لینے گیا ہے"

"عاشی کو لینے گیا ہے؟" محمود حسین چونکے "کیا ناجیہ اور عاشی ساتھ ساتھ واپس نہیں آتیں"

"آج پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ ناجیہ تنہا آئی ہے" شمسہ بیگم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "ڈرائیور بتا رہا تھا کہ عاشی کو باہر آنے میں دیر ہوئی تھی اس لئے ناجیہ اُسے چھوڑ کر واپس آ گئی"

"میں سمجھا نہیں ——" محمود حسین نے کہا "کیا ناجیہ نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے"

"ہاں —— ڈرائیور یہی بتا رہا ہے" شمسہ بیگم بولیں "عاشی آ جائے تو پتہ چلے کہ کیا بات ہے"

"سمجھا —— شاید اسی وجہ سے ناجیہ گاڑی سے اُتر کر اندر چلی گئی" محمود حسین نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا پھر بولے "ذرا ناجیہ کو بلوایئے ——"

"میرا خیال ہے عاشی کو آ لینے دیجئے" شمسہ بیگم نے مشورہ دیا "اس کے بعد ناجیہ سے بھی پوچھا جائے گا کہ اس نے یہ حماقت کیوں کی"

"اس کا سبب میں بخوبی جانتا ہوں" محمود حسین نے یکلخت گہری سنجیدگی سے کہا "ناجیہ اپنے آپ کو عاشی کے مقابلے میں بہت زیادہ بلند و بالا سمجھنے کا تصور کرتی ہے"

"مجھے بھی اس بات کا احساس ہے لیکن ناجیہ ابھی بچہ ہے، ذرا عقل آئے گی تو ——"

"آپ کی سوچ غلط ہے بیگم" محمود حسین نے تیزی سے کہا "غرور اور تکبر کا پودا ایک بار ذہن میں اپنی جڑیں مضبوط کر لے تو ختم ہونے کے بجائے اور تناور اور خود سر ہو جاتا ہے —— ناجیہ کو اگر ابھی سے سرزنش نہ کی گئی تو

احساس برتری کا گھمنڈ اُسے برباد کر دے گا، اُسے ابھی سے اس بات کا احساس ہونا چاہیئے کہ دولت اور عزت پر غرور کرنے والے جب ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گرتے ہیں تو دنیا کی کوئی طاقت انھیں سنبھالا نہیں دیتی"

"آپ کا کہنا بجا ہے مگر ناجیہ کی اُٹھان جس انداز پر ہوئی ہے اُسے اتنی جلدی تو ختم نہیں کیا جا سکتا" شمسہ بیگم دل ہی دل میں بولیں "میں خود محسوس کر رہی ہوں کہ اگر ناجیہ کو ابھی سے تنبیہہ نہ کی گئی تو آگے چل کر اُسے سنبھالنا مشکل ہو گا لیکن اس بات سے بھی ڈرتی ہوں کہ کہیں ہماری سرزنش اُسے اور نہ بگاڑ دے —— اسی غرض سے تو میں نے عاشی کو اُس کے ساتھ لگایا تھا کہ وہ عاشی سے کچھ سیکھے ——"

"میں آپ کی مجبوری بھی سمجھ رہا ہوں" محمود حسین نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا "ناجیہ کی تربیت جس انداز میں ہوئی ہے وہ غلط ہے، بنیاد اگر درست نہ ہو تو اُس پر عالیشان عمارت کی تعمیر مشکل ضرور ہو جاتی ہے مگر ناممکن نہیں ہوتی —— ہمیں ناجیہ کے لئے سنجیدگی سے سوچنا پڑے گا"

"مجھے قوی اُمید ہے کہ آپ اگر اس پر تھوڑی سی توجہ دیں تو وہ اب بھی سُدھر سکتی ہے" شمسہ بیگم نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا پھر بولیں "ناجیہ میرے مقابلے میں آپ سے زیادہ پیار کرتی ہے اس لئے کہ آپ اس کی جائے جا فرمائشیں پوری کرتے ہیں —— اگر آپ اُسے پیار و محبت سے اُس کی خامیوں کا احساس دلائیں تو ہو سکتا ہے وہ اچھے اور بُرے کی تمیز کرنے لگے"

"ہمیں مشترکہ طور پر اس مسئلے پر سنجیدگی سے عمل کرنا ہو گا" محمود حسین نے قدرے نرم لہجے میں جواب دیا، کچھ توقف سے بولے "کیا آج سے پیشتر بھی کبھی ایسا ہوا ہے کہ ناجیہ اور عاشی ایک دوسرے سے خفا رہی ہوں"

"جہاں تک عاشی کا تعلق ہے وہ بیچاری تو اپنی ناجیہ کا ہر طرح سے خیال رکھتی ہے البتہ ناجیہ ہی کبھی کبھی عاشی سے روکھا جاتی ہے"

"پھر —— اُن کے درمیان صلح کس طرح ہوتی ہے، میرا مطلب ہے کہ کیا آپ ناجیہ کو سمجھاتی ہیں"

"نہیں ——" شمسہ بیگم بولیں "عاشی بیچاری خود ہی کسی نہ کسی طرح ناجیہ کو راضی کر لیتی ہے"

"آپ ذرا معلوم کریں ناجیہ سے کہ وہ آج عاشی کو کیوں چھوڑ آئی" محمود حسین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "باتوں باتوں میں اُسے یہ احساس دلانے کی کوشش ضرور کیجئے گا کہ مجھے اُس کی یہ حرکت پسند نہیں آئی"

"میں معلوم کرتی ہوں" شمسہ بیگم اُٹھتے ہوئے بولیں۔

"ایک بات ذہن میں رکھئے گا" محمود حسین نے تیزی سے کہا "ناجیہ کو یہ شبہ نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم دونوں اس مسئلے پر گفتگو کر چکے ہیں"

"میں سمجھی نہیں ——"

"بچوں کی نفسیات بڑوں کے مقابلے میں زیادہ پیچیدہ اور نازک ہوتی ہے، اگر الجھی ہوئی ڈور کو سلجھانے میں ذرا غلطی ہو جائے تو پھر اُسے سلجھانا مزید دشوار ہو جاتا ہے"

"اسی لئے تو میں چاہتی ہوں کہ ناجیہ کے مسئلے میں آپ ذاتی دلچسپی لیں" شمسہ بیگم نے فکرمند ہوتے ہوئے کہا "مجھے تو یہی خدشہ ہے کہ کہیں اُس کے دل میں میری طرف سے کوئی میل نہ بیٹھ جائے"

"آپ فکرمند نہ ہوں" محمود حسین سمجھاتے ہوئے بولے "آپ ناجیہ کی ماں ہیں، اگر آپ نے ابھی سے ہمت ہار دی تو آگے چل کر کیا ہو گا"

"یہی فکر تو مجھے ہر وقت اندر ہی اندر گھلاتی رہتی ہے"

"حوصلے سے کام لیجئے بیگم صاحبہ۔ ابھی تو آپ کے سامنے ناجیہ کی پوری زندگی پڑی ہے"

شمسہ بیگم کو بیٹی کے خیال نے آزردہ خاطر کر دیا تھا، ملول ہو کر جانے کے لئے قدم موڑے تو محمود حسین نے بیوی کے دکھ کو محسوس کرتے ہوئے اُنھیں دوبارہ آواز دی۔

"ذرا سنئے ——"

"جی ——" شمسہ بیگم نے پلٹ کر شوہر کی سمت وضاحت طلب نظروں سے دیکھا

"میں نے ابھی کچھ دیر پیشتر آپ سے کچھ کہا تھا۔"

"کیا ——"

"یہی کہ آپ آج بہت حسین اور خوبصورت لگ رہی ہیں۔" محمود حسین نے طبیعت میں شوخی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "کوشش کیجئے کہ آپ کا حسن برقرار رہے اس لئے کہ اس پر میرا اور صرف میرا حق ہے۔"

شمہ بیگم سمجھ گئیں کہ محمود حسین انھیں فکرمند دیکھ کر ہنسانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے شوہر کا دل رکھنے کے لئے چہرے پر ایک ذرا مسکراہٹ بکھیری پھر تیزی سے گھوم کر اندر چلی گئیں۔

محمود حسین گیلری سے نکل کر سبزہ زار پر آگئے۔ ناجیہ کے سلسلے میں انھیں اس بات کا احساس روز اوّل سے تھا کہ صوفیہ خاتون کی بے پناہ محبت اور بے جا لاڈ پیار نے اُسے بگاڑ دیا ہے، اس وقت ناجیہ معصوم تھی، بچہ تھی اس لئے محمود حسین ہر بات کو درگزر کر گئے، لیکن اب وہ سنجیدگی سے بچی کے سلسلے میں سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے، وہ جانتے تھے کہ ناجیہ کی خودسری کو ابھی سے لگام نہ دی گئی تو آگے چل کر امارت کا احساس اُسے اور زیادہ مغرور اور گھمنڈی بنا دے گا اور یہ بات انھیں مطلق پسند نہ تھی۔

محمود حسین اپنے خیالوں میں گم لان پر ٹہل رہے تھے کہ گاڑی کا ہارن سُن کر چونک پڑے، پلٹ کر دیکھا تو شوفر عاشی کو لے کر آگیا تھا، کچھ سوچ کر وہ اپنی جگہ پر ہی رک گئے، وہ عاشی کا ردِعمل دیکھنا چاہتے تھے، وہ محسوس کرنا چاہتے تھے کہ عاشی کے معصوم دل نے ناجیہ کی نازیبا حرکت کا کیا اثر لیا ہے۔ اُن کی نظریں گاڑی پر جمی ہوئی تھیں۔

عاشی نے گاڑی سے اُتر کر ایک نظر عمارت پر ڈالی پھر بستہ اٹھائے پلٹی تو محمود حسین کو سبزے پر کھڑا دیکھ کر یوں ایک لمحہ کو گھبرا گئی جیسے چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہو مگر دوسرے ہی لمحے اُس نے خود پر قابو پا لیا، ایک معصوم سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر بڑے پیار سے بولی۔

"گڈ ایوننگ انکل ——"

"جیتی رہو عاشی بیٹی ——" محمود حسین نے خلوص سے کہا۔

"آنٹی کہاں ہیں ——" عاشی نے پوچھا پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"اندر ہی ہوں گی، کیوں، کوئی کام ہے کیا؟"

"جی نہیں —— یونہی دریافت کر رہی تھی۔" عاشی نے جلدی سے بات بناتے ہوئے کہا۔ "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا انکل؟"

"کیوں —— مجھے کیا ہوا تھا۔" محمود حسین نے عاشی کو بغور دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں جواب دیا۔

"آپ —— آپ شاید آج دفتر نہیں گئے، جبھی تو اس وقت گھر پر موجود ہیں۔"

"میں تمہاری ذہانت کی داد دیتا ہوں۔"

"اسی لئے تو میں آپ کی خیریت دریافت کر رہی تھی ——"

"شکریہ ——" محمود حسین نے عاشی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا پھر وہیں سبزے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ "اور سُناؤ تمہاری پڑھائی کیسی چل رہی ہے ——"

"آپ کی دعا ہے انکل ——" عاشی نے نہایت سادگی سے کہا لیکن وہ بیٹھی نہیں تھی، بدستور بستہ ہاتھوں میں دبائے کھڑی تھی۔

"مالی بابا کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"اللہ میاں کا بڑا احسان ہے —— بابا پہلے سے بہتر ہیں۔" عاشی نے کہا پھر بڑے بھولپن سے بولی۔ "اب جاؤں انکل ——"

"اتنی جلدی ——" محمود حسین نے عاشی کی جلد بازی کی وجہ سمجھتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو میں نے جی بھر تم سے بات بھی نہیں کی ——"

"میں لباس تبدیل کر لوں، بابا کو چائے پلا دوں پھر آکر آپ سے باتیں کروں گی —— خوب دیر تک۔"

"میں سمجھ گیا ——" محمود حسین نے یکلخت گمبھیر سنجیدگی سے کہا۔

"کیا —— کیا سمجھ گئے انکل؟" عاشی نے ایک دم سہم کر پوچھا۔

"یہی کہ تم انکل سے زیادہ اپنی آنٹی سے پیار کرتی ہو۔" محمود حسین کے لہجے میں شکایت تھی۔ "کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"آپ گھر پر ہوتے کب ہیں۔" عاشی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا —— ایک بات بتاؤ، تمہیں زیادہ پیار کس سے ہے، انکل سے یا آنٹی سے؟"

"دونوں سے —— برابر، برابر۔" عاشی نے مسکرا کر کہا پھر دوبارہ سنجیدگی سے پوچھا۔ "میں اب جاؤں انکل؟"

"ایک شرط پر جانے کی اجازت مل سکتی ہے۔" محمود حسین نے بچوں کے انداز میں کہا۔ "آج تم مجھے ایک ننھی منی پیاری سی کہانی سُناؤ گی۔"

"کونسی والی ——" عاشی نے جلدی سے پوچھا۔ "مجھے تو ڈھیر ساری کہانیاں یاد ہیں۔"

"میں تو وہ والی کہانی سُنوں گا جس میں خوبصورت پری غریب لکڑہارے کو جنگل سے اُٹھا کر پرستان کی سیر کرانے لے جاتی ہے۔"

"یہ والی کہانی تو مجھے نہیں آتی۔" عاشی بڑی معصومیت سے بولی۔ "یہ کہانی تو میں آپ سے سنوں گی، بولیں انکل سنائیں گے نا؟"

"چلو سُنا دوں گا —— مگر ایک شرط ہوگی۔"

"وہ کیا ——"

"کل تمہیں ایک کے بجائے دو کہانیاں سنانی ہوں گی۔"

"منظور ——" عاشی نے اچانک پھر کچھ سوچ کر جانے کی اجازت مانگی۔ "میں اب جاؤں انکل؟"

"جاؤ ——" محمود حسین نے مسکرا کر اجازت دے دی لیکن عاشی نے جیسے ہی ایک قدم اٹھایا انھوں نے دوبارہ اُسے روک لیا۔ "عاشی بیٹی میں تم سے ایک بات پوچھنا بھول ہی گیا۔"

"جی ——" عاشی نے تھوک نگلتے ہوئے دریافت کیا۔ "کیا بات —— انکل؟"

"آج تم اور ناجیہ علیحدہ علیحدہ کیسے آئی ہو ——" محمود حسین نے سنجیدگی سے پوچھا۔ "کوئی خاص بات؟"

"آئی ایم سوری انکل۔" عاشی سہم کر بولی۔ "وہ —— دراصل مجھے دیر ہو گئی تھی۔"

"دیر ہو گئی تھی ——" محمود حسین نے کریدنے کی خاطر کہا۔ "کیا تمہاری اور ناجیہ کی چھٹی ساتھ ساتھ نہیں ہوتی؟"

"ہوتی تو ساتھ ہی ہے انکل لیکن —— وہ —— مجھے مس نے ایک کام سے روک لیا تھا۔" عاشی نے مسکراتے ہوئے جھوٹ بولا۔

"تو کیا ہوا —— تم ناجیہ کو بھی روک لیتیں ——"

"وہ تو خود ہی رکنے کو تیار تھی انکل لیکن میں نے آنٹی کے خیال سے اُسے بھیج دیا۔" عاشی نے بات سنبھالنے کی خاطر کہا۔ "اگر دونوں کو دیر ہو جاتی تو آنٹی زیادہ پریشان ہوتیں۔"

"ہاں —— یہ تو ہے۔"

"میں اب جاؤں انکل —— بابا، میری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے —— جاؤ۔" محمود حسین نے عاشی کو والہانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "لیکن کہانی والا وعدہ یاد رکھنا ——"

"آپ بھی یاد رکھئے گا انکل —— آج آپ کی باری ہے۔" عاشی نے نہایت سادگی سے کہا پھر آہستہ سے بیٹی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اپنے کوارٹر کی طرف چلی گئی۔

محمود حسین اپنی جگہ بیٹھے عاشی کو جاتا دیکھتے رہے۔ آج پہلا اتفاق تھا جب انھوں نے عاشی کو اتنے قریب اور اتنی توجہ سے دیکھا تھا —— اُس سے باتیں کی تھیں اور اُس کی معصوم باتوں اور اُس کی ذہانت کے گرویدہ ہو کر رہ گئے تھے اُن کا خیال تھا کہ عاشی چونکہ ایک معمولی درجے کے مالی کی بیٹی ہے اس لئے وہ ناجیہ کی غلطی کو بڑھا چڑھا کر پیش کرے گی۔

رو رو کر اُس کی شکایت کرے گی ـــــ لیکن عاشی نے بڑی خوبصورتی سے خود جھوٹ بول کر ناجیہ کو بچانے کی کوشش کی تھی۔ وہ محمود حسین کی توقعات کے خلاف نہایت سمجھدار، ذہین اور بلند ثابت ہوئی۔ اُس کی معصوم باتیں کچھ تک محمود حسین کے کانوں میں گونج رہی تھیں، وہ عاشی کے وجود میں گم ہو کر رہ گئے تھے، دوبارہ اس وقت چونکے جب شمسہ بیگم نے انھیں مخاطب کیا۔

دل میں عاشی کی عظمت کا احساس لئے وہ بیوی کے ساتھ اپنی خواب گاہ میں آگئے، عاشی کی صورت شکل اور نقشے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ محمود حسین کی نظروں میں کھب کر رہ گئی تھی، اُس کا معصوم تصور ابھی تک محمود حسین کے ذہن میں روشن تھا۔

"ناجیہ نے کیا بتایا" خواب گاہ میں پہنچ کر انھوں نے بیوی سے دریافت کیا۔

"میں نے اُسے زیادہ کریدنے کی کوشش نہیں کی لیکن ناجیہ کا کہنا ہے کہ آج اُسے عاشی کی وجہ سے کلاس میں ڈانٹ سننی پڑی"

"کیا مطلب ـــــ؟"

"بچوں کی باتیں بھی اُن کی طرح معصوم ہوتی ہیں" شمسہ بیگم نے کہا "دراصل مس نے آج ایک سوال پہلے ناجیہ سے پوچھا، وہ اس کا جواب نہیں دے سکی، بعد میں عاشی نے اس کا جواب دے دیا، بس اتنی سی بات تھی"

"لیکن اس میں بُرا ماننے یا خفا ہونے کی کیا بات تھی"

"ناجیہ کا خیال ہے کہ مس نے اُسے عاشی کی وجہ سے ڈانٹا ہے، اس لئے کہ دونوں ساتھ پڑھتی ہیں" شمسہ بیگم نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "اگر عاشی بھی جواب نہ دیتی تو ظاہر ہے کہ مس، ناجیہ کو اُس کی مثال نہ دیتیں"

"گویا عاشی کو آج اُس کی کسی اور غلطی کی نہیں بلکہ اپنی ذہانت کی سزا ملی ہے"

"میں نے ناجیہ کو باور کرا دیا ہے کہ آپ کو اُس کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری ہے" شمسہ بیگم نے کہا "وہ آپ کا نام سُن کر ڈر گئی ہے، یہی بہت ہے اس لئے میرا خیال ہے کہ اب آپ بھی اُس سے کچھ نہ کہئے ورنہ بات ہلکی ہو جائے گی"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں ـــــ" محمود حسین نے بیوی کے چہرے کے تاثرات کو محسوس کرتے ہوئے کہا "بہرحال ماں ہوتی ہے ـــــ"

"کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی" شمسہ بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

"میں نے عاشی کو کریدنے کی کوشش کی تھی" محمود حسین نے بیوی کو عاشی کے بارے میں بتایا "اُس نے ناجیہ کو بچانے کی خاطر سارا الزام اپنے سر لے لیا ہے"

"عاشی پہلے بھی ایسا ہی کرتی رہی ہے" شمسہ بیگم نے اعتراف کیا "ناجیہ سے تو ٹوٹ کر محبت کرتی ہے ـــ اتنا خیال تو ہم ناجیہ کا نہیں رکھتے جتنا وہ رکھتی ہے"

"اس کے باوجود ناجیہ کو اُس کی کوئی قدر نہیں ـــــ" محمود حسین کے لہجے میں درد تھا، حسرتیں مچل رہی تھیں اور

عاشی کا معصوم تصور ایک بار پھر اُن کی نگاہوں میں اُبھر آیا ـــــ جانے کیوں ـــــ؟

✻ ـــــــــــــــــــــــ ✻

ماں کے جانے کے بعد ناجیہ کی پیشانی پر اَن گنت سلوٹیں ابھر آئیں۔

آج پھر عاشی کی وجہ سے اُسے ماں کی نگاہوں کے سامنے گردن جھکانی پڑی تھی ـــــ اُس روز بھی ماں نے قلم کا تحفہ دیتے ہوئے عاشی کو مستقبل میں بہتر نمبروں سے پاس ہونے کی دعا دی تھی اور ماں کی دُعا ٹھیک ہی ثابت ہوئی لباس تبدیل کر کے اُس نے جیسے تیسے چائے کے ساتھ ایک توس حلق کے نیچے اتارا پھر اپنے اسٹڈی روم میں آگئی، یہاں سکون سے تنہائی میں بیٹھ کر وہ حالات کا جائزہ لینے کی خواہشمند تھی، عاشی کا مسئلہ اُس کے لئے روز بروز مشکل ہوتا جا رہا تھا، فرّی نے بھی اُسے بارہا یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ عاشی کی حیثیت ایک ملازم سے زیادہ نہیں اور ملازموں کو زیادہ منہ لگا لیا جائے تو وہ سر پر چڑھنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں ـــــ پھر

کیا ماں کو عاشی کی حیثیت کا اندازہ نہیں تھا ـــــ؟

اگر تھا تو اُسے منہ لگانے کی کیا ضرورت تھی ـــــ؟

کیوں اس ادنیٰ درجے کے بوڑھے مالی کی اس بیٹی کو اتنی اہمیت دی جا رہی تھی ـــــ؟

کیوں ـــــ؟

آخر کیوں ـــــ؟؟

ناجیہ کا ذہن اُلجھتا رہا، اُسے عاشی کی حیثیت کا بخوبی اندازہ تھا، اگر اُس کے والدین نے ہاتھ بڑھا کر عاشی کو سہارا نہ دیا ہوتا تو وہ محض سرونٹ کوارٹر تک ہی محدود رہتی، کونونٹ اسکول کا تصور بھی اُس کے لئے صرف خواب رہتا۔ ابھی تک وہ گورنمنٹ اسکول کی بوسیدہ عمارت، کے اندر کسی بوسیدہ کمرے کی چھت کے نیچے میلے کچیلے بچوں کے ساتھ ٹوٹی پھوٹی میز پر بیٹھی پڑھ رہی ہوتی اور اسکول آنے جانے کے لئے اُسے گھنٹوں بس کے انتظار میں کھلے آسمان کے نیچے سڑک پر کھڑا رہنا پڑتا۔

"آج ایک دن وہ عاشی کو چھوڑ آئی تھی تو ایسا کون سا غضب ہو گیا تھا" ناجیہ نے سوچا "عاشی اتنی معصوم بچی بھی تو نہیں کہ تنہا بس میں گھر واپس نہ آ سکتی ـــــ کون سے پاؤں میں چھالے پڑ جاتے یا عزت میں کمی آ جاتی ـــــ ہونہہ، بڑی آئی کہیں سے ملازم کی لڑکی ـــــ چلی ہے مجھ سے مقابلہ کرنے ـــــ"

ناجیہ نے اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا ـــــ ماں کی بات اُسے رہ رہ کر یاد آ رہی تھی، اُس نے ماں سے کچھ چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی ـــــ کیوں چھپاتی؟ ـــــ جو بات تھی اُس نے صاف صاف بتا دی ـــــ ڈرکس بات کا تھا اور پھر یہ حقیقت بھی تھی کہ اگر عاشی نے اس سوال کا جواب نہ دیا ہوتا تو وہ مس کی ڈانٹ سننے سے بچ جاتی۔ کلاس میں صرف عاشی ہی تو قابلیت کی معراج نہیں تھی ـــــ وہ خاموش رہتی، کوئی دوسری لڑکی سوال کا جواب دے دیتی تو آخر عاشی کی قابلیت میں کونسا فرق آ جاتا۔

"شیم فار یو (تمہارے لئے شرم کی بات ہے) ـــــ" مس نے عاشی کو شاباش دینے کے بعد ناجیہ کو تیکھی نظروں سے گھورتے ہوئے کیسے کڑوے لہجے میں منہ بنا کر کہا تھا "تمہیں عاشی سے سبق لینا چاہئے ـــــ ایک یہ بھی ہے، کیسی ذہین اور اسمارٹ اور اس کے مقابلے میں تم ہو ـــــ زیادہ تر سوالات کے جواب یا غلط دیتی ہو یا پھر اُن ـــــ اوں ـــــ ایں ـــــ سوری مس کہہ کر وقت برباد کرتی ہو ـــــ سٹ ڈاؤن"

مس کی کہی ہوئی بات ناجیہ کے ذہن میں اُبھری تو اُس کا پارہ اور چڑھ گیا، پھولوں کے گلدان میں باسی پھول دیکھ کر اُسے جلال آ گیا، تیزی سے ہاتھ بڑھا کر اُس نے گلدان اُٹھایا اور پوری قوت سے قالین پر ایک طرف اچھال دیا۔ سوکھے ہوئے باسی پھول اِدھر اُدھر بکھر گئے، دبیز قالین کی وجہ سے گلدان کی شامت نہیں آ سکی تھی، پھر بھی ناجیہ نے اُسے ٹھوکر مار کر ایک طرف کیا اور دوبارہ عاشی کے سلسلے میں اُلجھنے لگی۔

پانچویں جماعت میں وہ ناجیہ سے آگے نکل گئی تھی پھر اُس نے دعدہ کیا تھا کہ آئندہ سے وہ ناجیہ کے مقابلے میں آگے نکلنے کی کوشش نہیں کرے گی، چھٹی جماعت میں اُس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا، جان بوجھ کر کچھ سوال چھوڑ آئی تھی چنانچہ ناجیہ کی چوتھی پوزیشن کے مقابلے میں اُس کی چھٹی پوزیشن آئی، نتیجہ آنے کے بعد اُس نے ناجیہ کو کتنے پیار سے کھلونے انداز میں لپٹا کر مبارکباد دی تھی، کتنی مسرت کا اظہار کیا تھا۔

اُس وقت ناجیہ کو عاشی کے خلوص پر یقین آ گیا تھا۔ فرّی نے کہا بھی تھا کہ عاشی کو دن اور کوڑھ مغز ہونے کی وجہ سے پیچھے رہ گئی ہے لیکن ناجیہ نے اُس کی بات تسلیم نہیں کی ـــــ کرتی بھی کس طرح جبکہ امتحان سے دو روز پہلے عاشی ہی نے اُسے وہ سوال سمجھائے تھے جو امتحان میں آ گئے تھے اور عاشی ان ہی سوالوں کو جان بوجھ کر غلط کرآئی تھی۔

ساتویں جماعت میں بھی عاشی نے یہی کوشش تھی کہ اُس کے نمبر ناجیہ سے زیادہ نہ آنے پائیں، شماہی امتحان میں وہ کچھ نمبروں سے رہ گئی لیکن سالانہ امتحان میں تو وہ ایک مضمون میں فیل ہوتے ہوتے بچی، بعد میں جب ناجیہ نے معلوم کیا تو عاشی کو سارے سوالات ازبر تھے، اُس موقع پر بھی ناجیہ نے دل ہی دل میں عاشی کے خلوص اور اُس کی محبت کا اعتراف کر لیا تھا لیکن آج نہ جانے کیوں عاشی نے اُس کے مقابلے پر آ کر مس کو بتا دیا تھا کہ محمود غزنوی نے

سومنات کا مندر مسمار کرنے کے سلسلے میں ہندو راجاؤں کی سفارشوں کو ٹھکرا کر رکھ دیا تھا اور کہا تھا وہ بُت فروش نہیں بُت شکن کہلانا چاہتا ہے۔

محمود غزنوی کی اس بات کا علم ناجیہ کو بھی تھا لیکن نہ جانے کیوں مس نے جب سوال کیا تو وہ اس جواب بھول گئی اور عاشی نے بھٹ سے جواب دے کر بالا مار لیا پھر جب مس نے ناجیہ کو ڈانٹا تو وہ کیسی معصوم بن گئی تھی گردن جھکا کر اس نے نگاہوں میں ناجیہ سے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا تھا لیکن ناجیہ اُسے معاف کرنے کو تیار نہ تھی ـــــ عاشی کی حرکت نے اُسے بھری کلاس میں رسوا کیا تھا ـــــ پھر ـــــ وہ اُسے کس طرح معاف کر دیتی عاشی کو اُس کی غلطی اور اُس کی اوقات کا احساس دلانے کی خاطر وہ جان بوجھ کر اُسے جھوڑا آئی تھی، ڈرائیور نے عاشی کے حق میں زبان کھولنے کی کوشش کی تو اُس نے ڈرائیور کو بھی غصے سے جھڑک دیا تھا لیکن ماں کے سامنے وہ زبان کھولنے سے قاصر تھی، اسی لئے تو اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔

دروازے پر قدموں کی آہٹ سن کر وہ غصے سے پلٹی، اُس کا خیال تھا کہ عاشی ہوگی ـــــ اُس کے ساتھ پڑھنے کے ارادے سے آئی ہوگی یا پھر اپنی غلطی کی معافی مانگنا چاہتی ہوگی، ناجیہ ماں کی سرزنش کا سارا غبار بھی اُس پر اُتارنا چاہتی تھی اسی لئے قدموں کی آہٹ سُن کر اُس کا چہرہ غصے کی شدت سے یکلخت سُرخ ہو گیا ـــــ تیزی سے بپھرے ہوئے خونخوار انداز میں پلٹی ـــــ لیکن عاشی کے بجائے دروازے پر باپ کو کھڑا دیکھ کر ایک دم گڑبڑا سی گئی۔

"پپ ـــــ پپا..... آ..... آپ ـــــ"

محمود حسین نے ناجیہ کے چہرے کے تاثرات کا بغور جائزہ لیا۔ فرش پر بکھرے ہوئے پھولوں اور ایک طرف پڑے ہوئے گلدان پر نظر ڈالی تو سمجھ گئے کہ ناجیہ اس وقت کن ذہنی کیفیتوں کا شکار ہے ـــــ ایک لمحہ کو سوچا کہ شور مچا کر بیٹی کو اُس کی غلطیوں کا سختی سے احساس دلا دیں مگر ضبط کر گئے ـــــ جو تربیت برسوں سے کر دی گئی تھی اُس کا لمحوں میں تو مشکل تھا چنانچہ غصہ پی گئے، ہونٹوں پر مسکراہٹ اور لہجے میں نرمی پیدا کر کے بولے۔

"کیا سوچ رہی تھی میری بیٹی ـــــ"

"میں ـــــ وہ ـــــ عاشی کا انتظار کر رہی تھی" ناجیہ روانی میں کہہ گئی، جلدی سے بات بنا کر بولی "ہم دونوں ایک ساتھ اسٹڈی کرتے ہیں"

"ابھی تک آئی نہیں عاشی" محمود حسین نے نہایت شفقت سے پوچھا۔

"بس آتی ہوگی ـــــ"

"آج مجھے بھی عاشی سے کچھ باتیں کرنی ہیں"

"باتیں ـــــ" ناجیہ چونکی "کیسی باتیں پپا ـــــ"

"عاشی مجھے حالات کی تفصیل بتا چکی ہے ـــــ" محمود حسین نے قدرے سنجیدگی سے کہا تو ناجیہ کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

"تفصیل ـــــ کیسی تفصیل" اُس نے سہمے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"غلطی تمہاری نہیں عاشی کی تھی" محمود حسین نے عاشی کے بولے ہوئے جھوٹ کو برقرار رکھتے ہوئے کہا "مس نے کسی کام کی وجہ سے اُسے روک لیا تھا تو وہ تمہیں بھی روک سکتی تھی ـــــ اس بات کی ضد کی کیا ضرورت تھی کہ تم تنہا واپس آ گئیں ـــــ"

"جی ـــــ جی ہاں" ناجیہ کچھ نہ سمجھ سکی تو باپ کی ہاں میں ہاں ملانے لگی۔

"عاشی کی عمر تم سے زیادہ ضرور ہے ناجیہ بیٹی لیکن میرا خیال ہے کہ تم اُس کے مقابلے میں زیادہ ذہین اور سمجھ دار ہو" محمود حسین نے ناجیہ کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "اگر عاشی نے اسرار کیا تھا تو بھی تمہیں اُسے چھوڑ کر نہیں آنا چاہیئے تھا"

"وہ ـــــ وہ، میرا خیال تھا کہ اگر میں نے اُس کی بات نہ مانی تو وہ خفا ہو جائے گی" ناجیہ نے کچھ کچھ سمجھتے ہوئے کہا پھر بولی "پپا ـــــ عاشی نے آپ کو کیا تفصیل بتائی ہے ـــــ"

"یہی کہ مس نے اُسے کسی کام سے روک لیا تھا ـــــ تم بھی اُس کو ساتھ لانے کے لئے رکنا چاہتی تھیں لیکن عاشی نے تمہیں ضد کر کے اس لئے بھیج دیا کہ ہم لوگ پریشان نہ ہوں ـــــ"

"ہاں پپا ـــــ ہاں، بالکل یہی بات ہے" ناجیہ نے جلدی سے کہا "عاشی نے مجھے زبردستی بھیج دیا تھا"

"اسی لئے تو میں نے کہا کہ تم عاشی کے معاملے میں زیادہ سمجھ دار ہو" محمود حسین ناجیہ کے نرم بالوں سے کھیلتے ہوئے بولے "آئندہ اگر عاشی ایسی کوئی ضد کرے تو تم سمجھ داری سے کام لینا ـــــ"

"ٹھیک ہے ـــــ"

"اور عاشی سے یہ بھی بتا دینا کہ میں اُس کی بات سے خوش نہیں ہوا" محمود حسین نے بیٹی کو خوش کرنے کی خاطر کہا۔

"آپ جانے دیجئے پپا ـــــ میں عاشی کو سمجھا دوں گی" ناجیہ بولی "آپ اُسے ڈانٹیں گے تو اُسے دُکھ بھی ہوگا"

"ٹھیک ہے ـــــ تم ہی سمجھا دینا لیکن ـــــ"

عاشی اچانک کتابیں ہاتھ میں لئے اسٹڈی کے دروازے پر نظر آئی تو محمود حسین خاموش ہو گئے، بھولی بھولی اور سہمی سہمی عاشی اس وقت بھی انھیں بہت پیاری لگی تھی لیکن حالات کے پیش نظر انھوں نے عاشی سے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا، ناجیہ کو اپنی باتوں کی سچائی کا احساس دلانے کی خاطر انھوں نے عاشی کو گھورا پھر ناجیہ کو پیار سے تھپکتے ہوئے باہر چلے گئے۔

عاشی بدستور سر جھکائے مجرم سی بنی اسٹڈی کے دروازے پر کھڑی رہی ـــــ!

ناجیہ نے عاشی کو دیکھا تو مسکرا دی، باپ کی باتوں نے اس کے دل کا سارا غبار دور کر دیا تھا اس لئے کہ عاشی نے تمام الزام اپنے سر لے کر ناجیہ کی پوزیشن صاف کر دی تھی۔

"اندر آ جاؤ عاشی ـــــ" ناجیہ نے آہستہ سے آواز دی۔

"ناجیہ ـــــ" عاشی نے اندر آتے ہوئے نظریں اُٹھا کر بڑے معصوم لہجے میں کہا "آج کلاس میں جو کچھ ہوا میں اُس پر شرمندہ ہوں ـــــ وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ ایسا کبھی نہیں ہوگا"

"اور تم نے پپا سے میرے خلاف کیا کہا تھا" ناجیہ نے عاشی کو ڈرانے کی خاطر منہ بنا کر سنجیدگی سے پوچھا تو عاشی کچھ اور سہم گئی۔

"خدا کی قسم ناجیہ ـــــ میں نے انکل سے تمہارے خلاف کچھ بھی نہیں کہا" وہ جلدی سے اپنی صفائی پیش کرنے لگی "میں نے تو انکل سے ـــــ"

"پپا نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے ـــــ یو آر ریلی گریٹ عاشی (YOU ARE REALLY GREAT)" ناجیہ نے یکلخت مسکرا کر کہا پھر آگے بڑھ کر بے اختیار عاشی کو گلے سے لگا لیا ـــــ اور عاشی کی غزالی آنکھیں ناجیہ کے خلافِ توقع ردِ عمل پر بھر آئیں، دراز پلکیں آنسوؤں سے بھیگ کر اور زیادہ حسین نظر آنے لگیں، مگر معصومی کا ثبوت پیش کرنے کی خاطر اُس نے بھی ناجیہ کو اپنی بانہوں کے حلقے میں لے لیا۔

دو معصوم دل ایک دوسرے سے مل کر دھڑکنوں کی زبانی سرگوشیاں کر رہے تھے ـــــ اور فلک کج رفتار کی گردشیں اس معصوم ملاپ پر مسکرا رہی تھیں ـــــ!!

راحیلہ خاتون کہیں جانے کے لئے بڑی شد و مد سے تیار ہو رہی تھیں کہ اُن کا جوان لڑکا سیٹی کی دُھن پر کوئی فلمی گیت الاپتا ہوا تیزی سے داخل ہوا، ماں کو سنگھار میز کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ ایک جھٹکے سے رک گیا۔

"کہیں جانے کی تیاری ہو رہی ہے ممی ـــــ"

"تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے" راحیلہ خاتون نے پلٹ کر تیکھی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "کتنی بار منع کر چکی ہوں کہ سیٹی پر آوارہ لڑکوں کی طرح فلمی گانے گانا مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا ـــــ"

"سوری ممی ——" اقبال نے مسکراتے ہوئے ڈھیٹ لہجے میں جواب دیا "بھول ہوگئی ——"

"تم ہر بار یہی کہہ کر ٹال جاتے ہو"

"آئندہ احتیاط رکھوں گا" اقبال نے سپاٹ آواز میں کہا پھر دوبارہ اپنا سوال دہرایا "کہیں جا رہی ہیں آپ ——"

"ہاں ——"

راحیلہ خاتون نے مختصراً کہا پھر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بال کی اُلجھی لٹوں کو سنوارنے لگیں اقبال کچھ دیر کھڑا ماں کو دیکھتا رہا پھر دبی زبان میں بولا

"ممی —— مجھے کچھ روپوں کی ضرورت ہے"

"تمہارے ڈیڈی کہاں ہیں"

"وہ —— وہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں ——"

"واپس آئیں تو انھیں سے روپے مانگ لینا"

"ڈیڈ سے ——" اقبال نے بُرا سا منہ بنا کر کہا پھر بولا "وہ ہمیشہ کی طرح کریدنے بیٹھ جائیں گے کہ کس لئے درکار ہیں پیسے، کہاں خرچ کرو گے —— ابھی دس روز پیشتر ہی تو پورے پانچ روپے دے چکا ہوں وہ کیا ہوئے اور ——"

"اقبال ——" راحیلہ خاتون نے پلٹ کر اقبال کو گھورتے ہوئے سرزنش کی "وہ تمہارے برابر کے دوست نہیں —— باپ ہیں"

"وہ تو ٹھیک ہے ممی لیکن ——"

"میں دیکھ رہی ہوں کہ جب سے تم نے کالج میں داخلہ لیا ہے کچھ زیادہ ہی بیباک اور گستاخ ہوتے جا رہے ہو"

"مجھے بیس روپوں کی اشد ضرورت ہے" اقبال نے ماں کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے سنجیدگی سے اپنا مطالبہ پیش کر دیا۔

"مہینے کا جیب خرچ تو تم مجھ سے لے چکے ہو پھر اچانک یہ بیس روپوں کی کیا ضرورت پیش آگئی" راحیلہ خاتون نے تیزی سے دریافت کیا۔

"میری کلاس کے لڑکے پکنک پر جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں" اقبال نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا "ہر لڑکے کو بیس روپے جمع کرانے ہیں"

"یہی تم اپنے ڈیڈی کو بھی بتا سکتے ہو ——"

"ممی پلیز ——"

"فضول باتیں مت کرو" راحیلہ خاتون کا لہجہ ترش ہوگیا "میرے پاس تمہاری فضول خرچیوں کے لئے پیسے نہیں ہیں، مہینے کا جیب خرچ میں تم کو دے چکی ہوں —— اب اگر تمہاری کوئی ضرورت ہے تو تم جانو اور تمہارے ڈیڈ"

"ڈیڈ سے کہا تھا میں نے ——" اقبال نے کچھ توقف کے بعد روکھے لہجے میں کہا "اُنھوں نے سختی سے منع کر دیا ہے"

"پھر —— مجھ سے فرمائش کر رہے ہو ——؟"

"میں اپنے دوستوں سے وعدہ کر چکا ہوں —— اب اگر میں نے کوئی بہانہ کیا تو نامناسب ہوگا"

"بہانے کی کیا ضرورت ہے —— صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ تمہارے ڈیڈی نے پکنک پر جانے سے روک دیا"

"لڑکے کیا سوچیں گے ——"

"کیا سوچیں گے لڑکے ——؟" راحیلہ خاتون جھلا گئیں۔

"آپ سمجھنے کی کوشش کریں ممی —— میں اب اسکول میں نہیں کالج میں ہوں"

"جانتی ہوں ——"

"میرے دوستوں کو میری حیثیت کا اندازہ بھی ہے" اقبال احمد نے ماں کو سمجھانا چاہا "اگر میں نے وقت

انھیں پیسے نہ دیئے تو میری بڑی کرکری ہوگی —— بخدا میں کہہ جاؤں گا"

"اگر یہ بات تھی تو تمہیں اپنے دوستوں سے وعدہ کرنے سے پیشتر مجھ سے یا اپنے ڈیڈی سے مشورہ کر لینا چاہیئے تھا"

"آئندہ سے ایسا ہی کروں گا لیکن اس بار —— پلیز ممی، میری عزت آپ کے ہاتھ ہے" اقبال نے ماں کو سینما دیکھ کر خوشامد کرتے ہوئے کہا "کم آن ممی —— فار دی لاسٹ چانس"

"اس سے پہلے بھی تم کئی چانس لے چکے ہو ——"

"یہ آخری —— ایک دم آخری" اقبال نے ماں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا پھر لاڈ میں آکر ماں کو لپٹا لیا۔

"ارے —— ارے —— چھوڑ تو سہی" راحیلہ خاتون نے خود کو اقبال سے چھڑاتے ہوئے کہا پھر پرس سے دس دس کے دو نوٹ نکال کر دیتے ہوئے بولیں "خبردار..... اس کی اطلاع تمہارے ڈیڈی کو نہ ہو ورنہ وہ پھر یہی دکھڑا لے کر بیٹھ جائیں گے کہ میں نے اُن کے چہیتے اور لاڈلے بیٹے کو بگاڑ دیا ہے —— ہونہہ!"

"اوہ ممی —— یو آر گریٹ اینڈ ویری ویری سویٹ" اقبال نے روپوں کو چومتے ہوئے ماں سے کہا پھر تیزی سے پنجوں کے بل مشینی انداز میں پلٹا اور لمبے لمبے قدم مارتا باہر چلا گیا۔

"دیوانہ ——" راحیلہ خاتون نے بیٹے کے جانے کے بعد ممتا بھرے لہجے میں مسکرا کر کہا پھر دوبارہ آئینے کے سامنے ہو کر زلفیں سنوارنے لگیں، بار بار اُن کی نگاہیں دیوار گیر کلاک پر بھی اُٹھ جاتی تھیں۔

اس وقت شام کے ساڑھے چھ کا عمل تھا اور انھیں ٹھیک آٹھ بجے کلب پہنچ کر ایک میوزیکل پارٹی میں شرکت کرنی تھی۔ افتخار احمد کو بھی پروگرام کا علم تھا لیکن وہ ابھی تک غائب تھے۔ راحیلہ خاتون کو رہ رہ کر شوہر کی غیر موجودگی پر غصہ آرہا تھا، میک اَپ سے فراغت پا کر انھوں نے لباس تبدیل کیا۔ آخری بار اپنا جائزہ لینے کے لئے سنگھار میز کے آگے کھڑی ہوئیں تو قدِ آدم آئینے کی دروغ گوئی پر شرما کر رہ گئیں پھر وقت کا خیال آیا تو ایک بار پھر اُن کی کشادہ پیشانی پر ناگوار شکنیں پیدا ہوگئیں۔ گزرتے ہوئے وقت کا ایک ایک منٹ انھیں بے حد اذیت ناک محسوس ہو رہا تھا —— بار بار اُن کی نظریں کلاک کی جانب اُٹھ رہی تھیں اور چہرے کی شفق گزرتی ساعتوں کے ساتھ ساتھ تلخی اختیار کرتی جا رہی تھی —— ٹھیک ساڑھے سات بجے راحیلہ خاتون نے گھنٹی بجا کر ملازمہ کو طلب کیا ——!

"جی بیگم صاحبہ ——" ملازمہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"صاحب کہاں ہیں ——"

"اسٹڈی روم میں ہیں بیگم صاحبہ" ملازمہ نے کہا "ابھی تھوڑی دیر پہلے میں انھیں کافی دے کر آئی ہوں"

"کیا کہا تم نے ——" راحیلہ خاتون نے تلملا کر پوچھا "صاحب اسٹڈی روم میں بیٹھے کافی پی رہے ہیں"

"جی ہاں بیگم صاحبہ ——"

"ٹھیک ہے —— تم جاؤ"

ملازمہ چلی گئی تو راحیلہ خاتون نے کسی بپھرے ہوئے طوفان کی مانند اسٹڈی روم کا رُخ اختیار کیا۔

افتخار احمد کی بدلتی ہوئی کیفیتوں کو وہ بہت دنوں سے محسوس کر رہی تھیں، وہ شوہر کے دُکھ اور اُن کے درد سے واقف تھیں مگر انھوں نے کبھی شوہر کا غم بٹانے کی کوشش نہیں کی —— اپنے آپ میں مست رہتی تھیں لیکن آج جب اُن کی خوشیوں کے درمیان افتخار احمد کا دکھ درد حائل ہوا تو وہ تلملا اُٹھیں، انھیں اس بات پر شدید طیش آرہا تھا کہ میوزیکل پروگرام شروع ہونے میں صرف آدھ گھنٹہ باقی رہ گیا تھا اور افتخار احمد تیار ہو کر اُن کے ہمرکاب ہونے کے بجائے آرام سے اسٹڈی میں بیٹھے کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

تیز تیز قدم اُٹھاتی وہ اسٹڈی میں داخل ہوئیں —— افتخار احمد کرسی تھکے ماندے مسافر کی طرح ایک صوفے میں دھنسے بیٹھے کسی گہری سوچ میں غرق تھے اور ایشٹرے میں پڑے ہوئے سگریٹ کے بیشمار ٹکڑے اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ بہت دیر سے اپنا غم غلط کرنے کی خاطر سگریٹ کا دھواں اُڑا رہے ہیں —— کمرے میں نائٹ بلب

کی مدھم روشنی بھی افتخار احمد کے غم میں برابر کی شریک نظر آ رہی تھی۔

راحیلہ خاتون نے ایک نظر شوہر پر ڈالی ـــــ غصے سے ہونٹ کاٹتی ایک قدم اور آگے بڑھا کر سوچ
تو کمرہ روشنی سے جگمگا اُٹھا' افتخار احمد نے یوں چونک کر آنکھ کھولی جیسے کچی نیند میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ کر
بیدار ہوئے ہوں۔

"آپ ـــــ" راحیلہ خاتون کو تعجب سے دیکھتے ہوئے افتخار احمد نے حیرت سے کہا پھر سنبھل کر بولے
"میں ڈیڑھ گھنٹے سے آپ کی راہ دیکھ رہی ہوں اور آپ یہاں بیٹھے کافی پی رہے ہیں۔" راحیلہ خاتون نے سپاٹ
لہجے میں کہا۔ "ہمیں ٹھیک آٹھ بجے کلب پہنچ کر میور ک پارٹی اٹینڈ کرنی ہے۔"

"میرے ذہن سے نکل گیا تھا ـــــ" افتخار احمد تھکی آواز میں بولے۔

"اب کیا پروگرام ہے آپ کا ـــــ اسٹڈی میں بیٹھ کر بچھڑے ہوئے رشتوں کا سوگ منائیں گے یا میرے
ساتھ تشریف لے چلیں گے۔" راحیلہ خاتون کے لہجے میں زہر تھا ـــــ تلوار کی سی کاٹ تھی۔

افتخار اندر ہی اندر تلملا اُٹھے ـــــ تڑپ کر بیوی کی طرف دیکھا ـــــ کچھ کہنے کے بجائے ہاتھ مسل کر رہ گئے
تیزی سے اُٹھے اور لان کی جانب کھلنے والی کھڑکی کے قریب جا کر تھم گئے۔

"میں نے کچھ دریافت کیا تھا آپ سے ـــــ" راحیلہ خاتون کی خشک اور سپاٹ آواز دوبارہ اُبھری۔

"فائزہ کے سلسلے میں آج مجھے ایک اور اطلاع ملی ہے ـــــ" افتخار احمد نے باہر گھپ اندھیروں پر
جھانکتے ہوئے بڑی درد بھری آواز میں کہا پھر اپنے ہونٹ سختی سے دانتوں تلے بھینچ لئے۔

"بیگم شیرازی نے بتایا تھا کہ پروگرام ٹھیک آٹھ بجے شروع ہو جائے گا۔" راحیلہ خاتون نے شوہر کی بات کا
نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "آج کے فنکشن میں لالہ رُخ آخری بار نغمہ سرا ہو رہی ہے' کل وہ اپنے وطن واپس لوٹ
جائے گی۔"

"خدا کرے وہ منحوس خبر غلط ہو۔" افتخار احمد کی آواز بھرا گئی۔ "لیکن بتانے والے نے یہی کہا ہے کہ فائزہ ـــــ
اب اس دنیا میں نہیں ہے۔"

"آپ نے تصدیق نہیں کی اب تک۔" راحیلہ خاتون نے رسم دنیا نبھانے کی خاطر سپاٹ آواز میں دریافت کیا۔

"اس اطلاع کی تصدیق کے لئے مجھے کراچی جانا ہوگا۔" افتخار احمد رندھی آواز میں بولے۔ "بیماری کے دوران
فائزہ لاہور چھوڑ کر کراچی چلی گئی تھی ـــــ"

"کچھ یہ بھی پتہ چلا کہ شادی کہاں ہوئی تھی۔" راحیلہ خاتون نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ "اگر کوئی اتہ
پتہ معلوم ہو تو بذریعہ خط بھی اُس کے سسرال والوں سے بھی تصدیق کی جا سکتی ہے۔"

افتخار احمد نے پلٹ کر بیوی کی طرف شکایتی نظروں سے دیکھا پھر کچھ سوچ کر تیزی سے اپنا رُخ دوبارہ موڑ لیا
راحیلہ خاتون نے شوہر کو منہ پھیرتے دیکھا تو جل بھن کر خاک ہو گئیں مصلحتاً غصہ پی گئیں، ـــــ چند ساعت
چُپ رہیں پھر دستی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے آہستہ سے بولیں۔

"آٹھ بجنے میں دس منٹ رہ گئے ہیں ـــــ کلب چلنے کے سلسلے میں کیا ارادہ ہے آپ کا ـــــ"

"تم ـــــ تم ہو آؤ ـــــ" افتخار احمد بڑا ضبط کرتے ہوئے بولے۔ "میری وجہ سے اپنا پروگرام کیوں خراب
کرتی ہو۔"

"ٹھیک ہے ـــــ میں ڈرائیور کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔" راحیلہ خاتون نے خشک آواز میں کہا پھر تیزی
سے گھوم کر واپس چلی گئیں اور افتخار احمد ـــــ

راحیلہ خاتون کے جانے کے بعد وہ اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر بچوں کی طرح سسکنے لگے۔

ممدو پر کھانسی کا دورہ شدت اختیار کرنے لگا تو عاشی بُری طرح پریشان ہو گئی۔
رات نصف سے زیادہ بیت چکی تھی' ہر سمت گھپ اندھیرا اور سناٹا طاری تھا۔ عاشی نے رات کھانے کے بعد ممدو کو دوا پلائی تھی پھر بستر پر لیٹ کر کتاب پڑھتے پڑھتے اُس کی آنکھ لگ گئی' دوبارہ وہ ممدو کی کھانسی کی آواز سن کر ہی جاگی تھی۔ جلدی سے اُٹھ کر وہ اُس کی پیٹھ سہلانے لگی' دواؤں کے علاوہ اُسے بس یہی ایک طریقہ معلوم تھا اور اکثر یہ طریقہ بڑا مؤثر ثابت ہوا تھا۔

لیکن آج ـــــ

آج تو وہ بوڑھے ممدو کی پشت سہلا سہلا کر نڈھال ہو چکی تھی لیکن کھانسی تھی کہ کسی طرح تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی ـــــ عاشی نے کھانسی کی دوا بھی دی مگر کوئی افاقہ نہ ہوا مگر جب کھانستے کھانستے ممدو کی حالت غیر ہونے لگی تو وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی' ہلکی سی اونی چادر جو اُسے شمسہ بیگم نے دی تھی سر پر ڈال کر وہ دروازے کی سمت بڑھی تو ممدو نے اُسے روک کر پوچھا۔

"اتنی ـــــ اتنی رات گئے ـــــ کہاں جا رہی ہے۔"

"آنٹی سے کہہ کر تمہارے لئے ڈاکٹر بلوانے جا رہی ہوں۔" عاشی نے سنجیدگی سے کہا۔

"دیوانی ـــــ ہو گئی ہے۔" ممدو نے کھانستے ہوئے بمشکل کہا۔ "چل ـــــ بیٹھ جا اپنے بستر میں۔"

"نہیں بابا ـــــ تمہاری طبیعت آج بہت زیادہ خراب لگ رہی ہے۔" عاشی درد بھرے لہجے میں بولی۔

"کچھ نہیں ہوا ـــــ مجھے!..... ایک ذرا کھانسی ـــــ ہو رہی ہے سو وہ بھی تھم جائے گی۔" ممدو نے اپنے ہوئے عاشی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "کیوں میری وجہ سے ـــــ سب کو پریشان کرے گی۔"

عاشی دروازے کے قریب ٹھہری ممدو کو دیکھتی رہی' اُس کا دل خواہ مخواہ ہی ڈوب رہا تھا کہ آج اُس کے بابا کی حالت روزمرہ کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی خراب ہے' اسی لئے وہ شمسہ بیگم سے درخواست کر کے کسی ڈاکٹر کو بلوانا چاہتی تھی لیکن ممدو کے کہنے پر اُسے خیال آیا کہ اتنی رات گئے وہ کسے جگا کر ڈاکٹر کے لئے کہے گی' سب لوگ تو اپنے اپنے کمرے میں بند گرم گرم بستر کے اندر دُبکے خوابِ خرگوش میں مگن ہوں گے ـــــ خراٹے لے رہے ہوں گے اور پھر ـــــ ڈاکٹر بھی اتنی رات گئے شاید مشکل ہی سے کپکپاتی سردی میں گھر سے باہر نکل کر کسی مریض کو دیکھنے کے لئے آمادہ ہوگا ـــــ لیکن۔

"بابا کی حالت آخر زیادہ خراب ہو گئی تو کیا ہوگا؟ ـــــ" عاشی کے معصوم ذہن میں یہ خیال اچانک اُبھرا تو وہ پریشان ہو گئی' ممدو دونوں ہاتھوں سے سینہ دبائے کھانسنے میں مصروف تھا' سردی کے باوجود اُس کا جھریوں زدہ چہرہ آنکھوں سے بہتے ہوئے پانی سے شرابور ہو رہا تھا۔

"بابا ـــــ" عاشی نے قریب جا کر ممدو کی کمر سہلاتے ہوئے کہا۔ "میری بات مان لو بابا ـــــ اس وقت تمہارے لئے ڈاکٹر کا آنا ضروری ہے۔"

"کون ـــــ کون بُلائے گا ڈاکٹر۔" ممدو جھلا گیا' کھانسی پر چند لمحوں کے لئے قابو پاتے ہوئے اُس نے چہرہ گھما کر عاشی کو دیکھا تو وہ سہم کر ایک قدم پیچھے ہو گئی۔

ممدو کی آنکھوں میں نہ جانے اتنی سُرخی کہاں سے آ گئی تھی اور پھر اُس کے چہرے کی وحشت بھی بڑی ڈراؤنی لگ رہی تھی' پسینے سے بھیگا ہوا چہرہ اور اُلجھے بکھرے بالوں نے ممدو کی شخصیت کو اس وقت بڑا مسخ کر دیا تھا۔ اُس کے لہجے میں بھی کچھ ایسا ہی کھردرا پن اور وحشت تھی کہ عاشی سہم کر رہ گئی۔

"چل ـــــ لیٹ جا ـــــ صبح ہو گی تو دیکھا جائے گا' کیوں بلاوجہ خود کو ہلکان ـــــ"

ممدو نے نرم لہجے میں عاشی کو سمجھانے کی کوشش کی' اُس کے چہرے پر اُبھرنے والی اُلجھن اور پریشانی نے ممدو کو احساس دلا دیا تھا کہ اُس نے عاشی کے نازک دل کو ٹھیس پہنچائی ہے ـــــ شاید اُسے عاشی سے اس انداز میں جھڑک کر بات نہیں کرنی چاہئے تھی' اسی غلطی کے تدارک کی خاطر اُس نے اپنا لہجہ نرم کر لیا تھا لیکن بیماری نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

کھانسی کے دورے نے اچانک دوبارہ اتنی شدت اختیار کر لی کہ اُس کا سانس اکھڑنے لگا' عاشی گھبرا کر اُس کے قریب آ گئی' پریشان لہجے میں بولی

"بابا ـــــ بابا ـــــ تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے"
ممدو نے سر سے نفی کا اشارہ کر کے عاشی کو دلاسہ دینے کی کوشش کی۔
"انکل رات کو دیر تک پڑھتے رہتے ہیں ـــــ" عاشی نے گھبرائے ہوئے انداز میں ممدو کو سمجھانے کی دروغ گوئی کا سہارا لیتے ہوئے کہا "وہ اس وقت بھی ضرور جاگ رہے ہوں گے اور میرے کہنے سے تمہارے لئے ڈاکٹر کا بندوبست بھی ضرور کر دیں گے"

ممدو نے کچھ کہنا چاہا لیکن کھانسی کسی طرح نہیں تھم رہی تھی۔ پھر کھانسی کے ساتھ خون کے چھینٹے نکلے تو وہ بُری طرح سہم کر رہ گئی، وہ اس بیماری کی نوعیت سے تو ناواقف تھی لیکن اتنا ضرور جانتی تھی کہ منہ سے خون نکلنا کوئی اچھی بات بھی نہیں۔ ممدو نے جلدی سے رضائی کھینچ کر خون کے ان چھینٹوں کو چھپانے کی کوشش کی تھی جو وہ کئی مہینوں سے عاشی سے چھپاتا چلا آ رہا تھا لیکن آج وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

"بابا ـــــ" عاشی نے حیرت سے ممدو کے نڈھال اور زرد چہرے کو تکتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہا۔
"تمہارے منہ سے ـــــ خون آ رہا ہے ـــــ"
"گلے میں ـــــ خر ـــــ خاش ہو گی ـــــ بگل" ممدو نے کھانستے ہوئے جھوٹ بولا "تو پریشان مت ہو ـــــ تیرا بابا ـــــ بالکل ـــــ بھلا چنگا ـــــ"

گلے میں دوبارہ کھانسی کا پھندہ لگا تو الفاظ ممدو کے حلق کے اندر ہی گھٹ کر رہ گئے ـــــ اُبکائی کے ساتھ ہی سارا کھایا پیا حلق سے باہر آ گیا ـــــ عاشی نے جلدی سے مٹی کا کونڈا اٹھا کر سامنے کر دیا لیکن تے کے ساتھ ہی خون کے قطرے دیکھ کر وہ ایک بار پھر دہل اٹھی ـــــ جانے کیوں اس کے دل کی دھڑکنیں آج کسی انہونی کے تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔

سہمی سہمی ـــــ خوفزدہ سی کھڑی وہ ممدو کی کمر کو جلدی جلدی سہلا رہی تھی ـــــ اُس کے نازک ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے ـــــ وہ دل ہی دل میں ممدو کی صحت یابی کی دعا مانگ رہی تھی ـــــ اُس کے معصوم دل کی ایک ایک دھڑکن جیسے زبان بن گئی تھی۔

اللہ میاں ـــــ
میرے بابا کو اچھا کر دے ـــــ
اللہ میاں ـــــ
میرے بوڑھے بابا کی کھانسی ختم کر دے ـــــ
میرے بابا کو آرام اور سکون عطا کر دے ـــــ
ساری بیماری دور کر دے ـــــ
اور ـــــ
میرے بابا کو سکون کی نیند آ جائے ـــــ
میرے اچھے اللہ میاں ـــــ
میری دعا قبول کر لیجئے ـــــ میری درخواست کو قبول کر لیجئے ـــــ !!

عاشی کے جسم کا ایک ایک رواں جیسے مجسم التجا بن گیا تھا پھر ـــــ ممدو کی کھانسی آہستہ آہستہ کم ہونے لگی تو عاشی کا دل خوشی سے جھوم اٹھا، قدرت نے شاید اُس کی دعاؤں کو شرفِ قبولیت بخش دیا تھا۔ ممدو کی حالت حیرت انگیز طور پر سنبھل رہی تھی، البتہ چہرے کی نقاہت دوچند ہو گئی تھی ـــــ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا وہ اس طرح ہانپ رہا تھا جیسے بڑی طویل مسافت طے کر کے منزل کے قریب پہنچا ہو۔

"بابا ـــــ تم اب لیٹ جاؤ"
عاشی نے مٹی کا کونڈا اٹھا کر پلنگ کے نیچے کیا پھر ممدو کو ذرا سا سہارا دے کر بستر پر لٹا دیا، ممدو کی رضائی ہٹا کر اپنی رضائی اس پر ڈال پھر پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بولی

"اب تمہاری کیسی طبیعت ہے بابا ـــــ"
"ہوں ـــــ" ممدو نے مختصراً سر کی جنبش سے جواب دیا، اس کے چہرے پر اب بھی وحشتیں رقص کر رہی تھیں۔
"اب تم سونے کی کوشش کرو ـــــ نیند آنے سے تکان بھی دُور ہو جائے گی ـــــ"
ممدو نے اس بار کچھ نہیں کہا، حسرت بھری نظریں عاشی کے معصوم چہرے پر مرکوز کر دیں۔
"جانتے ہو بابا ـــــ" عاشی نے ممدو کے بالوں میں آہستہ آہستہ اپنی انگلیاں گھماتے ہوئے بڑی معصومیت سے کہا: "میں نے اللہ میاں سے دعا مانگی تھی کہ تمہاری کھانسی دور ہو جائے ـــــ طبیعت ٹھیک ہو جائے اور اللہ میاں نے میری دعا قبول کر لی"

ممدو نے اپنے ہونٹ جلدی سے بھینچ لئے لیکن آنسوؤں کے ان قطروں کو نہ روک سکا جو جذبات میں اچانک طغیانی آ جانے کی وجہ سے اُس کی پلکوں تک آ گئے تھے، ان قطروں کو خشک کرنے کی خاطر اُس نے جلدی سے آنکھیں موند لیں۔

"اب تم آرام سے سو جاؤ بابا ـــــ" عاشی نے نہایت سادگی سے ضدی لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا "صبح میں تمہاری کوئی بات نہیں مانوں گی ـــــ آنٹی سے کہہ کر تمہارے لئے کوئی اچھا سا ڈاکٹر بلواؤں گی اور تمہارا باقاعدہ علاج کراؤں گی ـــــ پھر تم ایک دم بھلے چنگے ہو جاؤ گے ـــــ بالکل شرفو کی طرح"

"عاشی ـــــ میری ننھی گڑیا" ممدو نے بڑی نقاہت سے کہا پھر ہاتھ بڑھا کر عاشی کا بازو تھام لیا۔
"باتیں نہیں بابا ـــــ عاشی نے بڑی بوڑھیوں جیسے انداز میں کہا "اچھے بچوں کی طرح آنکھیں بند کرو ـــــ میں تمہیں پریوں کی کہانی سناتی ہوں لیکن خبردار ـــــ آنکھیں کھولنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ پریوں کی ملکہ رُوٹھ جائے گی ـــــ"

ممدو سختی سے ہونٹ بھینچے عاشی کی پیاری پیاری باتیں سن رہا تھا، عاشی کی باتیں اُس کے جذبات میں ہلچل مچا رہی تھیں، وہ آنے والے کل کے سلسلے میں پریشان تھا اور عاشی کی معصوم باتیں ان پریشانیوں کو ہوا دے رہی تھیں ـــــ پھر ـــــ پھر اچانک اُس کے بوڑھے دل کی غیر یقینی دھڑکنیں تیز ہو گئیں ـــــ اُس کی آنکھوں کے نیچے گھپ اندھیرے پھیلنے لگے ـــــ سانس سینے کے اندر گھٹنے لگا ـــــ اُس نے تیزی سے اُٹھ کر عاشی کو اپنی بانہوں میں لے کر بے اختیار چومنے کی کوشش کی لیکن ہمت جواب دے گئی ـــــ بستر سے اُس کا سر ایک ذرا بلند ہوا پھر تکیے پر گر کر ایک طرف ڈھلک گیا ـــــ ہاتھ پاؤں یوں ڈھیلے ہو گئے جیسے اُن میں زندگی کی ایک معمولی سی رمق بھی باقی نہ رہ گئی ہو

عاشی کی نظریں ممدو کے چہرے پر مرکوز تھیں، اس نے ممدو کے اٹھنے اور پھر نڈھال ہو کر گرنے کی کیفیت دیکھی تو اُس کا دل ایک انجانے خوف سے دھڑک اٹھا ـــــ وہ سہم کر دم بخود رہ گئی ـــــ کچھ دیر گنگ سی بیٹھی ممدو کے بے جان چہرے کو تکتی رہی پھر اُس نے آہستہ سے پکارا

"بابا ـــــ بابا ـــــ"

ممدو نے کوئی جواب نہ دیا تو عاشی کے ذہن میں اُبھرنے والا خوف جنون کی حالتوں سے دوچار ہونے لگا، اُس نے ممدو کو جھنجھوڑ ڈالا لیکن ـــــ دوسری سمت سے کوئی جواب نہ ملا ـــــ ممدو ایک دم خاموش اور ساکت پڑا تھا ـــــ اُس کے جسم کو ایک ذرا سی جنبش بھی نہیں ہو رہی تھی ـــــ

عاشی اچانک خوفزدہ ہو کر ممدو کے پلنگ سے دو قدم پیچھے ہو گئی ـــــ وحشت زدہ نگاہوں سے ـــــ ممدو کو پکارا ـــــ جواب کا انتظار کئے بغیر پلیٹ کر بوکھلائے ہوئے انداز میں کوارٹر کا دروازہ کھولا۔

اور ـــــ وحشتناک انداز میں پاگلوں کی طرح کوٹھی کی سمت دوڑنے لگی۔

عاشی کی وحشت رائیگاں نہیں گئی

محمود حسین اُس وقت حقیقتاً ایک فائل کے مطالعے میں مصروف تھے جب عاشی نے دیوانہ وار اُن کے دروازے پر دستک دی تھی ـــــ دروازہ کھلنے پر عاشی نہ جانے کس معصوم جذبے کے تحت بے اختیار محمود حسین سے لپٹ گئی رو رو کر اُس نے ممدو کی حالت بیان کی تو محمود حسین بھی مضطرب ہو گئے' اُسی وقت فون کر کے فیملی ڈاکٹر کو طلب کیا۔ شمسہ بیگم بھی جاگ اٹھیں' عاشی کی حالت دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گئیں۔

"خدا پر بھروسہ رکھو بیٹی ـــــ" محمود حسین نے عاشی کے سر پر بڑی شفقت و مہربانی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "اُس کی رحمت سے سب کچھ بہتر ہی ہوگا ـــــ"

"انکل ـــــ" عاشی نے لرزتے ہوئے کہا "اگر بابا کو کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گی؟"

"ایسی بُری فال زبان سے نہیں نکالتے بیٹی" شمسہ بیگم نے نہایت اپنائیت سے عاشی کو کھینچ کر اپنی کشادہ آغوش میں پناہ دیتے ہوئے کہا "قدرت جو کچھ کرتی ہے اُس میں بندے کی بھلائی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور مضمر ہوتا ہے اور پھر ہمارے ہوتے تمہیں پریشان ہونے کی بھلا کیا ضرورت ہے ـــــ"

"لیکن آنٹی ـــــ وہ' بابا تو بالکل چپ ہو گئے ہیں" عاشی نے رندھی ہوئی آواز میں بتایا "میں نے انھیں آوازیں بھی دی تھیں لیکن انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا ـــــ کہیں ـــــ"

"صبر سے کام لو میری بچی" شمسہ بیگم نے جلدی سے کہا "ڈاکٹر صاحب بس آتے ہی ہوں گے"

"آپ عاشی کا خیال رکھیں' میں ممدو کی خیریت دریافت کرنے جا رہا ہوں"

محمود حسین نے عاشی کی گفتگو سے جو اندازہ لگایا تھا اُس کے پیش نظر انھوں نے عاشی کو اپنے ساتھ لے جانا مناسب خیال نہیں کیا چنانچہ اُسے بیوی کے حوالے کر کے ممدو کے کوارٹر کی طرف چل پڑے' عاشی کی پریشانی نے اُن کو بھی پریشان کر دیا تھا ـــــ عاشی کا ایک جملہ رہ رہ کر اُن کے کانوں میں گونج رہا تھا۔

"اگر بابا کو کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گی ـــــ؟"

عاشی کے خیالوں میں گم اُنھوں نے ممدو کے کوارٹر میں قدم رکھا تو پہلی نظر میں خود محمود حسین کا کلیجہ بھی دھک سے رہ گیا لیکن جب انھوں نے آگے بڑھ کر نبض پر ہاتھ رکھا تو اُمید کی کرن روشن ہو گئی ـــــ ممدو کی نبض بڑی مدھم رفتار سے چل رہی تھی ـــــ زندگی نے ابھی دنیا کے ہنگاموں سے اپنا عارضی تعلق ختم نہیں کیا تھا ـــــ شاید کمزوری اور نقاہت کی وجہ سے ممدو بے ہوش ہو گیا تھا اور معصوم عاشی یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ قدرت نے اُس کے سر سے ایک شفیق بزرگ کا سایہ اُٹھا لیا۔

ممدو کے جسم کی حرارتوں کو برقرار رکھنے کی خاطر محمود حسین نے اُس کے سینے کی مالش شروع کر دی ـــــ اس وقت موقع کی نزاکت نے ملازم اور مالک کا فرق مٹا دیا تھا ـــــ یوں بھی محمود حسین ایک اچھے اور بھلے مالس تھے اور ملازموں سے بے حد پیار اور میانہ روی کا سلوک رکھتے تھے اور ممدو کی زندگی تو اچانک ہی انھیں عزیز نظر آنے لگی تھی ـــــ اس لئے کہ ممدو عاشی کا بزرگ تھا ـــــ سرپرست تھا

اور عاشی ـــــ

عاشی۔ اتنے چپکے سے دبے پاؤں محمود حسین کے دل و دماغ میں داخل ہوئی تھی کہ انھیں فوری طور پر احساس بھی نہ ہوا۔

وہ خود اپنی کیفیتوں سے بے خبر تھے ـــــ

لیکن آج ـــــ

آج جب عاشی بے اختیار اُن سے لپٹ کر روئی تو پہلی بار اُن کو احساس ہوا کہ عاشی نہ جانے کب سے اُن کے لاشعور میں گم تھی۔

جیسے وہ ایک عرصے سے اس معصوم وجود سے واقف تھے۔

جیسے عاشی کوئی گم شدہ نگینہ تھا جو ایک طویل مدت کے بعد انھیں اچانک مل گیا تھا۔

ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بھی محمود حسین کو عاشی کی اہمیت کا کبھی اتنی شدت سے احساس نہیں ہوا تھا جتنا آج ہو رہا تھا ـــــ جانے کیسے اور کیوں وہ لاشعور کی قید و بند سے آزاد ہو کر اُن کے شعور میں بیدار ہو گئی تھی ـــــ اور محمود حسین کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ عاشی کو جنم جنم سے جانتے ہوں ـــــ جیسے وہ کوئی غیر نہیں تھی' خود اُن کے وجود کا کوئی حصہ تھی جو انجانے میں کہیں ٹوٹ کر جُدا ہو گئی تھی ـــــ جیسے عاشی کے چہرے کا ایک ایک نقش اُن کے ذہن کے گوشے میں محفوظ تھا ـــــ وقت کی دھول نے اُن جانے پہچانے نقوش کو دُھندلا دیا تھا لیکن آج ـــــ

آج سارے نقش ایک ہی چوٹ میں چمک کر روشن ہو گئے تھے ـــــ یہ نقش بڑے نمایاں' بے حد صاف اور واضح تھے لیکن محمود حسین اُن کی شناخت کرنے سے قاصر تھے ـــــ زندگی کی طویل راہوں اور ان راہوں کے نشیب و فراز میں وہ عاشی کے جانے پہچانے اور مانوس نقش و نگار سے کہیں نہ کہیں ضرور ٹکرائے تھے ـــــ وہ اُسے جانتے تھے ـــــ پہچانتے تھے ـــــ انھوں نے اُسے بہت قریب سے چھو کر دیکھا تھا ـــــ دل کی دھڑکنوں کے زیر و بم میں محسوس کیا تھا ـــــ لیکن کہاں؟

محمود حسین کے ذہن میں آندھیاں چلنے لگیں ـــــ بگولے سے چکرانے لگے' عاشی کے تصور نے اچانک اُن کے وجود کو نہ جانے کیوں جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا ـــــ وہ اُس کی شناخت میں گم ہونے لگے .....

اگر تعلق اتنا گہرا تھا تو پھر وہ اب تک بے خبر کیوں رہے ـــــ

آج سے پہلے عاشی کو دیکھ کر اُن کے لاشعور کی لہروں میں کوئی جنبش' کوئی حرارت کیوں نہیں پیدا ہوئی۔

اس تغافل کی وجہ کیا تھی؟ ـــــ

کیا سبب تھا ـــــ؟

اور آج ـــــ ایک لمحے میں ـــــ اچانک ـــــ ایک دم سے عاشی ان کے ذہن پر کس طرح مسلط ہو گئی ـــــ

کیا وہ صرف انسانیت اور ہمدردی کا جذبہ تھا ـــــ یا

ایک معصوم کے بے سہارا ہونے کا احساس ـــــ جس نے انجانے رشتوں کو خون کا رنگ دے دیا تھا۔

عاشی کیا تھی ـــــ؟

کون تھی ـــــ؟

کوئی واہمہ؟ ـــــ جو حقیقت کا روپ دھار کر سامنے آ گیا ـــــ

کوئی تصور؟ ـــــ جو بال و پر کی صورت میں نمودار ہو رہا تھا ـــــ

ـــــ کوئی بھٹکا ہوا خواب جو عاشی کی شکل میں ایک مبہم سی تعبیر بن کر سامنے آ گیا تھا ـــــ یا

وہ محض ایک بے جان سی کنکری تھی جس نے سطح آب پر گر کر بلا وجہ اُس کے سکون کو برباد کر دیا تھا ـــــ ٹھہرے ہوئے پُرسکون پانی میں لہروں کے جال پیدا کر دیئے تھے۔

تلاطم بیدار کر دیا تھا ـــــ

تلاطم ـــــ جو آہستہ آہستہ طوفان کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا ـــــ اور

اور پھر ڈاکٹر کے آجانے سے محمود حسین کے خیالوں کا شیرازہ ٹوٹ کر بکھر گیا ـــــ وہ خوابوں کی دنیا سے نکل کر حقیقت سے دوچار ہو گئے۔ ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہو کر بولے

"سوری ڈاکٹر ـــــ میں نے اتنی رات گئے آپ کو زحمت دی لیکن ممدو کی حالت خاصی تشویشناک ہو گئی تھی۔"

"کسی ملازم کے ساتھ ہسپتال بھیج دیا ہوتا۔" ڈاکٹر نے کوارٹر کے ماحول کو ناگوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں صبح اٹنڈ کر لیتا۔"

"بہرحال ـــ اب آپ تشریف لے آئے ہیں تو اُس کا تفصیلی معائنہ بھی کر لیں ـــــ" محمود حسین نے مؤدبانہ سے جواب دیا۔

ڈاکٹر کو محمود حسین کی حیثیت کا خیال آیا تو اُس نے آگے بڑھ کر نہایت توجہ سے ممدو کی حالت کا جائزہ لینا شروع کر دیا، کچھ دیر تک کوارٹر میں گہری خاموشی طاری رہی، ڈاکٹر نے ضروری معائنے کے بعد فوری طور پر ایک انجکشن دیا پھر ممدو کے چہرے پر نظریں جماتا ہوا محمود حسین سے مخاطب ہوا

"یہ آپ کا کوئی خاص ملازم ہے ـــــ"

"یہ میرا لے پالک ہے ڈاکٹر ـــــ میرے لان کی ہریالی اور مہک اسی کے دم سے قائم ہے۔" محمود حسین نے قدرے جذباتی انداز میں جواب دیا پھر بولے ـــــ "کیا کوئی خاص بات ہے ـــــ"

"ہو بھی سکتی ہے ـــــ میں فی الحال یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن جہاں تک میرا خیال ہے آپکے مال کو تپ دق کا عارضہ لاحق ہے۔"

"اوہ نو ڈاکٹر ـــــ" محمود حسین چونک اٹھے۔

"میں نے بیہوشی دُور کرنے کے لئے انجکشن لگا دیا ہے ـــــ صبح تک اس کی طبیعت بہتر ہو جائے گی لیکن میرا مشورہ ہے کہ آپ اسے پہلی فرصت میں ضروری معائنہ کے بعد سینی ٹوریم میں داخل کرا دیں ـــــ گھر میں اس کی موجودگی دوسرا فرد کے لئے بھی مخدوش ثابت ہو سکتی ہے ـــــ"

"آل رائٹ ڈاکٹر ـــــ میں اسے صبح ہی چیک کرا لوں گا لیکن آپ سے ایک گزارش ہے۔"

"حکم دیجئے مسٹر محمود ـــــ"

"ممدو کی بیماری کی نوعیت کا اظہار آپ اور کسی پر نہیں کریں گے۔" محمود حسین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "میری والدہ سے بھی نہیں ـــــ"

"بہتر ہے ـــــ مگر اس میں کیا کوئی خاص مصلحت ہے۔"

"جی ہاں ـــــ" محمود حسین نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ "آپنے غالباً عاشی کو کبھی دیکھا ہوگا۔"

"کیوں نہیں ـــــ ماشاء اللہ بڑی اسمارٹ اور ذہین بچی ہے، لیکن ـــــ"

"ممدو عاشی کا سرپرست اور بزرگ ہے ڈاکٹر۔" محمود حسین نے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ ممدو کی بیماری کسی طرح بھی عاشی کے معصوم ذہن یا اُس کی پڑھائی پر اثر انداز ہو ـــــ"

"آئی سی ـــــ میں سمجھ رہا ہوں آپ کا مقصد۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "مطمئن رہیئے ـــــ آپ کے ملازم کی بیماری کا علم کسی اور کو کم از کم میری زبانی نہیں ہوگا ـــــ"

"شکریہ ڈاکٹر ـــــ"

محمود حسین ڈاکٹر کو رخصت کر کے واپس لوٹے تو عاشی اور شمسہ بیگم بھی ممدو کے کوارٹر میں موجود تھیں۔

"انکل، میرے بابا کی طبیعت ـــــ"

"بالکل ٹھیک ہے۔" محمود حسین نے عاشی کا جملہ مکمل ہونے سے پیشتر ہی مسکرا کر کہا۔ "تم نے تو ہمیں پریشان ہی کر دیا تھا۔"

"سوری انکل ـــــ" عاشی نے شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا پھر جلدی سے پوچھا۔ "بابا کو ہوش کب آئے گا ـــــ ڈاکٹر نے کیا بتایا ہے ـــــ کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے۔"

"تمہارے بابا کو صبح تک ہوش آجائے گا ـــــ ڈاکٹر نے نیند کا انجکشن لگا دیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔" محمود حسین نے عاشی کو یقین دلاتے ہوئے کہا۔ "البتہ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ اگر تمہارے بابا کو ہسپتال میں رکھ کر علاج کیا جائے تو یہ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے ـــــ"

"ہسپتال میں بابا کو تکلیف تو نہیں ہوگی۔" عاشی نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"تکلیف کیسی ـــــ وہاں تو ہر وقت ڈاکٹر اور نرسیں تمہارے بابا کا خیال رکھیں گی۔" محمود حسین نے عاشی کو پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "وقت پر دوا ملے گی ـــــ وقت پر کھانا ملے گا اور ہر طرح سے آرام کا خیال بھی رکھا جائیگا۔"

"تو پھر آپ بابا کو کسی اچھے سے ہسپتال میں داخل کرا دیں ـــــ لیکن ـــــ" عاشی کچھ کہتے کہتے یکلخت سہم کر خاموش ہو گئی نظریں گھما کر ممدو کو دیکھنے لگی جو ابھی تک غفلت سے دوچار تھا۔

"لیکن کیا عاشی بیٹی۔" شمسہ بیگم نے اپنائیت سے پوچھا۔ "تم کچھ کہتے کہتے رک کیوں گئیں ـــــ"

"مجھے بتاؤ بیٹی ـــــ" محمود حسین بولے۔ "کیا بات ہے ـــــ"

"میں نے ایک بار بابا کو آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن ـــــ بابا نے انکار کر دیا تھا، مجھے ڈانٹا بھی تھا۔" عاشی دبی زبان میں بولی۔

"کیوں ـــــ اس میں بھلا ڈانٹنے کی کیا بات تھی۔" شمسہ بیگم نے پیار سے دریافت کیا۔

"وہ ـــــ بابا کہہ رہے تھے کہ اگر انھوں نے آرام کیا تو کوارٹر خالی کرنا پڑے گا ـــــ اور انکل دوسرا مال رکھ لیں گے تو ہم لوگ کھائیں گے کہاں سے۔" عاشی نے نظریں جھکا کر بڑی سادگی سے کہا ـــــ "بس، بس اسی بات پر بابا مجھ پر خفا ہو گئے تھے۔"

"تم نے بابا کو یہ کیوں نہیں بتایا کہ تم میری بیٹی ہو ـــــ" شمسہ بیگم نے عاشی کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"خیر کوئی بات نہیں ـــــ ہوش آنے دو مالی بابا کو ـــــ میں خود بات کروں گی ـــــ"

محمود حسین نے عاشی کی بات سُن کر اپنا چہرہ جلدی سے دوسری سمت کر لیا، عاشی کے لہجے کی سادگی اور معصومیت نے نہ جانے کیوں انھیں تڑپا دیا تھا ـــــ اُن کی آنکھوں کے گوشے نمناک ہونے لگے تھے اور وہ اِن آنسوؤں کو ظاہر کر کے عاشی کو پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے

چنانچہ اُنھوں نے عاشی سے نظریں بچا کر جلدی سے اپنے آنسوؤں کو خود اپنے ہی دامن کی وسعتوں میں جذب کر لیا ـــــ !!

شائستہ بیگم ورانڈے میں بچھے تخت پر بیٹھی فراز کے قمیص کے ٹوٹے بٹن ٹانک رہی تھیں، کریمن اُن کے قریب ہی مونڈھے پر بیٹھی سوپ میں چاول پھٹک رہی تھی۔

ڈھلتے سورج کی الوداعی کرنیں صحن میں لگے یوکلپٹس کے درخت کی پھننگیوں کو چوم کر دیوار پر سرکنے لگیں تو کریمن نے آہستہ سے کہا۔

"بیگم صاحبہ ـــــ فراز میاں آج ابھی تک کیوں نہیں آئے۔"

شائستہ بیگم نے نظریں گھما کر گھڑی دیکھی، شام کے پونے چھ کا عمل ہو رہا تھا، فراز عام طور سے پانچ بجے تک اسکول سے واپس آجاتا تھا لیکن دیر سویر بھی ہو جاتی تھی ـــــ بہرحال کریمن کی مجہت کے پیش نظر وہ تخت پر پہلو بدل کر بولیں۔

"تم نے تو کہا تھا کہ تمہیں گھڑی دیکھنی نہیں آتی ـــــ پھر فراز کو دیر ہو جانے کا اندازہ تمہیں کیسے ہو گیا۔"

"دھوپ اب منڈیر تک لوٹ چکی ہے بیگم صاحب۔" کریمن نے چاول پھٹکتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "فراز میاں تو روز ناز بہت جلدی آجاتے تھے ـــــ"

"اب بھی ـــــ" شائستہ بیگم مسکرائیں۔ "تم نے دھوپ سے وقت کا اندازہ لگایا ہے۔"

"زندگی میں دھوپ چھاؤں کے سوا اور دھرا بھی کیا ہے ـــــ" کریمن بولی۔ "یہ موئے گھڑی گھنٹال تو انگریز

اپنے ساتھ ولایت سے لے کر یہاں آئے تھے ورنہ پہلے زمانے کے لوگ تو دھوپ گھڑی ہی سے وقت کا اندازہ لگاتے تھے۔"

"یہ تمہیں کس نے بتایا کہ گھڑی انگریز اپنے ساتھ لائے تھے۔"

"اور کون لا سکتا ہے اُن کے سوا ——" کریمن نے قدرے ناخوشگوار لہجے میں جواب دیا۔ "جو سچ پوچھو بیگم صاحب تو ہمارے ملک میں آج جتنی بُرائیاں نظر آ رہی ہیں، وہ سب کی سب انہیں گوری چمڑی والوں کے طفیل ہیں —— جب سے ان مونڈی کاٹنوں نے ہماری زمین پر قدم رکھا ہے یہاں کی آب و ہوا ہی بدل کر رہ گئی ہے۔"

"اچھا ——" شائستہ بیگم نے وقت گزاری کے لئے کریمن کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا "تمہاری معلومات تو خاصی وسیع معلوم ہوتی ہیں —— لیکن یہ آب و ہوا تبدیل ہونے والی بات میرے پلے نہیں پڑی۔"

"اب میں اتنی پڑھی لکھی تو ہوں نہیں کہ آپ کو ٹھیک طرح سے سمجھا سکوں مگر یہ آب و ہوا والی غلط بھی نہیں ہے۔" کریمن نے چاولوں کو سُوپ میں سمیٹتے ہوئے کہا پھر سوپ کو تخت پر رکھتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے بولی "اب جیسے حیا نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی —— جسے دیکھو کٹی پتنگ کی طرح ننگے سر ڈولتا چلا جا رہا ہے اور آجکل کی لڑکیاں —— توبہ، توبہ —— اُن کے تو دیدے کا جیسے پانی ایک دم ہی مر چکا ہے، مردوں کے ساتھ سانجھ بازاروں میں کولھے مٹکاتی پھرتی ہیں —— نہ بزرگوں کا لحاظ نہ چھوٹوں کی تمیز —— نہ آنکھوں میں شرم باقی رہ گئی ہے —— ایک وہ زمانہ تھا جب ڈولیاں ڈیوڑھی پر آکر دروازوں سے لگتی تھیں، کیا مجال جو کہار بھی سواری کی ایک جھلک دیکھ پاتا ——"

کریمن اپنی جھونک میں بدلتے وقت کی رفتار کا تذکرہ کرتی رہی اور شائستہ بیگم بیٹھی مسکراتی رہیں

کریمن کی عمر کچھ ایسی زیادہ بھی نہیں تھی۔ ادھیڑ عمر کی قبول صورت عورت تھی لیکن جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی اس لئے حالات نے اُسے دل برداشتہ اور قدرے چڑچڑا بنا دیا تھا مگر تھی پُرخلوص اور ایماندار —— انگریزوں کے نام سے اللہ واسطے کا بیر ہو گیا تھا اسی لئے انگریزوں کا ذکر آتے ہی اُس کے اچھے بھلے تیور ایک دم ہی بدل جاتے اور جب تک وہ دل کی بھڑاس نہ نکال لیتی زبان قینچی کی طرح چلتی رہتی۔

انگریزوں سے کریمن کی نفرت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کا شوہر نشے کی حالت میں ایک حادثے سے دوچار ہو کر کریمن کے ہاتھوں کی شہابی چوڑیوں کو چکنا چور کر گیا تھا اور کریمن کا خیال تھا نہ انگریز آتا —— نہ دارو اپنے ساتھ لاتا —— نہ اُس کا شوہر نشے کی حالت سے دوچار ہوتا اور نہ وہ بیوہ ہوتی۔

غرضیکہ اس وقت بھی کریمن دل کھول کر انگریزوں کی ذات پر اپنا بخار اتار رہی تھی، پھر وہ سانس لینے — دم بھر کو رُکی تو شائستہ بیگم نے موضوع بدلتے ہوئے کہا

"بوا —— لہسن اور سُرخ مرچ کی چٹنی پیسنا بھول جانا، دال چاول کے ساتھ چٹنی یا اچار نہ ہو تو منہ کا ذائقہ سویا سویا لگتا ہے اور فراز کو تو چٹنی بے حد پسند ہے ——"

"پیس لوں گی بیگم صاحبہ۔" کریمن ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی پھر اُس کی نظر منڈیر پر پڑی تو دھوپ کی آخری کرنیں وہاں سے بھی رخصت ہو چکی تھیں، اُس نے یکلخت سنجیدگی سے پوچھا "بیگم صاحبہ —— کیا فراز میاں کہہ گئے تھے کہ دیر سے واپس آئیں گے۔"

"بوا —— یہ آج تمہیں فراز کا اتنا خیال کیوں آ رہا ہے۔" شائستہ بیگم نے تبسم زیر لب کرتے ہوئے پوچھا پھر اس خیال سے کہ کہیں کریمن بُرا نہ مان جائے جلدی سے بات بناتے ہوئے بولیں "میرا مطلب ہے کہ اکثر اُسے سواری ملنے میں دیر بھی ہو جاتی ہے —— بس، آتا ہی ہوگا ——"

"خدا سلامت رکھے —— زندگی کے ہر امتحان میں کامیابی و کامرانی سے دوچار کرے۔" کریمن نے دعائیں دیتے ہوئے کہا "بڑا ہی ذہین اور سعادتمند بچہ ہے۔"

"لیکن تمہیں تو وہ وقت ناوقت چھیڑتا بھی رہتا ہے۔" شائستہ بیگم نے کریمن کے اُجڑے چہرے پر ممتا کی ویران بہاروں کو لہراتے دیکھ کر پوچھا "تمہیں اُس کی چھیڑ خانی بُری تو نہیں لگتی ——"

"کیسی بات کرتی ہو بیگم صاحبہ —— میں اور فراز میاں کی چھیڑ چھاڑ کا بُرا مناؤں گی —— یہ کیا کہا آپ نے۔" کریمن نے بے چین ہو کر جلدی سے کہا "بچے اگر شرارت نہ کریں تو کُند ذہن رہ جاتے ہیں۔"

"فراز تمہیں بہت اچھا لگتا ہے —— کیوں بوا۔"

"ایک بات کہوں بیگم صاحبہ بُرا نہ ماننا۔" کریمن نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا "اگر مجھے فراز میاں سے پیار نہ ہوتا تو میں اس دہلیز پر ایک دن بھی نہ ٹکتی —— سچ پوچھو تو اس گھر میں میرا پڑاؤ فراز میاں کے دم ہی سے ہے۔"

"میں جانتی ہوں بوا ——" شائستہ بیگم مسکرا کر بولیں "تمہاری اسی چاہت اور اپنائیت نے تو فراز کو شوخ بنا دیا ہے۔"

"اللہ اس کے نصیب اچھے کرے —— عمر دراز کرے —— جگ جگ سکھی رہے۔"

"آمین ——" شائستہ بیگم نے جلدی سے کہا۔

اُسی وقت دروازے پر دستک ہوئی تو کریمن کے چہرے پر اچانک سُرخی آ گئی، تیزی سے اُٹھ کر اُس نے دروازہ کھول دیا، آنے والا اُس کی توقع کے عین مطابق فراز ہی تھا۔

"سلام بوا ——"

"جیتے رہو میرے چاند ——" کریمن نے فراز کے سلام کے جواب میں ڈھیر ساری دعائیں دیتے ہوئے کہا۔ "آج اتنی دیر کہاں ہو گئی۔"

"میں ذرا ناجیہ کی طرف چلا گیا تھا۔"

"اچھا —— اچھا ——" کریمن نے نہ جانے کیوں مسکراتے ہوئے ممتا بھری نظر فراز پر ڈالی پھر اُس کی بلائیں لیتے ہوئے واپس پلٹی اور چاول اُٹھا کر باورچی خانے کی سمت چل گئی۔

"ناجیہ کے ہاں سب لوگ خیریت سے تو ہیں۔" شائستہ بیگم نے پیچھے سے دریافت کیا۔

"باقی سب لوگ تو ٹھیک ہیں لیکن عاشی کے بابا کی طبیعت بہت خراب ہے ممدو بے چارے کی۔"

"یہ بات تو ناجیہ اور عاشی کو نہیں پتہ مگر عاشی کہہ رہی تھی کہ مالی بابا ——" مانسی کا دورہ پڑا تھا اور منہ سے خون بھی آیا تھا۔"

"خون بھی آیا تھا ——" شائستہ بیگم چونکیں۔

"جی ہاں —— لیکن عاشی بتا رہی تھی کہ مالی بابا بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے، ڈاکٹروں نے یہی کہا ہے کہ ہسپتال میں زیادہ بہتر علاج ہو سکتا ہے۔"

"شمسہ اور محمود کیسے ہیں ——"

"ماموں جان گھر پر نہیں تھے ——" فراز نے جواب دیا "ممانی جان خیریت سے ہیں، آپ کے لئے دریافت کر رہی تھیں۔"

"اچھا —— اب تم لباس تبدیل کر کے ناشتہ کر لو۔" شائستہ بیگم نے اٹھتے ہوئے کہا پھر ناشتہ تیار کرنے کے لئے باورچی خانے میں چلی گئیں۔

فراز کو ناشتہ کرانے کے بعد وہ دوگھڑی اپنے کمرے میں آرام کرنے کی غرض سے داخل ہوئی تھیں کہ محمود حسین آ گئے۔ فراز ناشتہ کرنے کے بعد پڑوس میں اپنے ایک دوست کے پاس چلا گیا تھا اس لئے شائستہ بیگم محمود حسین کے ساتھ اپنے مختصر سے ڈرائنگ روم میں آ گئیں جو مختصر ہونے کے باوجود اپنے مکینوں کے سلیقے اور ذوق کی منہ بولتی مثال تھا۔

"آج فراز تمہاری طرف گیا تھا۔" شائستہ بیگم نے کچھ دیر کی رسمی باتوں کے بعد کہا "وہ بتا رہا تھا کہ ممدو کی طبیعت کچھ خراب ہے اور اُسے ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا ہے۔"

"ہاں —— ممدو کو دراصل ٹی بی ہو گیا ہے۔" محمود حسین بولے "میں نے ڈاکٹروں کے مشورے پر اُسے سینی ٹوریم میں داخل کرا دیا ہے۔"

"خدا رحم کرے اس غریب پر! —— کیا عاشی کو علم ہو گیا ہے کہ ممدو کو یہ موذی مرض لاحق ہے۔"

"نہیں —— فی الحال ہم نے اُسے مرض کی نوعیت سے آگاہ نہیں کیا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ تم اب اُس کے باپ کو تار دے کر بلوا لو" شائستہ بیگم بولیں" ایسی صورتِ حال میں اسے عاشی اور ممدو کے پاس ہونا بہت ضروری ہے ——"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں" محمود حسین بولے "کل سینی ٹوریم جاؤں گا تو ممدو سے عاشی کے باپ کا پتہ دریافت کروں گا"

"عاشی کو علم ہوگا تو اُس غریب کے دل پر کیا گزرے گی" شائستہ بیگم نے کہا" بے چاری ایک تو شروع سے ماں کے سائے سے محروم رہی —— باپ دولت کمانے کی دھن میں ایسا باہر گیا کہ پلٹ کر خبر تک نہ لی اور لے دے کر ایک بے چارہ ممدو رہ گیا تھا تو وہ بھی اپنی جان کو روگ لگا بیٹھا —— خدا عاشی پر رحم کرے —— بڑی ہی معصوم ذہین اور نیک بچی ہے"

"آپا ——" محمود حسین ممدو کی علالت اور عاشی کی لاوارثی کے ذکر سے ملول ہو کر بولے" آپ نے کبھی عاشی کو غور سے دیکھا ہے"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی ——" شائستہ بیگم نے وضاحت طلب انداز میں دریافت کیا" تم کیا پوچھنا چاہتے ہو ——"

"ممکن ہے یہ میرا وہم ہو —— لیکن —— لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں عاشی کو بہت پہلے سے جانتا ہوں —— جیسے میں اُسے پہلے بھی بہت قریب سے دیکھ چکا ہوں"

"اوہ ——" شائستہ بیگم سر و آہ بھر کر بولیں" میں سمجھ رہی ہوں تمہارا مقصد —— عاشی ایسی ہی معصوم اور بھولی بھالی بچی ہے کہ جو بھی اُسے دیکھتا ہے پیار کا برتاؤ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، بڑی پُرکشش اور جاذبِ زیب بچی ہے"

"کیا آپ بھی ایسا ہی محسوس کرتی ہیں جیسا میں محسوس کر رہا ہوں" محمود حسین نے سنجیدگی سے کہا" کیا آپ کو بھی عاشی جانی پہچانی سی لگتی ہے ——"

"میرا خیال ہے کہ ممدو کی بیماری کا تم نے اپنے دل پر بہت گہرا اثر لیا ہے" شائستہ بیگم محمود حسین کو بغور دیکھتے ہوئے بولیں" تمہیں اپنی صحت کا خاص خیال رکھنا چاہیئے —— رہا عاشی کا مسئلہ تو خدا نے اُسے تمہارے گلے کے سپرد کر کے اُس کے مستقبل کو بھی محفوظ کر دیا ہے، ثمینہ اس سے بے حد اپنائیت کا برتاؤ کرتی ہیں، ناجیہ بالکل بہنوں جیسا سلوک کرتی ہے اور تم —— میرا اندازہ اگر غلط نہیں ہے تو عاشی کی معصومیت نے شاید تمہیں بھی اپنا گرویدہ بنا لیا ہے ——"

"شاید ——" محمود حسین نے آہستہ سے کہا

"اگر تم مناسب سمجھو تو عاشی کو کچھ دنوں کے لئے میرے پاس چھوڑ دو —— یہاں اُس کی طبیعت بھی بہل جائے گی اور میری تنہائی بھی کچھ دنوں کے لئے دور ہو جائے گی" شائستہ بیگم بولیں" موجودہ حالت میں عاشی کا ممدو سے دور رہنا بہرحال ضروری ہے ورنہ خدانخواستہ اگر ممدو کے جراثیم عاشی کو بھی لگ گئے تو بہت بُرا ہوگا"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ عاشی کو چند دنوں کے لئے آپ کے پاس چھوڑ دوں" محمود حسین بھی ہولے آواز میں بولے" گزشتہ دو تین روز سے وہ برابر بضد ہے کہ میں اُسے اپنے ساتھ ہسپتال لے چلوں اور میں ہر بار کوئی بہانہ کر کے اُسے ٹال دیتا ہوں مگر —— کب تک"

"تم پریشان مت ہو —— خدا جو کرے گا بہتر ہی کرے گا"

"آپا —— اگر عاشی کو ممدو کی بیماری کی اصلیت کا پتہ چل گیا تو اُس کے معصوم دل پر کیا گزرے گی"

"جو زخم دیتا ہے وہی اُس کی دوا بھی پیدا کر دیتا ہے" شائستہ بیگم نے کہا" خدا پر بھروسہ رکھو عاشی کو ایک نہ ایک دن تو معلوم ہونا ہی ہے —— میرا خیال ہے کہ عاشی ذہین ہونے کے ساتھ حوصلہ مند بھی ہے"

"خدا کرے ایسا ہی ہو ——"

"ممدو ——"

"جی ——"

"میں محسوس کر رہی ہوں کہ تم ممدو کی علالت سے خاصے پریشان ہو"

"عاشی کا خیال مجھے پریشان کر دیتا ہے" محمود حسین پھر پلٹ کر بولے" وہ —— ہمارا بھونڈو کہاں ہے، نظر نہیں آ رہا ——"

"پڑوس میں گیا ہے —— بلواؤں"

"رہنے دیجئے" محمود حسین اُٹھتے ہوئے بولے، اس وقت ذرا جلدی بھی ہے، پھر کسی وقت فرصت سے آؤں گا ——"

"ایک پیالی چائے تو پیتے جاؤ —— ایسی بھی کیا جلدی"

"چائے اُدھار رہی —— پھر آؤں گا تو ایک کے بجائے دو پیالی پی لوں گا" محمود حسین نے سنجیدگی سے کہا بھرائے ہوئے انداز میں پلٹے اور قدم مارتے رخصت ہو گئے ——!

شائستہ بیگم محمود حسین کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک اُن کی پریشانی اور اُلجھن کا سبب سوچتی رہیں۔

✱ ✱

راحیلہ خاتون نے لاہور واپس آ کر جو وطیرہ اختیار کر لیا تھا وہ افتخار احمد کے لئے قطعی غیر متوقع تھا۔ شادی کے بعد سے افتخار احمد نے کبھی بیوی کا دل نہیں دکھایا تھا۔ اُن کی ہر بات اور ہر اشارے پر سرِ تسلیم خم کر دیا تھا، راحیلہ خاتون ہی کے ایما پر وہ بوڑھے بیمار باپ اور جوان بہن کو خدا کے سپرد کر کے کاروبار کے سلسلہ میں لندن چلے گئے تھے —— اس میں افتخار احمد کی کچھ اپنی غرض بھی شامل تھی۔ دولت مند اور راتوں رات بڑا آدمی بننے کے لالچ نے اُن کے ذہن کو معطل کر دیا تھا، اُن کی بینائی کمزور کر دی تھی —— اس حد تک کہ انھیں سسرال کی امارت اور راحیلہ خاتون کی شکل کے سوا اور کچھ نہیں دکھائی دے رہا تھا۔

لندن کے قیام کے دوران افتخار احمد نے جان مار کر شب و روز محنت کی تھی اور کاروبار کو پھیلانے اور جمانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ اُن کی دن رات کی محنت ہی کا نتیجہ تھا کہ راحیلہ کے باپ کو برونی منڈی میں قدم جمانے کا موقع مل گیا تھا۔

راحیلہ کا کاروبار دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا رہا —— افتخار احمد نے ماضی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں جو خواب دیکھے تھے وہ ایک ایک کر کے روشن تعبیر کی صورت میں سامنے آ رہے تھے۔ اُن کے پاس موٹر گاڑی تھی، نوکر چاکر تھے، سیکرٹریوں ماتحت تھے جو اُن کے اشارے پر پھرکی کی مانند ایک پیر پر ناچنے کے لئے ہر وقت آمادہ رہتے اور سب سے بڑی بات اُن کا بینک بیلنس تھا۔

بے حساب دولت تھی ——

دولت ——

جو اپنے اندر دنیا جہان کی خوشیاں خریدنے کی قوت رکھتی ہے

دولت ——

جس کے بل بوتے پر انسان کی ہر آرزو —— ہر خواہش پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے۔

جس کی جھنکار سُن کر بنی نوع انسان ہپناٹک ہوئے بدمست شرابی کی طرح مدہوش ہو جاتا ہے۔

جس کی جھنکار آدمی کو ہر چیز سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

بے فکر بنا دیتی ہے۔

افتخار احمد بھی دولت کے انبار تلے دب کر کاروبار کو زندگی سمجھ بیٹھے تھے، راحیلہ خاتون نے زندگی کے اس نئے موڑ پر ہر ہر قدم پر اُن کی رہنمائی کی تھی اس لئے افتخار احمد نہ صرف یہ کہ بے حد شکر گزار تھے بلکہ اُن کے کسی حکم سے سرتابی کی ہمت بھی کبھی نہ کرتے تھے اور اسی ڈھیل نے راحیلہ خاتون کو کھلی چھٹی دے دی تھی۔

لندن، امریکہ، فرانس اور دوسرے ممالک کی تہذیب سے راحیلہ خاتون بے حد متاثر ہوئی تھیں۔ اپنے "سوشل" کی چھاپ لگا لینے کے بعد اُن کی مصروفیات بھی اس درجہ بڑھ گئی تھیں کہ وہ اپنا زیادہ تر وقت گھر سے باہر ہی گزارتیں اور جب اپنی بے پناہ مصروفیات سے تھک کر ——— چور ہو کر واپس گھر لوٹتیں تو اُن کے ذہن سوچ سکت نہیں ہوتی تھی کہ وہ گھر یا گھر کے مکینوں کے بارے میں کچھ سوچ سکتیں۔

افتخار احمد نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو نئے سانچوں میں ڈھال لیا تھا لیکن لاہور واپسی کے بعد جب انھیں فائزہ کے حالات کا علم ہوا تو وہ تڑپ کر رہ گئے۔ مرحوم باپ کے بعد ایک فائزہ ہی تھی جو کے اپنے خون کی آخری نشانی رہ گئی تھی لیکن وقت نے اس نشانی کو بھی مٹا دیا تھا۔

بہن کے خط کا ایک ایک لفظ آری بن کر افتخار احمد کے دل و دماغ پر چلتا رہا۔ انھوں نے ہر اس جگہ پر فائزہ کو تلاش کیا جہاں سے سُراغ کی ایک ذرا بھی توقع تھی لیکن اُن کی کوششیں بار آور ثابت نہ ہوئیں۔ حلقوں سے وہ اس لئے پوچھ گچھ سے کتراتے تھے کہ وہ انھیں اپنی شکل دکھانے کے قابل نہیں رہ گئے تھے۔

تہذیب اور تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا تو افتخار احمد کی راتوں کی نیند اور دن کا چین سب جاتا رہا۔ کی یاد انھیں کسی کروٹ سکون کا ایک سانس نہ لینے دیتی، عائشہ کے معصوم وجود کا تصور اُن کے ذہن کے پردوں دُھندلے دھندلے خاکوں کا روپ دھار کر اُبھرتا تو وہ تڑپ اُٹھتے ——— آنسوؤں سے چہرہ تر کر لیتے ——— تنہائی میں بیٹھ کر سسکتے رہتے اور پھر تھک ہار کر زندگی گزارنے کی خاطر شب و روز میں گم ہو جاتے۔

بزرگوں کا کہنا ہے کہ مرد جب بیرونی ماحول سے اکتا جاتا ہے تو گھر کی چہار دیواری میں پناہ حاصل کرتا ہے۔ ر کی جگمگاہٹیں اُسے بہت جلد اپنی چکاچوند سے متاثر کر لیتی ہیں ——— بھنورے کی مانند وہ ہر ایک خوبصورت اور پھولوں کی آغوش میں قیام کا عادی بن جاتا ہے لیکن جب زمانے کی ٹھوکر اُسے خوابِ غفلت سے بیدار کرتی ہے تو وہ کی طرف تھکا ہارا واپس لوٹتا ہے اور اُس وقت اُس کا سب سے بڑا سہارا اُس کی اپنی شریکِ حیات ہوتی ہے جس کشادہ آغوش میں چھپ کر وہ ایک بار پھر سکون محسوس کرتا ہے۔

افتخار احمد کو گردشِ حالات نے کچوکے لگائے ——— زندگی کی حرارتوں نے اچانک سرد مہری کا احساس کیا تو انھیں اپنی خامیوں ——— اپنی کوتاہیوں کی بڑی شدت سے احساس ہوا ——— اُن کا سر ندامت سے جھک شرمندگی نے لمحہ بھر کی تو وہ لڑکھڑا کر رہ گئے لیکن یہ اظہار بعد از وقت تھا۔

وقت ——— جو افتخار احمد کے ہاتھوں سے نکل کر بہت پیچھے ماضی کے اندھیروں میں کہیں گم ہو گیا اُس وقت کا لوٹنا ناممکن تھا ——— اب تو صرف احساس رہ گیا تھا جو دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ساتھ باقی عمر گن گن کر گزار رہا تھا ——— کاٹ رہا تھا ——— اور پھر

پھر جب اچانک انھیں فائزہ کی موت کی خبر ملی تو انھیں یوں محسوس ہوا جیسے دنیا کی پرواز دنیا کے بیچ کسی ویران گھاٹی کے اوپر معلق ہو کر رہ گئی ہو ——— انھیں سینے کے اندر اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا ——— امید کرن جو تاریکیوں کے چھٹنے کے لئے مستقبل کی خوشیوں کا ایک سہارا تھی جب اچانک ڈوبی تو ہر سمت گھپ اندھیرا پھیل گیا ——— تاریکی کے ہولناک سناٹے اپنا دامن وسیع کرنے لگے ——— اور

یہی وہ وقت تھا جب افتخار احمد کو راحیلہ خاتون کے پیار کی ضرورت تھی ——— آغوش کی وہ کشادگی تھی جو اُن کے غموں کو تھپک تھپک کر وقت کا مرہم عطا کر سکتی ——— اُن کے درد کا درماں اور غموں کا مداوا لیکن راحیلہ خاتون کو اپنی مصروفیات اور "سوشل کاموں" سے اتنی فرصت کہاں تھی جو وہ شوہر کے غم کو محسوس کر سکتیں اور اُن کی یہی بے اعتنائی اور عدم توجہی افتخار احمد کے گھریلو گھاؤ کے کی شکل اختیار کرتی گئی۔

دولت کی جھنکار اب افتخار احمد کے لئے بڑی کرناک تھی۔

سکوں کی کھنک جو عارضی خوشیوں کے خریدنے کی طاقت رکھتی ہے۔ افتخار احمد کے کھوئے ہوئے اور اجڑی ہوئی بہاروں کے سلسلے میں مٹی سے بھی بدتر ثابت ہوئی۔

عزت اور شہرت جس کے پیچھے افتخار احمد منہ زور گھوڑے کی مانند سرپٹ دوڑ رہے تھے اب اُن کے کسی بہنیں تھی۔

اونچے حلقوں میں اُن کی ساکھ فائزہ کو نئی زندگی نہیں دے سکتی تھی۔

بامِ عروج پر چمکتا ہوا مقدر کا ستارہ رشتوں کے گھاؤ سے ٹکرا کر ایسا غروب ہوا کہ غبار کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔

اس وقت بھی افتخار احمد اسٹڈی روم میں بیٹھے بدلتے حالات کی ستم ظریفیوں پر غور کر رہے تھے جب اُن کا لڑکا اقبال احمد گنگناتا ہوا اندر داخل ہوا۔ باپ کو دیکھ کر وہ ایک لمحے کو رکا پھر اُن کے چہرے پر غموں کے سائے کو نظر انداز دیکھ کر سنجیدگی سے بولا۔

"ڈیڈی ——— آپ کچھ اُداس دکھائی دے رہے ہیں ..... کوئی خاص بات؟"

"نہیں ———" افتخار احمد نے زندگی کے تقاضوں کی سمت لوٹتے ہوئے کہا "محض خیال ہے تمہارا"

"لیکن ——— آپ آج ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سنجیدہ نظر آ رہے ہیں"

"ہاں ——— ہر چیز جو حد سے بڑھ جائے اپنی ہیئت تبدیل کر دیتی ہے" افتخار احمد سنجیدگی سے بولے

"میں ——— کچھ ——— سمجھا نہیں ڈیڈی"

"زندگی کی راہوں پر آگے بڑھنے کے لئے آنکھوں کا کھلا رہنا ضروری ہے ——— ورنہ تجربے ادھورے رہ جاتے ہیں" افتخار احمد نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا ——— "تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ انسان جب بڑی شدت سے قہقہے لگاتا ہے تو اُس کی آنکھوں سے پانی چھلک اُٹھتا ہے اور ——— لیکن تم ان باتوں کو سمجھ نہیں سکو گے"

"ڈیڈی ——— آپ اس وقت یقیناً کچھ پریشان ہیں ——— میرا دل گواہی دے رہا ہے"

"دل کی گواہی سچے صحراؤں میں سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی" افتخار احمد نے ہاتھ مل کر کہا پھر چونک کر پوچھا ——— "تم کہو کوئی کام تھا مجھ سے؟"

"جی ہاں ڈیڈی ——— دراصل .... ایک مشورہ کرنا تھا"

"تمہاری ممی شاید گھر پر نہیں ہیں ———"

"وہ مہاجرین کی امدادی کمیٹی کی میٹنگ میں گئی ہوئی ہیں"

"امدادی کمیٹی ———" افتخار احمد کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ ابھر کر دم توڑ گئی۔ کچھ توقف سے بولے "ہاں ——— تم مجھ سے کچھ مشورہ کرنا چاہتے تھے ———"

"ڈیڈی ——— پندرہ بیس روز میں میرا ایف اے کا نتیجہ آنے والا ہے"

"مجھے علم ہے" افتخار احمد نے بیٹے کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے جواب دیا۔

"مجھے مکمل یقین اور اعتماد ہے ڈیڈی کہ میں ایف اے کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کروں گا"

"اعتماد اور یقین اچھی علامتیں ہیں ——— انسان کو ثابت قدم رکھتی ہیں"

"میرے تمام پرچے اچھے ہوئے ہیں" اقبال نے ٹھوس لہجے میں کہا "ہو سکتا ہے میری فرسٹ ڈویژن آ جائے"

"خدا کرے ایسا ہو ———"

"ڈیڈی ———" اقبال نے اس بار کچھ توقف سے ہچکچاتے ہوئے کہا "میں ایف اے کے بعد کراچی جانے کا ارادہ رکھتا ہوں"

"کراچی ———" افتخار احمد ایک لمحے کو چونکے پھر پوچھا "کراچی جا کر کیا کرو گے؟"

"میں اپنی بقیہ تعلیم کراچی جا کر مکمل کرنا چاہتا ہوں"

"کیوں؟ ——— یہاں لاہور میں کیا خرابی ہے؟"

"بات خرابی کی نہیں ڈیڈی بلکہ ماحول کی ہے اور نہ جانے کیوں یہاں کے ماحول اور ہنگاموں سے مجھے الرجک ہونے لگی ہے"

"ہنگامے تو زندگی کی آخری سانس تک انسان کا تعاقب نہیں چھوڑتے ——— کل کراچی سے تمہارا دل اکتا گیا تو کہاں جاؤ گے؟"

"پلیز ڈیڈی ——" اقبال نے خوشامدانہ انداز اختیار کیا "مجھے کراچی جاکر بی اے کرنے دے دیجئے —— میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو مایوس نہیں کروں گا —— پوری توجہ اور دل جمعی سے پڑھوں اور فرسٹ ڈویژن لاکر دکھاؤں گا —— اٹ از اے پرامس ڈیڈ (IT'S A PROMISE DAD)"

"تمہاری ممی نے کیا کہا ہے ——"

"اُن کا کہنا ہے کہ میں کراچی جاکر رہا تو بُری صحبتوں میں پڑکر بھٹک جاؤں گا" اقبال نے بُرا منہ بنا کر کہا "بھلا یہ بھی کوئی دلیل ہوئی —— تعلیم کے حصول کے لئے تو انسان چین اور جاپان بھی جاتے ہیں"

"ہاں —— آں ——" افتخار احمد نے خلا میں گھورتے ہوئے جواب دیا کچھ دیر اپنی سوچوں میں گم رہے پھر سنجیدگی سے بولے "اگر تم چاہتے ہو کہ بی اے کراچی جاکر کرو تو میری طرف سے تمہیں پوری اجازت ہے"

"اوہ —— تھینکس ڈیڈ..... لیکن ممی .....؟"

"تم کوشش کرو تو شاید تمہاری ممی تمہاری ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیں ——"

"ڈیڈی —— کیا آپ ——"

"نہیں ——" افتخار احمد نے تیزی سے ٹھوس لہجے میں کہا "میں اس سلسلے میں تمہاری ماں سے کوئی گفتگو نہیں کروں گا"

"سمجھنے کی کوشش تو کیجئے ڈیڈی —— ممی نے تو بس ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے کہ میں گھر سے دور رہ کر برباد ہو جاؤں گا"

"اپنی ممی کو یہ سمجھانے کی کوشش کرو کہ انسان کچھ کھو کر ہی کچھ حاصل کرتا ہے" افتخار احمد سپاٹ آواز میں بولے "جب تک ٹھوکر نہ لگے انسان سنبھلنے کی کوشش نہیں کرتا —— یہ سب زندگی کے پختہ کار کی باتیں ہیں، تلخ تجربے..... جنہیں حاصل کئے بغیر انسان تاریکی میں بھٹکتا رہتا ہے —— اپنے آپ کو فریبِ مسلسل میں مبتلا رکھتا ہے اور ——"

"ممی میری بات کبھی نہیں مانیں گی" اقبال نے اکتاتے ہوئے کہا "آپ کی سفارش کے بغیر اجازت ملنا مشکل ہے ——"

"ناممکن تو نہیں ہے —— تم اپنی سی کوشش تو کرو" افتخار احمد سرد آہ بھر کر بولے "بعد کی بات میں دیکھی جائے گی"

"یو آر گریٹ ڈیڈ —— ایکسٹریملی گریٹ"

اقبال... اپنے چہرے پر اُمید کی خوشیاں سجائے اسٹڈی سے چلا گیا تو افتخار احمد ہاتھ ملتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور دبیز قالین پر چہل قدمی کرنے لگے —— اُن کے چہرے کے تاثرات بتدریج تبدیل ہو رہے تھے —— اُن کی آنکھوں میں ایک مخصوص چمک آہستہ آہستہ اُبھر رہی تھی —— ایسی چمک جو عقابوں کی آنکھوں میں اُس وقت اُبھرتی ہے جب وہ اپنے شکار کو دیکھ کر اُسے اپنے پنجوں میں دبوچنے کی جھپٹ پڑنے کے لئے پر تولتا ہے۔

بڑی دیر تک وہ اسٹڈی کے فرش پر اضطرابی کیفیتوں سے دوچار ٹہلتے رہے —— کبھی ٹہلتے رُک کر اچانک کھڑکی سے باہر تاریکیوں میں کچھ تلاش کرنے لگتے پھر دوبارہ ہاتھ مل کر ٹہلنا شروع کر دیتے وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا —— گھڑی کی سوئی اپنے محدود حلقے کے اندر تک تک کر کے اپنا فاصلہ طے کرتی رہی —— پھر اچانک کوٹھی کے بڑے گیٹ پر گاڑی کے مانوس ہارن کی آواز فضا کے سکوت کا سینہ چیرتی ہوئی اُبھری تو افتخار احمد ٹھٹھک کر رک گئے۔ بڑے سیمابی انداز میں گردن گھما کر اُنھوں نے آواز کی سمت کا تعین کیا اُن کے ذہن میں خود اپنے ہی کہے ہوئے جملے صدائے بازگشت بن کر گونجنے لگے!

"جب تک ٹھوکر نہ لگے انسان سنبھلنے کی کوشش بھی نہیں کرتا ——"

"تلخ تجربے —— جنہیں حاصل کئے بغیر انسان تاریکی میں بھٹکتا رہتا ہے ——"

اور پھر ——

پھر اچانک افتخار احمد کے لبوں پر زندگی سے بھرپور ایک جاندار اور ٹھوس تبسم جاگ اُٹھا ——!!

پھولوں کے کنج میں ہارسنگھار کی چھاؤں تلے بیٹھی وہ فری کے ساتھ گفتگو کر رہی تھی۔

"امتحانوں میں بہت کم دن رہ گئے ہیں ناجیہ —— اب میں چلتی ہوں" فری نے ڈھلتے سورج کی الوداعی کرنوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اتنی جلدی بھی کیا ہے" ناجیہ بولی "نویں کے امتحان ہی تو ہیں —— کلاس تو ہر صورت میں ملنی ہے۔ ہاں میٹرک میں پہنچ کر رٹا لگانا پڑے گا ——"

"میں خوب سمجھتی ہوں" فری نے کہا "تم نے غالباً اپنی تیاری چپکے چپکے مکمل کر لی ہے، اسی لئے تو اتنے آرام سے بیٹھی ہو"

"یہ وقت آرام کرنے کا ہے اس لئے تم بھی آرام سے بیٹھو" ناجیہ مسکرا کر بولی "ذرا سورج صاحب کو چھپ جانے دو، تھوڑا اندھیرا ہو جائے تو پھر ٹیبل لیمپ جلا کر پڑھنے میں زیادہ لطف آئے گا —— میں نے شروع میں ہی تاکید کر دی ہے کہ اندھیرا ہوتے ہی گرما گرم چائے تھرمس میں بھر کر میرے اسٹڈی روم میں رکھ دے"

"اوہ —— تو یہ ٹھاٹھ ہیں تمہارے ——"

"قدرت مہربان ہو اور انسان کنجوسی اور بخل سے کام لے تو میری زبان میں اُسے مکھی چوس کہتے ہیں"

"لیکن زیادہ تن آسانی انسان کو کاہل اور آرام طلب بھی بنا دیتی ہے"

"نان سنس ——" ناجیہ نے کڑوے لہجے میں کہا "نہیں معلوم ہے فری کہ مجھے اس قسم کی دقیانوسی اور فضول مثالوں اور کتابی باتوں سے سخت چڑ ہے۔ انسان کو ہمیشہ اسی بات پر عمل کرگزرنا چاہیئے جس کا مشورہ اس کا دل دے اور بس ——"

"دل کے مشورے غلط بھی تو ہو سکتے ہیں ——"

"ہوا کریں —— کیا فرق پڑتا ہے" ناجیہ لاپروائی سے بولی پھر اُس نے جلدی سے کہا "لیکن خبردار فری اب تم یہ مثال نہ دے بیٹھنا کہ کمان سے نکلا ہوا تیر اور زبان سے نکلی ہوئی بات واپس نہیں آسکتی"

"تم کہتی ہو تو نہیں کہوں گی لیکن یہ مثال غلط بھی نہیں ہے"

"سب ڈرامائی زبان کی کہاوتیں ہیں —— جانے کیوں لوگ ابھی تک اتنی پرانی اور گھسی پٹی باتوں پر عمل کرتے ہیں"

"کچھ نہ کچھ تو صداقت ہوگی ان باتوں میں" فری سنجیدہ تھی۔

"ہوا کرے —— میری صحت پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے"

"ابھی تو خیر کوئی اثر نہیں پڑے گا لیکن جب تم میٹرک کر کے کالج میں داخلہ لے لوگی تو ——"

"تو کیا ہوگا ——" ناجیہ نے تیزی سے پوچھا اُس کے لب و لہجے میں مقابلے کی ضد موجود تھی۔

"تو تمہیں اپنی روش بدلنی ہوگی ——"

"مگر —— کیوں"

"اس لئے کہ کالج میں تمہارے علاوہ اور بھی بہت سارے ایسے طالب علم ہوں گے جو اپنے مقابلے میں کسی اور کو نہیں گردانتے" فری نے سنجیدگی سے کہا، اس وقت وہ محض تفریحاً ناجیہ کو چھیڑنے کے موڈ میں آگئی تھی۔ چنانچہ اُسے تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی "اگر وہاں کوئی سوا سیر کا نکل آیا تو تمہاری دال گلنی مشکل ہو جائے گی"

"تمہارا کیا خیال ہے" ناجیہ تنک کر بولی "کیا میں کسی ایرے غیرے سے شکست قبول کروں گی"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں —— اس کا جواب تو آنے والا وقت ہی دے گا ——" فری نے شانے اچکائے تو ناجیہ کی پیشانی پر بل آگئے۔

"فری ——" اُس نے خشک لہجے میں کہا "تم شاید بھول رہی ہو کہ میرا نام ناجیہ ہے اور میں نے آج تک کسی کے آگے جھکنا نہیں سیکھا —— وادی جان نے مجھے ہمیشہ سربلند رہنے کا درس دیا تھا اور وہ سبق میرے ذہن میں

موجود ہے۔"

"تم سنجیدہ ہوگئیں ناجیہ ـــــ میں تو تمہیں چھیڑ رہی تھی۔"

"لیکن میں سنجیدہ ہوں۔" ناجیہ کا لہجہ بدستور ٹھوس تھا۔ "تم دیکھنا کہ کالج میں ہر طرف میرے نام کا ڈنکا بجے گا۔ کسی میں اتنی ہمت اور جرأت نہ ہوگی جو مجھ سے نظریں ملا کر بات کر سکے ـــــ میں ہمیشہ سے باوقار اور صاحب حیثیت ہوں، اونچے خاندان کی ہوں اور یہ تمام باتیں ہمیشہ اسی طرح ـــــ بالکل اسی انداز میں برقرار رہیں گی جیسی آج ہیں۔"

"پلیز ناجیہ ـــــ بھئی بور مت کرو۔" فری اُکتا گئی۔ "ایمان سے کہتی ہوں ـــــ میں تو تمہیں محض چھیڑ رہی تھی۔"

"دادی کا قول تھا کہ جو جھکتا ہے وہ ٹوٹ جاتا ہے۔" ناجیہ نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ "میں اس نصیحت کو بہت سنبھال کر اپنے ذہن میں محفوظ کر رکھا ہے۔"

"مگر میں نے تو کچھ اور سُنا ہے ـــــ" فری نے بھی اپنی معلومات کے مطابق کہا۔ "امی جان کہتی ہیں کہ انسان کی طبیعت میں اگر لچک اور جھکاؤ نہ ہو تو اس میں اور کیکر کی لکڑی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔"

"کیکر کی لکڑی ـــــ" ناجیہ نے نہایت معصومیت سے دریافت کیا۔ "یہ کیا ہوتی ہے ـــــ"

"یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں لیکن امی جان نے بھائی جان کو کسی بات پر سمجھاتے ہوئے یہ نصیحت کی تھی میرے ذہن میں رہ گئی۔"

"لیکن تمہاری امی جان میری دادی جان سے زیادہ بوڑھی نہیں ہوئی ہیں۔" ناجیہ نے بڑی ٹھوس دلیل پیش کرتے ہوئے کہا۔ "جو لوگ زیادہ عمر کے ہوتے ہیں وہ زیادہ عقلمند اور تجربے کار ہوتے ہیں۔"

"اچھا بھئی ہوتے ہوں گے۔" فری بھڑ اکتا گئی ـــــ "کوئی اور ذکر کرو ـــــ ارے ہاں، آج وہ تیرا عاشق کہاں ہیں۔"

"اندر کسی کام میں مصروف ہوگی۔"

"کہیں اکیلے اکیلے چھپ کر کتا ہیں تو نہیں چاٹ رہی۔"

"چاٹتی ہے تو چاٹا کرے ـــــ مجھے کیا۔" ناجیہ نے بدستور اُکھڑتے ہوئے کہا۔

"بات کیا ہے آخر ـــــ یہ تمہارا موڈ کیوں ٹھیک نہیں ہو رہا۔"

"میں سوچ رہی ہوں کہ کالج میں وہ کون ہوگا جو مجھے نیچا دکھائے ـــــ"

"توبہ ہے بھئی ـــــ" فری تیزی سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "تم تو بس ایک بات کے پیچھے پڑ کر رہ جاتی ہو۔ کہہ تو چکی ہوں کہ میں نے تمہیں ذرا چھیڑنے کے لئے مذاق کیا تھا۔"

"لیکن مذاق کبھی کبھی حقیقت کا رنگ ـــــ"

"خدا کے لئے ناجیہ ـــــ" فری نے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے تنگ آکر کہا۔ "اب اگر تم نے موضوع تبدیل نہ کیا تو چلی جاؤں گی ـــــ واہ، ایک تو میں امی سے اجازت لے کر تمہارے ساتھ جینے کے لئے آئی اور تم ہو کہ ڈنڈا لے کر بس اُس شخص کے پیچھے دوڑ پڑیں جس کا ابھی نہ کوئی نام ہے، نہ کوئی وجود ہے کوئی اتہ پتہ ـــــ"

"تم بھی وعدہ کرو کہ آئندہ میرے ساتھ اس قسم کی چھیڑ چھاڑ بالکل نہیں کرو گی ـــــ"

"وعدہ ـــــ ایک دم پکا وعدہ۔" فری نے جلدی سے وعدہ کر لیا۔

"تو پھر ملاؤ ہاتھ۔" ناجیہ نے مسکرا کر کہا۔

فری کے پیچھے ہٹ جانے سے ناجیہ کو ایک انجانی مسرت کا احساس ہوا تھا اس لئے کہ وہ اپنے پر ڈٹی رہی تھی اور فری کو تھک ہار کر میدان چھوڑنا پڑا تھا ـــــ فتح کے احساس نے اُس کے ذہن کی وہ کدورت دُور کر دی جو فری کی بے تکی باتوں سے پیدا ہو گئی تھی۔

"تمہیں تو بڑا ہو کر وکیل بننا چاہیئے۔" فری نے ہاتھ ملاتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھری۔

"ارادہ تھا میرا لیکن میں نے یہ سوچ کر ترک کر دیا کہ وکیل کی کوئی مونث نہیں ہوتی ـــــ"

"کیا بات ہوئی ـــــ" فری نے تعجب سے پوچھا۔

"یہی تو سب سے اہم بات ہے بچگی ـــــ" ناجیہ نے شوخی سے مسکراتے ہوئے کہا ـــــ "ذرا بتاؤ تو بھلا وکیل کی مؤنث کیا ہوتی ہے۔"

"وکیل کو تو مذکر اور مؤنث دونوں ہی سمجھا جا سکتا ہے۔" فری نے سنجیدگی سے کہا پھر خود ہی اپنے جملے کی ساخت پر مسکراتے ہوئے بولی ـــــ "اور بھی بہت سارے ایسے لفظ ہیں لغت میں مل جائیں گے جو اگر کسی مرد یا حضرت کے ساتھ نتھی کر دیئے جائیں تو مذکر کہلاتے ہیں اور اگر لیڈیز یا خواتین کے لئے استعمال ہوں تو مؤنث بن جاتے ہیں۔"

"پھر تم ہی بتاؤ ـــــ میں ایسا پیشہ بھلا کیسے اختیار کر سکتی ہوں جس کی حقیقت اور اصلیت بدلتی رہتی ہو۔"

"توبہ ہے ـــــ تم تو بات میں بات نکالنے بیٹھ جاتی ہو۔"

"خدا کا شکر ہے ـــــ تم نے میری قابلیت کا اعتراف تو کیا ـــــ" ناجیہ کے لہجے میں برتری کا احساس جھلک رہا تھا۔

دونوں بے تکلف لڑکیاں فکرِ دو جہاں سے بے نیاز اپنی باتوں میں مصروف تھیں کہ محمود حسین کی گاڑی بگلے میں داخل ہوئی اور گاڑی کی آواز سنتے ہی ناجیہ ایک دم سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

"کیا ہوا ـــــ" فری نے چونک کر دریافت کیا۔ "یہ گاڑی کی آواز سُن کر تمہارے اوپر وحشت کس لئے طاری ہو گئی؟"

"میں نے آج صبح پپا سے اپنے نئے فونٹن پن کی فرمائش کی تھی۔" ناجیہ نے گاڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "پوچھنی ہوں پپا سے کہ لائے یا نہیں ـــــ"

"تمہارے پاس تو شیفرس کا نیا سیٹ تھا ـــــ وہ کیا ہوا۔" فری نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ تو شیفرس کا تھا ـــــ میں نے پپا سے لیڈیز پارکر کی فرمائش کی ہے ـــــ"

"اچھا ـــــ تو پھر میں جا رہی ہوں ـــــ"

"او۔کے ـــــ بائی۔" ناجیہ نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا پھر پلٹ کر روش پر دوڑتی ہوئی کار کے قریب آگئی اور باپ کے اُترتے ہی قلم کا تقاضا داغ دیا ـــــ "پپا..... آپ میری چیز لائے یا نہیں ـــــ"

"لایا ہوں ـــــ" محمود حسین نے گاڑی سے باہر آتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "بھلا کیسے ممکن ہے کہ میری بیٹی کسی بات کی فرمائش کرے اور میں اُسے پُورا نہ کر دوں ـــــ"

"تھینک یو پپا ـــــ لیکن میرا نیا سیٹ کہاں ہے۔"

"اندر تو چلو ـــــ اتنی جلدی کیا ہے۔" محمود حسین نے گاڑی سے بریف کیس اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "تمہاری ممی کے سامنے تمہاری فرمائش پوری کرنے کا وعدہ کیا تھا اس لئے قلم کا نیا سیٹ بھی تمہاری ممی کے سامنے ہی دوں گا۔ اگر سندیے اور بروقت ضرورت کام آتے ـــــ"

"پھر جلدی کیجئے نا پپا ـــــ" ناجیہ اٹھلا کر بولی۔ "آپ تو اتنی دیر لگا رہے ہیں۔"

اسی وقت قریب سے گزرتی ہوئی فری نے محمود حسین کو سلام کیا۔

"گڈ ایوننگ انکل ـــــ"

"جیتی رہو بیٹی ـــــ لیکن تم جا کہاں رہی ہو۔"

"گھر ـــــ" فری نے ناجیہ کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "بہت دیر سے ہم ایک ساتھ ہی تھے اچھا انکل خدا حافظ۔"

"خدا حافظ ـــــ" محمود حسین نے پیار سے جواب دیا پھر بڑے لاڈ سے ناجیہ کے گلے میں بانہیں ڈال کر

دوستانہ انداز میں قدم بڑھانے لگے۔

ڈرائیور نے باپ بیٹی کا لاڈ دیکھا تو وہ کبھی زیرِ لب مسکرانے لگا ——— !!

پہلی بار اُسے محمدو کی بیماری کی نوعیت کا علم ہوا تو اُس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ وہ تو یہ سمجھ رہی تھی کہ محمدو کو معمولی سا نزلہ بخار اور کھانسی ہے جو دو چار روز میں جاتی رہے گی ——— اسی لئے تو اُس نے محمود حسین کی ایمرجنسی کو فوراً قبول کر لیا تھا کہ محمدو کا علاج کسی اچھے ہسپتال میں ہو ——— مگر میں تو وہ اُس کی ایک بات بھی نہیں سن رہا تھا، کبھی وہ دوا نی پلاتی تو محمدو اُسے ڈھیر ساری دعائیں دیتا۔

خدا تجھے ہمیشہ سکھی رکھے ———

خزاں کا منحوس جھکڑ کبھی تجھے چھو کر نہ گزرے ———

پت جھڑ کبھی تیرے قریب نہ پھٹکے ———

تیری عمر بوڑھے برگد سے بھی زیادہ طویل اور دگنی ہو ———

اور کبھی وہ دوا کے نام سے چڑ کر کہتا ——— "پھینک دے اٹھا کر کوارٹر سے باہر ——— دن سے زہر مار کر رہا ہوں لیکن کھانسی ہے کہ کسی طرح رُکنے کا نام نہیں لیتی ——— جا، اُلٹ دے پوری شیشی کلیجہ ونڈے کی باڑھ میں ———" اور اسی لئے عاشی نے چاہا تھا کہ اُس کے بابا کا علاج کسی بڑے ہسپتال میں ہو جائے جہاں محمدو کو وقت پر دوا ملے، وقت پر بڑھیا خوراک اور پھر آرام ہی آرام لیکن جب شرفو نے اچانک ایک دن اُسے بتایا کہ محمدو کی بیماری کی نوعیت کیا ہے تو وہ ایک لمحہ کو گنگ سی رہ گئی ——— یوں لگا لمحوں کی رفتار پل بھر کو ساکت ہو گئی ہو ——— تھم گئی ہو۔

اس روز اتفاق ہی تھا جو اُس کی اور شرفو کی مڈبھیڑ ہو گئی ——— وہ کسی کام سے اپنے کوارٹر کی سمت جا رہی تھی، اُسی وقت اُس نے شرفو کو محمود حسین کے ساتھ گاڑی سے اُترتے دیکھا تھا، اُسے معلوم تھا کہ شرفو ہر دن محمود حسین کے ساتھ ہسپتال جاتا ہے ——— دو ایک بار اُس نے بھی ہسپتال جا کر خود اپنی نظروں سے بابا کو دیکھنے کی خواہش کا بڑی شدت سے اظہار کیا تھا مگر محمود حسین اور شمسہ بیگم نہایت خوبصورتی سے ٹال گئے تھے چنانچہ اُس نے مزید اصرار کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

بہرحال، اُس وقت شرفو کو دیکھ کر اُس کے دل میں خیال آیا کہ وہ اُس سے محمدو کی خیریت دریافت کرے وہ یوکلپٹس کے تنے سے لگ کر کھڑی ہو گئی، محمود حسین قدم مارتے تیزی سے اندر چلے گئے تو وہ لپک کر شرفو کے پاس آ گئی، نہ جانے کیا بات تھی جو شرفو اچانک اُسے اپنے سامنے دیکھ کر کچھ گھبرا سا گیا۔

"عاشی بی بی ——— آپ ———"

"بابا کی طبیعت اب کیسی ہے شرفو؟" اُس نے لپک کر پوچھا "آنٹی کل بتا رہی تھیں کہ وہ پہلے سے کچھ بہتر ہیں"

"عاشی بی بی ——— آپ ——— آپ کسی سے کچھ کہیں گی تو نہیں؟" شرفو نے اطراف پر نظریں گھما کر رازداری سے کہا! "بڑے سرکار نے بڑی سختی سے منع کیا تھا کہ آپ کو کچھ نہ بتایا جائے"

شرفو کی بات سُن کر اُسے حیرت ہوئی ——— جانے وہ اس قدر رازداری سے کام کیوں لے رہا تھا؟ گھر میں ایک عاشی کی ذات ہی ایسی تھی جس سے وہ کھل کر ہنس بول لیتا تھا۔ مگر آج ——— اُسے نہ جانے کیا ہوا تھا، اُس کی معصوم نگاہوں میں خوف، معصومیت اور تجسس کے ملے جلے تاثرات اُبھر رہے تھے۔

"بات کیا ہے شرفو ———" اُس نے شرفو کو بغور تکتے ہوئے پوچھا "بابا کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"نہیں ———" شرفو نے آہستہ سے کہا پھر ہونٹ کاٹنے لگا۔

اس کا جواب بڑا مختصر اور بظاہر بہت سیدھا سادہ سا تھا لیکن عاشی کو یوں لگا تھا جیسے اُس کے دل نہاں خانوں میں کوئی شے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی ہو ——— ایک دم ہی سے اُس کے معصوم دل کی دھڑکن بھی تیز ہو گئیں۔ چند ثانئے وہ شرفو کو حیران اور پریشان نظروں سے تکتی رہی۔ پھر اُس کے یاقوتی ہونٹ متحرک

"شرفو ———" اُس نے کپکپاتی آواز میں پوچھا "کیا میرے بابا کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ کیا ہو گیا انہیں؟"

"صبر سے کام لیجئے عاشی بی بی ———" شرفو نے بے چینی سے جواب دیا، "ہسپتال کا بڑا ڈاکٹر ہمارے بڑے سرکار سے کہہ رہا تھا کہ محمدو جاچا کو ——— "

"بولو شرفو ——— بولو" وہ شرفو کے اچانک چپ ہو جانے سے اور مضطرب ہو گئی۔ "مجھے بتاؤ شرفو کہ بڑا ڈاکٹر میرے بابا کے لئے کیا کہہ رہا تھا؟"

"وہ ——— وہ کہہ رہا تھا کہ ——— مالی جاچا کو ——— ٹی بی ہو گئی ہے"

"ٹی بی ———" اُس نے حیرت اور بے یقینی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا "یہ کیا بیماری ہوتی ہے ———؟"

"عاشی بی بی ——— اگر بڑے سرکار کو پتہ چل گیا کہ میں نے آپ کو مالی جاچا کی بیماری بتا دی ہے تو وہ چمڑی اُتار دیں گے" شرفو خوفزدہ زدہ آواز میں کہا "ہسپتال سے واپسی میں مجھے بڑی سختی سے حکم ملا تھا کہ اپنی زبان بند رکھوں"

"تم مجھ پر بھروسہ رکھو شرفو ——— میں وعدہ کرتی ہوں کہ انکل یا آنٹی سے کچھ نہ کہوں گی"

"عاشی بی بی ———" شرفو نے ایک بار پھر اطراف پر نظریں گھماتے ہوئے آہستہ سے کہا "ٹی بی تپ دق کو کہتے ہیں ——— بڑی موذی اور خطرناک بیماری ہوتی ہے ——— اس بیماری میں اگر اچھا علاج نہ ہو تو مریض خون تھوک تھوک کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اللہ میاں کو پیارا ہو جاتا ہے ———"

"شرفو ———" عاشی کو اپنا وجود کسی ایسے پودے کی طرح محسوس ہو رہا تھا جو اچانک کسی بپھرے ہوئے طوفان کی زد میں آ گیا ہو ——— دل کی دھڑکنیں اور تیز ہونے لگیں۔

"میں اس بیماری کے سلسلے میں بہت کچھ جانتا ہوں بی بی جی" شرفو نے اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے دبی زبان میں کہا "میرے تایا کے بڑے لڑکے کو بھی یہی تپ دق کا مرض لاحق ہو گیا تھا ——— دو سال تک بیچارہ خیراتی ہسپتال کے گھٹیا وارڈ میں پڑا خون تھوکتا رہا پھر ایک دن اللہ میاں نے اُسے اپنے پاس بلا لیا"

"شرفو ——— کیا میرے بابا ——— کیا ——— وہ بھی ———"

"نہیں بی بی ——— نہیں" شرفو کو اپنی کہی ہوئی بات کا احساس ہوا تو جلدی سے سہمے ہوئے لہجے میں بولا "مالی جاچا کی بات تو جدا ہے ——— بڑے سرکار نے تو انھیں اس ہسپتال میں داخل کرایا ہے جہاں صرف اسی مرض کا علاج ہوتا ہے۔ بڑی خوبصورت جگہ ہے عاشی بی بی ——— نام بھی بھلا سا ہے ——— سانی اٹوریم (سینی ٹوریم) بڑا ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ ابھی مالی جاچا کا مرض زیادہ خطرناک نہیں ہوا ——— دوا دارو کے علاوہ پھل فروٹ اور اچھی خوراک ملے گی تو بہت جلد صحت مند ہو جائیں گے"

"تم ——— تم اب شاید مجھے بہلا رہے ہو" عاشی ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

"دل چھوٹا نہ کیجئے عاشی بی بی ———" شرفو نے جلدی سے دلاسہ دیتے ہوئے کہا "مالی جاچا اگر خدا نے چاہا تو بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ بڑے سرکار نے ان کے لئے ایک علیحدہ کمرے کا بندوبست کیا ہے ——— اور ایک نرس بھی جاچا کی دیکھ بھال کے لئے ہر وقت موجود رہتی ہے ——— میرا دل گواہی دیتا ہے کہ جاچا ضرور صحت مند ہو جائیں گے"

"شرفو ———" عاشی نے دل ہی دل میں شرفو کی دعاؤں پر آمین کہتے ہوئے پوچھا "بابا مجھے بھی پوچھ رہے تھے ———؟"

"بہت پوچھ رہے تھے" شرفو بولا "اور وہ کبھی یہی کہہ رہے تھے کہ آپ کو سانی اٹوریم سے دور رکھا جائے"

"دور رکھا جائے ———"

"دُور رکھا جائے ——— وہ کیوں؟"

"اس لئے کہ کہیں آپ کو بھی ——— خدانخواستہ، اُس موذی مرض کے جراثیم نہ لگ جائیں"

"شرفو ———" عاشی نے اچانک ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "میرا ایک چھوٹا سا کام کر دو گے"

"آپ حکم دے کر دیکھئے عاشی بی بی ——— آپ کا کام تو فرض ہے کروں گا اس لئے کہ آپ بھی میرا بہت خیال

رکھتی ہیں۔"

"تم انکل کے ساتھ دوبارہ کب ہسپتال جاؤ گے۔"

"کل کا دن چھوڑ کر پرسوں ——" شرفو نے کہا "لیکن کام کیا ہے ——"

"بابا سے —— چپکے سے میرا سلام کہہ دینا اور ——" عاشی کی آواز گلوگیر ہونے لگی، امڈتے ہوئے آنسوؤں کو بمشکل پیتے ہوئے بولی "یہ بھی بتا دینا کہ میں ہر نماز میں اُن کے لئے اللہ میاں سے بہت ساری دعائیں مانگتی ہوں —— اور —— اور مجھے یقین ہے کہ بابا ضرور بھلے چنگے ہو جائیں گے ——"

"آمین —— ثم آمین۔" شرفو نے دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرتے ہوئے بڑے خلوص سے آمین کہا۔

"اور ہاں —— بابا کو یہ نہ بتا دینا کہ مجھے اُن کا اصلی مرض معلوم ہو گیا ہے ورنہ —— بابا پریشان ہوں گے۔"

عاشی نے بمشکل دل کی بیقرار دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا لیکن ان آنسوؤں پر قابو نہ پا سکی جو سارے بند توڑ کر اُس کی پلکوں کی اوٹ سے اچانک ابل پڑے تھے۔

شرفو کی معصوم آنکھوں میں بھی غم کی پرچھائیاں لہرانے لگیں وہ ہمدردی ظاہر کرنے کے لئے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن عاشی وہاں رکی نہیں —— دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا، تیزی سے پلٹی اور اپنے کوارٹر کی سمت دوڑنے لگی —— شاید وہ اپنی بھیگی پلکوں اور آنسوؤں سے تر بتر آنکھوں کی نمائش نہیں کرنا چاہتی تھی۔

کوارٹر میں پہنچ کر اُس نے جلدی سے اندر سے دروازے کو کنڈی لگائی اور پھر ممدو کے ویران اور اجاڑ پلنگ کے اُجلے بستر پر گر کر بے تحاشا پھوٹ پڑی ——

سسکنے لگی ——

بلکنے لگی ——

اور ——

جب دل کا غبار آنسوؤں کی روانی سے چھٹ کر کچھ کم ہوا تو وہ جلدی سے اپنے آنسوؤں کو اپنے آنچل سے خشک کرنے لگی پھر —— پھر اُس نے اپنے لرزتے ہوئے ہاتھ دعا کے انداز میں بلند کر لئے اور اُس کے دُھلے ہوئے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلنے لگے —— وہ اپنے قادرِ مطلق سے ممدو کی زندگی کے لئے دل ہی دل میں... گڑگڑا کر بڑی عاجزی سے دعائیں کر رہی تھی۔

اور ——

باہر نیلے آسمان پر اودے اودے اور مٹیالے بادل تیزی سے چھٹنے لگے تھے —— !!

✱ ——— ✱

راحیلہ خاتون کو بیٹے کے بارے میں اس بات کا علم ہوا کہ وہ پڑھائی کی غرض سے کراچی جانے کا ارادہ رکھتا ہے تو اُن کا اچھا خاصا موڈ چوپٹ ہو گیا۔ حسبِ معمول اس وقت بھی وہ قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بناؤ سنگھار کی نوک پلک جانچ رہی تھیں، اقبال کو انھوں نے اپنے کمرے میں بڑے خوشگوار موڈ میں خوش آمدید کہا تھا —— وہ اس وقت اپنی ایک پرانی سہیلی کے ساتھ شاپنگ کے ارادے سے جانے کو تیار ہو رہی تھیں۔

لیکن ——

جب اقبال نے اپنا عندیہ بیان کیا تو یکلخت اُن کا پارہ چڑھ گیا، تیکھی نظروں سے پیشانی پر بل ڈال کر بیٹے کو پلٹ کر گھورا —— اکھڑے لہجے میں بولیں۔

"یہ اچانک بیٹھے بٹھائے تمہارے سر پر پھر کراچی کا بھوت کیسے سوار ہو گیا"

"بات بھوت کی نہیں پڑھائی کی ہے ممی۔" اقبال نے سنجیدگی سے کہا "میرا مستقبل سنور جائے گا۔"

"یہاں لاہور میں کیا خرابی ہے۔"

"کچھ بھی نہیں ——"

"پھر ——"

"یہاں کا ماحول مجھے پسند نہیں ہے ——"

"تو اس ماحول سے منہ موڑ کر صرف پڑھائی پر توجہ دو۔" راحیلہ خاتون بولیں "کیا ضرورت ہے ماحول میں گھلنے ملنے کی۔"

"آپ سمجھنے کی کوشش ——"

"اقبال ——" راحیلہ خاتون نے بیٹے کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا "تم جانتے ہو کہ میں لاہور سے تمہاری ایک دن کی دُوری بھی پسند نہیں کر سکتی۔"

"مگر —— کیوں ——"

"اس لئے کہ مجھے تمہارے اوپر اعتماد نہیں ہے۔"

"اس عدم اعتماد کا کوئی جواز —— کوئی وجہ، کوئی سبب بھی ہو گا۔"

"ہاں ——" راحیلہ خاتون نے بالوں کو بُرش کرتے ہوئے بدستور خشک لہجے میں جواب دیا۔

"میں وجہ دریافت کر سکتا ہوں۔" اقبال نے کچھ توقف سے پوچھا۔

"تمہاری بُری صحبت۔" راحیلہ خاتون نے بیٹے کو تیز نظروں سے گھورا "یہاں میں موجود ہوں تمہارے باپ ہیں لیکن اس کے باوجود تمہارا سرکل نہایت خراب ہے، جن لڑکوں سے تمہارا ملنا جلنا ہے وہ تمہارے اسٹینڈرڈ کے ہوتے ہیں، میں ایک لمحہ کو ان آوارہ اور بدتماش لڑکوں کے ساتھ تمہارا میل جول پسند نہیں کرتی —— سمجھے۔"

"اسی ماحول سے تو بچ کر میں دُور جانا چاہتا ہوں۔"

"کراچی؟ —— لیکن وہاں کون ہو گا تمہارے اوپر نظر رکھنے والا۔" راحیلہ خاتون بولیں "جو مرضی آئے گی کرتے پھرو گے، کون ہو گا وہاں روک ٹوک کرنے والا۔"

"مجھ پر اعتماد کیجئے ممی —— میں وعدہ کرتا ہوں کہ کراچی جا کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کروں گا۔"

"نہیں —— میں تم سے پہلے بھی کراچی جانے کی مخالفت کر چکی ہوں۔"

"میرے مستقبل کا سوال ہے ممی ——"

"فضول بحث مت کرو۔" راحیلہ خاتون اُکتائے ہوئے لہجے میں بولیں "جاؤ —— اس وقت میرا دماغ مت چاٹو۔"

"ٹھیک ہے —— اس وقت اگر آپ جلدی میں ہیں تو پھر کبھی سہی لیکن میں طے کر چکا ہوں کہ بی اے کراچی جا کر ہی کروں گا۔"

"اقبال ——"

"ممی ——" اقبال نے تیزی سے وضاحت کرتے ہوئے کہا "لاہور میں مجھے کس بات کی کمی ہے، جب چاہتا ہوں جتنا چاہتا ہوں اپنے اخراجات کے مطابق آپ سے یا ڈیڈ سے خرچ لے لیتا ہوں، پہننے کے لئے اچھا لباس ہے، گھومنے کے لئے گاڑی ہے، حکم چلانے کے لئے ملازم موجود ہیں اور ——"

"اور اس کے باوجود تم ان تمام آسائشوں کو چھوڑ کر جانا چاہتے ہو۔"

"یس ممی —— تنوعِ زندگی کی علامت ہے —— میں بھی ماحول کی یکسانیت سے اکتا گیا ہوں۔ چینج (CHANGE) چاہتا ہوں۔" اقبال نے ماں کو سمجھاتے ہوئے کہا "میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہاں میرا اٹھنا بیٹھنا اچھے لڑکوں کے ساتھ نہیں۔ مگر میں آپ دم سے انھیں چھوڑ بھی نہیں سکتا —— اچانک کنارہ کش ہوا تو وہ میرے مخالف ہو جائیں گے، دشمن بن جائیں گے —— مجھ پر طنز کریں گے —— جملے اُچھالیں گے اور یوں بات بڑھ بھی سکتی ہے۔"

"لیکن تم نے کس نے کہا تھا کہ ان لفنگے لڑکوں سے دوستی بڑھاؤ ——"

"وہ میری بھول تھی —— میں مانتا ہوں۔" اقبال نے سنجیدگی سے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ "اس وقت میرا شعور اتنا بیدار نہیں تھا، مجھے بُرے اور بھلے کی تمیز نہیں تھی لیکن اب میں اس ماحول سے دور رہ کر خود اپنا احتساب کرنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے ——— اگر یہ بات ہے تو تم کسی دوسرے کالج میں داخلہ لے لو، تمہارے ساتھی خود ہی سے کٹ جائیں گے۔"

"بات کالج کی نہیں ——— ایک ہی شہر کی ہے۔" اقبال نے تلملا کر کہا "میرے دوست میرا گھر جانے اور پھر ——— وہ مجھ سے کالج کی تبدیلی کا سبب بھی پوچھ سکتے ہیں۔"

"پوچھتے ہیں تو پوچھا کریں ——— ہم کسی کا دیا تو کھاتے نہیں جو کسی سے ڈریں ——— بس میں کہہ دیا ہے کہ تم نہیں لاہور میں رہ کر اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھو گے۔"

"سوری ممی ———" اقبال نے نظریں جھکا کر ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ "میں نے طے کر لیا ہے کہ کراچی جا کر بی اے کروں گا۔"

"میری اجازت کے بغیر ———" راحیلہ خاتون کا چہرہ اچانک تپ کر سُرخ انگارہ ہو گیا۔

"میں نے ڈیڈ سے بھی اپنی مرضی کا اظہار کیا تھا۔"

"پھر ——— کیا جواب دیا تمہارے باپ نے۔" راحیلہ خاتون نے ہونٹ کاٹتے ہوئے دریافت کیا۔

"ڈیڈ نے مجھے منع نہیں کیا ———"

"کیا ——— کیا تمہارے باپ نے تمہیں جانے کی اجازت دے دی ہے۔" راحیلہ خاتون غصے سے ہاتھ پٹخ کر بولیں۔

"ہاں ——— بشرطیکہ آپ بھی رضامند ہو جائیں۔"

"میں پوچھتی ہوں تمہارے باپ ہے۔"

راحیلہ خاتون نے تلملا کر بالوں کا برش میز پر رکھا، بیٹے کو غضبناک نظروں سے دیکھا پھر تیز قدم اُٹھاتی کمرے سے نکلیں، راہداری عبور کر کے اسٹڈی میں داخل ہوئیں تو افتخار احمد اپنی آرام کرسی پر دراز نہایت اطمینان سے کسی کتاب کے مطالعے میں محو تھے۔ راحیلہ خاتون نے رک کر شوہر کو گھورا پھر توپ دہانہ کھول دیا۔

"کیا پڑھا جا رہا ہے اتنی توجہ سے ———"

"قصہ چہار درویش ———" افتخار احمد نے کتاب بند کر کے برابر رکھی ہوئی میز پر اچھالتے ہوئے کہا "دوسرے درویش کی سرگزشت ———"

"بھاڑ میں گیا دوسرا درویش اور اُس کی سرگزشت" راحیلہ خاتون ایک دم ہی پھٹ پڑیں "کچھ سنا تم نے ——— اقبال کراچی جا کر بی اے کرنا چاہتا ہے ———"

"ہاں ——— اُس نے مجھ سے بھی اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔" افتخار احمد نے اٹھتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اور تم نے اُسے اجازت دے دی؟"

"میں نے اُسے منع نہیں کیا ———"

"لیکن ———"

"ترقی کی منزلیں طے کرنے کی خاطر انسان کو بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیے ———" افتخار احمد تیزی سے بولے "میری مثال تمہارے سامنے موجود ہے ——— اقبال تو محض تعلیم کے حصول کے لئے لاہور سے کراچی جا رہا ہے۔"

"میں نہیں چاہتی کہ اقبال کراچی جائے ———"

"اگر یہ بات ہے تو اُسے منع کر دو ———"

"وہ ضد پر آمادہ ہے ———" راحیلہ خاتون ہاتھ ملتے ہوئے بولیں "میری بات نہیں سنے گا۔"

"تو جانے دو ———" افتخار احمد ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولے "زمانے کے نشیب و فراز سے گزر کر تو خود ہی عقل آ جائے گی۔"

"کیا تم اُسے حکم نہیں دے سکتے ———"

"نہیں ———"

"کیوں ———"

"اس لئے کہ اب میں کبھی باپ بن چکا ہوں ———" افتخار احمد نے تڑپ کر کہا "باپ ——— جو اپنے جوان بیٹے سے صرف درخواست کر سکتا ہے ——— اپنی مجبوریوں کا دبی زبان میں محض اظہار کر سکتا ہے لیکن حکم نہیں دے سکتا ——— وہ ڈرتا ہے کہ کہیں اُس کا حکم اُس کے اپنے لہو کے راستے کی رکاوٹ نہ بن جائے اور ———"

"تم ———" راحیلہ خاتون نے شوہر کو غصے سے گھورتے ہوئے کہا "تم مجھ سے انتقام لینا چاہتے ہو ———"

"میں نہیں راحیلہ بیگم زمانہ تم سے تمہاری خطاؤں کا حساب طلب کر رہا ہے۔" افتخار احمد تیزی سے بولے "تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے ——— کہانی وہی پرانی ہے، صرف کردار بدل گئے ہیں۔"

"میں ——— میں دیکھتی ہوں کہ اقبال میری مرضی کے خلاف ایک قدم بھی کیسے اُٹھا سکتا ہے۔"

"ضرور دیکھو راحیلہ بیگم ———" افتخار احمد زہر خند سے بولے "ایک دن مرحوم باپ نے بھی یہی سوچا تھا لیکن میری ضد آڑے آ گئی تھی ——— تم نے مجھے میرے شاندار مستقبل کا احساس دلایا تھا اور میں ——— میں نے زندگی کی راہوں پر اپنے قدم جمانے کی خاطر رشتوں ناطوں کو ٹھکرا دیا تھا ——— ہمیار اور بوڑھے باپ کی درخواست رد کر دی تھی اور ——— اور مستقبل میں بڑا آدمی بننے کے خواب دیکھتا تمہارے ساتھ لندن چلا گیا تھا ———

اور مجھے ناکامی نہیں ہوئی ——— میں بڑا آدمی بن گیا ——— تم گواہ ہو کہ آج معاشرے میں میری بے حد عزت ہے، میرے پاس بے حساب دولت ہے، بے پناہ شکوہ اور آرام ہے ——— مجھے اس منزل تک پہنچنے کی خاطر بہت کچھ کھونا پڑا ہے، کچھ قربانیاں بھی زمانے کی بھینٹ چڑھانی پڑیں ——— ایک بوڑھے اور بیمار باپ کی قربانی جو اپنے جوان بیٹے کی راہ تکتا آنکھ بند کر کے خاموشی سے اپنے دائمی سفر پر روانہ ہو گیا ——— فاصلے زیادہ تھے اس لئے میں تجہیز و تکفین میں بھی شرکت سے محروم رہ گیا ——— لیکن میری ترقی کی راہ میں کوئی خلل نہیں پڑا ——— میرا بینک بیلنس بڑھتا رہا ——— میری عزت اور شہرت میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا ——— پھر ترقی کی ان منزلوں کی پُرپیچ راہوں میں مجھے ایک اور قربانی دینی پڑی ———

اپنی بہن کی قربانی ——— اپنی گڑیا..... اپنی فائزہ کی قربانی جو باپ کی موت کے بعد بھائی کے سایۂ شفقت سے بھی محروم ہو گئی ——— اپنی دلبر چھوڑ کر دربدر بھٹکتی رہی ——— خدا جانے اس غریب پر کیا کیا گزری ہو گی اور وہ لمحات کتنے سخت اور اذیتناک ہوں گے جب اُس نے اس منحوس اور ناپائیدار دنیا سے منہ موڑا ہو گا

اُس وقت ——— اُس وقت اُس کی نگاہوں میں کسی کے انتظار اور نفرت کے ساتھ ساتھ موت کے کربناک لمحے بھی اذیت بن کر اُبھرے ہوں گے اور پھر اس نے دنیا سے روٹھ کر منہ پھیر لیا ہو گا ——— یہ سب قربانیاں ہی تو تھیں جو میں نے اپنی ترقی کی راہوں میں پیش کی ہیں ——— اگر ——— اگر میں اپنے باپ کی بات مان کر ماضی کے اس موڑ پر ٹھہر گیا ہوتا تو آج بڑا آدمی نہ بن پاتا ——— میرے باپ نے مجھے روکنے کا حکم نہیں دیا تھا اس لیے کہ ترقی باپ اپنی اولاد کے شاندار مستقبل کی راہوں میں رکاوٹ نہیں بنتا ——— پھر ——— پھر میں اقبال کو کس منہ سے منع کر دوں ——— بولو ——— جواب دو راحیلہ بیگم، کیا تم ان باتوں کو بھول گئیں جو تمہاری بٹ دھرمی کا نتیجہ تھیں ———

وہ باتیں قصۂ پارینہ بن کر میرے سینے کی گہرائیوں میں دفن ہو گئی ہیں لیکن وہ مردہ نہیں ہوئیں ——— آج بھی ان باتوں کا زخم ناسور بن کر اندر ہی اندر رستا رہتا ہے لیکن ان زخموں پر زمانے کی نظر نہیں پڑتی ——— زمانہ ——— جو میری عزت، شہرت اور بے پناہ دولت کا گواہ ہے ———"

راحیلہ خاتون نے شوہر کی بات کا جواب نہیں دیا، خاموش کھڑی اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتی رہیں پھر افتخار احمد خاموش ہوئے تو انھوں نے غصے اور حقارت سے ایک آخری نظر اُن کے تُنے ہوئے چہرے پر ڈالی پھر گھوم کر تیز تیز قدم اُٹھاتی اسٹڈی سے باہر چلی گئیں اور ———

راحیلہ خاتون کے جاتے ہی افتخار احمد کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی ——— !!

گذشتہ

دو روز سے شائستہ بیگم فراز کے ساتھ محمود حسین کے ہاں مقیم تھیں۔ شمسہ بیگم کو بخار تھا۔ شائستہ بیگم انھیں دیکھنے آئیں تو محمود حسین نے انھیں مجبور کر کے روک لیا، کچھ شمسہ بیگم کا اصرار بھی تھا، اس لئے وہ انکار نہ کر سکیں، فراز کا میٹرک کا امتحان بھی ہو چکا تھا اس لئے شائستہ بیگم کو واپسی کی کوئی جلدی نہ تھی۔

صوفیہ خاتون کی زندگی میں شمسہ بیگم اور شائستہ بیگم کے دلوں میں ناجیہ کی وجہ سے جو گرہ پیدا ہو گئی تھی اور ایک معمولی سی غلط فہمی نے جو خلیج پیدا کر دی تھی وہ وقت کے ساتھ ختم ہو گئی تھی۔

شمسہ بیگم ماں تھیں اس لئے بیٹی کے سلسلے میں جذباتی ہو گئی تھیں لیکن جب انھیں صورت حال کا اندازہ ہوا تو اُن کا دل شائستہ بیگم کی طرف سے صاف ہو گیا، اپنے کئے پر شرمندگی بھی تھی۔ انھوں نے شائستہ بیگم کو بصد خلوص دوبارہ اپنی کوکھ میں لانے کی کوشش کی مگر وہ نہایت خوبصورتی سے ٹال گئیں۔

غرضیکہ دلوں میں جو میل آگیا تھا وہ قدرت نے صاف کر دیا تو شائستہ بیگم کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا اُن کے دل میں ناجیہ کو بہو بنانے کی جو آرزو پل رہی تھی وہ شمسہ بیگم کے من جانے سے دوبارہ جوان ہو گئی۔ چنانچہ وہ اس وقت بھی محمود حسین اور شمسہ بیگم کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھی گھل مل کر باتیں کر رہی تھیں

"فراز کا نتیجہ آنے میں کتنا وقت ہے" شمسہ بیگم نے گفتگو کے دوران دریافت کیا تو شائستہ بیگم سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

"ڈیڑھ ماہ ——" انھوں نے سنجیدگی سے کہا "ابھی دس پندرہ روز پہلے تو امتحان ختم ہوئے ہیں"

"مجھے قوی اُمید ہے کہ میرا بھونڈو اعلیٰ نمبروں سے کامیاب ہو گا" محمود حسین بولے۔

"اب تو اُسے بھونڈو کہنا چھوڑ دیں" شمسہ بیگم نے مسکرا کر کہا "آپ نے بلا وجہ اُسے بھونڈو کہنا شروع کر دیا ورنہ وہ تو ماشاء اللہ بے حد ذہین اور ہونہار بچہ ہے"

"ہوا کرے لیکن میں تو اُس وقت تک اُسے بھونڈو کہوں گا جب تک اس کی شادی نہیں ہو جاتی"

"سُن رہی ہیں آپ اپنے بھائی کی باتیں" شمسہ بیگم نے شائستہ بیگم سے مسکرا کر کہا۔

"میں جانتی ہوں کہ محمود فراز کو کس قدر چاہتے ہیں" شائستہ بیگم نہایت اپنائیت سے بولیں "جہاں چاہت ہو وہاں ہر چیز جائز ہوتی ہے —— رہا فراز تو وہ بھی محمود کے منہ سے بھونڈو سننے کے لئے بے چین رہتا ہے"

"سچ ——"

"ایمان سے ——"

"سُن لیا آپ نے ——" محمود حسین بیوی سے بولے "کیا اب بھی آپ کو فراز کے بھونڈو ہونے میں کوئی شبہ ہے"

شمسہ بیگم کے ساتھ ساتھ شائستہ بیگم بھی مسکرا دیں، کچھ دیر یونہی ہنسی مذاق ہوتا رہا پھر محمود حسین نے

سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے پوچھا

"آپا —— فراز کے بارے میں اب آپ نے کیا سوچا ہے، میرا مطلب ہے کہ آگے چل کر اُسے کیا بنانے کا ارادہ ہے"

"میری تو خواہش ہے کہ فراز پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بنے لیکن وہ کچھ اور سوچے ہوئے ہے"

"کیا سوچا ہے اُس نے ——"

"وہ تعلیم مکمل کر کے ایئر فورس میں جانا چاہتا ہے" شائستہ بیگم نے ملول لہجے میں جواب دیا۔

"اوہ —— تو میرا بھونڈو بڑا ہو کر ہوائی جہاز اُڑائے گا"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے آپا ——" شمسہ بیگم بولیں "فوج میں داخل ہو کر ملک اور قوم کی خدمت کرنا تو عین عبادت ہے"

"میٹرک کا نتیجہ آجائے تو میں فراز کی کامیابی کا جشن نہایت دھوم دھام سے مناؤں گا" محمود حسین نے شائستہ بیگم کی کیفیت کا اندازہ لگایا تو جلدی سے بات مذاق میں اڑاتے ہوئے بولے "کم از کم دس پونڈ کا کیک تیار کروایا جائے گا اور اُس پر نہایت جلی حروف سے درج ہو گا ——"

"بھونڈو کو اُس کی شاندار کامیابی مبارک ہو" شمسہ بیگم نے جملہ مکمل کیا تو شائستہ بیگم بھی مسکرا دیں۔

"جی نہیں ——" محمود حسین نے جلدی سے بات پلٹتے ہوئے کہا "کامیابی کے جشن کے موقع پر اسے بھونڈو نہیں کہا جائے گا"

"اب آپ بات بدلنے کی کوشش کر رہے ہیں" شمسہ بیگم ہنستے ہوئے بولیں "میں نے آپ کی بات مکمل کر دی اس لئے آپ قلابازی کھا رہے ہیں ——"

"چلئے تسلیم کئے لیتا ہوں کہ آپ درست فرما رہی ہیں" محمود حسین مسکرائے۔

"خدا کا شکر ہے کہ آپ نے آج بغیر بحث کئے کوئی بات تسلیم تو کی ——"

"کیا مطلب" شائستہ بیگم نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا "کیا محمود نے اب گھر میں بھی جرح اور بحث کی عادت ڈال لی ہے"

"خدا کی پناہ ——" شمسہ بیگم نے موقع پا کر شوہر کو مزید چھیڑنے کی خاطر کہا "اس وقت آپ موجود ہیں آپا جو اتنے لئے دیئے نظر آ رہے ہیں —— ورنہ بحث اور جرح کر تا تو اُن کا ... اوڑھنا بچھونا بن کر رہ گیا ہے"

"کیوں محمود ——" شائستہ بیگم نے پیار سے محمود حسین کی جانب ... گھورتے ہوئے دریافت کیا۔

"کیا شمسہ درست کہہ رہی ہیں"

"ایک دم بجا ارشاد ہے" محمود حسین نے جلدی سے کہا پھر بیوی کی طرف دیکھ کر بولے "ایک کپ چائے مل جائے گی"

"اچھا —— تو اس لئے میری ہر بات تسلیم کی جا رہی ہے"

شمسہ بیگم نے ملازم کو بلا کر چائے تیار کرنے کا حکم دیا پھر شائستہ بیگم سے مخاطب ہو کر بولیں۔

"میرا بھی ایک مشورہ ہے فراز کے بارے میں بشرطیکہ آپ کو پسند آئے"

"کیا ——" محمود حسین جلدی سے بولے۔

"فراز پر مجھ سے زیادہ حق تم لوگوں کا ہے" شائستہ بیگم نے کہا "مجھے یقین ہے کہ تم لوگوں کا مشورہ فراز کے حق میں زیادہ مفید اور کارآمد ثابت ہو گا"

"پہلے پتہ تو چلے کہ وہ مشورہ کیا ہے —— کیسا ہے اور یہ کہ اس مشورے کے دُور رس نتائج فراز کے حق میں آیا مفید ثابت ہوں گے یا نقصان دہ —— اور یہ کہ ——"

"دیکھ رہی ہیں آپا —— شروع ہو گئی نا عدالتی کارروائی" شمسہ بیگم نے مسکراتے ہوئے شائستہ بیگم سے شکایت کی۔

"اِس وقت تو میں نے اپنے کانوں سے سُن لیا اور آنکھوں سے دیکھ لیا کہ محمود ——"

"نہایت فرمانبردار، نیک، مہذب اور سیدھے سادے انسان ہیں۔ اور یہ کہ فی زمانہ اگر آفتاب لے کر ڈھونڈا جائے تو محترمہ شمسہ بیگم والدہ ناجیہ بیگم کو ایسا فرشتہ صفت اور نیک خصلت شوہر دوبارہ دستیاب ہو سکے گا۔" محمود حسین نے تیزی سے شائستہ بیگم کی بات کو درمیان سے مکمل کرتے ہوئے کہا۔ "پس محترمہ شمسہ بیگم کو لازم ہے کہ اپنے خاکسار صفت شوہر مسمی محمود حسین ولد احمد حسین مرحوم کی قدر کریں اور کوئی عمل ایسا سرزد نہ ہونے دیں کہ فریق کے نازک دل کو ٹھیس پہنچے اور اُس کا شیشۂ دل چکنا چور ہو جائے ——"

"اپنے منہ میاں مٹھو بننا شاید ایسے ہی موقع کے لئے کہا گیا ہے۔ ——" شمسہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ فراز کے سلسلے میں کوئی مشورہ دینا چاہ رہی تھیں۔" محمود حسین نے سلام کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ آج کچھ زیادہ ہی ترنگ میں ہیں۔"

"میں بھی کچھ یہی محسوس کر رہی ہوں۔" شائستہ بیگم نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

ملازم چائے کی ٹرالی لیے داخل ہوا تو گفتگو کا رُخ سنجیدہ ہو گیا۔ شمسہ بیگم نے چائے بنا کر سب کے پیش کی پھر خود ہی از سرِ نو فراز کا تذکرہ چھیڑتے ہوئے بولیں۔

"فراز کے سلسلے میں میری رائے یہ ہے کہ اگر وہ انجینئرنگ پڑھے تو زیادہ مناسب ہو گا۔"

"نہایت مناسب مشورہ ہے آپ کا لیکن بچوں پر کوئی فیصلہ مسلط کرنا مناسب نہیں ہوتا۔" محمود حسین بولے "طالب علم کی اپنی مرضی سے اگر اُسے آگے بڑھنے کا موقع دیا جائے تو زیادہ بہتر نتائج برآمد ہوتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ تم اگر کسی وقت محبت سے فراز کو سمجھاؤ تو وہ مان جائے گا۔" شائستہ بیگم نے محمود حسین سے کہا۔ "اس طرح مجھے جو وہم لاحق ہے وہ بھی جاتا رہے گا اور فراز کا مستقبل بھی سنور جائے گا۔"

"میں تو کہتی ہوں کہ آجکل ڈاکٹروں سے زیادہ انجینیروں کی قدر ہو رہی ہے۔" شمسہ بیگم بولیں۔ "ملک کی ترقی کے ساتھ ساتھ انجینیروں کی مانگ میں بھی روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے —— ڈاکٹری میں کیا رکھا ہے۔ مریض اچھا ہو گیا تو واہ تین خدا کے حضور سربسجود ہو جاتے ہیں اور خدانخواستہ اگر اللہ کو پیارا ہو گیا تو گالی کوسنے ڈاکٹر کو سننے پڑتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے —— اگر آپ لوگوں کی یہی خواہش ہے تو میں کسی وقت بھوندو کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کروں گا ویسے میرا ذاتی خیال ہے کہ قبل از وقت اگر کوئی حتمی فیصلہ نہ کیا جائے تو زیادہ مناسب ہو گا۔"

"میں سمجھی نہیں ——" شمسہ بیگم نے وضاحت طلب انداز —— میں پوچھا "آپ کا کیا خیال ہے —— نتیجہ آنے کے بعد فراز سے بات کی جائے۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" محمود حسین نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "جہاں تک نتیجہ کا سوال ہے تو فراز خدا کے فضل و کرم سے یقینی طور پر کامیاب ہو گا —— میں دراصل یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ فراز کو اُس کی خواہش کے مطابق داخلہ ضرور دلا دیا جائے لیکن فی الحال یہ نہ کہا جائے کہ آگے چل کر اُسے کیا لائن اختیار کرنی ہے۔"

"اِس سے کیا فرق پڑے گا ——"

"کیوں نہیں پڑے گا فرق۔" محمود حسین نے بیوی کو سمجھایا۔ "اس طرح اوّل تو یہ کہ فراز کا دل پڑھائی میں لگا رہے گا اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ بھوندو کی عقل بھی پختہ ہوتی جائے گی —— تعلیم مکمل ہو جانے کے بعد چاہے تو انجینیر بن جائے یا پھر مقابلے کا امتحان دے کر اعلیٰ سول افسر بھی بن سکتا ہے۔"

"یہ زیادہ مناسب رہے گا۔" شائستہ بیگم نے اس تجویز کو پسند کرتے ہوئے کہا۔

"اب کیا رائے ہے جناب کی اس خاکسار کے بارے میں۔" محمود حسین نے بیوی کو شوخی سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

"رائے تو خیر میری ہمیشہ سے آپ کے بارے میں بہت مناسب ہے البتہ آپ کا پیشہ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔"

"اس میں بھی قصور میرے پیشے کا نہیں بلکہ آپ کا اپنا ہے۔"

"وہ کس طرح ——"

"کبھی آپ دونوں آنکھوں سے میرے پیشے پر غور فرما کر دیکھیں —— ہو سکتا ہے آپ کو اپنی رائے تبدیل کرنی پڑے۔"

شمسہ بیگم کے علاوہ شائستہ بیگم بھی محمود حسین کا جواب سُن کر مسکرا دیں اور عین اُسی وقت جب ڈرائنگ روم میں دونوں کے درمیان یہ گفتگو ہو رہی تھی۔ فراز ناجیہ کے کمرے میں بیٹھا کہہ رہا تھا۔

"میرا فیصلہ اٹل ہے —— میں بڑا ہو کر فوجی بنوں گا اور ہوائی جہاز اُڑاؤں گا۔"

"ارادے نیک ہوں تو ضرور پورے ہوتے ہیں۔" عاشی نے کہا۔ "خدا نے چاہا تو آپ کے ارادے بھی ضرور پورے ہوں گے۔"

"میں نے سُنا ہے کہ فوج میں جانے کے لئے انسان کو بڑی سخت محنت کرنی پڑتی ہے۔" ناجیہ بولی۔

"میں کروں گا محنت۔" فراز نے سینہ ٹھونک کر کہا۔ "محنت کرنا تو ہر انسان کا فرض ہے۔"

"محنت تو خیر تم کر لو گے لیکن ——"

"لیکن کیا ——" عاشی نے ناجیہ کے خاموش ہو جانے پر وضاحت چاہی۔

"مجھے پپا سے درخواست کرنی پڑے گی کہ وہ تمہارے بارے میں آئندہ سے احتیاط رکھیں۔" ناجیہ نے سنجیدگی سے جواب دیا لیکن اُس کی آنکھوں کی شوخی بتا رہی تھی کہ وہ فراز کو چھیڑنا چاہ رہی ہے۔

"ماموں جان سے میں پہلے ہی اپنے ارادے کا اظہار کر چکا ہوں۔" فراز بولا۔ "اُن کی دعائیں بھی میرے ساتھ ہیں۔"

"دعائیں تو خیر میری بھی تمہارے حق میں ہوں گی لیکن اگر فوجیوں کو پتہ چل گیا کہ پپا تمہیں بھوندو کے نام سے یاد کرتے ہیں تو پھر تمہاری کامیابی کھٹائی میں پڑ جائے گی۔" ناجیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ تو ماموں جان مذاق کرتے ہیں میرے ساتھ ——" فراز نے جھینپتے ہوئے جواب دیا۔

"میری ایک بات مانو گے ——" ناجیہ تیزی سے بولی۔

"کہو ——"

"تم پپا سے کہہ دو کہ وہ تمہارے ساتھ اصلیت کا مذاق نہ کیا کریں۔"

"ہاں —— یہ ٹھیک ہے ——" فراز نے ایک دم سے ناجیہ کی بات کی تائید کی لیکن جب اپنی غلطی کا احساس ہوا اور ناجیہ کی بات کا مفہوم اُس کی سمجھ میں آیا تو جھینپ کر رہ گیا۔

"کیا اب بھی تمہارا ارادہ فوج میں جا کر ہوائی جہاز اُڑانے کا ہے۔" ناجیہ نے فراز کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا

"تمہاری بات اور ہے جو میں گڑبڑا جاتا ہوں لیکن ——"

"میری بات اور کیا ہے۔" ناجیہ نے اچانک فراز کا جملہ کاٹتے ہوئے اُسے تیز نظروں سے گھورا تو کچھ اور گڑبڑا گیا، جلدی سے بولا

"میرا مطلب ہے کہ تم بھی ماموں جان کی طرح میرے ساتھ چھیڑ خانی کرتی ہو۔"

"خیال ہے جناب کا ——" ناجیہ نے شانے اُچکا کر ایک شانِ بے نیازی سے کہا "ورنہ میں بھی آپ کو وہی سمجھتی ہوں جو پپا کہتے ہیں۔"

"یعنی یہ کہ بھوندو ——" فراز نے بڑی معصومیت سے دریافت کیا۔

"جناب ——" ناجیہ شوخی سے بولی۔ "اور یہ بھی میری ذرہ نوازی ہے جو میں آپ کو ایسا سمجھتی ہوں ورنہ کہاں آپ اور کہاں میں۔"

"بُری بات ہے ناجیہ ——" عاشی نے فراز کی حمایت لیتے ہوئے کہا۔ "تم کیوں بے چارے فراز کو تنگ کر رہی ہو —— ہمیں تو فراز کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔"

"کیوں فراز بھائی —— کیا آپ کو میری بات کڑوی لگتی ہے۔" ناجیہ نے عاشی کی بات کا جواب دینے کے بجائے فراز کی سمت تکتے ہوئے بڑی معصومیت سے دریافت کیا۔

"نہیں تو ـــــ میں نے کب کہا ـــــ" فراز نے سنجیدگی سے جواب دیا "آپس میں مذاق تو ہوتا ہی رہتا ہے۔"

"تو پھر آپ کی اجازت ہے کہ میں بھی آپ کو پاگل کی طرح بھوندو کہہ لیا کروں۔"

"تمہاری مرضی ـــــ"

"آپ بُرا تو نہیں مانیں گے ـــــ"

"نہیں ـــــ میں تمہاری کسی بات کا بُرا نہیں مانتا۔"

"اگر میں آپ کو بھوندو کے بجائے کچھ اور کہہ لیا کروں تو ـــــ"

"ناجیہ ـــــ" عاشی نے ناجیہ کو ٹوکتے ہوئے کہا "فراز عمر میں تم سے بڑا ہے، تمہیں اس کے ساتھ ایسا مذاق نہیں کرنی چاہیئے۔"

"میں نے بھلا کیا زیادتی کی ہے ـــــ" ناجیہ نے بدستور شوخی سے جواب دیا پھر فراز کو دیکھتے ہوئے بولی "حضرت اگر ہوائی جہاز اُڑا سکتے ہیں تو کیا میں ان کا مذاق بھی نہیں اُڑا سکتی ـــــ"

"مذاق اور بات ہے لیکن چھوٹے اور بڑے کی تمیز بھی ضروری ہے ـــــ" عاشی نے کہا "اندر آنی والی ہیں۔ وہ سنیں گی تو کیا کہیں گی۔"

"کہتی ہیں تو کہا کریں ـــــ میں کب پروا کرتی ہوں۔" ناجیہ نے بُرا مانتے ہوئے کہا "میں تو اسی طرح اُڑاؤں گی مذاق ـــــ اگر کسی کو بُرا لگتا ہے تو بہتر ہے کمرے سے چلا جائے۔"

"ناجیہ ـــــ میں نے کوئی ایسی بات تو نہیں کہی تھی کہ تم ـــــ"

"تم کون ہوتی ہو فراز کی حمایت لینے والی۔" اچانک ناجیہ نے پلٹ کر غصے سے کہا "بڑی آئیں مجھے نصیحت کرنے والی ـــــ نہیں چاہیئے مجھے نصیحت اور دور اندیشی کی باتیں۔"

"ناجیہ پلیز، سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"نہیں سمجھتی ـــــ" ناجیہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی پھر تیزی سے اٹھی اور پیر پٹکتی خواب گاہ سے باہر نکل گئی۔

"ارے ـــــ ارے، ناجیہ، سنو تو سہی۔" فراز نے ناجیہ کو روکنا چاہا پھر خود بھی اُس کے تعاقب میں کمرے سے باہر آ گیا۔

عاشی نے ایک سرد آہ بھری اور ہاتھ مل کر خاموش رہ گئی ـــــ!!

نرس نے کھڑکی کے پٹ کھولے تو ہوا کا خوشگوار اور معطر جھونکا ممدو کی روح کو تر و تازہ کر گیا۔ اُس نگاہوں کا زاویہ بدل کر دیکھا، کھڑکی کے باہر مصنوعی جھیل کے کنارے سبزے پر آج بھی مریضوں اور اُن سے ملنے والوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی، چمکتی جھلملاتی اور قیمتی گاڑیوں کی قطار دُور تک نظر آ رہی تھی۔

ممدو نے منہ کھول کر ایک طویل سانس لی پھر نرس سے بولا،

"آج دوپہر کو ڈاکٹر صاحب نہیں آئے تھے۔"

"ہاں ـــــ آج اُن کی بیٹی کی سالگرہ ہے۔" نرس نے ممدو کے قریب آ کر اُسے انتہائی نرم اور شفیق لہجے میں بتایا "لیکن وہ چراغ جلے بعد ایک راؤنڈ ضرور لیں گے۔"

"میرے بارے میں اب اُن کی کیا رائے ہے۔" ممدو نے آہستہ سے پوچھا۔

"تمہارے لئے اُن کی رائے بہت اچھی ہے۔" نرس نے اپنے گداز ہونٹوں پر ایک جاندار مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا "دوسرے مریضوں کے مقابلے میں تمہاری صحت حیرت انگیز طور پر بحال ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے تم کو بہت جلد ہسپتال سے رخصت کر دیا جائے گا۔"

"سچ ـــــ" ممدو کے چہرے پر زندگی کی بے پناہ مسرتیں جاگ اُٹھیں۔

"خود ترسی محسوس کرتے ہو۔" نرس نے ٹمپریچر لینے کی خاطر تھرمامیٹر ممدو کی زبان کے نیچے رکھتے ہوئے کہا پھر دستی گھڑی پر سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے بولی "جب تمہیں یہاں داخل کرایا گیا تھا اُس وقت تمہاری حالت اچھی نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے بھی تفصیلی معائنے کے بعد مایوس کن باتیں کی تھیں لیکن اب تمہاری رپورٹ سے وہ بھی مطمئن ہے۔ تمہارے پھیپھڑے پر جو دھبہ تھا وہ بھی گھٹ کر تیزی سے اپنا نشان ختم کرنے لگا ہے ـــــ"

ممدو تھرمامیٹر کی وجہ سے نرس کی بات کا جواب دینے سے قاصر تھا لیکن اس کی نگاہیں نرس کے چہرے پر مرکوز تھیں اور نرس کی باتوں کو وہ بہت غور سے سُن رہا تھا۔

"گڈ ـــــ" نرس نے تھرمامیٹر نکال کر اُسے دیکھتے ہوئے کہا "اس وقت تمہارا بخار بھی نارمل ہے، یہ صحت کی علامت ہے۔"

"مجھے ـــــ مجھے چھٹی کب تک مل جائے گی۔" ممدو نے پھر وہی سوال دہرایا جو وہ روزِ اوّل سے پوچھ رہا تھا۔

"دیکھو چاچا ـــــ تم نے پھر وہی بات کی۔" نرس نے میز کی دراز کھول کر دوائیں نکالتے ہوئے شکایتی انداز میں کہا "تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اب یہ سوال اس وقت تک نہیں پوچھو گے جب تک ڈاکٹر خود اپنی زبان سے تمہیں جانے کی اجازت نہ دے دے۔"

"غلطی ہو گئی ـــــ" ممدو نے جلدی سے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا "آئندہ احتیاط رکھوں گا۔"

"اچھا ـــــ اب تم دوائیں پی لو پھر میں تمہارے مہمان کو اندر بلاتی ہوں۔"

"مہمان ـــــ" ممدو چونکا، دوا پینے کی خاطر بستر سے اُٹھ کر آرام کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے بولا "مجھ سے کون آیا ہو گا ملنے کے لئے ـــــ"

"کوئی پرانا واقف کار لگتا ہے۔" نرس نے اُسے بتایا "کہہ رہا تھا کہ بہت تلاش کرنے کے بعد اُسے یہاں کا پتہ معلوم ہوا ہے۔"

"کون ہو سکتا ہے ـــــ" ممدو نے خود اپنے آپ سے سوال کیا پھر نرس سے بولا "کیا نام بتایا ہے مہمان نے۔"

"میں نے نام نہیں پوچھا ـــــ البتہ آج میں نے پہلی بار اُسے دیکھا ہے۔"

"اکیلا ہے ـــــ"

"ہاں ـــــ لیکن تمہیں اتنی پریشانی کیا ہے، دو منٹ بعد خود ہی دیکھ لینا۔"

نرس نے بڑے پیار سے ممدو کو دوا پلائی، اچھے صاف کپڑے سے اُس کا منہ صاف کیا پھر چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی کمرے سے باہر چلی گئی۔

ممدو کی آنکھیں دروازے پر جمی تھیں، سینی ٹوریم میں اُسے خاصی مدت ہو گئی تھی لیکن اس عرصے میں محمود حسین اور اُن کی کوٹھی کے مکینوں کے سوا کوئی اور اُس سے ملاقات کرنے نہیں آیا تھا ـــــ تھا بھی کون جو اُس کا انتظار کرتا ـــــ وقت کے بے رحم ہاتھوں نے ایک ایک کر کے سارے ہی رشتے ناطے ختم کر دیئے تھے ایک رحیمو کا سودہ بھی کمانے کھانے کے چکر میں پھنس کر سمندر پار نہ جانے کہاں جا کر گم ہو گیا تھا اور اب ـــــ صرف عاشی کی ایک ذات تھی جو روح بن کر اُس کے وجود کی گہرائیوں تک اُتر گئی تھی ـــــ عاشی نہ ہوتی تو اُسے اپنی زندگی کی اتنی ضرورت بھی نہ ہوتی لیکن عاشی کی خاطر تو اُس نے بارہا اپنے لرزتے اور کپکپاتے ہاتھ... ہونے کے قابل نہ ہو جائے، پوری طرح زمانے کے نشیب و فراز سمجھنے کی عادی نہ ہو جائے اور اس میں بڑوں جیسی سوجھ بوجھ نہ آ جائے۔

عاشی کے سوا اور تھا بھی کون جس کے لئے وہ زندگی کی تمنا کرتا۔

زندگی ـــــ

جو ہر لمحہ اُس سے روٹھنے کے لئے کمربستہ نظر آتی تھی۔

لیکن ـــــ

وہ زندگی کی باقی ماندہ سانسوں کو بہت سنبھال کر خرچ کر رہا تھا۔
اُسے اپنے موذی مرض کا بخوبی علم تھا۔
وہ جانتا تھا کہ قدرت نے اُسے جان لیوا مرض کے چنگل میں بُری طرح جکڑ دیا ہے۔
مگر ——
اُسے یہ بھی یقین تھا کہ فرض کی ادائیگی سے پیشتر اس کی بچی کھچی سانسیں اُس کا ساتھ نہیں چھوڑیں گی۔
اُسے قدرت پر بھرپور اعتماد تھا۔
یقین کامل تھا ——
یا پھر ——
وہ خود اپنے آپ کو فریبِ زندگی کا شکار بناتے ہوئے تھا زندہ رہنے کے لیے اور زندگی کو سہارا دینے کے لیے اُس نے سہارا دامن تھام لیا تھا۔ دروازے پر قدموں کی آہٹ ہوئی تو ممدو خوابوں کی دنیا سے نکل آیا۔ اُس نے پوری توجہ تمام تر بینائی سمیٹ کر آنے والے کو دیکھا تو دھک سے رہ گیا —— اُسے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آ رہا تھا —— اب بھی خواب دیکھ رہا تھا —— لیکن نہیں —— وہ خواب نہیں حقیقت تھی —— زندگی کی ایک کرن جو آج ایک طویل مدت کے بعد افتخار احمد کی صورت میں لپٹ کر پھر اُس کے سامنے آ گئی تھی۔

ممدو کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں اُس نے اپنے کپکپاتے لرزتے ہونٹ سختی سے دانتوں بھینچ لئے، ماضی کے زخم تازہ ہوئے تو اُس کا پورا وجود پھوڑے کی مانند دُکھنے لگا۔ چند لمحے وہ ٹکٹکی باندھے پھٹی نظروں سے افتخار احمد کو گھورتا رہا پھر جب اُسے اپنی نگاہوں پر یقین آ گیا تو اُس کے جسم کے اندر نہ جانے کیا کچھ اُبلنے سا ہونے لگا۔ اُس نے آہستہ سے نظریں جھکا لیں، ماضی کے دریچوں میں جھانکا تو ساری جان سے تھرا رہ گیا۔

بھولی بسری باتیں، جو ممدو کے بوڑھے وجود کے ماہ و سال پر کندہ تھیں ایک ایک کر کے تازہ ہونے دُھندلی دُھندلی تصویریں بن کر اُس کی نگاہوں کے سامنے رینگنے لگیں اور مدتوں کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ یادوں انبار تلے دبتا چلا جا رہا ہے، اُس کی سانسیں اٹک اٹک کر اپنا سفر پورا کر رہی تھیں، اُس کا دل سینے کی گہرائیوں آہستہ آہستہ گھٹ رہا تھا اور پھر ——

ایک مانوس اور جانی پہچانی آواز نے ممدو کو چونکا دیا۔

"ممدو بابا —— میں افتخار احمد ہوں۔"

ممدو بابا نے آہستہ سے نظریں اُٹھا کر افتخار احمد کو دیکھا، اُس کی پلکوں کے گوشے نم ہونے لگے۔

"میں —— میں فائزہ کا بدنصیب بھائی ہوں۔" افتخار احمد کی آواز کانپ رہی تھی۔ "در در بھٹکتے آج بڑی مشکلوں سے تمہارے پاس پہنچا ہوں ——"

ممدو خاموش رہا —— بُت بنا افتخار احمد کو تکتا رہا۔

"میں سب کچھ گنوا بیٹھا ہوں —— تمہارا بھی۔" افتخار احمد رندھی ہوئی آواز میں بولے۔ "مجھے معاف ممدو بابا ——"

ممدو نے اپنے ہونٹ کاٹ لئے۔ ایسا نہ کرتا تو دل پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔

"تم —— کب سے علیل ہو۔"

"تقریباً تین ماہ ہو گئے ——" ممدو نے اپنے حواس جمع کرتے ہوئے بڑی نحیف آواز میں کہا۔

"اب طبیعت کیسی ہے ——" افتخار احمد نے ایک خالی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"زندگی کے دن پورے کر رہا ہوں۔" ممدو نے سرد آہ بھری

"میں نے نرس سے دریافت کیا تھا۔" افتخار احمد بولے۔ "اُس کا کہنا ہے تم تیزی سے صحتیاب ہو رہے ہو۔"

"ہاں ——"

"باقی لوگ کہاں ہیں۔"

افتخار احمد نے تھوڑے توقف کے بعد دبی زبان میں دریافت کیا تو ممدو کے تنفس کی رفتار ایک بار بے ترتیب ہونے لگی، وہ افتخار احمد کے جملے کا مفہوم سمجھ رہا تھا —— لیکن کیا جواب دیتا، ہونٹ چبا کر رہ گیا ——

"مجھے فائزہ کا آخری خط ملا تھا۔" افتخار احمد نے لاہور والے گھر کے پتے پر ملنے والے خط کا حوالہ دیتے ہوئے بس اس کہا۔ "فائزہ نے اس خط میں —— اپنی بچی کا ذکر کیا تھا۔"

ممدو خاموش رہا البتہ اُس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو کر آنکھوں سے چھلک اُٹھا، چہرہ آنسوؤں سے بھیگنے لگا۔

"ممدو بابا —— میں نے یہ منحوس خبر بھی لاہور میں سُنی تھی کہ فائزہ ——"

"ہاں ——" ممدو تڑپ کر بولا "وہ بدنصیب، غموں کی ماری اب اس دنیا میں نہیں ہے۔"

"اور اُس کی بچی —— عائشہ۔"

"عاشی —— وہ زندہ ہے۔" ممدو نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا "اس سال تو اُس نے نویں جماعت کا امتحان دیا ہے۔"

"کہاں ہے عاشی ——" افتخار احمد نے مضطرب انداز میں کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

"وہ بہت خوش ہے افتخار میاں۔" ممدو ہاتھ ملتے ہوئے بولا "قدرت نے اُسے سر چھپانے کے لئے بھلے لوگوں کا سہارا بخش دیا ہے —— وہ اپنے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی اور میں —— میں نے اُسے کچھ بتانا مناسب کبھی نہیں سمجھا —— کیا فائدہ تھا ——"

"میں سمجھ رہا ہوں تمہارا مطلب —— لیکن —— اب میں واپس آ گیا ہوں۔"

"ہاں —— مگر آپ نے بھی واپس پلٹنے میں بہت دیر کر دی۔" ممدو نے آہستہ سے کہا پھر نظر گھما کر کھلے دریچے سے باہر دیکھنے لگا۔

"عاشی کا باپ کہاں ہے ——؟" افتخار احمد نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"وہ —— وہ بھی موجود ہے۔"

"کہاں ہے ——" افتخار احمد تلخ لہجے میں بولے "میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں، میں اُس سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اُس نے میری بہن سے بیوفائی کیوں کی، عائشہ سے کیوں منہ موڑ لیا، مجھے بتاؤ ممدو بابا۔ وہ کہاں ہے۔"

"وہ —— وہ یہاں نہیں ہے۔" ممدو نے جلدی سے کہا "ملک سے باہر گیا ہوا ہے۔"

"اُس کا کوئی پتہ نشان تو ہوگا۔" افتخار احمد کے لب و لہجے میں ترشی پیدا ہونے لگی، چہرے کے تاثرات بگڑنے لگے اور آنکھیں سُرخ ہونے لگیں "تم مجھے صرف اُس کا نام اور پتہ بتا دو۔ باقی میں خود سمجھ لوں گا۔"

"عاشی کو حالات کا علم ہوا تو اُس کی زندگی پر بُرا اثر پڑے گا۔" ممدو نے سمجھانے کی کوشش کی "اُس کی ذہنی حالت ناقابلِ رحم ہو گئی تو خدانخواستہ ایک سال برباد ہو جائے گا —— وقت گزر جائے تو پلٹ کر واپس نہیں آتا۔"

"افتخار میاں —— میں نے بھی اسی لئے اپنی زبان پر قفل ڈال لئے ہیں —— عاشی کسی قابل ہو جائے تو پھر دیکھا جائے گا۔"

"لیکن آخر وہ ہے کون ——" افتخار احمد نے تلملاتے ہوئے سوال کیا۔

"میں —— میں اُسے بہت قریب سے جانتا ہوں۔" ممدو نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا "میں نے اُسے بہت نزدیک سے دیکھا ہے لیکن مجھے —— وقت کا انتظار ہے —— وقت سے پہلے میں اپنی زبان بند رکھوں گا، اس میں عاشی کی بہتری ہے اور عاشی کے مستقبل کے لئے میں اپنی زندگی کی ایک ایک سانس قربان کر سکتا ہوں۔"

"لیکن ——" افتخار احمد نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے ہونٹ چبا کر پوچھا "کیا تم اس شخص کو بے قصور یا قابلِ رحم کہہ سکتے ہو جس کی بدولت میری مظلوم فائزہ نے موت کو گلے لگا لیا اور عاشی اپنی جنت سے محروم ہو گئی۔"

"حالات کے دھارے بڑے تلخ اور المناک ہوتے ہیں۔" ممدو نے ایک سرد آہ بھری "کون مظلوم ہے

اور کون قصوروار ——— اس کا فیصلہ تو وقت ہی کرے گا ———"

"عاشی ——— عاشی کہاں رہتی ہے؟" افتخار احمد نے ممدو کی حالت کے پیشِ نظر بات کا رُخ پھیرتے ہوئے سوال کیا۔

"یہیں اسی شہر میں رہتی ہے۔" ممدو نے رک رک کر جواب دیا۔ "بیرسٹر محمود حسین صاحب کے یہاں بڑے ہی بھلے اور خدا ترس لوگ ہیں، عاشی کو بالکل اپنی اولاد کی طرح سمجھتے ہیں۔"

"بابا ——— میں عاشی سے ملنا چاہتا ہوں، اپنے خون کو قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں افتخار احمد گلوگیر لہجے میں بولے۔ "میں اسے گلے لگانا چاہتا ہوں اور اسے بتانا چاہتا ہوں کہ میں۔ میں کون ہوں۔"

"نہیں ——— نہیں ———" ممدو کا لہجہ یکلخت کٹھور ہو گیا۔ "اگر عاشی کو حالات کا علم ہو گیا تو میری محنت رائیگاں ہو جائے گی ——— اُس کا مستقبل محفوظ نہیں رہے گا ——— نہیں افتخار میاں، نہیں ——— اگر آپ عاشی سے ملنا چاہتے ہیں تو آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا ———"

"وعدہ ——— کیسا وعدہ ———"

"آپ عاشی پر اپنے رشتے کی نوعیت کا اظہار نہیں کریں گے۔"

"مگر ——— ممدو بابا ———"

"ضد نہ کیجئے افتخار میاں، ممدو مجسم التجا بن گیا۔" میں نے آپ کے گھر کا نمک کھایا ہے۔ میں نمک حرام نہیں ہوں، میری رگوں میں دوڑنے والے لہو میں اگر ملاوٹ ہوتی تو اس وقت میں ہسپتال میں پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہوتا ——— جانے کب کام کر چکا ہوتا لیکن ——— لیکن قدرت نے میری سانسوں کو عاشی کے مستقبل کے ساتھ نتھی کر دیا ہے اس لئے ——— میں نہیں چاہتا کہ قبل از وقت عاشی کو اپنے ماضی کے بارے میں حالات کا علم ہو۔ مجھ سے وعدہ کیجئے افتخار میاں ——— آپ اس سلسلے میں اپنی زبان بند رکھیں گے ——— عاشی سے کچھ نہیں کہیں گے۔"

افتخار احمد نے ممدو کے خلوص کو محسوس کیا تو ثبات میں سر کو جنبش دینے لگے، ماضی کے ذکر نے کچھ زخم ہرے کئے تو اُن کی آنکھیں نمناک ہو گئیں، چند لمحے خاموش کھڑے ممدو کی شکل میں عظمت کے مینار کو تکتے رہے پھر بولے۔

"میں ——— عاشی سے کچھ نہیں کہوں گا۔"

"شکریہ ———" ممدو کی بوڑھی نگاہوں میں زندگی چمک اُٹھی۔ "بہت بہت شکریہ افتخار میاں ———"

"عاشی کیسی ہے بابا ——— میرا مطلب ہے کہ اب تو وہ خدا کے فضل سے کافی بڑی ہو گئی ہوگی۔" افتخار احمد نے پوچھا۔ "میں اُسے دیکھوں گا تو پہچانوں گا کس طرح ——— وہ یہاں کب آتی ہے کس وقت آتی ہے۔"

"ہفتے میں ایک بار ضرور آتی ہے۔" ممدو بولا۔ "پہلے اُسے میری بیماری کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا جب معلوم ہوا تو وہ کسی معصوم فاختہ کی طرح سہم کر رہ گئی تھی، ٹکر ٹکر دیکھنے لگی تھی، اُسے یقین دلا دیا ہے کہ میں بہت جلد اچھا ہو جاؤں گا، تبھی تو بڑی پُرامید ہے۔ جب بھی مجھ سے ملنے آتی ہے مہکتے ہوئے تازہ پھولوں کا گلدستہ ضرور لاتی ہے ہو سکتا ہے وہ آج ہی آ جائے۔"

افتخار احمد کی کیفیت قابلِ دید تھی، وہ بڑی دیر تک ممدو سے باتوں میں مصروف رہے ماضی کو کریدتے رہے۔ کبھی اُن کی آنکھوں کے گوشے نمناک ہو جاتے، کبھی آنکھیں جل کر انگاروں کی مانند سُرخ ہو جاتیں، وہ بار بار ملنے لگتے، کبھی تیزی سے اُٹھ کر کمرے میں چہل قدمی شروع کر دیتے اور پھر اچانک کھڑکی کے قریب جا کر باہر دور پر عاشی کو ہجوم میں تلاش کرنے لگتے ——— اور کچھ دیر بعد تھک ہار کر دوبارہ کسی تھکے اور لٹے ہوئے مسافر کی طرح واپس آ کر آرام کرسی پر گر جاتے۔

ممدو کی اپنی کیفیت بھی افتخار احمد سے کچھ مختلف نہ تھی۔ اُس کے اپنے دل کی دھڑکنیں بھی افتخار احمد کے اچانک آ جانے سے غیر یقینی ہو گئی تھیں، سہرچند کہ افتخار احمد نے عاشی کے سلسلے میں اپنی زبان بند رکھنے کا عہد کر لیا تھا لیکن اگر یہ عہد ٹوٹ گیا تو کیا ہوگا، کیا اُمید و بیم کا وہ شیرازہ بکھر جائے گا جسے سمیٹے رکھنے کی خاطر اُس نے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا تھا۔

کیا عاشی رشتوں ناطوں کو پہچان کر اُس کے ایثار کو فراموش کر دے گی ———
کیا خون کا رنگ قربانیوں کے رنگ پر غالب آ جائے گا۔
کیا برسوں کی رفاقت لمحوں میں کچے دھاگوں کی طرح ٹوٹ جائے گی ———
اور ———
اگر ایسا ہوا تو وہ کیا کرے گا ——— ؟
اُس کی زندگی میں باقی کیا بچے گا ———
آنسو ———
آہیں ———
کیا وہ عاشی کو بھول سکے گا ———
نہیں ——— نہیں ——— نہیں ———
عاشی تو اُس کی زندگی کا ایک جزو بن چکی تھی ———
اُس کے دل کی دھڑکنوں میں رچ بس گئی تھی ———
اُس کی سانسوں میں گھل مل کر رہ گئی تھی ———
پھر ———
دل کی دھڑکنوں اور سانسوں کے ٹوٹ جانے کے بعد بھلا وہ کس طرح زندہ رہ سکتا تھا۔
عاشی کی جُدائی تو اُس کے لئے موت کی آخری ہچکی ہوگی ———
موت ——— جس سے وہ محض عاشی کے لئے فرار حاصل کر رہا تھا ———
ورنہ ——— اُس کی زندگی میں عاشی کے سوا اور کیا تھا ——— !!!

کمرے کے دروازے کے باہر پختہ روش پر قدموں کی آہٹ اُبھری تو ممدو کے دل کی دھڑکنیں اچانک تیز ہو گئیں، وہ ان قدموں کی آہٹ کو پہچانتا تھا، ان آہٹوں کو سننے کی خاطر تو وہ پورے چھ روز تک منتظر رہتا تھا ——— پھر بھلا ان قدموں کی آہٹ کو وہ کیسے نہ پہچانتا ——— اس کی نگاہیں دروازے پر جم گئیں۔ ایک ایک لمحہ اُس کے وجود کے لئے بڑا جاں گسل ثابت ہو رہا تھا اور پھر ———

دروازے کے پٹ کھلے ———

عاشی مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی، ہاتھوں میں تازہ پھولوں کا مہکتا گلدستہ لئے ایک شانِ بے نیازی سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ممدو کے قریب آ کر تھم گئی، زندگی سے بھرپور مسکراہٹوں کو ہونٹوں پر بکھیر کر اُس نے ممدو کو بڑی پیار بھری نظروں سے دیکھا ——— گلدستہ آگے بڑھاتے ہوئے اُس کے ہونٹ گنگنا اُٹھے۔

"بابا ——— اب تم کیسے ہو۔"

"تیری دعائیں ہیں جو زندگی کی طرف گھسیٹ لائی ہیں۔" ممدو نے گلدستہ لیتے ہوئے پیار سے کہا۔

"مجھے یقین تھا کہ تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔" عاشی بڑے اعتماد سے بولی۔ "دل کی گہرائیوں سے جو دعا مانگی جائے وہ کبھی رائیگاں نہیں جاتی ——— خدا بڑا رحیم و کریم ہے۔"

"اچھا ——— تو نے میرے لئے کیا دعا مانگی تھی۔"

"یہی کہ تمہارا رفیق و شفیق سایہ میرے سر پر تا قیامت قائم رہے۔"

ممدو کی آنکھیں خوشی سے بھیگ گئیں پھر اچانک اُس نے نظریں گھما کر افتخار احمد کو دیکھا جو ٹکٹکی باندھے بغور کسی بے جان مجسمے کی مانند عاشی کو گھور رہے تھے۔

"عاشی ———" ممدو نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا۔ "ان سے ملو بیٹی ——— یہ میرے بڑے دیرینہ دوست اور محسن ہیں ——— افتخار میاں۔"

عاشی نے پلٹ کر پہلی بار افتخار احمد کو دیکھا پھر آہستہ سے بولی

"تسلیم ——— انکل"

"جیتی رہو، خوش رہو" افتخار احمد نے بے خودی کے انداز میں کہا پھر آہستہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور عاشی پر بدستور مرکوز رہیں

"آپ کھڑے کیوں ہو گئے انکل ——— بیٹھیے نا ———"

"ہاں ——— آں ———"

افتخار احمد نے چونکتے ہوئے جواب دیا ——— اُن کی نظریں بدستور عاشی پر مرکوز تھیں ——— کی دھڑکنیں ہر لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھیں اور دھڑکنوں کی زبان پر ایک ہی نام بار بار صدائے بازگشت بن کر گونج رہا تھا۔

فائزہ ——— !

فائزہ ——— !!

فائزہ ——— !!!

جھلملاتی ہوئی گاڑی سینی ٹوریم کی حدود سے باہر نکلی تو وہ کھڑکی سے باہر بھاگتے ہوئے نظاروں کو دیکھنے لگی۔ ممدو کی حالت دیکھ کر اُسے بڑا سکون ہوا تھا۔ وہ روز بروز تندرست ہو رہا تھا، اپنی تشفی کے لیے وہ براہ راست بڑے ڈاکٹر سے بھی مل چکی تھی، نرس سے بھی دریافت کیا تھا اور جب اُسے معلوم ہوا کہ ممدو تیزی سے روبصحت ہو رہا ہے تو وہ شگفتہ گلاب کی مانند کھل اٹھی تھی۔ اُس کی دُعائیں رائیگاں نہیں گئی تھیں۔

قدرت نے اُس کی زبان سے نکلی ہوئی معصوم دعاؤں کی لاج رکھ لی تھی۔

ممدو کو موت کے منہ سے بچا لیا تھا ———

اُس کے سر پر ایک بزرگ کا سایہ برقرار رہنے دیا تھا۔

وہ خوش خوش ممدو کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ ممدو کے چہرے پر زندگی کی مسرت دمک رہی ہوں گی، خون کی سُرخیوں نے ان بیمار زردیوں کو اپنے اندر جذب کر لیا ہوگا جسے دیکھ کر وہ اندر ہی اندر لرز جاتی تھی ——— کانپ اٹھتی تھی ——— کیسے کربناک لمحے تھے وہ ——— وہ دن ——— جو ایک بھیانک خواب بن کر اُس کی زندگی میں داخل ہوئے تھے اور اب سراب کی مانند ٹوٹ کر رہ گئے تھے ——— ایک نئی اور خوشگوار صبح طلوع ہو رہی تھی۔

وہ خوشیوں کے خزانے لئے ممدو کے سامنے گئی تھی ——— ممدو کے چہرے پر زندگی کے تاثرات تو تھے لیکن نہ جانے کیوں وہ کچھ کھویا کھویا ——— کچھ ابھا ابھا سا نظر آ رہا تھا، یوں جیسے زندگی کی خوشگوار راہوں پر اچانک کوئی موڑ کاٹتے ہوئے وہ یکلخت سہم کر تھم گیا ہو۔

عاشی کو ممدو کے لب و لہجے پر بھی تعجب ہو رہا تھا لیکن پھر اُس کی الجھن کی وجہ عاشی کی سمجھ میں آ گئی کمرے میں افتخار کی موجودگی نے ممدو کو محتاط بنا رکھا تھا۔ عاشی سے گفتگو کرتے ہوئے بھی وہ خود کو بہت نپے دیئے تھا۔

مگر کیوں ——— ؟

افتخار احمد کو تو ممدو نے اپنے دیرینہ دوست اور محسن کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا پھر وہ اس قدر احتیاط کیوں برت رہا تھا ——— اس قدر چپ چپ کیوں تھا ——— یوں جیسے اندر ہی اندر کوئی گھٹن اُسے پریشان کر رہی ہو ——— جیسے وہ افتخار احمد کے اچانک آ جانے سے خوش نہ ہو ——— لیکن کیوں ——— ؟

دوست تو قدرت کا عطیہ ہوتا ہے۔

نعمت ہوتا ہے۔

پھر ممدو اس نعمت کو پا کر ملول کیوں ہو گیا تھا ——— ؟

عاشی کا ذہن افتخار احمد کی شخصیت کے تانوں بانوں میں الجھتا گیا۔ جب اُس نے ہوش سنبھالا تو اُسے اپنے گرد صرف دو صورتیں نظر آئی تھیں ——— ایک چہرہ ممدو کا تھا جو آج بھی بوڑھے برگد کی طرح اس پر سایہ

کیے ہوئے تھا اور دوسرا چہرہ رحیمو کا تھا جو اُسے بچپن ہی میں چھوڑ کر چلا گیا تھا اور وقت نے اس چہرے کے نقوش عاشی کے ذہن میں دُھندلا دیئے تھے ——— صرف ایک مانوس سا عکس باقی رہ گیا تھا۔

ان دو چہروں کے علاوہ آج ممدو نے اسے پہلی بار افتخار احمد سے ملایا تھا ——— افتخار احمد، جو ممدو کا دیرینہ دوست تھا ——— محسن تھا ——— لیکن اُسے پا کر ممدو کو خوشی نہیں ہوئی، نہ جانے کیوں وہ اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گیا تھا۔

کیوں ——— ؟

آخر کیوں ——— ؟؟

کیا ماضی کا کوئی ایسا حساب باقی رہ گیا تھا جسے یاد کر کے ممدو گنگ ہو گیا تھا۔

کیا احسانوں کا بوجھ اتنا زیادہ تھا جسے اچانک محسوس کر کے ممدو کا وجود بوجھل ہونے لگا تھا۔

لیکن ممدو نے تو افتخار احمد کو اپنا دوست کہا تھا۔

اور ———

دوستوں کے حساب تو ہمیشہ دلوں میں ہوتے ہیں۔

پھر ———

احسانوں کا بوجھ دکھن بن کر ممدو کے چہرے پر کیوں اُبھر آیا تھا ——— ؟

عاشی کا معصوم ذہن الجھتا رہا، اُسے ممدو کے رویئے پر حیرت ہو رہی تھی ——— وہ افتخار احمد کے بارے میں بھی بڑی سنجیدگی سے غور کر رہی تھی ——— ممدو کی کیفیت پا لینے کے بعد اُس نے افتخار احمد کو بڑی توجہ سے محسوس کرنے کی کوشش کی تھی، وہ اُن کے وجود کی گہرائیوں میں جھانک کر اس راز کو پانا چاہتی تھی جس نے ممدو کو گنگ ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا، مگر اُسے اپنے ارادوں میں کامیابی نہیں ہوئی البتہ اُس نے افتخار احمد کی شخصیت کو نہ جانے کیوں بڑا مانوس سا محسوس کیا تھا ——— مانوس اور دیکھا بھالا سا۔

جیسے وہ افتخار احمد کو پہلے سے جانتی تھی۔

جیسے اُس کے معصوم دل کی دھڑکنوں میں اُس چہرے کی جھلکیاں بڑی مدت سے محفوظ تھیں۔

ایک مانوس چہرہ ——— جسے اُس نے پہلی بار دیکھا تھا۔

اُس کے چہرے کے نقوش کس قدر روشن اور تابناک نظر آ رہے تھے۔

اُن کی آنکھوں میں کتنا پیار، کتنی محبت اور کس قدر خلوص تھا۔

کیسا شفیق لہجہ تھا ———

کتنی مٹھاس تھی اس طرزِ تکلم میں ———

اور ———

یہ سب کچھ محض یونہی تو نہیں ہو سکتا تھا ——— ممدو نے اس شخصیت کو اپنا دوست اور محسن کہا تھا اور عاشی نے اُس کی شخصیت میں اپنائیت اور محبت کا وہ دامنوں اور لازوال جذبہ محسوس کیا تھا جو عاشی نہیں تھا ——— بڑا انوکھا اور گمبھیر تھا ——— بے حد اپنائیت کا وہ احساس یوں ہی تو عاشی کے وجود میں زندگی کی لہر بن کر نہیں اُبھرا تھا ——— گفتگو کرنے کا وہ کھویا کھویا اور محتاط سا انداز اتنا طلسمی تھا کہ عاشی اُس کے سحر میں ڈوبتی چلی گئی ——— لب و لہجے کی مقناطیسیت نے جیسے اُس کے دل کو موہ لیا تھا ——— اُس کے خون کی گردش یونہی تو تیز نہیں ہو گئی تھی ———

افتخار احمد سے پہلے بھی وہ انجانے لوگوں سے رسمی گفتگو کر چکی تھی لیکن آج سے پہلے اُس کے دل کی دھڑکنوں میں اپنائیت کا وہ احساس تو پہلے کبھی نہیں ابھرا تھا ——— پہلے تو اُس نے کبھی کسی کو اس قدر پُرخلوص نہیں پایا تھا۔

پھر آج اُس کے دل کی یہ کیفیت کیوں ہوئی تھی

کیوں ——— ؟

آخر کیوں ——— ؟؟

وہ اپنے خیالوں میں گم تھی کہ ڈرائیور کی آواز اُس کے کانوں میں گونجی اور اُس کے مصور
کے تانے بانے ٹوٹ کر بکھر گئے۔ وہ خواب کی دنیا سے چونک کر ہوش کی دنیا میں آگئی۔ ڈرائیور نے اُس کی فو
محسوس کرتے ہوئے دبی زبان میں مگر بڑی اپنائیت سے دریافت کیا تھا۔

"عاشی بٹیا ——— ممدو بابا کی طبیعت تو خدا کے فضل سے ٹھیک ہے نا ———"

"ہاں چاچا ——— بابا کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہے۔" اُس نے سنبھل کر بڑے ادب سے بوڑھے
کے سوال کا جواب دیا۔

"ڈاکٹر کیا کہتے ہیں ———"

"اگر خدا کو منظور ہوا تو بابا بہت جلد گھر واپس آجائیں گے ———"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" ڈرائیور نے صدق دل سے کہا۔

"تم بھی دُعا کرنا چاچا کہ بابا جلدی ٹھیک ہو کر واپس آجائیں ———"

"میں تو ہر نماز میں دعا کرتا ہوں بٹیا ———" ڈرائیور بولا "ممدو بابا کے نہ ہونے سے کوٹھی کی ر
اُداس اُداس نظر آتی ہے۔"

ڈرائیور سے باتیں کرتی وہ کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوئی تو دروازے پر ہی شرفو سے مڈبھیڑ ہوگئی
کچھ اُلجھا اُلجھا سا نظر آرہا تھا۔ قریب ہی سفید رنگ کی ایک کار بھی کھڑی تھی۔

"کیا بات ہے شرفو ———" اُس نے گاڑی سے اُترتے ہوئے شرفو سے دریافت کیا "تم پریشان کیوں ہو ——— کیا ناجیہ نے پھر ڈانٹ ڈپٹ کی ہے ———"

"نہیں ———" شرفو نے جلدی سے کہا "بڑے سرکار کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیا ہوا انکل کو ———" عاشی کا دل دھک سے رہ گیا۔

"یہ نہیں ——— اندر ڈاکٹر صاحب آئے ہوئے ہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب ———"

عاشی نے ایک نظر سفید رنگ کی گاڑی پر ڈالی پھر لمبے لمبے قدم اُٹھاتی کوٹھی کے اندر چلی گئی۔ ا
سے گزرتے ہوئے اُس کی نظر ڈاکٹر پر پڑی جو شمسہ بیگم کے ساتھ سامنے سے آرہا تھا۔ وہ اپنی جگہ تھم گئی۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔" ڈاکٹر کہہ رہا تھا "کام کی زیادتی اور تکان کی وجہ سے چکرا گیا تھا۔"

"ڈاکٹر ——— کہیں آپ مجھ سے کچھ چھپا تو نہیں رہے ہیں۔" شمسہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا "آج سے پہلے ا
کی طبیعت کبھی اس انداز میں خراب نہیں ہوئی تھی ———"

"خدا پر اعتماد اور بھروسہ رکھئے، محمود صاحب کو کچھ نہیں ہوا۔ دو تین روز آرام کرلیں تو طبیعت بحال ہوجائے گی۔"

"آپ معائنہ کے لئے دوبارہ کب آئیں گے۔"

"ضرورت تو نہیں لیکن آپ کے اطمینان کے لئے صبح مطب سے اُٹھتے ہوئے ایک چکر لگا لوں گا۔"

"میں آپ کی بے حد شکر گزار ہوں گی ڈاکٹر۔"

"آپ شرمندہ کر رہی ہیں ———" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا پھر بولا "کوشش کیجئے گا کہ محمود صا
دو تین روز کے لئے اپنی تمام مصروفیات بالکل ترک کردیں۔ آرام کرنے سے اُن کی طبیعت پر خوشگوار اثر پڑے گا۔"

"میں ایسا ہی کروں گی ڈاکٹر۔"

شمسہ بیگم ڈاکٹر کو دروازے تک چھوڑ کر واپس آئیں تو عاشی نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا

"آنٹی ——— یہ اچانک انکل کو کیا ہوا۔"

"یونہی ذرا چکر سا آگیا تھا کام کی زیادتی اور تکان کی وجہ سے۔"

عاشی نے معصوم نظروں سے شمسہ بیگم کے چہرے کا بغور جائزہ لیا، وہ ڈاکٹر کی گفتگو بھی سن چکی تھی لیکن
پھر بھی نہ جانے کیوں اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو نہ پا سکی، تیزی سے مضطرب انداز میں پلٹی، تیز تیز قدم اٹھاتی
محمود حسین کی خواب گاہ میں چلی گئی ——— محمود حسین اپنی مسہری پر تکیوں کا سہارا لئے نیم دراز تھے، چہرے پر معمولی
سی نقاہت موجود تھی، عاشی نے چین ہو کر قریب گئی۔ بڑی اپنائیت سے بولی۔

"انکل ——— یہ کیا ہوگیا آپ کو ———"

"کچھ بھی تو نہیں ———" محمود حسین نے مسکرا کر کہا "بھلا چنگا تو ہوں ———"

"پھر ——— یہ ڈاکٹر کیوں آئے تھے ———"

"اپنی فیس وصولنے۔" محمود حسین نے کہا پھر بولے "تم سُناؤ، ممدو کی طبیعت اب کیسی ہے۔"

"پہلے سے بہت بہتر لیکن آپ ———" عاشی نے بڑی اپنائیت سے کہا "آپ دو تین روز تک سب
کام کاج چھوڑ کر صرف آرام کریں گے ——— ڈاکٹر نے یہی مشورہ دیا ہے۔"

"اور باہر کے کام کون نپٹائے گا۔" محمود حسین نے عاشی کو والہانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں یہ نہیں جانتی۔" عاشی نے بچکانہ انداز میں ضد کی "بس، آپ دو تین روز تک گھر میں رہیں گے۔"

"لیکن ———"

"انکل ——— آپ کو میری قسم۔"

"عاشی ———" محمود حسین عاشی کا جملہ سُن کر تڑپ اُٹھے ہونٹ چبانے لگے، یوں جیسے لاشعور میں
اچانک کہیں کوئی پھانس چبھ کر رہ گئی ہو، اُن کی نگاہیں عاشی کے چہرے پر مرکوز تھیں اور دل ——— نہ جانے کیوں
تیز تیز دھڑک رہا تھا۔

"آپ نے کوئی جواب نہیں دیا ———" عاشی نے محمود حسین کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "مانیں گے نا
میری بات ———"

"ہاں ———"

محمود حسین نے جلدی سے اقرار کر لیا پھر بے اختیار عاشی کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں، یوں خلاء
میں گھورنے لگے جیسے خود کو بہلانے کی کوشش کر رہے ہوں ——— جیسے عاشی کی صورت میں ماضی کی کچھ ایسی یادیں
وابستہ تھیں جنہیں وہ بھول جانا چاہتے تھے۔ فراموش کر دینا چاہتے تھے۔ لیکن ایسا کیوں ہو رہا تھا۔

کیوں ———؟

آخر کیوں ———؟

عاشی سے اُن کا کیا رشتہ تھا ———

کیسی وابستگی تھی جو انہیں اندر ہی اندر مضطرب کر دیتی تھی ———

تڑپا دیتی تھی ———

کیا عارضی رفاقتوں نے اتنی شدت اختیار کر لی تھی کہ وہ خون کے رشتوں سے زیادہ موثر ثابت ہو رہے تھے۔

کیا وہ محض وہم تھا جو بھولی بسری حقیقتوں کا پرتو بن کر بار بار اُن کے ہوش و حواس گم کر دیتا تھا۔

یا اُن کا اپنا خیال تھا جو انہیں حال سے ماضی کی جانب لے جاتا تھا۔

ماضی ———

جس کے دریچوں کے اُس پار ابھی تک کچھ چنگاریاں سی سلگ رہی تھیں۔

دھوئیں کی ایک دُھندلاتی ہوئی ہلکی ہلکی باریک سی لکیر جو فضا میں اُلٹے سیدھے نقوش کو جنم دیتی اور پھر
ہوا کا کوئی جھونکا ان نقوش کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا۔

ملیامیٹ کر دیتا۔

اور یہ سارے احساسات عاشی کے وجود سے جنم پا کر محمود حسین کے ذہن کے پردوں پر اُجاگر

ہو رہے تھے۔

کبھی چمک کر یک دم روشن ہو جاتے ——

اور پھر ——

اچانک ان تاریکیوں میں ڈوب کر سسکنے لگتے۔

دھندلا کر یادوں کی شکل اختیار کر لیتے —— !!

" انکل —— آپ کتنے اچھے ہیں " عاشی نے چند لمحوں بعد بڑے بھولپن سے کہا " میری کتنی بار مان لیتے ہیں "

محمود حسین نے پلٹ کر عاشی کو بہت غور سے دیکھا —— جانے کیوں اُن کا دل چاہا کہ عاشی کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر اپنے دل کی گہرائیوں میں چھپا لیں لیکن شمسہ بیگم کے اچانک آجانے سے اُن کی خواہش دم توڑ گئی جلدی سے آنکھوں نے اپنی توجہ بیوی کی جانب مبذول کر لی۔ بات بنانے کی خاطر بولے۔

" کیا کہہ رہا تھا ڈاکٹر —— "

" تشویش کی کوئی بات نہیں ہے البتہ آپ کو دو تین روز تک آرام کا مشورہ دیا گیا ہے "

" اور انکل نے مجھ سے وعدہ کر لیا ہے کہ دو تین دنوں تک صرف آرام کریں گے " عاشی بولی

" سچ —— " شمسہ بیگم نے شوہر کی سمت دیکھا۔

" ہاں —— میں نے عاشی سے وعدہ کیا ہے اور —— اور میں یہ وعدہ ہر قیمت پر پورا کروں گا "

" عاشی بیٹی —— تم ذرا ناجیہ کے پاس چلی جاؤ " شمسہ بیگم نے عاشی سے کہا " وہ شاید ابھی تک اپنے کمرے میں سو رہی ہے "

عاشی نے جواب میں مسکرا کر ایک بار پھر محمود حسین کی طرف دیکھا اور تیزی سے پلٹ کر چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی کمرے سے باہر چلی گئی اور محمود حسین اپنی بے چینی کو چھپانے کی خاطر بیوی سے اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف ہو گئے —— !!

افتخار احمد جب سے عاشی کو دیکھ کر کراچی سے واپس لوٹے تھے اُن کو کسی کروٹ چین میسّر نہیں آ رہا تھا ماضی کے نقوش میں انھیں اپنی مرحوم بہن کی ہو بہو تصویر نظر آئی تھی اور اُن کے زخموں پر چھڑکنے والی کھرنڈ ایک ہی ٹھیس سے علیحدہ ہو گئی —— ماضی کے زخم تازہ ہوئے تو یادوں کی ٹیسوں کی شدت بھی سوا ہو گئی۔

اگر افتخار احمد کے اختیار میں ہوتا تو وہ فائزہ کی کھوئی ... ہوئی نشانی کو پالینے کے بعد ایک پل کے لئے بھی اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتے لیکن اوّل تو وہ بیوی کی وجہ سے مجبور تھے جو عاشی کو اپنی چھت کے سائے تلے کسی قیمت پر برداشت کرنے کو تیار نہ ہوتیں پھر ممدو کی خاموشی نے بھی افتخار احمد کو عاشی کے حاصل کرنے کے سلسلے میں میانہ روی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

ماضی میں جو غلطیاں جوانی کے نشے میں سرزد ہو چکی تھیں، افتخار احمد اب اُس کا کفارہ ادا کرنا چاہتے تھے عاشی کو پالینے کے بعد انھیں اپنی کوتاہیوں کا احساس انتہائی شدّت سے ہوا تھا، فائزہ کی روح کو سکون دینے کی خاطر ضروری تھا کہ وہ سب سے پہلے اُس شخص کو تلاش کرتے جس نے اُن کی غیر موجودگی میں فائزہ کا ہاتھ تھاما تھا اور پھر اُسے بیچ منجدھار میں بے سہارا چھوڑ کر نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ افتخار اُس کو تلاش کر کے مرحوم بہن کا حساب بے باق کرنے کے لئے مضطرب تھے لیکن ممدو نے اپنی زبان پر قفل ڈال لیا تھا —— اُسے وقت کا انتظار تھا اور اسی انتظار کے اسرار نے افتخار احمد کو مہر بلب بننے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس وقت بھی وہ اسٹڈی میں آرام کرسی پر نیم دراز آنکھیں موندے اپنی سوچوں میں گم تھے، اُن کے ذہن کی دریچوں سے اُن کا ماضی جھانک رہا تھا اور عاشی حال میں اُن کے تصوّر میں سر بلند کھڑی ہاتھ پھیلائے اپنا حق مانگ رہی تھی، اپنی ماں کی بے چین روح کے سکون کے لئے افتخار احمد سے مرہم کی طلب گار تھی۔

اچانک افتخار احمد نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں —— یوں جیسے پلکوں کے سامنے گھپ اندھیروں نے سما کر انھیں آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا تھا، چند ثانیے وہ کرسی پر بیٹھے سامنے دیوار پر لگی ہوئی کلاک کی ٹک ٹک کو سنتے رہے پھر ایک جھٹکے سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور فرش پر بچھے دبیز قالین پر ٹہلنے لگے، ٹہلتے ٹہلتے یکلخت رک جاتے، ہونٹ چباتے، ہاتھ ملتے اور پھر سر جھٹک کر ٹہلنے لگتے۔

اُن کے چہرے پر اضطراب کے گہرے سیاہ بادل منڈلا رہے تھے اور اُن کی آنکھوں کی وحشت اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ وہ کسی شدید ذہنی خلفشار میں مبتلا ہیں —— بکھرے بکھرے خیالات کے ہجوم نے جیسے اُن کے ذہن میں سمٹ کر کوئی ایک موٹا تلاش کر لیا تھا اور وہ اس موڑ سے گزر جانے کے لئے کسی ٹھوس اقدام کے بارے میں غور کر رہے تھے۔

اسٹڈی کے باہر سنگ مرمر پر قدموں کی آہٹ سنائی دی تو افتخار احمد نے پلٹ کر دروازے کی سمت دیکھا، اُن کی آنکھیں جل رہی تھیں اور ان ہی جلتی بجھتی آنکھوں کے سامنے راحیلہ خاتون اپنے تمام بناؤ سنگھار کے ساتھ موجود تھیں۔

" آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے " راحیلہ خاتون نے شوہر پر ایک لاپروا سی سرسری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ " ہمیں ٹھیک آٹھ بجے بیگم جہانگیر کو اُن کی کوٹھی سے یک (CK/R) کرنا ہے اور ساڑھے آٹھ بجے ڈاکٹر سجاد کے ڈنر میں شرکت کرنی ہے "

افتخار احمد نے کوئی جواب نہیں دیا، خالی خالی نظروں سے بیوی کو تکتے رہے۔

" اس وقت پونے آٹھ بج رہے ہیں —— " راحیلہ خاتون نے ایک شانِ بے نیازی سے اپنی سنہری دستی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے شوہر کو وقت کا احساس دلایا " کیا آپ پندرہ منٹ میں تیار ہو سکیں گے "

" نہیں —— "

" پھر میرے لئے کیا حکم ہے —— " راحیلہ خاتون نے ایک آوارہ لٹ کو جھٹک کر شانوں سے پشت کی جانب اچھالتے ہوئے دریافت کیا، اُن کے ہونٹوں پر کسی تاسف کے بجائے ایک شوخ سی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

" حکم —— " افتخار احمد ہاتھ ملتے ہوئے بولے " اگر میں یہ کہوں کہ اس وقت میرا جی اچھا نہیں ہے تو "

" تو —— میں آپ کو گھر پر آرام کرنے کا مشورہ دوں گی " راحیلہ خاتون نے لاپروائی سے جواب دیا۔

" اور تم —— " افتخار احمد نے قدرے ترش انداز میں سوال کیا " کیا تم میری خاطر اپنا پروگرام ملتوی کر دو گی —— "

" سوری ڈیئر —— " راحیلہ خاتون نے سپاٹ لہجے میں تیزی سے کہا " میں بیگم جہانگیر سے وعدہ کر چکی ہوں "

" لیکن میری کیفیت کا اندازہ لگا رہی ہو "

" میرا خیال ہے کہ آپ آج پھر ماضی کے اندھیروں میں بھٹک گئے ہیں "

" ہاں —— مگر اب مجھے اپنی منزل کا کھویا ہوا نشان مل گیا ہے "

" اچھا —— " راحیلہ خاتون کی اچھا میں تلوار کی کاٹ تھی، طنز بکھرے لہجے میں بولیں " ذرا میں بھی تو سنوں کہ آپ کراچی سے کیا معلومات حاصل کر کے واپس لوٹے ہیں "

" وقت ہے تمہارے پاس میری باتیں سننے کا —— " افتخار احمد نے تڑپ کر پوچھا۔

" صرف اتنا بتا دیجئے کہ وہ کون خوش نصیب تھا جس نے آپ کے خاندان میں ایک داماد کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی تھی " راحیلہ خاتون نے مضحکہ اُڑاتے ہوئے دریافت کیا۔

" میں —— میں ابھی تک اس شریف آدمی کا نام اور پتہ دریافت نہیں کر سکا "

" اوہ —— آئی سی " راحیلہ خاتون نے مسکرا کر سر ہلایا " گویا کراچی سے مایوسی کا شکار ہو کر واپسی ہوئی ہے "

" نہیں —— " افتخار احمد کا لہجہ یکلخت ٹھوس ہو گیا " میں مایوس نہیں ہوا —— بے حد کامیاب آیا ہوں "

"مبارک ہو ——"

"تم نے میری کامیابی کا سبب نہیں پوچھا"

"تلخیٔ وقت کی وجہ سے مجبور ہوں —— پھر کہی" راحیلہ خاتون کا جواب زہر سے بھرپور تھا۔

"راحیلہ ——" افتخار احمد چیخ اُٹھے "تم میری بیوی ہو —— میری شریکِ حیات ہو لیکن"

"میرے پاس اس وقت فضول باتوں کے لئے وقت نہیں ہے —— ٹاٹا"

راحیلہ خاتون نے انتہائی سرد مہری سے جواب دیا پھر ساڑی کا پلو سنبھالتی ایک انداز دلربا سے گھومیں اور سر کو لاپروائی سے جھٹکتی تیز تیز قدم اُٹھاتی اسٹڈی کے سامنے سے گزر گئیں۔

افتخار احمد گنگ سے کھڑے بیوی کی بے اعتنائیوں پر غور کرتے رہے، انھیں بیوی سے اتنے سخت اور روّیے کی اُمید نہیں تھی لیکن اس بات کی توقع بھی فضول تھی کہ راحیلہ خاتون بچھڑے رشتوں کے ملاپ کی اطلاع پر مسرت کا اظہار کریں گی —— افتخار احمد کے خشک ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ مچل اُٹھی۔

اور پھر ——

پھر اچانک اُن کے ذہن کے گوشے سے ایک روشن کرن پھوٹی اور اُن کے پُورے وجود کو گنگنا گئی، تصور دوش پر اُبھرنے والا وہ خیال افتخار احمد کے لئے جیسے زندگی کی نوید تھا جو اُن کے کملائے چہرے پر اچانک بہار آنکھوں میں مسرتوں اور خوشیوں کے ہزاروں دیپ جل اُٹھے —— کانوں میں شہنائیوں کی تیز گونج اُبھرنے شہنائیوں کی گونج میں افتخار احمد نے عالمِ تصور میں عاشی کو دیکھا

عاشی ——

جو عروسی جوڑے میں ملبوس تھی۔

شرمائی شرمائی اور لجائی لجائی سی گھونگھٹ کے اوٹ سر جھکائے کھڑی تھی۔

افشاں سے اُس کا پنڈا دمک رہا تھا۔

حنا کی خوشبو پورے ماحول کو معطر کر رہی تھی —— اور

عاشی دلہنوں کے روپ میں تنہا نہیں تھی —— اُس کے قریب سہرے کے درمیان ایک چہرہ اور موجود تھا۔

مانوس اور جانا پہچانا چہرہ۔

یہ چہرہ اقبال احمد کا تھا جو عاشی کے دوش بدوش کھڑا اپنی قسمت پر رشک کر رہا تھا۔

اپنی خوشیوں پر پھولا نہیں سما رہا تھا ——

عاشی اور اقبال احمد ——

اقبال احمد اور عاشی ——

کتنا خوبصورت تھا یہ جوڑا ——

کتنا خوش آئند تھا یہ تصور ——

اور ——

اس حسین تصور کو ماحول کی تمام تر رعنائیوں اور شہنائیوں کی گونج سمیت اپنے ذہن میں قید کر کے افتخار احمد نے جلدی سے اپنی آنکھیں موند لیں اور اُن کے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ایک آواز اُبھری

"فائزہ —— میں تمہاری روح سے شرمسار ہوں، نادم ہوں —— لیکن اس ندامت کے بوجھ کرنے کی خاطر میں عاشی کو بہو بنا کر اپنے ان گنت گناہوں کا تھوڑا سا کفارہ ضرور ادا کروں گا —— میں تم وعدہ کرتا ہوں ——!!"

بیرسٹر محمود حسین کی کوٹھی آج پھر بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔

بیرسٹر میں ناجیہ اور عاشی کی کامیابی کا جشن اس قدر بڑے پیمانے پر منایا جا رہا تھا کہ قرب و جوار کے رہنے والے انگشت بدنداں رہ گئے تھے، بیرسٹر محمود حسین کے دوست احباب، عزیز و اقارب اور شہر کے امراء اور روساء سب ہی اس تقریب میں مدعو تھے۔ باہر صدر دروازے سے لے کر عمارت کے دوسرے سرے تک قمقموں کی آویزشت کا انتہائی شاندار انتظام تھا۔ کوٹھی کا چپہ چپہ برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا اور ہر سمت سے بھرپور قہقہے پھوٹ رہے تھے۔

ناجیہ نے اپنی سہیلیوں اور ہم جماعت لڑکیوں کو بھی اس جشن میں بلایا تھا، آج وہ بے حد خوش تھی اس لئے کہ پورے بورڈ میں اُس کی چوتھی پوزیشن آئی تھی جبکہ اس کے مقابلے میں عاشی محض فرسٹ ڈویژن پاس ہوئی تھی ناجیہ کو ذہنی طور پر اس بات کا یقین تھا کہ عاشی نے دیدہ دانستہ اُس کے مقابلے میں سبقت لے جانے کی کوشش نہیں کی ورنہ دونوں نے ایک ساتھ ہی محنت کی تھی بلکہ عاشی نے تو خاص طور پر مار باندھ کر ناجیہ کو کورس مکمل کرایا تھا —— وہ اگر چاہتی تو ناجیہ کے مقابلے میں آگے نکل سکتی تھی مگر اُس نے ایسا نہیں کیا —— وہ اپنے عہد پر قائم رہی تھی ——!!

ناجیہ اس وقت اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی دل کھول کر قہقہے لگا رہی تھی، فرحت اُس کے قریب ہی بیٹھی تھی، کالج کی قریبی سہیلیاں عطیہ، نادرہ، عاصمہ اور ناز بھی پیش پیش تھیں۔

ناجیہ نے آج بنارسی ساڑھی باندھ رکھی تھی، جسم کی مناسبت سے چوڑے بارڈر والی گنگا جمنی ساڑی اُس نے فدکر کے پہنی تھی، ساڑی کے ساتھ اُس نے یاقوت والا سونے کا قیمتی سیٹ بھی پہن رکھا تھا جو اُس کی کھلتی رنگت پر بے حد دیدہ زیب لگ رہا تھا، شمسہ بیگم نے ناجیہ کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اس موقع پر وہ ساڑی باندھنے سے گریز کرے لیکن ناجیہ نے ساری مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر وہی کیا تھا جو اُس کے دل میں آئی تھی۔ ویسے یہ حقیقت تھی کہ اپنے بے حد سادہ لباس اور بناؤ سنگھار میں وہ محفل کی جان بنی ہوئی تھی۔ اُس کی جاندار باتیں اور کھنکتے قہقہے رہ رہ کر گونج رہے تھے۔

عاشی نے سفید شلوار سوٹ پر چھوٹی کامدانی والے کام کا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا، شمسہ بیگم کے اصرار پر اُس نے گلے اور کانوں میں موتیوں کا ہلکا سیٹ پہن لیا جو اُسے شمسہ بیگم نے بطور تحفہ دیا تھا، صورت اور سیرت کے معاملے میں چونکہ قدرت نے عاشی کو انمول سانچوں میں ڈھال کر تخلیق کیا تھا اس لئے اُس کی سادگی میں بھی پرکاری موجود تھی اور وہ پوری محفل میں سب سے الگ تھلگ اور نمایاں نظر آ رہی تھی۔

آنے والے مہمانوں نے دل کھول کر ناجیہ کو اُس کے مرتبے کے اعتبار سے تحفے دیئے تھے، دعوتی کارڈ میں چونکہ ناجیہ کے ساتھ عاشی کی کامیابی کا ذکر بھی تھا اس لئے مہمان اس کے لئے بھی خوبصورت اور حسین کاغذوں میں پیک تحفے لائے تھے لیکن یہ تحفے اتنے قیمتی اور انمول نہیں تھے جتنے ناجیہ کو دیئے جا رہے تھے اس لئے کہ ناجیہ بڑے باپ کی بیٹی تھی اور معاشرے کا دستور یہی ہے کہ حیثیت کے اعتبار سے تعلقات کی نوعیت کو پرکھا جائے اور اسی لحاظ سے ایک دوسرے کو نوازا جائے۔

عاشی کو چونکہ اپنی حیثیت کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں تھی اس لئے وہ شمسہ بیگم اور ملازموں کے ساتھ گھلی ملی مہمانوں کے استقبال اور اُن کی آسائش کا خیال رکھنے میں مصروف تھی۔ ایک بار وہ ناجیہ کے قریب سے گزری تو ناجیہ نے اُسے آواز دے کر قریب بلا لیا

"کہاں پھرکی کی طرح ناچتی پھر رہی ہو —— کچھ دیر سہیلیوں کے ساتھ بھی بیٹھو نا"

"بس، ایک منٹ ——" عاشی نے مسکرا کر کہا "آنٹی نے ایک ضروری کام سونپ دیا ہے اُسے نپٹا کر آتی ہوں"

"اکیلے ہی اکیلے ——" عطیہ نے عاشی سے کہا "ذرا ہمیں بھی تو سنوں، کون ہے وہ خوش نصیب جسے تم نوازنے کے لئے اس قدر بے چین نظر آ رہی ہو ——"

"کیا مطلب ——" عاشی نے چونک کر پوچھا —— اسے عطیہ جیسی بے باک لڑکیاں یوں بھی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔ اس وقت تو اُسے عطیہ کا جملہ کچھ عجیب اور بے معنی سا لگا تھا۔

"ارے بھئی خفا کیوں ہو رہی ہو ——" عطیہ نے شوخی سے جواب دیا۔ "ابھی تم ہی نے تو ناجیہ سے تقاضا کیا تھا کہ ایک منٹ میں کسی کو لپٹا کر آتی ہوں ——"

"میں نے ایک ضروری کام نپٹانے کی بات کی تھی۔" عاشی نے بے حد سنجیدگی سے تصحیح کی۔

"تو اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے؟" ناز نے جو حد درجہ موڈرن واقع ہوئی تھی عطیہ کا ساتھ دیتے ہوئے برجستہ کہا۔ "اتنے شور غل میں تمہاری آواز کچھ صاف نہیں سنائی دی تھی۔"

"چلو اب بھی تمہاری سمجھ میں میری بات آگئی —— یہی بہت ہے۔" عاشی نے بدستور سنجیدگی سے پلٹ کر دوسری جانب چلی گئی۔

"کیا بات ہے ناجیہ؟" فرحت نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "یہ عاشی اس قدر اکھڑی اکھڑی کیوں نظر آرہی ہے؟"

"صبح سے ممی نے اُسے اپنے ساتھ کام میں لگا رکھا ہے اور پھر ابھی وہ اتنی موڈرن بھی نہیں ہوئی کہ ہر ایک کے تقاضوں کو سمجھ سکے۔" ناجیہ نے بات بناتے ہوئے کہا

"ویسے ایک بات یا ہماری کی ہے۔" نادرہ بولی۔ "سفید لباس میں عاشی غضب ڈھا رہی ہے۔"

"خاک ——" عاصمہ نے ناجیہ کی طرفداری کی۔ "بھلا سفید بھی کوئی رنگ ہوتا ہے، ذرا ایک نظر اپنی ہیروئن کو دیکھو —— کیسی آفت لگ رہی ہے، خدا قسم پوری محفل میں سب سے زیادہ حسین اور جامہ زیب نظر آرہی ہے۔"

"اس میں بھلا کیا شک ہے۔" فرحت نے لقمہ دیا

"اسکول کی حد تک تو خیر ٹھیک تھا۔" عطیہ ناک چڑھا کر بولی۔ "لیکن کالج میں —— ایمان سے یہ عاشی تو دن نہ چل سکے گی لڑکے اس کا جینا دوبھر کر دیں گے۔"

"اس کی تو وہی مثال ہوگی —— نہ کوؤں میں نہ موروں میں۔" ناز نے پھر عطیہ کی حمایت میں کہا

"کوئی اور بات کرو نا۔" عاصمہ اکتا کر بولی۔ "تم لوگ کہاں ایک بور ٹاپک لے کر بیٹھ گئیں۔"

ناجیہ کو اس وقت ایک لمحے کے لئے عاشی کے سلسلے میں اپنی ہم جولیوں کی باتیں گراں گزری تھیں، اُسے احساس تھا کہ آج عاشی ہی کی بدولت وہ چوتھی پوزیشن کا تمغہ پیشانی پر سجائے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی ان سے تحسین حاصل کر رہی تھی لیکن یہ احساس اتنا شدید بھی نہیں تھا کہ وہ محض عاشی کی خاطر اپنی سہیلیوں کو ناراض کرتی چنانچہ اُس نے بھی عاشی کے تذکرے کو ختم کر دیا اور دوبارہ اپنی سہیلیوں میں قہقہے بکھیرنے لگی۔

"ارے ناجیہ ——" اچانک فرحت نے جھک کر ناجیہ کے کان میں سرگوشی کی۔ "آج وہ تمہارا کزن کہاں ہیں —— فراز؟"

"باہر سبزے پر کسی درخت سے ٹیک لگائے کھڑے کوئی فلمی گانا گنگنا رہے ہوں گے۔" ناجیہ مسکرا کر بولی۔ عطیہ اور ناز کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔

"ہائیں ——" ناز نے ناجیہ کو کریدا۔ "یہ آنی رازداری سے کس کی باتیں شروع ہو گئیں۔"

"ہیں ایک موڈرن مجنوں ——" ناجیہ شوخی سے بولی۔ "کالج میں زیر تعلیم ہیں، کچھ ذہین ہوئے ہیں لیکن فالتو وقت میں عشق کرنا اور گھسے پٹے مکالمے بولنا اُن کی ہوبی ہے۔"

"اور تم نے ابھی تک ہم لوگوں سے اُن کا تعارف بھی نہیں کرایا۔" عطیہ بولی۔ "خدا کی قسم یہ تمہاری زیادتی ہے۔"

"کچھ زیادتی ناجیہ اس وقت فراز کے سلسلے میں کر رہی ہیں۔" فرحت نے مسکرا کر کہا۔ "نہ وہ بے چارا موڈ مجنوں ہے نہ وہ غریب گھسے پٹے فلمی مکالمے بولتا ہے —— حقیقت صرف اتنی ہے کہ بے چارا ناجیہ کی زلف میں اُلجھ گیا ہے۔"

"میں تو کچھ اور بھی محسوس کر رہی ہوں۔" ناز نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"وہ کیا ——" عطیہ نے پلٹ کر ناز سے دریافت کیا۔

"ایک جملے میں ایک بار غریب اور دو بار بے چارا۔" ناز نے فرحت کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ "کہیں جناب —— یہ آپ پڑوسی ہو کر پڑوسی کے حق پر ڈاکہ کیوں مار رہی ہیں؟"

"خدا سمجھے تم سے ——" فرحت بُری طرح جھینپ کر بولی۔ "میں نے تو سیدھی سادی بات کہی تھی۔"

"دوسری بات کب تک کہنے کا ارادہ ہے۔" عطیہ نے سرد آہ اور ٹھنڈی سانس بھر کر پوچھا تو فرحت اور جھینپ گئی۔ "کیوں فری ——" ناجیہ نے بھی شوخی سے فرحت کو گھورتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ سچ ہے ——"

"تمہارا سر ——" فرحت نے جھلا کر کہا اور تیزی سے اُٹھ کر اُس جانب چلی گئی جہاں اُس کے والدین دوسرے مہمانوں کے ساتھ بیٹھے تھے

اور ٹھیک اسی وقت جب لڑکیوں کے ہجوم میں فراز موضوعِ بحث بنا تھا شائستہ بیگم شمسہ بیگم سے ہمکلام تھیں۔

"ناجیہ کے لئے ایک چھوٹا سا تحفہ میں نے بھی خریدا ہے لیکن ——"

"لیکن کیا ——" شمسہ بیگم نے تعجب سے کہا۔ "آپ بزرگ ہیں آپا، آپ کی تو دعائیں بہت کافی ہیں۔ اور پھر تحفہ تو ایک طرح سے خوشی کا اظہار ہے، اس میں چھوٹے بڑے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔"

"میں وہ تحفہ ناجیہ کو تمہاری اجازت سے دینا چاہتی ہوں۔"

"میری اجازت سے ——" شمسہ بیگم چونکیں۔ "میں سمجھی نہیں آپا ——"

"آج ناجیہ کی خوشی کا دن ہے، میں چاہتی ہوں کہ اس خوشی میں اپنی ایک دیرینہ آرزو بھی شامل کر لوں۔" شائستہ بیگم نے دبی زبان میں ڈرتے ڈرتے کہا۔ "میں نے اسی مناسبت سے ایک تحفہ بھی خرید لیا ہے۔"

"دیکھوں تو سہی —— کیسا ہے وہ تحفہ۔" شمسہ بیگم نے کچھ کچھ سمجھتے ہوئے مسکرا کر کہا

شائستہ بیگم ایک لمحہ کو جھجک گئیں پھر انھوں نے اپنے ہینڈ بیگ سے سُرخ مخمل کی ایک خوبصورت سی چوکور ڈبیہ نکال کر شمسہ بیگم کی طرف بڑھاتے ہوئے بڑی حسرت سے بولیں۔

"شمسہ —— اگر تمہیں میرے تحفے کی حیثیت اپنے مقابلے میں حقیر و کمتر محسوس ہو تو اسے پھینکنے کے بجائے خاموشی سے مجھے لوٹا دینا ——" میں وعدہ کرتی ہوں کہ تم سے تحفے کی واپسی کا کبھی کوئی گلہ نہیں کروں گی۔"

شمسہ بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے ڈبیہ لے کر آہستہ سے کھولا، اُن کا خیال غلط نہیں تھا اندر سبزے کی ایک وزنی مگر نازک سی انگوٹھی موجود تھی جس کے اندر جڑے ہوئے ہیرے روشنی میں آتے ہی دمک اُٹھے تھے۔ پوری آب و تاب سے جھلملانے لگے تھے۔

شمسہ بیگم چپ چاپ کھڑی انگوٹھی کو تکتی رہیں۔

"آپ نے اپنے بھائی سے ذکر کیا ہے اس انگوٹھی کا ——" شمسہ بیگم نے آہستہ سے دریافت کیا۔

"نہیں ——" شائستہ بیگم جلدی سے بولیں۔ "ایک بار مجھ سے جو غلطی سرزد ہو چکی ہے میں اُسے دہرانا نہیں چاہتی، تم ماں ہو اس لئے میں نے تمہارے آگے جھولی پھیلائی ہے۔"

"آپا —— کیسی باتیں کر رہی آپ۔" شمسہ بیگم نے کہا۔ "اس میں جھولی پھیلانے کی کیا بات ہے، جہاں بھکاری درخت ہوتا ہے پتھر تو آتے ہی رہتے ہیں اور آپ تو بہرحال اپنی ہیں ——"

"پھر —— تمہارا کیا جواب ہے۔" شائستہ بیگم نے بڑی اُمیدوں سے سوال کیا۔

"انگوٹھی خوبصورت بھی ہے اور قیمتی بھی، اس لئے میں اسے اپنے پاس محفوظ کئے لیتی ہوں۔" شمسہ بیگم نے مسکرا کر مخملی ڈبیہ کو اپنے بیگ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "رہا ناجیہ کی کامیابی کا تحفہ تو آپ اسے گلے لگا کر پیار کر لیں یہی اس کے لئے بہت ہوگا ——"

شائستہ بیگم جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن دو چار مہمان خواتین کے آجانے سے چپ رہ گئیں لیکن اُن کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اُن کی دیرینہ آرزو رائیگاں نہیں جائے گی اور پھر ——

خدا کے حضور نذرانۂ شکر کے طور پر اُن کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک آئے ——!!

رول نمبر ایٹ ——
یس سر ——
رول نمبر نائن ——
یس سر ——
رول نمبر ٹن ——
یس سر ——
رول نمبر الیون ——
میاؤں —— یس سر ——

میاؤں اور یس سر کی زنانہ مردانہ آوازیں ایک ساتھ اُبھریں تو پروفیسر کے علاوہ پوری کلاس چونک اٹھی —— بیشتر طلبا اور طالبات کی نظریں شہباز کی جانب اُٹھ گئیں جو سر جھکائے انتہائی مہذب اور معصوم انداز میں اپنی نشست پر بیٹھا تھا —— رفعت کی نظریں بھی برق رفتاری سے شہباز کی طرف اٹھیں اور پھر اگر اُس کے اختیار میں ہوتا تو وہ شہباز کا منہ نوچ لیتی لیکن بھری کلاس میں وہ آپے سے باہر ہو کر اپنا مذاق نہیں بنانا چاہتی تھی۔ اندر ہی اندر بل کھا کر رہ گئی۔

آج تیسرا دن تھا جب ایک نئی کلاس میں رول نمبر الیون کے ساتھ ہی "میاؤں" کی آواز بھی کلاس میں گونجی تھی، رفعت کے علاوہ اب یہ بات دوسرے ہم جماعتوں کے علم میں بھی آگئی تھی کہ یہ شہباز کی شرارت ہے لیکن ابھی کسی کو اُس سے باز پُرس کرنے کی جسارت نہیں ہوئی تھی۔

پہلی بار "میاؤں اور یس سر" کا کورس مہتری کے پیریڈ میں سُنائی دیا —— دوسرے دن اسلامیات کے لکچرار مولوی متین صاحب اس آواز کو سُن کر چونکے تھے اور آج —— آج اُردو کے پروفیسر بھی "میاؤں" کی آواز پر چونک اُٹھے —— حاضری رجسٹر سے نظریں اٹھا کر انھوں نے ان نشستوں کی جانب دیکھا۔ جدھر سے وہ آواز آئی تھی —— چند لمحے اُن کی تیز نظریں مختلف لڑکوں پر چکراتی رہیں پھر وہ بھی شہباز کو خشمگیں نظروں سے گھورتے نئے تعلیمی سال کو شروع ہوئے ابھی صرف ایک ہی مہینہ گزرا تھا لیکن شہباز اس مختصر عرصے میں ہی کالج میں مشہور ہو گیا تھا، اُس کی شہرت میں اُس کی انوکھی عادتوں کو بے حد دخل تھا۔

کچھ عجیب وضع قطع کی شخصیت کا مالک تھا، پل پل میں رنگ بدلنے والا —— کبھی بے حد سنجیدہ اور مہذب اور کبھی اتنا شوخا و شریر کہ بس خدا کی پناہ —— دو تین روز نئی سائیکل پر لاابالی لڑکوں کی طرح کالج کی راہداریوں پر اِدھر اُدھر لہراتا نظر آتا پھر اچانک نئے نئے ماڈل کی بڑھیا اور قیمتی کاروں میں اُس کی آمد شروع ہو جاتی —— وہ اتنے بڑھیا سوٹ میں ہوتا کہ طلبا کے علاوہ اساتذہ بھی اُس کی جانب دیکھنے پر مجبور ہو جاتے —— کبھی وہ بے حد سستے اور معمولی درجے کے لباس میں ملبوس دکھائی دیتا۔

وہ دراز قد اور چھریرے بدن کا مالک تھا، کھلتی ہوئی گندمی رنگت پر اُس کے چہرے کے بھرے بھرے اور گھونگھر والے بال بہت ہی بھلے لگتے —— جامہ زیبی کا یہ عالم تھا کہ ہر قسم کے لباس میں منفرد نظر آتا

تھا —— کبھی اُس کی شخصیت کی طرح رنگ بدلنے کی عادی تھیں —— شاعروں جیسی کھوئی کھوئی اور خمار آلود آنکھیں جن میں خواب چلتے نظر آئیں لیکن اکثر یہی خمار آلود غلافی آنکھیں جب اپنا رنگ بدلتیں اور اُن میں عقابوں جیسی چمک اور مردمی عود کر آتی تو اُس کے قریبی ساتھی بھی کترا کر اُس سے دُور ہو جاتے تھے۔

وہ کون تھا؟ —— کیا تھا؟ —— یہ جاننے کے لئے سب ہی تجسس میں مبتلا تھے لیکن ابھی کوئی اُس کی تہہ تک نہیں پہنچ سکا البتہ طلبا کی ایک بڑی تعداد شہباز کی شخصیت سے بے حد مرعوب اور متاثر نظر آتی کچھ ہم جماعتوں نے تو باقاعدہ طور پر لیڈر تسلیم کر لیا تھا لیکن شہباز کو ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا، وہ ہمیشہ اپنی دُھن میں..... مست نظر آتا، پوری جماعت میں اگر وہ خود سے کسی کی عزت کرتا تو عدیل کی جو بے حد نیک، سیدھا سادھا اور غریب طبیعت طالب علم تھا۔ اکثر و بیشتر وہ عدیل کے ہی ساتھ نظر آتا۔

پڑھائی کے معاملے میں بھی شہباز بہت ذہین اور ہونہار ثابت ہوا تھا جس کی وجہ سے بیشتر اساتذہ بھی اُسے پسند کرتے اور اچھی نظروں سے دیکھتے تھے۔

ایک بات جو شہباز کی شخصیت کو کالج کے دوسرے طالب علموں سے منفرد اور جُدا کرتی تھی وہ اُس کی "زن بیزاری" تھی۔ لڑکیوں کو دیکھتے ہی وہ کڑوا سا منہ بنا کر اس طرح دوسری سمت نظریں پھیر لیتا جیسے وہ اُن کے وجود کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرنا چاہتا تھا —— اس مخصوص عادت نے نہ صرف یہ کہ اُسے لڑکیوں کے حلقے میں "قابل غور" بنا دیا تھا بلکہ وہ لڑکیوں کے درمیان اکثر موضوع بحث بھی بن جاتا تھا۔

بہرحال —— ایک ماہ کے اندر اندر شہباز پورے کالج میں "ہیرو" کی طرح مشہور ہو گیا۔ لڑکے اور لڑکیوں نے اُس کے مختلف نام بھی رکھ رکھے تھے۔ خاص طور پر طالبات کے گروپ نے اُسے عجیب و غریب اور انوکھے خطاب دیئے تھے۔

بگڑے دل نواب ——
بقراط ——
بگلا بھگت ——
آدھا تیتر آدھا بٹیر ——
نواب بے ملک —— اور
فلاسفر کی روح ——

غرضیکہ اُس کے بے شمار نام تھے مگر ان تمام باتوں سے بے نیاز وہ اپنے آپ میں مگن رہنے کا عادی تھا —— کچھ بیباک اور موڈرن لڑکیوں نے اُس کا دل جیتنے اور اُسے اپنی جانب راغب کرنے کے لئے اپنی سی کوشش بھی کی لیکن انھیں اپنے ارادوں میں مایوسی کے سوا کچھ نہ ملا۔

اپنی پسلو دار شخصیت کے باوجود شہباز انتہائی مہذب، ملنسار اور خوش مزاج واقع ہوا تھا، جس سے بھی ملتا جھک کر نہایت انکساری سے پیش آتا مگر اس کے باوجود خود کو کچھ اس انداز میں لئے دیئے رہنے کا عادی تھا کہ دوسرے فرد کو اُس سے بے تکلف ہونے کی جسارت نہیں ہوتی تھی۔

پھر

ایک دن اچانک رفعت بلاوجہ اُس سے اُلجھ پڑی، اس روز خالی پیریڈ ہونے کی وجہ سے وہ لائبریری کی سمت جا رہی تھی کہ کنٹین کے قریب ایک گول مٹول سا لڑکا اُس کے سامنے سبزے پر گرا، رفعت کا خون کھول اُٹھا، کچھ اس انداز میں لڑکیوں سے یوں بے تکلفی یا ربط پیدا کرنا اُسے سخت ناپسند تھا۔ ایک لمحے کو وہ رُکی، کچھ سوچ کر اُس لڑکے کا نحیف سا وجود گول سبزے سے اُٹھائی، کھول کر دیکھا تو اُس پر "سلام محبت قبول ہو" درج تھا، عشق کی یہ گھٹیا ابتدا دیکھ کر وہ جل ہی تو گئی —— تلملا کر پلٹی تو بائیں جانب مہندی کی باڑھ کے قریب شہباز سر جھکائے کھڑا تھا۔

جانے کیوں رفعت نے یہی سمجھا کہ کاغذ کی وہ گول سی بال اُس نے اُس کی جانب اچھالی تھی۔ قرب و جوار میں کوئی دوسرا ذی روح نظر نہیں آتا تھا جس پر شبہ کیا جا سکتا چنانچہ وہ غصے میں بھری شہباز کے قریب چلی گئی۔ تیکھی نظروں سے اُس کے جھکے ہوئے سر کی تراش خراش کو ٹٹولتے ہوئے قدرے ترش لہجے میں بولی،

"یہ جناب کی حرکت ہے ——"

شہباز نے نظریں اُٹھا کر رفعت کو دیکھا پھر اُس کے ہاتھ کو دیکھنے لگا جو اسی کی طرف بڑھا ہوا تھا۔ گلاب کے ارادے سے پلٹا ہی تھا کہ رفعت ایک دم تیز ہو گئی۔

"کیا میں اس کا مطلب دریافت کر سکتی ہوں ——"

"یہ —— میری حرکت نہیں ہے" شہباز نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔

"یہاں قریب تمہارے سوا کون ہے ——" رفعت جھنجلا کر بولی۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے محترمہ —— میں اس قسم کی رکیک حرکتیں کرنے کا عادی نہیں ہوں"

"تم نہیں تو کون کر سکتا ہے یہ بے ہودہ حرکت ——"

"یہ تو آپ مجھ سے زیادہ بہتر جانتی ہوں گی" شہباز نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"طالبات نے تمہارے بارے میں بڑی مہذب رائے قائم کر رکھی ہے ——"

"اپنی اپنی مرضی پر منحصر ہے" وہ بولا "مجھے دوسروں سے بھلا کیا سروکار ——"

"میں —— اس کاغذ کے پرزے کو پرنسپل کے روبرو بھی پیش کر سکتی ہوں —— سمجھے" رفعت کا لہجہ اور تیز ہو گیا۔

"میں بھی آپ کو یہی مشورہ دوں گا ——" شہباز کے ہونٹوں پر ایک شوخ مسکراہٹ اُبھر آئی "خط ملتے ہی سزا ضرور ملنی چاہیئے ——"

"تم ——" رفعت کا پارہ یک دم ہی چڑھ گیا —— "کیا سمجھتے ہو اپنے آپ کو —— میں تمہارا ٹائپ خوب سمجھتی ہوں ——"

"حالات کے پیش نظر آپ کا غصہ حق بجانب ہے محترمہ لیکن میں ——"

"زیادہ بگلا بھگت بننے کی کوشش مت کرو" رفعت نے ہاتھ ملتے ہوئے سخت لہجے میں کہا

"رفعت صاحبہ ——" اچانک شہباز کے تیور بھی بگڑ گئے "آپ بلاوجہ میری ذات پر کیچڑ اچھالنے کا حق نہیں رکھتیں"

"میں —— میں تمہیں پورے کالج میں بدنام کر دوں گی" رفعت بھی بگڑ گئی "میں لوگوں کو بتاؤں گی اوپر سے کچھ اور ہو اور اندر سے کچھ اور ——"

"زبان کو لگام دیجئے محترمہ —— آپ حد سے تجاوز کر رہی ہیں"

رفعت جھلا کر کوئی سخت بات کہنا چاہتی تھی کہ دائیں جانب برگد کے بوڑھے درخت کے قریب سے ملے جلے نقرئی قہقہے کھنک اُٹھے۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا عطیہ اور فرخندہ تنے سے لگی کھڑی بے اختیار ہنس رہی تھیں قبل اس کے کہ وہ اُن سے مخاطب ہوتی عطیہ نے بڑی بے باکی سے ہاتھ ہلاتی کی جانب اُٹھاتے ہوئے مسکرا کر کہا

"سلام محبت قبول ہو ——"

"تم ——" رفعت کا دل دھک سے رہ گیا۔ غصہ میں وہ شہباز کو نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ گئی تھی۔ غلطی کا احساس ہوا تو جھینپ کر رہ گئی۔

"کیوں —— کیا تمہیں ہمارا سلام محبت قبول نہیں" فرخندہ نے شوخی سے پوچھا۔

"یہ کیا بیہودگی تھی تم دونوں کی ——" وہ جل سی بولی

"یہ بیہودگی نہیں محترمہ —— آپ لڑکیوں کا نہایت مہذب اور شستہ مذاق ہے" شہباز نے زہر سے کہا۔

"میں شرمندہ ہوں ——" اُس نے نظریں جھکا کر اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔

"مجھے تو یہ حرکت بھی آپ لوگوں کی ملی بھگت لگ رہی ہے ——" شہباز سنجیدہ تھا۔

"خدا کی قسم میں ——"

"رہنے دیجئے محترمہ —— زیادہ بگلا بھگت بننے کی کوشش مت کیجئے ——"

"میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ مجھے اپنی سہیلیوں نے ایسے مذاق کی مطلق توقع نہیں تھی ——" رفعت نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی "میں واقعی آپ سے بے حد شرمندہ ہوں"

"اس میں بھلا شرمندگی اور اظہار ندامت کی کیا ضرورت ہے" عطیہ نے قریب آتے ہوئے کہا "کالج میں ہم جماعتوں کے درمیان اگر اس قسم کی خوشگوار نوک جھونک چلتی رہے تو نتائج بڑے خوشگوار ہوتے ہیں"

"اور ہماری اس حرکت کا تو تمہیں احسانمند ہونا چاہیئے ——" فرخندہ نے شہباز کو کنکھیوں سے تکتے ہوئے رفعت سے کہا "کسی بہانے پتھر کو جونک تو لگی ——"

"یہ جونک کی خام خیالی ہے محترمہ —— پتھر ہمیشہ پتھر ہی رہتا ہے" شہباز نے شوخی سے جواب دیا۔

"زہے نصیب ——" فرخندہ نے ٹھنڈی سانس بھری "آپ کسی بہانے سہی —— ہم سے مخاطب تو ہوئے"

"فرخندہ ——" رفعت نے اُسے ٹوکا "یہ کیا بیہودگی ہے —— کیسی باتیں کر رہی ہو تم ——"

"رفعت صاحبہ ——" شہباز یکلخت بڑے مہذب انداز میں بولا "کیا میں کچھ عرض کر سکتا ہوں"

"فرمایئے ——" اُس نے ندامت بھرے انداز میں شہباز کی طرف دیکھا۔

"اگر اجازت ہو تو اب میں طلبا برادری کو بتا دوں کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی —— اندر سے پیتل بھی برآمد ہو سکتا ہے"

"میں —— آپ سے معافی چاہتی ہوں"

"خدا کا شکر ہے کہ آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ورنہ کچھ دیر پہلے تو آپ کھسیانی بلی بنی ہوئی تھیں ——" شہباز نے بڑی سادگی بھری شرارت سے کہا "صرف میاؤں کہہ کر کھسیانو جنے کی کسر باقی رہ گئی تھی"

"مسٹر شہباز ——" رفعت سنبھل کر بولی "اب آپ بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہے ہیں"

"سمجھ گئی ——" عطیہ نے بیباکی سے کہا "گویا میاؤں بے تکلفی بڑھانے کے لئے بطور کوڈ ورڈ (CODE-WORD) استعمال کیا جا رہا ہے ——"

"جہنم میں جاؤ تم دونوں ——" رفعت نے تلملا کر کہا پھر نظریں جھکائے تیزی سے کترا کر وہاں سے چل گئی۔

عطیہ نے رفعت کو چھیڑنے کی خاطر نمک مرچ لگا کر یہ واقعہ کچھ اور لڑکیوں کو سنا دیا اور پھر نہ جانے کیوں دوسرے دن شہباز نے ہسٹری کی کلاس میں حاضری ہوتے وقت رفعت کا رول نمبر آتے ہی اپنا لہجہ بدل کر میاؤں کہہ دیا تھا اور رفعت نے جواب میں پلٹ کر شہباز کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کچا ہی چبا ڈالنے کا ارادہ رکھتی ہو۔

ہسٹری کی کلاس ختم ہوتے ہی "میاؤں" کا راز باقی ہم جماعتوں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا اور کیچڑ شہباز کے ہاتھ ایک شوشہ آ گیا —— رفعت کو اُس کی غلط فہمی کا احساس دلانے کی خاطر وہ متواتر تین دن سے مختلف پیریڈ میں میاؤں کی آواز حلق سے نکال رہا تھا۔

اس وقت بھی اردو کی کلاس میں اُس نے بڑی خوبصورتی سے بلی کی آواز حلق سے نکالی پھر یوں بے تعلق سا نظر آنے لگا جیسے اُسے کسی بات کا علم ہی نہ ہو۔

"مسٹر شہباز ——" اردو کے پروفیسر نے اُسے خشمگیں نظروں سے گھورتے ہوئے آواز دی۔

"یس سر ——" شہباز نے بڑے بھولپن سے چونک کر پروفیسر کی جانب دیکھا۔

"کیا آپ نے بھی میاؤں کی آواز سنی تھی ——"

"جی —— جی نہیں" اُس کے چہرے پر دنیا جہان کی سادگی مسلط تھی۔

"گویا آپ کلاس میں حاضر نہیں تھے"

"میں کتاب پر نظریں جمائے بیٹھا تھا جناب اس لئے میاؤں پر غور نہیں کر سکا" شہباز نے چور نظروں سے رفعت کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"میاؤں کے مطلب تو جانتے ہیں آپ ——"

"جی ہاں ——" شہباز تیزی سے بولا "میں نے سنا ہے کہ میاؤں کا استعمال اکثر شاعروں سے ہاں زن و مرد کے درمیان بے تکلفی کی فضا پیدا کرنے کیلئے بطور کوڈ کیا ہے —— آپ بہتر روشنی ڈال سکتے ہیں۔"

"آج نظم یا غزل کا نہیں بلکہ نثر پڑھانے کا نمبر ہے۔"

"میں بھول گیا تھا، سوری سر ——" شہباز نے سنجیدگی سے کہا پھر کتاب پر نظر جما دی۔

پروفیسر نے دوبارہ حاضری لینی شروع کر دی اور رفعت —— وہ ابھی تک شہباز کے ہی اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہی تھی ——!!

پیریڈ ختم ہوا تو لڑکیاں کتابیں سنبھالتی جتھے کے انداز میں اٹھ کر کلاس سے باہر چلی گئیں۔ شہباز اسی طرح بھی اپنی نشست پر بیٹھا کتاب کے اوراق الٹ پلٹ رہا تھا۔ زبیر اور وقار نے ایک دوسرے کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر شہباز کے قریب آ گئے۔ سجاد اور فرخ وہاں پہلے سے موجود تھے۔ عدیل حسب دستور شہباز کے داہنے ہاتھ والی نشست پر موجود تھا۔

"لیڈر زندہ باد ——" وقار نے قریب آتے ہوئے کہا "خدا کی قسم آج لطف آ گیا۔ کیا تڑکی ہتڑکی جواب ہے میرے شیر نے پروفیسر صاحب کو —— واہ"

"اور تم نے دوسرے محاذ کی طرف غور نہیں کیا" زبیر بولا "غنیم کی صفوں میں بھی ہر ہونٹ میٹھی میٹھی مسکان لیس تھا سوائے ایک خاتون کے ——"

"وہ کون ——" سجاد نے پوچھا۔

"میاؤں ——" وقار نے منہ سے میاؤں کی آواز نکالی تو سب ہنس دیئے۔

"میرا خیال ہے اب یہ سلسلہ بند ہو جانا چاہیئے ——" عدیل نے سنجیدگی سے اپنا خیال ظاہر کیا تو سب اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔

"کیا مطلب ——" فرخ نے نہایت تعجب سے عدیل کو گھورتے ہوئے کہا "کیا اب آپ بھی خواتین کے سلسلے میں اپنی کسی رائے کا اظہار کریں گے ——"

"سُن تو لو یار ——" فیصل نے کہا "ممکن ہے کوئی قومی ہو ——"

"یقیناً کوئی فتویٰ ہی ہو گا" عارف نے کہا "ورنہ کہاں عدیل اور کہاں لڑکیوں کا تصور۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا ——" سجاد نے مذاق اڑایا "ممکن ہے دوستوں کی دیکھا دیکھی ہمارے عدیل کی عقل بھی ٹھکانے آ گئی ہو۔"

"گویا تمہارا خیال ہے کہ اب عدیل میاں کا شمار بھی بالغوں میں ہوا کرے گا" فرخ نے برجستہ کہا تو سب مسکرا دیئے۔

"مذاق اگر مذاق کی حد تک ہو تو ٹھیک ہے لیکن اگر مذاق کسی فریق کی دل آزاری کا سبب بن جائے تو یہ مذاق نہیں نشتر بن جاتا ہے ——" عدیل نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔

"نشتر ——" زبیر نے 'تر' پر زور دیتے ہوئے کہا "لگتے فرخ صاحب، آپ صرف عدیل کے بات ہونے پر شبہ ظاہر کر رہے تھے اور یہ حضرت باقاعدہ زخمی نظر آتے ہیں ——"

"سر اٹھا کے میر کے آہستہ بولو —— ابھی نشتر سے زخمی سو رہا ہے" عارف نے لہراتے ہوئے میر کے خاصے شعر کی پڑھ ماری۔

"خوبصورت شعر ہے" سجاد نے بڑی معصومیت سے پوچھا "کس کا ہے"

"پہلے میر کا تھا لیکن اب تو نشتر کا لگ رہا ہے" فرخ نے کہا

"کچھ بھی ہو —— خاصا زخمی شعر ہے" فیصل نے ہانک لگائی۔

"میں عدیل کے خیال سے متفق ہوں" شہباز اچانک بولا تو تمام لڑکے سنجیدگی سے اُس کا منہ تکنے لگے۔

"استاد —— کیا اب تم یہ میاؤں والا سلسلہ بند کر دو گے" وقار نے دریافت کیا

"ہاں ——"

"کیوں ——"

"اس لیے کہ بقول عدیل کے اب یہ کسی کی دل آزاری کا سبب بن رہا ہے"

"تم شاید بھول رہے ہو کہ لیڈر کو رفعت نے تمہیں پورے کالج میں بلا وجہ بدنام کرنے کی دھمکی دی تھی" زبیر نے یاد دلانے کی کوشش کی۔

"پھر نتیجہ کیا نکلا ——" عدیل بولا "وہ بے چاری خود تختۂ مشق بن کر رہ گئی"

"اور اسکے لئے عدیل —— تم تو اپنی چونچ بند ہی رکھا کرو" وقار کے لہجے میں اکتاہٹ تھی۔

"یار خدا کے لئے عدیل —— تم تو اپنی چونچ بند ہی رکھا کرو" وقار کے لہجے میں اکتاہٹ تھی۔

"میں نے محض اپنا خیال ظاہر کیا تھا، آگے جو شہباز کی مرضی" عدیل نے آہستہ سے کہا پھر کتاب اُٹھا کر کلاس سے باہر چلا گیا۔

"استاد —— میرا ایک مشورہ مانو گے" وقار بولا

"کہو ——"

"تم عدیل کے پاس سے اپنی نشست دور رکھو ورنہ تم بھی خشک اور بور بن کر رہ جاؤ گے"

"وقار ——" شہباز نے تیزی سے نظریں اُٹھا کر وقار کو گھورا، قدرے ترش لہجے میں بولا "آئندہ میرے سامنے کبھی عدیل کے لئے کوئی غلط بات مت کہنا ——"

"میں نے کوئی غلط بات نہیں کی استاد لیکن ——"

"میں نے طے کر لیا ہے کہ وہی کروں گا جو عدیل نے مشورہ دیا ہے" شہباز نے تیزی سے کہا۔

"یعنی آج سے میاؤں کا سلسلہ بند" زبیر نے دریافت کیا۔

"ہاں ——" شہباز نے جو ایک لمحہ پیشتر نہایت سنجیدہ تھا مسکرا کر جواب دیا "ہمیں اپنے ساتھیوں کا احترام کرنا چاہیئے خواہ وہ طالب علم ہوں یا طالبات ——"

"لیکن میں کچھ اور محسوس کر رہا ہوں" عارف نے شہباز کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا ——" دو تین ملی جلی آوازیں ابھریں۔

"میران نیم باز آنکھوں میں —— ساری مستی شباب کی سی ہے" عارف نے پھر ایک شعر کا کباڑہ کر دیا۔

"شباب نہیں شراب ——" فیصل نے تصحیح کی۔

"احمق ہیں آپ" عارف بولا "شعر ہمیشہ وقت اور ماحول کے اعتبار سے پڑھنا چاہیئے اور اگر اس میں.... تھوڑی ردّ و بدل حسب حال ہو جائے تو کیا کہنا ——"

"خیال ہے تمہارا۔ شہباز نے مسکرا کر عارف کو دیکھتے ہوئے کہا "میرا وہ ٹائپ نہیں ہے ——"

"مگر لیڈر —— ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی" زبیر نے دریافت کیا "تم اپنی زن بیزاری کے لئے خاصے مشہور ہو چکے تھے پھر اچانک یہ میاؤں والا سلسلہ کیسے شروع کر دیا۔"

"میں مس رفعت کو محض اس بات کا احساس دلانا چاہتا تھا کہ جلد بازی میں کئے گئے فیصلے اکثر غلط ثابت ہوتے ہیں" شہباز سنجیدگی سے بولا "لیکن اب عدیل کے مشورے کے بعد پھر اپنی پرانی روش اختیار کر لوں گا"

"رفعت اسے اپنی فتح بھی تصور کر سکتی ہے" سجاد نے کہا "لڑکیوں کی بیچ زیادہ مغرور اور خود سر ہوتی ہیں"

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا" زبیر بولا "لیڈر کی خاموشی غنیم کی صفوں میں احساس برتری پیدا کر سکتی ہے"

"آپ تو نہ بولئے ——" عارف نے پلٹ کر تیزی سے کہا "یہ سارا سلسلہ آپ کی "اُن کے" وجہ سے شروع ہوا تھا"

"آرڈر —— آرڈر ——" فرخ نے احتجاج کیا "پہلے اس 'اُن کے' کی وضاحت کی جائے"

"میرا اشارہ مس عطیہ کی طرف تھا" عارف نے زبیر کا بھانڈہ پھوڑ دیا۔

"اچھا ——" وقار اچھل پڑا "یہ چکر کب سے شروع ہوا"

"زیادہ تفصیل مجھے بھی نہیں معلوم لیکن دو روز قبل میں نے زبیر کو عطیہ کے ساتھ دیکھا تھا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ زبیر نے عطیہ خاتون کو اپنی ہسٹری کے نوٹس کی کاپی بھی دی ہے"

"وہ میں نے محض ہمدردی اور حبُ الوطنی کے جذبے کے تحت عطیہ صاحبہ کو عطا کر دی تھی۔" زبیر نے سر جھکا کر سنجیدگی سے کہا۔ "طلبا برادری میں بھائی چارہ نہایت ضروری ہے۔"

"بھائی چارے کے بچے ——" سجاد نے زبیر کی گردن پکڑتے ہوئے کہا۔ "سچ سچ بتاؤ —— کیا چکر چلایا ہے؟"

"یار گردن تو چھوڑو ——" زبیر نے خود کو سجاد کی گرفت سے آزاد کراتے ہوئے کہا۔ "خدا کی قسم کچھ نہیں میرے تمہیدی دور میں ہے۔"

"نوٹس کی کاپی ملی یا نہیں ——" عارف نے پوچھا

"ابھی نہیں ملی ——" زبیر نے گردن سہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"اور تم نے تقاضہ بھی نہیں کیا ہوگا۔" فرخ نے دریافت کیا۔

"نہیں —— ابھی خود سے ہم کلام ہونے کی ہمت نہیں ہو سکی۔" زبیر نے معصومیت سے جواب دیا۔

"اللہ —— اللہ —— کیا سادگی ہے جناب کے حسنِ اخلاق میں۔" فیصل بولا۔ "یار کیوں دوستوں کے سامنے معصوم بننے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"تم نہیں مانتے تو نہ سہی لیکن حقیقت ہے کہ ابھی میرے اور محترمہ عطیہ کے درمیان صرف نوٹس کے تبادلے کا رشتہ ہوا ہے۔" زبیر نے سنجیدگی سے کہا۔

"ارادے کیا ہیں تمہارے ——" شہباز نے زبیر سے دریافت کیا۔

"فی الحال نیک ہیں لیڈر —— آئندہ کیا ہوگا یہ حالات پر منحصر ہے۔" زبیر نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

"ایک بات کا خیال رکھنا۔" شہباز نے فائل ہاتھ میں دبا کر اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں ایسے ساتھیوں کو اپنے قریب نہیں پسند کرتا جو محبت کے میدان میں حدود کا خیال نہیں رکھتے ——"

"میں سمجھا نہیں لیڈر ——" زبیر نے دریافت کیا۔ "تمہاری بات کا مقصد کیا ہے ——"

"سمجھنے کی کوشش کرو ——" شہباز نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا پھر کسی فلاسفر کی طرح خلا میں گھورتا ہوا گردن اٹھائے نشستوں سے کتراتا ہوا کلاس روم سے باہر آ گیا۔

رفعت کے تنفس کی روانی ابھی تک بحال نہیں ہوئی تھی —— کینٹین کے عقب میں سبزے پر اپنی ہم جماعتوں کے ساتھ بیٹھی وہ اس وقت بھی اندر ہی اندر کھول رہی تھی۔

"ختم بھی کرو رفعت ——" ناز بولی۔ "اس قسم کا مذاق تو چلتا رہتا ہے۔"

"تم اس بیہودگی کو مذاق کا نام دے رہی ہو۔" رفعت نے تلملا کر کہا۔ "اس کی حرکت کی وجہ سے پوری کلاس میں میری سبکی ہوئی ہے۔"

"رفعت کا خیال درست ہے۔" فرحت بولی۔ "ہمیں شہباز والے سلسلے میں سنجیدگی سے غور کر کے کوئی جوابی قدم اٹھانا چاہیئے —— ورنہ آج اگر رفعت لڑکوں کا ہدف بن رہی ہے تو کل ہم میں سے کسی اور کا نمبر بھی آ سکتا ہے۔"

"پھر —— تمہارا کیا خیال ہے۔" نادرہ نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں پہلے براہِ راست شہباز سے گفتگو کرنی چاہیئے۔" عاشی جو بہت دیر سے خاموش بیٹھی لڑکیوں کی باتیں سن رہی تھی پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے بولی۔ "آخر مسٹر شہباز شرافت سے اپنی غلطی تسلیم کر لیں اور آئندہ سے احتیاط برتنے کا وعدہ کر لیں تو ٹھیک ہے —— اس طرح ہمارے درمیان کسی آئندہ پیدا ہونے والی رنجش کا احتمال بھی نہیں ہوگا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے ——" فرحت نے عاشی سے پوچھا۔ "کیا شہباز سیدھی طرح راہِ راست پر آ جائے گا؟"

"ممکن ہے ——"

"اور اگر اس نے پھر بھی اپنی بے ہودگی جاری رکھی ——"

"دوسری صورت میں رفعت کو پرنسپل سے رجوع کرنا ہوگا۔" عاشی سنجیدہ تھی۔

"لیکن پرنسپل تک جانے سے پہلے یہ بھی اچھی طرح سوچ لو کہ ان تمام باتوں کی ابتدا ہماری طرف سے ہوئی ہے۔" عاصمہ نے کہا۔ "نہ عطیہ اور فرخندہ وہ مذاق کرتیں —— نہ رفعت اور شہباز کے درمیان غلط فہمی

پیدا ہوتی —— کسی کے ساتھ میاؤں کا سلسلہ شروع ہوتا ——"

عطیہ اور فرخندہ عاصمہ کی بات پر مسکرائیں تو رفعت کا غصہ اور تیز ہو گیا۔ دونوں کو گھور کر بولی۔

"سب کچھ تم دونوں ہی کی حماقت سے ہوا ہے اور تم اس وقت بھی بیٹھی مسکرا رہی ہو۔"

"سب کچھ اندازہ نہیں تھا کہ صورتِ حال اتنی خراب ہو جائے گی۔" عطیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہمیں

"بات کر لینے میں آخر حرج ہی کیا ہے" عاصمہ نے نادرہ کی حمایت کی۔

"عدیل سے تو میں کبھی بات کر سکتی ہوں" ناجیہ نے تیزی سے کہا تو عاصمہ کے علاوہ نازاور رفعت چونک اٹھیں۔

"تم ——" فرحت نے حیرت سے پوچھا "عدیل سے بات کرو گی ——"

"کیوں —— اس میں کیا حرج ہے"

"کیوں نہیں ہے حرج ——" عطیہ نے کہا "کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی"

"میرا خیال ہے کہ تم نے کبھی عدیل کو غور سے نہیں دیکھا" ناجیہ نے شوخی سے کہا "گدڑی کا لال اسی کو کہتے ہیں"

"ہائیں ——" فرخندہ نے دیدے پھاڑ کر ناجیہ کو تعجب سے گھورتے ہوئے کہا "اتنے پٹر پٹر کہ ہمیں کانوں کان خبر تک نہ ہوئی"

"کبھی ذرا ہم بھی تو سنیں، آخر یہ معاملہ کیا ہے" ناز بولی۔

"ہمیں تو اس سلسلے کی جڑیں بہت دور تک نظر آ رہی ہیں" فرخندہ نے ناجیہ کے ہونٹوں پر کھیلتی مسکراہٹ کو محسوس کرتے ہوئے بڑے وثوق سے کہا۔

"اب تم اسے کیا کہو گی" عطیہ نے فرخندہ سے دریافت کیا "چڑی کا غلام یا قسمت کا سکندر"

"توبہ توبہ ——" فرخندہ نے کانوں کو ہاتھ لگا کر بولی "میں تو عدیل کو بالکل مولوی مدن سمجھ رہی تھی لیکن وہ حضرت تو چھپے رستم نکلے —— ہماری شہزادی ہی کو لے اڑے"

"تیرے منہ میں خاک" ناجیہ مسکرا کر بولی "ابھی تو میں نے صرف اسے قابل توجہ سمجھا"

"اوہ ابھی سے اگر مسکراہٹوں کا یہ عالم ہے تو پھر ——"

"آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا" ناز سینے پر ہاتھ مار کر بولی تو سب ہی لڑکیاں ہنس دیں۔

"یہ میرے مسئلے کا حل تلاش کیا جا رہا ہے یا ٹی الف ایل لکھی جا رہی ہے" رفعت چڑ کر بولی تو لڑکیوں کو پھر سنجیدہ ہونا پڑا۔

"میں بہرحال اس مشورے کے حق میں ہوں کہ شہباز کے بجائے عدیل سے بات کی جائے" عاصمہ نے کہا

"میں بھی عاصمہ کی تائید کرتی ہوں" ناز نے یونہی کہہ دیا۔

باقی سب لڑکیوں نے بھی تائید کر دی تو فرحت نے عاشی کو گھورتے ہوئے کہا۔

"کچھ آپ بھی فرمایئے —— آپ کن خیالوں میں گم ہیں"

"جب سب کی یہی مرضی ہے کہ عدیل صاحب سے بات کر لی جائے تو پھر ٹھیک ہے" عاشی نے سنجیدگی سے کہا

"تو یہ طے ہوا کہ ہماری جانب سے ناجیہ بیگم مسٹر عدیل سے گفتگو کریں گی" عطیہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

"یہ تو خیر طے ہو گیا لیکن ابھی ایک بات تشنہ رہ جاتی ہے" فرحت بولی "اگر عدیل کو درمیان میں لانے کے باوجود یہ میاؤں والا مسئلہ حل نہ ہوا تو کیا ہو گا ——"

"پھر تو ایک ہی حل باقی رہ جاتا ہے" ناز نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"وہ کیا ——" نادرہ اور فرحت نے یک زبان ہو کر دریافت کیا۔

"ہمیں چونکہ بہرقیمت پر اس مسئلے میں کامیابی حاصل کرنی ہے اس لئے ناکامی کی صورت میں ہم پر یہ لازم ہو گا کہ رفعت اور شہباز کے بزرگوں سے رابطہ قائم کیا جائے" ناز بدستور سنجیدہ تھی۔

"یہ بزرگوں کو درمیان میں لانے سے کیا حاصل ہو گا۔ نادرہ نے وضاحت طلب کی۔

"تم ابھی کمسن ہو اس لئے نہ سمجھ سکو گی" ناز نے کہا پھر بولی "بزرگوں سے پہلے ہم رابطہ قائم کریں گے پھر بزرگ حضرات ایک دوسرے سے رابطہ قائم کریں گے اور پھر موجودہ مسئلے کا دائمی حل طے ہو جائے گا"

"اور پھر اس کے بعد میاؤں کے ساتھ چیاؤں چیاؤں کا سلسلہ بھی شروع ہو جائے گا" عطیہ نے کچھ ایسے انداز میں شرماتے ہوئے جیسا کی سے کہا کہ لڑکیاں اس کی بات کا مفہوم سمجھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئیں۔

نیلم بھی اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ پا سکی۔

کچھ دیر تک سب ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتی رہیں پھر فرخندہ نے کہا

"ناز کی تجویز مناسب ہے لیکن فی الحال اس پر عمل نہیں کیا جا سکتا"

"کوئی وجہ ——" عطیہ نے پوچھا۔

"اس طرح رفعت اور شہباز کا مسئلہ تو حل ہو جائے گا لیکن ناجیہ اور عدیل کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔ لہذا پہلے ناجیہ اور عدیل کی ملاقات ضروری ہے"

"میں گلے گلے تیار ہوں ——" ناجیہ نے بھی بیباکی کا مظاہرہ کیا۔

"سوچ لو ناجیہ ——" ناز گردن مٹکا کر بولی "کہیں ہنسی ہنسی میں پھنسی نہ ہو جائے"

"کیا مطلب ——" ناجیہ ایک دم ہی سنجیدہ ہو گئی "کیا تم میری اور عدیل کی بات کو اب تک مذاق سمجھ رہی ہو"

"اگر یہ بات ہے تو پھر سدھارو بی بی" ناز نے بڑی بوڑھیوں جیسے انداز میں دعا دیتے ہوئے کہا "تمہاری ہمجولی رہے —— گود ہری رہے اور ——"

"دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو ——" فرخندہ نے گرہ لگائی تو لڑکیوں کی محفل ایک بار پھر زعفران زار بن گئی۔

اچانک عاصمہ نے جو ناجیہ کے قریب بیٹھی تھی اسے کہنی مارتے ہوئے کہا۔

"وہ دیکھ اودھر —— تیرا ہیرو روش پر تنہا جگالی کرتا پھر رہا ہے"

ناجیہ کے علاوہ باقی لڑکیوں کی نگاہیں بھی اسی سمت اٹھ گئیں —— عدیل سامنے روش پر کتابیں تھامے سر جھکائے اسی طرف آ رہا تھا۔

"اس کو کہتے ہیں جذبۂ عشق کی صداقت" ناجیہ شوخی سے بولی "ادھر تصور کیا اور ادھر وہ کچے دھاگے میں بندھا لگاموں کے سامنے آ گیا"

"خدا سمجھے تم سے ——" نادرہ نے آہستہ سے کہا "تم تو اب بے شرم ہوتی جا رہی ہو"

"مبارک ہو عطیہ ——" ناز نے بڑی خوبصورتی سے عطیہ پر چوٹ کی "تمہارے گروپ میں ایک اور اضافہ ہوا"

"تم رملے کی ترقی سے کیوں جلتی ہو" عطیہ نے تیزی سے کہا "ہماری انجمن کے دروازے تمہارے اوپر بھی کھلے ہیں جب دل چاہے ہم میں شامل ہو جاؤ"

"میرا خیال ہے یہ حضرت لائبریری کی سمت جا رہے ہیں" عاصمہ نے عدیل کو تکتے ہوئے کہا۔

"یہ موقعہ غنیمت ہے ناجیہ" فرخندہ بولی "دو دو تک میدان صاف ہے —— ابھی ان حضرت کو روک کر دو ٹوک کی بات کر لو"

ناجیہ نے پلٹ کر اپنی سہیلیوں کی سمت دیکھا پھر کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا واقعی تم عدیل سے بات کرو گی" نادرہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہوں ——" ناجیہ نے مسکرا کر مختصر سا جواب دیا۔ پھر آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی سبزے سے اتر کر روش پر آ گئی۔

"اے بی بی —— امام ضامن تو بندھواتی جاؤ" ناز نے مدھم لہجے میں کہا "پہلی بار ایک نئی منزل کی طرف جا رہی ہو —— ذرا پھونک پھونک کر قدم رکھنا کہیں سچ مچ پھسل نہ جانا ——"

"گھبرا نہیں ناجیہ ——" فرخندہ بولی "ہم سب تمہارے ساتھ ہیں ——"

ناجیہ نے کوئی جواب نہیں دیا —— مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئی اور عاشی —— نہ جانے کیوں اس کے دل کی دھڑکنیں آپ ہی آپ تیز ہونے لگی تھیں —— !!

مدور و بصحت ہو کر گھر واپس آیا تو عاشی کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔

اس نے کوارٹر کو دن بھر محنت کر کے بڑے سلیقے سے سجایا تھا۔ ہر چیز کی ترتیب بدل دی تھی تاکہ ان چیزوں

میں ایک نیا پن محسوس ہو، ماحول کی یکسانیت بدل جائے۔

اس روز وہ کالج بھی نہیں گئی تھی۔ ممدو کے استقبال کی خوشی نے اُسے بے حال کر دیا، دوپہر کے بعد اُس نے بار بار گھڑی پر نظر ڈالنی شروع کر دی تھی، اپنے ذہن کے معصوم گوشوں میں اُس نے ممدو کی واپسی کا وقت مقرر کر لیا تھا، محمود حسین نے اُسے یہ وعدہ سنایا تھا کہ ممدو کو چار بجے ہسپتال سے چھٹی مل جائے گی۔

سینی ٹوریم سے واپسی کے راستے میں کتنا وقت صرف ہوتا تھا اس کا اندازہ وہ پہلے ہی لگا چکی تھی۔ چنانچہ یقین تھا کہ ممدو زیادہ سے زیادہ پانچ بجے تک گھر واپس آجائے گا لیکن وہ ڈیڑھ بجے کے روانہ ہونے کے آدھ گھنٹے بعد سے پہلے ہی آگئی تھی اور بار بار برآمدے کے بڑے اور وزنی پھاٹک کی جانب دیکھنے لگتی۔ وہ ممدو کی واپسی کی بڑی شدت سے منتظر تھی، اُس کے بس میں ہوتا تو وقت کی رفتار کو تیز کر دیتی۔

ساڑھے چار بجے محمود حسین بھی گھر آگئے۔ خلاف توقع وہ آج کچہری سے جلدی واپس لوٹ آئے تھے، گھر والوں کے پاس آج اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ محمود حسین سے اُن کی جلدی واپسی کا سبب دریافت کر سکتی ——— آج تو صرف اور صرف ممدو کی واپسی کا انتظار تھا۔ ایک ایک لمحہ کاٹنا کٹھن ہو رہا تھا۔

مہکتے پھولوں کا حسین گلدستہ جسے اُس نے آج بڑی محنت سے تیار کیا تھا ہاتھوں میں لئے وہ ممدو کی راہ دیکھ رہی تھی کہ شمسہ بیگم کی آواز سُن کر یوں اُچھل پڑی جیسے چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لی گئی ہو، معصوم دل کی دھڑکنیں یکلخت ہی تیز ہو گئیں۔

ایک لمحے کو وہ اپنی اضطرابی حالت پر خجل سی ہو کر رہ گئی۔ پھر مسکراتی نظروں سے شمسہ بیگم کو دیکھنے لگی جو محمود حسین کے ساتھ سبزے پر موجود تھیں۔

"تسلیم انکل ———" اُس نے محمود حسین کو دیکھا تو جلدی سے سلام کے لئے ہاتھ اُٹھا دیا۔

"جیتی رہو ——— خوش رہو" محمود حسین نے عاشی کے سراپا کو بڑی اپنائیت سے دیکھتے ہوئے شفقتوں میں دُعا دی۔

"اتنی بے چینی سے کس کا انتظار ہو رہا ہے" شمسہ بیگم نے عاشی کے چہرے پر پھوٹتی شفق کو محسوس کرتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

"وہ ——— ڈرائیور چاچا، بابا کو سینی ٹوریم سے لینے گئے ہیں" عاشی نے جلدی سے کہا پھر ہاتھ میں پکڑے گلدستے کو دیکھنے لگی۔

"یہ گلدستہ میری بیٹی نے شاید میرے لئے تیار کیا ہے" محمود حسین نے کہا "آج میں بھی تو جلدی آگیا ہوں"

"لے لیجئے انکل ———" عاشی نے نہایت بھولپن سے گلدستہ محمود حسین کی جانب بڑھا دیا۔

"پھر تم مالی بابا کو کیا دو گی ———" محمود حسین نے بڑی سادگی سے دریافت کیا پھر گلدستہ لے لیا۔

"گلاب کا ایک تازہ سُرخ پھول" وہ چہک کر بولی "خلوص تحفے سے نہیں۔ نیت اور خوشی سے دیکھا جاتا ہے"

"خدا تمہیں خوش رکھے" محمود حسین نے گلدستہ واپس کرتے ہوئے کہا پھر بڑی محبت سے عاشی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے "تم نے آج ہماری جلد واپسی کا سبب نہیں پوچھا ———"

"کچہری میں کام کم ہو گیا ———"

"اوہو نہہ ———"

"پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے ———"

"تم پوچھو تو جانیں ———"

"آنٹی نے فون کر کے کسی کام سے بلایا ہو گا" اُس نے سادگی سے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"نہیں ———" محمود حسین بیوی کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے "یہ بات بھی نہیں ہے"

"پھر ———" وہ قدرے اکتا گئی "آپ ہی بتا دیں نا انکل ———"

"پہلے اپنی ہار تسلیم کرو ———"

"مان لی ہار" عاشی نے جلدی سے ہار مان لی۔ اُسے ممدو کے انتظار کی جلدی بھی تو تھی۔

"بتا دوں ———" محمود حسین نے بیوی کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا

"بتا بھی دیں ——— کیوں آپ بے چاری کو پریشان کر رہے ہیں" شمسہ بیگم نے ہنس کر کہا۔

"آج ہم اس لئے کچہری سے جلدی آگئے ہیں کہ اپنی عاشی بیٹی کے ساتھ ہم بھی مالی بابا کا استقبال کریں گے"

"سچ انکل ———" عاشی خوشی سے اُچھل پڑی، معصوم جذبوں میں مسرتوں کی طغیانی آئی تو اُس کی خوبصورت آنکھیں بھیگ گئیں۔

"اپنی آنٹی سے پوچھ لو ———" محمود حسین نے مسکرا کر کہا پھر جیب سے کسی تالے کی چابی نکال کر اُس کی زنجیر گھمانے لگے۔

"تم نے مالی بابا کے لئے کیا تیاریاں کی ہیں" شمسہ بیگم نے عاشی سے پوچھا۔

"میں نے ———" عاشی نے نظریں جھکا کر اپنی دستی گھڑی دیکھی پھر منہ اُٹھا کر بولی "میں نے کوارٹر کی خوب صفائی کی ہے اور ہر چیز کی ترتیب بھی بدل دی ہے تاکہ بابا کو کوئی پرانی بات یاد نہ آسکے"

"یہ تو تم نے بہت اچھا کیا" شمسہ بیگم نے عاشی کی تعریف کرتے ہوئے کہا "ماحول کی تھوڑی سی تبدیلی بھی اکثر انسان کے دل و دماغ پر نہایت خوشگوار اثر ڈالتی ہے"

"اوہ ———" عاشی نے ہوا کی خنکی سے ایک خفیف سی جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ "اور میں نے خانساماں سے بابا کے لئے شاہی ٹکڑے بھی تیار کرا لئے ہیں ——— بابا شاہی ٹکڑے بہت شوق سے کھاتے ہیں"

"اچھا کیا تم نے ———" شمسہ بیگم نے اپنی شال نہایت محبت سے اُتار کر عاشی کے شانوں پر ڈال دی۔ "رہنے دیجئے آنٹی، مجھے کوئی خاص ٹھنڈ ———"

"اوڑھے رہو" شمسہ بیگم نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے پیار بھرا تحکمانہ انداز اختیار کیا تو عاشی نے سر تسلیم خم کر لیا۔

"یہ آج ناجیہ گھر پر نہیں ہے کیا ——— نظر نہیں آرہی" محمود حسین نے اچانک بیٹی کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے بیوی سے دریافت کیا۔

"آپ شاید بھول رہے ہیں کہ ایک ہفتہ قبل آپ نے ناجیہ کو نئی کار خرید کر تحفے میں دی ہے"

"میں سمجھا نہیں ———" محمود حسین نے وضاحت طلب نظروں سے بیوی کو دیکھا "نئی کار سے میری بات کا کیا تعلق ہے ———"

"پتہ نہیں آپ کچہری میں وکالت کس طرح کرتے ہوں گے" شمسہ بیگم نے شوخی سے کہا پھر وضاحت کرتے ہوئے بولیں "جب سے ناجیہ کو علم ہوا تھا کہ آپ اُس کے لئے علیحدہ کار خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں اُس نے ڈرائیور سے گاڑی چلانی سیکھنی شروع کر دی تھی۔ چنانچہ اب وہ ہر وقت نئی کار لئے اُڑتی پھرتی ہے ———"

"کیا وہ تنہا ڈرائیونگ کے لئے جاتی ہے" محمود حسین نے تعجب سے پوچھا۔

"نہیں، خیر تنہا تو نہیں جاتی، فرحت ساتھ ہوتی ہے لیکن میں اسے کبھی مناسب نہیں سمجھتی۔ شمسہ بیگم سنجیدگی سے بولیں "کئی بار کہہ چکی ہوں کہ ڈرائیور کو ساتھ لے جایا کرے لیکن وہ سنتی کہاں ہے"

"خیر ——— میں سمجھا دوں گا لیکن آج تو اُسے گھر پر موجود رہنا چاہیئے تھا" محمود حسین بولے "کیا اُسے علم نہیں تھا کہ آج ممدو سینی ٹوریم سے بفضل خدا روبصحت ہو کر واپس آرہا ہے"

شمسہ بیگم کوئی جواب دینا چاہتی تھیں کہ اپنی گاڑی کے مانوس ہارن کی آواز سُن کر چونک اٹھیں، اسی لمحے عاشی بے اختیار چیخ اٹھی۔

"بابا آگئے ——— بابا آگئے ———"

ڈرائیور نے گھر والوں کو پھاٹک کے قریب دیکھا تو گاڑی وہیں روک دی، عاشی نے ممدو کے اُترنے کا انتظار بھی نہیں کیا، لپک کر گھر کی کے ذریعے گلدستہ دیتے ہوئے بولی۔

"نہیں روبصحت ہو کر واپسی مبارک ہو بابا ———"

"تجھے بھی مبارک ہو" ممدو نے پیار سے اُس کے گال تھپتھپا دیئے پھر محمود حسین اور شمسہ بیگم کو کھڑے دیکھا تو حیرت سے بولا "ارے دروازے کے سامنے سے ہٹ تو سہی ——— مجھے بچے اُترنے دے ——— دیکھ بڑے سرکار اور مالکن بھی موجود ہیں ———"

عاشی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ جلدی سے ایک طرف ہوگئی' شرفو نے لپک کر دروازہ کھولا تو ممدو اپنے اکڑ کر محمود حسین کے سامنے جا کھڑا ہوا' بھرائی ہوئی آواز میں آہستہ سے بولا'

"سرکار ـــــ میں آپ کا احسان زندگی بھر نہ بھلا سکوں گا۔ اگر آپ مہربان نہ ہوتے تو ـــــ"

"میں نے کوئی احسان نہیں کیا ممدو ـــــ اپنا فرض پورا کیا ہے" محمود حسین نے بڑی اپنائیت سے کندھے ہوئے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا" مجھے شرمندہ نہ کرو ـــــ"

"بڑے سرکار ـــــ" ممدو کی پلکوں کے گوشے بھیگنے لگے۔

"میں تمہیں نئی زندگی کی دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں" محمود حسین نے مسکراتے ہوئے کہا

"ہر طرف سے بھی تمہیں روبصحت ہونا مبارک ہو" شمسہ بیگم بولیں "خدا عاشی بیٹی کے سر پر تمہارا سایہ تادیر قائم رکھے"

"میں کس منہ سے آپ لوگوں کا شکریہ ادا کروں" ممدو نے کپکپاتی آواز میں جواب دیا۔ ضبط کرنے کے باوجود آنسو کے دو قطرے اُس کی پلکوں سے ڈھلک کر نیچے آگئے تھے۔ جذبات پر قابو پانے کے لئے اُس نے اپنے ہاتھ سختی سے بھینچ لئے

"ہماری عاشی بیٹی نے آج تمہارے لئے خاص طور سے شاہی ٹکڑے تیار کرائے ہیں" محمود حسین نے مسکرا کر گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے کہا۔

"کیوں تکلیف کی تو نے ـــــ" ممدو نے عاشی کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھا۔

"تکلیف میں نے نہیں خانساماں نے کی ہے" عاشی شوخی سے بولی "میں نے تو صرف تمہاری پسند کی فرمائش کی تھی۔

"اور عاشی نے تمہارے لئے آج سارا دن کوارٹر کی صفائی بھی کی ہے" شمسہ بیگم مسکرا کر بولیں۔

"ایمان سے بابا ـــــ تم دیکھو گے تو خوشی سے اچھل پڑو گے۔ عاشی نے کہا پھر بڑی محبت سے ممدو کا بازو تھام کر بولی "چلو' دکھاتی ہوں تمہیں"

"عاشی ـــــ" محمود حسین نے بلکنت سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا" مجھے ممدو سے کچھ بات کرنی ہے"

عاشی نے محمود حسین کو اچانک سنجیدہ ہوتے محسوس کیا تو سہم کر رک گئی' ممدو بھی اُن کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"ممدو ـــــ تم نے ایک بار عاشی سے کہا تھا کہ اگر میں نے تمہاری جگہ کسی دوسرے مالی کا بندوبست کر لیا تو تمہیں کوارٹر نئے مالی کے لئے خالی کرنا پڑے گا" محمود حسین نے ہاتھ میں دبی چابی کی زنجیر گھماتے ہوئے کہا۔

"جی ـــــ جی ہاں بڑے سرکار ـــــ" ممدو نے دھڑکتے ہوئے دل سے جواب دیا۔

"تمہاری بیماری کے سبب میں نے عاشی کو بھی کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا لیکن آج میں بتا رہا ہوں کہ میں نے نئے مالی کا انتظام کر لیا ہے اور کل سے وہ تمہارے کوارٹر میں آجائے گا ـــــ"

"جی ـــــ" ممدو کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا پھیل گیا۔ خود کو سنبھالتے ہوئے بولا "جیسی آپ کی مرضی سرکار"

عاشی کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اُس نے محمود حسین کی جانب بہت غور سے دیکھا جو بدستور سنجیدہ نظر آرہے تھے البتہ شمسہ بیگم نہ جانے کیوں زیرلب مسکرا رہی تھیں۔

"مجھے افسوس ہے ممدو ـــــ لیکن سرونٹ کوارٹر میں چونکہ گنجائش نہیں ہے اس لئے تمہیں نئے مالی کے لئے کوارٹر خالی کرنا پڑے گا"

"اتنی جلدی ـــــ" عاشی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا اور یوں حیرت سے محمود حسین کو تکنے لگی جیسے کچھ سمجھ نہ سکتا ہو۔

"ہاں عاشی ـــــ یہ میرا حکم ہے اور تمہیں میرا حکم ماننا پڑے گا ـــــ اس لئے کہ میں تمہیں بیٹی کہہ چکا ہوں"

"انکل ـــــ" عاشی کی آنکھیں بھیگ گئیں کچھ کہنا چاہتی تھی کہ محمود حسین نے ہاتھ میں دبی ہوئی چابی اُس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ انکسی کی چابی ہے عاشی بیٹی ـــــ ہاں' آج سے تم اور تمہارے بابا سرونٹ کوارٹر میں نہیں ـــــ انکسی میں رہیں گے"

"انکل ـــــ" عاشی نے محمود حسین کے لہجے کے خلوص کو محسوس کیا تو خوشی سے چیخ اٹھی' بے اختیار بڑھ کر

اُن کے شانہ سینے سے لپٹ گئی۔

"ہاں بیٹی ـــــ" محمود حسین بڑی شفقت سے اُس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے "تمہیں اچانک سرپرائز (SURPRISE) دینا چاہتا تھا ـــــ تم خود ہی سوچو عاشی' جب میں تمہیں ناجیہ سے کم عزیز نہیں رکھتا تو اب تم سرونٹ کوارٹر میں کیسے رہ سکتی ہو"

"انکل ـــــ میں ـــــ"

"آگے کچھ نہ کہنا عاشی ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا" محمود حسین نے مچلتی نظروں سے عاشی کے چہرے کے مانوس خدوخال کو بہت قریب سے گھورتے ہوئے کہا "لو ـــــ یہ چابی قبول کرو ـــــ میری خوشی کی خاطر ـــــ"

عاشی نے لرزتے ہاتھوں سے چابی کی زنجیر تھام لی۔ اُس کی نگاہیں بدستور محمود حسین کے چہرے پر مرکوز تھیں' زبان سے شکریے کا اظہار نہ کر سکی تو جذبات سے مغلوب ہو کر ایک بار پھر محمود حسین سے لپٹ گئی۔

شمسہ بیگم کی پلکوں پر بھی خوشی کے آنسو کے شبنمی قطرے جھلملا اُٹھے ـــــ!

اور ممدو ـــــ اُس نے آسمان کی جانب نظریں اُٹھا کر اُس کی نیلگوں وسعتوں کا اندازہ لگایا پھر آنکھیں بند کر کے آہستہ سے یوں گردن جھکا لی جیسے خدا کے حضور نذرانۂ شکر پیش کر رہا ہو ـــــ!!

رات کے کھانے کے بعد محمود حسین اپنی خوابگاہ میں لیٹ کر کچھ دیر تک مطالعہ کرنے کے عادی تھے آج بھی حسب معمول وہ ایک ضروری فائل کے کاغذات اُلٹ پلٹ رہے تھے کہ شمسہ بیگم نے آہستہ سے کہا۔

"کافی کی خواہش ہو رہی ہو تو بنا لاؤں ـــــ"

"خیریت ـــــ" محمود حسین نے پلٹ کر بیوی کی طرف دیکھا "آج یہ بغیر کہے آپ نے کافی کی پیشکش کیسے کر دی"

"کوئی گناہ تو کیا نہیں میں نے ـــــ" شمسہ بیگم ٹوک کر بولیں

"میں نے عنایت کا سبب دریافت کیا تھا" محمود حسین نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "گناہ کا حساب کتاب تو بعد میں ہوگا"

"ٹھیک ہے ـــــ آپ فائلوں میں سر کھپاتے رہیئے' میں بھی پڑ کر سو رہتی ہوں"

"ارے ارے ـــــ آپ تو خفا ہوگئیں" محمود حسین جلدی سے فائل بند کرتے ہوئے بولے "یہ لیجئے بند کر دی فائل ـــــ اب فرمایئے' کیا حکم ہے اس خاکسار کے لئے ـــــ"

"ٹھہریئے ـــــ میں آپ کے لئے کافی تیار کر کے لاتی ہوں"

محمود حسین سمجھ رہے تھے کہ یہ عنایت بلاوجہ نہیں ہے' ضرور کوئی بات ہے جو شمسہ بیگم اُن سے تفصیل سے بیان کرنے کی خواہشمند تھیں' پہلے بھی متعدد بار وہ بیوی کے اس انداز کو پرکھ چکے تھے چنانچہ وہ مسکرا دیئے اور شمسہ بیگم اسٹڈی ڈریسنگ گاؤن کے بند باندھتی خوابگاہ سے باہر چلی گئیں۔

فائل اور ضروری کاغذات بریف کیس میں بند کرنے کے بعد محمود حسین بستر پر نیم دراز ہو کر قیاس آرائی کرنے لگے تھے' اہلیہ کے آنے سے پیشتر اس بات کو سوچنا چاہ رہے تھے جو کی جانے والی تھی ـــــ مگر اُن کا ذہن انکسی کی طرف گیا' ایک لمحے کو اُن کے چہرے کے خوشگوار تاثرات گہری سنجیدگی میں تبدیل ہوگئے۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ شمسہ کو یہ بات بُری لگی ہو کہ انکسی ممدو اور عاشی کے تصرف میں کیوں دے دی گئی؟" محمود حسین کے ذہن میں یہ خیال تیزی سے ابھرا تو وہ بے چین سے ہو کر اُٹھے اور دبے قدموں چہل قدمی کرنے لگے انکسی کو دینے سے پیشتر انھوں نے شمسہ بیگم سے پوچھا بھی تھا اور اُن کے مشورے کے بعد ہی عملی قدم اٹھایا تھا۔ پھر.....

شمسہ بیگم کافی کی ٹرے لئے کمرے میں داخل ہوئیں تو محمود حسین کے خیالات کا شیرازہ منتشر ہوگیا۔ انھوں نے اپنے چہرے پر گمبھیر تاثرات سجا لئے لیکن ذہن برابر الجھتا رہا۔ نہ جانے کیوں انھیں رہ رہ کر یہی خیال آرہا تھا کہ شمسہ بیگم اُن کے والہانہ پیار کو محسوس کر لیا ہے اور اسی ضمن میں وہ بات کرنے کی خواہشمند تھیں۔

"کیا بات ہے ـــــ یہ آپ نے میز پر جاتے ہی چہل قدمی کس لئے شروع کر دی" شمسہ بیگم کافی کی ٹرے میز پر رکھتی ہوئی بولیں۔

"یوں ہی ——— ذرا خون میں حرارت پیدا کر رہا تھا۔"

"کیوں بناتے ہیں ———" شمسہ بیگم نے مسکرا کر کہا "ابھی اتنی سردی کہاں پڑنی شروع ہوئی کہ خون جمنے لگے۔"

"بات صرف سردی کی نہیں ہوتی ———" محمود حسین نے دوبارہ بستر پر آتے ہوئے کہا "اکثر فوارشوں کی بھی جسم میں جھرجھری پیدا کر دیتی ہے ———"

"باتیں بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔" شمسہ بیگم نے قدرے شرماتے ہوئے کہا پھر بولیں "ناجیہ میں بھی آپ کی آیا ہے، جواب تو جیسے زبان کی نوک پر رکھا ہوتا ہے ———"

"آخر ہے نا اپنے باپ کی اصل بیٹی ———" محمود حسین نے کافی کا کپ اٹھا کر ایک گھونٹ لیا پھر بولے "وقت تو آپ نے خاصی محنت سے کافی تیار کی ہے ———"

"آپ کو جگانے کی خاطر ———"

"زندہ باد ———" محمود حسین چہک کر بولے "گویا آج رات آپ کی خواہش پر رات جگا ہوگا۔"

"جی نہیں۔ خاطر جمع رکھئے" شمسہ بیگم نے جھینپتے ہوئے لہجے میں تیزی سے کہا "بل کے بھاگوں چھینکا ٹوٹنے کی بات بالکل نہیں ہے۔"

"پھر ———" محمود حسین نے بڑا معصوم منہ بنا کر سوال کیا "اور کیا بات ہو سکتی ہے۔"

"نہایت اہم اور ضروری بات ہے ——— پہلے آپ کافی پی لیں پھر بتاتی ہوں۔"

محمود حسین بیوی کو ٹٹولنے کی خاطر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے لیکن اس بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکے جو شمسہ بیگم ان سے کرنے والی تھیں۔ کافی پینے کے بعد جب شمسہ بیگم نے اٹھ کر دروازہ اندر سے بند کیا تو محمود حسین کا دل آپ ہی آپ دھڑکنے لگا۔ اُن کے تصورات کے دوش پر ایک بار پھر عاشی کا مسکراتا ہوا معصوم اور بھولا سا چہرہ ابھر آیا۔

یہ چہرہ اپنے اندر مقناطیسی کشش رکھتا تھا ———
جانا پہچانا سا تھا ———
اپنا اپنا سا لگتا تھا ———

اور اسی اپنائیت کے طلسمی احساس نے محمود حسین کو اپنے چہرے کے خدوخال میں ڈوب جانے پر مجبور کر دیا تھا ——— اکثر انھوں نے اس کشش کی وجہ جاننے کی کوشش کی لیکن ہر بار الجھ کر رہ گئے ——— ہر بار خود کو بہلا لیا کہ وقت کی گرد شیں کبھی پیچھے کی سمت واپس نہیں لوٹ سکتیں لیکن اس کے باوجود وہ اس حصار کو توڑ نہ سکے تھے جو عاشی کے وجود نے ان کے گرد قائم کر دیا تھا ——— شاید اس لئے کہ وہ حصار ہی درحقیقت ان کے ادھورے خوابوں کی روشن تعبیر تھا ——— پھر وہ اس تعبیر سے دور کیسے جا سکتے تھے ———!

شمسہ بیگم نے خواب گاہ کا دروازہ بند کرنے کے بعد اپنی الماری کے سیف سے سُرخ مخمل کی چھوٹی سی ڈبیا نکالی اور اُسے خاموشی سے لا کر شوہر کے سامنے رکھ دیا۔

محمود حسین نے دھڑکتے ہوئے دل سے ڈبیہ کھولی، اندر سونے کی ایک نازک سی انگوٹھی موجود تھی جس میں جڑے ہوئے نگینے ایک لمحے کو انھوں نے بہت غور سے انگوٹھی کو دیکھا پھر بیوی کو وضاحت طلب نظروں سے گھورتے ہوئے بولے

"بیٹ کی ہے ———"

"جی ہاں ———" شمسہ بیگم مسکرا کر بولیں "کیسی ہے ———"

"خوبصورت بھی ہے اور نازک بھی۔" محمود حسین نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا "کھودا پہاڑ نکلا چوہا میں تو سمجھ رہا تھا کہ نہ جانے کیا بات ہے جس کی خاطر رات کالی کرنی پڑے گی۔"

"آپ کو اس انگوٹھی کی قیمت کا کچھ اندازہ ہے ———" شمسہ بیگم نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"زیادہ سے زیادہ چار چھ ہزار ———"

"جی نہیں ——— اس سے بھی زیادہ۔"

"دس ہزار ———"

"یہ بھی بہت کم ہیں ———"

"بیس ہزار۔"

"جی نہیں ———" شمسہ بیگم مسکرا کر بولیں "اس انگوٹھی کی قیمت کا اندازہ لگانا آپ کے لئے ناممکن ہے۔"

"میں سمجھا نہیں ———" محمود حسین نے تعجب سے پوچھا۔

"آپا کامیابی کے جشن والی رات یہ انگوٹھی ناجیہ کو پہنانا چاہتی تھیں۔" شمسہ بیگم نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا "میں نے اُن سے یہی کہا تھا کہ آپ سے مشورہ کرنے کے بعد ہی جواب دیا جا سکتا ہے۔"

"ہم ———" محمود حسین کچھ دیر کے لئے کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو گئے پھر بیوی کی سمت دیکھتے ہوئے بولے "آپ نے اس انگوٹھی کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے ———"

"اتنا اہم فیصلہ میں آپ کے مشورے کے بغیر بھلا کس طرح کر سکتی ہوں ———"

"پھر بھی ———" محمود حسین نے سنجیدگی سے کہا "آپ نے کچھ سوچا تو ہوگا۔ آخر آپ ناجیہ کی ماں ہیں۔"

"میرے خیال سے تو فراز میں کوئی بُرائی نہیں ہے۔" شمسہ بیگم نے توقف سے کہا "گھر کا لڑکا ہے ——— دیکھا بھالا بھی ہے۔"

"فراز کے بارے میں میری رائے بھی یہی ہے۔" محمود حسین بولے "جہاں تک اُس کے مستقبل کا تعلق ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کا نام ضرور روشن کرے گا ——— اور ہاں، میں آپ کو ایک بات بتانا تو بھول ہی گیا تھا۔"

"وہ کیا ———"

"میں نے آپا کے مشورے پر فراز سے بات کی تھی ——— وہ انجینئرنگ کے بجائے مقابلے کے امتحان میں شریک ہونے کو آمادہ ہو گیا ہے۔"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔" شمسہ بیگم نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "اچھا ہوا جو فراز نے ایبر فورس میں شمولیت کا فیصلہ ترک کر دیا۔ آپا در اصل نیاز بھائی کے انجام سے اس قدر خوفزدہ ہیں کہ کسی غیر کو بھی پائلٹ بننے کا مشورہ نہیں دیں گی، فراز تو پھر اُن کا خون ہے ——— کیا آپا کو اطلاع ہے کہ فراز نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا ہے؟"

"ہاں ———"

"مقابلے کے امتحان کے بعد فراز کی کیا حیثیت ہوگی۔" شمسہ بیگم نے پوچھا۔

"بہت بڑا اور اعلیٰ آفیسر بنے گا ———"

"انشاء اللہ۔" شمسہ بیگم نے جلدی سے کہا پھر کچھ رک کر بولیں "آپ کا کیا مشورہ ہے، یہ انگوٹھی ناجیہ کو پہنا دی جائے۔"

"ہمیں اس سلسلے میں جلد بازی نہیں کرنی چاہیئے ——— بہت سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔"

"کیا مطلب ——— کیا فراز آپ کو ناجیہ کے لئے پسند نہیں ہے۔"

"فراز ہر اعتبار سے ناجیہ کے لیے موزوں اور مناسب ہے لیکن شاید ناجیہ اس رشتے کو پسند نہ کرے۔"

"تو کیا ناجیہ کی شادی اُس کی اپنی پسند سے ہوگی ———" شمسہ بیگم نے حیرت سے پوچھا "ہمیں کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہوگا۔"

"حالات کو سمجھنے کی کوشش کریں بیگم۔" محمود حسین نے ہاتھ ملتے ہوئے جواب دیا "ناجیہ کی تربیت نے اُسے اتنا خود مختار اور خود سر بنا دیا ہے کہ ہم اسے کسی بات کے لئے پابند نہیں کر سکتے ———"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ———"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ——— ناجیہ کو سنوارنے میں ہمیں وقت درکار ہوگا، اُسے پیار و محبت سے سمجھانا ہوگا۔"

"پھر ——— آپکو کیا جواب دیا جائے ———" شمسہ بیگم نے بجھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اتنی جلدی مایوس نہ ہوں" محمود حسین بیوی کو سمجھاتے ہوئے بولے۔ "فی الحال یہ انگوٹھی سنبھال کر پاس رکھیں اور ہو سکے تو اشاروں کنایوں میں یا پھر کسی اور ذریعے سے فراز کے سلسلے میں ناجیہ کا عندیہ معلوم کرنے کی کوشش کریں ——— رہا آپا کا سوال تو میں انھیں سمجھا دوں گا۔"

"جیسی آپ کی مرضی ——— میں تو اتنا کہوں گی کہ ناجیہ کے لئے فراز سے زیادہ مناسب رشتہ ملنا مشکل ہے"

"خدا پر بھروسہ رکھئے بیگم ——— وہ چاہے گا تو حالات خود بخود ہی رُخ اختیار کر لیں گے جو ہم چاہتے ہیں"

شمسہ بیگم نے ایک نظر شوہر پر ڈالی پھر ایک سرد آہ بھر کر اُٹھیں اور انگوٹھی کو لے جا کر دراز میں رکھ آئیں۔ اُن کے چہرے پر حزن و ملال کے بادل منڈلا رہے تھے اور محمود حسین ——— وہ چھت پر نظریں جمائے کسی گہری سوچ میں غرق تھے ——— !!

جب سے محمود حسین نے ناجیہ کو نئی کار خرید کر دی تھی اس کی آزادی بھی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ شمسہ بیگم نے اُسے متعدد بار تاکید کی تھی کہ وہ تنہا گاڑی لے کر کہیں نہ جایا کرے۔ ڈرائیور یا کسی ملازم کو ساتھ لے جایا کرے لیکن ناجیہ نے سب کچھ ایک کان سے سُن کر دوسرے کان سے نکال دیا تھا۔

شام کو فرحت کے ساتھ ڈرائیونگ پر جانا تو جیسے اُس کا روزمرہ کا معمول بن گیا تھا۔ اکثر وہ کالج بھی اپنی گاڑی پر جاتی، کبھی عاشی کو بھی ساتھ لے جاتی اور کبھی بالکل ہی تنہا روانہ ہو جاتی اور عاشی کو بس سے کالج جانا پڑتا۔ غرضیکہ نئی گاڑی کی وجہ سے ناجیہ کی آزادی میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

آج بھی شام کی چائے پینے کے بعد اُس نے لباس تبدیل کیا، ڈرائیور سے کہا کہ جا کر پٹرول کی ٹنکی بھروا لائے اور وہ حسبِ معمول فرحت کو ساتھ لے کر ڈرائیونگ کے لئے نکل پڑی۔

"آج کدھر کا پروگرام ہے" فری نے دریافت کیا۔

"جدھر تم کہو ———"

"کیا خیال ہے اگر آج کسی مضافاتی علاقے کی سیر کی جائے" فری نے کہا "ذرا دیکھیں تو سہی کہ ہمارے غریب لوگ کس طرح اپنی زندگی کے دن گزارتے ہیں ———"

"خیریت تو ہے ———" ناجیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا "کیا تعلیم مکمل کرنے کے بعد سیاست میں حصہ لینے کا ارادہ ہے"

"اور کبھی غم ہیں زمانے میں سیاست کے سوا ———"

فری نے بُرا سا منہ بنا کر جواب دیا، ناجیہ بھی مسکرا دی، گاڑی صدر کے علاقے سے گزری تو ناجیہ نے اُس کا رُخ بندرگاہ جانے والی شاہراہ کی جانب موڑ دیا، فری کچھ دیر خاموش رہی پھر اُس نے راستے کا اندازہ لگاتے ہوئے پوچھا

"کیا کیماڑی چلنے کا ارادہ ہے ———"

"نہیں ——— ابھی میں اپنی زندگی سے اتنی عاجز بھی نہیں آئی ———"

"پھر اس طرف کہاں جا رہی ہو ———"

"گھارا در سے نکل کر ہاکس بے (HAWKS BAY) کی طرف چلتے ہیں"

"اکیلے ———" فری نے اپنی نشست پر کسمساتے ہوئے کہا۔

"اکیلے کیوں ———" ناجیہ لاپروائی سے بولی "تم جو میرے ساتھ ہو"

"میرا مطلب تھا کسی مرد کے بغیر ہمارا ساحلی تفریح کا ہوں کی طرف جانا مناسب نہیں"

"اچھا ——— وہ کس وجہ سے"

"لوگ بلاوجہ فقرے چست کرتے ہیں" فری سنجیدہ تھی "الٹی سیدھی بکواس شروع کر دیتے ہیں"

"کرتے ہیں تو کیا کریں۔ ہمیں کیا ———" ناجیہ بدستور لاپروائی سے بولی۔

"نہیں ناجیہ ——— ہاکس بے نہیں، کسی اور سمت چلتے ہیں" فری نے اصرار کیا

"یہ تمہاری جان کیوں نکل جا رہی ہے" ناجیہ نے مسکرا کر پوچھا "کیا کوئی زبردستی اُٹھا کر لے جائے گا"

"یہ بھی لیکن پھر بھی ہمارا تنہا وہاں جانا مناسب نہیں ہے" فری بولی "اگر چلنا ہے تو پھر کسی دن باقاعدہ پروگرام بنا لیں لیکن لڑکیوں کو اور بھی ساتھ لے لیں گے اور ہم اپنی گاڑی بھی لے چلوں گی تاکہ ایک ڈرائیور بھی ساتھ ہو"

فری کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، ہونٹ کاٹ کر رہ گئی پھر اُس نے بریک لگا کر گاڑی بھی سڑک کے کنارے روک لی، اُس کا موڈ فری کے بار بار کے انکار سے خراب ہو گیا تھا۔ ایک لمحے کو رُک کر اُس نے پشت سے آنے والی گاڑیوں کو دیکھا پھر اپنی گاڑی گھمانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اچانک اُس کی نظر عدیل پر پڑی جو سڑک کے کنارے پیدل مارچ کرتا چلا آ رہا تھا۔ اسی وقت فری نے بھی کہا

"ناجیہ ——— وہ دیکھو سامنے ——— تیرا گدڑی کا لال ———"

"کیا خیال ہے ——— اُٹھا لوں" ناجیہ کا موڈ ایک دم ہی ٹھیک ہو گیا، عدیل کو دیکھ کر اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اُبھر آئی تھی۔

"کالج کی بات اور ہے ناجیہ لیکن ———"

"اب اگر تو نے میرا موڈ خراب کیا تو دھکا مار کر نیچے پھینک دوں گی" ناجیہ نے گھور کر کہا پھر گاڑی کو آہستہ آہستہ آگے بڑھانے لگی۔

عدیل سر جھکائے اپنی دُھن میں مگن چلا آ رہا تھا، ناجیہ نے ایک دم اُس کے قریب لے جا کر گاڑی روکی تو وہ چونک اُٹھا۔ ناجیہ اور فری کو دیکھا تو سٹپٹا کر بولا۔

"آپ ———"

"ایسی بھی کیا بے رخی عدیل صاحب" ناجیہ نے شوخی سے کہا "آپ تو نظر ہی نہیں اُٹھاتے ———"

"جی ——— میں ——— وہ ———" عدیل ہکلانے لگا۔

"کہاں کھوئے ہوئے تھے ———"

"کہیں بھی نہیں" عدیل نے گڑبڑاتے ہوئے جواب دیا "یونہی ذرا ایک کام سے بندرگاہ تک گیا تھا"

"اچھا ———" ناجیہ نے انتہائی تعجب کا اظہار کیا پھر بڑی معصومیت سے بولی "کیا بندرگاہ سے پیدل ہی آ رہے ہیں ———"

"تم بھی کمال کرتی ہو" فری نے شوخی سے ناجیہ کو کہنی ماری پھر عدیل پر فقرہ چست کرتے ہوئے بولی "جب عدیل صاحب پیدل ہی نظر آ رہے ہیں تو اس میں بھلا پوچھنے کی کیا ضرورت ہے"

عدیل نے کوئی جواب نہیں دیا، ایک نظر بھر کر فرحت کو دیکھا پھر جلدی سے نظریں جھکا لیں۔

"کہاں جا رہے ہیں آپ ———" ناجیہ نے براہِ راست عدیل سے پوچھا۔

"فرنچ مارکیٹ تک" عدیل نے سنجیدگی سے کہا "وہیں ایک مختصر سی گلی کے پیچھے مکان میں میری رہائش ہے"

"میں چھوڑ دوں آپ کو ———"

"جی نہیں ——— شکریہ"

"کیوں ———" ناجیہ نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا "کیا آپ مجھے خدمت کا موقع نہیں دیں گے"

"آپ شاید مجھے بنا رہی ہیں ———" عدیل نے ناجیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"اندازہ کس طرح لگا لیا آپ نے ———" ناجیہ نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

"میرا خیال ہے ———"

"اس خیال کی کوئی وجہ بھی ہو گی ———" ناجیہ نے سوال کیا

"بس میرا دل یہی کہتا ہے"

"اچھا ———" فری نے برجستہ کہا "تو آپ صاحبِ دل بھی ہیں"

"جی ہاں ——" عدیل نے سنجیدگی سے جواب دیا "صرف صاحبِ دل —— آپ لوگوں
صاحبِ حیثیت نہیں ہوں"

"اندر آجائیے ——" ناجیہ نے نشست کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا "یوں سڑک پر کھڑے
کرنا کچھ اچھا نہیں لگتا"

"آپ کیوں زحمت مول لے رہی ہیں —— میں پیدل ہی چلا جاؤں گا"

"پلیز عدیل ——" ناجیہ نے اس بار بے تکلفی اختیار کی۔ "میری خاطر ——"

اور عدیل ایک لمحے کو جھجکا پھر خاموشی سے اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ناجیہ نے انجن اسٹارٹ
گاڑی واپس موڑلی لیکن اس کی رفتار مدھم ہی رکھی —— چند لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ پھر ناجیہ نے کہا

"مجھے خوشی ہے عدیل کہ آپ نے میری درخواست رد نہیں کی"

"ایک بات میں بھی عرض کرنا چاہوں گا ——"

"ارشاد ——" فری نے جلدی سے کہا "ہم ہمہ تن گوش ہیں"

"میں بہت غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں" عدیل نے براہِ راست ناجیہ سے مخاطب ہو کر کہا
والد پوسٹ ماسٹر ہیں اور ہم جھونپڑی نما ایک مختصر سے مکان میں رہتے ہیں —— آپ —— آپ کو یہ بات
لئے بتا رہا ہوں کہ آپ بڑے گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں ——"

"میں سمجھی نہیں عدیل صاحب" ناجیہ نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا "ان باتوں سے آپ کا مقصد

"میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے ——" عدیل کہتے کہتے رک گیا پھر بولا "آپ میرا مطلب سمجھ
ہوں گی"

"جی نہیں ——" ناجیہ نے انجان بنتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ کالج میں مجھ سے بے تکلفی سے ملتی ہیں اور یہ بات دوسرے لڑکے لڑکیوں کے لئے چہ میگوئیوں کا
بن سکتی ہے" عدیل نے رک رک کر کہا۔

"آپنے غالباً اسکینڈل کا ترجمہ کیا ہے" فری نے الفاظ چباتے ہوئے کہا "چہ —— میگوئیاں ——

"جی ہاں ——"

"دوستی کرنا میرے خیال میں کوئی ایسی معیوب بات تو نہیں" ناجیہ نے اپنے قہقہوں پر بمشکل قابو پاتے ہو
سنجیدگی سے کہا "اور پھر —— ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہی پڑھتے ہیں ——"

"آپ درست فرما رہی ہیں لیکن ——" عدیل کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

ناجیہ نے نظریں اٹھا کر شیشے میں دیکھا تو مسکرا کر رہ گئی۔ عدیل نظریں جھکائے کسی سوچ میں گم
آرہا تھا۔

"آپ کچھ کہنا چاہتے تھے" ناجیہ نے ایک سرد آہ بھر کر کہا "چپ کیوں ہو گئے ——"

"دراصل —— دراصل میں —— آپ کی بہت عزت کرتا ہوں" عدیل نے جھجکتے ہوئے
دیا "اگر میری وجہ سے آپ پر کوئی حرف آیا تو مجھے دلی صدمہ ہوگا اور —— یہ بات میں بڑے خلوص سے کہہ رہا
"آپ کا خلوص ہی تو ہے جس نے مجھے آپ سے دوستی کرنے پر مجبور کر دیا ہے" ناجیہ نے بڑی اپنائیت سے
"زمین اور آسمان —— جہاں ایک دوسرے سے ملتے نظر آتے ہیں وہ مقام محض نگاہوں کا فریب
ہے ناجیہ صاحبہ" عدیل نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا پھر چونک کر بولا "گاڑی یہیں روک دیجئے —— میری
آگئی ہے"

"آپ تو مجھے افسانہ نگار معلوم ہوتے ہیں" ناجیہ نے گاڑی سڑک کے کنارے روکتے ہوئے پوچھا "کون
رسالے میں چھپتے ہیں"

"میں تصنع اور بناوٹ کو معیوب سمجھتا ہوں اس لئے افسانوں اور افسانوی باتوں کو پسند نہیں کرتا"
نے خشک لہجے میں کہا

"گڈ ——" ناجیہ تیزی سے بولی "میری اور آپ کی بہت سی عادتیں ملتی جلتی ہیں ——"

"لفٹ دینے کے لئے میں آپ کا بے حد مشکور ہوں" عدیل نے آہستہ سے کہا پھر تیزی سے گاڑی سے
لمبے لمبے قدم اٹھاتا سڑک عبور کر گیا۔

"صورت سے چغد لگتا ہے لیکن باتیں بڑی سوجھ بوجھ کی کرتا ہے" فرحت بولی۔

"خدا کی قسم فری —— یہ عدیل بڑی خوبیوں کا مالک ہے" ناجیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہوش میں تو ہو ——" فرحت نے حیرت سے ناجیہ کا منہ تکتے ہوئے کہا "کہاں تم اور کہاں عدیل"

"تفریح کے لئے کچھ ایسا برا بھی نہیں ہے"

"کیا مطلب ——" فرحت چونک اٹھی

"تم بس دیکھتی جاؤ —— میں اس غریب جانور کو کس طرح سیدھا کر پالتو بناتی ہوں"

"کہیں بعد میں ایسا نہ ہو کہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر خود اس کی پالتو بن جاؤ" فرحت شوخی سے بولی

"مائی فٹ ——" ناجیہ نے مسکراتے ہوئے حقارت کا اظہار کیا پھر گاڑی کو ایک دم سے گیئر میں ڈال کر
تیزی سے آگے بڑھاتی چلی گئی۔

راستے بھر دونوں بے تکلف سہیلیاں عدیل کا تذکرہ کر کے ہنستی مسکراتی رہیں —— خاص طور پر ناجیہ
دل کھول کر بات بات پر قہقہے بلند کر رہی تھی ——!!

صبح ہی سے موسم کے تیور ٹھیک نہیں تھے۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ آج کالج کا ناغہ کر دے لیکن جب شہزاد آکر کہا کہ ناجیہ اُس کی منتظر ہے تو وہ جلدی جلدی تیار ہو کر فائل لئے آنگن سے باہر آگئی۔ موسم کی مناسبت سے اُس نے گہرے رنگ کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔

ناجیہ اپنی نئی گاڑی میں بیٹھی اس کی راہ تک رہی تھی۔

"سوری ——" اُس نے دروازہ کھول کر اگلی نشست پر ناجیہ کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا "مجھے کچھ دیر ہو گئی۔"

"معاف کیا ——" ناجیہ نے لاپروائی سے کہا پھر گاڑی اسٹارٹ کر کے روش پر آگے بڑھ گئی۔ پھاٹک پر کھڑے ہوئے چوکیدار نے سلام کے لئے ہاتھ اٹھایا تو وہ سر کے خفیف اشارے سے جواب دیتی کھلی سڑک پر آگئی۔

"مجھے تو آج بارش کے آثار نظر آرہے ہیں۔ عاشی نے نیلے آسمان کی چھاتی پر اودے اودے بادلوں کو منڈلاتے دیکھ کر کہا۔

"موسم بڑا آفت ہو رہا ہے۔" ناجیہ بولی "ایمان سے اگر اچانک رم جھم شروع ہو جائے تو لطف آجائے۔"

"تمہیں ڈرائیور کو ساتھ لے لینا چاہیئے تھا۔" عاشی نے کہا "بارش سے سڑک پر پھسلن ہو گئی تو ڈرائیونگ تمہارے لئے دشوار ہو جائے گی ——"

"نان سنس۔" ناجیہ کی پیشانی شکن آلود ہو گئی "تمہارے جسم کے اندر بھی کسی دقیانوسی بوڑھی عورت کی روح حلول کر گئی ہے۔"

"مطلب ——"

"ممی نے بھی گھر سے چلتے وقت ڈرائیور کو ساتھ لینے کا حکم صادر فرمایا تھا ——"

"ٹھیک ہی تو کہا ہے آنٹی نے —— ذرا سوچو اگر راستے میں اچانک ——"

"کوئی حادثہ پیش آگیا تو ہمارا پرسانِ حال کون ہوگا۔" ناجیہ نے جملہ پورا کر دیا۔

"حادثہ ہو کیوں —— " وہ جلدی سے بولی "گاڑی خراب بھی تو ہو سکتی ہے۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو ——" ناجیہ نے مسکرا کر کہا۔

"اگر ایسا ہوا تو گاڑی کون ٹھیک کرے گا ——"

"مائی فٹ ——" ناجیہ جھلا گئی پھر ہونٹوں پر شوخ سی مسکراہٹ بکھیر کر بولی "وہ اپنی قسمت پر رشک کرے گا اور موسم کو ڈھیر ساری دعائیں دے ڈالے گا ——"

"وہ کون ——" عاشی نے حیرت سے پوچھا۔

"وہی —— جو ہمارے قریب آکر کچھ شرما کر اور کچھ سہمے سہمے انداز میں خود کو بڑا مہذب اور شریف ثابت کرتے ہوئے کہے گا۔ مس، کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں۔"

"کس کی بات کر رہی ہو ——"

"تم اُس کے سامنے بھی کوئی دقیانوسی جملہ نہ بول دینا۔" ناجیہ نے اسے گھور کر تنبیہ کی پھر سامنے سڑک پر نظر جماتے ہوئے رومانٹک انداز میں بولی "پہلے آرام سے اُسے دیکھنا آنکھوں اور پتلیوں کی حرکت سے اندازہ لگانے کی کوشش کرنا وہ کس قماش کا اور کہاں —— عمر سے اس کی شرافت یا کمینگی کی پیمائش نہ کرنا ورنہ چوٹ کھا جاؤ گی۔"

"لیکن —— وہ ہے کون۔" عاشی اُلجھ گئی "پتہ تو چلے ہم کس کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں۔"

"اسی ہیرو کے بارے میں جو ہمیں لفٹ دے گا۔"

"لفٹ دے گا —— کیا مطلب۔"

"تم ہی نے تو کہا تھا کہ گاڑی میں کوئی خرابی بھی پیدا ہو سکتی ہے۔" ناجیہ شوخی سے بولی "اگر ایسا ہوا تو ظاہر ہے ہم گاڑی کے اندر بند تو نہیں رہیں گے —— کسی نہ کسی سے لفٹ تو لینی پڑے گی۔"

"اب سمجھی ——" عاشی نے قدرے شرماتے ہوئے کہا "گویا تم خوابوں میں محل تعمیر کر رہی ہو۔"

"موسم کا تقاضہ کچھ یہی ہے ——" ناجیہ نے لہرا کر جواب دیا پھر نظریں اٹھا کر بادلوں کو دیکھنے لگی۔

عاشی نے کنکھیوں سے ناجیہ کو دیکھا پھر دل ہی دل میں نہ جانے کس بات پر مسکرا دی۔

کالج پہنچتے پہنچتے موسم کے تیور اور زیادہ خطرناک ہو گئے، سیاہ بادلوں نے مشرق سے اٹھ کر آسمان کو لپیٹ میں لیا تو ہلکا ہلکا خواب آور اندھیرا پھیل گیا۔ پھر پہلا ہیر پیڈ ختم ہوا ہی تھا کہ بڑی بڑی بوندوں کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اندھیرا چھا اور گہرا اور خوفناک ہو گیا۔

لڑکے اور لڑکیاں اُٹھ کر دروازوں کے قریب آگئے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو کلاس سے نکل کر کھلے آسمان کے نیچے جا کر بارش میں نہانے لگے۔ "اُف اللہ —— کیسا گھپ اندھیرا پھیل گیا ہے۔" نادرہ نے موسم کی تبدیلی پر تبصرہ کیا۔

"خدا کی قسم —— اب سردی کی بہار دیکھنا۔" آسیہ بولی۔

"مجھے تو یہ بارش رکتی نظر نہیں آتی۔" رفعت نے کہا۔

"لعنت ہے تجھ پر ——" فرخندہ نے رفعت کو گھورا "خدا خدا کر کے تو موسم سرما کی پہلی بارش ہوئی ہے اور تو اسے نظر لگا رہی ہے۔"

"اب ہم گھر کیسے واپس جائیں گے۔" نیلوفر نے بارش کے تیور کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا ضرورت ہے گھر جانے کی۔" عطیہ نے جس کی نیلوفر سے ہمیشہ ٹھنی رہتی تھی جلدی سے جواب دیا "اب تو اسی کلاس روم کو اپنا گھر سمجھو بی بی اور کرسی کا ہاتھ تھام کر چپ چپاتے ایک کونے میں بیٹھ جاؤ ——"

"تیرے منہ میں خاک۔" نیلوفر جل کر بولی "جو آتا ہے زبان پر کہہ دیتی ہے۔"

"موسم کے اعتبار سے ایک مناسب مشورہ دیا تھا —— مانو نہ مانو تمہاری مرضی۔" عطیہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

"سوچ لو۔" فرخندہ نے لگائی "ایسی بارش بار بار برسنے سے رہی۔"

"اور بارش بھی ایسی کہ ارمانوں کو گدگدا دے ——" نازنے بھی نیلوفر کو چھیڑا۔

"میں تو اب چلتی ہوں۔" فرحت نے کہا "ڈرائیور کہیں باہر موجود ہوگا۔"

"کیا بوریت ہے فری ——" ناجیہ نے فرحت کو گھورتے ہوئے کہا "خبردار جو تم نے گھر جانے کا نام لیا۔"

"پھر —— کیا یہیں کھڑے کھڑے دن گزارنے کا ارادہ ہے۔" فرحت نے پوچھا۔

"کیوں نہ کہیں گھومنے چلا جائے ——" عطیہ نے رائے پیش کی۔

"ایمان سے —— ایسا موسم بار بار ہاتھ نہیں آئے گا۔" فرخندہ نے شانے سمیٹ کر جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

"کسی گارڈن میں چل کر کیوں نہ بیٹھا جائے۔" نیلوفر نے تجویز پیش کی۔

"اسی بی —— اگر ایسے ہی بیٹھنے کو جی چاہ رہا ہے تو کسی کالے پیلے کا ہاتھ تھام کر بیٹھ جاؤ۔" عطیہ بولی "کیوں کسی بھلے چنگے گارڈن کو تباہ کرنے کے درپے ہو ——"

نیلوفر نے عطیہ کو خشمگیں نظروں سے دیکھا، اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔

"یہ تمہاری زیادتی ہے عطیہ ——" ناجیہ نے نیلوفر کی حمایت میں کہا "کیوں تم اس بے چاری کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ رہی ہو۔"

"پنجے سے مجبور نظر آتی ہے۔" عاصمہ نے پہلی بار کہا تو عطیہ اس کی جانب پلٹ پڑی۔

"تم ابھی تک موجود ہو ——— میں تو سمجھی تھی کہ پہلے ہی چھینٹے کے ساتھ کہیں بہہ گئی ہوگی۔"

"کبھی خدا کے لئے ———" فرخندہ نے احتجاج کیا۔ "یہ آپس میں لڑ جھگڑ کر وقت کیوں ضائع کر رہی ہو؟ چلو کپڑے وڑے لے لو۔" ناجیہ بولی۔ "جسے ہمارے ساتھ چلنا ہو وہ ایک طرف ہو جائے اور جو واپس گھر جانا چاہیں وہ دوسری سمت ہو جائیں ———"

"یہ ٹھیک ہے ———" فرخندہ کہا اور جلدی سے ناجیہ کے قریب چلی گئی۔

فرحت، عطیہ، ناز، عاصمہ، رفعت اور آسیہ بھی فرخندہ کے ساتھ ناجیہ کی طرف ہو گئیں، نادرہ، عاشی، نیلوفر، ساجدہ بدستور دوسری جانب کھڑی رہیں۔

"عاشی تم ———"

"بابا کی طبیعت ابھی ٹھیک نہیں ہے" عاشی نے ناجیہ کی بات مکمل ہونے سے پیشتر کہا "میرا گھر پر ہونا ضروری ہے۔"

"اور اگر بارش نہ ہوتی تو ———" فرحت نے عاشی کو گھورتے ہوئے دریافت کیا۔

"تو اور بات تھی" عاشی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اور تم دوسری قطار میں کیا منہ لٹکائے کھڑی ہو" عاصمہ نے نادرہ سے کہا۔

"بس میرا دل نہیں چاہ رہا۔"

"کیا بات ہوئی" عطیہ نے پوچھا۔ "ایسے حسین موسم میں اور دل تفریح کو نہ چاہے ——— تعجب ہے!"

"کہیں اور پروگرام تو نہیں ہے" فرخندہ نے رازداری سے سوال کیا

"جو دل چاہے سمجھ لو" نادرہ مسکرا دی۔

"اور تم ———" ناز نے نیلوفر سے پوچھا "کیا ارادے ہیں؟"

"میں تم لوگوں کی پکنک خراب نہیں کرنا چاہتی" نیلوفر نے عطیہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

"چل نا ———" فرخندہ بے تکلفی سے بولی "تیرے بنا کیا خاک لطف آئے گا۔"

"سوچ لو ——— کہیں گاڑن میری وجہ سے تباہ نہ ہو جائے۔"

"اوہو ———" عطیہ چہک کر بولی "تو تم مجھ سے خفا ہو ———"

نیلوفر نے کوئی جواب نہ دیا تو عطیہ مسکراتی ہوئی بڑھی اور نیلوفر کا ہاتھ تھام کر گھسیٹتے ہوئے بولی

"سیدھی طرح چلتی ہے یا بلاؤں دو چار مزدوروں کو ڈنڈا ڈولی کرنے کے لئے۔"

"میں نہیں جاؤں گی" نیلوفر نے شوخی سے کہا۔ "تم لوگ مجھے نشانہ بنا لیتی ہو ———"

"نشانہ ہمیشہ شکار ہی بنتا ہے میری جان" ناز نے مدھم آواز میں سرگوشی کی۔ "کاش ہم بھی نشانہ بن سکتے۔"

"کبھی ساجدہ سے بھی تو پوچھو" ناجیہ نے کہا۔ "ان کو کیا مجبوری ہے۔"

"میں جانتی ہوں ———" عطیہ نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا ———" ناجیہ نے چونک کر پوچھا۔ "ادھر بھی کھچڑی پک رہی ہے؟"

"ابھی کہاں ———" عطیہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ابھی تو دال چاول کا کوڑا کرکٹ نکالا جا رہا ہے۔"

"گویا چھان بین ———" فرخندہ بولی

"دال تو خیر لمحوں میں گل جائے گی لیکن چاول کون ہے ———" ناز نے ساجدہ کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

"نہ بابا ———" عطیہ کانوں کو ہاتھ لگا کر نہایت شرارت سے بولی "مجھے کیا پڑی ہے جو کسی کے وقار کو ٹھیس پہنچاؤں۔"

"آئی سی ———" فرخندہ نے ساجدہ کو گھورا۔ "تو جناب نے وقار پر کمند ڈالی ہے۔"

"تم بھی آگئیں عطیہ کی باتوں میں" ساجدہ بولی۔ "یہ تو خود جیسی ہوائی دیدہ ہے ویسا ہی دوستوں کو سمجھتی ہے۔"

"پھر بھی ———" ناجیہ نے کہا "دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔"

"دالوں سے کیا پردہ ———" فرخندہ نے بے تکلفی سے ساجدہ سے کہا۔ "ہم کسی غیر سے تو نہیں کہیں گے۔"

"کوئی بات ہی نہیں تو کیا بتاؤں ——— عطیہ کا سر۔" ساجدہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

"جب کوئی بات ہی نہیں ہوئی ——— عطیہ یک دم سنجیدہ ہو گئی۔ "میرے سر کے بارے میں کوئی نکتہ چینی نہیں ہونی چاہیے خبردار ———"

"دیکھیں ———"

"کیوں ———" ناجیہ نے پوچھا۔

"اس لئے کہ اب اس سر میں زبیر کا سودا سمایا ہوا ہے۔"

"خدا سمجھے تجھے ———" رفعت بولی۔ "بالکل ہی بے شرم ہو گئی ہے۔"

"کیا خیال ہے اگر ہم وقار کو ساتھ لے لیں" نازلی بولی۔ "اس طرح شاید ساجدہ بھی چلنے کو تیار ہو جائے۔"

"پھر تو عاشی اور نادرہ سے بھی ان کی پسند کر بدلنی پڑے گی۔" عاصمہ نے مسکرا کر کہا۔

"بھئی تو معاف ہی رکھو ———" نادرہ نے ہنس کر جواب دیا۔

"اور اپنی عاشی تو کبھی بالکل ہی کمسن ہیں۔" ناجیہ شوخی سے بولی۔

"جبھی تو بابا کے کولھے سے لگ کر بیٹھے جا رہی ہے۔" فرحت نے چوٹ کی۔

"تم لوگوں کا چلنے کا ارادہ بھی ہے یا یہیں کھڑے کھڑے ... وقت برباد کرو گی۔" آسیہ نے کہا تو تمام لڑکیوں نے اس کی تائید کی۔

سائبان کے نیچے سے گزر کر لڑکیوں کی ٹولی بیرونی گیٹ تک آگئی جہاں کچھ گاڑیاں ابھی تک موجود تھیں، فرخندہ، آسیہ، رفعت اور ناز ناجیہ کی گاڑی میں بیٹھ گئیں اور عطیہ، عاصمہ اور نیلوفر فرحت کے ساتھ اس کی گاڑن میں چل گئیں جس پر ڈرائیور بھی موجود تھا ——— پھر دونوں گاڑیاں آگے پیچھے موسلا دھار بارش میں کالج کے گیٹ سے باہر نکل کر دھند میں غائب ہو گئیں ———!

موسم حد درجہ خوشگوار ہوتا جا رہا تھا، بارش کی شدت ہر لمحہ زور پکڑتی جا رہی تھی۔ کالج میں چھٹی کا اعلان کر دیا گیا تھا اس لئے طلبا اور طالبات ٹولی بنا بنا کر روانہ ہو رہے تھے۔

عاشی اور نادرہ اپنی کلاس میں تنہا رہ گئیں، باقی لڑکیاں اسی بارش میں بھیگتی روانہ ہو گئی تھیں البتہ لڑکوں میں سے شمیم، ندیم اور ان کے دو تین دوست موجود تھے۔ کمرے میں دروازے کے قریب کھڑے وہ بھی موسم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"عاشی ———" نادرہ نے موسم کے تیور دیکھتے ہوئے کہا "کیا ارادہ ہے ——— یہ بارش تو دو ایک دن اور رکنے کی نظر نہیں آتی۔"

"میں بھی یہی سوچ رہی ہوں" عاشی سنجیدگی سے بولی۔

"اتنی تیز اور طوفانی بارش میں تو کرائے کی سواری بھی نہیں ملے گی۔"

"غلطی ہو گئی ہم سے" عاشی نے کہا "ہم بھی سب کے ساتھ پکنک پر چلے جاتے۔"

"ایسے موسم میں تو کسی سے لفٹ بھی نہیں مانگی جا سکتی۔" نادرہ نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا "سردی بھی بڑھتی جا رہی ہے ———"

"کالج بھی خالی ہوتا جا رہا ہے ———"

"پھر ——— کیا پیدل ہی مارچ کرنی پڑے گی؟"

"ایک تدبیر ہے ———" عاشی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "میں گھر پر فون کر کے انکل سے دوسری گاڑی منگوا لوں ———"

"گڈ آئیڈیا ———" نادرہ خوش ہو گئی پھر بولی "لیکن آفس تک کیسے جائیں گے؟"

"پیدل ———" عاشی نے جواب دیا۔

"پانی میں بھیگ کر شرابور ہو جائیں گے ———" نادرہ نے پھر جھرجھری لی۔

"یہاں کھڑے رہنے سے بہتر ہے ———"

ابھی عاشی اور نادرہ کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی کہ شہباز اور اُس کے ساتھی بھی کلاس سے نکل کر پھاٹک کی طرف چلے گئے، عاشی اور نادرہ کے سوا اب وہاں اس کلاس میں کوئی نہیں تھا۔

"اب کیا خیال ہے؟" عاشی نے نادرہ سے پوچھا۔

"کچھ دیر بارش ہلکی ہونے کا انتظار کیوں نہ کر لیں ——"

"بارش سے تیرا دم کیوں نکل رہا ہے"

"کپڑے بھیگ گئے تو دیکھنے والے مذاق اُڑائیں گے" نادرہ بولی "تیرا کیا خیال ہے، کالج خالی ہو گیا ہوگا"

"کیا مطلب ——"

"مطلب یہ کہ لڑکوں کی ٹولیوں نے پھاٹک پر میلہ لگا رکھا ہوگا"

"تو کیا ہم اُن کے ڈر سے یہیں دُبکے بیٹھے رہیں گے" عاشی سنجیدگی سے بولی "جلدی نکل چل —— اگر پرنسپل آفس بھی بند ہو گیا تو فون کرنے کا موقع بھی ہاتھ سے نکل جائے گا"

"بارش میں ساری کتابیں غارت ہو جائیں گی" نادرہ نے ایک اور خطرے کا اظہار کیا۔

"پھر تو ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے" عاشی جل کر بولی "کلاس کے کھڑکی دروازے بند کر کے یہیں نیزوں پر وقت تک بسیرا کیا جائے جب تک بارش تھم نہیں جاتی"

"نہایت رومانٹک اور مناسب آئیڈیا ہے ——"

"تیرا سر ——" عاشی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "اگر ڈرتی ہے تو بیٹھ آرام سے لیکن میں تو اب ایک لمحہ نہیں ٹھہر سکتی"

نادرہ ابھی ہچکچا رہی تھی کہ شہباز اپنی گاڑی لئے سامنے آ گیا، وہ تنہا ہی تھا۔ دروازے کا شیشہ گرا کر اُس نے ایک نظر دونوں پر ڈالی پھر کچھ سوچ کر نیچے اُتر کر اُن کے قریب آ گیا۔ بڑے مہذب لہجے میں بولا

"چلئے —— میں آپ دونوں کو ڈراپ کر دوں گا ——"

"آپ —— آپ کو بلاوجہ زحمت ہوگی" نادرہ نے تکلف کا اظہار کیا۔

"ہم فون کر کے گھر سے دوسری گاڑی منگا لیں گے" عاشی سپاٹ آواز میں بولی۔

"پرنسپل کے دفتر کا فون بھی موسلا دھار بارش کی نذر ہو گیا۔ شہباز نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"پھر —— اب کیا ہوگا" نادرہ گھبرا گئی۔

"تکلف چھوڑئیے محترمہ —— تشریف لائیے۔ میں آپ دونوں کو آپ کی رہائش گاہ تک چھوڑ دوں گا ——"

"لیکن آپ ——" نادرہ کچھ کہتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔

"میں آپ کا ہم جماعت ہوں —— ساتھی ہوں اور —— اور انسانیت کے ناطے سے میرا فرض ہے کہ آپ کے کام آؤں —— تشریف لائیے ——"

شہباز نے لپک کر گاڑی کا دروازہ کھولا تو نادرہ نے بیٹھنے میں پہل کی۔ چار و ناچار عاشی کو بھی شہباز کی پیشکش قبول کرنی پڑی لیکن نہ جانے کیوں اس وقت اسے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا —— معصوم دل کی دھڑکنیں جانے کیوں تیز ہونے لگیں۔ چہرے پر اُلجھن اور خوف کے ملے جلے تاثرات اُبھر آئے۔

نادرہ کا گھر راستے میں تھا، وہ اُترنے لگی تو عاشی کا دل چاہا کہ اُس کے ساتھ ہی اُتر جائے۔ شہباز کے ساتھ گاڑی میں ایسے موسم میں تنہا سفر اسے معیوب سا لگ رہا تھا لیکن قبل اس کے کہ وہ نادرہ پر اپنے ارادے کا اظہار کرتی، نادرہ نے بڑی اپنائیت سے شہباز کا شکریہ ادا کیا اور پھر عاشی کو خدا حافظ کہتی ہوئی تیزی سے گاڑی سے نیچے اُتری اور دروازہ بند کرتی ہوئی ایک بلڈنگ میں داخل ہو گئی۔

عاشی کے دل کی دھڑکنیں یکلخت ہی دو چند ہو گئیں۔

"آپ کی رہائش کہاں ہے ——" شہباز کی آواز بارش کے شور میں سرگوشی بن کر اُس کے کانوں میں گونجی، وہ سنبھل کر بیٹھ گئی ——

"میں —— میں اور ناجیہ ایک ساتھ ہی رہتے ہیں" اُس نے قدرے سہمے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

شہباز نے کوئی دوسرا سوال نہیں کیا۔ کار دوبارہ حرکت میں آئی تو عاشی نے دل ہی دل میں دعائے خیر پڑھنی شروع کر دی۔ رفعت والے واقعے کے بعد سے تو وہ شہباز سے نہ جانے کیوں ڈرنے لگی تھی —— وہ تھا بھی تو پُراسرار شخصیت کا مالک —— اُس کے ہم جماعت بھی اس کی شخصیت کی تہہ تک پہنچنے کے لئے اُس کے بارے میں کھوج لگاتے رہے تھے لیکن ابھی تک شہباز کی گہرائیوں تک کسی کی رسائی نہیں ہو سکی تھی اور —— اس وقت وہ اسی شہباز کے ساتھ اس کی کار میں بیٹھی تھی۔

ایک لمحے کو خوف کی لہر اُس کی رگ و پے میں تیزی سے سرایت کر گئی۔ ڈرتے ڈرتے اُس نے نظریں اٹھا کر دیکھا شہباز اسٹیئرنگ پر بیٹھا بڑی سنجیدگی سے ڈرائیونگ میں منہمک تھا۔ گاڑی کے چوڑے چکلے شیشے پر موسلا دھار بارش اور وائپر (WIPER) کی جنگ پوری شدت سے جاری تھی۔

چند ثانیے تک وہ سہمی سہمی نگاہوں سے شہباز کو تکتی رہی پھر اُس نے نگاہوں کا زاویہ بدل کر باہر دیکھنے کی سعی کی تو ساری جان سے کانپ کر رہ گئی، بارش نے دُھند کی کیفیت طاری کر دی تھی، اُسے کچھ صاف نظر نہ آ سکا۔ باہر کا دھندلایا ہوا منظر کسی غفریت کی طرح بھاگتا نظر آ رہا تھا۔

وہ اپنے وجود کے اندر کچھ اور سمٹ کر رہ گئی —— "جانے وہ کس راستے پر جا رہی تھی؟ —— شہباز اُسے کہاں لے جا رہا تھا؟ —— آنے والے لمحے اُس کے حق میں کیا ثابت ہوں گے؟ —— دوست؟ —— دشمن؟ ——" اُس کے معصوم ذہن میں اُلٹے سیدھے سوال ابھر کر آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ شہباز کے متعلق اُس کے دل میں متضاد خیالات اور وسوسے اُبھر رہے تھے اور باہر موسلا دھار بارش کا زور ہر لمحہ شدت اختیار کر رہا تھا۔ اچانک شہباز کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"مس عاشی —— کیا ناجیہ آپ کی بہن ہے ——"

"جی ——" وہ ایک لمحے کو چونک اٹھی۔ پھر دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے مدھم آواز میں بولی "جی ہاں۔ سگی بہن"

"بیرسٹر صاحب سے آپ کا کیا رشتہ ہے ——"

"وہ —— میں انھیں انکل کہتی ہوں" عاشی نے آہستہ سے کہا

"آپ کے والدین کہاں رہتے ہیں ——" شہباز نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

عاشی اس سوال پر چونکی، اُس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ کنکھیوں سے اُس نے شہباز کی سمت دیکھا اپنی نخوت پر بڑا غیر متعلق بنا بیٹھا تھا لیکن اس کے باوجود دوسروں کے تعلق کو کریدنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیوں ——؟ کس لئے؟ —— وہ کیا جاننا چاہتا تھا ——؟

اسے ان باتوں سے آخر کیا سروکار تھا ——؟

وہ ہوتا کون تھا دوسروں کے بارے میں اس طرح کرید کرید دریافت کرنے والا ——؟

اُس کے ذہن میں ابھرنے والے سوالات نے شہباز کی شخصیت کو کچھ اور پُراسرار بنا دیا۔

"ناجیہ کے بارے میں آپ کی ذاتی رائے کیا ہے ——"

"جی ——" شہباز کے اس سوال پر وہ اُچھل پڑی، خشک لہجہ اختیار کر کے بولی "آپ کیا دریافت کرنا چاہ رہے ہیں؟"

"خدا کے حکم کے بغیر بے جان اور خشک پتے بھی اپنی جگہ سے جنبش نہیں کر سکتے —— انسان تو اس دنیا میں سب سے تقدیر جاوداں کی حیثیت رکھتا ہے"

عاشی نے کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔

"وہ، جو خود کو دوسروں پر برتر ظاہر کرنے کی کوشش کریں بڑے کم ظرف ہوتے ہیں" شہباز کٹھور انداز میں بولتا رہا "اوپر سے بظاہر بڑے مضبوط اور مربوط نظر آتے ہیں لیکن —— اندر سے کھوکھلے اور منتشر ہوتے ہیں"

عاشی اب بھی خاموش رہی، شہباز کی باتیں جب اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں تو جواب کیا دیتی۔

"دوسروں کو نیچا دکھانے والے جب خود ٹھوکر کھا کر منہ کے بل زمین پر آتے ہیں تو قدرت بھی اُن پر رحم کے

دروازے بند کر لیتی ہے۔"

"آپ ——— آپ کیا کہہ رہے ہیں، میں کچھ بھی نہیں سمجھ سکی۔" عاشی نے اکتا کر جواب دیا۔

اس بار شہباز نے کوئی جواب نہیں دیا، گاڑی کی رفتار ایک دم کم ہوئی تو عاشی گھبرا سی گئی۔

"آپ نے گاڑی روک دی ———" اُس نے سہمے سہمے لہجے میں دریافت کیا۔

"جی ہاں ——— آپ کی منزل آگئی۔" شہباز نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

عاشی نے گردن گھما کر دیکھا، محمود حسین کی کوٹھی کا پھاٹک اس کے سامنے تھا، اسی لمحے شہباز نے پلٹ کر اُسے ایک نظر بھر کر دیکھا پھر ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھول دیا ——— پختہ سڑک پر موسلا دھار بارش کا جلترنگ سا بج رہا تھا۔

"میں آپ کی بے حد شکر گزار ہوں ———" اُس نے پہلی بار اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "آپ نے زحمت کی ———"

"میں نے صرف اپنا فرض پورا کیا ہے ———"

"اندر نہیں چلیں گے آپ ———" اُس نے یونہی اخلاقاً کہا۔ "ایک کپ چائے پیتے جائیے۔"

"شکریہ ———" شہباز نے اس بار قدرے اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔ "آپ کی چائے پھر کبھی پی لوں گا۔"

"میرا خیال ہے کہ بارش کے شور کی وجہ سے چوکیدار کو میری آمد کا علم نہیں ہوا ورنہ وہ پھاٹک ضرور کھول دیتا۔" عاشی نے پھاٹک بند دیکھ کر اپنے خیال کا اظہار کیا۔

شہباز نے ہارن بجایا تو بوڑھا چوکیدار اپنے مختصر سے کمرے سے نکل کر باہر آگیا اور جلدی جلدی پھاٹک کھولنے لگا۔

"میں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔" عاشی نے پھاٹک کھلنے کے بعد بڑے خلوص سے کہا پھر تیزی سے نیچے اُتری اور بارش کی دھند میں دوڑتی ہوئی اندر چلی گئی اور شہباز ———

اُس نے ایک نظر بھر کر سیر سٹر محمود حسین کی کوٹھی کے اونچے پھاٹک کو دیکھا پھر اُس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی ——— !!

*

دوپہر کا ایک بج رہا تھا جب وہ گھر واپس لوٹی

تین گھنٹے کے سیر سپاٹے نے اُسے نڈھال کر دیا تھا۔ تھک کر چور ہو گئی تھی اور اُس پر سے بھیگے ہوئے لباس نے اُس کی طبیعت کو بوجھل کر دیا تھا، گھر کی دہلیز عبور کرتے ہی اُس نے شرفو کو اس طرح آواز دی جیسے کوئی بڑا معرکہ سر کر کے آئی ہو۔

"جی بی بی ———" شرفو دوڑتا ہوا آیا۔ ناجیہ کو سر سے پاؤں تک پانی میں شرابور دیکھا تو تعجب سے پوچھ بیٹھا "یہ آپ کا لباس ——— کیا پانی میں بھیگ گئی تھیں۔"

"شرفو ———" اُس کے تیور یکلخت خراب ہو گئے۔

"جی بی بی جی ———"

"مجھے مجھ سے سوال کرنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ اُس کا لہجہ کرخت ہو گیا۔

"معافی چاہتا ہوں ———" شرفو نے خوف زدہ لہجے میں جواب دیا پھر جلدی سے نظریں جھکا لیں۔

"آئندہ مجھ سے بات کرتے وقت تم اپنی حیثیت اور اپنی اوقات کا خیال رکھو گے۔"

"جی ——— جی اچھا۔"

"دو کپ چائے دم لے کر میری خواب گاہ میں لے آؤ۔"

"جی ——— ابھی لایا۔"

شرفو تیر کی طرح باورچی خانے کی جانب لپکا تو وہ شانے اُچکاتی ہال سے گزر کر راہداری میں آگئی۔ اپنے کمرے کی طرف گھومتے ہوئے اُس نے پلٹ کر ہال میں بچھے ہوئے قیمتی قالین پر نظر ڈالی تو اُس کے ہونٹوں پر تیکھی مسکراہٹ جاگ اُٹھی ——— اُس کے قدموں کے بلکے اور بھیگے بھیگے نشان دروازے سے راہداری تک قالین پر مکمل بوٹوں کی طرح

نقش ہو گئے تھے۔ وہ ان نشانات کو دیکھتی رہی پھر گنگناتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ گیلے لباس کی وجہ سے اب اُسے ہلکی سی خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ جلد از جلد وہ اس بھیگے لباس کو اپنے جسم سے اُتار پھینکنے کی خواہشمند تھی لیکن راہداری کے دریچوں سے اپنی خواب گاہ کی مور مالگھومتے ہی وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔

باپ کی نگاہوں میں گہری سنجیدگی دیکھ کر بس ایک ثانیے کو وہ سہمی تھی۔ پھر اُس نے خود پر بڑی سرعت سے قابو پا لیا ——— اتنے خوشگوار موسم میں اپنی ہم جماعت سکھیوں کے ساتھ کلب میں کلیک منانا اُس کے نزدیک کوئی جرم نہیں تھا ——— پھر وہ خود اپنی نظروں میں چور کیوں بنتی ——— اور اب تو وہ اسکول کی حدود سے گزر کر کالج کے احاطوں میں داخل ہو چکی تھی ——— اُس نے گاڑی چلانی بھی سیکھ لی تھی ——— اب وہ ڈرائیور کی محتاج بھی نہیں رہی تھی ——— اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئی تھی۔

بچی تو تھی نہیں کہ بات بات پر نظریں جھکا کر سہم جاتی اور پھر اُس نے تو طفلی کے زمانے میں بھی گھر والوں کے دلوں پر حکومت کی تھی ——— اپنی من مانی کرتی رہی تھی ——— ڈرنا یا دبنا نہیں سیکھا تھا۔

دریان میں دادی کی موت نے اُسے محتاط ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا ——— ایک مضبوط طاؤ کھوس سہارے کے اچانک چھن جانے سے وہ گڑبڑا کر رہ گئی ——— دادی کی موت کے احساس اور اپنی تنہائی کے خیال نے اُسے خوف زدہ کر دیا تھا۔

——— اُس وقت اُس نے سوچا تھا کہ اُسے اپنی روش بدلنی ہوگی ——— ایک نئے راستے پر چلنے کی عادت ڈالنی پڑے گی ——— راستہ جو اُس کے والدین کو پسند نہیں تھا اور دادی کی حمایت حاصل کر لینے کے بعد اُس نے ان راستوں کی جانب کبھی پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا اس لئے کہ ان راستوں پر قدم قدم پر پابندیاں تھیں۔

والدین کی روک ٹوک تھی ———

جھڑکیاں تھیں ———

گھٹن کا احساس تھا جسے وہ سخت ناپسند کرتی تھی ———

وہ آزاد فضاؤں میں کھل کر سانس لینا چاہتی تھی ———

خود مختاری میں شان سمجھتی تھی ———

اور ———

صوفیہ خاتون کی تربیت نے اُسے ہمیشہ سربلند رہنا سکھایا تھا۔

جھکنا اُس کی سرشت میں نہیں تھا ———

گھٹن کو برداشت کرنا اُس کے خمیر میں شامل نہیں تھا ———

وہ آزاد تھی ———

آزاد رہنا چاہتی تھی۔

چنانچہ باپ اور ماں کو راہداری میں دیکھ کر وہ غیر ارادی طور پر ایک لمحے کو چونکی پھر اُس نے خود پر قابو پا لیا۔ اُسے کوئی خوف کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن باپ کی نگاہوں میں اُبھرنے والی سنجیدگی دیکھ کر وہ ہمیشہ اچھے لگنے والے لمحوں میں وہ کچھ ایسی ہی کیفیتوں سے دوچار تھی۔

"کہاں سے آرہی ہو ناجیہ بیٹی ———" محمود حسین نے سپاٹ آواز میں دریافت کیا

"کالج کی سہیلیوں کے ساتھ کلفٹن چلی گئی تھی۔"

"عاشی نہیں گئی تھی تمہارے ساتھ۔"

"نہیں ———" عاشی کا نام سن کر وہ سلگ اُٹھی۔ اُس کے ذہن میں یہی خیال ابھرا تھا کہ شاید عاشی نے اُس کے خلاف کان بھرے ہیں۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ "عاشی کو اپنے مدد باہا کا خیال ستا رہا تھا اس لئے میں نے اُسے گھر واپس بھیج دیا۔"

"فرحت تھی تمہارے ساتھ ———"

"جی ہاں ———" اُس نے چہرے سے پانی کے قطروں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔ "فرحت کی گاڑی بھی ساتھ

تھی اُس کا ڈرائیور بھی اور چھ سات دوسری لڑکیاں بھی تھیں۔"

"بڑی قیامت خیز اور موسلا دھار بارش ہے۔" محمود حسین بولے۔ "ایسے خطرناک موسم میں ڈرائیونگ ناممکن ہو جاتی ہے۔"

"ایڈونچر نہ ہو تو زندگی میں کوئی لطف بھی باقی نہیں رہتا ——"

محمود حسین چونک اٹھے، انھیں بیٹی سے پلٹ کر یوں کسی بیباک جواب کی توقع نہیں تھی، وہ تو نہایت سنجیدہ اور سلجھے ہوئے انداز میں ناجیہ کو اس کی غلطی کا احساس دلانا چاہتے تھے لیکن ناجیہ ——

وہ باپ کو زندگی کے نشیب و فراز میں اپنے تجربوں سے قائل کرنا چاہتی تھی۔

"تم فون کر کے ڈرائیور کو بلا سکتی تھیں۔" وہ ضبط کر کے بولے۔ "تمہاری غیر حاضری نے ہمیں پریشان کر دیا تھا۔"

"کیوں ——" اُس نے تیزی سے پوچھا۔ "کیا عاشی نے نہیں بتایا تھا کہ ہم لڑکیاں ٹیلنگ پر گئی ہیں۔"

"عاشی نے بتا دیا تھا لیکن ہمیں اندیشہ تھا کہ کہیں تمہاری گاڑی بارش کے سبب بند نہ ہو جائے۔" محمود حسین اُسے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے قدرے ٹھوس لہجہ اختیار کیا۔ "ایسے موسم اور طوفانی بارش میں نئی گاڑیاں بھی بعض اوقات خراب ہو جاتی ہیں۔"

"انسان ایسے چھوٹے موٹے خطروں سے ڈرنے لگے تو بالکل بزدل بن کر رہ جائے۔"

"تم اگر ڈرائیور کو ساتھ لے جاتیں تو کون سی قیامت آ جاتی۔" شمسہ بیگم چپ نہ رہ سکیں۔ "باپ سے بحث کرتے ہوئے تمہیں شرم بھی نہیں آتی۔"

ناجیہ ہونٹ کاٹ کر رہ گئی، ماں کی سرزنش پر وہ بُری طرح جھلا گئی تھی۔

"لباس دیکھو اپنا —— جسم سے چپک کر رہ گیا ہے۔" شمسہ بیگم ماں بن گئیں۔ "کچھ شرم و حیا بھی ہے ——"

"جاؤ —— لباس تبدیل کر ڈالو ورنہ ٹھنڈ بھی لگ سکتی ہے۔" محمود حسین نے جلدی سے کہا بیوی کو ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے تیزی سے قدم بڑھاتے آگے نکل گئے۔

شمسہ بیگم ناجیہ کو گھورتے ہوئے جانے کے لئے بڑھیں تو اُس نے ماں کو روک لیا۔

"ممی ——" اُس نے خشک لہجے میں پوچھا۔ "عاشی نے کیا شکایت کی ہے میری ——"

"ناجیہ ——" شمسہ بیگم کا پارہ یکلخت ہی چڑھ گیا، عاشی کی اُجلی شخصیت پر ناجیہ کا بے بنیاد شبہ برداشت نہ کر سکیں، سخت لہجے میں بولیں۔ "تم اب حد سے بڑھتی جا رہی ہو ——"

"میں نے کوئی غلط بات نہیں کہی —— صرف یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ میرے خلاف کیا زہر اگلا گیا ہے۔"

"عاشی نے ہم سے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ تم دوسری لڑکیوں کے ساتھ سیر کو گئی ہو۔" شمسہ بیگم نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"جب آپ کو علم تھا کہ میں سیر کو گئی ہوں تو پھر ——"

"ہوش میں رہ کر گفتگو کرو ناجیہ —— تم اپنی ماں سے مخاطب ہو۔"

"میں نے آپ سے ڈاڈیڈ سے کوئی گستاخی تو نہیں کی۔" وہ اُلجھ گئی۔

"جو کچھ تم کر رہی ہو اُسے کیا کہو گی۔" شمسہ بیگم نے پلٹ کر تیزی سے سوال کیا۔

"میں اپنی صفائی پیش کر رہی ہوں اور صفائی پیش کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔" ناجیہ نے جھلا کر کہا۔

"والدین سے یوں نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر گفتگو کرنا بدتہذیبی میں شمار کیا جاتا ہے۔"

"لیکن میں ——"

"خبردار جو تم نے اب زبان کھولی۔" شمسہ بیگم کے تیور اور خراب ہو گئے۔

ناجیہ نے کوئی جواب نہیں دیا، اپنی جگہ کھڑی نچلا ہونٹ دانتوں تلے چباتی رہی۔ اُس کی غلطی تھی، بارش کی نمی کے علاوہ رگوں میں گردش کرتے جوان خون کی سرخیاں بھی اُبھر آئی تھیں۔

"ذرا جا کر اپنے آپ کو آئینے میں دیکھو۔" شمسہ بیگم نے اُس کے لباس اور جسم کے مختلف زاویوں کو حقارت سے تکتے ہوئے کہا۔ "شاید تمہیں اندازہ ہو سکے کہ تہذیب اور شرم کسے کہتے ہیں۔"

"یہ لباس میں نے آج پہلی بار نہیں پہنا ——" ناجیہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ "پہلے بھی پہن چکی ——

"لیکن پہلے کبھی تم پانی میں بھیگ کر یوں بے شرمی سے باپ کے سامنے نہیں آئی تھیں۔"

"ڈیڈی اور اپنے خود راستے میں کھڑے ہو کر مجھے روکا تھا۔" اُس نے احتجاج کیا۔ "اس میں میرا کیا قصور ہے۔"

"میں نے تم سے زبان بند رکھنے کو کہا تھا ——" شمسہ بیگم غصے سے لرز اٹھیں۔ "دفع ہو جاؤ میری نگاہوں کے سامنے سے اور خبردار جو تم نے کبھی دوبارہ ہماری نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر بات کرنے کی کوشش کی۔"

شمسہ بیگم ناجیہ کو پہلی بار قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے چلی گئیں اور ناجیہ ——

نہ جانے ماں کے لب و لہجے میں ایسی کیا بات تھی جو اُس نے زندگی میں پہلی بار نظریں جھکالی تھیں لیکن چند لمحوں کے لئے —— ماں کے پلٹتے ہی اُس نے نہایت غرور اور تمکنت سے دوبارہ اپنی گردن اونچی کر لی ——

کچھ دیر تک راہداری میں کھڑی ماں کو جاتا دیکھتی رہی پھر ایک جھٹکے سے پلٹی اور لمبے لمبے قدم اُٹھاتی اپنے خواب گاہ میں آ گئی۔

ماں کی سخت باتیں اُس کے ذہن میں تپتی دوپہر کی گرم ہوا بن کر چلتی رہیں —— زندگی میں پہلی بار اسے سرنگوں ہونا پڑا تھا —— پہلی بار اُس کے کانوں میں وہ سخت جملے گونجے تھے جن کا وہ کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتی تھی —— آج تک اُس نے دوسروں کو اپنے سامنے جھکانا سیکھا تھا —— جھکنا نہیں سیکھا تھا لیکن آج —— نہ جانے کیوں ماں کے سامنے اپنی نظریں نہ اُٹھا سکی —— زبان جیسے گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔

"ذرا جا کر اپنے آپ کو آئینے میں دیکھو ——" ماں کا وہ جملہ اُس کے وجود میں نشتر بن کر چبھ رہا تھا۔

آنکھوں کے گرم تھپیڑوں کی طرح اُس کے وجود کو اندر ہی اندر جھلسا رہا تھا —— وہ ہونٹ چباتی تیز تیز اپنی خواب گاہ میں ٹہلتی رہی پھر اچانک اُس نے کمرے کے مشرقی گوشے میں اونچی تپائی پر رکھے ہوئے پیتل کے وزنی گلدان کو اٹھا کر سامنے کی سمت اُچھال دیا۔

جھناکے کی ایک آواز ابھری اور سنگھار میز کا قدآدم شیشہ گلدان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا —— ریزہ ریزہ ہو کر قالین پر بکھر گیا اور تب ——

ناجیہ ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ بکھیرے سر بلند کئے، لباس تبدیل کرنے کی غرض سے غسل خانے میں چلی گئی ——!

✱

آنکھی کے دروازے میں بیٹھا وہ اپنے حالات پر غور کر رہا تھا۔

سرونٹ کوارٹر سے سینی ٹوریم جاتے وقت اُس نے اپنے مختصر سے اثاثے اور در و بام کو کتنی حسرت بھری نظروں سے دیکھا تھا یوں جیسے وہ ان دیکھی بھالی چیزوں اور جانے پہچانے مانوس ماحول سے ہمیشہ کے لئے تعلق منقطع کر رہا ہو۔

عاشی اور ڈاکٹروں کو تو اُس کی بیماری کا علم بہت بعد میں ہوا تھا لیکن وہ خود اپنے مرض سے واقف تھا۔

اس روز تو محض اتفاق تھا جو وہ کھانسی کے دورے پر قابو نہ پا سکا —— خون کے چھینٹے اُس کے منہ سے نکل پڑے تھے جسے دیکھ کر عاشی دیوانی سی ہو گئی تھی، بات اگر اُس کے اختیار کی ہوتی تو وہ ان چھینٹوں کو بھی اپنے تپتے وجود کی تہوں کے اندر چھپا لیتا۔

زندگی کے آخری لمحات تک دنیا والوں کی نگاہوں سے اپنے مرض کو چھپائے رکھتا جب تک موت کی پُرسکون آغوش اُسے اپنے دامن میں نہ سمیٹ لیتی۔

وہ کسی کے احسان کا بوجھ اپنے ناتواں شانوں پر برداشت کرنے کو تیار نہیں تھا —— اس لئے کہ وہ تو خود دھرتی کے سینے پر بوجھ بن کر رہ گیا تھا۔ اگر فائزہ نے اُس کے آنگن میں پناہ نہ لی ہوتی تو اُس کی زندگی بڑی محدود ہو کر رہ جاتی۔

—— پھر عاشی کے ننھے وجود نے اُسے زندگی کی شاہراہوں پر قدم جما کر آگے بڑھنے کے لئے مجبور کیا تھا۔

اور ——

یہی مجبوری اُس کے لئے حاصلِ زندگی بن کر رہ گئی تھی۔

اُسے جینے کا ایک بہانہ مل گیا تھا۔

اُس کی زندگی کی تمام شاہراہیں سمٹ کر ایک منزل پر آ گئی تھیں۔ وہ صرف اور صرف عاشی کی خاطر زندہ رہنا چاہتا تھا —— اُسے اس وقت کا انتظار تھا جب عاشی عہدِ طفلی کے سنہرے دور کو پھلانگ کر جوانی کی سرحدوں میں داخل ہو جاتی، سمجھ دار اور ذہین ہو جاتی اور تب —— تب وہ ایک مجبور اور بے بس ماں کی تمام نشانیاں عاشی کے حوالے کر دیتا —— ان رازوں سے ہمیشہ کے لئے سبکدوش ہو جاتا جو اُس نے اپنے بوڑھے وجود کے نہاں خانوں میں بڑی حفاظت

سے چھپا رکھے تھے۔

زندگی کے پُرپیچ راستوں پر کئی مقام ایسے آئے جب ممدو کی ہمت جواب دینے لگی ——— اُسے ایسا لگا جیسے بڑے جب سانسوں کی گھٹن اور ماحول کی ریشہ دوانیوں نے اُسے اپنے شکنجوں میں جکڑ کر موت سے ہمکنار کرنے کی ٹھانی لیکن ہر سنگِ میل پر قدرت نے اُس کی مدد کی ———

وہ ———

کل بھی زندہ تھا اور تنفس کی رفتار اُسے آج بھی متحرک کئے ہوئے تھی اور آج ——— آج وہ بڑی بےچینی سے محسوس کر رہا تھا کہ اب وقت آگیا ہے جس وقت کا اُسے بڑی شدتوں سے انتظار تھا ——— اس وقت کے انتظار میں تو اُس نے صدیوں کے ایک ایک پل ——— ایک ایک لمحے کا شمار کیا تھا ——— اسی وقت کی خاطر تو اُس نے موت کو کئی بار چکمہ دیا تھا کتنی بار زندگی اور موت کی آنکھ مچولی کھیل چکا تھا اور جب اُس کی قوت جواب دینے لگتی تو اُس کے ہاتھ آسمان کی جانب بلند ہو جاتے ———

اُس کی پلکوں پر آنسوؤں کے شبنمی قطرے اولوں موتیوں کی مانند جھلملا اٹھتے ———

دل کی دھڑکنوں میں طوفانی حرارتیں یکلخت بیدار ہو جاتیں ———

ہونٹوں پر جا سکوت ٹوٹ کر اُس کے اور خدا کے درمیان سرگوشیوں میں منتقل ہو جاتا۔

دنیا جہان کی تمام حسرتیں سمٹ کر اُس کی آنکھوں میں سما جاتیں ———

وہ آسمان کے دُور پار خلاؤں کی وسعتوں میں جھانکتا رہتا ———

اور ———

اُس کے وجود کا رواں رواں ۔ ایک ایک انگ ایک ہی دعا کرتا ———

میرے معبود ———

مجھے عاشی کے لئے کچھ سانسیں اور مستعار دے دے ———

اور آج جب قدرت نے ممدو کو زندگی کے اس دوراہے پر لا کھڑا کیا جس کا وہ متمنی تھا تو اُس کے پاؤں لڑکھڑانے لگے، اُس کی قوتِ فیصلہ ایک بار پھر متزلزل ہو رہی تھی، وہ سوچ رہا تھا کہ اُسے اب فائزہ کی تمام امانتیں خاں کے حوالے کر دینی چاہئیں، اب ذمہ داری کے اس بوجھ کو اُٹھانے کی سکت اُس میں نہیں تھی ——— سانسوں کا بندھن ٹوٹنے سے پہلے وہ عاشی کو بامراد دیکھ لیتا تو اُس کی زندگی کی تمام تمنائیں ——— تمام آرزوئیں پوری ہو جاتیں ۔ اسی ایک مقصد کے لئے تو وہ زندہ تھا لیکن ——— آج ———

آج جب قدرت نے ممدو کو اُس کے فرض سے سبکدوش ہونے کا موقع دیا تو وہ پھر جھکڑا گیا ——— وہم نے ایک بار پھر اُسے خوف زدہ کرنا شروع کر دیا ——— انکھی کے باہر ورانڈے میں آرام کرسی پر بیٹھا وہ سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ کیا عاشی کا معصوم اور نرم و نازک وجود اس بوجھ کو اُٹھانے کے قابل ہوگا جو وہ اُسے منتقل کرنا چاہتا تھا۔

کیا وہ زندگی کے سربستہ رازوں کو یکلخت پا لینے کے بعد دم بخود نہ ہو جائے گی۔

اس پر کیا گزرے گی ———

ہو سکتا ہے وہ خوشی کی انتہاؤں اور مسرتوں کے خزینوں کو اچانک پا لینے کے بعد دیوانی ہو جائے۔

زندگی سے بھرپور قہقہے اُس کے منہ سے اُبل کر ماحول کو جھوم اُٹھنے پر مجبور کر دیں۔

فضا گلرنگ ہو جائے ———

اور ———

یہ بھی ممکن تھا کہ عاشی اپنے وجود کا راز آشکار ہو جانے پر یک دم دل گرفتہ ہو جائے ———

اُس کے یاقوتی لبوں کی مسکانیں اچانک اُس سے روٹھ جائیں ———

وہ خود اپنی نگاہوں میں اپنے وجود کو برداشت کرنے پر آمادہ نہ ہو سکے۔

اُسے دنیا سے نفرت ہو جائے ———

وہ رشتوں سے حقارت کرنا سیکھ لے ———

بلندیوں کی طرف دیکھنا چھوڑ دے ——— اور

یہ بھی ممکن تھا کہ جذبات کی فراوانی اُس سے سوچنے سمجھنے کی تمام قوتوں کو چھین لے ———

اُسے پنا دم گھٹتا محسوس ہو ———

تنفس کا زیر و بم منتشر ہونے لگے ——— اور

عاشی ———

گھبرا کر اپنے وجود کو ختم کر لے ———

اس کہانی کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے جو فرد کی اذیت ناک موت سے شروع ہوئی تھی ——— !!

اور اس خیال کے تصور ہی سے ممدو کا ناتواں وجود سرتاپا لرز اٹھا، اپنی قربانیوں کو یوں رائیگاں ہوتے دیکھ کر اُس کی پلکوں تلے اندھیرا پھیل گیا، اپنے ساتھ ساتھ اُسے کائنات کا ایک ایک ذرہ چکراتا محسوس ہو رہا تھا ——— پھر ہارن کی تیز آواز اُس کے کانوں میں گونجی تو اُس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں ———

خوابوں کا طلسم ٹوٹا تو حقیقت افتخار احمد کے رُوپ میں اُس کے سامنے موجود تھی، ممدو سہم گیا، خالی خالی نگاہوں سے اس لمبی چوڑی اور جھلملاتی کار کو دیکھنے لگا جو حالات کے نشیب و فراز سے گزر کر آج اُس کے دروازے تک آگئی تھی ——— وہ اس حقیقت سے فرار حاصل کرنے سے قاصر تھا

اُس کی نگاہیں بدستور افتخار احمد پر مرکوز تھیں جو کار سے اُتر کر اُس کی جانب بڑھ رہے تھے، قیمتی لباس میں ملبوس وہ امارت اور شان و شوکت کی جیتی جاگتی تصویر نظر آرہے تھے لیکن اُن کی آنکھوں میں بھی ناکام حسرتوں نے بسیرا کر رکھا تھا۔

افتخار احمد آج تنہا نہیں تھے، اُن کے ساتھ اُن کا بیٹا اقبال احمد بھی تھا جس نے ہاتھوں میں پھولوں کا انتہائی دیدہ زیب گلدستہ اور مٹھائی کا ٹوکرا اٹھا رکھا تھا، ممدو نے افتخار احمد کے استقبال کے لئے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کی ٹانگیں لڑکھڑا کر رہ گئیں، ہانپتا ہوا دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا، تھکن کے تاثرات اُبھر کر اُس کے چہرے پر گہرے ہو گئے۔

"تم ——— تم بیٹھے رہو ممدو" افتخار احمد نے لپک کر اُس کے شانوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا "ابھی تمہیں آرام کی ضرورت ہے"

"آپ ——— آپ بھی بیٹھئے افتخار میاں"

ممدو نے خالی کرسی کی جانب اشارہ کیا تو افتخار احمد بیٹھ گئے، اقبال نے مٹھائی کا ٹوکرا درمیانی میز کے قریب رکھا پھر اپنے اشارے پر پھولوں کا گلدستہ ممدو کو پیش کرتا ہوا بولا

"میری طرف سے آپ کو صحت یابی مبارک ہو ———"

"یہ میرا بیٹا ہے ممدو ——— اقبال احمد"

افتخار احمد نے تعارف کرایا تو ممدو نے ایک نظر بھر کر اقبال کو دیکھا پھر بولا

"جیتے رہو ——— خوش رہو"

"میں کل تمہیں دیکھنے ہسپتال گیا تھا، وہاں یہ خوشخبری ملی کہ تم صحت یاب ہو کر گھر آگئے ہو" افتخار احمد نے کہا۔

"اس کی عنایت ہے افتخار میاں ورنہ میں بہت گنہگار ہوں"

"تم نے ٹھیک کہا ممدو ——— اُس کی عنایت نہ ہو تو انسان بالکل بے بس اور مجبور ہوتا ہے" افتخار احمد نے انکھی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا "میں بھی مایوس ہو گیا تھا لیکن پھر خدا نے میری سُن لی ———"

"وہ دلوں کا بھید جانتا ہے" ممدو نے ایک سرد آہ بھری۔

کچھ دیر تک رسمی گفتگو ہوتی رہی پھر افتخار احمد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا،

"اگر میں بیرسٹر محمود حسین سے تعلقات استوار کر لوں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا"

"میں ——— میں سمجھا نہیں" ممدو چونک اُٹھا۔

"مجھے اپنے ذاتی معاملات میں ایک اچھے وکیل کی بھی ضرورت ہے، محمود حسین کا نام خاصا سُنا ہوا ہے اور پھر اس طرح ہمارے درمیان راہ و رسم بھی بڑھ جائے گی"

"آپ رضی کے مالک ہیں، لیکن میں ہاتھ باندھ کر ایک ہی درخواست کروں گا" ممدو نے اقبال کی موجودگی کو ملحوظ

رکھتے ہوئے کہا: "بیرسٹر صاحب بڑے بھلے اور نیک انسان ہیں ——— انھیں میرے اور آپ کے دیرینہ تعلقات کا نہیں ہونا چاہیئے ورنہ مجھے ——— یہ دہلیز بھی چھوڑنی پڑے گی۔"

"تم فکر مت کرو ———" افتخار احمد کرسی پر پہلو بدل کر بولے: "میں تمہاری حیثیت کو کوئی ٹھیس نہیں پہنچنے دوں گا۔"

"بہت بہت شکریہ۔" ممدو نے انکساری سے کہا: "آپ شاید میرا مطلب سمجھ رہے ہوں گے۔"

"عاشی کہاں ہیں؟" افتخار احمد نے ممدو کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"کوٹھی میں ہوگی۔" ممدو بولا "بیرسٹر صاحب کی بیٹی ناجیہ اور عاشی ایک دوسرے سے سگی بہنوں کی طرح پیار کرتی ہیں۔"

"میں پرسوں ہی یہاں آیا ہوں۔" افتخار احمد نے سنجیدگی سے کہا "دو چار روز بعد ہی واپس چلا جاؤں گا۔ جانے سے پہلے میں تمہاری اور عاشی کی دعوت کرنا چاہتا ہوں ——— دو چار گھڑی مل چل کر ساتھ بیٹھ لیں گے۔"

"یہ آپ کی کرم فرمائی ہے افتخار میاں لیکن اس بیماری کی حالت میں میرا کہیں آنا جانا مناسب نہیں ہوگا۔" وہ ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "نہ جانے کیوں افتخار احمد کی دعوت اُسے منظور نہیں تھی چنانچہ جلدی سے بات بناتے ہوئے بولا۔ "اور اقبال میاں کسی دن میرے غریب خانے پر کھانا کھالیں، عاشی سارا بندوبست کرلے گی۔"

"چلو، تمہاری یہ خوشی ہے تو یونہی سہی۔" افتخار احمد نے کہا، "پرسوں رات ہم دونوں باپ بیٹے تمہارے مہمان بن جاتے ہیں مگر اس شرط پر کہ تم زیادہ تکلف سے کام نہیں لوگے۔"

"آپ کی خدمت کرنا تو میرا فرض ہے۔" ممدو خوشی خوشی بولا "بڑی مہربانی جو آپ نے میری درخواست رد نہیں کی۔"

"کیا خیال ہے ڈیڈی ——— اب چلا نہ جائے۔" اقبال نے اکتائے ہوئے انداز میں باپ سے کہا۔

"اتنی جلدی کیا ہے اقبال میاں۔" ممدو نے بڑی عاجزی سے کہا "آپ پہلی بار یہاں آئے ہیں اگر بغیر چائے چلے گئے تو مجھے دکھ ہوگا ———"

"پرسوں تو کھانے پر آرہے ہیں، اطمینان سے باتیں ہوں گی اور چائے بھی ہم ایک کے بجائے دو کپ پی لیں۔" اقبال نے اٹھتے ہوئے کہا ——— "آیئے ڈیڈی ——— ابھی ہمیں دو ایک کام اور بھی نپٹانے ہیں۔"

افتخار احمد کی نظریں عاشی کو تلاش کر رہی تھیں لیکن چار و ناچار انھیں بیٹے کے کہنے پر اٹھ جانا پڑا۔

"عاشی کو میری طرف سے پیار کر لینا ممدو اور بہت ساری دعائیں کہنا۔" انھوں نے ممدو کی نظروں میں جھانک کر کہا پھر تیزی سے واپسی کے لئے قدم اٹھائے، مگر ٹھٹک کر رک گئے۔

عاشی کوٹھی سے نکل کر انکی سمت آرہی تھی۔

"عاشی آگئی افتخار میاں۔" ممدو نے اصرار کیا "اب تو ایک پیالی چائے پی لیجئے ———"

"کیوں اقبال ——— کیا خیال ہے تمہارا۔"

"جیسی آپ کی مرضی ڈیڈی ———" اقبال احمد نے عاشی کو کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا پھر دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

عاشی نے قریب آکر افتخار احمد کو دیکھا تو گلاب کے تازہ پھول کی مانند کھل اٹھی، بڑی اپنائیت و تپاک سے ملی، نہ جانے کیا بات تھی جو آج بھی افتخار احمد کو دیکھ کر اُس کے ذہن میں ایک عجیب سا احساس جاگا تھا۔ وہ اس احساس کو کوئی نام دینے سے قاصر تھی لیکن اتنا ضرور جانتی تھی کہ افتخار احمد کو دیکھتے ہی اُس کے دل کی کلیاں تیز ہو جاتی ہیں اور ان دھڑکنوں سے اُسے بے حد پیار تھا ——— ایسا لگا وہ پیدا ہو گیا تھا جسے وہ کھونا نہیں چاہتی۔

وہ دراندے میں کھڑی افتخار احمد سے گھل مل کر بات کر رہی تھی اور ممدو اُس کے لب و لہجہ کو بڑے والہانہ انداز میں محسوس کر رہا تھا ——— قدرت نے خون کے رشتوں کو جس انداز میں ملایا تھا وہ بھی عجیب تھا۔ افتخار احمد اور عاشی آپس میں گھل مل کر باتیں کرنے کے باوجود ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے ہوئے ممدو اس ملاپ سے آئندہ پیدا ہونے والی صورتِ حال پر غور کرنے لگا پھر اچانک اُس کی نظر اقبال احمد کی جانب گئی جو عاشی کو بڑی توجہ ——— بے حد لگن اور بڑے پیار سے ٹکٹکی باندھے گھور رہا تھا ——— یوں، جیسے یہیں ہی وہ اپنا سب کچھ ہار بیٹھا ہو ———

دل
دل کو قرار
دل کی خوشی و حواس

سب کچھ حسن کی بارگاہ میں قربان کر چکا ہو ——— !!

ممدو کی کشادہ پیشانی پر اچانک غور و فکر کی ان گنت آڑی ترچھی لکیریں اُبھر آئیں ——— !

عدیل اور ناجیہ کے میل جول کی خبریں ہم جماعتوں میں چہ میگوئیوں کا سبب بنی ہوئی تھیں۔ کچھ لڑکوں کا خیال تھا کہ ناجیہ محض عدیل کو اُلو بنا رہی ہے اور اُس کے ساتھ فلرٹ کر رہی ہے لیکن کچھ لڑکے ان دونوں کی ملاقاتوں کو بڑی نگاہوں سے ..... دیکھ رہے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ ناجیہ عدیل کی مردانہ وجاہت اور خداداد حسن کے سحر میں ڈوب کر اُس کی محبت کا شکار ہو گئی ہے۔ لڑکیوں کے گروپ میں بھی اسی قسم کی خبریں اُڑتی پھر رہی تھیں۔

آج عدیل پہلی بار گبرڈین کے قیمتی اور نئے سوٹ میں نظر آیا تو تمام نظریں اسی پر جم گئیں، شہباز نے بھی اس سوٹ کو نہایت غور سے دیکھا تھا پھر یونہی ایک لاپروا سی مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیر کر چپ ہو گیا البتہ زبیر نے اُسے سرتاپا گھورتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔

"سناؤ ہیرو ——— آجکل کیسی گزر رہی ہے۔"

"ٹھیک ہوں ———" عدیل نے جو ہمیشہ اپنے ساتھیوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو کرنے کا عادی تھا خلافِ توقع کتراتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو چہرے پر پہلے کے مقابلے میں زیادہ رونق نظر آرہی ہے۔" زبیر نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔

"دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔" فیصل نے دبی زبان میں کہا تو عدیل نے پلٹ کر اُسے تیز نظروں سے گھورا لیکن نہ جانے کیا سوچ کر خاموش ہو گیا، فیصل سے کترا کر نکلنے کی کوشش کی تو عارف راستے میں آگیا۔

"گڈ گاڈ ———" اُس نے عدیل کو دیکھ کر سیٹی بجاتے ہوئے کہا "آج تو تم سچ مچ گریٹ لگ رہے ہو۔"

"تھینکس ———" عدیل یونہی مسکرا دیا۔

"کہاں سے لیا ———" سجاد نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

"الفی سے ———" عدیل روانی میں کہہ گیا۔ پھر یکلخت خاموش ہو کر سجاد کو گھورنے لگا۔

"اچھا تحفہ ہے ———" سجاد نے کہا "مبارک ہو۔"

"لیکن ذرا بچ کر رہنا میری جان۔" سجاد کے ساتھ کھڑے ہوئے فرخ نے دبی زبان میں کہا "کہیں ایسا نہ ہو کہ جب تمہاری آنکھ کھلے تو چڑیاں کھیت چگ کر اڑ چکی ہوں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ فرخ کو شکایتی انداز میں گھورنے لگا۔

"ہم سے کیوں اُڑنے کی کوشش کر رہے ہو مائی ڈیر۔" سجاد بولا "ہم تمہارے دشمن تو نہیں ———"

"لیکن ———" عدیل نے کچھ کہنا چاہا۔

"احتیاط شرط ہے۔" سجاد نے بقراطیہ انداز میں تیزی سے اُس کا جملہ کاٹتے ہوئے کہا "تمہاری پسند بُری نہیں ہے البتہ تم نے ذرا اپنے قد سے اونچی چھلانگ لگانے کی کوشش کی ہے۔"

"آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔" عدیل سجاد کے طنز کو برداشت نہ کر سکا تو اُس کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔

"ہم سمجھنا نہیں چاہتے تو تمہاری مرضی ———" ہمیں کیا۔" سجاد نے عدیل کے تیور بدلتے دیکھے تو شانے اُچکاتا اس کے سامنے سے ہٹ گیا۔

عدیل اُسے غصیلی نظروں سے گھورتا رہا۔ ناجیہ نے جو سوٹ اسے تحفہ کہہ کر دیا تھا وہ اُس کے لئے مصیبت بن گیا تھا، وہ خود بھی سمجھ رہا تھا کہ اتنا بڑھیا سوٹ اُس کی حیثیت سے کہیں زیادہ ہے۔ تین روز تک اُس نے سوٹ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا لیکن جب ناجیہ نے اُسے بڑے خلوص اور پیار سے اپنی قسم رکھا دی تو وہ اُسے پہننے پر مجبور ہو گیا تھا۔

چند لمحے وہ روش پر کھڑا سجاد کو گھورتا رہا پھر جانے کے ارادے سے ایک قدم اُٹھایا ہی تھا کہ
"کس کس کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہوگے" اُس نے عدیل سے پوچھا۔
"میں ——— میں تم لوگوں کی باتیں سمجھنے سے قاصر ہوں" عدیل جھلا گیا "کیا سوٹ پہننا گناہ ہے
میں اور بھی لاتعداد لڑکے سوٹ میں ملبوس ہیں ——— پھر تم لوگ میرا مذاق کیوں اڑا رہے ہو"
"اس لئے کہ ہم تمہارے دوست ہیں ——— ہمیں تم سے ہمدردی ہے"
"میں اتنا ناسمجھ کبھی نہیں کہ اپنے بُرے اور بھلے کی تمیز نہ کر سکوں"
"ٹھیک ہے ———" فرخ نے لاپروائی سے کہا "میں سجاد کو سمجھا دوں گا کہ وہ تمہارے معاملے
"میرے معاملے سے تمہاری کیا مراد ہے" عدیل چڑ گیا۔
فرخ پلٹ کر کوئی سخت جواب دینا چاہتا تھا کہ عارف اور وقار لپکتے ہوئے قریب آگئے۔ عارف
کچھ ایسی نظروں سے عدیل کو گھورتا پایا جیسے کسی عجوبے کو دیکھ رہا ہو، وقار نے بھی عدیل کو اس نئے رنگ
دیکھ کر حیرت سے پلکیں جھپکانا شروع کر دی تھیں۔
"آپ کی تعریف ———" عارف نے عدیل سے انتہائی معصومیت سے دریافت کیا۔
"جناب کو عدیل کہتے ہیں" وقار نے تعارف کراتے ہوئے کہا "ہماری کلاس کے بے حد نیک، سیدھے سادے
ہونہار طالب علم شمار کئے جاتے ہیں ———"
"بڑی مسرت ہوئی آپ سے مل کر" عارف نے اپنی خوبصورت اداکاری جاری رکھتے ہوئے کہا "خاکسار کو عارف
کہتے ہیں، آپ ہی کے ساتھ اسی کالج میں زیر تعلیم ہوں"
عدیل نے عارف کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، ہونٹ کاٹتا تیزی سے آگے بڑھ گیا تو عارف نے
سے پوچھا۔
"بات کیا ہے ——— آج تو یہ اپنے جامے سے باہر نظر آرہا ہے"
"نئے جامے کا اثر ہے" فرخ نے جواب دیا۔
"میرا خیال ہے کہ ناجیہ اُسے پھر کی بنا کر جھوڑے گی" وقار سنجیدگی سے بولا۔
"ضروری تو نہیں ہے ———" عارف نے کہا "ہو سکتا ہے کہ وہ عدیل کے سلسلے میں حقیقتاً سنجیدہ ہو"
"ناجیہ اور سنجیدگی ——— اور وہ بھی عدیل کے سلسلے میں" فرخ نے کہا "ناممکن ہے ———"
"گویا اپنا ایک ساتھی بے موت مارا جانے والا ہے" عارف سرد آہ بھر کر بولا۔
"شہباز کی موجودگی میں عدیل پر کوئی آنچ نہیں آسکتی" وقار نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
"ناجیہ بھی بڑے باپ کی بیٹی ہے" فرخ بولا "شہباز کے مقابلے میں اپنی بار کبھی تسلیم نہیں کر سکتی"
"ایک منٹ ———" عارف تیزی سے بولا "کیا عدیل نے تسلیم کر لیا ہے کہ یہ سوٹ اُسے ناجیہ نے دلوایا
"نہیں ———" فرخ نے کہا "ایسی کوئی بات ہمارے درمیان نہیں ہوئی"
"گویا حقیقت کا کھوج لگائے بغیر ہی تم لوگوں نے اس غریب کو گھیر لیا"
"سجاد نے کریدنے کی کوشش کی تھی مگر عدیل ایک دم ہی سینہ تان کر لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گیا" فرخ نے
میں نہ ہوتا تو دونوں کے درمیان اُٹھا پٹخ شروع ہو جاتی ———"
"آئی سی ——— تو معاملہ اس قدر آگے بڑھ چکا ہے" عارف سنجیدہ ہو گیا۔
"بے چارے عدیل کی محبت کی لاٹری نکل بھی تو کہاں ———" وقار نے مسکرا کر کہا "بے موت مارا جائے
"ہمیں شہباز کو قبل از وقت حالات سے باخبر کر دینا چاہیے" عارف بولا "ابھی مرض کا ہلکا سا شبہ ہے اس کے
عشق کے مہلک جراثیم سے بچایا جا سکتا ہے۔ بعد میں مرض لاعلاج ہو گیا تو دشواری ہوگی۔
چپراسی نے کلاس شروع ہونے کا گھنٹہ بجایا تو روش پر چہل قدمی کرتے طلبا و طالبات کی ٹولیاں
کلاس میں سمٹنے لگیں۔ ناجیہ نے عدیل کو نئے سوٹ میں دیکھ لیا تھا، دل ہی دل میں اپنی فتح پر خوش تھی لیکن
انجان بنی بیٹھی تھی۔

"کہاں گم ہو ناجیہ ———" فرخندہ نے اُسے کہنی مار کر سرگوشی کی "ذرا اس طرف تو دیکھو ——— تمہارا
پھر آج واقعی گدڑی کا لال لگ رہا ہے ———"
"جل گئیں اس کی پرسنالٹی دیکھ کر ———" ناجیہ نے شوخی سے جواب دیا۔
"ایمان سے مجھے تو رشک آرہا ہے" فرخندہ بے باکی سے بولی "اگر تم نے اُسے شکار نہ کیا ہوتا تو میں آج ہی
جال ڈال دیتی"
"لیکن اب تمہیں امانت میں خیانت کی اجازت نہیں ہے" ناجیہ نے سنجیدگی سے فرخندہ کو گھورا تو وہ مسکرا دی۔
"یہ سوٹ شاید تم نے اسے تحفے میں دیا ہے ——— کیوں" فرخندہ نے ناجیہ کو کریدنے کی کوشش کی۔
"راز کی بات ہے ——— کیوں بتاؤں" ناجیہ ہنس کر بات اڑا گئی۔
"چپکے چپکے تم دونوں میں کیا کھچڑی پک رہی ہے" عطیہ نے ناجیہ کے برابر بیٹھتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔
"تمہارے زبیر کے بارے میں سوچ رہی تھی" ناجیہ نے ٹھنڈی سانس لی۔
"کیا مطلب ———" عطیہ نے چونکنے کی نہایت خوبصورت اداکاری کی۔
"کچھ خبر بھی ہے تمہیں ——— یہ ناجیہ تمہارے زبیر کے بارے میں کیا کہہ رہی ہے" فرخندہ بولی۔
"کیا ———" عطیہ نے وضاحت چاہی۔
"یہ کہہ رہی تھی کہ آج تمہارے زبیر صاحب عدیل کے سامنے پرسنالٹی اور لباس کے اعتبار سے پانی بھرتے نظر
آرہے ہیں"
ناجیہ مسکرا دی، عطیہ نے اُسے گھورتے ہوئے پوچھا۔
"کیوں جی ——— کیا یہ فرخندہ سچ کہہ رہی ہے ———"
"سچ کو آنچ کیا ———" ناجیہ بولی "یقین نہیں آتا تو خود ہی دیکھ لو ———"
عطیہ نے ناجیہ کے جواب پر تیزی سے نظریں گھما کر عدیل کو دیکھا جو سوٹ کے اندر کسمساتا نظر آرہا تھا۔
وہ عدیل کے بارے میں کوئی خوبصورت سا مجاوزہ سوچ ہی رہی تھی کہ انگریزی کے پروفیسر نے کلاس میں قدم رکھا اور
پوری کلاس پر یکلخت گہری سنجیدگی طاری ہو گئی ———!

✻

کالج سے واپسی پر ناجیہ کا موڈ نہایت خوشگوار تھا، گاڑی چلاتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ کچھ گنگناتی بھی جا رہی
تھی کئی دنوں بعد آج عاشی اُس کے ساتھ تھی۔ بہت دنوں سے وہ ناجیہ سے فراز کے بارے میں گفتگو کرنے کے لئے کسی موقع
کی تلاش میں تھی، شمسہ بیگم نے اُسے اعتماد میں لے کر تمام باتیں بتا دی تھیں اور یہ فرض اُس پر ڈال دیا تھا کہ وہ فراز کے
بارے میں ناجیہ کے خیالات معلوم کرے۔
عدیل اور ناجیہ کے بارے میں کالج میں جو باتیں آہستہ آہستہ مشہور ہو رہی تھیں وہ اس سے بھی بے خبر نہیں
تھی، عاصمہ نے اُسے ایک بار یہ بھی بتایا تھا کہ ناجیہ عدیل کے ساتھ سیر و تفریح کو بھی جاتی ہے اور ان دونوں میں خاصی گاڑھی
چھن رہی ہے۔ عاشی کو ناجیہ کی یہ آزادی اور اس طرح کھلے عام عدیل کے ساتھ گھومنا اور دوسروں کے لئے موضوع بحث بننا بالکل
پسند نہیں آیا تھا۔ ایک دو بار اُس نے سوچا بھی تھا کہ ناجیہ کو ٹوک دے لیکن نہ جانے کیوں اس کے سامنے زبان نہیں کھول
سکی تھی ——— شاید اس لئے کہ وہ ناجیہ کے پل پل بدلتے موڈ سے ڈرتی تھی ——— یا پھر ناجیہ اُسے بہت زیادہ
عزیز تھی اور وہ ناجیہ کی خفگی مول لینے سے حتی الامکان گریز کرنا چاہتی تھی۔ لیکن آج کے خوشگوار موڈ کو دیکھ کر وہ ہمت کر بیٹھی۔
"کیا گنگنا رہی ہو" اُس نے ناجیہ کے چہرے پر پھوٹتی شفق کو تکتے ہوئے کہا۔
"پیا ملن کو جانا ———" ناجیہ مسکرا کر بولی
"یہ تو شاید فلمی گانا ہے"
"ہاں ——— میں نے ریڈیو پر سنا تھا" ناجیہ بولی "بڑا سوئٹ سانگ ہے"
"ایک بات پوچھوں ——— بتاؤ گی" عاشی نے بڑی اپنائیت سے کہا۔
"میں جانتی ہوں" ناجیہ زیر لب مسکرائی "تم بھی شاید عدیل اور میرے تعلقات کے بارے میں دریافت کرو گی"

"ہاں ——" عاشی سنجیدہ ہوگئی "لڑکے اور لڑکیاں عجیب عجیب باتیں کرنے لگے ہیں"

"مجھے معلوم ہے" وہ لاپروائی سے بولی۔

"آسیہ اور رفعت کا خیال ہے کہ وہ سوٹ جو عدیل پہنے ہوئے تھا ——"

"ایمان سے بتانا عاشی، عدیل اس لباس میں کیسا لگ رہا تھا" وہ عاشی کا جملہ کاٹتے ہوئے بولی۔

"بہت ہی شاندار" عاشی نے اعتراف کر لیا "سوٹ میں آدمی کی پرسنالٹی اور نکھر آتی ہے"

"گویا تم بھی مانتی ہو کہ عدیل پرسنالٹی کے اعتبار سے بہتوں سے اچھا ہے"

"ہاں —— لیکن ——"

"غربت نے اُس کے راستے مسدود کر دیئے ہیں" ناجیہ یکلخت سنجیدگی سے بولی بقول شاعر"

"مفلسی حسِ لطافت کو مٹا دیتی ہے"

"کسی کی تقدیر بنانا یا بگاڑنا خدا کے اختیار میں ہے"

"میں تسلیم کرتی ہوں مگر پرسنالٹی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے" ناجیہ یک دم ہی شوخ ہوگئی عاشی کو مسکراتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی "میں نے عدیل کی شخصیت میں ایک بڑھیا سوٹ کی کمی کو بڑی شدت سے محسوس کیا تھا چنانچہ وہ کمی دُور کر دی اور جب عدیل کی شخصیت نکھر کر سامنے آئی تو دو دِل جل بھن کر کباب ہوگئے"

"ممکن ہے تمہارا خیال درست ہو لیکن اکثر یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی طول پکڑ لیتی ہیں"

"مطلب ——"

"مطلب یہ کہ انسان سب کی نظروں میں آجاتا ہے ——"

"پھر ——"

"دوسرے اُس پر انگلیاں اُٹھانا شروع کر دیتے ہیں" عاشی بولی "بلاوجہ بدنام کرتے ہیں"

ناجیہ کے تیور اچانک خراب ہوگئے، اُس نے پلٹ کر عاشی کو سخت نظروں سے گھورا پھر فوراً ہی خلاف توقع مسکرانے لگی، سپاٹ آواز میں بولی،

"میں جانتی ہوں کہ طلبا برادری میدے اور عدیل کے بارے میں کیا کیا ریمارکس پاس کر رہی ہے"

"کیا یہ سب کچھ مناسب ہے"

"نامناسب بھی نہیں ——" اُس نے لاپروائی سے جواب دیا

"اگر ان باتوں کی بھنک انکل یا آنٹی کے کانوں تک پہنچ گئی تو ——"

"ممی اور پپا کو اپنے خون پر بھروسہ ہونا چاہیئے" ناجیہ نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"اور لوگ جو الٹی سیدھی باتیں بناتے ہیں ——"

"وہ اپنی شخصیت کا اظہار کرتے ہیں" ناجیہ سنجیدہ ہوگئی "ہر وہ بات جو کسی انسان کی خواہش کے برخلاف ہو اُسے گراں گزرتی ہے، جو بردبار اور سنجیدہ ہوتے ہیں اپنی ناکامی اور شکست دونوں کو اپنی شخصیت کی گہرائی میں سمیٹ لیتے ہیں، اُن کی حوصلہ مندی اُن کی قوتِ برداشت کا سبب ہوتی ہے لیکن وہ —— جو اپنی شکست کو تسلیم نہیں کرتے اور ناکامی سے گھبرا کر دوسروں پر کیچڑ اچھالنی شروع کر دیتے ہیں بڑے کمزور اور پست ذہنیت کے مالک ہوتے ہیں —— کم ظرف ہوتے ہیں اور میں ان کم ظرفوں کے منہ لگنا اچھا نہیں سمجھتی"

"میں بھی یہی کہنا چاہ رہی تھی" عاشی تیزی سے بولی "تم بلاوجہ دوسروں کو ——"

"بلاوجہ کیسے ——" ناجیہ نے عاشی کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے پوچھا۔

"کیا مطلب ——" عاشی چونکی "کیا تم عدیل کو پسند کرتی ہو ——"

"ناپسند بھی نہیں کرتی ——" ناجیہ نے زیرِلب مسکراتے ہوئے جواب دیا

"اگر یہ بات ہے تو پھر عدیل سے برملا ملو —— سب سے کھل کر بتا دو کہ تم عدیل کو پسند کرتی ہو —— اس طرح دوسروں کے دلوں اور ذہنوں میں اٹکے شکوک اور شبہات ختم ہو جائیں گے" عاشی نے قدرے جذباتی لہجے میں مشورہ دیا۔

"ابھی میں نے عدیل کو اس حد تک بھی پسند نہیں کیا کہ اپنی پسند کا کھل کر اعلان کر دوں" ناجیہ لاپروا انداز میں بولی

"پھر —— تمہارا اس طرح عدیل کے ساتھ گھومنا پھرنا —— کھل کر باتیں کرنا —— اُس کے لئے تحفے تحائف —— یہ سب کیا ہے"

"تم سے ابتدا کا نام دے سکتی ہو" ناجیہ نے مسکرا کر کہا پھر شوخی سے بولی "انسان بازار جاتا ہے تو دوکانوں کی بیسیوں میں ہزاروں اور ایک سے ایک اچھی چیزیں موجود ہوتی ہیں، کچھ چیزیں قابلِ توجہ ہوتی ہیں جنہیں وہ قریب سے دیکھنے کے لئے ہاتھ بڑھا کر اُٹھا لیتا ہے لیکن اس وقتی عمل کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ اُسے خرید لے گا —— یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اسے کچھ دیر تک اُلٹ پلٹ کر دلچسپی سے دیکھے پھر اس کی جگہ واپس رکھ دے"

"تمہاری منطق میری سمجھ میں نہیں آتی" عاشی اُلجھتے ہوئے بولی

"سمجھ میں نہیں آتی تو کوئی اور بات کرو" ناجیہ نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا

"ایک بات اور بھی ہے لیکن ڈرتی ہوں کہ تم کہیں بُرا نہ مان جاؤ ——" عاشی نے دبی زبان میں کہا۔

"آج بُرا نہیں مانوں گی" ناجیہ معنی خیز انداز میں بولی "جو کچھ کہنا چاہو بے دھڑک کہہ ڈالو ——"

"فراز تمہیں کیسا لگتا ہے ——" عاشی نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

"پپا اُسے بھوندو کہنا چھوڑ دیں تو اُس کی شخصیت اور بھی نکھر آئے گی"

"میں سنجیدگی سے پوچھ رہی ہوں ناجیہ ——"

"خوبصورت شخصیت کا مالک ہے لیکن کچھ بھی جان کی تربیت نے اُس کے اندر کی اسمارٹنس کو زنگ آلود کر دیا ہے" ناجیہ نے کہا —— "اس عمر میں تو لڑکوں کو بے حد اسمارٹ ہونا چاہیئے، ہر وقت چہروں پر تہذیب، تمدن شرافت اور ثقافت کے بڑے بڑے پوسٹر چسپاں کئے رہنا مجھے زہر لگتا ہے"

"یہ تو ایک وقتی بات ہے جو احول کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدل بھی سکتی ہے"

"ہو سکتا ہے ——" ناجیہ پھر لاپروا ہوگئی

"اچھا، ایک بات بتاؤ" عاشی نے اپنا مفہوم کچھ اور واضح کرتے ہوئے پوچھا "عدیل اور فراز میں زیادہ اچھا کون ہے ——"

"جو نظروں کو زیادہ اچھا لگے ——"

"میں تمہارا خیال پوچھ رہی ہوں ——"

"بات کیا ہے ——" ناجیہ نے چونک کر عاشی کو گھورتے ہوئے معنی خیز انداز میں پوچھا "کیا فراز تمہیں پسند آگیا ہے"

"ہاں —— لیکن صرف ایک بھائی کی حیثیت سے" عاشی مسکرا دی۔

"پھر فراز کے بارے میں اس قدر تجسس اور کرید کیوں ہے"

"تمہاری وجہ سے ——"

"میری وجہ سے ——" ناجیہ چونکی —— "مطلب ——"

"میں نے انکل اور آنٹی کو فراز کے بارے میں باتیں کرتے سنا ہے اور ان باتوں کا موضوع تم تھیں ——"

"اوہ ——" ناجیہ نے ایک لمبی سانس لی "اب میں سمجھی ——"

"اگر سمجھ گئی ہو تو جلدی سے اپنا خیال بھی ظاہر کر دو"

"کیا ممی نے تم سے کہا تھا کہ میرا خیال معلوم کرو" ناجیہ نے سپاٹ آواز میں دریافت کیا

"نہیں ——" عاشی نے جھوٹ بولا "میں اپنی طرف سے پوچھ رہی ہوں"

"تمہارا کیا خیال ہے" اچانک ناجیہ نے بڑی بیباکی سے دریافت کیا "کیا فراز میرے لئے مناسب رہے گا"

"کیوں نہیں ——" عاشی جلدی سے بولی "میرا خیال تو یہ ہے کہ اتنے نیک کاموں میں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیئے"

"فراز کے بارے میں میں نے اس حیثیت سے کبھی نہیں سوچا ——" ناجیہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"اب سوچ لو ——" عاشی نے اصرار کیا۔

"سوچ تو لوں ـــــ لیکن ـــــ" ناجیہ کچھ کہتے کہتے یکلخت خاموش ہوگئی۔

"لیکن کیا ـــــ" عاشی نے کریدتے ہوئے دریافت کیا۔

"اگر میں نے فراز کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تو بے چارے عدیل کا کیا بنے گا" ناجیہ شوخی سے بولی۔

"وہ غریب تو بیچ منجدھار میں ڈوب جائے گا ـــــ"

"میں صرف فراز کے سلسلے میں تمہاری رائے پوچھ رہی ہوں"

"آج تو میں صرف عدیل اور اُس کے نئے سوٹ کے بارے میں غور کر رہی ہوں ـــــ فراز کے بارے میں پھر کسی دن فرصت سے غور کروں گی"

ناجیہ نے انتہائی لاپروائی سے جواب دیا پھر دھیمے سُروں میں گنگنانا شروع کر دیا اُس کے ہونٹوں پر بڑی شوخ اور شریر مسکراہٹیں کھیل رہی تھیں۔

عاشی نے اُسے مزید چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا ـــــ!!

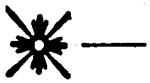

آج چھٹی کا دن تھا۔

شمیم بیگم حسب سابق صبح سے شوہر کی آؤ بھگت میں لگی ہوئی تھیں اُن کا معمول تھا کہ چھٹی والے دن وہ صرف شوہر کے ہمراہ اپنا وقت گزارتی تھیں لیکن آج شام کو انھیں پڑوس میں ایک ملنے والی کے گھر میلاد میں شرکت کرنی تھی اسلئے وہ عاشی کو بطور خاص تاکید کر گئی تھیں کہ وہ محمود حسین کا بطور خاص خیال رکھے۔

مغرب کو شام کی چائے پلانے کے بعد وہ ناجیہ کی طرف آگئی لیکن ناجیہ کہیں جانے کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی وہ اپنے بالوں کو آخری ٹچ دے رہی تھی، بالوں کو سنوارنے کے بعد اُس نے مگھوم پھر کر خود کو مختلف زاویوں سے قدِ آدم آئینے میں دیکھا پھر سینٹ اُٹھا کر خود پر اسپرے کرتے ہوئے عاشی سے بولی۔

"کیسی لگ رہی ہوں"

"گریٹ ـــــ"

عاشی نے نہایت فراخدلی سے اُس کی تعریف کی، حقیقتاً اس وقت آف وہائٹ کے ہلکے کام والے شلوار سوٹ میں وہ بہت جچ رہی تھی، عاشی اُسے تعریفی نگاہوں سے دیکھتی رہی، ناجیہ سینٹ کی شیشی رکھ کر جانے کے لئے مڑی تو اُس کے گلابی ہونٹوں پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"کہاں کی تیاری ہے ـــــ" عاشی نے اُس کی مسکراہٹ کو محسوس کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"یوں ہی ـــــ ذرا شاپنگ کا ارادہ ہے" ناجیہ لہرا کر بولی۔

"ساتھ کون ہوگا ـــــ" عاشی نے شوخی سے پوچھا "فرحت ـــــ یا"

"جو بھی ہوگا خوش نصیب ہی ہوگا ـــــ" ناجیہ کے جواب میں شرارت تھی۔

"واپسی کب تک ہوگی ـــــ"

"ہوگی ضرور ـــــ" ناجیہ کا لہجہ معنی خیز تھا "کب تک ـــــ یہ نہیں کہا جا سکتا"

"گویا دیر بھی ہو سکتی ہے ـــــ کیوں"

"ہاں آں ـــــ حالات پر منحصر ہے"

ناجیہ نے کچھ ایسے رومانٹک انداز میں جواب دیا کہ عاشی بھی ہنس دی۔

"آنٹی کہاں ہیں ـــــ" اُس نے ناجیہ سے پوچھا۔

"ابھی کچھ دیر پیشتر ڈاکٹر عالیہ کے گھر میلاد میں گئی ہیں"

"اور انکل ـــــ"

"پاپا اپنے کمرے میں ہوں گے ـــــ" وہ لاپروائی سے بولی "میں وثوق سے نہیں کہہ سکتی"

ناجیہ جانے کے لئے گنگناتی ہوئی آگے بڑھی تو عاشی نے اُسے ٹوک دیا،

"ڈرائیور کو ساتھ لے جانا بھولنا ورنہ آنٹی خفا ہوں گی"

"عاشی ——" وہ رک کر تیزی سے پلٹ پڑی "میں نے کتنی بار منع کیا ہے کہ یہاں جاتے وقت نہ ٹوکا کرو۔"

"میرا ٹوکنا تمہارے لئے اچھا شگون ہوتا ہے۔" عاشی مسکرا کر بولی "تم ہی نے تو کہا تھا۔"

"یہ تو ہے لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں ڈرائیور کا ذکر آتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔"

"کباب میں ہڈی کا خیال آجاتا ہوگا ——" عاشی نے شوخی سے کہا۔

"آج پہلی بار تم نے عقلمندی کی بات کی ہے۔" ناجیہ مسکرا کر بولی "شر فو سے کہہ کر اپنی نظر اتروالینا۔"

پھر ناجیہ اپنا پرس گھماتی، لہراتی بل کھاتی چلی گئی تو وہ مسکراتی ہوئی محمود حسین کے خواب گاہ میں گئی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ ڈرائنگ روم بھی خالی تھا چنانچہ وہ اسٹڈی میں چلی گئی۔

محمود حسین ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس ایک آرام کرسی پر بیٹھے کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔ کھلے در میان قانون کی ایک موٹی سی کتاب موجود تھی اور کتاب کے صفحات کے درمیان ایک تصویر تھی جسے وہ بڑی انہماک سے دیکھ رہے تھے، اتنے انہماک سے کہ انھیں عاشی کے آنے کی خبر تک نہ ہو سکی لیکن جب عاشی نے بالکل ان کے سر پر پہنچ کر آہستہ سے "انکل" کہہ کر مخاطب کیا تو وہ اس طرح ہڑبڑا کر چونکے کہ کتاب ان کے ہاتھ سے چھل کر فرش پر گر گئی اور تصویر کتاب سے نکل کر عاشی کے قدموں میں آگئی۔

عاشی نے تصویر کی بس ایک ذرا سی جھلک دیکھی تھی، اُسے اٹھانے کے ارادے سے جھکی بھی تھی لیکن محمود حسین نے جھپٹ کر اُسے اُٹھا لیا پھر اپنے گاؤن کے جیب میں تیزی سے رکھ لیا، جانے کیوں اُن کی حالت غیر ہو گئی تھی، چہرے پر پسینے کے ننھے منے قطرے جھلملا رہے تھے اور دراز پلکیں بار بار تیزی سے جھپک رہی تھیں۔

عاشی کے اچانک آجانے سے وہ کچھ بوکھلا سے گئے تھے، شاید وہ اپنے خیالوں میں بہت زیادہ غرق تھے اور عاشی نے اُن کی محویت توڑ کر انھیں پریشان کر دیا تھا —— وہ خود بھی شرمندہ ہو گئی تھی۔

"سوری انکل ——" وہ محمود حسین کے چہرے کے تاثرات دیکھ شرمندہ سی بولی "مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ آپ اس قدر مصروف ہوں گے ورنہ ——"

"کوئی بات نہیں ——" محمود حسین نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا "تمہاری آمد پر نہیں تھیں اس لئے میں وقت گزارنے کی خاطر اسٹڈی میں آگیا۔"

"آپ نے چائے پی انکل ——"

"نہیں ——"

"میں لاتی ہوں اپنے ہاتھوں سے بنا کر۔" اُس نے کہا پھر تیزی سے پلٹ کر اسٹڈی سے باہر چلی گئی۔

محمود حسین نے جھک کر کتاب فرش سے اُٹھائی، جیب سے تصویر نکال کر اُسے ایک بار پھر دیکھا سے دیکھا پھر اُسے کتاب میں محفوظ کیا اور کتاب کو آہنی الماری میں مقفل کر کے دوبارہ آرام کرسی پر دراز ہو گئے، کچھ دیر بعد چائے کی ٹرالی گھسیٹتی واپس آئی تو وہ پوری طرح سنبھل چکے تھے۔

"تم نے کیوں زحمت کی؟" عاشی کو گھورتے ہوئے وہ پیار سے بولے "کیا شر فو موجود نہیں ہے؟"

"میں اپنا حق ملازموں کو دینے کے خلاف ہوں۔" اُس نے مسکرا کر جواب دیا پھر چائے تیار کرنے لگی۔

"خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔"

"آمین ——" اُس نے بڑے خلوص سے کہا پھر چائے کی پیالی محمود حسین کی طرف بڑھا دی۔

"میرا خیال ہے کہ تمہاری آنٹی جاتے ہوئے میرا خیال کرنے کی تاکید کر گئی ہوں گی۔"

"انکل ——" عاشی ٹھٹک کر بولی "جائیے —— میں آپ سے بات نہیں کرتی۔"

"کیوں —— کیوں؟"

"کیا آنٹی کے کہے بنا میں آپ کا خیال نہیں رکھتی ——" عاشی کے لہجے میں بڑی معصوم شکایت تھی۔

"اوہ ——" محمود حسین سنجیدگی سے بولے "میں شاید روانی میں ایک غلط بات زبان سے نکال گیا اور ایک ذرا سی غلطی پورے کیس کو بگاڑ کر رکھ دیتی ہے۔" عاشی شوخی سے بولی۔

"ہاں —— میں تمہاری دلیل مانتا ہوں۔" محمود حسین عاشی کے چہرے کو بغور تکتے ہوئے بولے "انسان کی ایک چھوٹی سی غلطی بھی اکثر زندگی کا روگ بن جاتی ہے اور پھر ——"

"انکل ——" عاشی نے جلدی سے کہا "اگر آپ کو میری بات ناگوار گزری ہے تو میں معافی کی خواستگار ہوں۔"

"نہیں —— مجھے تمہاری کوئی بات ناگوار نہیں گزری، تم نے جو کچھ کہا بالکل ٹھیک کہا۔"

"وہ تو میں نے یوں ہی مذاق کیا تھا۔"

"ناجیہ کہاں ہے ——" محمود حسین نے بڑی خوبصورتی سے موقع کی نزاکت سے کترانے کی خاطر بات بناتے ہوئے کہا "آج صبح ناشتے کی میز پر اُسے دیکھا تھا —— اُس کے بعد سے نظر نہیں آئی۔"

"ابھی کچھ دیر پہلے وہ دعوت کی طرف گئی ہے۔" عاشی نے جان بوجھ کر غلط بیانی سے کام لیا۔

"ممد کی طبیعت اب کیسی ہے؟" محمود حسین نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

"خدا کا فضل و کرم ہے —— پہلے سے بدرجہا بہتر ہے۔"

"عاشی ——" محمود حسین نے چائے ختم کر کے اپنے لئے ایک سگار جلاتے ہوئے کہا "مجھے تم سے ایک شکایت ہے۔"

"شکایت اور مجھ سے۔" عاشی چونک اٹھی۔

"ہاں ——"

"آپ شاید مذاق کر رہے ہیں۔"

"نہیں —— میں سنجیدہ ہوں۔"

"اگر مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہے تو میں اُسے دریافت کئے بغیر دست بستہ معافی چاہتی ہوں۔" عاشی یکلخت سنجیدہ ہو گئی۔

"لیکن ہم چاہتے ہیں کہ تم پر اپنی خفگی کا سبب ظاہر کر دیں۔"

عاشی نے کوئی جواب نہیں دیا، چپ سادھے کھڑی محمود حسین کو وضاحت طلب نظروں سے تکتی رہی۔

"عاشی ——" محمود حسین نے سگار کا ایک کش لے کر آرام کرسی سے اُٹھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا "کیا تم نے کبھی محسوس کیا ہے کہ ہم نے ناجیہ کے مقابلے میں تمہیں کبھی نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے۔"

"جی —— جی نہیں۔"

"پھر تم ہم سے غیروں کی طرح کیوں پیش آتی ہو۔" محمود حسین کا لہجہ بڑا ٹھوس اور جذباتی تھا۔

"انکل ——" عاشی تڑپ اٹھی "میں ابھی تک نہیں سمجھ سکی کہ آپ کس بات پر مجھ سے خفا ہیں۔"

"ناجیہ آئے دن ہم سے طرح طرح کی فرمائشیں کرتی رہتی ہے —— ضد کر کے اپنی ایک ایک بات منواتی ہے، لیکن تم نے آج تک ہم سے کوئی فرمائش نہیں کی —— کوئی ضد نہیں کی ——" محمود حسین نے عاشی کو بڑی اپنائیت سے گھورتے ہوئے کہا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے۔"

"انکل ——"

"میں بتاتا ہوں۔" محمود حسین تیزی سے بولے "تم —— تم شاید ہمیں اپنا نہیں سمجھتیں اس لئے گریز کرتی ہو۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں انکل ——" عاشی کے پلکوں کے گوشے نمناک ہو گئے "خدا گواہ ہے کہ آپ نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ بے مثال ہے، آپ کی عنایت نہ ہوتی تو شاید ——"

"عاشی —— آگے کچھ نہ کہنا۔" محمود حسین ہاتھ ملتے ہوئے بولے پھر کچھ توقف کے بعد کہا "میں نے تو کچھ کیا وہ میرا فرض تھا —— میں نے تمہارے اوپر کوئی احسان نہیں کیا۔"

"یہ بھی آپ کی عظمت کی دلیل ہے ——"

"لیکن تم نے ابھی تک ہماری خفگی کے جواب میں کوئی معقول بات نہیں کہی۔" محمود حسین نے قریب جا کر بڑی شفقت سے عاشی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ہم جاننا چاہتے ہیں کہ ہماری بیٹی اس قدر تکلف سے کیوں کام لیتی ہے، کوئی فرمائش کیوں نہیں کرتی —— ناجیہ کی طرح ضد کیوں نہیں کرتی۔"

"جب بغیر فرمائش کے تمام ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں تو پھر ضد کرنے کی کیا ضرورت ہے" عاشی نے بھولپن سے جواب دیا۔

"اس کے باوجود ——— میں چاہتا ہوں کہ تم ناجیہ کی طرح مجھ سے اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لئے فرمائش کیا کرو ——— میں کوئی بات بھول جاؤں تو مجھ سے باقاعدہ روٹھ جایا کرو اور ———" اور محمود حسین کی نگاہیں عاشی کے چہرے پر مرکوز تھیں اور ہونٹ متحرک تھے "اور تم کو تو ناجیہ کے مقابلے میں زیادہ حق ہے ——— اس لئے ——— اس لئے کہ تم ——— تم ناجیہ سے عمر میں بڑی ہو"

"آپ بھول رہے ہیں انکل" عاشی نے محمود حسین کے لب میں چھپی مٹھاس کو محسوس کرتے ہوئے نہایت معصومیت سے جواب دیا "ضد بڑے بچے نہیں صرف چھوٹے بچے کیا کرتے ہیں ———"

"تم کوئی فرمائش تو کر سکتی ہو ———"

"کیا فرمائش کروں ———" عاشی پلکیں جھپکا کر بڑے بھولپن سے سوچنے لگی۔

"انسان کی چھوٹی چھوٹی ہزاروں خواہشات ہوتی ہیں بیشمار ضرورتیں ہوتی ہیں" محمود حسین بولے "آج تک کبھی کانچ کی چوڑیوں کی بھی فرمائش نہیں کی ———"

"ٹھیک ہے" عاشی نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا "آپ کل جب کام سے واپس لوٹیں تو میرے لئے چوڑیاں لیتے آئیں"

"اور اگر تمہیں پسند نہ آئیں تو ———"

"تو میں آپ سے ضد کر کے دوسری منگوالوں گی" عاشی نے نہایت سادگی سے جواب دیا۔

"ایک طریقہ اور بھی ہے ———"

"وہ کیا ———" عاشی نے پوچھا۔

"میرے ساتھ آؤ ———"

محمود حسین اسٹڈی سے نکل کر راہداری میں آئے پھر راہداری سے گزر کر اپنی خواب گاہ میں آگئے عاشی اُن کے ساتھ ساتھ تھی، اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ محمود حسین آج اس پر اس قدر مہربان کیوں ہو گئے ہیں خواب گاہ میں پہنچ کر محمود حسین نے لوہے کی الماری کھولی پھر الماری کے سیف سے نوٹوں کی گڈی نکال کر عاشی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے

"لو ——— یہ پانچ ہزار اپنی چوڑیوں کے رکھ لو"

"لیکن چوڑیاں تو ———"

"میری خوشی کی خاطر عاشی" محمود حسین نے اُس کا جملہ کاٹتے ہوئے جذباتی انداز میں کہا "اسے قبول کر لو"

عاشی نے محمود حسین کی نظروں میں پیار کی تڑپ محسوس کی تو چار و ناچار گڈی لے لی لیکن اُسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس انداز میں اس عنایت کا شکریہ ادا کرے کن الفاظ میں محمود حسین کو یہ بتائے کوشش کرے کہ اُسے دولت کی نہیں صرف پیار و محبت کی ضرورت ہے۔

وہ گنگ سی کھڑی سوچتی رہی تو محمود حسین نے قریب آکر اُس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے ہوئے بڑے پیار سے کہا

"مجھ سے ایک وعدہ کرو عاشی ———"

"کیا ———"

"یہ پیسے جب ختم ہو جائیں تو تم مجھ سے اور لے لو گی"

"جی ——— ایک لمحے کو وہ چونک اٹھی پھر کچھ سوچ کر دبی زبان میں اقرار کر لیا۔

"ایک وعدہ اور ——— تم ان پیسوں کو صندوق یا الماری میں بند کر کے نہیں رکھو گی" محمود حسین کے چہرے کے خدوخال کو والہانہ نظروں سے گھورتے ہوئے بولے "ان پیسوں سے فوری طور پر اپنی ضرورت کی خریداری کر لو گی"

"ٹھیک ہے ———" اُس نے محمود حسین کا دل رکھنے کو اقرار کر لیا اور کر بھی کیا سکتی تھی۔

"ایک آخری وعدہ اور ——— تم ان پیسوں کا ذکر کسی اور سے نہیں کرو گی، ناجیہ سے بھی نہیں، شمسہ سے بھی نہیں" محمود حسین نے نہ جانے کیوں کپکپاتی آواز میں کہا۔

"انکل ———" عاشی نے کچھ کہنا چاہا۔

"عاشی ———" محمود حسین نے رندھی آواز میں اُس کا نام لیا پھر بے اختیار اُسے کھینچ کر اپنے سینے کی گہرائیوں میں چھپا لیا۔ اور پھر خواب گاہ میں اُن کی دبی دبی سسکیاں گونجنے لگیں ——— !!

✱ ✱

صدر کے شاپنگ سینٹر کے قریب وہ بڑی دیر سے لفٹ رائٹ کرنے میں مصروف تھا، شام کے ساڑھے پانچ بجے تھے، ناجیہ نے ٹھیک پانچ بجے آنے کو کہا تھا، وہ ساڑھے چار بجے ہی وہاں پہنچ گیا تھا لیکن ناجیہ ابھی تک غائب تھی، چند لمحے تک وہ ٹریفک کے ہجوم میں ناجیہ کی کار کو تلاش کرتا رہا پھر اکتا کر دوبارہ چہل قدمی شروع کر دی، اُس کے ذہن میں متعدد سوالات اُبھر رہے تھے، وہ سوچ رہا تھا۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ ناجیہ نے محض اُسے بیوقوف بنانے کی خاطر ملنے کا بہانہ کیا ہو ———

لیکن نہیں ——— اگر ایسا ہوتا تو وہ اس قدر مہربان کیوں ہوتی۔

سوٹ کے سلسلے میں کالج میں اُس کی اور ناجیہ کی خاصی شہرت ہو گئی تھی لیکن ناجیہ نے ان باتوں کی مطلق کوئی پروا نہیں کی تھی ایک کان سے سُنتا تھا اور دوسرے سے اڑا دیا تھا۔ اور جب خود اُس نے ناجیہ سے ان افواہوں اور بے سروپا باتوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہا تو ناجیہ نے بڑا کڑوا سا منہ بنا کر کہا تھا ——— "کتے یوں ہی بھونکتے رہتے ہیں، اُن کے خوف سے ہم اپنا راستہ کیوں بدلیں ———"

اس کے بعد تو وہ اُس سے اور زیادہ قریب ہو گئی تھی۔

کالج کے احاطے میں کبھی دوسروں کی موجودگی میں گفتگو کرنے سے گریز نہیں کرتی تھی۔ اُس نے پچھلی ملاقات میں کہا تھا،

"تم فکر مت کرو عدیل، میں تمہیں اس مقام تک لا کھڑا کروں گی جہاں لوگ تمہیں دیکھ کر تمہارا مذاق نہیں اُڑائیں گے، تمہاری عزت کریں گے، تمہیں احترام کی نظروں سے دیکھیں گے ———"

"مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے ناجیہ لیکن ———" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔

"لیکن کیا ———"

"میری عزت کا کیا کرو گی" اُس نے دل گرفتہ لہجے میں کہا تھا "میرے ساتھی اسی لئے تو میرے اوپر انگلیاں اُٹھاتے ہیں ——— آوازیں اور جملے کستے ہیں"

"تم میرے ہوتے ہوئے دوسروں سے خائف ہو ———"

"خائف نہیں ہوں مگر ڈرتا ضرور ہوں"

"ڈر کس بات کا ———"

"انسان دوسروں کی نظر میں ہزار بار کیوں نہ گر جائے ایک ذرا کوشش اور ہمت سے سنبھل جاتا ہے لیکن اگر خود اپنی نگاہوں سے گر جائے تو تمام عمر پچھتاووں اور محرومیوں کا شکار رہتا ہے"

"میرا خیال ہے تم نے تھرڈ کلاس رومانی کہانیاں پڑھنی شروع کر دی ہیں" ناجیہ نے اُسے گھورتے ہوئے کہا "میں تمہیں اچھے رائٹر کے ہلکے پھلکے ناول خرید دوں گی ——— اُن کے مطالعے سے تمہارا ذوق بلند ہو گا"

"تم میرا مطلب ——— "

"ڈونٹ بی فولش عدیل" وہ جھلا گئی لیکن پھر فوراً ہی اُس نے عدیل کی خفگی کا خیال کرتے ہوئے کہا تھا۔ "تمہارا مطلب سمجھتی ہوں لیکن تم ہمیشہ تصویر کا تاریک پہلو کیوں دیکھتے ہو"

"حالات مجبور کر دیتے ہیں ———"

"ٹھیک ہے ———" وہ چڑ کر بولی "اگر تم کو میری دوستی میری محبت سے زیادہ اپنے حالات اور اپنی

محرومیوں کے گرد و پیش زیادہ عزیز ہیں تو میں آئندہ سے تمہیں پریشان نہیں کروں گی ـــــ تم سے دور رہنے کی کوشش کروں گی۔"

"تم دور چلی گئیں تو میں اور بھٹک جاؤں گا ـــــ"

"پھر وعدہ کرو کہ آئندہ سے تم میرے سامنے دقیانوسی اور فرسودہ قسم کی باتوں سے پرہیز کرو گے!"

"وعدہ ـــــ"

"جاؤ ـــــ معاف کیا۔"

اُس کے ذہن میں پچھلی ملاقاتوں کی خوبصورت باتیں گونج رہی تھیں لیکن وقت جوں جوں ڈھل کر رہا تھا اُس کی مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔ چھ بجے تو اُس نے اُمید کا دامن چھوڑ دیا۔ ریلنگ پر کہنیاں ٹکا کر سوچنے لگی۔

وہ اب نہیں آئے گی ـــــ

کالج میں اپنی سہیلیوں کی موجودگی میں ہنس بول لینا اور بات ہے لیکن کالج کے لحاظ سے باہر شاید وہ اتنی بے تکلف ممکن ہے اُسے اپنا وعدہ یاد نہ رہا ہو ـــــ!

گھر میں کوئی مہمان یا ملنے جلنے والا آگیا ہوگا اس لئے وہ مجبور ہوگئی ہوگی ورنہ ضرور آتی ـــــ

وہ بے وفا نہیں ہے ـــــ

بے وفا ہوتی تو میری غربت کو سہارا کیوں دیتی، مجھے اپنے لطف و کرم سے کیوں نوازتی ـــــ

دوسروں کی نظروں میں میرا مقام بلند کرنے کی خاطر خود نشانہ کیوں بنتی ـــــ

کیوں ـــــ؟

آخر کیوں ـــــ؟؟

اور پھر اس خیال کے ساتھ ہی وہ چونک اُٹھا، آنے والی کار بالکل اُس کے قریب ریلنگ کے ساتھ ہی ایک جھٹکے سے رُکی تھی۔ اُس نے نظریں اُٹھا کر دیکھا تو دل باغ باغ ہوگیا، ذہن پر طاری سارے بوجھ خیالات پلک جھپکتے میں دُور ہو گئے، ساری کدورتیں ختم ہوگئیں۔

ناجیہ اسٹیئرنگ پر بیٹھی اُسے مسکراتی نظروں سے دیکھ رہی تھی، وہ تیزی سے گھوم کر آگے بڑھا، دروازہ کھول کر اگلی نشست پر اُس کے برابر بیٹھ گیا۔ خوشبو کی ایک ہی لپٹ اُس کے دل و دماغ کو معطر کر گئی۔ کار قریب اُس کے وجود کو گنگنانے لگا۔

"سوری عدیل" ناجیہ نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "تمہیں میری خاطر بڑی زحمت اٹھانی پڑی!"

"کوئی بات نہیں ـــــ"

"میں ایک گھنٹہ لیٹ ہونے پر بے حد شرمسار ہوں لیکن ـــــ"

"تم اب آگئی ہو تو انتظار کی زحمت بھی میرے لئے عین راحت بن گئی ہے۔" وہ جلدی سے بولا "مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔"

"یقین کی کوئی وجہ ـــــ" اُس نے گیئر بدل کر گاڑی کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"میرا دل گواہی دے رہا تھا ـــــ"

"سچ ـــــ" اُس نے شوخی سے دریافت کیا۔

"ہاں ـــــ"

"اور کیا کہہ رہا تھا تمہارا دل ـــــ"

"میرا دل مجھے تمہاری محبت اور تمہاری دوستی کے حصول پر مبارکباد پیش کر رہا تھا۔"

"تم نے اب باتیں بنانا بھی سیکھ لی ہیں۔" وہ زیر لب مسکرائی "اپنا ماضی بھولتے جا رہے ہو ـــــ"

"تمہارا ساتھ شامل رہا تو میں اپنے آپ کو بھی بھول جاؤں گا۔" وہ جذباتی ہوگیا "تمہارا قرب مجھے زندگی اور نئی راہوں کی نوید دیتا ہے تو میں فضاؤں میں بلند ہو جاتا ہوں ـــــ اتنا بلند کہ زمین پر بسنے والے انسان مجھے حقیر کیڑوں کی مانند نظر آتے ہیں لیکن اکثر میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا۔"

"اچھا ـــــ" اُس نے مدھم آواز میں پوچھا "اگر یہ سب کچھ خواب ہی ثابت ہوا تو ـــــ"

"تو میں بلندیوں سے گر پڑوں گا ـــــ پستیوں سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جاؤں گا، کانچ کے بے جان ٹکڑوں کی طرح بکھر جاؤں گا۔"

"بس بس ـــــ" وہ تیزی سے بولی "میں نے تمہارا خیال معلوم کیا تھا، لیلیٰ مجنوں کے مکالمے سنانے کی فرمائش نہیں کی تھی ـــــ"

"میں اپنے احساسات کی ترجمانی کر رہا تھا ـــــ" اُس نے سنجیدگی سے کہا

"کیا خیال ہے" وہ بات گھما کر بولی "کچھ دیر کلفٹن چل کر سمندر کی ہواؤں سے لطف اندوز نہ ہوا جائے؟"

"تمہاری مرضی ـــــ" وہ انکساری سے بولا۔

ناجیہ نے مسکرا کر رفتار تیز کر دی، کلفٹن کے ساحل پر پہنچ کر اُس نے گاڑی ایک قدرے پُرسکون جگہ پر روک دی، ہوا کی بھیگی بھیگی خنکی اُس کے بالوں سے چھیڑ خانی کرنے لگی تو اُس نے شیشہ چڑھا لیا، سامنے ساحل پر موجوں کا شور جاری تھا۔

"تم نے یہ نہیں پوچھا کہ مجھے آنے میں دیر کیوں ہوگئی تھی ـــــ" اُس نے پلٹ کر عدیل کو دیکھا۔

"میں اس کی جسارت نہیں کر سکتا" عدیل نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

"کیوں ـــــ"

"بس ـــــ یوں ہی" اُس نے ناجیہ کے چہرے پر دمکتی زندگی کو محسوس کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"تمہاری یہی باتیں میرے دل میں گھر کرتی جا رہی ہیں" وہ مسکرا دی پھر تیزی سے پلٹ کر پچھلی سیٹ پر رکھے ہوئے بنڈل اُٹھاتے عدیل پر ایک دلربا نظر ڈال کر بولی "تمہارے لئے شاپنگ کر رہی تھی اس لئے دیر ہوگئی۔"

پھر اُس نے بنڈل کھول کھول کر اپنی خریدی ہوئی چیزیں عدیل کو دکھانی شروع کر دیں۔ چھوٹی چھوٹی ان گنت چیزیں خوبصورت خوبصورت پیکٹوں سے برآمد ہو رہی تھیں۔

نئے اور خوبصورت کالج فائل ـــــ پارکر کا سنہری کیپ والا فونٹین پن کا سیٹ ـــــ سینٹ کی بوتل ـــــ بھاری اور خوبصورت قسم کے رومال ـــــ پوری چھ عدد ٹائیاں ـــــ دو ریڈی میڈ شرٹ ـــــ پتلون کے لئے دو بہترین پیس اور دو سوٹ جس میں سے ایک باقی تھا۔

عدیل ان چیزوں کو حیرت سے تکتا رہا۔ ناجیہ اُسے ایک ایک چیز دکھا کر اپنی خوشی کا اظہار کرتی رہی اور اظہار و اصرار ان نگاہوں کے بوجھ تلے دبتا گیا۔ ناجیہ کا مہکتا قرب اور گنگناتا وجود ہم رکاب نہ ہوتا تو شاید غربت کا احساس اُس کے تمام بند ٹوٹ کر اُس کی آنکھوں سے طوفان کی صورت میں بہہ نکلتا۔

"کیا بات ہے ـــــ" ناجیہ نے اُس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا "کیا میرے تحفے پسند نہیں آئے؟"

"سارے کے سارے لاجواب ہیں" وہ جبراً مسکرا دیا۔

"پھر ـــــ منہ بنائے کیا سوچ رہے تھے ـــــ"

"سوچ رہا تھا کہ تمہارے ان احسانوں کا بوجھ کیسے اتار سکوں گا۔"

"ہے ایک طریقہ ـــــ بتاؤں"

"بتاؤ ـــــ"

"جب میں محبت سے کوئی چیز تمہارے لئے لایا کروں تو مسکراتے ہوئے اُسے قبول کر لیا کرو، احسانوں کا بوجھ اتنا نہیں ہلکا ہو جائے گا ـــــ" ناجیہ نے شوخی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں تمہارے ان تحفوں کو خوشی سے قبول کرتا ہوں لیکن ایک مسئلہ پھر بھی باقی رہ جاتا ہے۔"

"وہ کیا ـــــ"

"اگر کسی نے پوچھا کہ یہ قیمتی اور ایک سے بڑھ کر ایک تحفے کہاں سے آئے ہیں تو کیا جواب دوں گا۔" عدیل نے ناجیہ کے سراپا کو والہانہ نظروں سے تکتے ہوئے مدھم آواز میں سوال کیا۔

"کہہ دینا ایک دوست نے بڑے پیار سے دیئے ہیں۔" ناجیہ نے بالوں کی آوارہ لٹ کو سر کی جنبش سے

پشت کی جانب اُچھالتے ہوئے کہا۔

"ماں اس پیارے دوست کا نام بھی دریافت کر سکتی ہے؟"

"جو جی میں آئے بتا دینا" ناجیہ مسکراتی رہی۔

"اور اگر میاں نے اُسے دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو ——"

"بات اگر اتنی طول پکڑنے لگے تو کہہ دینا —— انتظار فرمائیے ——"

عدیل اس جواب پر ہنس دیا، کچھ دیر تک اُن کے درمیان تحفوں کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی پھر ناجیہ نے دستی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا

"کیا خیال ہے —— اب واپس چلا جائے؟"

"آپ کی مرضی ——" عدیل نے سرسراتے انداز میں سرگوشی کی "آپ کے رحم و کرم پر ہوں"

"اسی طرح جھکتے رہا کرو —— اچھے لگتے ہو"

ناجیہ نے شوخی سے عدیل کو گھور کر دیکھا پھر انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی کو تیزی سے گھما کر واپسی کے راستے پر ڈال دیا۔

* *

وقت اور حالات کی نئی کروٹ نے ممدو کی سوچوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

عاشی کی زبانی یہ سُن کر کہ محمود حسین نے اُسے جیب خرچ کے لئے پانچ ہزار کی خطیر رقم دی ہے وہ بے انتہا حیرت ہوئی تھی اس لئے کہ وہ اس گھر کو عاشی کے لئے غیر نہیں سمجھتا تھا۔

اسی چوکھٹ پر عاشی کی کمسنی کی یادیں نقش تھیں۔

اسی دہلیز سے عاشی کا حال و ماضی وابستہ تھا۔

اور ——

اسی کوٹھی کے در و دیوار میں عاشی کا مستقبل پنہاں تھا۔

ہر چند کہ محمود حسین نے عاشی کو تاکید کر دی تھی کہ ان روپوں کے بارے میں کسی سے کچھ نہ کہے لیکن اُس نے ممدو کو پہلی فرصت میں بتا دیا تھا، وہ جلد از جلد اس بوجھ سے سبکدوش ہو جانا چاہتی تھی جو اچانک اُس کے کاندھوں پر بار کر دیا گیا تھا، اُس نے محمود حسین کی دلجوئی کی خاطر اور اُن کی خوشی کے پیش نظر بے حد اصرار پر لے لی تھی لیکن اس رقم نے اُس کے معصوم ذہن کو پریشان کر دیا تھا۔ محمود حسین اور شمسہ بیگم نے جو عنایتیں اُس پر کر رکھی تھیں وہ بہت تھیں۔

اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنی ساری رقم کا وہ کیا کرے گی، اتنے ڈھیر سارے روپے دیکھ کر وہ کچھ گھبرا سی گئی تھی پھر جب اُس نے وہ رقم لے جا کر ممدو کے سامنے رکھی تو ایک لمحے کو ممدو کی بوڑھی نگاہوں میں بھی اَن گنت سوالات ابھر آئے تھے، اُس نے عاشی کو کچھ عجیب نظروں سے گھورا۔

اِن نظروں میں اضطراب تھا ——

بے چینی تھی ——

پچھلی زندگی کے اَن گنت تجربوں کا نچوڑ تھا ——

سرزنش تھی ——

ایک خاموش سوال بھی تھا —— "کہاں سے آئی یہ رقم ——؟"

اور عاشی ممدو کی نگاہوں کے بدلتے زاویوں اور کیفیتوں کو دیکھ کر بوکھلا سی گئی تھی۔

"بابا —— یہ اتنے ڈھیر سارے روپے مجھے انکل نے دیئے ہیں"

"بڑے سرکار نے ——" ممدو کے کانوں میں شہنائیوں کا شور اُبھر آیا، اس کی نگاہوں کا تجسس

"وہ کہہ رہے تھے کہ میں بھی ناجیہ کی طرح اُن سے فرمائشیں کیا کروں —— ضد کر کے اپنی باتیں منوا

عاشی نے کہا "وہ مجھے ناجیہ سے کم نہیں سمجھتے لیکن ——"

"لیکن کیا ——" ممدو نے تیزی سے پوچھا

"اس کے احسانات ہمارے اوپر پہلے ہی کیا کم ہیں کہ یہ اتنے سارے روپے اور بوجھ بن گئے"

"اپنوں کے حساب ہمیشہ دل میں ہوتے ہیں بچی" ممدو نے ان روپوں پر نظر ڈال کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس کے یہاں دیر ضرور ہے لیکن اندھیر نہیں ہے ——"

"بابا —— تم کسی طرح یہ روپے انکل کو واپس کر دینا"

"یہ تیرا اور بڑے سرکار کا ذاتی معاملہ ہے، میں درمیان میں بولا تو چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی"

"مگر ہم اتنے روپوں کا کریں گے کیا ——" اُس نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"اچار ڈالیں گے —— یا پھر ان کا درخت لگا دیں گے تاکہ پھلتے پھولتے رہیں" ممدو نے مسکرا کر کہا پھر عاشی کو پیار بھری نظروں سے دیکھتا ہوا بولا "ان روپوں سے تم اپنی ضرورت کی چیزیں بازار سے خرید لانا ——"

"لیکن میری تمام ضرورت تو آنٹی بغیر کہے پوری کر دیتی ہیں"

"پھر —— بڑے سرکار نے روپے بچھے کیوں دیئے ہیں" ممدو نے اُسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"کانچ کی چوڑیوں کی فرمائش پر" عاشی نے بڑے بھولپن سے جواب دیا "میں نے تو بس چوڑیوں کی فرمائش کی تھی"

"چوڑیاں بھی خرید لینا اور جو پیسے بچ جائیں انھیں سنبھال کر رکھنا" ممدو نے اپنے تجربے کی بات بتائی، "برے وقت میں پیسے ہی انسان کے کام آتے ہیں"

"تم جانو ——" اُس نے لاپروائی سے جواب دیا پھر اچانک سنجیدگی سے بولی "ان روپوں کا ذکر کسی اور سے نہ کرنا، انکل نے مجھے یہی تاکید کی تھی ——"

"پھر —— تم نے مجھے کیوں بتایا ——"

"واہ، کیوں نہ بتاتی —— تم تو میرے بابا ہو" اُس نے مسکرا کر کہا، آگے بڑھ کر ممدو کی پیشانی کو چوما پھر کچھ گنگناتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

محمود حسین کی اپنائیت کے اس نئے انداز نے ممدو کو زندگی کی نوید دی تھی، اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کی محنت رائیگاں نہیں گئی جو کچھ اس نے سوچا تھا وہ آہستہ آہستہ پورا ہو رہا تھا اور جو کچھ اُس نے اپنے خدا سے مانگا تھا وہ اُسے مل رہا تھا

اُس روز ممدو کی بوڑھی نگاہوں میں خوشیوں اور مسرتوں کے انمول موتی جگمگا اٹھے تھے، عاشی کے مستقبل کے لئے اُس نے جو خواب دیکھے تھے اُن خوابوں کی تعبیر سامنے آ رہی تھی —— عاشی کو ایک ٹھوس اور مضبوط سہارے کی ضرورت تھی جو ممدو نے اُس کے لئے تلاش کر لیا تھا —— اُسے یقین تھا کہ اب اگر زندگی نے اس کے ساتھ دغا بازی اور دھوکہ دہی کا مظاہرہ کیا تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا، وہ عاشی کو اس منزل تک لے آیا تھا جہاں کوئی اور نہیں لا سکتا تھا۔

اس منزل تک پہنچنے کے لئے ممدو کو بڑی قربانیاں دینی پڑی تھیں، موت سے زندگی کی بھیک مانگنی پڑی تھی اور خدا سے سانسوں کے فریب کو بحال رکھنے کے لئے دعا کرنی پڑی تھی —— یہ سب کچھ اُس نے عاشی کے لئے کیا تھا۔

عاشی ——

جو اُسے زندگی کی حرارتوں سے زیادہ عزیز تھی۔

عاشی ——

جو ایک بدنصیب ماں کا بھٹکا ہوا خواب تھی

اور آج —— آج جب ان خوابوں کی تعبیر کی ایک روشن جھلک ممدو کو نظر آئی تو وہ خوشی سے نڈھال ہو گیا، ایک لمحے کو اُس نے سوچا تھا کہ فائزہ کا مقفل ٹرنک اور اُس کی ڈائری جو اُس نے اپنی زندگی کی سانسیں بہت سنبھال کر رکھی تھی خاموشی سے لے جا کر محمود حسین کے حوالے کر دے اور پھر آنکھ بند کر کے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائے کہ

اب زندگی کی تمام حسرتیں پوری ہو چکی تھیں۔
تمام خواہشات کی تکمیل ہو چکی تھی۔
زندگی کے نشیب و فراز پر بھٹکتے بھٹکتے وہ بہت تھک چکا تھا۔
نڈھال ہو گیا تھا ——— اور
اب آرام چاہتا تھا ——— !!

لیکن فلک کج رفتار کو ابھی ممدو کا سکون اور اُس کا آرام منظور نہیں تھا' ابھی وہ عاشی کے نازک کو محفوظ ہاتھوں کے سپرد کر کے ٹھیک طرح سے اطمینان کا سانس بھی نہیں لے پایا تھا کہ اچانک اُس کا بیٹا کارحیمو ایک طویل مدت تک اُس کی نظروں سے اوجھل رہنے کے بعد سامنے آ گیا۔

اُس روز شام ہی سے اُس کی آنکھ رہ رہ کر پھڑک رہی تھی' سینے میں ہلکا ہلکا درد بھی محسوس ہو رہا تھا رات کو سونے کے لئے بستر پر دراز ہوا تو نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی' اُس نے عاشی سے بات کر کے وقت گزارنا چاہا لیکن وہ بے خبر سو رہی تھی ——— کچھ دیر وہ بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا پھر اُٹھ کر باہر برآمدے میں آ گیا جانے کیوں آج کسی کروٹ اُسے چین نہیں مل رہا تھا' ایک عجیب سی بے کیفی طاری تھی اور پھر ———

پھر اچانک کوٹھی کا چوکیدار رحیمو کو ساتھ لئے اُس کے سامنے آ گیا تو اُس پر سکتے کی کیفیت طاری ہو گئی۔ آنکھیں اپنے حلقوں میں منجمد ہو کر ایک ہی نقطے پر منجمد ہو گئیں۔

"ممدو چاچا ——— دیکھ تو سہی ———" چوکیدار نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اُسے آواز دی "تیرا لڑکا ولایت سے آیا ہے ——— تجھ سے ملنے ———"

ممدو نے کوئی جواب نہیں دیا' پھٹی پھٹی نظروں سے ٹکٹکی باندھے رحیمو کو دیکھتا رہا جو کوٹ پتلون پہنے' ہاتھ میں بریف کیس اُٹھائے ممدو کے سامنے کھڑا تھا۔ وقت کی کروٹوں کے ساتھ ساتھ رحیمو میں بھی لاتعداد تبدیلیاں آ گئی تھیں اب وہ دیہاتی یا گنوار نہیں' ایک دم شہری جنٹلمین نظر آ رہا تھا' کوٹ پتلون میں بڑا شاندار لگ رہا تھا۔

"بابا ———" چوکیدار کے جانے کے بعد رحیمو نے ممدو کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "میں تیرا رحیمو"

ممدو کا دل بیٹے کی آواز سن کر تڑپ اُٹھا' ہونٹ کپکپانے لگے اور آنکھوں کے گوشے نمناک ہو گئے لیکن اُس نے رحیمو کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا ——— اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھا ہاتھ ملتا رہا۔

"بابا ——— تو ابھی تک مجھ سے ناراض ہے" رحیمو ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے بولا "میں نے تجھے کتنے خط لکھے' تو نے کسی کا جواب نہیں دیا ——— ایسا بھی کیا بابا ——— میں تجھ سے بنا کہے چلا گیا وہ میری بھول تھی۔ میری غلطی تھی' میں اپنے کئے پر نادم ہوں' ہاتھ جوڑ کر تجھ سے معافی مانگتا ہوں ——— مجھے معاف کر دے بابا"

ممدو بدستور خاموش رہا ——— کسی ٹھہرے ہوئے طوفان کی مانند ———

"مجھے اپنے مستقبل کا خیال تجھ سے دُور لے گیا تھا اور آج ———" رحیمو نے ٹھوس آواز میں کہا "تیری دعاؤں سے تیرے بیٹے کا مستقبل سنور گیا ہے' میں نے دن رات محنت کر کے اپنا مستقبل سنوارا ہے اب وہ سب کچھ مل گیا ہے کل تک میں جس کا خواب دیکھا کرتا تھا ———"

ممدو تصویرِ حیرت بنا بیٹے کی بات سنتا رہا

"اب میں غریب نہیں ہوں بابا ——— میرے پاس بہت ساری دولت ہے' مکان ہے' گاڑی ہے اپنا چھوٹا موٹا کاروبار ہے' میرے اپنے ملازم ہیں' نوکر چاکر ہیں اور اب ———" رحیمو نے باپ کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "اب میں تنہا واپس نہیں جاؤں گا' تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور تمہارے ———"

"خبردار ———" ممدو یکلخت بول پڑا "عاشی کا نام اپنی زبان پر مت لانا"

"کیوں ———" رحیمو کا ہنستا مسکراتا چہرہ یکلخت سفید پڑ گیا' سہمی سہمی آواز میں پوچھا "کیا ہوا ہے وہ خیریت سے تو ہے"

"ہاں ——— خدا کے فضل و کرم سے وہ بالکل ٹھیک ہے" ممدو نے ٹھوس لہجے میں کہا "تو نے اپنے سنوارنے کی خاطر اس پھول جیسی نازک اور معصوم بچی سے منہ موڑ لیا تھا لیکن میں نے ایک پل کو بھی اس

کو نہیں آئی اور اب ——— اب وہ تناور درخت بن گئی ہے' اُسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں رہی"

"بابا ———" رحیمو نے بڑی عاجزی سے کہا "اب تو غصہ تھوک دے"

"تو اب یہاں کیا لینے آیا ہے" ممدو نے دل پر جبر کر کے روکھے لہجے میں سوال کیا۔

"میں تجھے اور عاشی کو لینے آیا ہوں ———" رحیمو کے لہجے میں التجا تھی۔

"کہاں ٹھہرا ہے تو ———" ممدو نے خشک آواز میں پوچھا "تیرا سامان کہاں ہے ———"

"میں ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں بابا' سامان بھی وہیں ہے۔ تمہارا پتہ دریافت کرتے کرتے یہ وقت ہو گیا"

"تجھے بڑی جلدی اپنی منزل مل گئی" ممدو ایک سرد آہ بھر کر بولا "مجھ سے پوچھ ——— میں آج تک اسی دوراہے پر کھڑا ہوں جہاں فائزہ کو دفن کیا گیا تھا ——— اُس کی چھوڑی ہوئی نشانی نہ ہوتی تو میری زندگی کا سفر بھی اُسی دوراہے کے کب کا ختم ہو گیا ہوتا"

"میں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوں ———" رحیمو بولا "معاف کر دے بابا ———"

"میں ——— میں ایک شرط پر تیری ساری خطائیں معاف کر سکتا ہوں" ممدو کا لب و لہجہ ٹھوس ہو گیا۔

"مجھے تیری ہر شرط منظور ہے ———" رحیمو نے جلدی سے کہا پھر بڑی اپنائیت سے بولا "کیا یہیں بیٹھے بیٹھے باتیں کرے گا۔ مجھے اندر چلنے کو نہیں کہے گا ———"

"مجھ سے ایک وعدہ کر رحیمو ———" ممدو دل کڑا کر کے بولا "تو آئندہ مجھ سے ملنے کی خاطر یہاں نہیں آئے گا"

"بابا ———" رحیمو کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ سکا۔

"میں نہیں چاہتا کہ عاشی پر تیرا سایہ بھی پڑے ———" ممدو اُٹھ کر کھڑا ہو گیا "میں تیری زبان سے عاشی کا نام بھی سننا پسند نہیں کروں گا' مجھے عاشی کے سلسلے میں اپنی زبان ہمیشہ بند رکھنی ہوگی ورنہ ——— ورنہ میں تجھے بھی معاف نہیں کروں گا"

"میں اپنی زبان بند کر لوں گا بابا لیکن تمہارا مطلب ———"

"زیادہ مطلب سمجھنے کی کوشش مت کر ورنہ اس معصوم کا مستقبل تباہ ہو جائے گا"

"مجھے کیا ہو رہا ہے بابا ——— مجھے بتا تو سہی' آخر بات کیا ہے"

"میں پاگل ہو گیا ہوں ———" ممدو نے سرد لہجے میں جواب دیا "میری عقل سٹھیا گئی ہے لیکن تو کون ہوتا ہے یہ سب کچھ پوچھنے والا ——— جب اتنے برسوں تک تو ہمیں بھلائے بیٹھا رہا تو اب تیری ممتا کیوں پھڑپھڑا رہی ہے"

"بابا ———"

"جا' چلا جا رحیمو ———" ممدو نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا "اگر تو مجھ سے کوئی رشتہ رکھنا چاہتا ہے تو یہاں سے چلا جا' ——— میں تجھ سے ملنے تیرے ہوٹل آ جاؤں گا لیکن یہاں میں تجھے شناخت نہیں کر سکتا اس لئے کہ اگر میں نے تجھے اس کوٹھی کی چہار دیواری کے اندر پہچان لیا تو عاشی برباد ہو جائے گی ——— اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی ——— تو چلا جا رحیمو ——— نہیں تو میں تجھے حشر کے میدان میں بھی معاف نہیں کروں گا ———"

"بابا ——— کیا میں ایک نظر عاشی کو دیکھ سکتا ہوں" رحیمو نے ٹوٹے ہوئے انداز میں کہا۔

"نہیں ———" ممدو سینہ تان کر بولا "تو یہ سمجھ لے کہ عاشی تیرے لئے مر چکی ہے"

"میں یہاں صرف ایک ہفتے کے لئے آیا ہوں بابا ——— پھر واپس چلا جاؤں گا" رحیمو کے اداس سے چہرے پر تشویش کی پرچھائیں مچل رہی تھیں۔

"تو مجھے اپنے ہوٹل کا پتہ بتا دے ——— میں تجھ سے وہیں آ کر مل لوں گا" ممدو نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

اس بار رحیمو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جیب سے ایک کارڈ نکال کر ممدو کے حوالے کیا پھر اپنی بھیگی پلکوں کو سمیٹتا ہوا تیزی سے مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا کوٹھی کے صدر دروازے کی جانب چلا گیا اور ممدو ——— وہ اس طرح تصویرِ حیرت بنا چپ چاپ رحیمو کو واپس جاتے دیکھ رہا تھا جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو ——— !!

ناجیہ عاشی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھی فرحت سے خوش گپیوں میں مصروف تھی کہ اچانک
نے سرگوشی کی "لو ناجیہ ـــــ تمہارے وہ آ گئے ـــــ"

"وہ ـــــ وہ کون" ناجیہ نے چونک کر پوچھا۔

"وہ ـــــ وہی ـــــ بس سمجھ جاؤ"

"فراز بھائی آپ ـــــ" عاشی نے فراز کو آتا دیکھ کر بلند آواز میں کہا۔

ناجیہ نے عاشی کی آواز پر پلٹ کر دیکھا تو فراز سامنے کھڑا تھا۔ پینٹ اور بش شرٹ میں
وقت وہ خاصا اسمارٹ نظر آ رہا تھا، چہرے پر حسب دستور وہی بھولی بھالی معصومیت اور پاکیزہ سی سنجیدگی طاری تھی

"کیا پھوپی جان بھی آئی ہیں" ناجیہ نے دریافت کیا

"ہاں ـــــ"

"بیٹھئے نا ـــــ آپ کھڑے کیوں ہیں" عاشی جلدی سے بولی

"شاید ناجیہ کی اجازت کا انتظار کر رہے ہیں" فرحت شوخی سے بولی "کیوں فراز بھائی ـــــ"

"صاحب خانہ کی اجازت بہرحال ضروری ہوتی ہے" فراز نے مسکرا کر جواب دیا پھر ناجیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی معصومیت سے پوچھا "میں اس وقت مخل تو نہیں ہوا ـــــ"

"اب آ ہی گئے ہیں تو تشریف رکھئے" ناجیہ نے نظر بھر کر فراز کو گھورتے ہوئے کہا "رہا مخل ہونے کا سو
یہاں ایسی کوئی بات نہیں جو آپ سے چھپائی جائے ـــــ"

"ایک بات تو ہے ـــــ" فرحت نے دبی زبان میں کہا تو ناجیہ بڑی تیزی سے پلٹ پڑی، قدرے
سے بولی،

"تیرا سر ـــــ"

"میرا سر تو سلامت ہے لیکن اب مجھے تمہارے سر کی خیر نظر نہیں آتی" فرحت نے زیر لب مسکراتے ہوئے

"فراز بھائی ـــــ" عاشی نے براہ راست فراز سے پوچھا "سنا ہے آپ نے مقابلے کے امتحان کی
میں باقاعدہ اور نہایت زور شور سے تیاریاں شروع کر دی ہیں"

"کیا مطلب ـــــ" فرحت نے سنجیدگی سے دریافت کیا "کیا آپ کو باقاعدہ مقابلے کی دعوت دی گئی

"جی ہاں ـــــ" فراز نے کنکھیوں سے ناجیہ کو دیکھتے ہوئے جواب دیا "ماموں جان کا حکم ہی ہے کہ میں
کے امتحان کی تیاری ابھی سے شروع کر دوں"

"کیا خیال ہے آپ کا ـــــ" فرحت نے شوخی سے پوچھا "کامیاب تو ہو جائیں گے ـــــ"

"کوشش کرنا اپنا کام ہے ـــــ آگے جو قدرت کو منظور ہو"

"اگر ممتحن سختی پر اتر آیا تو آپ کو نمبر ملنے دشوار ہو جائیں گے ـــــ"

"کامیابی کے اور بھی طریقے ہیں ـــــ" فراز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مثلاً ـــــ"

"کاپی سادی چھوڑ دی جائے ـــــ" فراز نے بڑی سادگی سے جواب دیا "ممتحن محض اپنی مرضی سے
اوراق پر جو چاہے لکھ لے اور اسی اعتبار سے نمبر دیدے"

"خدا نظر بد سے بچائے فراز بھائی، آج تو آپ بڑی حاضر دماغی سے کام لے رہے ہیں" عاشی نے ہنستے ہوئے

"اتفاق ہے ـــــ" ناجیہ بولی۔

"لیکن ہے خوبصورت ـــــ" فرحت نے گرہ لگائی۔

"خوبصورت بھی اور حسین بھی" عاشی چپ نہ رہ سکی۔

"آپ کا کیا خیال ہے ـــــ" فراز نے بڑی معصومیت سے ناجیہ سے پوچھا۔

"کس سلسلے میں ـــــ" ناجیہ نے انجان بنتے ہوئے دریافت کیا۔

"اس اتفاق کے سلسلے میں جو آج اتفاق سے میری زبانی سرزد ہو رہا ہے ـــــ"

"بہت اچھے ـــــ" فرحت تیزی سے بولی "آپ تو اردو بھی بول لیتے ہیں"

"مجھے کچھ اور زبانیں بھی آتی ہیں ـــــ بشرطیکہ کوئی سمجھنے والا ہو" فراز کا جملہ معنی خیز تھا۔

فرحت کے علاوہ ناجیہ اور عاشی بھی مسکرا دیں۔

"میرا خیال ہے کہ اب مجھے چلنا چاہیئے" فرحت اٹھتے ہوئے بولی "اس لئے کہ دوسری زبانوں میں بھلا ناجیہ کے مقابلے
میں کون ٹھہر سکتا ہے"

"آپ کوشش تو کریں ـــــ" فراز نے فرحت پر فقرہ چست کرتے ہوئے جلدی سے کہا "ابھی سے مایوس
ہو گئیں تو آگے کیا ہوگا"

"شکریہ ـــــ مجھے تو آپ معاف ہی رکھیں" فرحت نے کہا پھر ناجیہ کو وش کرتی ہوئی ہنستی مسکراتی چلی گئی۔

"فراز بھائی ـــــ" عاشی نے فرحت کے جانے کے بعد کہا "آج تو واقعی آپ کو اپنی نظر اتروانی پڑے گی"

"اور آپ کی نظر اتارنے کے لئے میرے خیال میں پیاز زیادہ مناسب رہیں گے" ناجیہ بولی "اس لئے کہ وہ آپ کو
آپ سے زیادہ بہتر سمجھتے ہیں ـــــ"

"آپ شاید مجھے بھوندو کہنا چاہ رہی تھیں ـــــ" فراز نے مسکرا کر کہا "کہہ لیجئے ـــــ میں برا نہیں مانوں گا"

"سعادت مندی ہے آپ کی ورنہ صرف میرے کہنے سے کیا ہوگا" ناجیہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے ـــــ" فراز نے دبی زبان میں کہا "تالی صرف ایک ہاتھ سے نہیں بجتی ـــــ اس کے
لئے دوسرے ہاتھ کی مرضی بھی ضروری ہوتی ہے ـــــ"

"اچھا فراز بھائی ـــــ" عاشی نے موقع کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے کہا "آپ دوسرے ہاتھ کی مرضی ـــــ
دریافت کریں، اور میں اتنی دیر میں آپ سب کے لئے اچھے سے ناشتے کا بندوبست کرتی ہوں"

عاشی اٹھ کر چلی گئی تو فراز اپنی نشست پر سمٹ کر بیٹھ گئے۔

"عاشی آبجکٹ ہر وقت بس آپ ہی کے گن گاتی رہتی ہے" ناجیہ نے کچھ توقف کے بعد مسکراتے ہوئے کہا

"میں بھی اسے اپنی سگی بہن کی طرح پیار کرتا ہوں"

"کچھ دن ہوئے وہ مجھ سے آپ کی پرزور سفارش کر رہی تھی"

"کس سلسلے میں" فراز نے تیزی سے پوچھا۔

"پھوپھی جان آپ کو گھر بسانے کے متعلق بہت سنجیدہ ہیں" ناجیہ نے بڑے لاپروا مگر بے باک لہجے میں کہا۔

فراز نے کوئی جواب نہیں دیا، ایک نظر ناجیہ کو دیکھ کر گردن جھکائی تھی۔

"کیا یہ باتیں قبل از وقت نہیں ہیں ـــــ" ناجیہ نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں ـــــ"

"لیکن مسئلہ تو آپ ہی کی ذات سے متعلق ہے"

"ہو سکتا ہے کہ امی جان نے کچھ سوچ کر یہ مسئلہ اٹھایا ہو"

"تعلیم مکمل ہونے سے پیشتر اس قسم کی باتیں مجھے تو زہر لگتی ہیں" ناجیہ نے قدرے جھلاہٹ کا اظہار کیا۔

"والدین کا اپنا ایک علیحدہ نظریہ ہوتا ہے" فراز نے کہا "وہ جو کچھ سوچتے ہیں اس میں ان کی اپنی مصلحتیں بھی
ہوتی ہیں"

"لیکن مجھے یہ طریقہ کچھ مناسب نہیں لگتا کہ قبل از وقت ہی کسی کی سوچوں کو قید کر کے اس پر ریزرویشن سلپ
لگا دی جائے ـــــ"

"دوسری صورت میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک اچھا اور خوبصورت انتخاب ہاتھ سے نکل جائے" فراز نے
گہری نگاہ سے جواب دیا۔

"آئی سی ـــــ" ناجیہ نے فراز کو غور سے دیکھا پھر انتہائی بے باکی سے بولی "انتخاب کا حق کیا صرف
لڑکوں کا ہے ـــــ؟"

"جی نہیں ـــــ" فراز نے تیزی سے کہا "لڑکیوں کو بھی پورا پورا اختیار حاصل ہونا چاہیئے ـــــ"

"آپ قسمت پر یقین رکھتے ہیں ——"

"جی ہاں —— لیکن میں آپ کا اشارہ نہیں سمجھ سکا۔"

"میں نے ایسی کوئی دشوار بات نہیں کہی تھی۔" ناجیہ مسکرا کر بولی "اگر آپ قسمت پر یقین رکھتے ہیں تو ریزرویشن سلپ والا طریقۂ کار کیا آپ کو فرسودہ نظر نہیں آتا؟"

"ممکن ہے آپ کا خیال درست ہو لیکن بزرگ بہرحال ہم سے زیادہ تجربہ کار ہوتے ہیں۔"

"لیکن جغرافیائی حالات کی طرح انسان کی اپنی سوچیں بھی بدلتی رہتی ہیں۔" ناجیہ نے تیزی سے کہا "وقت کے ساتھ ساتھ حالات میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں ——"

فراز نے کوئی جواب نہیں دیا، کرسی پر پہلو بدل کر رہ گیا۔

"آج آپ مجھے اپنے لئے پسند کر رہے ہیں لیکن کل ——" ناجیہ نے نہایت سختی اور بے باکی سے "ہو سکتا ہے کہ کل کوئی اور بہتر لڑکی آپ کی توجہ کا مرکز بن جائے ——"

"ناجیہ ——" فراز نے نظریں اٹھا کر ناجیہ کا نام لیا —— آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

"معاملہ اس کے برعکس صورت بھی اختیار کر سکتا ہے۔" ناجیہ بولی "ہو سکتا ہے کہ آج کی تاریخ میں میری رائے آپ کے متعلق بہت اچھی ہو لیکن ضروری تو نہیں کہ یہی رائے کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد بھی برقرار رہے۔ وقت اور حالات میری رائے کو بدل بھی سکتے ہیں۔"

"آپ —— آپ درست فرما رہی ہیں۔" فراز نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا پھر کچھ سوچ کر بولا "میں اپنی کو سمجھا دوں گا کہ اس معاملے کو وقت اور حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں ——"

"آپ کو غالباً میری بات کچھ ناگوار گزری ہے ——"

"جی نہیں —— میں نے آپکی باتوں کا برا نہیں منایا ——"

"ایک بات پوچھوں ——" ناجیہ نے قدرے توقف سے پوچھا۔

"پوچھئے ——"

"کیا میں واقعی آپ کو اچھی لگتی ہوں؟"

فراز نے اس سوال پر چونک کر ناجیہ کو دیکھا پھر اپنی نشست پر کسمسا کر رہ گیا۔

"مجھے معلوم تھا کہ آپ جواب دینے سے گریز کریں گے لیکن آپ کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات سے اندازہ ہو گیا ہے کہ آپ مجھے پسند کرتے ہیں ——" ناجیہ نے مسکراتے ہوئے کہا "میں بھی آپ کو برا نہیں سمجھتی —— لیکن یہ میری وقتی رائے ہے، میں مستقبل کے بارے میں کوئی ضمانت نہیں دے سکتی ——"

فراز نے کچھ کہنا چاہا لیکن اسی وقت شائستہ بیگم اور شمہ بیگم ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں اور فراز کو ارادہ ترک کر دینا پڑا۔

ناجیہ آج خلافِ معمول پھوپھی کو دیکھ کر بے اختیار اپنی نشست سے اٹھی اور دوڑ کر ان کے گلے لگ گئی۔

افتخار احمد کو عاشی کے پالینے کے بعد صرف ایک ہی فکر لاحق تھی کہ کسی طرح اس کو بہو بنا کر اپنے گھر لے آئیں اس طرح وہ اپنی ماضی کی کوتاہیوں کا تدارک بھی کرنا چاہتے تھے اور بہن کی روح کو تسکین بھی پہنچانا چاہتے تھے لیکن یہ بات بھی ان کو بخوبی معلوم تھی کہ راحیلہ خاتون آسانی سے عاشی کو اقبال کے لئے قبول نہیں کریں گی۔ راحیلہ خاتون اونچے خاندان اور بڑے باپ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ افتخار احمد سے ان کی شادی ایسے حالات کے پیش نظر ہوئی تھی کہ ان کو افتخار احمد کے خاندانی پس منظر کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں تھیں لیکن بعد میں جب ان کو حالات کا علم ہوا تو برا سامنا بنا کر رہ گئیں —— اکثر و بیشتر وہ باتوں باتوں میں ان کو اس بات کو طعنہ دے جاتی تھیں کہ ان کے پاس دولت، عزت اور شہرت جو کچھ بھی ہے ان ہی کے دم سے ہے کہ اگر افتخار احمد کی شادی ان کے ساتھ نہ ہوئی ہوتی تو وہ کوٹھیوں اور کاروں میں گھومنے پھرنے اور عیش کرنے کے بجائے کسی دفتر میں کلرکی کر رہے ہوتے۔

چھوٹائی بڑائی اور امیری غریبی کا یہی فرق تھا جس نے افتخار احمد اور راحیلہ خاتون کے درمیان کبھی دوستانہ فضا نہیں استوار ہونے دی جو میاں بیوی کے درمیان ہونی چاہئے۔ راحیلہ خاتون اپنی امارت کے زعم میں سر اٹھا کر چلنے کی عادی تھیں اور افتخار احمد کو صرف یہ احساس مطمئن کئے ہوئے تھا کہ انھوں نے سوسائٹی میں یہ مقام حاصل کرنا چاہا تھا وہ انھیں شادی کے بعد مل گیا تھا۔

عزت اور نام حاصل کرنے کی تلاش میں کامیاب ہو جانے کے بعد سے انھوں نے مصلحتاً راحیلہ خاتون سے اپنا رویہ نرم رکھا تھا، پہلے وہ اپنی جگہ پتھر بنے رہتے تھے مگر حالات کی ایک ہی کروٹ نے انھیں ایک بار پھر راحیلہ خاتون کی مرضی کے سامنے تسلیم خم کر دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ ہر قیمت پر عاشی کو اقبال کے لئے حاصل کرنا چاہتے تھے۔

آج بھی وہ لان میں آرام کرسی پر بیٹھے ان ہی خیالوں میں غرق تھے کہ راحیلہ خاتون بنی سنوری تیز تیز قدم اٹھاتی ان کے قریب آگئیں۔ شوہر کو ایک نظر گھور کر بولیں۔

"میں آپ کو اندر تلاش کرتی پھر رہی ہوں اور آپ یہاں بیٹھے ہیں؟"

"آپ لباس تبدیل کر رہی تھیں اس لئے میں کچھ دیر ٹہلتا ہوا میں آگیا۔" افتخار احمد نے بیوی کو دیکھتے ہوئے جلدی سے کہا۔

"کیا آپ تیار نہیں ہوں گے؟" راحیلہ خاتون نے دوسری کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے پوچھا۔

"بلاوا ساڑھے سات کا ہے اور ابھی پونے چھ بجے ہیں، مجھے تیار ہونے میں کتنی دیر لگے گی۔"

"میں نے ملازم سے کہا ہے کہ وہ آپ کے نیلے سوٹ پر استری کر دے۔ آج آپ وہی پہن کر چلیں گے۔"

"جو حکم آپ کا ——" افتخار احمد نے بڑی سعادت مندی سے جواب دیا۔

"کیا بات ہے ——" راحیلہ خاتون نے زیر لب مسکراتے ہوئے دریافت کیا "اب کی بار کراچی سے واپسی کے بعد آپ میں خاصی تبدیلی رونما ہوئی ہے، پہلے تو آپ کو میری اتنی خاطر کبھی منظور نہیں تھی۔"

"ہے ایک بات جس نے مجھے یہ احساس دلا دیا ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر اور محبت سے رہنا چاہئے ——" افتخار احمد نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ایک لمحے کو عاشی کا خوابناک تصور ان کی پلکوں پر لہرا گیا۔

"اچھا ——" راحیلہ خاتون شوہر کو تیز نظروں سے گھورتے ہوئے بولیں "ذرا میں بھی سنوں، آخر وہ کونسی ایسی بات ہے جس نے پتھر میں جونک لگا دی ——"

افتخار احمد کو بیوی کی مثال سخت ناگوار گزری لیکن برداشت کر گئے، قدرے مسکرا کر بولے۔

"آپ نے کبھی محسوس کیا ہے کہ اقبال اب چشم بد دور جوان ہو گیا ہے اور دو تین سال بعد اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو جائے گا۔"

"تعجب ہے آپ کو اولاد کے جوان ہونے کا علم کراچی جانے کے بعد ہوا۔" راحیلہ خاتون نے ہنس کر کہا پھر بولیں "لیکن اقبال کی عمر کا آپ میں رونما ہونے والی تبدیلی سے کیا تعلق ہے ——"

"بہت گہرا اور اہم تعلق ہے۔" افتخار احمد نے محتاط الفاظ میں جواب دیا "کیا آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ عاشی کی چقاش ہماری بہو پر کیا اثر ڈالے گی —— کیا سوچے گی وہ۔"

"بہو ——" راحیلہ خاتون چونک اٹھیں "یہ اچانک بہو کا خیال آپ کو کیسے آگیا ——"

"کیوں —— کیا آپ کا ارادہ اقبال کی شادی کر کے اس کا گھر بسانے کا نہیں ہے۔"

"جب وقت آئے گا تب دیکھا جائے گا ——" راحیلہ خاتون لاپرواہی سے بولیں۔

"ٹھیک ہے —— مگر ہمیں ابھی سے تمام باتوں کا خیال رکھنا ہوگا۔" افتخار احمد نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے ہوشیار قدرے توقف سے بولے —— "میرا تو مشورہ ہے کہ اقبال کے لئے ابھی سے کوئی لڑکی بھی دیکھ لی جائے۔"

"خدا سلامت رکھے میرے اقبال کو —— لاکھوں میں ایک ہے، اس کے لئے بھلا لڑکیوں کی کیا کمی۔"

"درست فرما رہی ہیں آپ —— لیکن اچھے اور مناسب رشتے عین وقت پر نہیں ملا کرتے۔"

"لگتا ہے اس کا ذاتی چکر ہو چکا ہے۔" راحیلہ خاتون نے مسکرا کر بڑے کھوندے انداز میں شوہر پر چملکا سا پھینکتے ہوئے بات بناتے ہوئے بولیں "میرا مطلب ہے کہ دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے ——"

افتخار احمد کا خون ایک بار پھر کھول اٹھا لیکن مصلحت کے ہیبتِ نظر اوہ غصہ پی گئے۔ سپاٹ لہجہ

"کوئی لڑکی ہے آپ کی نظر میں ——— "

"ہیں تو بے شمار لڑکیاں لیکن ابھی تک میں نے کسی پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔"

"ایک لڑکی میں نے بھی دیکھی ہے ——— " افتخار احمد نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "اب کی بار کر ایک دیرینہ دوست سے ملنے گیا تو وہاں دیکھی تھی ——— آج تک اس کا معصوم چہرہ نگاہوں میں پھر رہا ہے اقبال کے لئے نہایت مناسب رہے گی۔"

"گھرانہ کیسا ہے ——— "

"ٹھیک ٹھاک ہے" افتخار احمد بولے۔ "زیادہ امیر کبیر لوگ تو نہیں ہیں لیکن ہیں بڑے شریف اور وضعدار

"لڑکی کہاں تک پڑھی لکھی ہے ——— " راحیلہ خاتون نے دریافت کیا

"کالج میں زیرِ تعلیم ہے ——— غالباً ایف اے میں ہے۔"

"ایف اے ——— " راحیلہ خاتون نے کڑوا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "میں تو اپنے اقبال کے لئے کم بی اے سے پاس بہو لاؤں گی۔"

"دو سال بعد وہ لڑکی بھی بی اے کر لے گی۔" افتخار احمد جلدی سے بولے۔ "اقبال کی شادی بھی ہم تین چار سال بعد ہی کریں گے۔"

"پھر ——— اتنی جلدی بات پکی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"اگر تم نے اس لڑکی کو دیکھ لیا تو چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کرنے پر آمادہ ہو جاؤ گی۔"

"سچ ——— کیا وہ واقعی اتنی خوبصورت اور حسین ہے۔" راحیلہ خاتون نے دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔ "کوئی تصویر ہے تمہارے پاس۔"

"نہیں ——— لیکن اب کی بار آپ بھی میرے ساتھ کراچی چلیں ——— خود ہی اپنی نظروں سے دیکھ لیجئے۔"

"لو بھلا ——— اگر لڑکی خوبصورت اور حسین ہوئی تو میں اسے فوراً ہو بنا لاؤں گی۔" راحیلہ خاتون بولیں۔ "بی اے کی ڈگری بعد میں آتی رہے گی۔"

"لیکن میں چاہتا ہوں کہ اقبال اپنی تعلیم مکمل کر لے تو زیادہ مناسب رہے گا۔"

"اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو یہی سہی، ہم لڑکی پسند آنے پر منگنی پر بھی اکتفا کر سکتے ہیں۔"

"ہاں ——— یہ مناسب خیال ہے۔"

"نام کیا ہے لڑکی کا ——— "

"عاشی ——— " افتخار احمد نے دھڑکتے دل سے کہا

"پیارا نام ہے ——— " راحیلہ خاتون بولیں پھر چونک کر دستی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "آپ تو باتوں میں وقت ٹال رہے ہیں ——— جلدی اٹھ کر تیار ہو جائیں ورنہ ہمیں دیر ہو جائے گی ——— "

"آپ فکر نہ کریں۔" افتخار احمد جلدی سے اٹھتے ہوئے بولے۔ "میں تیار ہونے میں دس منٹ سے زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"

لباس تبدیل کرتے وقت بھی افتخار احمد کے ذہن میں عاشی کا تصور گنگنا رہا تھا۔ وہ بہت خوش اور مسرور تھے۔ آج پہلی بار انھوں نے اقبال اور عاشی کی شادی کی بات زبان سے نکالی تھی اور انھیں خوشی تھی کہ راحیلہ خاتون نے بریک زبان اُن کے خیال کو رد نہیں کیا بلکہ عاشی کے ذکر کو پسند کیا تھا ——— اُسے دیکھنے کی خواہش کا اظہار بھی کیا تھا ——— گفتگو کے اس آغاز پر ہی افتخار احمد بڑے پُر امید ہو گئے تھے۔ اُن کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے ——— عاشی کو اس کا کھویا ہوا مقام دوبارہ مل جائے گا ——— اپنی ماں کی بے چین روح کو قرار بھی آ جائے گا ——— اور

فائزہ کے خیال کے ساتھ ایک خیال خطرے کی گھنٹی بن کر افتخار احمد کے ذہن میں گونجنے لگا۔

عاشی ہو بہو اپنی ماں کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔

زندہ عکس تھی ———

اگر راحیلہ خاتون نے اُسے فائزہ کی نسبت سے شناخت کر لیا تو کیا ہو گا ——— ؟

کیا وہ عاشی کو بہو کی حیثیت سے قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں گی ——— ؟؟

سفید پینٹ اور چاکلیٹ کلر کی بائی نک میں وہ خوابوں کا شہزادہ ہی لگ رہا تھا۔ ناجیہ کے برابر بیٹھا وہ اپنی قسمت پر بجا طور پر فخر کر رہا تھا۔ ناجیہ کے قرب کی مہک اور اُس کے لباس سے اُٹھنے والی بھینی بھینی خوشبو نے اُس کے دل و دماغ کو معطر کر رکھا تھا ——— کل تک وہ جن باتوں کو خواب سمجھ رہا تھا آج وہ حقیقت میں اس کے سامنے موجود تھیں۔

ناجیہ کا حسین قرب ———

ناجیہ کی پیاری پیاری اور معصوم باتیں ———

اُس کے یاقوتی لبوں سے پھوٹنے والی زندگی سے بھرپور مسکراہٹیں ———

اُس کے انار جیسے گالوں پر پھوٹنے والی شفق کی شرمیلی سُرخیاں ———

اور ———

خود ناجیہ کا وجود ———

اُسے آج سب کچھ حاصل تھا لیکن جب ناجیہ نے اُسے سنجیدگی سے اپنے لئے آنے والی فراز کے رشتے کی بات سُنائی تو وہ یکلخت چونک اُٹھا، جیسے خوابوں کا تسلسل اچانک ٹوٹ گیا ہو، جیسے بلندی پر پرواز کرتے کرتے حضرت پرواز نے دم توڑ کر اُسے ایک دم ہی پستیوں کی سمت گرا دیا ہو ———

چند لمحوں پیشتر وہ ناجیہ کے ساتھ اُس کی گاڑی میں بیٹھا اپنے خیالوں کے دوش پر بہت اونچی اڑان اڑ رہا تھا مگر فراز کے تذکرے نے اُسے گنگ سا کر دیا، اُسے اپنے دل کے نہاں خانوں میں کوئی شیشہ جیسی شے ٹوٹ کر کرچیوں میں بدلتی ہوئی محسوس ہوئی اور بکھرتی کرچیوں کی چبھن نے اُسے مضطرب کر دیا۔

اُس نے آہستہ سے چہرہ گھما کر ناجیہ کو دیکھا، کتنی لاپروا نظر آ رہی تھی وہ، جیسے کوئی بات ہی نہ ہو، ایک لمحے کو اُس کا دل چاہا کہ ناجیہ سے گاڑی کی رفتار مدھم کرنے کو کہے پھر گاڑی روکوا کر آہستہ سے نیچے اُترے اور خاموشی سے گردن جھکائے نظروں سے اوجھل ہو کے اپنی راہ ہو لے

ابھی تو صرف ابتدا تھی! ——— ابھی جب اُسے ناجیہ کی دُوری کے احساس نے تڑپا دیا تھا تو آئندہ کیا ہو گا ——— ؟ کیا وہ دو قدم آگے بڑھنے کے بعد ناجیہ کی جُدائی کے صدمے کو برداشت کر سکے گا ——— کیا دوبارہ اس راستے کو اختیار کر سکے گا جو ناجیہ کو دل میں بسا لینے کے بعد وہ بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا اور ——— جب اُس کے ساتھیوں کو اُس کی بہت کا انجام معلوم ہو گا تو وہ کیا کہیں گے ؟ ——— کیا وہ اُن کے طنز کے نشتروں کو برداشت کر لے گا

کھلی فضا میں آزادی کا سانس لے سکے گا ——— ؟

نہیں ———

نہیں ——— نہیں ———

سینے کی گہرائیوں میں اُسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا تو اُس نے جلدی سے اپنی نظریں ناجیہ کے چہرے سے ہٹا لیں۔ بار بار جاگتے ہوئے اُن نظاروں کو دیکھنے لگا جو کچھ دیر پیشتر بڑے بھلے لگ رہے تھے لیکن اب ——— اب اسے وہ محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ نظارے اُس کی محبت کی حسرتوں کا جنازہ اپنے شانوں پر اُٹھائے تیزی سے بھاگے جا رہے ہوں ——— ہمیشہ کے لئے دفن کر دینے کی خاطر۔

"عدیل ——— "

ناجیہ کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ چونک اُٹھا۔

"ہوں ——— " اُس نے مُردہ سی ..... مدھم آواز میں جواب دیا۔

"کیا سوچ رہے ہو ——— "

"سوچ رہا ہوں کہ کیا میں تمہارے بغیر زندہ رہ سکوں گا۔" عدیل کے لہجے میں سنجیدگی کا کرب تڑپ رہا تھا۔

ناجیہ نے تیزی سے پلٹ کر اُس کے چہرے کو دیکھا، لمحوں کی دیر میں وہ کیسا اُداس اور اُ... تھا، ایک لمحے کو اُسے غرورِ حسن کا احساس ہوا تو اُس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی لیکن دوسرے ... عدیل کو سہارا دیتے ہوئے کہا

" اوہ ـــــ کم آن عدیل، ڈونٹ بی سو سلی، تم کہاں سے کہاں پہنچ گئے "

" یہی سوچ رہا ہوں ناجیہ ـــــ " عدیل نے پلٹ کر اُس کے وجود کو والہانہ نظروں سے تکتے ہو... دکھ بھرے لہجے میں کہا " میں اچانک کہاں سے کہاں پہنچ گیا ـــــ کل تک کیا تھا، آج کیا ہوں اور کل ...

" پلیز عدیل ـــــ میرے سامنے اس قسم کی فرسودہ اور مایوس کن باتیں نہ کیا کرو، مجھے شدید گھٹن محسوس ... لگتی ہے "

" آئی ایم سوری ناجیہ ـــــ " عدیل زہرخند سے بولا " مجھے محبت کے آداب اور رسم و رواج نہیں ... شاید فراز والی بات سننے کے بعد مجھے تمہیں مبارکباد پیش کرنی چاہیئے تھی "

" واٹ نان سنس ـــــ " ناجیہ شوخی بھرے غصے سے بولی " میں نے تمہیں اپنا سمجھتے ہوئے ایک بات ... تھی، یہ تو نہیں کہا تھا کہ میں نے فراز کے رشتے کو قبول کر لیا ہے "

" وہ ـــــ وہ تمہارا عزیز بھی تو ہے "

" ہاں آں ـــــ میرا عزیز ہے مگر مجھے عزیز نہیں ہے " ناجیہ نے بے باکی سے کہا

" کیا ـــــ کیا تم اُس کا رشتہ قبول کرنے سے انکار کر دو گی " عدیل نے سہمے ہوئے انداز میں دریافت ...

" کیوں نہیں " ناجیہ تیزی سے بولی " شادی میری زندگی کا اہم ترین مسئلہ ہے، مجھے اس کو حل کرنے کا پورا ... اختیار ہے "

" پھر ـــــ تم نے کیا فیصلہ کیا ہے " عدیل مجسم سوال بن گیا۔

" فیصلہ ابھی زیرِ غور ہے ـــــ " اُس نے عدیل پر ایک مسکراتی نظر ڈال کر گنگناتے ہوئے کہا " تمہا... شخصیت اور تمہارا خیال آڑے آ رہا ہے ورنہ ـــــ "

" ورنہ کیا ـــــ " عدیل نے تڑپ کر پوچھا۔

" ورنہ فراز بھی کچھ ایسا بُرا نہیں ہے ـــــ "

" تم چاہو تو میں تمہارے راستے سے خود کو ہٹا سکتا ہوں " عدیل کا لہجہ ٹھوس ہو گیا، ایک سرد آہ بھر کر بولا " ... ناجیہ ـــــ تمہارے ہونٹوں پر سجی مسکراہٹیں اور تمہاری خوشیاں مجھے اپنی زندگی سے زیادہ عزیز ہیں "

" سچ ـــــ " ناجیہ نے ایک ادائے دلربانہ سے عدیل کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

" یقین نہیں آتا تو آزما کر دیکھ لو ـــــ "

" تمہاری یہی باتیں تو مجھے تمہارا گرویدہ بنائے ہوئے ہیں " ناجیہ مسکرائی۔

" یہ تمہاری ذرہ نوازی ہے ناجیہ جو تم نے مجھے فرش سے اُٹھا کر عرش تک پہنچا دیا " عدیل بولا " میں ان لمحوں کو حا... زندگی سمجھ رہا ہوں لیکن ـــــ لیکن اگر یہ لمحے میری زندگی سے کٹ کر علیحدہ ہوئے تو میں ـــــ میں زندہ نہ رہ سکوں گا"

" میرے ہوتے ہوئے ایسی مایوسی کی باتیں کر رہے ہو " ناجیہ نے شکوہ کیا۔

" ناجیہ ـــــ " عدیل نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے آہستہ سے کہا " میری ماں تم سے ... چاہتی ہیں ـــــ "

" کیوں ـــــ "

" انھیں میری باتوں پر یقین نہیں آتا ـــــ وہ میری باتوں کو مذاق سمجھتی ہیں "

" مذاق کیوں ـــــ "

" پرانے وقتوں کی ہیں ـــــ اُن کا کہنا ہے کہ زمین اور آسمان کا ملاپ محض نگاہوں کا دھوکہ ہے "

" تم کیا سمجھ رہے ہو ـــــ " ناجیہ نے سپاٹ لہجے میں پوچھا " کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ـــــ "

" ہے ـــــ لیکن ڈرتا ہوں کہ اگر کسی دن یہ اعتماد متزلزل ہوا تو کیا ہوگا ـــــ " عدیل کی آ...

... دینے کی بجائے مانند سسکیاں نے لگی۔

" تم پریشان مت ہو عدیل " ناجیہ نے کچھ سوچ کر جواب دیا " اگر تمہاری خواہش ہے تو میں تمہاری ماں سے ... ملوں گی ـــــ "

" سچ ـــــ " عدیل کے چہرے پر اُمید کی کرن جھلملا اٹھی۔

" بہت جلد ـــــ دو چار دنوں کے اندر اندر "

" سچ ناجیہ سچ ـــــ کہیں میرے کان مجھے دھوکہ تو نہیں دے رہے "

" مجھ پر یقین کرو عدیل ـــــ میں تمہارے ساتھ تمہاری ماں سے ملنے ضرور چلوں گی " ناجیہ نے اپنے ... الفاظ دہراتے ہوئے کہا۔

" لیکن میرا گھر ـــــ " عدیل نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا " تم شاید اسے پسند نہ کرو ـــــ "

" یہ سب کچھ میرے اوپر چھوڑ دو ـــــ دولت میں بڑی قوت ہوتی ہے " ناجیہ نے سامنے نظر جماتے ہوئے جواب دیا " کھنکتے سکوں سے ہر شے نہایت آسانی سے خریدی جا سکتی ہے ـــــ اس کی ہیئت بھی تبدیل کی جا سکتی ہے "

" میں ـــــ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا " عدیل نے وضاحت طلب نظروں سے پوچھا۔

" فی الحال کچھ سمجھنے کی کوشش مت کرو عدیل ـــــ بس دیکھتے جاؤ " ناجیہ نے لاپروائی سے کہا پھر ... گاڑی کی رفتار تیز کر دی ـــــ !!

رحیمو نے جس ہوٹل کا پتہ دیا تھا وہاں تک پہنچنے میں ممدو کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ہوٹل کے ملازم نے اُس کی رہنمائی کمرے تک کر دی لیکن دروازے کے سامنے پہنچ کر ممدو ایک لمحے کو رک گیا۔ اُس کے سینے میں ایک عجیب سی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ جلد از جلد رحیمو کو اپنے بازوؤں کے حصار میں بھینچ لینے کے لئے مضطرب تھا۔ وہ اپنے اس رویے پر نادم تھا جو اُس نے رحیمو کے ساتھ محمود حسین کی کوٹھی پر کیا تھا۔

آج بھی اُس کی نگاہوں میں بیٹے کے چہرے پر اُبھرنے والی حسرتوں کی تصویر محفوظ تھی، جس رو کھے انداز میں ممدو نے اُس سے نظریں پھیری تھیں اُسے محسوس کر کے رحیمو کا کلیجہ ضرور پھٹ گیا ہوگا لیکن اُس نے زبان سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا، بس ایک نظر بھر کر باپ کو دیکھا پھر نظریں جھکا کر واپس لوٹ گیا تھا۔

کیسا دلگداز تھا وہ منظر۔

کیسی حسرتیں تھیں ان لمحوں میں جو موت کی طرح دبے پاؤں نہایت خاموشی سے گزر گئے تھے۔

ممدو نے اپنا دل پتھر کر لیا تھا۔

اور ——

اس پتھر سے ایک اولاد کی اُمیدیں ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی تھیں۔

کتنی طویل مدت کے بعد وہ اپنے وطن واپس آیا تھا۔

صرف اپنے باپ سے ملنے کی تمنا دل میں لئے۔

لیکن ——

ممدو نے حالات کے پیشِ نظر اُسے بے نیل و مرام واپس کر دیا تھا۔

اور آج ——

آج وہ رحیمو کے ہوٹل کے کمرے کے دروازے کے باہر کھڑا ان لمحوں کو محسوس کر رہا تھا، سوچ رہا تھا کہ نہ جانے رحیمو نے اُس کی باتوں کا کیا اثر لیا ہو —— ہو سکتا ہے وہ خفا ہو —— اپنوں کے خفا رویے نے اُس کے شیشۂ دل کو چکنا چور کر دیا ہو —— یا —— شاید اُسے باپ کی مجبوریوں کا احساس ہو گیا ہو

کچھ دیر وہ دروازے کے سامنے بُت بنا کھڑا اپنے روز و شب کا حساب کرتا رہا۔ پھر آگے بڑھ کر اُس نے دروازے پر دستک دی تو اُسکا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اندر سے اُبھرنے والی آہٹ نے اُس کے دل میں ہلچل سی مچا دی —— پھر دروازہ کھلا —— رحیمو نے باپ کو دیکھا تو بس ایک ثانیے کو اُس کی نگاہوں میں کچھ تڑپے کلبلایا "بابا" کہتا ہوا بے اختیار ممدو کے سینے سے چمٹ گیا۔

ممدو کی بوڑھی نگاہیں نمناک ہو گئیں۔ لرزتے اور کانپتے ہاتھوں سے اُس نے رحیمو کی پشت تھپتھپا کر اُسے اپنے پیار کا یقین دلایا پھر پلکوں پر ٹھہرے آنسوؤں کو اپنے دامن میں جذب کرتا قدم اٹھاتا اندر

"مجھے یقین تھا بابا کہ تم ضرور آؤ گے ——" رحیمو نے بڑی عزت سے باپ کو ایک صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا

ممدو نے اُسے نظر بھر کر دیکھا پھر کمرے کی سجاوٹ میں گم ہو گیا —— کیسا حسین اور خوبصورت کمرہ تھا وہاں کا ماحول، ہر چیز نہایت سلیقے سے اپنی جگہ رکھی ہوئی تھی، کیسا سکون اور کیسی ٹھنڈک تھی، کتنی قیمتی اور اچھی چیزیں وہاں نہایت نفاست سے سجائی گئی تھیں اور اس عالیشان کمرے میں اُسے اپنا رحیمو بالکل شہزادوں کی طرح لگ رہا تھا، ایک لمحے کو وہ ماحول کی رنگینیوں میں گم ہو گیا پھر اُس نے سوچا —— کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا

وہ ایک غریب اور بوڑھا باپ تھا لیکن اُس نے رحیمو کے لئے ہمیشہ بڑے سہانے اور اونچے دیکھے تھے، اکثر وہ خود ہی اپنے خوابوں پر شرمندہ ہو جاتا —— سوچتا، غریب کے خواب ہمیشہ خواب ہی رہتے ہیں مگر آج ان خوابوں کی حیثیت جاگتی اور مہکتی تعبیر دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا۔ دل ہی دل میں خدا کے حضور سجدہ ریز ہو کر اُس کی عنایتوں اور مہربانیوں کا شکر ادا کر رہا تھا۔ دعا مانگ رہا تھا۔

میرے معبود —— پروردگارِ عالم ——

مالکِ کون و مکاں ——

میرے رحیمو کو اسی طرح پھولوں کی سیج نصیب ہو ——

کوئی دکھ کوئی غم اُس کے قریب نہ پھٹکے ——

وہ ہمیشہ خوش و خرم رہے ——

شاد و آباد رہے ——

زندگی کی خوشیاں سدا اُس کے آنگن میں مسکراتی رہیں ——

خزاں کبھی بہاروں پر غالب نہ آنے پائے ——

وہ زندگی کی طویل شاہراہوں پر یونہی ہمیشہ مسکراتا رہے ——

ترقی کی راہوں پر گامزن رہے ——

مسرتیں اُس کی قدم بوسی کرتی رہیں ——

وہ اپنے آپ میں گم تھا، رحیمو نے آہستہ سے اس کی محویت کو توڑا

"بابا —— کیا پیو گے، قہوہ یا شربت؟"

"جو تیرا دل چاہے منگا لے" ممدو نے بڑی فراخ دلی سے کہا، آج وہ بیٹے کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا، آج تو وہ سابقہ تلخیوں کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔

رحیمو نے بیرے کو بلا کر چائے اور دیگر لوازمات کا آرڈر دیا، ممدو اُسے پیار بھری نظروں سے دیکھتا رہا، بیرا چائے لایا تو رحیمو نے خود چائے بنا کر باپ کو پیش کی، اصرار کر کے ایک ایک چیز کھلاتا رہا، پھر اُس نے باپ کو تصویروں کا وہ البم دکھایا جو خاص طور سے وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔

ممدو حیرت اور تعجب سے ان تصاویر کو دیکھتا رہا جن میں رحیمو کی ماضی کا ایک ایک لمحہ محفوظ تھا، کس طرح اُس نے کھلے آسمان کے نیچے راتیں بتائی تھیں۔ چار پیسے اکٹھا کرنے کی خاطر شب و روز محنت کی تھی، ہوٹلوں میں برتن صاف کئے تھے، مزدوری کی تھی پھر اپنا ذاتی کاروبار کیا تھا، ایک خوبصورت دفتر قائم کیا تھا جہاں وہ گھومنے والی کرسی پر نہایت شان سے بیٹھتا تھا، اُس کی حیثیت ملازم سے مالکوں جیسی ہو گئی تھی، رہنے کے لئے اُس نے اپنا ذاتی گھر بھی بنا لیا تھا۔

ممدو خوشی کے جذبوں سے سرشار رحیمو کے بیتے دنوں کی کہانی تصویروں کی زبانی سنتا رہا پھر اُس نے البم رکھتے ہوئے بڑے خلوص سے کہا

"خدا تجھے ہمیشہ خوش رکھے ——"

"بابا ——" رحیمو بڑے لاڈ سے بولا "تم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں نے کتنے پیسے جمع کر لئے ہیں؟"

"میں نے اندازہ لگا لیا ہے" ممدو نے مسکراتے ہوئے کہا "تیرے پاس ڈھیر سارے پیسے جمع ہو گئے، جبھی تو گاڑی بھی ہے تیرے پاس"

"میں اب تنہا واپس نہیں جاؤں گا" رحیمو کچھ دیر بعد سنجیدگی سے بولا "تم اور عاشی بھی میرے ساتھ چلو گے"

ممدو نے کوئی جواب نہیں دیا، ایک سرد آہ بھر کر خاموش ہو گیا۔

"تم نے ابھی تک مجھے معاف نہیں کیا ——"

"ایسا مت بول رحیمو" ممدو تڑپ کر بولا "تو میرا خون ہے، میری عمر بھر کی جمع پونجی ہے، میں بھلا تجھ سے ناراض کیسے ہو سکتا ہوں —— تیرے لئے تو میرا انگ انگ دعائیں کرتا ہے"

"پھر تم نے کوئی جواب کیوں نہیں دیا" رحیمو نے اصرار کیا "چلو گے نا میرے ساتھ ——"

"تیرو چلوں گا لیکن اگلے پھیرے میں ——"

"میں سمجھ گیا بابا —— تم اپنے رحیمو کو بہلا رہے ہو"

"تو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتا میرے لاڈلے" ممدو نے اُسے پیار کرکے سمجھانے کی کوشش کی "میں اکیلی تیرے ساتھ نہیں جاسکتا۔"

"کوئی وجہ تو ہوگی نا؟"

"ہاں ——" ممدو نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میں نے بڑی موذی اور لمبی بیماری جھیلی ہے تم تو یہاں ہوتا تو شاید رو رو کر برا حال کر لیتا —— مجھے تپ دق ہوگئی تھی۔"

"نہیں ——" رحیو چونک اٹھا "یہ تو بڑی بُری بیماری ہے بابا' ایک بار جان سے چمٹ جائے تو آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتی۔"

"مجھے کبھی اپنی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں تھا لیکن محمود میاں نے میری بیماری پر پانی کی طرح پیسہ بہایا تھے' بڑے ہسپتال میں میرا علاج ہوا تھا اور ——" "اور کیا ——"

"جو تو سچ پوچھے رحیو تو مجھے اپنی زندگی سے کوئی لگاؤ کبھی نہیں لیکن عاشی کے خیال نے مجھے قدرت سے اپنی زندگی کی بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا ——"

"بابا ——" رحیو نے شکایت کی "تمہیں میرا کوئی خیال نہیں ——"

"تو تو مجھے چھوڑ کر چلا گیا تھا رحیو —— بیچ منجدھار میں" ممدو نے ایک آہ بھر کر کہا "ایک لمحے کی جانکاہی کا خیال بھی نہ آیا تجھے —— میری ہمت ٹوٹ جاتی یا سانس نے ساتھ نہ دیا ہوتا تو اس بے چاری معصوم زندگی کا کیا بنتا" میں تم سے شرمندہ ہوں بابا —— لیکن میں جانتا تھا کہ اگر میں نے تم سے باہر جانے کی اجازت مانگی تو تم کبھی اجازت نہ دو گے اسی لئے میں دل پر پتھر رکھ کر چلا گیا مگر خدا گواہ ہے کہ اس تمام عرصے میں تمہارے یا عاشی کے خیال سے ایک لمحہ بھی بے خبر نہیں رہا —— میں نے تمہیں خطوط بھی لکھے لیکن جب جواب نہ ملا تو میں سمجھ گیا کہ تم مجھ سے خفا ہو ——"

"میں بھی اپنی جگہ لاچار و بے بس تھا" ممدو بولا "تیرے اس طرح اچانک چلے جانے سے میری کمر ٹوٹ گئی تھی!"

"تم اور عاشی محمود حسین تک کیسے پہنچ گئے" رحیو نے دریافت کیا۔

"اس مقام تک پہنچنے کے لئے مجھے بڑے پاپڑ بیلنے پڑے ہیں" ممدو نے اپنی ماضی کی داستان کو دہراتے ہوئے کہا "تیرے جانے کے بعد عاشی کا خیال مجھے شب و روز تڑپاتا تھا' نہ میں اس کو تنہا چھوڑ کر کہیں باہر نکل سکتا تھا نہ اس معصوم جان کو ساتھ لے کر محنت مزدوری کر سکتا تھا پھر ہماری پڑوسن بوا ارجمند نے میرا بڑا ساتھ دیا' اُسے شاید ننھی عاشی کی لاوارثی پر ترس آگیا تھا۔ چنانچہ وہ دن بھر عاشی کو اپنے پاس رکھتی اور میں کام کے سلسلے میں ادھر اُدھر مارا مارا پھرتا۔

قدرت مہربان تھی جو مجھے ایک دکان پر ملازمت مل گئی۔ ڈیڑھ سال تک میں وہاں کام کرتا رہا لیکن پھر عاشی کے خیال نے مجھے وہ ملازمت ترک کر دینے پر مجبور کیا —— فائدہ نے اُس کے لئے جو خواب دیکھے تھے وہ میری قلیل آمدنی میں پورے نہیں ہو سکتے تھے —— عاشی کی عمر کے ساتھ ساتھ اُس کے اخراجات بھی دوگنے ہو گئے تھے۔

میں نے دوکان کی ملازمت چھوڑ کر سوسائٹی کے ایک بنگلے میں ملازمت کر لی، خاصے شریف اور بھلے لوگ تھے، تنخواہ معقول ہونے کے ساتھ ساتھ میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ میں خوش تھا کہ زندگی ایک ڈگر پر لگ گئی ہے لیکن قسمت نے ایک نیا رُخ اختیار کیا۔

عاشی جب تین سال کی ہوئی تو بوا ارجمند اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اُس کی بہو نے عاشی کو اپنے پاس رکھنا چاہا لیکن مجھے خبر تھی کہ وہ محض دنیا دکھاوے کو اور میرا دل رکھنے کی خاطر اور میری زبان سے عاشی کی ذمہ داری قبول کرنے کی منتظر تھی خود اُسے سارا سارا دن اپنے بناؤ سنگھار میں گزر جاتا تھا' سمجھدار عاشی کی کیا نگہداشت کرتی لہٰذا میں اس معصوم کو اپنے ساتھ بنگلے میں لے گیا جہاں ایک کوارٹر میں میری رہائش تھی۔"

ممدو ایک لمحے کو سانس لینے کی غرض سے رکا پھر بولا۔

"عاشی چار سال کی ہوئی تو میں نے اُسے ایک پرائمری اسکول میں پڑھنے بھیجنا دیا۔ میرے مالک نے عاشی کے خیال سے میری تنخواہ بھی بڑھا دی —— دن بڑے سکون اور چین سے گزر رہے تھے لیکن ابھی ایک سال بھی نہیں گزرنے پایا تھا کہ خدا کا وہ نیک بندا —— میرا مالک اللہ کو پیارا ہو گیا اور اس کے چوتھے عرصے بعد مجھے بوڑھا سمجھ کر ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔

اس وقت دنیا مجھے اپنی نگاہوں میں گھومتی نظر آئی' عاشی کی نگہداشت اور اُسے اُس کی منزل تک پہنچانے کا خیال مجھے ہر لمحہ بے چین کئے رہتا —— حالات سے مجبور ہو کر میں دوبارہ اپنے مکان میں آگیا تین دن

کا راشن معصوم عاشی کے لئے ساتھ لایا تھا —— ان ہی دنوں جب میں بے حد پریشان تھا قسمت نے اچانک میری دستگیری محمود حسین صاحب کی کوٹھی تک کر دی۔ انھیں ایک تجربہ کار ماں کی ضرورت تھی اور مجھے سر چھپانے کی جگہ درکار تھی۔" ممدو ایک لمحہ کو خاموش ہو گیا' اُس کا سانس پھولنے لگا تھا' گلاس اُٹھا کر اُس نے دو گھونٹ پانی پیا پھر کسی پرسلیوبدلتے ہوئے بولنا شروع کیا۔

"سر سٹر صاحب اور اُن کی بیگم دونوں ہی مجھ پر مہربان ہو گئے۔ عاشی کو ناجیہ کا ساتھ ملا تو اس کی تربیت بھی خود ہونے لگی پھر بیگم صاحبہ نے عاشی پر مہربان ہو کر اُس کا داخلہ بھی ناجیہ کے ساتھ بڑے انگریزی اسکول میں کرا دیا اور اب —— خدا کے فضل سے وہ کالج میں پڑھنے جاتی ہے۔"

"مجھے افسوس ہے بابا کہ میری وجہ سے تم کو اتنی پریشانیوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا" رحیو نے شرمندگی کا اظہار کیا پھر پوچھا "سر سٹر صاحب کا رویہ عاشی کے ساتھ کیسا ہے؟"

"بڑا پیار کرتے ہیں وہ عاشی کے ساتھ —— بالکل اپنی اولاد کی طرح چاہتے ہیں۔"

"بابا ——" رحیو نے کچھ توقف کے بعد دریافت کیا "کیا عاشی نے مجھے بھی یاد کیا ——"

"کیسی دیوانوں جیسی باتیں کر رہا ہے" ممدو مسکرا کر بولا "ارے پگلے جب تو اُسے چھوڑ کر گیا تھا اس وقت اس معصوم کو اتنی سمجھ کہاں تھی جو وہ تجھے شناخت کر سکتی یا تیری جُدائی کو محسوس کر سکتی۔"

"اب اگر وہ مجھے دیکھے گی تو کیا سمجھے گی ——" رحیو نے بڑے لگاؤ سے پوچھا۔

"دریا کی پُرسکون سطح پر کوئی کنکری آن پڑے تو ان گنت لہریں اور بھنور پیدا ہو جاتے ہیں" ممدو نے کہا۔ "میں اسی لئے تجھے عاشی سے دُور رکھنا چاہتا ہوں —— قدرت نے اُسے اُس کی منزل تک پہنچا دیا ہے' میری محنت رائیگاں نہیں گئی' وقت کے دھاروں نے اُسے جینے کا راستہ بتا دیا ہے —— اب اگر کوئی نیا موڑ درمیان میں آیا تو وہ اُلجھ جائے گی' تو میرا خون ہے رحیو' میری بات کو سمجھنے کی کوشش کر۔"

"بابا ——"

"ضد مت کر رحیو" ممدو بڑی عاجزی سے بولا "زمانے کی گردش نے اگر تجھے عاشی کے راستے سے ہٹا دیا ہے تو اب دُور دُور ہی رہ —— تو نے قریب آنے کی کوشش کی تو اس پودے کی جڑیں ہل جائیں گی جسے میں نے اپنے خون سے سینچ کر تناور اور مضبوط بنا دیا ہے —— بنیادیں بار بار تعمیر کی جائیں تو اُن پر اونچی اور عالیشان عمارت نہیں کھڑی کی جا سکتی۔ میں تمہارے اشارے سمجھ رہا ہوں لیکن عاشی سے میرا بھی کچھ ناطہ ہے؟" رحیو نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا "میں اتنی دُور سے اس لئے تو نہیں آیا تھا کہ تم سے اور عاشی سے ملے بغیر واپس چلا جاؤں —— میں نے زندگی کی کٹھن... شاہراہوں پر اپنے قدم جمانے کے لئے بڑی سخت محنت کی ہے' میں نے جو کچھ پایا ہے' حاصل کیا ہے وہ اپنی تنہا ذات کے لئے تو نہیں کیا' اس میں تمہارا اور عاشی کا بھی حصہ ہے اور —— میں تو تم دونوں کو اپنے ساتھ لے جانے کا سوچ کر آیا تھا —— کیا تم مجھے اکیلا واپس کر دو گے؟"

"جذباتی مت بن رحیو —— میں تجھے مرنے والی کی بے چین رُوح کا واسطہ دیتا ہوں' میں نے بڑی مشکلوں سے عاشی کو اُس کی منزل کا نشان دیا ہے' وہ بہت خوش ہے —— اسے خوش رہنے دے' اگر تیری ضد سے تانے بانے اُلجھ گئے تو اس بدنصیب کی رُوح کو قیامت تک چین نصیب نہ ہوگا —— میں حشر کے میدان میں اُس کے سامنے کیا منہ لے کر جاؤں گا؟" ممدو نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا "زندگی کا سفر جو طے ہو گیا —— وہی اوپر والے کی مہربانی ہے اب کوئی زخم لگا تو میں کبھی نہ سنبھل سکوں گا۔"

"نہیں بابا —— نہیں" رحیو تڑپ کر بولا "ایسی باتیں نہ کر —— اگر تیری خوشی یہی ہے کہ میں عاشی سے نہ ملوں تو میں لوٹ جاؤں گا، ہو گا لیکن تو دل چھوٹا کرنے کی بات مت کر —— اس نگری میں تیرے سوا میرا اور کون ہے۔"

"دل چھوٹا نہ کر رحیو —— میری مجبوریوں کو سمجھنے کی کوشش کر" ممدو بولا "میرے اندر اب اتنی سکت باقی نہیں رہی کہ حالات کا مقابلہ کر سکوں۔"

"میں سمجھ رہا ہوں بابا —— سمجھ رہا ہوں۔"

رحیو نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا، اور اُٹھ کر بے اختیار باپ سے لپٹ گیا' اپنے ہاتھوں سے باپ کی آنکھوں کو خشک کیا پھر بڑی عقیدت سے اُس نے ممدو کی پیشانی کو چوم لیا —— شاید اس طرح وہ باپ کی عظمتوں کو سلام کرنا چاہتا تھا ——

!!

شام کی سیر سے وہ واپس لوٹی تو عاشی بھی اس کے ساتھ تھی۔ گہرے نیلے رنگ کے شلوار سوٹ میں اُس کی گہری سنجیدگی کچھ اور نکھر آئی تھی، عاشی نے پیازی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا لیکن اس لباس میں بھی وہ کسی تازہ گلاب کی مانند شگفتہ اور شاداب نظر آ رہی تھی۔

پورٹیکو میں دو عدد ہیا رنگ کی مرسڈیز پہلے سے موجود تھی، ناجیہ نے اُسے دیکھا تو چونک اٹھی۔

"عاشی ——" اُس نے عاشی سے پوچھا "کیا تم اس مرسڈیز کو پہچانتی ہو؟"

"کچھ خیال پڑتا ہے کہ کہیں دیکھ چکی ہوں۔"

"صرف دیکھ نہیں چکی بلکہ تم اس پر سفر بھی کر چکی ہو۔"

"کیا مطلب ——" عاشی نے تعجب سے دریافت کیا۔

"میرا اندازہ غلط نہیں تو یہ شہباز کی گاڑی ہے۔" ناجیہ بولی "ایک دو بار وہ کالج بھی اسی گاڑی پر آ چکا ہے۔"

"یاد آیا مجھے ——" عاشی نے جلدی سے کہا "اس روز بارش والے دن کبھی شہباز کے پاس یہی گاڑی تھی۔"

ناجیہ نے ایک نظر گاڑی پر ڈالی پھر لمبے لمبے قدم اٹھاتی اندر داخل ہوئی، شرفو کو آواز دی تو وہ تیر کی طرح بھاگتا ہوا اُس کے سامنے آ گیا۔

"ڈیڈی کہاں ہیں ——"

"ڈرائنگ روم میں۔" شرفو جلدی سے بولا "کسی مہمان سے بات چیت کر رہے ہیں۔"

"نام کیا ہے مہمان کا ——"

"نام —— جی —— وہ —— مجھے نہیں معلوم۔"

"دفع ہو جاؤ ——" اُس نے گھور کر دیکھا تو شرفو نظریں جھکا کر اُلٹے قدموں واپس ہو گیا۔

"ہو سکتا ہے شہباز ہی ہو۔" عاشی نے کہا "ممکن ہے انکل کے پاس کسی مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں کوئی مشورہ لینے آیا ہو۔"

"یو آر رائٹ۔" ناجیہ نے ایک ادائے دلربانہ سے سر کو جھٹک کر آوارہ زلفوں کو پشت کی سمت اچھالتے ہوئے کہا "تمہارا اندازہ سو فیصد درست ہے —— موصوف یقیناً کسی پہاڑ کے نیچے اکیلا چوکڑی بھول گئے ہوں گے اور اب ڈیڈی کی شہرت سے فائدہ اٹھانے کی خاطر یہاں دوڑے چلے آئے۔"

"شہباز کے بارے میں تمہاری رائے زیادہ اچھی نہیں معلوم ہوتی۔" عاشی مسکرائی۔

"کیا مطلب ——" ناجیہ نے پوچھا "کیا تم اس کے بارے میں کوئی مناسب رائے رکھتی ہو؟"

"ہاں —— میرا خیال ہے کہ شہباز جو کچھ نظر آتا ہے اُس کے بالکل برعکس ہے۔" عاشی روانی میں دل کی بات زبان تک لے آئی پھر ناجیہ کی چبھتی نظروں کا خیال آیا تو جلدی سے بات بناتے ہوئے بولی "ہو سکتا ہے میرا خیال غلط ہو۔"

"آؤ میرے ساتھ۔" ناجیہ نے سنجیدگی سے کہا "ابھی معلوم ہو جاتا ہے کہ مسٹر پُراسرار ڈیڈی کے پاس کس غرض سے آئے ہیں۔"

چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی وہ عاشی کو ساتھ لئے ڈرائنگ روم میں پہنچی تو ایک بار پھر چونک اٹھی، باپ کے ساتھ ماں کو بھی وہاں بے تکلفی سے بیٹھا دیکھ کر اُسے حیرت ہی ہوئی تھی، سامنے رکھی میز پر چائے اور پھل فروٹ کے برتن نہایت سلیقے سے موجود تھے۔

شہباز محمود حسین کے سیدھے ہاتھ والے صوفے پر ایک شانِ بے نیازی سے بیٹھا کسی بات پر زیرِ لب مسکرا رہا تھا، شارک اسکن کے سفاری سوٹ میں اُس کی شخصیت اس وقت بڑی پُروقار نظر آ رہی تھی، ناجیہ اور عاشی ڈرائنگ روم میں ماں کی موجودگی پر غور ہی کر رہی تھی کہ محمود حسین نے اُسے دیکھ لیا، بڑے پیار سے بولے

"آؤ ناجیہ —— آؤ، دیکھو تو سہی آج ہمارے گھر کون آیا ہے؟"

شہباز نے ناجیہ کا نام سُنا تو پلٹ کر ایک نگاہِ غلط انداز اُس پر ڈالی پھر اسی شگفتہ انداز میں مسکرا دیا۔

ہوا اُٹھ کھڑا ہوا، ناجیہ اور عاشی نے اپنی اپنی نشست سنبھال لی تو وہ بھی اپنے صوفے پر دوبارہ بیٹھ گیا۔

"میں ان سے بخوبی واقف ہوں ڈیڈی۔" ناجیہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں باپ سے کہا "اتفاق سے ہماری کلاس میں ہیں۔"

"شہباز مجھے بتا چکے ہیں۔" محمود حسین نے مسکراتے ہوئے کہا "لیکن اب جو بات میں تمہیں بتاؤں گا وہ تم

سے زیادہ حیران کن ہو گی؟"

"میں ہمہ تن گوش ہوں ڈیڈی۔" ناجیہ نے بدستور تیکھے لہجے میں کہا۔

"تم کو اپنے وہ سرفراز انکل یاد ہیں جو تین چار سال پہلے ہمارے ہاں آ کر دو روز کے لئے ٹھہرے تھے؟"

"خوب اچھی طرح یاد ہیں۔" ناجیہ بولی "مگر آپ نے بتایا تھا کہ دو سال پہلے ——"

"ہاں بیٹی ——" محمود حسین نے گلوگیر لہجے میں کہا "سرفراز میرا اگری دوست تھا، بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہم نے تین سال تک ایک ہی ہوسٹل میں قیام کیا تھا، میں اس عرصے میں سرفراز کو محض ایک طالب علم کی حیثیت سے جانتا تھا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ جواہرات کا بہت بڑا تاجر بھی ہے اور بیرسٹری محض پلنے کو میں اٹھانے کی خاطر پڑھ رہا تھا —— وہ اداروں کی جائیداد کا مالک تھا لیکن نہایت سادہ زندگی گزارنے کا عادی تھا۔ غرور اور تکبر تو اُس کی طبیعت میں نام کو بھی نہیں تھا۔"

"آپ نے شاید پہلے بھی ان باتوں کا تذکرہ کیا تھا۔" ناجیہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ہاں —— تمہاری ماں سے میں اکثر اپنے دوست کا ذکر کیا کرتا تھا کیونکہ وہ صرف میرا دوست ہی نہیں بلکہ میرا محسن بھی تھا۔" محمود حسین نے بیتی باتوں کو یاد کرتے ہوئے کہا "ایک موقع پر اگر اس نے میری مدد نہ کی ہوتی تو شاید میرا مستقبل اتنا تابناک نہ ہوتا، خدا اُسے غریقِ رحمت کرے، بڑی ہی پُرخلوص طبیعت اور خوبیوں کا مالک تھا۔"

"اور یہ شہباز میاں تمہارے اُن ہی مرحوم انکل کے اکلوتے بیٹے ہیں۔" شمسہ بیگم نے بات کو مختصر کرنے کی خاطر شہباز کا تعارف کرایا تو ناجیہ کے علاوہ عاشی نے بھی شہباز کو غور سے دیکھا جو اپنی نشست پر نظریں جھکائے کسی سوچ میں گم نظر آ رہا تھا۔ "اوہ ——" ناجیہ نے اپنی نشست پر پہلو بدلتے ہوئے کہا "بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر —— مسٹر شہباز؟"

"ہم جماعت کی حیثیت سے ہم پہلے ہی سے ایک دوسرے کے واقف ہیں۔" شہباز نے سر اٹھا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں ——" ناجیہ نے سپاٹ انداز میں جواب دیا "یہ بھی اچھا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے پہلے سے واقف ہیں، ویسے مجھے یہ جان کر تعجب ہوا کہ آپ سرفراز انکل کے صاحبزادے ہیں؟"

"اس تعجب کی کوئی وجہ بھی ہو گی ——" شہباز نے بڑے نرم لہجے میں پوچھا۔

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے سرفراز انکل بہت سیدھے سادے اور سادہ لوح انسان تھے۔" ناجیہ کے انداز میں طنز تھا۔ "اور میں اُن کے برعکس ہوں۔" شہباز نے ہنستے ہوئے کہا "آپ شاید یہی کہنا چاہتی تھیں ——"

"ہو سکتا ہے میرا اندازہ غلط ہو لیکن عام اسٹوڈنٹس کی یہی رائے ہے کہ آپ بڑی پُراسرار شخصیت کے مالک ہیں۔" ناجیہ نے نہایت صاف گوئی سے جواب دیا۔

"کیا آپ کا بھی یہی اندازہ ہے ——"

"کچھ کچھ ——" ناجیہ نے بڑی بے تکلفی سے کہا "مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ آپ کسی بڑے باپ کے اکلوتے بیٹے ہیں اور دولت کی فراوانی نے آپ کو کسی خاص وجہ سے پُراسرار بننے پر مجبور کر دیا ہے۔"

"خیال ہے آپ کا ورنہ —— بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب، تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں۔" شہباز نے بڑی سادگی سے غالب کا شعر پڑھتے ہوئے کہا "بات صرف اتنی ہے مس ناجیہ کہ میں خود پسندی اور خود نمائی کو اچھا نہیں سمجھتا، ممکن ہے اسی وجہ سے میرے دوست مجھے پُراسرار تصور کر بیٹھے ہوں۔"

"اب تو آپ بہرحال میرے گروپ میں شامل ہو جائیں گے۔" ناجیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"میں پہلے بھی آپ کے گروپ سے باہر تو نہیں ہوں۔" شہباز نے دبی زبان میں کہا پھر کنکھیوں سے عاشی کو دیکھنے لگا۔

کچھ دیر تک رسمی باتیں ہوتی رہیں۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ شہباز محمود حسین کے ایک دیرینہ اور پرانے دوست کا بیٹا ہے ناجیہ اس سے بہت جلد ہی کھل مل گئی، لیکن عاشی ابھی تک خود کو لئے دیئے بیٹھی تھی، البتہ وہ اس بات پر بے حد مسرور تھی کہ شہباز کا تعلق ایک شریف اور اونچے گھرانے سے ہے۔ شہباز کے بارے میں جو رائے اپنے ذہن میں قائم کر رکھی تھی اُسے محمود حسین کی اطلاع نے بڑی تقویت پہنچائی تھی۔

"شہباز میاں ——" محمود حسین نے کچھ توقف کے بعد پوچھا "کراچی میں تمہارا قیام کہاں ہے ——"

"ڈیڈی نے یہاں ایک چھوٹا سا ریسٹ ہاؤس بنا رکھا تھا اسی میں مقیم ہوں۔"

"تمہارے علاوہ اور کون رہتا ہے وہاں؟"

"ایک پرانا بوڑھا ملازم بھی ہے جو میری ضرورتوں کا خیال رکھتا ہے۔"

"گویا تم بالکل تنہا رہتے ہو؟" شمسہ بیگم نے کہا

"جی ہاں ——— لیکن مجھے آج تک کبھی کسی تکلیف کا احساس نہیں ہوا"

"تمہارے ساتھ کوئی اور عزیز دار کیوں نہیں رہتا" شمسہ بیگم نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا

"قریب کے رشتے دار خدا کو پیارے ہو چکے ہیں اور دُور کے رشتے داروں سے میں ہمیشہ پناہ مانگتا ہوں" شہباز نے مسکرا کر بڑی سادگی سے جواب دیا۔

"ہمیں تم کیا سمجھتے ہو؟" شمسہ بیگم نے پہلو بدل کر سوال کیا۔

"آپ کا شمار میں نے والد مرحوم کے حکم کے بموجب بزرگوں میں کیا ہے"

"پھر ایک بزرگ کی موجودگی کے باوجود تم تنہا کیوں رہتے ہو؟"

"یہ ہوئی نا بات ———" محمود حسین نے بیوی کی تائید کرتے ہوئے تیزی سے کہا "جب تم ہمیں اپنا بزرگ سمجھتے ہو تو اس گھر پر تمہارا بھی حق نکلتا ہے پھر یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ اپنا گھر ہوتے ہوئے تم کسی دوسری جگہ تنہا پڑے رہو——— میں تو کہتا ہوں کہ ابھی دو ایک ملازموں کو ساتھ لے جاؤ اور اپنا سامان اٹھا کر یہاں آجاؤ"

"میں ابھی دو کمرے خال کرائے دیتی ہوں" شمسہ بیگم بولیں "تمہیں ہمارے یہاں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی بلکہ گھر جیسا آرام ملے گا"

شہباز نے کہا۔ "میں آپ لوگوں کی اس محبت کا تہہ دل سے ممنون ہوں لیکن اتنی جلدی کوئی آخری فیصلہ نہیں کر سکتا"

"اس میں بھلا فیصلہ کرنے کی کیا بات ہے؟" شمسہ بیگم نے کہا "ہم تمہارے لئے کوئی غیر تو نہیں ہیں؟"

"بہر حال ———" محمود حسین نے شہباز کو بچکچاتے دیکھ کر کہا "سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانا بڑی اچھی عادت ہے اس لئے میں تم کو سوچنے کا موقع دیتا ہوں لیکن اس شرط پر کہ تم غور و خوض کرنے میں زیادہ وقت ضائع نہیں کرو گے"

"میں آپ کی محبت اور عنایت کے لئے بے حد ممنون ہوں انکل" شہباز نے نہایت ادب سے جواب دیا۔

"ڈیڈی ———" ناجیہ نے مسکرا کر باپ سے پوچھا "اگر شہباز صاحب نے زیادہ وقت لیا تو آپ کا کیا فیصلہ ہوگا؟"

"یہ وقت آنے پر ہی بتایا جائے گا" محمود حسین مسکرا کر بولے "عدالت کی کارروائی ہمیشہ خفیہ اور راز رہنی چاہیئے اور خاص طور پر عدالتی فیصلوں کا علم تو فریقین کو کسی قیمت پر بھی قبل از وقت نہیں ہونا چاہیئے"

"فیصلے کے خلاف اپیل کی کوئی گنجائش ہوگی یا نہیں" ناجیہ نے شہباز کو دیکھتے ہوئے باپ سے دریافت کیا۔

"کیوں شہباز میاں ——— کیا تم میرے فیصلے کے خلاف اپیل کرو گے" محمود حسین نے بڑے پیار سے شہباز سے پوچھا۔

"اوّل تو میں ایسی گستاخی کی جسارت نہیں کر سکتا اور پھر اپیل کرنے سے کوئی مثبت حاصل ہونے کی توقع بھی نہیں ہے اس لئے کہ آنٹی پہلے ہی اپنا فیصلہ سنا چکی ہیں" شہباز نے شمسہ بیگم کی جانب دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

"بہت خوب ———" محمود حسین نے بے ساختہ قہقہہ لگاتے ہوئے کہا پھر بیوی کو دیکھتے ہوئے بڑی انکساری سے بولے "نہایت ذہانت کا ثبوت دیا ہے تم نے شہباز میاں ——— بلکہ یوں کہو کہ میرے فیصلے کی تصدیق بھی تمہاری آنٹی ہی کریں گی اس لئے کہ اُن کی تصدیق کے بغیر میرا کوئی فیصلہ قانونی شکل اختیار کر ہی نہیں سکتا"

"بس رہنے دیجئے" شمسہ بیگم قدرے شرما کر بولیں "آپ تو یوں کہہ رہے ہیں جیسے اس گھر میں میری مرضی کے خلاف کوئی پتہ بھی اِدھر سے اُدھر نہیں ہوتا"

"بچے کی بات تو خیر میں نہیں جانتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں ہمیشہ آپ کے اشاروں پر غور کرتا رہا ہوں"

"ہٹئے بھی ——— کچھ بچوں ہی کا خیال کر لیجئے" شمسہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا پھر کام کا بہانہ کر کے اندر چلی گئیں تو محمود حسین نے بھی بچوں میں بیٹھنا مناسب نہیں سمجھا۔

"آپ نے پہلے کبھی ذکر نہیں کیا کہ ڈیڈی اور آپ کے خاندان کے پرانے مراسم ہیں" والدین کے جانے کے بعد ناجیہ نے پوچھا۔

"پہلے اس کی ضرورت نہیں پیش آئی تھی" شہباز نے سنبھل کر جواب دیا۔

"آج کیا خاص ضرورت پیش آگئی جو ادھر کا راستہ بھول گئے"

"انکل سے ایک کاروباری مشورے کی غرض سے حاضر ہوا تھا"

"اوہ ——— گویا آپ تعلیم کے حصول کے ساتھ ساتھ تجارت بھی کرتے ہیں؟"

"جی ہاں ——— دو وقت کی روٹی کی خاطر انسان کو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے"

"آپ سمجھ اکساری سے کام لے رہے ہیں"

"میں سمجھا نہیں ———"

"میں جانتا ہوں کہ آپ کا تعلق ارب پتی خاندان سے ہے"

"ڈیڈی بتا چکے ہیں کہ آپ کا تعلق ارب پتی خاندان سے ہے"

"اور پردے کی خبر بانی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے"

"یہ تو ہے لیکن آپ اتنی دولت جمع کس کے لئے کریں گے" ناجیہ نے شوخی سے کہا "کالج کے احاطے کے اندر تو آپ کو "بنجر" کا خطاب بھی مل چکا ہے"

"زیادہ زرخیز رہنے والے اکثر اسکینڈل کا شکار ہو جاتے ہیں" شہباز نے دبی زبان میں کہا پھر مسکرا کے بولا۔ "میں بھی دوسروں کی طرح انسان ہوں اور انسانی ضرورتوں کو نظر انداز نہیں کرتا ———"

"گویا آپ بھی زرخیز ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں" ناجیہ نے قدرے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"جی ہاں ——— اس لئے کہ گاڑی محض ایک پہیئے پر نہیں چل سکتی"

"بہت خوب ———" ناجیہ بولی "آج تو آپ کے بہت سارے نئے پہلو بھی سامنے آرہے ہیں، کالج میں اس قدر پُراسرار بنے رہنے کی وجہ دریافت کر سکتی ہوں ———؟"

"وقت کی بربادی سے بچنے کے سوا اور کوئی خاص بات نہیں ہے"

"تنہا زندگی گزارتے ہوئے آپ کو بوریت نہیں ہوتی" ناجیہ نے کہا "میں تو اگر کچھ دیر تنہائی کا شکار ہو جاؤں تو جی اُلٹنے لگتا ہے"

"اپنا اپنا خیال ہے ——— ویسے میں اتنا تنہا بھی نہیں ہوں جتنا آپ خیال کر رہی ہیں" شہباز نے اس بار معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک دل آویز مسکراہٹ اُبھر آئی۔

"کیا مطلب ———" ناجیہ چونکی "کیا کوئی دوسرا بیتہ بھی آپ کی نہائیوں میں داخل ہو چکا ہے"

"جی ہاں ——— لیکن ابھی وہ میرے ذہن تک محدود ہے"

"یوں کہئے کہ ابھی آپ صرف خوابوں سے دل بہلا رہے ہیں"

"خواب نہیں ——— حقیقت کہئے مس ناجیہ ———"

"میں پوچھ سکتی ہوں کہ وہ کون ہے ———" ناجیہ نے تکلفی سے سوال کیا "اپنوں سے کیا پردہ"

عاشی بدستور خاموش بیٹھی ناجیہ اور شہباز کی گفتگو سن رہی تھی۔ شہباز نے ناجیہ کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اچانک اُس سے خاموشی کی وجہ پوچھی تو وہ ایک لمحے کو بوکھلا سی گئی، یوں جیسے چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں گرفتار کر لی گئی ہو، پھر اُس نے بڑی تیزی سے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"مجھے آپ دونوں کی باتوں میں زیادہ لطف آرہا ہے"

"میں کچھ اور سمجھ رہا تھا ———" "کیا ———" وہ بے اختیار سوال کر بیٹھی

"یہی کہ آپ نے شاید ابھی تک میرے سلسلے میں اپنی وہ رائے تبدیل نہیں کی جو کالج کے اکثر طالب علموں نے قائم کر رکھی ہے"

"میری رائے پہلے بھی دوسروں سے مختلف تھی" عاشی جلدی سے بولی "اگر مجھے آپ پر اعتماد نہ ہوتا تو اس روز آپ کے ساتھ بارش میں کبھی نہ آتی ———"

"طوفانی حالات میں انسان کو مجبوراً ابھی دوسروں پر اعتماد کرنا پڑتا ہے" شہباز نے کہا پھر جلدی سے بولا "اس روز اگر آپ نے مجھ پر اعتماد نہ کیا ہوتا تو شاید آج میں یہاں نہ ہوتا"

"کیا مطلب ———" ناجیہ یکلخت چونک اٹھی، شہباز کا وہ جملہ اُسے بہت گہرا محسوس ہوا تھا۔

"میرا خیال تھا کہ انکل سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد ملاقات کروں گا لیکن اس روز آپ کی کوٹھی تک آکر احساس ہوا کہ اپنا کچھ سامان وہیں رکھ لیا جائے اُن سے دور نہیں رہنا چاہیئے"

عاشی کا دل اچانک شہباز کے جملے پر دھڑک اٹھا، جانے کیوں اُسے معاً یہ خیال آیا کہ شہباز نے جو کچھ اُسے سنانے کی خاطر ساخت کیا ہے ——— چونک کر اُس نے بھرپور نظروں سے شہباز کو دیکھا لیکن اُس کا چہرہ جذبات کی ترجمانی سے یکسر عاری تھا ——— اُس نے خود کو سرزنش کی ——— جانے اُس کی سوچوں نے کیا سمجھ لیا تھا، دُزدیدہ نظروں سے اُس نے ناجیہ کو دیکھا پھر سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"میں بھی آپ کے خیال سے متفق ہوں۔" ناجیہ نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔
"آپ کا کیا خیال ہے ——" شہباز پھر اچانک عاشی سے مخاطب ہو گیا۔
"کس سلسلے میں ——" وہ جان بوجھ کر انجان سی بن گئی۔
"بہت خوب ——" شہباز مسکرا کر بولا "میں تو آپ کو اسی ڈرائنگ روم میں موجود سمجھ رہا تھا۔ آپ شاید کہیں اور گم ہیں ——"
"جی نہیں ——" اُس نے جلدی سے صفائی پیش کی "ایسی کوئی بات نہیں ——"
"میں اپنے اندازے کی غلطی پر شرمندہ ہوں۔" شہباز کیلخت سنجیدہ ہو گیا پھر چونک کر ناجیہ سے "آپ نے ابھی تک مس عاشی کا تعارف نہیں کرایا —— آپ کی کلاس فیلو ہیں —— یہ بات مجھے پہلے سے معلوم اس کے علاوہ دیگر کوائف کیا ہیں ——؟"
"ممی اور ڈیڈی نے عاشی کو اپنی منہ بولی بیٹی بنا رکھا ہے —— ویسے حقیقت یہ ہے کہ یہ ہمارے ساتھ پہلے پہل، مرونٹ کوارٹرز میں تشریف لائی تھیں پھر ترقی کرتے کرتے ہماری انکسی تک آ گئیں۔" ناجیہ نے جملہ دیدہ دانستہ عاشی کی اصلیت کو بے نقاب کرنے کی خاطر کہے تھے۔
عاشی ناجیہ کی صاف گوئی پر گھبرائی نہیں، صرف مسکرا کر رہ گئی۔ شہباز نے سنجیدہ نظروں سے ایک نظر دیکھا پھر عاشی سے مخاطب ہو کر بولا
"آپ —— ممدو بابا کے ساتھ یہاں تشریف لائی تھیں۔" "جی ہاں ——" عاشی نے ٹھوس آواز میں جواب
"کیا آپ ممدو بابا سے واقف ہیں۔" ناجیہ نے چونک کر سوال کیا
"جی ہاں ——" شہباز نے بڑی سنجیدگی سے کہا پھر لاپروائی سے بولا "آج ہی تعارف ہوا ہے۔ یہ اتفاقاً ٹکرا گئی تھی ——"
"آپ نے یہاں آنے کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے۔" ناجیہ نے باتوں کا رُخ تبدیل کرتے ہوئے
"ڈیڈی آپ کو آسانی سے نہیں بخشیں گے۔"
"کیا آپ بھی یہی چاہتی ہیں کہ میں آپ کی کوٹھی میں مہمان بن کر آ جاؤں ——" شہباز نے ناجیہ کی نگاہوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔
"آف کورس ——" ناجیہ نے تیزی سے جواب دیا "آپ آ جائیں گے تو بڑا لطف رہا کرے گا ——"
"اور آپ کا کیا مشورہ ہے۔" شہباز نے ایک بار پھر عاشی سے اُس کی مرضی دریافت کی۔
"اگر ناجیہ کی خواہش ہے تو آپ ضرور تشریف لے آئیں۔" وہ مسکرا کر بولی
"کیا خیال ہے آپ کا مسٹر شہباز —— ایک ایک کپ چائے اور پی لی جائے۔" ناجیہ نے اپنی نشست کسمساتے ہوئے پوچھا۔
"جیسی آپ کی مرضی ——"
"عاشی —— ذرا تم جا کر اپنے ہاتھوں سے اچھی سی چائے بنا لاؤ۔"
ناجیہ نے پلٹ کر عاشی سے کہا تو وہ خاموشی سے مسکراتی ہوئی اٹھی اور چھوٹے چھوٹے قدم ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی، اُسے احساس ہو گیا تھا کہ ناجیہ اُسے وہاں سے ہٹانا چاہتی تھی شاید اس کے دل کے برابر کی نہیں تھی —— یا —— پھر اس لئے کہ وہ شہباز کی توجہ صرف اپنے لئے مخصوص رکھنے کی خواہش
"آپ دونوں گھر پر شاید ساتھ ہی اسٹڈی کرتی ہیں۔" شہباز نے عاشی کے جانے کے بعد پوچھا
"جی ہاں ——" ناجیہ نے سپاٹ آواز میں جواب دیا "ممی اور ڈیڈی کے بے حد اصرار پر میں ساتھ ہی پڑھتی ہوں۔"
"آپ انکل کو خالو یا پاپا کہتی ہیں ——"
"کبھی کبھی ڈیڈی یا ڈیڈی بھی کہہ لیتی ہوں۔" ناجیہ مسکرائی "آپ نے تو آتے ہی یہاں کی چھان

بین کر دی ہے —— اور کیا کیا معلوم کر لیا ہے ——"
"ابھی تو ابتدا کی ہے ——"
شہباز نے آہستہ سے جواب دیا پھر اُس دروازے کی جانب دیکھنے لگا جدھر سے گزر کر عاشی باہر گئی تھی۔

ممدو کو شام کی چائے دے کر وہ کالج کا کام کرنے کے ارادے سے بیٹھی ہی تھی کہ باہر ہارن کی آواز سُن کر اُس کے گداز ہونٹوں پر ایک معصوم مسکراہٹ پھیل گئی۔
"عاشی ——" ممدو نے آواز دی "ذرا دیکھ تو جا کر کون آیا ہے —— ناجیہ بی بی تو نہیں ہیں۔"
"دیکھتی ہوں بابا ——"
وہ کتاب بند کر کے باہر جانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے باپ پر اپنے شبہے کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اُسے یقین تھا کہ آنے والا اقبال کے سوا اور کوئی نہ ہو گا۔ پہلی بار وہ افتخار احمد کے ساتھ آیا تھا تو اُسے جانے کی جلدی پڑی تھی لیکن عاشی سے متعارف ہو جانے کے بعد وہ تنہا بھی دو تین بار کسی نہ کسی بہانے سے چکر لگا چکا تھا۔
عاشی اُس کی نگاہوں کا مفہوم سمجھتی تھی، وہ جانتی تھی کہ اقبال بار بار کیوں وہاں آتا ہے لیکن اس نے ان باتوں کا کبھی برا نہیں منایا تھا شاید اس لئے کہ اقبال نے ابھی تک خود کو اپنے خول کے اندر ہی محدود کر رکھا تھا، گفتگو کرتے ہوئے بھی وہ بے حد محتاط اور مہذب رہتا۔ کبھی کبھی چور نظروں سے عاشی کی سمت دیکھتے ہوئے اس کی اور عاشی کی نگاہوں کا اچانک تصادم ہو جاتا تو وہ بوکھلا جاتا، جلدی سے گھبرا کر ممدو سے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیتا۔
بظاہر وہ بے حد نیک اور شریف نظر آتا تھا، ممدو اکیلے میں بھی کئی بار اُس کے گن گا چکا تھا لیکن عاشی نے ہمیشہ اپنی زبان بند ہی رکھی، وہ جانتی تھی کہ اگر کبھی اُس نے بھولے سے اقبال کے سلسلے میں ممدو کی باتوں کی تائید کر دی تو اس کا مفہوم کچھ اور ہی ہو گا —— اسی لئے وہ جان بوجھ کر ایسے موقعوں پر یا تو چپ رہتی یا پھر بڑی خوبصورتی سے کوئی اور بات چھیڑ کر اقبال کے ذکر کو پس پشت ڈال دیتی۔
افتخار احمد سے پہلی ملاقات میں وہ اُن کے حُسنِ اخلاق اور بزرگانہ شفقت سے بے حد متاثر ہوئی تھی اور اسی رشتے سے وہ اقبال کے ساتھ بھی ہنس بول لیا کرتی تھی —— اس سے آگے اُس نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔
راہداری سے گزر کر وہ باہر آئی تو اقبال اُس کے سامنے ہی سائبان کے نیچے موجود تھا، حسبِ معمول پھولوں کی ٹوکری بھی اُس کے ساتھ تھی جو اُس کے بیان کے مطابق وہ اپنے باپ کے حکم پر ممدو کے لئے لانا ضروری سمجھتا تھا۔
عاشی نے مسکراتی نظروں سے اُسے خوش آمدید کہا
"ممدو بابا کی طبیعت اب کیسی ہے۔" اقبال نے عاشی کو دیکھ کر جلدی سے پوچھا۔
"اب تو خدا کے فضل سے بہت بہتر ہے۔"
"پرسوں لاہور سے والد صاحب کا خط آیا تھا اور ——"
"آپ کو سختی سے تاکید کی گئی تھی کہ فوری طور پر جا کر ممدو بابا کی خیر خیریت دریافت کرو اور واپسی ڈاک سے صورتِ حال سے آگاہ کرو ——" عاشی نے جملہ پورا کر دیا۔
"جی ہاں —— ڈیڈی نے یہی لکھا تھا لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا۔" اقبال نے تعجب سے پوچھا۔
"آپ شاید بھول رہے ہیں —— پچھلی بار بھی افتخار انکل نے اسی مضمون کا خط لکھا تھا۔" عاشی مسکرا کر بولی
"جی —— جی ہاں" اقبال نے چونک کر کہا پھر شرمندہ سا نظر آنے لگا
"اندر آ جائیے نا ——"
"میں مخل تو نہیں ہوا ——"
"جی نہیں ——" وہ دروازے کے سامنے سے ہٹتے ہوئے بولی "تشریف لائیے۔"
ممدو نے اُسے دیکھا تو بستر پر کسمساتے ہوئے بولا
اقبال پھولوں کی ٹوکری اُٹھائے اندر داخل ہوا تو عاشی بھی زیرِ لب مسکراتی اُس کے ساتھ ساتھ

"تم نے پھر تکلیف کی ——— اتنے ڈھیر سارے پھل فروٹ کی کیا ضرورت تھی؟"

"ڈیڈ کا حکم تھا کہ میں خالی ہاتھ نہ آؤں۔" اقبال نے بڑی انکساری سے کہا پھر ممدو کے اشارے پر کرسی پر بیٹھ گیا۔

عاشی نے مسکراتے ہوئے دوسری کرسی سنبھال لی۔

"خدا خوش رکھے تمہارے والد کو ——— اُن کو خط لکھنا تو میرا اسلام بھی ضرور لکھ دینا۔" ممدو نے کہا۔

"لیکن آئندہ اتنے پھل نہ لانا۔ پڑے پڑے سڑنے لگتے ہیں۔"

"کیوں ——— کیا آپ کو پھل پسند نہیں؟"

"وہ تو ہیں بیٹے لیکن اتنے سارے پھل میں کیسے کھا سکتا ہوں۔"

"گھر میں آپ کے علاوہ اور لوگ بھی تو ہیں۔" اقبال نے کہا پھر جلدی سے بولا "میرا مطلب ہے کہ یوں دو چار پھل ہاتھوں میں لئے چلے آنا بھی تو اچھا نہیں لگتا ———"

"آپ کیا پینا پسند کریں گے۔" عاشی نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا "چائے یا شربت ———"

"رہنے دیجئے ——— زحمت ہوگی آپ کو۔"

"اس میں زحمت کیسی" ممدو نے کہا پھر عاشی سے بولا "جا بیٹی ——— اچھی سی چائے بنالا، شربت ابھی موسم نہیں آیا۔"

وہ چائے تیار کر کے ٹرالی سجائے واپس آئی تو اقبال باتوں میں مصروف تھا، گفتگو اسی پڑھائی کے متعلق تھی اور ممدو اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق اقبال کو اُس کی تعلیم کے بارے میں بتا رہا تھا۔

"میرے بارے میں چھان بین ہو رہی تھی شاید۔" عاشی نے چائے بناتے ہوئے اقبال سے کہا تو وہ ہنس پڑا۔

"جی ہاں ——— میں آپ کے تعلیمی مشاغل کے بارے میں دریافت کر رہا تھا" وہ کرسی پر پہلو بدل کر بولا "آپ کو پڑھائی میں کوئی دشواری تو نہیں ہوتی ———"

"دشواری؟ ——— میں سمجھی نہیں آپ کا مطلب؟"

"میرا مقصد یہ تھا کہ بغیر ٹیوٹر کے آپ تمام مضامین تیار کر لیتی ہیں؟"

"اوہ ———" عاشی اُس کا مطلب سمجھ کر مسکرا دی، چائے کا کپ اُس کی سمت بڑھاتی ہوئی بولی "نہ کسی طرح گزارا کر لیتی ہوں، جو چیز سمجھ میں نہیں آتی وہ ناجیہ یا پھر کالج میں کسی دوسری ہم جماعت سے ڈسکس کر لیتی ہوں۔"

"اگر آپ چاہیں تو میں بھی آپ کی تھوڑی بہت مدد کر سکتا ہوں۔" اقبال نے بڑی سنجیدگی سے خدمات پیش کیں۔

"میرے اور آپ کے مضامین میں بڑا فرق ہے ورنہ ——— "

"بہرحال انگریزی اور اردو تو میں نہایت آسانی سے پڑھا سکتا ہوں۔" اقبال نے جلدی سے کہا

"تمہیں بلاوجہ تکلیف ہوگی اقبال میاں۔" ممدو بولا

"اس میں بھلا تکلیف کی کیا بات ہے۔" اقبال نے انکساری کا مظاہرہ کیا پھر دبی زبان میں کہا "آپ سمجھتے ہیں تو اور بات ہے ورنہ مجھے عاشی صاحبہ کو پڑھانے میں مطلق کوئی دشواری یا زحمت نہیں ہوگی۔"

"انگریزی تو میری خدا کا شکر ہے کہ ٹھیک ٹھاک ہے البتہ اُردو شاعری میری سمجھ میں نہیں آتی۔" عاشی ہنسی ضبط کرتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا "اگر آپ ہفتے میں ایک دو دن مجھے اُردو شاعری پڑھا دیا کریں تو نوازش ہوگی۔"

"کیوں نہیں ——— آپ جب سے چاہیں میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

"میر کے بارے میں آپ کا خیال ہے ———"

"میر تقی میر کی شاعری بھی اپنی جگہ مناسب ہے لیکن میرے خیال میں مرزا غالب کے کلام میں زیادہ

ہے۔"

"تمام استادوں نے تو میر تقی میر ہی کو غزل گوئی کا بے تاج بادشاہ کہا ہے۔" عاشی نے بڑے بھولپن سے کہا۔

"تمام نہیں بھی اُردو شاعری میں اپنا ایک علیحدہ مقام رکھتے ہیں ——— کم از کم میں نے کتاب میں یہی پڑھا ہے۔"

"درست پڑھا ہے آپ نے لیکن اپنا علیحدہ ایک مقام بنا لینا میر کے نزدیک ———"

"سمجھ گئی ———" عاشی نے اقبال کے جملے کو کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا "میر کو غالباً دوسرے ہم عصروں کے ساتھ مل جل کر قدم بڑھانا چاہیئے تھا، مساوات کے اصولوں پر۔"

"آپ ——— آپ شاید مجھے بنانے کی کوشش کر رہی ہیں۔" اقبال نے عاشی کے جملوں میں پوشیدہ ظرافت کو محسوس کرتے ہوئے کہا پھر وضاحت کرتے ہوئے بولا "دراصل میں آپ کو یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ میر محض اپنی ذات کا شاعر تھا، اُس نے جو کچھ کہا ہے صرف اپنے لئے کہا ہے، دوسروں نے میر کے درد و غم کو جمع کر کے دیوان ..... مرتب کر دیا۔"

"کیوں ——— دوسروں کو بھلا اس کی کیا ضرورت تھی۔" عاشی نے سادگی سے سوال کیا۔

"اس لئے کہ میر کے اشعار غزل کے معنوی اعتبار سے بے مثل تھے ———"

"پھر آپ غالب کو میر پر سبقت کیوں دیتے ہیں ——— کیا صرف اس لئے کہ غالب کے معنی حاوی ہوتے ہیں؟"

"اب سمجھ گیا میں۔" اقبال نے چائے کی پیالی رکھتے ہوئے مسکرا کر کہا

"کیا ———"

"آپ شاید میرا امتحان لے رہی ہیں۔"

"یہ کیسے اندازہ لگایا آپ نے ———" عاشی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"آپ کی ذہانت کو محسوس کرنے کے بعد ———" اقبال نے اُس کے سراپا کو بہت غور سے دیکھتے ہوئے کہا "میرا یقین ہے کہ آپ اُردو شاعری میں کمزور نہیں ہیں ———"

"اقبال میاں، اسے کچھ آتا جاتا ہے یا تم یونہی تعریف کر رہے ہو۔" ممدو نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"تعریف نہ کروں گا تو ٹیوشن فیس اتنی اچھی چائے کیسے ملے گی۔" اقبال نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

عاشی بھی اس جملے پر مسکرا دی پھر وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ شرفو نے اندر داخل ہو کر بتایا کہ شمسہ بیگم اسے فوری طور پر یاد کر رہی ہیں ——— چار و ناچار وہ معذرت طلب کرتی ہوئی اٹھی اور شرفو کے ساتھ ہو لی۔

اقبال کی مشتاق نگاہوں نے دروازے تک اُس کا تعاقب کیا تھا ———!

✱ ✱

شمسہ بیگم نے اپنی دستی گھڑی پر نظر ڈالی تو انھیں وقت کا اندازہ ہوا۔

شاپنگ کرتے کرتے انھیں چار بج گئے تھے، عید آنے سے دو ماہ پیشتر ہی وہ تمام تیاریاں مکمل کر لینے کی عادی تھیں تاکہ عین وقت پر بھیڑ بھاڑ میں نہ بھگتنا پڑے۔ چنانچہ آج وہ ایک طویل فہرست سامان کی مرتب کر کے شرفو اور بوڑھے ڈرائیور کے ساتھ نکل پڑی تھیں۔

اُن کا ارادہ تھا کہ شاپنگ کے بعد کچھ دیر کے لئے شائستہ بیگم کی طرف بھی ہو لیں گی لیکن وقت کا اندازہ ہونے کے بعد انھوں نے شائستہ بیگم کی طرف جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور ڈرائیور کو کوٹھی واپس چلنے کی ہدایت کرتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئیں، شرفو سامان کے پیکٹ اور ڈبے ایک ایک کر کے گاڑی کے پچھلے حصے میں رکھ رہا تھا۔

"جلدی کر شرفو ——— دیر ہو رہی ہے۔" شمسہ بیگم نے شرفو کو آواز دی۔

"ابھی آیا بیگم صاحبہ ———"

شرفو نے جلدی جلدی ہاتھ چلانا شروع کر دیا، ڈکی بند کر کے واپس آیا تو شمسہ بیگم نے پوچھا۔

"دکان سے سارا سامان گن کر اٹھا لیا تھا نا ——— کوئی پیکٹ بھول تو نہیں گئے ———"

"کل سامان گیارہ عدد تھا بیگم صاحبہ ——— میں نے خود گن گن کر اٹھوایا ہے۔" بوڑھے ڈرائیور نے جواب

دیا پھر گاڑی کھلی سڑک پر لے آیا۔

شمسہ بیگم اطمینان کا سانس لیتی ہوئی نشست کی پشت سے ٹک گئیں' بازار میں دو تین گھنٹے گزارنے کے سبب وہ خاصی تھک گئی تھیں' ہوا کا تروتازہ جھونکا ان کے چہرے سے ٹکرایا تو طبیعت تر و تازہ ہو گئی لیکن اُن کا سکون زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکا' صدر بازار کے بڑے چوراہے سے گھومتے ہوئے اُن کی نظر ناجیہ کی گاڑی پر پڑی جو کیفیٹیریا کے سامنے رک رہی تھی۔

شمسہ بیگم چونک کر اپنی نشست پر سیدھی ہو گئیں' اُن کے دل کی دھڑکنیں یکلخت تیز ہو گئیں' ناجیہ کسی لڑکے کے ساتھ مسکراتی ہوئی گاڑی سے اُتر رہی تھی پھر گاڑی بند کر کے وہ دونوں کیفیٹیریا کی طرف گئے' شمسہ بیگم اس سے زیادہ نہ دیکھ سکیں' ٹریفک کے ہجوم میں دونوں جوڑے اُن کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

"ڈرائیور ——— گاڑی روکو" اُن کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

بوڑھے اور تجربے کار ڈرائیور نے نہایت احتیاط اور چابک دستی سے گاڑی ایک سمت کر کے فٹ پاتھ کے کنارے روک دی۔

"کوئی چیز خریدنے سے رہ گئی ہے کیا" شرفو نے سوالیہ نظروں سے شمسہ بیگم کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں ———"

شمسہ بیگم نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا' اُن کی طبیعت کا انتشار بڑھتا جا رہا تھا' ناجیہ کو کسی اجنبی کے ساتھ دیکھ کر اُن کے دل کو شدید صدمہ ہوا تھا' اسی اچانک دھچکے کے سبب انھوں نے گاڑی روکنے کا حکم دیا تھا' لمحے کو اُن کے ذہن نے یہی مشورہ دیا تھا' وہ ناجیہ سے باز پُرس کرنے میں دیر نہ کریں لیکن پھر انھوں نے سوچا

ناجیہ جوان ہو چکی ہے ———

خود سر ہے ———

آزاد خیال ہے ———

آزادی اور خود مختاری کا جذبہ اُس کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے ———

زبان کے معاملے میں بھی وہ بیباک تھی ———

شمسہ بیگم کی باز پرس پر اگر وہ پلٹ کر کوئی سخت جواب دے بیٹھی تو وہ بھرم بھی ٹوٹ جائے گا جو ماں بیٹی درمیان اب تک قائم تھا ———

لیکن ———

وہ مرد کون تھا ———

ناجیہ سے اُس کا کیا تعلق تھا ———

کوئی ہم جماعت ———

یا.....

"بیگم صاحبہ ———" بوڑھے ڈرائیور نے شمسہ بیگم کا عکس شیشے میں دیکھتے ہوئے پُرتشویش لہجے میں پوچھا "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ———"

"کیا ہوا میری طبیعت کو ———" ڈرائیور کے سوال نے شمسہ بیگم کو چونکا دیا' اپنے راز کو وہ دوسرے پر آشکار کر کے جگ ہنسائی کا سامان نہیں فراہم کرنا چاہتی تھیں' خود کو سنبھالتے ہوئے بولیں "کیا پوچھا تھا تم نے"

"آپ نے گاڑی روکنے کا حکم دیا تھا" ڈرائیور نے کنکھیوں سے آئینے میں دیکھا' شمسہ بیگم کا پریشان چہرہ اُلجھے اور بھٹکتے خیالات کی ترجمانی کر رہا تھا۔

پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلملا رہے تھے ———

آنکھوں کی چمک ماند ماند سی نظر آ رہی تھی۔

چہرے کی وہ شگفتگی اور شادابی جو ایک لمحے پیشتر قائم تھی اچانک غائب ہو گئی تھی۔

نگاہوں میں الجھن تھی ———

ہونٹوں کی سُرخی اچانک ہی بے جان سی ہو کر رہ گئی تھی۔

چہرہ سپاٹ سپاٹ ——— دھواں دھواں ہو گیا تھا ———

کیوں ———؟

آخر کیوں ———؟

کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور رہی ہو گی ———!!

"جی ——— ہاں ———" شمسہ بیگم نے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے جلدی سے کہا "مجھے چکر سا آ گیا تھا ——— تھکن کی وجہ سے ہوا ہو گا" ڈرائیور نے اپنا خیال ظاہر کیا پھر بولا "ڈاکٹر صاحب کا مطب نزدیک ہی ہے ترتاب صاحب تو انھیں دیکھا دیں؟"

"نہیں ———" شمسہ بیگم نے ملول سانس لیتے ہوئے جواب دیا "ایسی تشویش کی کوئی بات نہیں ہے"

"برف میں لگی ہوئی بوتل لاؤں بیگم صاحبہ؟" شرفو نے پوچھا۔

"نہیں گھر چلو ———" شمسہ بیگم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

ڈرائیور نے گاڑی دوبارہ چلائی تو شمسہ بیگم نے پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں لیکن ذہن بدستور ناجیہ اور اس نوجوان کے بارے میں اُلجھ رہا تھا۔

شمسہ بیگم کا خیال تھا کہ دادی کی موت کے بعد اُن کی تعلیم اور صحبت کا اثر ناجیہ کے دل و دماغ سے رفتہ رفتہ زائل ہو جائے گا' اسی لئے انھوں نے ناجیہ پر کسی قسم کی سختی یا دباؤ ڈالنے کے بجائے اُس سے لطف و کرم کا دوستانہ رویہ برقرار رکھا تھا' وہ ماں کی ممتا کا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں' انھیں یقین تھا کہ ناجیہ وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ نئے سانچوں میں ڈھل جائے گی' اُس کے ذہن سے دادی کی تربیت کے وہ زہریلے جراثیم ختم ہو جائیں گے جس نے ناجیہ کے معصوم ذہن میں والدین کی طرف بغاوت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔

لیکن شمسہ بیگم کا خیال غلط ثابت ہوا۔

انھوں نے اکثر و بیشتر محمود حسین کو اس ذمہ داری کا احساس دلانے کی کوشش کی تھی کہ ناجیہ بچپن کے مدوجزر پھلانگ کر جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھ رہی ہے' اُس کی تربیت پر خاص توجہ دی جائے ——— محمود حسین نے بھی ناجیہ کے سلسلے میں اپنا برتاؤ بہت نرم کر رکھا تھا۔

شمسہ بیگم نے اس بات کی بھی مخالفت کی تھی کہ ناجیہ کو علیحدہ گاڑی لے کر دی جائے لیکن محمود حسین نے بیوی کی اس بات کو بھی ہنس کر ٹال دیا اس لئے کہ خدا نے اُن کو دولت سے نواز رکھا تھا اور وہ اولاد کے معاملے میں کنجوسی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتے تھے' لیکن اُن کی یہی دریا دلی آج شمسہ بیگم کے لئے ایک طوفان کا رُخ اختیار کر گئی تھی۔

ناجیہ کی آزاد خیالی نے شمسہ بیگم کے وجود کو جھنجھوڑ کر لرزہ براندام کر دیا تھا۔

ماں کی ممتا میں ہیجانی اُبال پیدا کر دیا تھا ———

تڑپ اُٹھنے پر مجبور کر دیا تھا ———

اس لئے کہ آج اُن کا اعتماد ٹوٹ گیا تھا ———

ریزہ ریزہ ہو کر منتشر ہو گیا تھا ———

اور ان ریزوں کی کرچیاں ایک ممتا بھرے دل کو زخمی کر گئی تھیں ———

شمسہ بیگم سوچ رہی تھیں۔

اگر ناجیہ کو اب بھی نہ روکا گیا تو اس کی آزادی کا انجام کیا ہو گا ———؟

بربادی ———

رسوائی ——— جگ ہنسائی ———

اگر ناجیہ کے غیر مردوں کے ساتھ میل ملاپ کے چرچے عام ہو گئے تو ———؟

کیا وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل رہیں گی

اس آمارت کا کیا ہو گا جو سکوں کی جھنکار پر برقرار تھی

اس عزت اور ساکھ کا کیا حشر ہوگا جو برسوں میں قائم کی گئی تھی
کیا آمارت، عزت اور شرافت کا بھرم بدنامی اور رسوائیوں کے باوجود قائم رہ سکے گا۔
نہیں ——— !
نہیں ——— !!
نہیں ——— !!!

وقت کی ایک ہی کروٹ اور ناجیہ کی آزادی کے ایک ہی رُخ نے آج شمسہ بیگم کی پُرسکون زندگی میں ہلچل پیدا کر دی تھی، انھیں کسی پل چین نصیب نہیں ہو رہا تھا آنے والے لمحات اور مستقبل کے بارے میں اور جتنا سوچتیں اتنا ہی مضطرب اور بے چین ہوتی جا رہی تھیں، اُلجھتی جا رہی تھیں ——— دولت کی فراوانی آج انھیں کانٹوں کی سیج محسوس ہو رہی تھی ——— عزت اور شہرت کا بھرم سراب نظر آ رہا تھا اور وقت کی رفتار جیسے اچانک تھم کر رہ گئی تھی، منجمد ہو گئی تھی۔

گھر پہنچ کر شمسہ بیگم تیزی سے گاڑی سے اُتریں اور لمبے لمبے قدم اُٹھاتی سیدھی اپنی خوابگاہ میں چلی گئیں، اُن کے ذہن میں آندھیوں کے بگولے اُٹھ رہے تھے، وہ ناجیہ کے مستقبل کے بارے میں بے حد ہراساں تھیں، جو کچھ اُن کی نگاہوں نے ایک بار دیکھ لیا تھا وہی بہت تھا، وہ اُس کا کوئی مناسب اور معقول حل ڈھونڈ رہی تھیں۔

انھیں جوان بیٹی کے مستقبل کا خیال پریشان کر رہا تھا ———
شوہر کی عزت اور ساکھ کا بھرم خوفزدہ کئے ہوا تھا ———
خاندان کی شرافت کا وقار برقرار رکھنے کا سوال ابھر رہا تھا ———

ناجیہ نے آج انھیں زندگی کی ایک ایسی موڑ پر لا کھڑا کیا تھا جہاں حالات نے انھیں بے بس اور بالکل تنہا کر دیا تھا ——— وہ ان باتوں کا تذکرہ شوہر سے بھی نہیں کر سکتی تھیں اس لئے کہ محمود حسین ممکن تھا کہ جذبات کی فراوانی میں مشتعل ہو کر کوئی ایسا قدم اُٹھا لیتے جو پورے خاندان کو خس خاشاک کر دیتا۔

بے بسی کے اسی احساس نے شمسہ بیگم کو نڈھال کر دیا تھا ——— بے دست و پا کر دیا تھا، اتنا مجبور کر دیا تھا کہ وہ خود اپنی کوکھ سے جنم لینے والی اولاد سے بھی نہیں پوچھ سکتی تھیں کہ اُس نے اپنے لئے غلط راستوں کا انتخاب کیوں کیا ہے؟ اُن کی بازپرس جوان اولاد کو مزید بے راہ روی پر اکسا سکتی تھی ——— اور خود سر کر سکتی تھی۔ حالات اور بگڑ کر اُن کے قابو سے بالکل باہر بھی ہو سکتے تھے ———

شمسہ بیگم ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتی رہیں، خیالوں میں محو خواب گاہ میں بچھے دبیز قالین پر ٹہلتی رہیں۔ اُن کے ذہن میں ایک ہی خیال رہ رہ کر اُبھر رہا تھا ———

ناجیہ کی شادی کیوں نہ کر دی جائے ———

ڈھولک کی تھاپ پر اُبھرنے والے خوشیوں کے گیت اور شہنائیوں کی گونج میں خطروں اور وسوسوں کا وہ احساس بڑی آسانی سے دفن ہو سکتا تھا جو کسی زہریلے ناگ کی مانند پھن کا ڑھے کھڑا ایک کھیلتے آباد گھر کی خوشیوں کو ڈس لینے کے لئے اچانک اُبھر آیا تھا ——— !!

✻ ——— ✻

ناجیہ کیفیٹیریا سے کافی پی کر باہر نکلی تو اُس کا موڈ خاصا خوشگوار تھا۔

آج اُس نے عدیل کے بے حد اصرار پر اُس کے گھر جانے کا پروگرام بنایا تھا، دوپہر سے شام میں ہلکا ہلکا دھندلکا تھا اس لئے اُس نے راستے میں رک کر کافی پی لینی مناسب سمجھی تھی ——— اسے صدیقہ بیگم کے گھر والوں کے لئے مٹھائی بھی خریدنی تھی ——— بزرگوں سے اُس نے یہی سنا تھا کہ کسی کے گھر پہلی بار جائیں تو خالی ہاتھ نہیں جاتے ———

عدیل نے دبی زبان میں مٹھائی خریدنے کی مخالفت کی تھی لیکن ناجیہ نے اُس کی بات نہیں مانی بلکہ عدیل کو مزید اپنے احسانوں کے بوجھ تلے دبانے کی خاطر اُس نے مٹھائی کے علاوہ پھلوں کا ایک قیمتی ٹوکرا بھی خرید لیا۔

کیفیٹیریا سے نکل کر وہ گاڑی میں بیٹھنے لگی تو کسی نے پشت سے اُس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ چونک کر پلٹی تو بے اختیار مسکرا دی، عطیہ زبیر کے ساتھ کھڑی اُسے معنی خیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

عدیل گاڑی کی دوسری جانب مسمسی صورت بنائے کھڑا تھا، عطیہ نے اُس پر اچٹتی نظر ڈالتے ہوئے ناجیہ سے کہا

"آئی سی ——— تو معاملہ کیفیٹیریا تک پہنچ چکا ہے، مبارک ہو"

"تھینکس ———" ناجیہ بے باکی سے مسکرا دی پھر زبیر کو دیکھتے ہوئے بولی "تم سناؤ کیسی گزر رہی ہے"۔

"بہت بُری ———" عطیہ نے کڑوا سا منہ بنا کر کہا "زبیر کے گھر والے جان کو آ گئے ہیں"

"کیا مطلب ———" ناجیہ نے چونک کر پوچھا "کوئی مخالفت آڑے آ رہی ہے"

"مخالفت ہوتی تو پھر رونا کس بات کا تھا" عطیہ نے اس بار شوخی سے جواب دیا "یہاں تو موافقت اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ مجھے تو کالج کی پڑھائی بھی مشکل نظر آ رہی ہے"

"کیوں زبیر صاحب ———" عطیہ سے نظر ہٹا کر ناجیہ نے زبیر سے پوچھا۔

"کیا عرض کروں" زبیر نے نہایت انکساری سے کہا "امی جان کو خدا جانے کیوں یہ آپ کی سہیلی کچھ زیادہ ہی پسند آ گئی ہیں چنانچہ وہ انھیں کالج سے نکال کر گھر کی چار دیواری میں قید کرنا چاہتی ہیں"

"اتنی جلدی کیا ہے ——— اس بے چاری کو تعلیم تو مکمل کر لینے دیجئے ———"

"قطعاً نہیں ———" زبیر نے عطیہ کو پیار بھری نظروں سے تکتے ہوئے کہا "موسم اور لڑکیوں کے موڈ کا بھلا کیا بھروسہ، جانے کب تبدیل ہو جائے ——— اس لئے میں نے چٹ منگنی پٹ بیاہ پر عمل کرنا زیادہ مناسب خیال کیا ہے"

"کیا خیال ہے ———" عطیہ نے کہا "ایک کافی کا کپ ہمارے ساتھ بھی ہو جائے ———"

"نہیں ——— میں ذرا جلدی میں ہوں، پھر سہی"

"تمہاری مرضی ——— ویسے تم نے جانور اچھا سدھایا ہے، وش یو گڈ لک" عطیہ نے آخری جملہ سرگوشی سے کہا پھر مسکراتی ہوئی کیفیٹیریا میں چلی گئی۔

زبیر نے بڑی گرمجوشی سے عدیل کے ساتھ مصافحہ کیا تھا۔

ناجیہ نے گاڑی آگے بڑھائی تو بس ایک لمحے کو اُس کے ذہن میں یہ خیال اُبھرا کہ اُسے عدیل کے ساتھ اس طرح کسی ہوٹل یا کیفے میں تنہا نہیں آنا چاہیئے تھا، کسی نے دیکھ لیا تو مفت کی بدنامی ہوگی ——— لیکن پھر اُس نے سر کی خفیف جنبش سے اس فرسودہ خیال کو اپنے ذہن سے نکال دیا ——— ریڈیو آن کیا تو اتفاق سے گلوکارہ کی ایک خوبصورت غزل نشر ہو رہی تھی

؎ "غمِ عاشقی سے کہہ دو رہِ عام تک نہ پہنچے
مجھے خوف ہے یہ تہمت مرے نام تک نہ پہنچے"

وہ غزل کے بول سُن کر دل ہی دل میں مسکرا دی۔ ذرا پہلو بدل کر عدیل کو دیکھا جو خاموش بیٹھا سامنے سڑک پر بہتے ٹریفک کے دھارے پر نظریں جمائے کھویا ہوا تھا۔

"کس سوچ میں گم ہو ———"

"یوں ہی ——— اپنی خوش قسمتی پر غور کر رہا تھا۔ عدیل نے ناجیہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"خوش قسمتی ..... کس بات کی؟"

"آپ۔ میرے ساتھ میرے گھر جو چل رہی ہیں"

"اس میں خوش قسمتی کی ایسی کیا بات ہے ———"

"یوں نہیں ———" عدیل بولا "کہاں آپ اور کہاں میں ———"

"سورج کی روشنی میں خواب دیکھنا بڑی بات ہے" اُس نے شوخی سے کہا "سُنا ہے اچھے بھلے خواب شعلوں کی تپش سے پگھل کر اپنی تردتازگی کھو دیتے ہیں"

"آپ کی طرح آپ کی باتیں بھی بڑی خوبصورت ہوتی ہیں"

"پلیز عدیل ——" وہ شرارت بھرے لہجے میں بولی "مجھے یہ فلمی مکالمے سُن کر اُبکائی سی آنے لگتی ہے"

"میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کی؟"

"پھر بھی —— مجھے اپنی تعریف سننے کا کچھ زیادہ شوق نہیں ہے"

راستے بھر وہ عدیل کو چھیڑتی رہی، سرکا درد اب نام کو بھی نہیں تھا لیکن جب اُس نے چمکتی جھلملاتی گاڑی ایک تنگ سی گلی میں موڑی تو اُس کا موڈ یکلخت خراب ہوگیا، عدیل اُس کی ہر ادا سے واقف تھا، راستہ کچھ دُور جا کر کشادہ ہوگیا مگر چھوٹے موٹے نیم پختہ سے بے ترتیب اور بے ہنگم مکان دیکھ کر اُس کا دل بیٹھنے لگا پھر اُس نے عدیل کے اشارے پر ایک ایسے مکان کے سامنے گاڑی روک دی جس کے کھلے دروازے پر پرانا سا بوسیدہ پردہ اُسے اپنا مذاق اُڑاتا نظر آرہا تھا۔

عدیل کی خاطر دل پر جبر کر کے وہ گاڑی سے نیچے اُتر آئی، ٹاٹ کے پردے کے قریب سے گزرتے ہوئے اُسے کا شدید احساس ہوا لیکن وہ برداشت کر گئی، کچے صحن کے ساتھ برآمدے میں ایک بوڑھی مگر سلجھی ہوئی خاتون سفید اُجلی ساڑھی میں ملبوس اُس کے استقبال کو تیار کھڑی تھیں۔ عدیل نے تعارف کراتے ہوئے کہا

"ناجیہ —— یہ میری امّی ہیں"

"خوشی ہوئی آپ سے مل کر" ناجیہ نے اخلاقاً مسکرانے کی کوشش کی۔

"جیتی رہو بیٹی" عدیل کی ماں نے اُسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا پھر ایک مختصر سے کمرے میں لے گئی جو صاف ستھرا ہونے کے باوجود اپنی تنگ دستی کا اعلان کر رہا تھا۔ ناجیہ خود کو لئے دیئے ایک کرسی پر بیٹھ گئی، کچے فرش کی سیلن پورے کمرے میں رچی بسی تھی۔

عدیل کچھ دیر ماں اور ناجیہ کے پاس بیٹھ کر باہر چلا گیا تو ناجیہ نے ماحول پر ایک نظر ڈالتے ہوئے پوچھا

"یہاں اور کون رہتا ہے ——"

"صرف میں اور عدیل ——" معمر خاتون نے دبی زبان میں کہا "عدیل میرا اکلوتا لڑکا ہے چار بہنوں میں یہی ایک سہارا باقی بچا ہے ——"

"اور عدیل کے والد ——"

"وہ اولاد کے شاندار مستقبل کے لئے خوشیاں خریدنے کی خاطر اپنوں کو چھوڑ کر پردیس جا بسے کمانے گئے"

"عدیل بے حد ہونہار اور اچھا اسٹوڈنٹ ہے" ناجیہ نے عدیل کی ماں کے لہجے کی کسک کو محسوس کرتے ہوئے کہا "مجھے یقین ہے کہ وہ آپ لوگوں کو مایوس نہیں کرے گا"

"خدا کرے ایسا ہی ہو ——" بوڑھی خاتون نے ایک سرد آہ بھر کر کہا تو ناجیہ چونکے بغیر نہ رہ سکی۔

"کیا آپ عدیل سے خوش نہیں ہیں؟" اُس نے دبی زبان میں پوچھا۔

"عدیل میرا خون ہے بیٹی —— مجھ سے زیادہ اُسے کون جان سکتا ہے" بزرگ خاتون نے ناجیہ کے لباس اور بناؤ سنگھار کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا "مجھے عدیل سے بڑی اُمیدیں وابستہ ہیں لیکن وہ ضرورت سے زیادہ حساس اور نیک ہے"

"میرا بھی یہی اندازہ ہے ——"

"اس کا دل بڑا حساس ہے —— چھوٹی چھوٹی باتوں کا بڑا گہرا اثر لے بیٹھتا ہے اور ایسے لڑکے جو ضرورت سے زیادہ حساس ہوں زندگی کی راہوں پر بڑی جلدی بھٹک جاتے ہیں" عدیل کی ماں کے لہجے میں حسرتیں بول رہی تھیں۔

"آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں ——" ناجیہ نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"میری باتوں کا بُرا نہ ماننا بیٹی، تم بڑے گھر کی لڑکی ہو اور ہم لوگ غریب اور سیدھے سادے لوگ ہیں، دو ٹوک باتیں کرنے کی عادت ہے" عدیل کی ماں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا پھر تھوڑے توقف سے بولیں "عدیل تمہارے سلسلے میں بڑے اونچے اونچے خواب دیکھنا شروع کر دیئے ہیں —— دن رات تمہارا تذکرہ کرکے خوش ہوتا ہے —— تمہارے برتاؤ نے اُس کی سوچوں کو بدل دیا ہے لیکن —— ایسے جذباتی اور حساس لڑکوں کی

زندگی اکثر پامال ہو جاتی ہے تو وہ تمام زندگی محرومیوں کا شکار رہتے ہیں —— یوں بھی ہم غریبوں کے پاس آنسوؤں اور آہوں کے سوا اور کیا ہوتا ہے ——"

ناجیہ گنگ سی رہ گئی —— چپ چاپ بیٹھی اپنے خیالوں میں گم رہی، عدیل کی ماں نے ایک نظر اُس کے چہرے کے تاثرات پر ڈالی پھر پہلو بدل کر سیدھے سادے نرم لہجے میں بولیں

"میں میری باتیں ناگوار گزری ہوں تو معاف کر دینا —— میں تمہاری طرح تعلیم یافتہ تو نہیں ہوں لیکن زندگی نے جو تجربے عنایت کئے ہیں انہی کی روشنی میں پھونک پھونک کر قدم اٹھانے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے"

"میں آپ کے ساتھ نہیں کہہ سکتی کہ تمہارے اور عدیل کے میل ملاپ کی نوعیت کیا ہے لیکن ایک ماں ہونے کے رشتے سے محسوس کر رہی ہوں کہ عدیل تمہیں اپنی زندگی، اپنی دنیا سمجھ بیٹھا ہے —— اور ——"

"میں عدیل کی کلاس فیلو ہوں" ناجیہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے چونک کر کہا "ہمارے درمیان صرف دوستی کا رشتہ استوار ہے اور اسی دوستی کے ناطے میں عدیل کی ترقی کی خواہشمند ہوں —— میں اُسے زندگی کے امتحانوں میں سرفراز دیکھنا چاہتی ہوں"

"اور اس کے بعد —— اس کے بعد کیا ہوگا؟"

"مستقبل کا انحصار وقت اور حالات پر ہوتا ہے" وہ کھوس آواز میں بولی

"لیکن جذبوں کو اگر ٹھیس پہنچے تو دل ٹوٹ جاتا ہے ——"

"میں سمجھی نہیں ——" ناجیہ نے پوچھا

"میں —— تمہارے اور عدیل کے مستقبل کے بارے میں دریافت کرنا چاہتی ہوں ——"

"یہ سوچنا میرے بزرگوں کا کام ہے ——" ناجیہ نے اپنا دامن بچاتے ہوئے جواب دیا۔

"بلند عمارت کی تعمیر کا اُس کی بنیادوں سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے ——"

"جی ——" ناجیہ چونک اُٹھی، اُس کا چہرہ جانے کیوں تمتما کر سرخ ہوگیا۔

"بیٹی —— میں تم سے ایک درخواست کر رہی ہوں" عدیل کی ماں نے ممتا بھرے لہجے میں کہا "اگر تم اپنے ارادوں میں پختہ ہو تو اور بات ہے —— ورنہ —— عدیل کو کھل کر بتا دو کہ وہ ریت کی بنیادوں پر سنگ مرمر کی تعمیر کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے ——"

"آپ کا کیا خیال ہے —— کیا میری دوستی عدیل کے حق میں فائدہ مند نہیں" ناجیہ تلملا کر بولی، "تم آج کی بات کر رہی ہو اور میں —— کل کے بارے میں خوف زدہ ہوں"

"پھر ——" اُس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے پوچھا "اس میں قصور کس کا ہے ——"

"ہماری غربت اور ہمارے حالات کا ——" عدیل کی ماں نے ایک تلخ حقیقت کا اعتراف بڑی نرمی سے کیا پھر ناجیہ کے چہرے پر بدلتے رنگوں کی کرختگی کو محسوس کرتے ہوئے نہایت شفیق اور ملائم لہجے میں بولیں "میری باتوں پر پھر کسی وقت ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنا —— ویسے مجھے خوشی ہے کہ تم عدیل کے لئے ہمارے غریب خانے تک آگئیں —— آرام سے بیٹھو بیٹی —— یہاں تکلف کا کیا کام ——"

ناجیہ اندر ہی اندر جھلس کر رہ گئی، اُس نے تیکھی نظروں سے بوڑھی خاتون کو دیکھا —— کچھ کہنا چاہتی تھی مگر عدیل کے آجانے سے اُس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا —— پہلو بدل کر عدیل کی جانب دیکھا جو ٹرے میں چائے کے میلے کچیلے برتن اور کچھ دیگر لوازمات سجائے بڑے خلوص اور احترام سے اُس کے سامنے کھڑا تھا بڑے اہتمام سے اُس نے خود اپنے ہاتھوں سے کیا تھا —— ناجیہ کی پذیرائی کی خاطر اُس نے اپنے تئیں بڑی تگ و دو کا ثبوت دیا تھا —— ناجیہ نے عدیل کو سرتاپا بہت غور سے دیکھا پھر اُس کے خستہ ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ رینگ اُٹھی۔

تبسم —— جس کے اندر فتح کا احساس ہمک رہا تھا۔ برتری کا نشہ چھلک رہا تھا ——

ایک ماں کا ممتا بھرا دل اُس تبسم کی اوٹ میں چھپے طوفانوں کی شدتوں کو محسوس کر کے لرز اُٹھا ——

!!

محمود حسین آج بڑے خوشگوار موڈ میں تھے۔

آج وہ اپنا ایک پرانا کیس جیتے تھے، انھیں اس مقدمے کی جیت کی اُمید بہت کم تھی لیکن ایک مجبور و بے کس بیوہ کو اُس کا حق دلانے کی خاطر اُنھوں نے اس کیس میں پوری جان لگادی تھی چنانچہ جب فیصلہ اُن کے حق میں نکلا تو اُن کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

کھانے کی میز پر بھی وہ اسی مقدمے کی روداد سُناتے رہے لیکن اپنی خوابگاہ میں جانے کے بعد انھیں پہلی بار اچانک احساس ہوا کہ شمسہ بیگم نے اُن کی خوشی پر کسی مسرت کا اظہار نہیں کیا، گم صم بیٹھی رہی تھیں اس وقت کبھی وہ نہ جانے کن سوچوں میں گم تھیں۔

"سنئے ——" محمود حسین نے انھیں بڑے پیار سے آواز دی

"جی ——" شوہر کی آواز سُن کر وہ چونک اُٹھیں جلدی سے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر محمود حسین کی جانب متوجہ ہوگئیں۔

"آپ آج خلافِ توقع بہت کھوئی کھوئی سی نظر آرہی ہیں —— خیریت تو ہے؟"

"شاپنگ کے لئے بازار گئی تھی، اُس کی تکان باقی ہے"

"اور کوئی خاص بات تو نہیں ——" محمود حسین نے بیوی کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے بڑی دلچسپی سے دریافت کیا۔

"اور کیا بات ہوسکتی ہے ——؟"

"یہی تو میں آپ سے دریافت کر رہا ہوں"

شمسہ بیگم نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا، ناجیہ کا خیال انھیں اس وقت بھی پریشان کئے تھا لیکن وہ جلد بازی میں کوئی ایسی بات زبان سے نہیں نکالنا چاہتی تھیں جسے سُن کر محمود حسین بھڑک اُٹھے اور سدھرنے کے بجائے اور خراب ہوجائے۔

اُن کا خیال تھا کہ وہ کسی وقت موقع محل دیکھ کر نہایت سکون سے شوہر سے اس ضمن میں بات کریں گی اور ناجیہ کی بے راہ روی کی داستان سنانے کے بجائے انھیں اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کریں گی جتنی جلدی ممکن ہو ناجیہ اور فراز کی شادی کی بات پکی کردی جائے اور کوئی چھوٹی موٹی ایسی رسم بھی ادا کردی جس سے لوگوں کو اس بات کا علم ہوجائے کہ ناجیہ کسی اور کی امانت ہوچکی ہے۔

"آپ کو میری قسم ——" محمود حسین نے بیوی کو خاموش پایا تو بے حد نرم لہجے میں بولے "دل پر جو بوجھ ہے اُسے اُتار پھینکئے ——"

"بوجھ کیسا ——" شمسہ بیگم نے شوہر کو ٹالتے ہوئے جواب دیا "آپ تو بلاوجہ پیچھے پڑجاتے ہیں"

"زندگی کے انیس سال آپ کے ساتھ گزار چکا ہوں" محمود حسین نے کہا "کیا اب بھی مجھے اس بات کا

یقین نہیں کوئی دشواری پیش آسکتی ہے کہ آپ کی کیفیت کیا ہے ——"

"اگر آپ کو اندازہ ہے تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں ——"

"اس کا مطلب یہ ہوا... کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے" محمود حسین نے کہا پھر بیوی کے چہرے کو پڑھتے ہوئے بولے "اب اگر میں یہ بھی بتادوں کہ آپ اس وقت کس خیال سے اُلجھ رہی ہیں تو بندے کو کیا انعام ملے گا"

"یہ وکالت کرتے کرتے آپ نے علم نجوم میں کب سے دلچسپی لینی شروع کردی" شمسہ بیگم مسکرادیں۔

"جب سے آپنے ماں بن کر ناجیہ کے بارے میں سوچنا شروع کیا ہے"

"کیا مطلب ——"

شمسہ بیگم شوہر کی بات سُن کر یوں چونکیں جیسے سوتے میں کوئی بھیانک خواب دیکھتے دیکھتے یکایک اُن کی آنکھ کھل گئی ہو —— اُن کے دل کی دھڑکنیں یکلخت تیز ہوگئیں، جس بات کو وہ شوہر سے پوشیدہ رکھنا چاہتی تھیں وہ انھیں پہلے ہی معلوم ہوچکی تھی۔

حالات کی سنگینی کا تصور ذہن میں اُبھرا تو وہ ایک لمحے کو سرتاپا لرز اُٹھیں پھر معاً انھیں اپنی غلطی کا احساس بھی ہوگیا —— شوہر کے لبوں پر دلکش مسکراہٹ دیکھ کر انھیں اندازہ ہوگیا کہ انھوں نے محض اندھیرے میں تیر چلایا تھا جو اتفاق سے ٹھیک نشانے پر جا لگا، چنانچہ شمسہ بیگم نے بھی اپنے چہرے پر مصنوعی حیرت پیدا کرتے ہوئے جلدی سے کہا

"آپنے میری پریشانی کا سبب جان لیا"

"ناڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں" محمود حسین نے اطمینان کا سانس لیا "خدا کا شکر ہے کہ مسئلہ حل ہوگیا ورنہ میں تو سوچ رہا تھا کہ نہ جانے کیا اہم بات ہوگی"

محمود حسین مسہری پر دراز ہوئے تو شمسہ بیگم بھی اُن کے قریب بیٹھ گئیں، آہستہ سے بولیں

"کیا ناجیہ کا مسئلہ آپ کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا"

"ابھی یہ مسئلہ قبل از وقت ہے اس لئے زیادہ اہمیت کا حامل نہیں" محمود حسین لاپروائی سے بولے۔

"لڑکی کا مسئلہ تو اس کے پیدا ہوتے ہی شروع ہوجاتا ہے" شمسہ بیگم نے کہا۔

"آپا جان کئی بار فراز کے سلسلے میں جواب مانگ چکی ہیں —— بار بار بات بناتے ہوئے شرمندگی ہونے لگی ہے"

"میرا تو مشورہ ہے کہ آپ آپا سے کھل کر کہہ دیجئے کہ جب تک ناجیہ بی اے نہیں کرلیتی ہم اس کی شادی کے بارے میں کچھ نہیں سوچنا چاہتے" محمود حسین نے کہا "فراز کا رشتہ بلاشبہ اپنی ناجیہ کے لئے بہترین ہے لیکن ——"

"لیکن ویکن چھوڑئیے اور میرا مشورہ مانئے تو فراز اور ناجیہ کی منگنی کردیجئے" شمسہ بیگم شوہر کی بات کاٹتے ہوئے بولیں "بات اگر گھر کی ہوتی تو ٹالا بھی جاسکتا تھا مگر آپا کی بات اور ہے ——"

"اگر آپ مناسب نہیں سمجھتیں تو میں کسی وقت آپا سے بات کئے لیتا ہوں"

"کیا بات کریں گے آپ ——"

"یہی کہ فراز اور ناجیہ کا مسئلہ تعلیم مکمل ہونے کے بعد طے کیا جائے"

"خدا کے لئے ایسا غضب نہ کیجئے گا" شمسہ بیگم نے جلدی سے کہا "امی حضور کی زندگی میں ایک بار پہلے حالات کے عجیب نظر آیا مجھ سے خفا ہوگئی تھیں —— اب اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو اُن کا دل ٹوٹ جائے گا"

"آپ درست سوچ رہی ہیں مگر ——"

"مگر ویگر کچھ نہیں" شمسہ بیگم نے جلدی سے کہا "میں کہتی ہوں جب فراز ہمیں پسند ہے اور آخرکار اسی سے ناجیہ کی بات طے ہونی ہے تو بلاوجہ دلوں میں رنجش اور کدورتوں کو کیوں جگہ دی جائے"

"آپ نے ناجیہ کا عندیہ بھی معلوم کیا ——"

"میں نے ناجیہ کا عندیہ بھی معلوم کیا ——"

"میں نے میرے ایما پر ایک دو بار ناجیہ کے سامنے فراز کا ذکر نکالا تو تھا لیکن ناجیہ نے کھل کر اپنے خیال کا اظہار نہیں کیا" شمسہ بیگم نے جواب دیا پھر سنجیدگی سے بولیں "آپ کا کیا خیال ہے —— کیا ناجیہ فراز کے

رشتے کو ناپسند کرے گی۔"

"ہو سکتا ہے ——" محمود حسین نے کہا۔

"کیا اُسے ہماری پسند کا کوئی لحاظ نہ ہوگا۔" شمسہ بیگم نے خود اپنے دل میں چھپے خوف کو کریدتے ہوئے پوچھا۔

"ہمارا اور آپ کا زمانہ اور تھا ——" محمود حسین سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولے۔ "بہت زمانے کے ساتھ بدلتے جا رہے ہیں، مخلوط تعلیم نے طالب علموں کے ذہنوں کو جہاں کشادگی اور وسعت دی ہے اُن کے دل و دماغ میں حق اور ناحق کے بارے میں سوچنے اور سمجھنے کے جذبوں کو بھی ہوا دی ہے اس لئے ضروری ہو گیا ہے اپنی مرضی کے ساتھ ساتھ اگر اولاد کی خوشیوں کا بھی خیال رکھیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔"

"ایک بات کہوں —— بُرا تو نہیں مانیں گے آپ۔" شمسہ بیگم نے سنبھل کر کہا۔

"میں —— اور آپ کی کسی بات کا بُرا مانوں گا۔" محمود حسین کے لہجے میں بے حد اپنائیت اور پیار تھا

"اگر خدانخواستہ ناجیہ ہمارے سامنے اپنی کسی پسند کا مسئلہ کھڑا کر دے تو آپ کیا کریں گے۔" شمسہ بیگم نے دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے سوال کیا۔

"ہمیں ناجیہ کی پسند کے بارے میں ٹھنڈے دل سے غور کرنا پڑے گا۔" محمود حسین بولے۔ "سرزنش کرنے سے بات خراب ہو سکتی ہے۔"

"اگر مخلوط تعلیم کے یہی فوائد ہیں تو میں ناجیہ کو تعلیم سے اٹھائے لیتی ہوں۔" شمسہ بیگم نے تڑپ کر کہا۔ "نہیں چاہئے مجھے ایسی ڈگریاں جو لڑکیوں سے اُن کی آنکھوں کی شرم و حیا چھین لے۔"

"آپ تو خفا ہو گئیں۔" محمود حسین مسکرا کر بولے۔ "میں نے تو آپ کے سوال کا جواب دیا تھا۔"

"سوال جواب چھوڑیئے۔" شمسہ بیگم نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ "میری مانیئے تو جتنی جلدی ممکن ہو فرائض اور ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائیے، نہ جانے کیوں آجکل مجھے ہر وقت ناجیہ کے مستقبل کا خیال ہولاتا رہتا ہے، مجھے تو خدشہ ہے کہ کہیں میں عارضۂ قلب میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔"

"کیسے بُرے کلمات زبان سے نکال رہی ہیں۔" محمود حسین نے تیزی سے کہا۔ "کیا آپ کو اپنے خون پر اعتماد نہیں ——"

"خون پر تو ہے لیکن زمانے کی رفتار سے دل ڈرتا ہے۔" شمسہ بیگم گلوگیر آواز میں بولیں۔ "برسوں کی عزت لمحوں میں خراب ہو جاتی ہے۔"

"ٹھیک ہے ——" محمود حسین نے بیوی کی نمناک آنکھوں کو دیکھتے ہوئے تسلی دی۔ "آپ ناجیہ کی فکر نہ کریں جیسا آپ چاہیں گی ویسا ہی ہوگا ——"

"کسی وقت آپ بھی ذرا ناجیہ کو باتوں باتوں میں سمجھانے کی کوشش کیجئے گا کہ زیادہ آزادی کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔"

"آپ تو بلاوجہ پریشان ہو رہی ہیں، یہی تو زمانہ ہے اُس کے کھیل کود کا —— کل کو بیاہ کر اپنے گھر جائے گی تو پھر یہ اپنے گھر جیسی آزادی کہاں نصیب ہوگی۔"

"پھر بھی باپ کی نصیحت کوئی بُری بات تو نہیں۔" شمسہ بیگم بولیں۔ "اچھا ہے اگر کان میں دو بول پڑتے رہیں اس بات کا خوف تو رہے گا کہ باپ کہیں ناراض نہ ہو جائے۔"

"کیا بات ہے —— آج آپ ناجیہ کے سلسلے میں کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو رہی ہیں۔"

"ماں ہوں اس لئے فکرلاحق رہتی ہے۔" شمسہ بیگم نے بات ٹالتے ہوئے قدرے مسکرا کر کہا۔ "آپ کی طرح کہ کان پر جوں کبھی نہیں رینگتی، ہر وقت عدالتی فائلوں میں مگن رہتے ہیں۔"

"آپ کی توجہ نہیں ملتی تو بے جان فائلوں ہی سے دل بہلاتا رہتا ہوں۔" محمود حسین نے شوخی سے جواب دیا۔

"اِس کے علاوہ کچھ اور بھی سوجھتا ہے۔" شمسہ بیگم اُٹھتے ہوئے بولیں پھر انھوں نے نائٹ بلب جلا کر باقی لائٹیں گل کر دیں اور اپنے بستر پر آ گئیں۔

محمود حسین کے سو جانے کے بعد بھی وہ خاصی دیر تک جاگتی رہیں اور ناجیہ کے مستقبل کے

بارے میں سوچتی رہیں پھر نیند کے خمار نے یلغار کی تو انھوں نے آہستہ سے پلکیں موندیں اور دنیا و مافیہا سے بیخبر ہو گئیں!!

وہ نہا کر غسل خانے سے نکلی تو جی بہت ہلکا ہو گیا، تولیے سے بالوں کو سکھاتی باہر آئی تو تمہ دار کھی آنکھیں بند کئے لیٹا تھا، قریب جا کر اُس نے آہستہ سے باآواز کہہ کر آواز دی، دوسری جانب سے کوئی جواب نہ ملا تو آنکھیں کھول دیں، بالوں کو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خشک کیا پھر ہلکا سا سنوار کر یوں ہی گنگناتی ہوئی غسل خانے کے ارادے سے باہر آئی تو ٹھٹھک کر رک گئی۔

شہباز برآمدے کے سامنے ہی موجود تھا، سفید پتلون اور اُس پر ہلکے چاکلیٹ کلر کے بش شرٹ میں کامران حسن بڑا پُروقار لگ رہا تھا، عاشی کو اچانک سے نکلتے دیکھ کر وہ بھی اپنی جگہ رک گئے تھے، ایک لمحے کو دونوں کی آنکھوں کا تصادم ہوا، دونوں ہی خلاف توقع ایک دوسرے کو آمنے سامنے پا کر چونکے پھر دونوں کے چہرے پھول مسرتیں جاگ اٹھیں۔ جانے کیا بات تھی جو عاشی شہباز کو اپنے دروازے پر کھڑا دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھی انجانی سرشاری کے احساس نے اُسے جیسے فرش سے اُٹھا کر عرش پر کھڑا کر دیا۔

وہ اپنی جگہ سنگِ مرمر کے تراشے ہوئے کسی حسین مجسمے کی مانند چپ چاپ کھڑی شہباز کو دیکھتی رہی، اس کی غلافی آنکھیں جیسے اپنے حلقوں میں ساکت و جامد ہو کر رہ گئی تھیں، دراز پلکوں میں ایک ذرا بھی تو جنبش نہیں ہو رہی تھی، دل کی دھڑکنیں جانے اُس کے کانوں میں چپکے چپکے کیا سرگوشیاں کر رہی تھیں۔

شہباز اُس کا ہم جماعت تھا ——

اُس کی شخصیت کالج کے طالب علموں میں مرکزی توجہ کی حامل تھی ——

وہ بے حد پُراسرار تھا ——

لڑکیوں کے حلقے میں اُسے جانے کتنے عجیب و غریب خطابوں سے نوازا گیا تھا ——

شہباز کے بارے میں طالبات کی رائے کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی ——

لیکن عاشی نے اپنی رائے صرف اپنی ذات تک محدود رکھی تھی ——

اُس کا خیال تھا کہ شہباز جو اوپر سے بے حد پُراسرار اور گمبھیر نظر آتا ہے اندر سے نہایت ٹھوس اور معصوم کردار کا مالک ہوگا ——

اُس کا اندازہ غلط نہیں تھا ——

شہباز کی حقیقت اُس روز آشکار ہو گئی جس دن وہ محمود حسین سے ملاقات کرنے آیا تھا ——

وہ بہت بڑے باپ —— اونچے اور مالدار خاندان کا چشم و چراغ تھا ——

وقت نے اُسے تنہا زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تھا ——

تقدیر نے اُس کی جھولی ہیرے جواہرات سے بھر دی تھی ——

لیکن ——

وہ بہکا نہیں تھا، اپنی جگہ ثابت قدم تھا ——

خود اپنا احتساب کر رہا تھا ——

اور وہ عاشی کا محسن بھی تھا ——

عاشی خیالوں کے دوش پر اونچے آسمان پر بادلوں کے نرم ٹکڑوں کے درمیان اڑی جا رہی تھی کہ شہباز کی آواز اُس کے کانوں میں گونجی۔

"آپ نے شاید پہچانا نہیں مجھے —— خادم کو شہباز کہتے ہیں۔"

کتنا سادہ مگر شوخ سا لہجہ تھا، عاشی کو اپنی محویت کا احساس ہوا تو کٹ کر رہ گئی، جانے اُس کی سرگوشی کو شہباز نے کیا رنگ دیا ہوگا؟ —— ایک لمحے کو وہ گھبرا سی گئی پھر خود کو سنبھالتی ہونٹوں پر تبسم جگاتی آہستہ سے بولی۔

"آپ اور یہاں ——"

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے" شہباز نے اُس کے کھلے بالوں کو ایک نظر دیکھتے ہوئے جواب دیا "میں ہی موجود ہوں"

"میرا مقصد یہ نہیں تھا ——" وہ گڑبڑا گئی

"پھر —— کیا تھا آپ کا مقصد"

"آپ تنہا جو ہیں —— میرا مطلب ہے ناجیہ آپ کے ساتھ نہیں ہے"

"جہاں تک ناجیہ کا تعلق ہے تو ملازم نے بتایا ہے کہ وہ ڈرائیونگ کے لئے گئی ہیں —— رہا میری تنہائی کا سوال تو اُسی کو دُور کرنے کی خاطر آپ کی طرف آگیا" شہباز نے آخری جملہ براہِ راست عاشی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا پھر جلدی سے نظریں جھکا کر ایک شریر سی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر بولا "آپ کو میرا اس طرح یہاں آنا ناگوار تو نہیں گزرا"

"اگر ناجیہ موجود ہوتی تو ——" وہ غیر ارادی طور پر سوال کر بیٹھی۔

"تو مجھے مجبوراً آپ کے ممدوبابا کو دیکھنے کا بہانہ کر کے اِدھر آنا پڑتا ——" شہباز کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"بہانہ کیوں ——" اُس نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے نہایت معصومیت سے پوچھا۔

"آپ شاید بھول رہی ہیں کہ جس روز میں پہلی بار یہاں آیا تھا اُس روز بھی ناجیہ نے آپ کو چائے تیار کرنے کے لئے ڈرائنگ روم سے باہر بھیج دیا تھا" شہباز یکلخت سنجیدہ ہو گیا۔

"اس میں یاد رکھنے کی کیا بات تھی" وہ لاپروائی سے بولی "ممکن ہے ناجیہ آپ سے اکیلے میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہو"

"آپ کا اندازہ درست ہے" شہباز نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا "ناجیہ نے آپ کی غیر موجودگی میں مجھ سے بڑی باتیں کی تھیں"

"مجھے یقین تھا کہ ایسا ہی ہوا ہوگا" وہ شوخی سے بولی۔

"آپ نے ان باتوں کے بارے میں نہیں دریافت کیا"

"دوسروں کی نجی باتیں معلوم کرنا ایٹی کیٹ کے خلاف ہے" عاشی نے مسکرا کر کہا پھر جلدی سے بولی "کیا باہر ہی سے لوٹ جانے کا ارادہ کر کے آئے ہیں"

"آپ کی اجازت کے بغیر آپ کی دہلیز کیسے عبور کر سکتا ہوں"

"یہ کوٹھی میری نہیں —— ناجیہ کی ہے" اُس نے ہنس کر جواب دیا۔

"ناجیہ نے بھی اُس روز مجھے یہی باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ اس کوٹھی میں آپ کی حیثیت کیا ہے" شہباز نے دبی زبان میں کہا۔ اُس کے لہجے میں درد کی لپک بھی موجود تھی۔

"بابا سے نہیں ملیں گے آپ ——" عاشی نے بڑی خوبصورتی سے باتوں کا رُخ بدل دیا دیدہ شہباز نے بات سُن کر نہ جانے کیوں اِس وقت عاشی کو اپنی کم مائیگی کا بڑی شدت سے احساس ہوا —— لیکن اس احساس کو مسکراہٹوں میں جذب کر لیا تھا ——!

ممدو کو جگا کر وہ شہباز کو اندر لے گئی، بڑے مہذب انداز میں اُس نے ممدو سے شہباز کا تعارف کرایا پھر دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر اندر چلی گئی، کچھ دیر بعد وہ چائے کی ٹرے سجائے واپس آئی تو ممدو اور شہباز دونوں سے ایک دوسرے سے باتوں میں مصروف تھے، یوں لگ رہا تھا جیسے وہ برسوں سے ایک دوسرے سے واقف ہیں۔

ممدو کے قریب بیٹھی وہ باتیں سنتی رہی پھر شہباز جانے کے لئے اٹھا تو وہ بھی کھڑی ہو گئی، اُسے جاتے کے لئے باہر آئی تو شہباز نے مسکراتے ہوئے کہا

"آپ کے ممدو بابا سے مل کر بے حد خوشی ہوئی"

"ذرہ نوازی ہے آپ کی" عاشی نے انکساری سے کام لیا پھر کچھ سوچ کر بولی "آپنے انکل کے بیٹے کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے"

"میں سمجھا نہیں"

"جب سے —— ورنہ انکل اور آنٹی دونوں ہی نے آپ کو اپنی کوٹھی میں قیام کی دعوت دی تھی"

"اوہ ——" شہباز نے سنجیدگی سے کہا پھر عاشی کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا "آپ کا کیا مشورہ ہے"

"آپ شاید بھول رہے ہیں کہ ناجیہ نے آپ کو میری حیثیت بتا دی ہے" عاشی نے پہلی بار جھجکتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں کون ہوتی ہوں آپ کو مشورہ دینے والی ——"

"ایک دوست کی حیثیت سے آپ مجھے اپنی رائے سے تو آگاہ کر سکتی ہیں"

"میری طرح بھلا میری رائے کی بھی کیا حیثیت ہو سکتی ہے" عاشی کے ہونٹوں پر ایک تبسم تڑپ کر نڈھال ہو گیا۔

"میں اور محمود حسین صاحب کے بڑے پرانے خاندانی تعلقات ہیں" شہباز نے سنجیدگی سے کہا۔

"مجھے اس کا علم ہو چکا ہے ——" عاشی نے روش پر اُس کے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"لیکن میں نے ان دیرینہ تعلقات کے باوجود بیرسٹر انکل سے ملنے سے گریز کیا تھا"

"کوئی وجہ ہوگی ——"

"جی ہاں —— ہر تیر اپنی جگہ بھاری ہوتا ہے" شہباز بدستور سنجیدہ تھا "زیادہ گھلنے ملنے سے تلخیاں جنم بھی تو فروغ پا سکتی ہیں"

"پھر ——" عاشی نے اپنے دل میں اُبھرنے والے تجسس کی خاطر پوچھ ہی لیا "اس روز آپ انکل سے ملنے ہوں آئے تھے"

"میں اس سوال کا جواب دے سکتا ہوں —— لیکن ایک شرط پر"

"کیا ——"

"آپ وعدہ کریں کہ میری بات کا بُرا نہیں مانیں گی"

"کیا مطلب ——" عاشی چونکی "آپ کے جواب کا بھلا میری ذات سے کیا تعلق ——"

"جب تک آپ وعدہ نہیں کریں گی میں کوئی جواب نہیں دوں گا"

عاشی نے بہت غور سے شہباز کو دیکھا پھر کچھ سوچ کر وعدہ کر لیا۔

"ہو سکتا ہے آپ کو میری جسارت ناگوار گزرے لیکن سیدھے سادھے انداز میں کھل کر بات کرنے کا عادی ہوں" شہباز نے کہا "مجھے دنیا کے رسم و رواج اور اونچ نیچ کا کچھ زیادہ تجربہ تو نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ انسان کو ہمیشہ سچی بات کرنی چاہئے"

"یہ تو بڑی اچھی عادت ہے ——"

"لیکن اسی عادت نے میری شخصیت کو بڑا پُراسرار بنا دیا ہے —— وہ، جو مجھ کو سمجھ نہیں پاتے میرے بارے میں قیاس آرائی شروع کر دیتے ہیں اور میں اُن کی باتوں سے سہم کر اپنے خول میں کچھ اور سمٹ جانے کی کوشش شروع کر دیتا ہوں"

"آپ یہاں آنے کا سبب بتانے جا رہے تھے" عاشی نے اُسے موضوع سے ہٹتا دیکھ کر کہا

"ہاں —— یہاں —— آپ کی وجہ سے چلا آیا تھا" شہباز نے نظریں جھکا کر بڑی سادگی سے کہا۔

اور عاشی ایک لمحے کے لئے گنگ سی رہ گئی، اُسے اپنی قوتِ سماعت پر شبہ ہو رہا تھا، شاید وہ کوئی سہانا خواب دیکھ رہی تھی —— زندگی میں آج پہلی بار کسی نے اُس کی اہمیت کا کھلے لفظوں میں اقرار کیا تھا کسی کی زندگی کا سبب بن گیا۔

گردن جھکائے سنتا رہا، میں جماتے وہ اپنے دل کی دھڑکنوں کو گن رہی تھی کہ شہباز کی گنگناتی آواز پھر اُس کے کانوں میں رس گھول گئی۔

"عاشی —— آپ نے میری بات کا بُرا تو نہیں مانا"

عاشی نے جھکی دراز پلکیں اُٹھا کر سہمی سہمی نگاہوں سے شہباز کو دیکھا، اُسے اپنا وجود ڈولتا محسوس ہوا شہباز کی باتوں نے جیسے اُس پر سحر کر دیا تھا —— نشہ سا طاری کر دیا تھا۔

"میں اپنی تنہائیوں سے بہت اکتا گیا ہوں" شہباز نے ٹھوس مگر سادہ انداز میں کہا" میں آپ کو دوست طلب کا رہا ہوں"

"آپ ——" اُس نے خود پر قابو پاتے ہوئے دبی زبان میں جواب دیا" آپ کو شاید میری حیثیت کا نہیں ہے"

"دوستی کا رشتہ تمام رشتوں سے مقدس اور پاک ہوتا ہے ——"

"میرے بابا اس کوٹھی کے تنخواہ دار ملازم ہیں" وہ آہستہ سے بولی

"دوستی کا جذبہ اونچ نیچ اور چھوٹے بڑے کے تمیز سے بالاتر ہوتا ہے"

"اس کوٹھی کے مالکوں نے میری سرپرستی نہ کی ہوتی تو شاید آج میری حیثیت کچھ اور ہوتی" وہ حقیقت کا اظہار کرنے لگی۔

"دوستی کرنا کوئی جرم نہیں ہے ——"

"غریبی بذاتِ خود سب سے بڑا جرم ہے" وہ تڑپ کر بولی" کیا آپ اس حقیقت کو جھٹلا سکیں گے"

"اپنی ذات پر اعتماد رکھنا میرے نزدیک سب سے بڑی قوت ہے" شہباز نے کہا" دولت تو آتی جاتی چھاؤں ہوتی ہے"

"میں نے زندگی میں ابھی تک تصویر کا صرف ایک رُخ دیکھا ہے، دوسری جانب کیا ہے، مجھے نہیں معلوم"

"جدوجہد زندگی کی حرارتوں کو برقرار رکھتی ہے"

"لیکن جو موت بدنامی سے ہو وہ بڑی اذیتناک ہوتی ہے"

"محبت سب سے عظیم جذبے کا دوسرا نام ہے"

"جو روزاوّل سے محکوم رہے ہوں وہ نظریں اُٹھانے سے بھی سہم جاتے ہیں"

"خوف بزدلی کی علامت ہے عاشی" شہباز نے قدرے جھلا کر کہا" آپ کو غالباً اندازہ نہیں ہے کہ میرے سر اور آنٹی آپ کی ذات سے کس قدر ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں"

"آپ نے صرف انکل اور آنٹی کا پیار دیکھا ہے، ناجیہ کی طبیعت سے ناواقف ہیں" وہ بڑے گھٹے ہوئے لہجے میں بولی" مجھے صرف میری اپنی دنیا تک محدود رہنے دیجئے"

"آپ شاید مجھے دوستی کے قابل نہیں سمجھتیں"

"خدا کی قسم یہ سراسر الزام ہے" وہ تڑپ اٹھی" میں نے آپ کو کبھی بُرا نہیں سمجھا ——"

"اور اچھا سمجھتے ہوئے بھی مجھ سے قریب آتے ہوئے خوف زدہ ہیں"

"آپ میری مجبوریوں کا اندازہ نہیں لگا سکتے ——" وہ اندر ہی اندر سلگتے ہوئے بولی" مجھے بابا کی مجبوریاں زیادہ عزیز ہیں"

"ٹھیک ہے ——" شہباز ایک سرد آہ بھر کر بولا" میں آئندہ یہاں آنے سے گریز کروں گا"

"لیکن کیوں ——" وہ معمہ سوال بن گئی۔

اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ شہباز کو کس طرح اپنی مجبوریوں اور محرومیوں کی داستان سنائے۔ شہباز نے جس سادگی اور اپنائیت سے اُس کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا وہ اُس کے لئے مسرتوں اور خوشیوں سے کم نہیں تھا، وہ اپنی ذات میں بہت بلند ہو گئی تھی لیکن حالات کی نزاکتوں نے اُسے معمولی بنا دیا تھا۔ اُسے علم تھا کہ ناجیہ کو اُس کی خوشیاں کبھی منظور نہ ہوں گی —— وہ ناجیہ کے ساتھ شب و روز رہتی تھی اُس کی طبیعت کا بخوبی علم تھا، اسی لئے تو وہ شہباز سے کترا رہی تھی۔

خود اپنی خوشیوں کا گلا گھونٹ رہی تھی

مستقبل —— اور مستقبل کی تابناکیوں کو تاریکیوں کے حوالے کر رہی تھی —— اور پھر

ان خوابوں کو ریزہ ریزہ کر رہی تھی جو اس ایک لمحے کو شرمندۂ تعبیر ہوئے تھے ——

غم کے بادلوں نے اُمڈ کر اُس کی بہاروں کو گھٹاٹوپ اندھیروں میں محصور کر دیا ——

وہ اس درجہ مجبور تھی کہ خود اپنی مجبوریوں پر پگھل کر آنسو بھی نہیں بہا سکتی تھی ——

قسمت کی ستم ظریفیوں نے اسے سراب سے شبنگی بجھانے کی تربیت دی تھی —— پھر ——

وہ ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشمے کو زندگی کیسے سمجھ لیتی —— ؟

"میں —— اب اجازت چاہوں گا" شہباز نے کچھ توقف کے بعد بجھی ہوئی آواز میں کہا" اگر مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو —— میری کوئی بات آپ کو ناگوار گزری ہو تو ——"

"شہباز صاحب —— پلیز ——" وہ چیخ اٹھی۔

شہباز کے روکھے لہجے نے اُس کی رُوح کی تازگی کو جھلسا دیا تھا —— وہ بلک اٹھی تھی —— اُس کی آنکھیں نہ جانے کیوں بھیگنے لگیں۔ جانے کیوں وہ اتنی جلدی شہباز سے مل کر اچانک نہیں بچھڑنا چاہتی تھی ——

ابھی تو پوری طرح اس مُلاقات کی ابتدا بھی نہیں ہوئی تھی —— صرف شہباز نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔

اور پھر اُس کی مجبوریوں کو سمجھنے کے بجائے خود ہی منہ موڑ کر واپس چلا جانا چاہتا تھا۔

کیوں ——

آخر کیوں ——

کیا اُس کی قسمت میں یوں ہی اندر ہی اندر گھٹنا اور سلگنا تحریر تھا ——

یہ کہاں کا انصاف تھا کہ دل خون کے آنسو رو رہا ہے اور ہونٹوں پر مسکراہٹیں تازہ رہیں ——

اس سے تو بہتر موت تھی ——

موت ——

جو زندگی کی تمام تلخیوں اور غموں کا مداوا تھی ——

ہر زخم کے لئے تریاق تھی ——

زندگی کی آخری سانس تھی ——

لیکن ——

وہ اپنی مرضی سے موت کو بھی گلے نہیں لگا سکتی تھی ——

چند ثانیے وہ بُت بنی کھڑی شہباز کو حسرت بھری نظروں سے تکتی رہی پھر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر تیزی سے گھومی اور لمبے لمبے قدم اٹھاتی واپس پلٹ گئی۔

اور —— ٹھیک اسی وقت ناجیہ کی چمکتی ہوئی جھلملاتی نئی گاڑی خراماں خراماں کوٹھی کے احاطے کے اندر داخل ہو رہی تھی اور شہباز اکیلا اور کوٹھی کے درمیان سبزے پر خاموش کھڑا کسی گہری سوچ میں ڈوبا تھا ——!!

ناجیہ کی نظر شہباز پر پڑی تو وہ خوشی سے کھل اٹھی۔ گاڑی سے اُتر کر سیدھی اُسی کی جانب آگئی، اس کے قریب پہنچتے ہوئے لہک کر پوچھا

"آپ کب آئے ——"

"اب تو واپس جا رہا تھا ——" شہباز نے ایک پھیکی مسکراہٹ لبوں پر اُبھارتے ہوئے کہا

"کیا پاپا اور ممی سے ملاقات نہیں کریں گے"

"کر چکا ہوں ——"

"کتنی دیر ہو گئی آپ کو آئے ہوئے ——"

"کیا کریں گی پوچھ کر" شہباز نے کہا" ایک گھنٹے سے انتظار کر رہا ہوں"

"میرا انتظار ——" ناجیہ نے شوخی سے پوچھا پھر بے تکلفی سے شہباز کا ہاتھ تھام کر بولی" آیئے نا، میں آگئی ہوں"

وہ شہباز کو ساتھ لئے ڈرائنگ روم میں آگئی، شہباز کی زبانی یہ سُن کر کہ وہ ایک گھنٹے سے اُس کا منتظر رہا تھا ناجیہ کو بے حد مسرت ہوئی۔

شہباز کو کالج میں ہیرو کے نام سے یاد کیا جاتا تھا' لڑکیاں اُسے "تسخیر" کرنے کی خاطر بے تاب رہتی تھیں لیکن وہ کردار کے معاملے میں کسی آہنی چٹان کی مانند اپنی جگہ ٹھوس تھا ——— پتھر تھا ——— اس پتھر میں جونک لگتے دیکھ کر وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔

اپنی کوٹھی پر شہباز سے پہلی ملاقات ہونے کے بعد وہ اُس کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ انداز میں خود شہباز نے اپنی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے پردہ اُٹھایا تھا' اُسے سُن کر ناجیہ نے اپنی رائے قائم کر لی تھی' اُسے یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ شہباز اُس کے والد کے دوست کا بیٹا ہے' اس کے علاوہ بھی شہباز بہت ساری خوبیوں کا مالک تھا۔

خوبصورت تھا ———

کالج میں ایک نمایاں حیثیت کا حامل تھا ———

وجیہہ اور نوجوان تھا ———

صاحبِ جائیداد تھا ———

دولت مند تھا ——— اور

تنہا تھا ——— !!

اور ان تمام خوبیوں نے ناجیہ کو اس درجہ متاثر کیا تھا کہ وہ پہلی ہی ملاقات میں بے اختیار اُس کی جانب کھنچتی چلی گئی' عاشی اُس کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے ایک ساتھ رہتی تھی لیکن اس وقت اس شہباز کے سامنے عاشی کی موجودگی بھی برداشت نہیں کی ——— چائے بنانے کے بہانے سے اُسے ٹال دیا تھا اور اس کے بعد وہ شہباز سے ایک ذرا سی دیر میں خاصی بے تکلف ہو گئی تھی ——— کریدکرید کر اُس کی زندگی کے بارے میں دنیا جہان کی باتیں دریافت کرتی رہی ——— اُس نے شہباز کو اس بات پر بھی رضامند کر لیا تھا کہ کالج میں وہ اُسی کی ٹیم میں شامل ہوگا۔

شہباز نے اُس کی کسی بات سے انکار نہیں کیا تھا' اُس کی ہر بات کا نہایت اطمینان اور سکون سے ہوئے انداز میں جواب دیتا رہا' اُس نے کوٹھی میں آکر مستقل قیام کرنے کے سلسلے میں حامی نہیں بھری تھی' ناجیہ اس پہلو پر بہت زیادہ اصرار بھی نہیں کیا تھا اور پھر شہباز کے جانے کے بعد بھی وہ بڑی دیر اسی کے خیالوں میں رہی۔ اپنے اور شہباز کے مستقبل کے بارے میں اُس نے نہ جانے کیا کیا خواب دیکھ ڈالے تھے۔

زندگی میں پہلی بار ناجیہ نے کسی مرد کو ایک نئے انداز' ایک نئے زاویے سے دیکھا تھا اور خود ہی سوچوں پر شرما گئی تھی' زندگی کی شاہراہوں پر خیالوں ہی خیالوں میں وہ شہباز کا ہاتھ تھامے بہت دور نکل گئی تھی۔

خوابناک وادیوں میں ———

برف پوش پہاڑیوں کے دامن میں ———

اونچے نیچے راستوں پر وہ شہباز کا ہاتھ تھامے گنگناتی رہی ———

پہاڑی جھرنے بھی اس کی تان کے ساتھ تان لاپتے رہے ———

خوابوں کی یہ دُنیا ناجیہ کو اتنی اچھی' اتنی خوبصورت اور پُرسکون لگی کہ اُس نے دل ہی دل میں ان خوابوں میں حقیقت کا رنگ بھرنے کا فیصلہ کر لیا تھا چنانچہ آج وہ شہباز سے زیادہ اپنائیت سے ملی تھی' لیکن شہباز آج نہ جانے کیوں اُسے کچھ کھویا کھویا سا لگ رہا تھا' سنجیدہ سنجیدہ سا ——— آج اُس سے ملنے میں وہ زندگی اور وہ تازگی نہیں تھی جو ناجیہ نے پہلے دن محسوس کی تھی۔

ناجیہ اس تبدیلی پر غور کرتی رہی پھر اس خیال سے کہ شہباز اُس کی غیر موجودگی کی وجہ سے اداس ہو گیا ہوگا وہ اندر ہی اندر کسی تازہ گلاب کی مانند کھل اٹھی' مسکرا کر بولی

"آج آپ کچھ اُداس اُداس سے نظر آتے ہیں"۔

"آپ نے کیسے اندازہ لگایا ———"

"جانے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں" وہ گنگنا اٹھی "میں آپ کی الجھن کا سبب جانتی ہوں"

"مجھے نہیں بتائیں گی ———" شہباز نے مسکراتے ہوئے پوچھا

"اوں ہوں ———" وہ ایک محبوبانہ ادا سے لہرا کر بولی پھر مسکراتے ہوئے پوچھا "کیا پئیں گے آپ"

"فی الحال اجازت چاہوں گا" شہباز نے بڑی خوبصورتی سے جواب دیا "مجھے ایک ضروری کام سے ———"

"تکلف تو نہیں کر رہے ———"

"اپنے گھر میں اور اپنوں سے بھلا تکلف کیسا" وہ مسکراتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا

"اتنی جلدی بھی کیا ہے — کچھ دیر تو اور بیٹھئے ———" ناجیہ نے اصرار کیا۔

"اسی شہر میں رہتا ہوں ——— آتا جاتا رہوں گا"

"ارے ہاں' میں ایک بات تو پوچھنا بھول ہی گئی" ناجیہ نے تبسم بکھیرتے ہوئے پوچھا "آپ نے ہمارے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے ———"

"ابھی تک کوئی آخری فیصلہ نہیں کر سکا ———"

"کیا یہ کوٹھی اور یہاں کا ماحول آپ کو پسند نہیں آیا ———"

"ایسی تو کوئی بات نہیں ہے" شہباز نے جلدی سے کہا "مجھے آپ کی کوٹھی سراہنے سے بہت پسند آئی ہے"

"صرف کوٹھی ——— یا ———" ناجیہ اپنا جملہ نامکمل چھوڑ کر معنی خیز انداز میں مسکرانے لگی۔

"یہاں کی ہر چیز نہایت خوبصورت' بھلی اور جاذبِ نظر ہے"

"پھر ——— آپ کو فیصلہ کرنے میں کیا دشواری پیش آ رہی ہے"

"زیادہ قرب اکثر جدائی کا پیش خیمہ بن جاتا ہے" شہباز سنجیدگی سے بولا۔

"جہاں اپنائیت ہو وہاں جدائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" ناجیہ نے شوخی سے ایک عام بات کہہ دی۔

"جو فیصلے جلد بازی میں کئے جائیں وہ زیادہ مستحکم اور پائیدار ثابت نہیں ہوتے" شہباز بدستور سنجیدہ تھا۔

"یہ اندازہ کب ہوا آپ کو ———"

"کچھ دیر پیشتر" شہباز روانی میں کہہ گیا پھر سنبھل کر زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا "دراصل میں ایک سیدھا سادا انسان ہوں اور سیدھی سادھی باتوں کو زیادہ پسند کرتا ہوں' زندگی میں گھماؤ پھراؤ اور اُلجھاوے مجھے کبھی نہیں بھاتے' اسی لئے میں خود کو زیادہ تر تنہا دیکھتا ہوں ——— اپنائیت کا احساس اکثر بڑا تکلیف دہ ثابت ہوا ہے ———"

"میں کبھی نہیں آپ کا مطلب ———" ناجیہ نے وضاحت چاہی۔

"ایک بات پوچھوں ——— بُرا تو نہیں مانیں گی"

"کیسے اندازہ لگا لیا آپ نے کہ میں اور آپ کی کسی بات کا بُرا مناؤں گی" ناجیہ نے بڑی اپنائیت سے مسکرا کر پوچھا۔

"شکریہ ———" شہباز ایک ذرا سا مسکرایا پھر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا ——— "مس ——— آپ نے کبھی کسی کو اپنا سمجھنے کی کوشش کی ہے ———"

"زیادہ کر رہی ہوں ———" وہ ایک ادائے دلربانہ سے جھوم کر بولی

"مجھے لگتا ہے وہ خوش نصیب ہوگا لیکن اگر خدانخواستہ وہ آپ کو اپنا سمجھنے سے گریز کرے تو آپ کے دل پر کیا گزرے گی"

"مجھے یقین ہے مسٹر شہباز کہ وہ ایسا کبھی نہیں کرے گا" ناجیہ کے لہجے میں بے پناہ اعتماد جھلک رہا تھا۔

"بعض خوش فہمی اکثر زندگی کا روگ بن جاتی ہے" شہباز نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا پھر اچانک مسکراتے ہوئے بولا "میری بات کا کچھ زیادہ خیال مت کیجئے گا ——— دراصل آج آپ نے اتنا انتظار کروایا کہ طبیعت مکدر ہو گئی" "مجھے یاد تھا کہ آپ آنے والے ہیں ورنہ سیر کو نہ جاتی ———"

"سیر کرنا صحت کی علامت ہے اور صحت سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔

"دوبارہ کب آئیں گے آپ ——"

"وعدہ نہیں کرتا لیکن —— ملاقات بہرحال ہوتی رہے گی۔"

شہباز نے مسکراتے ہوئے جانے کے لئے قدم اٹھایا تو وہ باہر تک اُسے چھوڑنے آئی۔ جب شہباز کی گاڑی پھاٹک سے نکل کر نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوگئی وہ ہاتھ ہلا ہلا کر اُسے وِش کرتی رہی پھر مسکراتی ہوئی واپس چلی گئی۔ شہباز کی باتیں ابھی تک اُس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔

گنگناتی لہراتی وہ راہداری عبور کر کے اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ سامنے سے شمسہ بیگم آتی ہوئی نظر آئیں۔ ناجیہ کے چہرے پر دمکتی خوشی کو معنی خیز نظروں سے گھورتے ہوئے بولیں

"آج تم نے پھر خاصی دیر کر دی ——"

"اوہ ممی ——" وہ بڑے بھولپن اور معصومیت سے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی "کیا آپ بھی میرا انتظار کرتا ہے؟"

"مجھے سے بھی تمہارا کیا مطلب ہے؟" شمسہ بیگم نے قدرے ناگوار لہجے میں کہا "کیا میرے علاوہ کوئی اور بھی تمہارا انتظار کرتا ہے؟"

"پپا ——" ناجیہ نے مسکراتے ہوئے بڑی خوبصورتی سے بات بنا دی۔

"ناجیہ ——" شمسہ بیگم نے ہونٹ کاٹتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا "مجھے اب تمہارا اس طرح آزادی سے گھومنا پھرنا پسند نہیں۔"

"کیوں —— اب کیا بات ہوگئی ہے ——" اُس نے شوخی سے دریافت کیا۔

"اب تم بچی نہیں ہو —— جوان ہوگئی ہو ——"

"مگر شام کو تفریح کے لئے جانا کوئی بُری بات تو نہیں؟"

"میں نے کب کہا کہ تفریح کرنا کوئی عیب ہے۔" شمسہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا "لیکن ڈرائیور کا ساتھ ہونا ضروری ہے ——"

"او۔ کے ممی ——" خلاف توقع اُس نے ماں کی بات مان لی۔ "آئندہ سے ڈرائیور کو ساتھ لے لوں گی۔"

"تم ابھی نادان ہو ناجیہ۔" شمسہ بیگم نے اُسے نرمی سے سمجھایا "زمانے کی اونچ نیچ سے واقف نہیں ہو —— بعض لوگ ذرا ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں، بلاوجہ بدنام کر ناشہ دُرخ کر دیتے ہیں اور بدنامی ایسا داغ ہے جو ایک بار لگ جائے تو تمام زندگی اپنے نشانات قائم رکھتی ہے ——"

"کہہ تو دیا کہ ڈرائیور کو آئندہ سے ساتھ لے جاؤں گی۔"

"کالج جاتے وقت بھی ڈرائیور کا تمہارے ساتھ جانا ضروری ہے ——" شمسہ بیگم نے دبی زبان میں کہا۔

"یہ مشکل ہے ممی ——" ناجیہ ٹھنک کر بولی "میری سہیلیاں کیا سوچیں گی ——"

"کیا سوچیں گی ——"

"آپ نہیں جانتیں ممی ——" ناجیہ نے ماں کو سمجھانے کی کوشش کی "اگر ڈرائیور میرے ساتھ جائے تو وہ باتیں بنائیں گی —— اور پھر کالج میں اور بھی تو بے شمار لڑکیاں ہیں جو خود کار ڈرائیور کے آنے جانے کے ساتھ کوئی ڈرائیور نہیں ہوتا۔"

شمسہ بیگم بیٹی کے جواب پر تلملا کر رہ گئیں، ایک لمحے کو اُن کے دل میں آئی کہ اس بات کو یہاں ختم کر دے آئیں جو اُن کی نگاہیں دیکھ چکی تھیں لیکن وہ جوان اور خود سر بیٹی کے منہ نہیں لگنا چاہتی تھیں اس لئے خون کا گھونٹ پی کر چپ رہیں، بات کا رُخ بدل کر بولیں،

"آج شہباز آیا تھا، تمہارا انتظار کر کے واپس چلا گیا۔"

"میری اُس کی ملاقات ہوگئی۔" ناجیہ نے مسکراتے ہوئے ماں کو بتایا۔

"تمہیں کہاں ملا ——" شمسہ بیگم نے حیرت سے دریافت کیا "یہاں سے گئے تو اُسے ایک گھنٹہ ہوگیا ہوگا۔"

"آپ کو وقت کا اندازہ نہ ہوا ہوگا۔" وہ بڑے لاڈ سے بولی "ابھی پندرہ منٹ پہلے ہی تو میری اور شہباز کی باہر لان پر ہوئی ہے، ہاں اگر مجھے ذرا دیر ہو جاتی تو وہ حضرت چلے گئے ہوتے۔"

"سمجھی ——" شمسہ بیگم نے کہا "وہ عاشی کی طرف اکسی میں چلا گیا ہوگا، ممد کی طبیعت کے بارے

پوچھنے تھا۔"

"ہائی۔ سی ——"

عاشی کا نام شہباز کے ساتھ سُن کر اُس کے چہرے کی رنگت یکلخت تبدیل ہوگئی، اُس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا —— آنکھوں میں خون کی سُرخیاں اُبھر آئیں اور پھر ——

ہونٹ کاٹتی، بل کھاتی وہ تیزی سے مڑی اور اپنے کمرے میں چلی گئی —— !!

شائستہ بیگم نے ٹیکسی کے کرائے کی ادائیگی کی پھر اُتر کر کوٹھی میں داخل ہوگئیں، چوکیدار نے انھیں دیکھ کر نہایت ادب سے سلام کیا تھا۔

آج وہ بہت دنوں بعد یہ فیصلہ کر کے آئی تھیں کہ شمسہ بیگم اور محمود حسین سے فراز اور ناجیہ کے سلسلے میں آخری جواب لے کر واپس جائیں گی، درمیان میں محمود حسین دو تین بار اُن کے گھر آئے تھے، شائستہ بیگم نے کبھی دبی زبان اور کبھی اشاروں کنایوں میں محمود حسین سے اُن کی مرضی معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ہر بار بڑی خوبصورتی سے ٹال مٹول کر گئے تھے ——!

فراز کے لئے رشتوں کی کوئی کمی نہیں تھی، خدا کے فضل و کرم سے وہ لاکھوں میں ایک تھا، اُس کی خوبصورتی شرافت اور چال چلن کوئی ایسی ڈھکی چھپی چیز نہیں تھی جو قریب و جوار اور پاس پڑوس والوں کی نگاہوں اور دلوں تک نہیں چنانچہ اس کے متعدد رشتے آچکے تھے لیکن شائستہ بیگم نے سب کو ایک ہی جواب دیا تھا۔

"فراز کی بات طے ہو چکی ہے ——"

انھیں فراز کی شادی کی کچھ ایسی جلدی بھی نہیں تھی، ابھی وہ اپنی تعلیم مکمل کر رہا تھا اور اس کے ساتھ شب و روز نہایت لگن سے مقابلے کے امتحان کی تیاریوں میں مصروف بھی رہتا —— امتحان میں کامیابی کے بعد تو فراز کے لئے اونچے اور بڑے بڑے گھرانوں کی لڑکیوں کے رشتے بھی آسکتے تھے لیکن شائستہ بیگم نے اپنے من میں ایک ہی بات ٹھان رکھی تھی۔

ناجیہ بہو بن کر گھر آجائے ——

اور آج اسی ارمان کو سینے سے لگائے وہ ٹھان کر آئی تھیں کہ محمود حسین اور شمسہ بیگم سے دو ٹوک فیصلہ کر کے رہیں گی، اس لئے کہ گزشتہ چند مہینوں سے اُن کا جی ٹھیک نہیں رہتا تھا، ہر وقت طبیعت پر ایک بوجھل سی کیفیت چھائی رہتی تھی اور اُجاڑ اُجاڑ گھر کاٹنے کو دوڑتا —— اس دوران وہ دو بار اپنے مرحوم شوہر کو بھی خواب میں دیکھ چکی تھیں جس کی وجہ سے انھیں فراز کی فکر اور زیادہ لاحق ہوگئی تھی۔

شائستہ بیگم کو اپنی موت سے کوئی خطرہ یا خوف نہیں تھا، شوہر کی حادثاتی موت کے بعد سے اُن کی زندگی کی تمام رنگینیوں سے اُچاٹ ہوگیا تھا، اگر فراز جینے کا سہارا نہ بن گیا ہوتا تو شاید موت ہی اُن پر مہربان ہو جاتی —— بہرحال، وہ ہر وقت اسی فکر میں الجھی رہتیں کہ فراز جتنی جلدی ممکن ہو اپنی تعلیم مکمل کر لے —— مقابلے کا امتحان پاس کر لے اور پھر عملی زندگی میں اپنا مقام بنا لے تو وہ اُس کے سر پر سہرا سجا کر خود دنیا کی تمام فکروں سے سبکدوش ہو جائیں۔

شائستہ بیگم نے دنیا دیکھ رکھی تھی، شوہر کی موت نے انھیں زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ کر دیا تھا، اونچ نیچ سمجھنے کی عادی ہوگئی تھیں اور ان ہی تمام وجوہات کی بنا پر انھوں نے بہت سوچ سمجھ کر ناجیہ کو بہو بنانے کا فیصلہ کیا تھا، اسی فیصلے کے پیش نظر ایک بار ان کے اور شمسہ بیگم کے درمیان غلط فہمی کی دیوار بھی حائل ہوگئی تھی، جسے انھوں نے اس دیوار کو خود بخود ڈھا دیا تھا۔

شائستہ بیگم کو اس بات کا اندازہ بھی تھا کہ فراز ناجیہ کو پسند کرتا ہے —— دونوں بچپن میں ایک ساتھ کھیل کود کر جوان ہوئے تھے، قسمت کی ستم ظریفی نے فراز کو مستقل طور پر ناجیہ کے والدین کے در پر لا ڈالا، اس طرح وہ دونوں ایک ساتھ ہو گئے —— ایک ساتھ پیتے اور ایک ساتھ کھاتے —— ایک ساتھ اُٹھتے بیٹھتے اور اسی

ساتھ نے فراز کے دل میں ناجیہ کے پیار کا بیج بو دیا جو وقت کی رفتار کے ساتھ محبت کے تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا تھا۔

ہر چند کہ فراز نے اپنی زبان سے اس بات کا اعتراف کبھی نہیں کیا کہ وہ ناجیہ کو دل و جان سے چاہتا ہے مگر شائستہ بیگم اس کی ماں تھیں ——— اولاد کی نگاہوں کے ایک ایک زاویے اور مفہوم کو بہت اچھی طرح سمجھتی تھیں۔ انھیں اس بات کا بھی بخوبی اندازہ تھا کہ فراز نے محض محمود حسین کی خوشنودی اور ناجیہ کے حصول کی خاطر مقابلے کا امتحان دینا منظور کر لیا تھا ورنہ اس کے سر میں تو بس ایک ہی سودا سمایا ہوا تھا۔

مرحوم باپ کی طرح وہ بھی پائلٹ بننا چاہتا تھا

جہاں تک ناجیہ کا تعلق تھا تو شائستہ بیگم اس کی طبیعت سے بھی بخوبی واقف تھیں۔ دادی کی رفاقت تربیت نے ناجیہ کو انتہائی خود سر، مغرور اور بیباک بنا دیا تھا۔ امارت کا احساس اُس کے ذہن میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا ——— وہ دوسروں کے اشارے پر چلنے کے بجائے دوسروں کو اپنے اشاروں پر چلانے کی عادی تھی ——— ماں باپ کے علاوہ اُس کے تمام ملنے جلنے والے اس سے گفتگو کرتے وقت احتیاط سے کام لیتے کہ جانے کب اُسے کوئی بات ناگوار خاطر گزرے اور کب اُس کی پیشانی شکن آلود ہو جائے۔

ماں باپ کے سلسلے میں ناجیہ کا رویہ نرم ضرور تھا لیکن اپنی مرضی کے خلاف وہ والدین کے کسی حکم کو بمشکل اپنے اوپر مسلط کرنے پر آمادہ ہوتی۔ بچپن کی تربیت نے اُسے آزاد خیال بنا دیا تھا اور وہ اپنی آزادی کو ہر قیمت برقرار رکھنا چاہتی تھی۔

فراز جیسے سیدھے سادھے اور ٹھنڈے دماغ کے لڑکے کے لئے ناجیہ کا رشتہ عام صورت میں مناسب کبھی نہیں تھا لیکن شائستہ بیگم ہر قیمت پر اُسے اپنے مُونے آنگن کی زینت بنانا چاہتی تھیں، اس لئے کہ ناجیہ جب پانے پڑی ہاتھ پاؤں چلاتی اور بے ربط الفاظ بولتی اُسی وقت سے شائستہ بیگم نے اُسے بہو بنانے کا ارادہ کر لیا تھا۔

فراز بھی اُسے پسند کرتا تھا ——— چاہتا تھا ———

اور ———

اس لئے کہ ناجیہ کا تعلق اُس گھرانے سے تھا جس نے ہر ہر قدم پر شائستہ بیگم کی مدد کی تھی۔

بیوگی کے غم میں سہارا دیا تھا ———

سر چھپانے کو جگہ دی تھی ———

اپنائیت اور پیار دیا تھا ———

ہر موڑ پر رہنمائی کی تھی اور جینے کا انداز سکھایا تھا ———

پھر ———

وہ فراز کے لئے ناجیہ کے سوا کسی اور کا انتخاب کس طرح کر سکتی تھیں ———!!

شائستہ بیگم نے جب کوٹھی میں داخل ہو کر ڈرائنگ روم میں جھانکا تو اتفاق سے محمود حسین اور شمہ بیگم موجود تھے اور بڑی سنجیدگی سے سر جوڑ کر کسی اہم گتھی کو سلجھانے میں مصروف تھے۔ شائستہ بیگم بے دھڑک اندر داخل ہو گئیں۔ شمہ بیگم نے انھیں خلاف توقع اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھا تو ایک لمحے کو پٹ کر رہ گئیں پھر مسکراتی ہوئی تیزی سے اٹھیں اور بے اختیار گلے لگ گئیں۔

"بس رہنے دو ———" شائستہ بیگم نے مسکراتے ہوئے شکوہ کیا "مجھے دیکھ لیا تو محبت میں جوش آگیا ورنہ دنوں سے پلٹ کر خبر بھی نہ لی کہ زندہ ہے یا مر گئی ———"

"آپ کی شکایت حق بجانب ہے لیکن خدا گواہ ہے کہ کئی بار ارادہ کر کے چل ہوں مگر کچھ اتفاق ایسا ہوتا ہے کہ گھر نہیں ہوتا ———"

"ایسا بھی کیا ——— تم اگر ٹھان لیتیں تو دو گھڑی کو خیریت دریافت کرنے تو آ ہی سکتی تھیں۔"

"میں حقیقتاً آپ سے بہت شرمندہ ہوں آپا۔"

"مجھ سے تو آپ کو کوئی شکایت نہیں۔" محمود حسین مسکرا کر بولے "میں تو برابر سلام کے لئے حاضری دیتا رہتا ہوں۔"

"آپا کا گھر آپ کے راستے میں ہے اس لئے اگر آپ چلے جاتے ہیں تو کوئی کمال نہیں کرتے۔" شمہ بیگم نے کہا "میں تو کہہ چکی ہوں کہ مجھے بھی لے چلیں لیکن آپ ہر بار کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ٹال گئے ———"

"آپ اگر جانا چاہتیں تو ڈرائیور کے ساتھ بھی جا سکتی تھیں۔" محمود حسین نے دبی زبان میں کہا۔

"کیا مطلب ———" شمہ بیگم نے چونک کر پوچھا "کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں جان بوجھ کر نہیں گئی ———"

"بظاہر تو یہی مطلب اخذ کئے جا سکتے ہیں ——— اب رہا حقیقت کا مسئلہ تو وہ بھی آپ ہی بہتر جانتی ہیں۔"

"آپا ———" شمہ بیگم نے شائستہ بیگم کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "سُن رہی ہیں آپ اپنے چہیتے بھائی کی باتیں، کس قدر بھولپن سے خود سرخرو بن کر مجھے بُرا بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"میں خوب جانتی ہوں محمود کو ———" شائستہ بیگم نے صوفے پر بیٹھ کر مسکراتے ہوئے کہا "یہ بھی کچھ کم نہیں ہیں۔"

"سُن لیا آپ نے ———" محمود حسین بیوی کو مخاطب کر کے جلدی سے بولے "گویا آپا نے یہ فیصلہ کر دیا کہ میرے مقابلے میں آپ زیادہ بڑی خطاوار ہیں ———"

"کیوں آپا ———" شمہ بیگم نے مسکراتے ہوئے پوچھا "کیا آپ مجھ سے زیادہ ناراض ہیں۔"

"ناراض تو خیر میں کسی سے نہیں البتہ مجھے تم دونوں سے شکوہ ضرور ہے۔" شائستہ بیگم دبی زبان میں بولیں۔

"بھئی مد کہاں ہیں ———" محمود حسین نے چونک کر دریافت کیا۔

"فراز گھر پر ہی ہے۔" شائستہ بیگم نے کہا۔

"کیا مطلب ——— کیا آپ تنہا آئی ہیں۔" محمود حسین یکلخت سنجیدہ ہو گئے "خیریت تو ہے ———"

"میری تو خیریت ہے لیکن آج تم دونوں کی خیریت نہیں ہے ———"

شائستہ بیگم نے باری باری.... دونوں کو پیار اور شکوہ بھری نظروں سے گھورتے ہوئے مسکرا کر کہا تو..... محمود حسین سمجھ گئے کہ وہ کس ارادے سے آئی ہیں، شمہ بیگم نے جلدی سے نظریں گھما کر شوہر کو دیکھا پھر سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

"محمود ———" شائستہ بیگم نے قدرے توقف کے بعد محمود حسین کو بڑی اپنائیت سے تکتے ہوئے کہا "کیا اب مجھے یہ بھی بتانا ہوگا کہ میں آج فراز کو گھر پر چھوڑ کر تنہا کیوں آئی ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے ——— فراز اپنے امتحانات کی تیاری میں مصروف ہوگا۔" محمود حسین نے جان بوجھ کر انجان بننے کی کوشش کی۔

"بات ٹالنے کی کوشش مت کرو۔" شائستہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا "آج میں تم میاں بیوی سے ایک آخری فیصلہ سننے آئی ہوں۔"

"آخری فیصلہ ——— کس سلسلے میں۔" محمود حسین نے بڑے بھولپن سے دریافت کیا۔

"فراز اور ناجیہ بیٹی کے سلسلے میں۔"

"اس میں بھلا فیصلہ کرنے کی کیا بات ہے۔" محمود حسین نے بیوی کی نظروں کا اشارہ پا کر بڑی خوبصورتی سے کہا۔ "مجھے فراز پر آپ کو حق ہے اسی طرح ناجیہ بھی آپ ہی کی بچی ہے۔"

"اور کیا ———" شمہ بیگم جلدی سے بول پڑیں "ہم درمیان میں بولنے والے کھلاکون ———"

"آج تم اس طرح پیچھا نہیں چھڑا سکو گی۔" شائستہ بیگم نے گہری سنجیدگی اختیار کر لی "آج میں صاف صاف الفاظ میں تم دونوں کا جواب سنے آئی ہوں ———"

"ہم آپ کے کسی حکم سے باہر تو نہیں ہیں آپا لیکن ———" شمہ بیگم کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئیں۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں ———" شائستہ بیگم بولیں "مجھے کاج اور خصتی کی ایسی کوئی جلدی نہیں ہے، وہ تم دونوں کی مرضی پر چھوڑتی ہوں لیکن میں چاہتی ہوں کہ اس رشتہ کو پکا کرنے کے لئے منگنی کی رسم پوری کر دی جائے تاکہ میرا دل کو اطمینان ہو جائے۔"

"ہمیں آپ کی کسی بات سے انکار نہیں ہے۔" محمود حسین نے کہا "لیکن آپ ناجیہ کی تربیت اور طبیعت سے بخوبی واقف ہیں۔"

"ہاں ——— اور میں یہ بھی جانتی ہوں وہ لاکھوں میں ایک ہے۔" شائستہ بیگم نے ناجیہ کی تعریف کرتے ہوئے

کہا "ابھی اُس کی عمر کھیلے کودنے کی ہے ——— اپنے گھر کی ذمہ داریوں کا بوجھ پڑے گا تو طبیعت میں سنجیدگی اور بھی آجائے گی ——— تم تو بس مجھے یہ بتا دو کہ منگنی کے لئے کون سا دن مناسب رہے گا ———"

"ہم چاہتے ہیں کہ ناجیہ کی مرضی بھی اس سلسلے میں دریافت کر لی جائے تو مناسب ہوگا" محمود حسین سنجیدہ ہو

"کیا مطلب ——— کیا تمہارے خیال میں وہ تم لوگوں کے حکم سے سرتابی کر سکتی ہے"

"خدا نہ کرے جان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے" محمود حسین بولے "انھوں نے اپنی دانست میں ناجیہ کی بہ

کی خاطر اُسے مستقبل میں زندگی کے پُرپیچ راستوں پر قدم جما کر چلنے کی تربیت دی ——— لیکن ناجیہ کا ذہن پختہ نہیں ——— وہ

باتوں کا غلط مطلب لے بیٹھی اور ——— کچھ ہماری نرمی نے بھی اُسے خودسر اور ضدی بنا دیا ——— خدانخواستہ اگر ہم

ہماری پسند اور مرضی کو رد کر دیا تو بہت بُرا ہوگا ———"

شائستہ بیگم نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا، محمود حسین کو دیکھتی رہیں۔

"خدا گواہ ہے آپا کہ میں فراز اور ناجیہ کا رشتہ دل و جان سے پسند ہے" شمسہ بیگم نے ماحول کی گھٹن کو محسوس کر

ہوئے کہا "ہماری طرف سے آپ کو اجازت ہے ——— آپ آج ہی ناجیہ کو بہو بنا کر اپنے ساتھ لے جائیے لیکن ہم

ابھی تک اسی لئے اپنی زبان پر تالے ڈال رکھے ہیں کہ ناجیہ کی مرضی بھی معلوم کر لی جائے تو وہ خدشے دُور ہو جائیں گے

نے ہمیں پریشان کر رکھا ہے"

"گویا تم دونوں کی طرف سے ہاں ہے ———" شائستہ بیگم نے شمسہ بیگم کی باتوں سے خوش ہو کر دریافت کیا

"ہم گلے گلے تیار ہیں آپا ———" محمود حسین نے یقین دلاتے ہوئے جلدی سے کہا۔

"مجھے نہ بنائیے تم دونوں کی ہاں، سننی تھی" شائستہ بیگم کے چہرے پر زندگی کی بھرپور مسرتیں جاگ اٹھیں، ہلکا

پھلکا "جہاں تک ناجیہ کی طبیعت کا تعلق ہے تو میں بھی اس سے بخوبی واقف ہوں ——— میرا دل گواہی دیتا ہے کہ

فراز کے سلسلے میں انکار نہیں کرے گی ——— ایک نہ ایک دن وہ میرے گھر کی عزت ضرور بنے گی"

"خدا آپ کی زبان مبارک کرے ———" شمسہ بیگم کے لہجے میں خلوص تھا ——— حسرت تھی۔

"اب تو آپ کا دل ہماری طرف سے صاف ہوگیا ———" محمود حسین نے دریافت کیا۔

شائستہ بیگم نے پلٹ کر بڑی اپنائیت سے محمود حسین کی جانب دیکھا، کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن اسی

عاشی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو شائستہ بیگم نے مصلحتاً کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا اور عاشی کو قریب بلا کر اس کی خیر

دریافت کرنے لگیں۔

وہ شہباز کی کیفیت کو کئی دنوں سے محسوس کر رہی تھی، اُس نے خود کو اچانک اپنی ذات کے اندر

کر لیا تھا، جتنی دیر کلاس میں رہتا پروفیسر یا بلیک بورڈ کی جانب تکتا رہتا، چھٹی کا گھنٹہ بجتا تو خاموشی سے کتابیں

اٹھا کر باہر نکل جاتا، کالج کے وسیع و عریض میدان اور سبزے کے کسی خاموش اور ویران گوشے میں بیٹھا کتابوں کو

کھولے رہتا۔

امتحان تو ابھی بہت دُور تھے ———

پھر ——— وہ کن امتحانوں میں گم ہو کر رہ گیا تھا ——— ؟

اچانک اُسے کیا ہو گیا تھا ———

کیا وہ اتنا ہی جذباتی واقع ہوا تھا کہ ایک ذرا سی بات کا اتنا گہرا اثر لے بیٹھا۔

یا ———

عاشی کو باور کرانا چاہتا تھا کہ اس کے بغیر وہ زندگی کی تمام خوشیوں اور مسرتوں سے منہ موڑ لے گا ———

شہباز کی اس اچانک تبدیلی کو صرف اُسی نے نہیں، کلاس کے دوسرے ہم جماعتوں نے بھی قابل

طور پر محسوس کیا تھا، شہباز کی غیر موجودگی میں اُس کے بارے میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔

"یار ——— یہ اپنا لیڈر آجکل نہ جانے کن فضاؤں میں بھٹکتا رہتا ہے ———"

"کسی کی نظر تو نہیں لگ گئی ———"

"ہم تاثیر صحبت کا اثر ——— ہو سکتا ہے عدیل کی دیکھا دیکھی اپنے اُستاد نے بھی کسی سے دل لگا لیا ہو"

"شہباز اور کسی عورت کا تصور! ——— قربِ قیامت کی دلیل ثابت ہوگی ———"

"بیٹھے بٹھائے نہ جانے کیا روگ لگا بیٹھا ——— بے چارا ———"

"کچھ بتاتے سے بھی گریز کرتا ہے ——— یا تو چپ سادھے رہتا یا پھر مسکرا کر ٹال جاتا ہے ———"

"میرا مشورہ ہے کہ کسی شاہ صاحب سے رجوع کیا جائے۔ کیا پتہ کسی بھید میں نہ آگیا ہو ———"

"سمندر کی طرح گہرا اور پُراسرار ہے ——— آسانی سے اس کی تہہ تک پہنچنا مشکل ہے ———"

ایک طرف مردوں کے حلقے میں شہباز کی شخصیت کے بارے میں قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں

دوسری جانب لڑکیوں نے بھی اس "معمہ" کو حل کرنے کی خاطر اپس میں پُرزور بحث مباحثے شروع کر رکھے تھے۔

"شہباز کا اس طرح ہر وقت گم صم اور کھوئے کھوئے رہنا کوئی نہ کوئی معنی ضرور رکھتا ہے ——— دال میں کہیں نہ

کہیں کالا ضرور موجود ہے"

"آجکل تو وہ عدیل سے بھی دُور دور رہتا ہے ———"

"ناجیہ ——— تم نے عدیل سے دریافت کیا؟ ——— میرا خیال ہے عدیل ہی اس معمے کو حل کر سکتا ہے"

"عدیل کو اتنی فرصت کہاں؟ ——— وہ غریب تو خود ناجیہ کی زلفوں میں اُلجھ کر اُلٹا لٹک رہا ہے ———"

"میں کہتی ہوں، ہمیں بلاوجہ اس کی کرید کرنے کی کیا پڑی ہے ——— ہوگا کچھ! ——— ہماری بلا سے"

"ایسی بھی کیا بے مروتی ——— اپنا ہم جماعت ہے ——— ہم آج اُس کا خیال نہ رکھیں گے تو کل ہمارے دکھ درد

میں کوئی دوسرا بھلا کیوں شریک ہونے لگا ———"

"اتنا ہی خیال ہے تو کسی روز دامن تھام کر پوچھ کیوں نہیں لیتیں کہ میاں مجنوں کہاں ٹھوکر کھائی ہے اور کون ہے وہ ماہ لقا جس کی یاد میں ہر وقت سبزوں کو قدموں تلے روندتے رہتے ہو ———"

"میں تو آج ہی پوچھ لوں لیکن وقار سے ڈر لگتا ہے ——— بڑا شکی مزاج واقع ہوا ہے؟"

"عطیہ ——— تم ہی زبیر سے معلوم کرو کہ اس وزنی پتھر کو اچانک یہ جونک کب، کیسے اور کہاں سے

لگ گئی ———"

"مجھے زبیر سے اتنی فرصت کہاں جو شہباز کے بارے میں سوچوں ———"

"میرا تو خیال ہے کہ کسی بزرگ سے فال نکلوائی جائے ———"

"اور اگر فال میں تیرا نام نکل آیا تو ——— ؟"

"آج کل اپنی عاشی بھی کچھ کھوئی کھوئی سی پائی جا رہی ہیں ——— کہیں ڈور کا دوسرا سرا انھوں نے تو

نہیں تھام رکھا ہے ———"

"ناممکن ——— اپنی عاشی تو اللہ میاں کی گائے ہے ——— اس میں وہ جراثیم کہاں جو کسی پر حملہ آور

ہو سکیں ———"

"مجھے یہ باتیں مذاق میں بھی ناپسند ہیں"

عاشی اپنا نام آتے ہی بگڑ کر ہم جولیوں کے ہجوم سے دُور چلی جاتی لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ سب کچھ

مذاق نہیں ——— حقیقت ہے ——— ایسی زندہ حقیقت جس نے رونما ہو کر اچانک اُسے بھی ایک امتحان سے دوچار

کر دیا تھا ——— شہباز نے جانے کیوں بیٹھے بٹھائے پانی کی پُرسکون اور ٹھہری ہوئی سطح پر ایک کنکری اچھال دی

تھی ——— پھر لہروں کے جال نے اُسے بھی اپنے پیچ و خم میں اُلجھا لیا ——— اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر

وہ شہباز کو کس طرح سمجھائے ——— کیسے کہے کہ اس نے خود کو اپنی ذات کے اندر محدود کر کے کتنی بند زبانوں کو کھلنے

پر اُکسا دیا ہے ——— کیسے اس خطرناک حقیقت کا احساس دلائے کہ "وہ" سب کچھ جو آج راز ہے ——— مخفی ہے ———

ہمیشہ پوشیدہ نہیں رہ سکے گا۔

اور ———

جس دن لوگوں نے اس راز کو پا لیا ——— اُس دن کیا ہوگا ——— ؟

قیامت آجائے کی ـــــ ؟
طوفان ٹوٹ پڑیں گے ـــــ ؟

آج بھی وہ ان ہی خیالوں میں گم تھی، تیسرا پیریڈ خالی تھا اس لئے وہ وقت گزارنے کی خاطر لائبریری میں آبیٹھی، شلف سے ایک درسی کتاب اٹھا کر یوں ہی اس کے اوراق الٹتی پلٹتی رہی ـــــ وقت کاٹنا مشکل ہوا تو کتاب رکھ کر اس ارادے سے لائبریری سے باہر آگئی کہ کچھ دیر کھلی ہوا میں سبزے پر چہل قدمی کر کے اپنے اُلجھے ذہن کو سلجھانے کی کوشش کرے گی۔

اپنے آپ سے اُلجھتی وہ روش سے ہٹ کر لکڑ ونے کی باڑھ سے کتراتی سبزے پر آگئی لیکن دوسرے ہی لمحے دھکے سے رہ گئی ـــــ دل کی دھڑکنوں میں جیسے اچانک اُبال آگیا ہو ـــــ تنفس کی رفتار تیز ہوگئی، خلائی آنکھوں میں خوف کے ابر پیے بیدار ہوئے تو وہ کسی سہمی ہوئی ہرنی کی طرح اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گئی۔

شہباز باڑھ کے ساتھ سبزے پر مولسری کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا اُسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اپنی قوت بینائی پر شبہ ہو رہا ہو ـــــ جیسے جاگتے میں خواب دیکھ رہا ہو اور ـــــ کتنی حسرتیں تڑپ رہی تھیں اس کی نگاہوں میں!

آس پاس کوئی اور نہیں تھا پھر بھی وہ تنہائی میں شہباز کو اچانک اپنے سامنے ـــــ اتنا قریب دیکھ کر گھبرا گئی ـــــ ایک تمنائے کو اُس نے سوچا کہ اپنی بہکی بہکی سانسوں اور دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتی تیزی سے پلٹے اور جتنی جلد کی ممکن ہو سکے دوسروں کی نگاہوں سے بچنے کی خاطر شہباز سے بہت دُور چلی جائے لیکن وہ چاہنے کے باوجود ایسا کرنے سے قاصر رہی ـــــ جانے کیوں اُس کے قدموں میں جیسے بیڑیاں پڑ گئی تھیں، اُسے اس بات کا خیال بھی نہ تھا کہ اگر وہ اچانک ڈر کر واپس چل گئی تو شہباز کیا سوچے گا کیا کہے گا ـــــ

"آپ ـــــ" شہباز نے اُسے گھورتے ہوئے آہستہ سے کہا تو اُس کی حالت اور دگرگوں ہوگئی۔

"جی ـــــ وہ ـــــ میرا تیسرا پیریڈ خالی تھا" وہ گڑبڑا کر بے ربط جملے بولنے لگی۔

"آپ شاید لائبریری سے واپس آرہی ہیں ـــــ"

"جی ہاں ـــــ"

"میں بھی اِدھر سے ہی آرہا ہوں"

"کیا مطلب ـــــ" وہ چونک سی اٹھی

"کتابوں میں میرا دل بھی نہیں لگا تو اس ویرانے میں چلا آیا"

شہباز نے بڑی گہری بات کہی تھی ـــــ لیکن کیوں؟ آخر وہ اسے کیا باور کرانا چاہتا تھا اُسے یہ غلط فہمی کیوں پیدا ہوگئی تھی کہ وہ بھی اس آگ کی لپیٹ میں آگئی ہے جس نے شہباز کو اپنے حلقے میں گھور رکھا تھا۔

یہ تو محض ایک اتفاق تھا جو وہ بلا ارادہ اِدھر آنکلی تھی، جان بوجھ کر تو اُس نے ایسا نہیں کیا تھا۔

"کیا سوچ رہی ہیں آپ ـــــ"

"جی ـــــ کچھ نہیں" اُس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا "چوتھا پیریڈ شروع ہونے میں دس منٹ رہ گئے ہیں"

"جی ہاں ـــــ یہ وقت ہی تو ہے جو انسان کو تنکے کی مانند حالات کا شکار کئے ہوئے ہے" شہباز نے ایک سرد آہ بھر کر دبی زبان میں کہا "کبھی ایک لمحہ زندگی کے لئے نوید مسرت بن جاتا ہے اور ـــــ کبھی ایک پل کی لغزش انسان کے لئے پوری زندگی کا روگ بن جاتی ہے ـــــ"

عاشی نے کوئی جواب نہیں دیا، نظریں جھکا کر انگلیوں کو یوں ہی مسلنے لگی۔

"ممدو بابا کی طبیعت اب کیسی ہے ـــــ"

"خدا کا فضل ہے ـــــ پہلے سے بہتر ہے" اُس نے جھکی جھکی نظروں سے جواب دیا

"میرا سلام کہہ دیجئے گا" شہباز سنجیدگی سے بولا "خدا اُن کو ہمیشہ زندہ و سلامت رکھے"

"بابا کو سلام کرنے کی خاطر آپ خود بھی آسکتے ہیں" اس نے آہستہ سے کہا

"سوچا تھا ایک دو بار ـــــ لیکن ـــــ" وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔

"لیکن کیا ـــــ" عاشی نے گھنیری پلکیں اُٹھا کر اُسے غور سے دیکھا۔

"ارادہ ترک کر دیا ـــــ" شہباز کا لہجہ بڑا اُداس تھا۔

"کیوں ـــــ" اُس نے پوچھ لیا "کوئی وجہ ـــــ"

"جس بات سے کچھ حاصل نہ ہو اُسے بار بار دہرانے سے کیا حاصل ـــــ" شہباز نے ٹھوس مگر مضمحل انداز میں جواب دیا۔

"آج کل آپ بہت الگ تھلگ سے رہتے ہیں ـــــ"

"جی ہاں۔ ع ـــــ میں نے اوروں سے سُنا ہے کہ پریشاں ہوں میں"

شہباز کے چہرے پر ایک تبسم تڑپ کر نڈھال ہوگیا۔

"آپ گھر نہ آئے تو آنٹی اور انکل کیا سوچیں گے ـــــ ناجیہ کیا کہے گی" عاشی نے سوال کیا۔

"مجھے دوسروں سے کیا سروکار"

"زندہ رہنے کی خاطر دنیا داری بھی کرنی پڑتی ہے ـــــ"

"ہر شخص اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے ـــــ"

"جو غم نہ سہہ سکیں وہ خوشیوں کے بوجھ سے بھی بہت جلد اکتا جاتے ہیں" عاشی نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

"اور جو دوسروں کو خوش نہ رکھ سکیں وہ خود بھی غموں کی لپیٹ میں آجاتے ہیں" شہباز تڑپ کر بولا۔

"اسے زندگی نہیں ہٹ دھرمی کہتے ہیں" عاشی نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔

"کچھ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو انسان کے اختیار میں نہیں ہوتیں ـــــ وہ بے بس ہو جاتا ہے"

"بے بسی کا احساس بزدلی کی علامت ہے ـــــ"

"زندگی کا ہر محاذ جبر و تشدد سے سر نہیں کیا جا سکتا ـــــ کئی مقام ایسے بھی آتے ہیں جہاں دامن بچانا پڑتا ہے ـــــ"

"انکساری عین عبادت ہے ـــــ"

"منزل کا سُراغ کھو جائے تو مسافر بھٹک جاتا ہے"

"جو اُمید کا دامن چھوڑ دیں وہ منزل کا سراغ کبھی نہیں پا سکتے" عاشی تلملا کر بولی

"میں آپ کی بات کا کیا مطلب اخذ کروں ـــــ"

شہباز نے پُر اُمید نظروں سے عاشی کو تکتے ہوئے دریافت کیا ـــــ اندھیروں میں اُمید کی ایک کرن کی اُس کے اداس اور ویران چہرے پر زندگی کی علامت بن گئی ـــــ بجھی بجھی آنکھوں میں اُمیدوں کے دیئے ٹمٹمانے لگے۔

"میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتی ہوں" عاشی نے تھوڑے توقف سے کہا

"حکم دیجئے ـــــ"

"خود کو سنبھالنے کی کوشش کیجئے ورنہ ـــــ"

"ورنہ کیا ـــــ"

"آپ کے حوالے سے کچھ ایسے آشیانے بھی طوفان کی زد میں آجائیں گے جنھیں تنکے جوڑ جوڑ کر بڑی مشکلوں سے بنایا گیا ہے" عاشی کے لہجے میں درد کی شدتیں تھیں ـــــ تڑپ تھی ـــــ التجا تھی۔

"ابھی آپ مجھے بزدلی کا طعنہ دے رہی تھیں اور اب خود طوفانوں سے ڈر رہی ہیں ـــــ" شہباز نے گہرے گلوئے سے انداز میں کہا۔

"بدنامی کا داغ موت کی اذیتوں سے بھی زیادہ کربناک ہوتا ہے" ـــــ وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی، گہرا آنے والے خطروں کے احساس ہی سے تپ کر کندن ہوگیا۔

" میں سمجھ رہا ہوں مس عاشی ——— " شہباز نے تھکے تھکے مڈھال لہجے میں جواب دیا' عاشی کے چہرے پر ایک نظر ڈال کر بڑی حسرت سے بولا" میں اپنی نگاہوں کے زاویے بدلنے کا وعدہ نہیں کرتا البتہ دوسروں کی خاطر روش بدلنے کی کوشش ضرور کروں گا ——— آپ کے حکم کی خاطر "

" شکریہ ——— "

عاشی نے آہستہ سے کہا پھر جانے کے لئے تیزی سے پلٹی تو عدیل سے ٹکراتے ٹکراتے بچی جو جانے وہاں کب سے موجود تھا ——— اور ——— عدیل کو دیکھ کر عاشی کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اچانک طوفانوں کی لپیٹ میں آگئی ہو۔

بس ایک لمحے کے لئے وہ سہم کر رکی ——— نظریں اٹھا کر اس نے عدیل کو سہمی سہمی نگاہوں سے دیکھا پھر دل کی دھڑکنوں کو سمیٹتی جلدی سے کترا کر روش پر آگئی ———

افتخار احمد بیوی کو لاہور سے کراچی لے آئے تھے لیکن ابھی تک وہ اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکے تھے کہ راحیلہ خاتون کو بیرسٹر محمود حسین کے گھر لے جا کر عاشی سے ملایا جائے یا صرف عاشی کی تصویر دکھا کر ان کا عندیہ لیا جائے انھیں اس بات کا خدشہ لاحق تھا کہ اگر ایک بار بیوی کی زبان سے "نا" نکل گئی تو پھر اسے ہاں میں تبدیل کرانا ممکن ہوگا۔

راحیلہ خاتون قبل از وقت اس امر سے آگاہ نہیں تھیں کہ انھیں کراچی کس مقصد سے لایا گیا ہے۔ وہ بعض اولاد کی محبت میں فوری طور پر رضامند ہو گئی تھیں' ان کا قیام بھی اپنے ایک قریبی عزیز کے گھر تھا' اقبال کو بھی وقتی طور پر وہیں بلوا لیا گیا تھا۔

تین روز تک افتخار احمد نہایت خاموشی سے بیوی کا موڈ اور تیور بھانپتے رہے' جو تھے روز۔۔۔

راحیلہ خاتون نے واپسی کا خیال ظاہر کیا تو بڑی لاپروائی سے بولے

" اتنی جلدی کیا ہے' ابھی تو کراچی آئے ہوئے صرف تین دن ہی ہوئے ہیں "

" کیا مطلب ——— کیا آپ کا ارادہ یہاں طویل قیام کا ہے "

" ایسا بھی نہیں ——— لیکن میرا خیال ہے کہ دو تین روز بعد اگر چلا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا "

" کوئی کام ہے آپ کو ——— "

" ہاں ——— " افتخار احمد نے بات بنانے کی خاطر کہا " ایک کاروباری مسئلہ درپیش ہے' جس شخص سے الجھن میں مبتلا ہے وہ کراچی سے باہر گیا ہوا ہے اور اس کی واپسی دو روز بعد متوقع ہے "

" ٹھیک ہے ——— دو روز بعد سہی لیکن آپ ازراہ کرم سیٹ ابھی سے ریزرو کرا لیں تاکہ عین وقت پر کسی دشواری کا سامنا نہ ہو "

" بہتر ——— میں آج ہی اقبال کو بھیج کر نشستیں محفوظ کرا لیتا ہوں "

راحیلہ خاتون نے رکنے کی حامی بھر لی تو ایک بار پھر افتخار احمد عاشی کے سلسلے میں الجھ گئے۔ وہ طے کر چکے تھے کہ ہر قیمت پر عاشی کو بہو بنا کر مرحوم بہن کی روح کو سکون پہنچائیں گے' بات اگر ان کے اختیار کی ہوتی یا عاشی اپنی بدنصیب ماں کی ہم شکل نہ ہوتی تو افتخار احمد اب تک بیوی کو کسی نہ کسی طرح ہموار کر کے رشتے کی بات طے کر چکے ہوتے لیکن عاشی ہو بہو ماں کی تصویر تھی اس لئے وہ جلد بازی سے ہچکچا رہے تھے۔ مگر جب ایک دن اور گزر گیا تو وہ دل کڑا کر کے بیوی سے تذکرہ نکال ہی بیٹھے۔

" آپ کراچی آ کر کسی بات کو بھول تو نہیں رہی ہیں "

" کیسی بات ——— "

" ذرا ذہن پر زور دیں ——— ہو سکتا ہے کہ آپ کو یاد آ جائے "

راحیلہ خاتون کو چونکہ اپنے بناؤ سنگھار اور شب و روز کے سوشل کاموں کی مصروفیات سے فرصت نہیں ملتی تھی اس لئے وہ اقبال کی شادی کے لئے کسی لڑکی کو دیکھنے والی بات بھی یکسر فراموش کر چکی تھیں۔

کچھ دیر یوں ہی خلا میں تکتی رہیں پھر بولیں

"مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا ——"

"بات بہادر بیٹے کے متعلق تھی۔" افتخار احمد نے بڑے لاڈ سے یاد دلانے کی کوشش کی۔

"کیا ہوا —— کیا اقبال نے یہاں آکر بھی پڑھائی سے دل چرانا شروع کر دیا۔" راحیلہ خاتون بگڑ گئیں۔ "میں نے تو پہلے ہی اس تجویز کی مخالفت کی تھی —— پردیس میں ماں باپ سے دور رہ کر نوجوان لڑکے کچھ زیادہ ہی آزاد ہو جاتے ہیں۔"

"آپ سے کس احمق نے کہا کہ اقبال یہاں آکر اپنی تعلیم کی جانب سے لاپروا ہو گیا ہے۔" افتخار احمد نے تیزی سے کہا۔ "سچ پوچھئے تو کراچی آکر وہ پڑھائی کے سلسلے میں زیادہ بردبار اور سنجیدہ ہو گیا ہے۔"

"میں لاہور میں آپ سے اقبال کے مستقبل کے بارے میں کچھ کہا تھا —— اب یاد آیا۔"

"ارے ہاں ——" راحیلہ خاتون نے اپنی یادداشت تازہ کرتے ہوئے کہا پھر بولیں۔ "مجھے کراچی آئے چار روز ہو گئے اور آپ نے ابھی تک منہ میں دہی جما رکھی ہے —— جھوٹ موٹ بھی یاد دلانے کی کوشش نہیں کی کہ مجھے اقبال کے لئے دلہن بھی دیکھنی ہے۔"

"میں یہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آپ کو وہ لڑکا کتنا خیال ہے۔"

"بہرحال ——" راحیلہ خاتون نے بات ٹالتے ہوئے کہا "دیر آید درست آید —— یہ بتایئے کہ کب چل رہے ہیں مجھے اقبال کی دلہن دکھانے ——"

"آپ حکم دیں تو لڑکی یہاں بلا کر بھی آپ کو دکھائی جا سکتی ہیں لیکن ——"

"لیکن کیا ——" راحیلہ خاتون نے شوہر کی اچانک خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"لڑکی دیکھنے سے پہلے آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔"

"وعدہ! —— میں سمجھی نہیں۔"

"اگر لڑکی آپ کو اقبال کے لئے پسند آگئی تو آپ کسی اور وجہ سے اُسے رد کرنے کی کوشش نہیں کریں گی۔" افتخار احمد نے سنجیدگی سے کہا۔ مرحوم بہن کا خیال اُن کے چہرے پر کرب بن کر اُبھر آیا۔

"یہ آپ مجھ سے پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہیں۔" راحیلہ خاتون نے شوہر کے چہرے کے بدلتے تاثرات کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "کھل کر کیوں نہیں کہتے کہ آخر بات کیا ہے ——"

"میں نے اقبال کے لئے جس لڑکی کا انتخاب کیا ہے وہ بے حد نیک سلیقہ شعار، خوبصورت اور خوب سیرت ہے۔" افتخار احمد نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"یہ باتیں تو لڑکیوں کی خوبیوں میں شمار کی جاتی ہیں ——" راحیلہ خاتون بولیں۔

"شکل و صورت اور خدوخال کے اعتبار سے بھی وہ لڑکی اپنی مثال آپ ہے۔"

"یہ بات آپ لاہور میں بھی کہہ چکے ہیں ——"

افتخار احمد نے فوراً ہی کچھ نہیں کہا، کچھ توقف سے بولے

"جو خوبیاں میں بیان کر چکا ہوں کیا اس کے علاوہ بھی آپ کو کچھ اور درکار ہوگا۔"

"آپ کا اشارہ جہیز کی طرف تو نہیں ——"

"جہاں تک جہیز کا تعلق ہے وہ لڑکی اپنے ساتھ مناسب جہیز بھی لائے گی۔"

"پھر کیا بات ہے ——" راحیلہ خاتون نے پہلو بدل کر پوچھا۔ "کیا اس کا خاندانی پس منظر ٹھیک نہیں ہے"

"نہیں —— ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔" افتخار احمد نے جلدی سے کہا۔ "لڑکی کا تعلق اچھے خاندان سے ہے۔"

"اور ایسی کون سی بات ہو سکتی ہے جس کی وجہ سے آپ گھبرا رہے ہیں کہ اقبال کے لئے اس کا رشتہ رد

افتخار احمد ایک لمحے کے لئے پھر متوحل ہو گئے —— پھر دل کڑا کر کے بولے

"وہ —— بن ماں کی بچی ہے۔"

"یہ تو اور اچھی بات ہے۔" راحیلہ خاتون بولیں۔ "جہاں ساس سسر کا کھڑاگ نہ ہو وہاں زندگی میں زیادہ سکون ہوتا ہے۔"

"اس لڑکی کی ایک بدنصیبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنوں کے ہوتے ہوئے غیروں کے گھر پرورش پا رہی ہے۔" افتخار احمد نے دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے بڑے درد بھرے انداز میں کہا۔ "وقت اور حالات نے اسے وارثوں ہوتے ہوئے بھی لاوارث بنا دیا ہے۔"

"آپ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں ——؟" راحیلہ خاتون نے شوہر کو تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کا خیال درست ہے۔" افتخار احمد دبی زبان میں بولے۔ "میں اس لڑکی کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں اور یہی واقفیت میرے لئے پریشانی کا سبب بن گئی ہے۔"

"مجھ سے کیا وعدہ لینا چاہتے ہیں ——؟" راحیلہ خاتون نے شوہر کو گھورتے ہوئے سپاٹ لہجے میں دریافت کیا۔

"میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ اس لڑکی کو محض اس کی اپنی ذات کی خوبیوں میں جتنا چاہے پرکھ لیجئے گا لیکن اور وجہ سے اُسے رد نہ کیجئے گا ورنہ اس کا دل ٹوٹ جائے گا ——"

"آپ میرے تجسس کو ہوا دے رہے ہیں۔" راحیلہ خاتون نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "اب تو اس لڑکی کو دیکھنے کا اشتیاق پہلے کے مقابلے میں دوچند ہو گیا ہے ——"

"میں آپ کو اس کی تصویر اس وقت بھی دکھا سکتا ہوں۔"

"کیا مطلب —— کیا لڑکی نہیں دیکھی جا سکتی ——"

"وہ بھی دیکھی جا سکتی ہے لیکن مناسب ہوگا کہ آپ پہلے ایک نظر اس تصویر کو دیکھ لیں۔" افتخار احمد یہ کہہ کر اٹھے اور جا کر اپنے سوٹ کیس سے ایک تصویر نکال لائے اور دھڑکتے دل سے عاشی کی تصویر راحیلہ خاتون کے ہاتھوں میں تھما دی۔

راحیلہ خاتون نے بڑے تجسس اور اشتیاق سے تصویر کو لیا تھا لیکن اس پر پہلی نظر ڈالتے ہی وہ ایک دم چونک اٹھیں جیسے کسی بھیانک خواب کی تعبیر دیکھ کر سہم گئی ہوں۔

اُن کی نگاہیں عاشی کی تصویر پر مرکوز تھیں اور ذہن ماضی کے دھندلکوں میں بھٹک رہا تھا۔

افتخار احمد اپنی جگہ خاموش بیٹھے بیوی کے چہرے کے بدلتے تاثرات کا جائزہ لے رہے تھے۔

راحیلہ خاتون کی آنکھوں میں ابھرنے والی تیز چمک اور پیشانی پر نمودار ہونے والی اَن گنت سلوٹوں نے اُن کے ذہن میں اٹھنے والے طوفان کا پتہ دے دیا تھا —— وہ بھانپ چکے تھے کہ راحیلہ خاتون نے ایک نظر میں عاشی کو شناخت کر لیا ہے۔

—— چند لمحے خاموشی سے بیت گئے پھر راحیلہ خاتون نے تصویر سے نظر اٹھا کر افتخار احمد کی جانب دیکھا۔

اُن کی آنکھوں میں نفرت کوٹ کوٹ کر بھری تھی —— حقارتیں امڈ امڈ کر تڑپ رہی تھیں —— بلندیوں اور پستیوں کا فرق بڑا نمایاں نظر آ رہا تھا۔

تو یہ تھا آنے والے طوفان کی نشان دہی کر رہے تھے ——

طوفان ——

جو پوری شدت سے سر اُٹھانے کے لئے بے چین نظر آ رہا تھا

"کون ہے یہ لڑکی ——" راحیلہ خاتون نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

"ایک مجبور اور بے بس —— جو زمانے کی گردشوں کا شکار ہو کر لاوارثی کی زندگی گزار رہی ہے۔" افتخار احمد نے قدرے سنبھل کر نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

"کیا نام ہے اس کا ——"

"عاشی ——"

"کیا یہ لڑکی —— فائزہ کی بیٹی ہے" راحیلہ خاتون نے خشک لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں —— یہ میری مرحوم بہن کی آخری نشانی ہے"

"اور تم اپنی مرحوم بہن کی روح سے اپنی شرمندگی دور کرنے کی خاطر اسے اپنی بہو بنانے کے خواب دیکھ رہے ہو —— کیوں" راحیلہ خاتون کے لب و لہجے میں زہر کی تلچھٹ موجود تھی۔

"عاشی معصوم ہے، بے قصور ہے ——" افتخار احمد نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا "حالات کے پیش اُسے ہماری نفرت کی نہیں —— محبت اور سرپرستی کی ضرورت ہے"

"حماقتیں بار بار نہیں کی جاتیں افتخار صاحب ——" راحیلہ خاتون بل کھاتے ہوئے اٹھیں "ایک جو غلطی میرے بزرگوں سے ہو چکی ہے وہی بہت کافی ہے —— میں اُس کی سزا اپنی اولاد کو نہیں دے سکتی"

"لیکن عاشی کا کیا قصور ہے" افتخار احمد نے تلملا کر کہا "اس غریب کو تو یہ بھی علم نہیں کہ میں اس کا بدنصیب ماموں ہوں —— حالات کی ستم ظریفیوں نے خونی رشتوں کے درمیان بھی ایک پردہ حائل کر رکھا ہے ——"

"تو آپ بڑے شوق سے اُٹھا دیجئے یہ پردہ —— جا کر گلے لگا لیجئے اپنی معصوم اور نیک بھانجی کو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا لیکن کان کھول کر سن لیجئے کہ آپ کی حیثیت یا مظلوم بھانجی بہو بن کر میرے گھر کی دہلیز پر کبھی قدم نہ رکھ سکے گی"

"کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے ——"

"جی ہاں ——" راحیلہ خاتون لال پیلی ہو کر بولیں "قطعی اور آخری فیصلہ ——"

افتخار احمد جھلا کر رہ گئے، کچھ توقف سے بولے

"اقبال پر صرف آپ ہی کا نہیں —— کچھ میرا حق بھی ہے"

"میں تسلیم کرتی ہوں —— مگر آپ اس حق کا ناجائز استعمال نہیں کر سکیں گے" راحیلہ خاتون آپے سے باہر ہونے لگیں، غصے سے کپکپاتی آواز میں بولیں "میرا نام بھی راحیلہ ہے، میں دیکھتی ہوں کہ آپ باپ بیٹے کبھی اپنی من مانی کس طرح پوری کرتے ہیں ——"

"آہستہ گفتگو کیجئے ——" افتخار احمد نے دانت پیستے ہوئے کہا "آپ کے عزیز سنیں گے تو خیال کریں گے ہمارے بارے میں"

"خیال کرتے ہیں تو کیا کریں —— مجھے کسی کا ڈر یا خوف نہیں"

راحیلہ خاتون نے تلملا کر کہا پھر عاشی کی تصویر کو حقارت سے ایک طرف اچھالا اور پیر پٹکتی تیزی سے کمرے سے باہر چلی گئیں۔

افتخار احمد بیوی کے جانے کے بعد بھی کچھ دیر تک گنگ سے کھڑے اُلٹی ہوئی بساط کے بارے سنجیدگی سے غور کرتے رہے پھر اُنھوں نے آہستہ سے آگے بڑھ کر عاشی کی تصویر کو اُٹھا لیا —— ایک نظر دیکھا پھر اُس کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے —— !!

✱

تاریخ کا پیریڈ ختم ہوا تو ناجیہ کتابیں اُٹھائے لپکتی ہوئی شہباز کے قریب آگئی، وہ کلاس روم سے نکل کر لائبریری کی طرف جا رہا تھا۔

"ہیلو ——" اُس نے قریب جا کر شہباز کو دستک دی۔

"آپ ——"

"جی ——" وہ بڑے محبوبانہ انداز میں مسکرائی "بندی کو ناجیہ کہتے ہیں"

"آپ کچھ خفا نظر آ رہی ہیں ——"

"اس کا اندازہ کیسے لگا لیا جناب نے"

"آپ کی گفتگو سے ——"

"آدمی ذہین معلوم ہوتے ہیں" اُس نے کہا "میں آپ کے اندازے کی تائید کرتی ہوں"

"خفگی کی کوئی وجہ بھی ضرور ہوگی ——"

"آپ کی گمشدگی ——" اُس نے شہباز کو قاتلانہ نظروں سے دیکھا۔

"میری گمشدگی —— میں سمجھا نہیں"

شہباز نے اُسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا تو وہ پھر مسکرا دی، ایک خاص ادا سے سر کو خفیف سا جھٹک کر بالوں کی آوارہ لٹ کو پشت کی جانب اچھالتے ہوئے بولی

"آپ اتنے دنوں سے ملے جو نہیں ——"

"اوہ ——" شہباز نے طویل سانس بھری۔

"کہیں کھو تو نہیں گئے تھے ——" اس بار ناجیہ کے لہجے میں طنز کی آمیزش بھی تھی۔

"زندگی کی پُرپیچ راہوں پر دھوپ چھاؤں کا کھیل تو ہمیشہ جاری رہتا ہے" وہ سنبھل کر بولا "میری گمشدگی سے آپ نے خود کو پا لیا ہے تو اسے بھی میں اپنی خوش قسمتی ہی کہوں گا ——"

"آپ تو شعر میں بھی اچھی خاصی شاعری کر لیتے ہیں" ناجیہ نے برجستہ کہا

"اور شاعری صرف وہی سمجھ سکتا ہے جو خود بھی چوٹ کھایا ہوا ہو ——" اس بار شہباز نے بھی چبھتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"میں نے کچھ اور بھی سُنا ہے" ناجیہ نے معنی خیز انداز اختیار کر لیا۔

"میرے بارے میں ——"

"جی ہاں ——"

"کیا سُنا ہے ——"

"یہی کہ آجکل آپ بھی کسی غزل کی تکمیل میں مصروف ہیں"

شہباز نے چونک کر ناجیہ کو دیکھا —— وہ خوابیدہ نظروں سے شہباز کو گھور رہی تھی، ان ہوش رُبا نگاہوں میں تجسس بھی تھا اور شکایت بھی ——

شہباز نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا، اپنے دل کی ان دھڑکنوں کو شمار کرنے لگا جو ناجیہ کے جملے سے اچانک بے ترتیب ہو گئی تھیں —— وہ اس جملے میں ڈوب کر اس کی گہرائی کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند لمحے خاموشی سے دبے پاؤں گزر گئے۔

"آپ اچانک کچھ اُلجھ سے گئے ہیں" ناجیہ نے دبی زبان میں پوچھا، کوئی خاص بات ہے کیا ——"

"جی نہیں ——" وہ بڑی لاپروائی سے مسکرایا "بات تو کچھ بھی نہیں ہے ——"

"افسانے بلا عنوان کے ترتیب نہیں پاتے" وہ شوخ ہو گئی لیکن اس شوخی میں بھی تلخی شامل تھی "کیا خیال ہے آپ کا ——"

"عنوان اگر خوبصورت ہو تو بلاشبہ افسانہ تحریر کرنے کو جی کرتا ہے لیکن کچھ افسانے ایسے بھی ہوتے ہیں جو بلا عنوان رہ جاتے ہیں —— ایسے افسانوں کی تکمیل کی خاطر انسان کو زندگی کی بازی لگانی پڑتی ہے"

شہباز بے حد سنجیدہ ہو گیا —— وہ ناجیہ کی گفتگو کا مفہوم سمجھ رہا تھا۔

"آپ نے کیا سوچا ہے" ناجیہ نے آہستہ سے ہونٹ کاٹتے ہوئے سپاٹ آواز میں دریافت کیا "کیا آپ کو بازی زندگی کی بازی لگا دینے کو عقلمندی کہیں گے ——"

"آپ بھول رہی ہیں شاید" شہباز نے مسکرا کر بات بنانے کی کوشش کی "میں افسانہ نگار نہیں —— ایک سیدھا سادھا انسان ہوں"

"اور اگر زندگی کے موڑ پر کوئی خوبصورت عنوان آپ کی راہ میں اچانک آجائے تو ——"

اس کا جواب تو عنوان دیکھ کر ہی دیا جا سکتا ہے" شہباز لاپروائی سے بولا "چھوڑیئے بھی ان افسانوی

باتوں کو ـــــ یہ بتایئے آپ کی اسٹڈی کیسی ہو رہی ہے ـــــ"

"اسٹڈی کرنے کی کوشش تو کر رہی ہوں لیکن ـــــ"

"لیکن کیا ـــــ"

"کچھ باب ایسے مشکل آجاتے ہیں جو ذہن کو الجھا دیتے ہیں۔"

"میں ایک بات کہوں آپ سے ـــــ" شہباز نے موقع کی نزاکت کے تحت دوبارہ سنجیدگی اختیار

"کہیئے ـــــ"

"یقین کریں گی آپ ـــــ"

"اس کا انحصار تو بات کی نوعیت پر ہوگا۔"

"غلط فہمی اکثر بے بنیاد افسانوں کو جنم دیتی ہے لیکن ان باتوں کا حقیقت سے دُور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہوتا۔"

"آپ کا اشارہ کس طرف ہے ـــــ" ناجیہ نے تیزی سے پوچھا۔

"آپ کی طرف بھی ہو سکتا ہے ـــــ" شہباز نے برجستہ کہا پھر وضاحت کرتے ہوئے جلدی سے بولا "آپ اس وقت جس انداز میں میرے ساتھ قدم ملا کر چل رہی ہیں ـــــ لوگ اسے بھی افسانے کا عنوان دے سکتے ہیں۔"

"کیا آپ بھی اسے افسانہ کہیں گے۔" ناجیہ نے سرسراتی آواز میں دریافت کیا تو شہباز ایک لمحے کو چونک اٹھا پھر ایک لاپروا سی مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیر کر بولا۔

"جو عنوان راہ چلتے تلاش کیے جاتے ہیں وہ زندگی سے بھرپور کسی معیاری افسانے کا عنوان نہیں بن سکتے۔"

"میں سمجھی نہیں ـــــ" ناجیہ چلتے چلتے یکلخت رک گئی، اس نے تیکھی نظروں سے شہباز کو گھورا۔

"آپ کو کسی افسانے کا عنوان نہیں کہا جا سکتا ـــــ"

"پھر ـــــ" ناجیہ بدستور کھنچی کھنچی نظر آ رہی تھی۔

"غزل کہہ دوں تو آپ خفا تو نہیں ہوں گی۔" شہباز دل پر جبر کر کے مسکرایا۔

"ہمارے ایسے نصیب کہاں۔" ناجیہ نے بے باکی سے جواب دیا۔

شہباز کے ایک ہی جملے نے اُسے سرشار کر دیا تھا۔ "غزل" کہتے وقت اُس نے جس انداز میں نا کی نگاہوں میں جھانکا تھا وہ کس قدر خوبصورت اور حسین انداز تھا۔

پُرکشش ـــــ

دل فریب ـــــ

اور اپنائیت کے جذبوں سے بھرپور ـــــ

اُس پر ایک بے خودی سی طاری ہونے لگی، شہباز کے جملے نے جیسے اُس کے کانوں میں رس گھ دیا تھا ـــــ نشہ سا طاری کر دیا تھا اور اس نشے کے عالم میں اُس کی اپنی "فتح" کا خمار بھی شامل تھا۔

عدیل نے اُسے بتایا تھا کہ عاشی اور شہباز کو اُس نے تنہائی میں باتیں کرتے دیکھا اور اس بات سُن کر وہ آپے سے باہر ہو گئی تھی ـــــ شہباز اُس کی نگاہوں کا مرکز نہیں تھا لیکن وہ کالج کا ہیرو ضرور سمجھا جا پھر ـــــ وہ بھلا یہ کیسے برداشت کر سکتی تھی کہ کالج کے اس خوبرو ہیرو کا نام عاشی کے ساتھ آئے۔

عاشی ـــــ

جو اُس کے پیروں کی دھول تھی ـــــ

اُس کے مقابلے میں بے حد کمتر اور غریب تھی ـــــ

وہ بھلا اس کے مقابلے میں کیسے سبقت لے جا سکتی تھی ـــــ

شکست کے ایک موہوم تصور ہی نے ناجیہ کو تڑپا دیا ـــــ

وہ مجسم قہر بن گئی ـــــ

سراپا انتقام ہو گئی ـــــ

لیکن آج ـــــ

آج شہباز کے محض ایک جملے نے اُس کی تمام غلط فہمیاں دُور کر دیں ـــــ اُسے عاشی کے مقابلے فتح کا احساس ہوا تو وہ خوشی کے جذبوں سے سرشار ہو کر جھوم جھوم اٹھی۔ اپنی سربلندی پر فخر کرنے لگی۔ لیکن کو آنکھوں سے ہٹا کر اُس نے مست نظروں سے شہباز کو دیکھا جو اُس کے روبرو کھڑا مسکرا رہا تھا۔

نگاہوں کا تصادم ہوا تو اُس نے شرما کر جلدی سے نظریں جھکا لیں ـــــ چہرہ تپ کر گلنار ہو گیا۔ دل کی دھڑکنیں تو جیسے تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں اور اسی وقت فرخندہ کی آواز اُس کے کانوں میں گونجی وہ دھک سی رہ گئی۔

"کیا ارادہ ہے ناجیہ ـــــ کیا ہمارے ساتھ کینٹین کی طرف نہیں چلو گی۔"

فرخندہ نے کہا تو اُسے یاد آگیا کہ اُس نے سہیلیوں کے ساتھ آج آلو کے کٹلٹس اور کافی کا پروگرام بنایا تھا ـــــ شرمندگی مٹانے کی خاطر جلدی سے بات بناتے ہوئے بولی

"مجھے دراصل شہباز صاحب سے ہسٹری کے نوٹس لینے تھے ـــــ"

"ایسی بھی کیا لے مروتی ـــــ" فرخندہ نے کہا۔ "عدیل سُنے گا تو اس غریب کے دل پر کیا بیتے گی۔"

"عطیہ، ساجدہ، نیلوفر اور فرحت کہاں ہیں۔" ناجیہ نے فرخندہ کی بات ٹالنے کی خاطر پوچھا۔

"سب کینٹین پر تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔"

"چلو ـــــ"

ناجیہ جانے کیلئے مڑی تو فرخندہ نے مسکراتے ہوئے شہباز سے پوچھا۔

"کیوں شہباز صاحب، لے جائیں ناجیہ کو، آپ کی اجازت ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اگر آپ عدیل سے اجازت حاصل کر لیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔" شہباز نے سپاٹ لہجے جواب دیا۔

ناجیہ نے پلٹ کر ایک نظر شہباز کو دیکھا پھر فرخندہ کا ہاتھ تھامے روش پر قدم اٹھانے لگی۔ اور شہباز ـــــ اُس نے شانے اُچکاتے ہوئے یوں ایک لمبی سانس لی جیسے اُس کے ذہن سے کوئی وزنی بوجھ اتر گیا ہو۔

کالج سے واپسی پر وہ بڑے خوشگوار موڈ میں تھی ـــــ کار سے اُتر کر وہ گنگناتی ہوئی اپنے کمرے میں گئی، بیگ میز پر رکھتی ہوئی وہ سیدھی غسل خانے میں چلی گئی۔ نہانے سے اُس کا ذہن ہلکا اور تازہ ہو گیا۔ بالوں کو تولیے سے خشک کرتی ہوئی باہر آئی تو شرفو کو دروازے کے قریب کھڑا دیکھ کر اُس کا موڈ ایک لمحے کو خراب ہو گیا۔

عام حالات میں اگر اُس نے شرفو کو اس طرح اپنی تنہائی میں مخل ہوتے دیکھا ہوتا تو قیامت اٹھا کر رکھ دیتی لیکن آج وہ بہت مسرور تھی ـــــ آج اُس نے شہباز کو اپنے جانے میں فتح کر لیا تھا اور اس فتح پر وہ پھولے نہیں سما رہی تھی۔

شرفو کو بس ایک ثانیے کے لئے اُس نے گھور کر دیکھا پھر خلافِ توقع مسکراتے ہوئے بڑے نرم لہجے بولی۔

"کیا بات ہے ـــــ یہاں کیوں کھڑے ہو ـــــ"

"آپ کو بڑے سرکار نے یاد کیا ہے ـــــ"

"کوئی خاص بات ـــــ"

ناجیہ نے سوالیہ نظروں سے شرفو کو دیکھا پھر خود ہی اپنی حماقت پر مسکرا دی، بھلا شرفو اُس کے کیا جواب دے سکتا تھا، بالوں کو جھٹک کر پیچھے اچھالتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں ہیں ڈیڈی ـــــ"

"ڈرائنگ روم میں ـــــ"

شرفو جانے کے لئے پلٹا تو اُس نے آواز دے کر اُسے روک لیا۔

"میرے لئے فریش لائم کا ایک گلاس تیار کر کے اِدھر ہی لے آؤ ـــــ"

"ابھی لایا ——" شرفو نے بڑی سنجیدگی سے کہا پھر تیزی سے گھوم کر واپس چلا گیا۔

بالوں کو خشک کر کے اُس نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا، سفید پس منظر میں اُبھرے ہوئے گلابی پھولوں والے شلوار سوٹ میں وہ بڑی اسمارٹ لگ رہی تھی، قدِ آدم شیشے کے سامنے کھڑی وہ بالوں کو برش سے آخری ٹچ دے رہی تھی کہ شرفو لائم کا گلاس لے آگیا۔

"اِدھر میز پر رکھ دو ——" اُس نے برش رکھ کر خود کو مختلف زاویوں سے آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔

شرفو بڑی مستعدی سے گلاس میز پر رکھ کر واپس چلا گیا۔

اپنی تیاری سے مکمل طور پر مطمئن ہونے کے بعد وہ لہراتی ہوئی پلٹی، لائم کا گلاس اُٹھا کر ہونٹوں سے لگایا تو اُسے جھرجھری سی آگئی، کھٹاس کی تیزی پل بھر میں اُس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی، گلاس ختم کر کے اُس نے میز پر رکھا پھر گنگناتی ہوئی کمرے سے باہر آگئی۔

لاؤنج عبور کر کے وہ باپ سے ملاقات کے لئے ڈرائنگ روم کی طرف گھومی تو سامنے سے شمسہ بیگم آگئیں۔

"ہیلو ممی ——" اُس نے ہاتھ اُٹھا کر ماں کو وش کیا۔

"کیا سیر پر جانے کی تیاری ہو رہی ہے؟" شمسہ بیگم نے بیٹی کو سر سے پاؤں تک تکتے ہوئے پوچھا۔

"فی الحال ڈیڈی نے بلایا ہے اُن سے ملنے جا رہی ہوں اور پھر اس کے بعد —— تھوڑی سی ڈرائیونگ!"

"میری بات کا ——"

"پورا پورا دھیان ہے" وہ جلدی سے جملہ مکمل کرتے ہوئے بولی "تنہا نہیں جاؤں گی —— ڈرائیور ساتھ ہوگا"

"کیا بات ہے ——" شمسہ بیگم نے ناجیہ کی خوشی کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا "آج ہماری بیٹی بہت خوش نظر آرہی ہے ——"

"آج میں نے کالج میں ایک زبردست مقابلہ جیتا ہے ——" وہ شوخی سے بولی

"مقابلہ —— کیسا مقابلہ ——" شمسہ بیگم نے وضاحت چاہی۔

"ابھی نہیں —— پھر کسی وقت اطمینان اور تفصیل سے بتاؤں گی"

اُس نے ماں کی پیشانی کو بے اختیار چومتے ہوئے کہا پھر مسکراتی ہوئی تیزی سے پلٹی اور بہار کے کسی مست خرام جھونکے کی مانند لہراتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو ایک لمحے کو ٹھٹک کر رک گئی پل بھر میں اُس کی تمام خوشی جیسے کافور ہوگئی —— عاشی کو باپ کے پاس بیٹھے دیکھ کر اُس کی اُجلی اور کشادہ پیشانی یکلخت ہی شکن آلود ہوگئی —— اُس کے ذہن میں مختلف خیالات اُبھر کر آپس میں گڈمڈ ہونے لگے

اُسے عاشی کی موجودگی میں وہاں کس لئے طلب کیا گیا ہے ——

ایسی کیا بات تھی جو عاشی کی موجودگی میں ہونے والی تھی ——

کہیں ایسا تو نہیں کہ عاشی کو اس کی اور شہباز کی باتوں کا علم ہوگیا ہو ——

اور ——

اُس نے محمود حسین کی حمایت حاصل کر کے شہباز کے سلسلے میں ناجیہ کو شکست دینے کا منصوبہ بنالیا ہو —— ناممکن ——

اگر ایسا ہوا تو وہ عاشی کو کسی قیمت پر معاف نہیں کرے گی ——

عاشی ——

عاشی ——

عاشی ——

آخر عاشی کی حیثیت ہی کیا ہے ——

ایک ملازم کے بیٹے کی اولاد ہی تو تھی ——

حالات نے اُسے وقتی طور پر ناجیہ کے مقابلے میں ضرور لا کھڑا کیا تھا ——

لیکن ——

عاشی میں اتنی جرأت نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ ناجیہ کی برابری کر سکتی ——

ذرہ ہمیشہ ذرہ ہی رہتا ہے ——

دھوپ کی کوئی آوارہ کرن اُسے وقتی طور پر کندن کی طرح چمکا ضرور دیتی ہے ——

لیکن —— وہ آفتاب نہیں بن سکتا۔

دروازے کے قریب کھڑی وہ عاشی کو تیکھی نظروں سے گھورتی رہی پھر محمود حسین نے اُسے بلایا تو وہ خود کو سنبھالتی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی باپ کے قریب جا کر اُن کے برابر ہی بیٹھ گئی۔

عاشی کے ہونٹوں پر نظر آنے والی خدا داد تازگی اور مسکراہٹ نہ جانے کیوں اس وقت اُسے چبھ رہی تھی۔

"میں نے تم کو اس وقت ایک ضروری کام سے بلوایا ہے" محمود حسین نے بیٹی کو پیار سے مخاطب کیا۔

"جی ——" وہ آہستہ سے بولی، لہجے سے کھنچاؤ ظاہر ہو رہا تھا۔

"کیا بات ہے بیٹی ——" محمود حسین نے اُس کے جواب کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا "تمہارا جی تو ٹھیک ہے ——"

"میں ذرا جلدی میں ہوں ڈیڈی ——" اُس نے بات بناتے ہوئے کہا "فرحت میرا انتظار کر رہی ہے مجھے اُس کے ساتھ شام کی سیر کے لئے جانا ہے ——"

"اوہ! —— میں سمجھا کوئی اور بات ہے" محمود حسین نے اطمینان کا سانس لیا پھر بولے "مجھے دراصل مقدمے کی پیروی کے لئے اسلام آباد جانا پڑ رہا ہے، وہاں دو تین روز قیام رہے گا —— سوچ رہا ہوں سب لوگوں کو بھی ہمراہ لے چلوں، تم لوگ مری جا کر قیام کرنا، میں مقدمے کی پیروی ختم کر کے تم لوگوں کے پاس آجاؤں گا —— کیا خیال ہے تمہارا"

"کیا ممی بھی ساتھ چل رہی ہیں" اُس نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"نہیں —— وہ گھر اکیلا چھوڑنے پر تیار نہیں ہیں"

"پھر ——" اُس نے کنکھیوں سے عاشی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "اور سب لوگ کون ہیں جو ہمارے ساتھ چلیں گے"

"تم ہو، عاشی ہوگی اور میرا ارادہ اس بار شرفو کو بھی ساتھ لے چلنے کا ہے" محمود حسین نے کہا "غریب آدمی ہے —— ذرا سیر و تفریح کرے گا تو خوش ہو جائے گا ——"

"میں اس نظریے کے خلاف ہوں ڈیڈی" ناجیہ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تیزی سے بولی "مالک اور نوکر کے درمیان ایک محدود فاصلہ ہونا بہت ضروری ہے —— یہ فاصلہ ختم ہو جائے تو اکثر ملازم اپنی اوقات بھول جاتے ہیں"

"اپنا اپنا خیال ہے —— بہرحال، تم اگر نہیں چاہتیں تو شرفو کو ساتھ نہیں لے چلیں گے" محمود حسین بیٹی سے ایک امکانی بحث سے بچتے ہوئے کہا "تم بتاؤ —— تمہارا کیا پروگرام ہے"

"مجھے بھی معاف ہی رکھئے ڈیڈی" ناجیہ نے سنجیدگی سے کہا "امتحانات سر پر کھڑے ہیں، بلاوجہ پڑھائی کا نقصان ہوگا"

"گویا مجھے تنہا ہی جانا پڑے گا ——"

"تنہا کیوں —— عاشی ہوگی آپ کے ساتھ" ناجیہ کے لہجے میں ایک ہلکی سی کڑواہٹ بھی تھی۔

"جب تم نے انکار کر دیا تو یہ اب کھلا کیسے جا سکتی ہے ——"

"کیا مطلب ——" ناجیہ چونکی۔

"تمہارے آنے سے پہلے عاشی بیٹی نے بھی امتحانات کی وجہ سے تفریح پر جانے سے گریز کیا تھا اور

یہ طے ہوا تھا کہ اگر تم میرے ساتھ جانے پر آمادہ ہو گئیں تو پھر اسے بھی ساتھ چلنا ہوگا۔"

"اور مجھے یقین تھا انکل کہ ناجیہ بھی انکار کرے گی۔" عاشی مسکرا کر بولی۔

"کہیں تم دونوں نے پہلے سے آپس میں مسکوٹ تو نہیں کر رکھی تھی۔" محمود حسین نے مسکرا کر کہا۔

"ہمیں پروگرام کا علم کہاں تھا انکل ——" عاشی بولی "ہاں اگر آپ امتحانوں کے بعد مری چلنے کا پروگرام بنائیں تو ہم گلے گلے تیار ہیں ——"

"ٹھیک ہے اگر تم دونوں کی مرضی نہیں ہے تو پھر میں منشی کو ساتھ لے جاتا ہوں۔"

محمود حسین صوفے سے اُٹھے تو ناجیہ اور عاشی بھی اُٹھ گئیں —— ناجیہ ابھی تک عاشی کو تیکھی نظروں سے گھور رہی تھی لیکن عاشی نے اُس کا کوئی نوٹس نہیں لیا —— شاید اس لئے کہ اسے رونما ہونے والے حالات کا علم نہیں تھا —— وہ اس بات سے بھی لاعلم تھی کہ عدیل نے اُس کی اور شہباز کی ایک رسمی ملاقات کا ذکر ناجیہ سے کیا ہے اور ناجیہ اس کے حق میں طوفان کا رُوپ اختیار کر چکی ہے۔

محمود حسین ڈرائنگ رُوم سے اُٹھ کر اپنے کمرے کی سمت گئے تو ناجیہ عاشی کے ساتھ قدم اُٹھاتی باہر لان پر آ گئی۔ پھر جب وہ سبزے پر پڑی کرسیوں کی جانب جا کر ایک کرسی پر بیٹھی تو عاشی کو تعجب ہوا۔

"کیا بات ہے ——" اُس نے دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے ناجیہ سے پوچھا "کیا فرحت کے ساتھ سیر پر جانے کا ارادہ نہیں ہے؟"

"نہیں ——" ناجیہ نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر ایک توشکن انگڑائی لیتے ہوئے کہا "اب کچھ دل نہیں چاہ رہا ——"

"خیریت تو ہے ——" عاشی نے مسکرا کر دریافت کیا "یہ اچانک پروگرام کیسے تبدیل ہو گیا ——"

"کیسا نیت سے جی اُکتا گیا۔"

"آج خاصی موڈ میں نظر آ رہی ہو ——"

"شاید تمہارا خیال درست ہے لیکن ——" ناجیہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"لیکن کیا ——" عاشی نے پوچھا۔

"کبھی کبھی تنہائی کا احساس بھی اچھے خاصے موڈ کو چوپٹ کر دیتا ہے۔" ناجیہ نے بڑی شوخی اور بے باکی سے جواب دیا۔

"بہت خوب —— آج تو تم بالغوں جیسی گفتگو کر رہی ہو۔" عاشی کے گلابی ہونٹوں پر ایک شرمیلی سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔

"بدلتے موسم کی کرشمہ سازی ہے —— اپنا کوئی قصور نہیں۔"

"کچھ اسی مسئلے میں آنٹی بھی پریشان ہیں۔"

"کیا مطلب ——"

"فراز کی امی کا تقاضہ آئے دن زور پکڑتا جا رہا ہے۔" عاشی مسکرا کر بولی "بس، صرف تمہاری طرف سے ہاں کی دیر ہے ——"

"فراز ——" ناجیہ نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا "اچھا لڑکا ہے ——"

"پھر کیا خیال ہے ——" عاشی نے جلدی سے پوچھا "آنٹی سے کہہ دوں کہ تم تیار ہو ——"

"میں نے صرف فراز کو اچھا کہا تھا —— شادی پر رضامندی کا اقرار تو نہیں کیا۔"

"ایک ہی بات ہے۔" عاشی بولی "شادی بھی اسی کے ساتھ کی جاتی ہے جو اچھا لگتا ہے ——"

"عاشی —— ایک بات پوچھوں۔"

"پوچھو ——"

"فراز تمہیں کیسا لگتا ہے ——"

"بے انتہا نیک —— شریف اور ٹھوس کردار کا مالک ہے ——"

"اور ایسے لڑکے سے کوئی بھی لڑکی شادی کرنے پر آمادہ ہو سکتی ہے۔"

"میرا یہی خیال ہے ——"

"پھر —— تم فراز سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں۔"

ناجیہ نے برجستہ فراز کے ذکر کو ایک نیا موڑ دیا تو عاشی چونک سی گئی، سٹپٹا کر بولی۔

"فراز کا رشتہ تمہارے لئے آیا ہے ——"

"اس کی فکر مت کرو۔" ناجیہ نے لاپروائی سے کہا پھر قدرے سنجیدگی سے بولی "تم اگر تیار ہو تو میں ممی سے کہہ کر تمہاری بات پکی کرا سکتی ہوں ——"

"لیکن آنٹی نے فراز کے سلسلے میں تمہارا عندیہ معلوم کرنے کے لئے مجھے تعینات کیا ہے۔" عاشی کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے بولی۔

"تمہارا کیا اندازہ ہے —— کیا میں فراز کے ساتھ شادی کرنے پر اپنی آمادگی کا اظہار کر دوں گی۔"

"میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

"مجھے فراز پسند ہے ——" ناجیہ نے مسکرا کر کہا، پھر تھوڑے توقف سے بولی "لیکن —— میں اس سے شادی نہیں کروں گی۔"

"انکار کی کوئی وجہ ——"

"ممی نے صرف میرا عندیہ معلوم کیا ہے، وجہ نہیں دریافت کی ہوگی۔" ناجیہ نے تیزی سے کہا "تم ممی کو میرے فیصلے سے آگاہ کر سکتی ہو۔"

"تم اپنی مرضی کی مالک ہو ناجیہ لیکن آنٹی کو تمہارے فیصلے سے دکھ ہوگا۔" عاشی نے دبی زبان میں کہا۔

"مجھے معلوم ہے —— مگر میں دوسروں کی وقتی خوشی کی خاطر اپنی پوری زندگی کو روگ نہیں لگا سکتی۔" ناجیہ نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

عاشی چُپ سی ہو گئی، کچھ سوچ کر ڈرتے ڈرتے بولی۔

"ایک بات کہوں ناجیہ —— بُرا تو نہیں مانو گی۔"

"کہو ——" ناجیہ نے سنجیدگی سے عاشی کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"عدیل اور تمہارا کوئی جوڑ نہیں، آنٹی مخمل میں ٹاٹ کا پیوند کبھی پسند نہیں کریں گی۔" عاشی نے سہمے سہمے کہا۔

"اور ٹاٹ اگر مخمل کا پیوند بننے کے خواب دیکھنا شروع کر دے تو ——" ناجیہ چبھتے لہجے میں بولی "اس انقلاب کو تم کیا نام دو گی ——"

"میں —— میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔" عاشی نے چونک کر پوچھا۔

"وقت آنے دو —— تم میرا مطلب بھی سمجھ جاؤ گی —— اتنی جلدی کیا ہے۔"

ناجیہ نے بڑی بے باکی سے کہا پھر اُس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ اُبھر کر گہری ہوتی چلی گئی اور عاشی منہ کھولے ہکا بکا اُس کی باتوں کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔!

✱

بائیس سال تک راحیلہ خاتون جس صدمے کو جھیلتی آئی تھیں اور جس غم کو انھوں نے بڑی کاوشوں سے اپنی سوشل زندگی کے جگمگاتے لمحات میں چھپانے کی کوشش کی تھی وہ ایک بار پھر تلخ حقیقت بن کر اُن کے سامنے آ گیا۔

افتخار احمد سے اُن کی شادی خود ان کی اپنی پسند کی نہ تھی لیکن انھوں نے بزرگوں کی عزت اور گھریلو وقار کا بھرم قائم رکھنے کی خاطر کسی نہ کسی طرح خود کو ان سانچوں میں ڈھال لیا تھا جو تقدیر نے فراہم کیا تھا۔ بزرگوں کی رفاقت نے میاں بیوی کی طبیعت میں کچھ ہم آہنگی پیدا کر دی تھی۔

وقت کے ساتھ ساتھ راحیلہ خاتون نے بھی حالات سے سمجھوتہ کر کے زندگی کی ایک مخصوص ڈگر پر گزر بسر کی تھی لیکن افتخار احمد نے آج پھر اُن کے سکون کو تہہ و بالا کر دیا تھا، ان زخموں کو نئے سرے سے کرید کر ہرا کر دیا تھا جس پر راحیلہ خاتون نے بمشکل ماہ و سال کی کھرنڈ جمائی تھی۔

اقبال ان کا اکلوتا لڑکا تھا جس کی پرورش بڑے لاڈ پیار اور چاؤ سے ہوئی تھی' اُسے پھولوں کی سیج پر سونے کا نوالا دے کر پروان چڑھایا گیا تھا اور اسی لاڈ پیار نے اقبال کی عادتوں کو کچھ بگاڑ دیا تھا' کالج میں ہم عمر دوستوں کی صحبت نے اُسے غلط راہ پر ڈال دیا لیکن پھر اقبال نے بذاتِ خود اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی' خود اپنی کوتاہیوں کو دُور کرنے کی خاطر اُس نے لاہور چھوڑ کر کراچی میں داخلہ لے لیا۔ اس طرح وہ اپنے پُرانے دوستوں کی مخالفت اور دشمنی مول لئے بغیر اُن کی صحبت سے بھی دور رہ سکتا تھا اور اپنی پڑھائی میں بھی سکون و اطمینان سے دلچسپی بڑھا سکتا تھا۔

راحیلہ خاتون نے شروع شروع میں بیٹے کو کراچی بھیجنے کی سخت مخالفت کی مگر ازاں بعد اولاد کے بہتر مستقبل کے پیشِ نظر انھوں نے بیٹے کی وقتی جُدائی کو برداشت کر لیا تھا لیکن آج ——— آج انھیں اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔

افتخار احمد آئے دن کبھی کاروبار کی خاطر اور کبھی بیٹے سے ملنے کے بہانے کراچی آتے رہتے تھے' راحیلہ خاتون نے ان پھیروں پر کوئی توجہ نہیں دی تھی مگر عاشی کے مسئلے نے اچانک ان کے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا' اُن کے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ جن سسرال والوں کے نام اور وجود سے انھیں روزِ اوّل سے شدید نفرت تھی ——— جن لوگوں سے دُوری اختیار کرنے کی خاطر وہ شادی کے فوراً بعد شوہر کو ساتھ لے کر بیرونِ ملک چلی گئی تھیں ——— اس خاندان اور اسی گھرانے کی ایک لڑکی آج پھر اُن کی خوشیوں کی راہ میں دیوار بن کر حائل ہو گئی تھی۔

سسرال والوں سے قطع تعلق کرنے کی خاطر راحیلہ خاتون کو اپنی زندگی میں نہ جانے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے تھے' اپنی مرضی کے خلاف انھیں افتخار احمد سے اپنی بے پناہ لگاوٹ اور محبت کا ڈھونگ رچانا پڑا تھا' وقت کی طویل مسافت طے کرنے کی خاطر شہروں شہروں گھومنا پڑا ——— اس تمام عرصے میں راحیلہ خاتون نے افتخار احمد اور اُن کے گھر والوں کے درمیان ایک پردہ سا تان دیا تھا' وہ تمام خطوط جو افتخار احمد کے نام آتے کھولے بغیر انتہائی رازداری سے تلف کر دیئے جاتے اور افتخار احمد کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی کہ باپ اور بہن کو اُن سے کوئی سروکار نہیں رہا۔

پھر جب راحیلہ خاتون کو فائزہ کی شادی کی اطلاع ملی تو اُن کے دل کو قدرے سکون ہو گیا' اب انھیں اس بات کا خدشہ نہیں رہا تھا کہ افتخار احمد باپ کی موت کے بعد بہن کا بوجھ اٹھانے پر مجبور ہو جائیں گے ——— لیکن انھوں نے فائزہ کی شادی کی اطلاع بھی شوہر کے کان تک نہیں پہنچنے دی مبادا کہ بہن کی محبت میں بے قرار ہو کر وہ وطن واپس جا کر اُس کی خوشیوں میں شریک ہونے کی کوشش کرنے

وقت اسی طرح گردش کرتا رہا' راحیلہ خاتون کو اپنے سسر اسرار احمد کی موت کی اطلاع ملی پھر انھیں فائزہ کے دربدر ہونے کا علم ہوا لیکن وہ ان تمام خبروں کو اپنے وجود کے تہہ خانوں میں دفن کرتی رہیں پھر جب انھیں یقین ہو گیا کہ اب سسرال میں کوئی باقی نہیں رہا تو وہ شوہر کو لے کر واپس وطن آ گئیں۔

افتخار احمد کو وطن پہنچ کر باپ کی موت اور بہن کی بربادی کا علم ہوا تو وہ تڑپ اُٹھے' اس موقع پر راحیلہ خاتون نے شوہر کے ساتھ دل کھول کر آنسو بہائے اور انھیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ جس طرح وہ حالات سے لاعلم تھے اسی طرح انھیں بھی سسرال والوں پر جو کچھ بیتی اُس کی کوئی خبر نہیں تھی۔

موت کی ایک تیز و تند آندھی آئی اور زندگیوں کو اپنے جھکڑ میں لپیٹ کر دنیا کے ہنگاموں سے بہت دُور لے گئی ——— بچھڑ جانے والوں کے غم نے زندہ رہ جانے والوں کو خون کے آنسو رُلائے لیکن پھر وقت اُن کے دلوں پر مرہم بن گیا ——— گزرتی ساعتوں کی دُھول ماضی کے واقعات پر تہیں جماتی رہی ——— پھر حالات کی کروٹوں نے بیتے دنوں کے نقش بھی ذہنوں میں دُھندلا دیئے ——— دُھند چھٹی تو فضا صاف شفاف ہو گئی لیکن بائیس سال بعد ایک بار پھر عاشی کی خاموش تصویر نے نگاہوں کے سامنے آ کر راحیلہ خاتون کے سکون کو درہم برہم کر دیا ——— انھیں کانٹوں پر لوٹنے پر مجبور کر دیا۔

بات اگر اُن کے اختیار کی ہوتی تو وہ ایک پل کے لئے بھی نہ خود کراچی میں رُکتیں نہ اقبال کو وہاں ایک پل گزارنے کی اجازت دیتیں لیکن حالات کے نشیب و فراز نے انھیں مصلحتوں پر عمل کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ غصے میں آ کر شوہر کے سامنے دل کی بھڑاس نکال چکی تھیں لیکن بیٹے سے دوٹوک فیصلہ کرنے سے پیشتر وہ اُس کے دل کا بھید جاننا ضروری

سمجھیں ——— وہ اس بات کو جاننے کے لئے مضطرب تھیں کہ عاشی اور اقبال کے درمیان اب تک کیا راہ و رسم پیدا ہو چکی ہے' اُن کی ملاقاتوں کی نوعیت کیا ہے۔

جوان لڑکے کو سرزنش کرنے میں انھیں اس بات کا خوف بھی تھا کہ کہیں اگر بیٹے کی اولاد نے بھی عشق کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُن کا ساتھ دینے اور حکم ماننے سے انکار کر دیا تو پھر وقت کی بساط ہمیشہ کے لئے اُن کے ہاتھوں سے چھن جائے گی ——— انھیں اولاد کی خوشیوں اور اُس کی محبت کی خاطر حالات کے سامنے سرنگوں ہونا پڑے گا۔

لیکن ———

وہ کسی قیمت پر جھکنے کو تیار نہ تھیں ———

ماں کی ممتا وقت کی کروٹ سے ٹکرا کر تڑپ اٹھی تھی ———

جذبوں میں ہلچل قدرتی امر تھا ———

رگوں پر جو نشتر لگے تھے انھوں نے مندمل ہوتے گھاؤ کو ناسور کی شکل دے دی تھی۔

تاریخ ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔

ماضی میں راحیلہ خاتون کی شاطرانہ چالوں نے انھیں فتح سے ہمکنار کیا تھا ———

فتح کے احساس نے انھیں مغرور کر دیا تھا ———

لیکن یہ غرور قدرت کی لازوال قوتوں کے لئے ایک چیلنج بن گیا۔

رحمتِ خداوندی کو جوش آیا ———

مشیتِ ایزدی کے حکم سے فلک کی رفتار تیز ہوئی۔

اور ایک ہی شہ میں راحیلہ خاتون کے بتے بازی مات ہو گئی ———

اور اس شکست کے احساس نے راحیلہ خاتون کے جذبۂ انتقام کو اور ہوا دے کر بھڑکا دیا ———

اس پوزیشن پر بھی عاشی کو قبول کرنے پر تیار نہ تھیں بلکہ انھوں نے طے کر لیا تھا کہ وہ عاشی کا کانٹا اتنی خوبصورتی سے افتخار احمد کی زندگی سے نکال پھینکیں گی کہ سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی کو بھی کوئی گزند نہ پہنچے گا۔

افتخار احمد سے جھڑپ ہو جانے کے بعد وہ تمام رات ایک پل کو بھی نہ سو سکیں' ساری رات عاشی کے متعلق تلخ کرتی رہیں' انھیں اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ جوانی دیوانی ہوتی ہے اور دلوں میں بھڑکنے والی آگ اتنی آسانی سے سرد نہیں ہوتی چنانچہ راحیلہ خاتون نے نہایت غور و خوض کے بعد ایک آخری فیصلہ کیا اور صبح کا منہ ہاتھ دھو کر اور تیار ہو کر ناشتے کی میز پر آ گئیں۔

گھر کے دوسرے افراد کے سامنے انھوں نے خود کو لے دیئے رکھا' افتخار احمد کے چہرے پر بیتی باتوں کا اثر ابھی تک موجود تھا' کچھ کھنچے کھنچے اور چپ چپ نظر آتے تھے' راحیلہ خاتون نے شوہر کی خفگی کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ ناشتہ کے بعد جب اقبال کالج جانے لگا تو انھوں نے اُسے روکتے ہوئے کہا۔

"اقبال بیٹے ——— ذرا میرے ساتھ کمرے میں چلو' مجھے تم سے کچھ ضروری اور اہم باتیں کرنی ہیں۔"

"مجھے کالج کی دیر ہو جائے گی ممی ———"

"ہو جانے دو ———" راحیلہ خاتون نے خشک انداز میں کہا پھر دل پر جبر کر کے ذرا مسکرا کر نرمی سے بولیں "تمہارے جوابات کرنی ہے وہ تمہارے لئے بھی بہت اہم ہے ———"

اقبال نے دستی گھڑی پر نظر ڈالی' کالج جانے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا لہٰذا وہ ماں کے ساتھ اُن کی خواب گاہ میں آ گیا' راحیلہ خاتون نے تنہائی میں بیٹے کو شکایتی نظروں سے دیکھا پھر بولیں'

"تو مجھے کیا سمجھتا ہے ———"

"آپ ——— آپ میری بہت اچھی اور پیاری سی ممی ہیں لیکن ———"

"لیکن مجھے اپنی ماں پر اعتماد نہیں ہے ———" راحیلہ خاتون نے تیزی سے کہا' اس بار اُن کے لہجے کی کڑواہٹ کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

"——— آپ نے کیسے سوچ لیا" اقبال نے حیرت سے پوچھا۔

"تیری حرکتوں کی وجہ سے ——"

"میں —— میں سمجھا نہیں"

"ابھی سمجھاتی ہوں ——" راحیلہ خاتون نے بڑے لاڈ سے بیٹے کا کان پکڑتے ہوئے کہا "سچ سچ بتا یہ عاشی کون ہے ——؟"

"اوہ —— ممی ——" اقبال نے معاملے کی نزاکت کو سمجھا تو شرما کر ماں سے لگ گیا۔

"شرمانے سے کام نہیں چلے گا" راحیلہ خاتون مسکرا کر بولیں "میری باتوں کا ٹھیک ٹھیک جواب دے"

"لیکن —— آپ تو کل واپس لاہور جا رہی ہیں" اقبال نے ٹالنے کی کوشش کی۔

"تیری خوشی کی خاطر میں اپنی روانگی منسوخ بھی کر سکتی ہوں" راحیلہ خاتون نے اقبال کو اپنی نرمستا یقین دلاتے ہوئے بڑے پیار سے کہا "میرا لاہور جانا تیری خوشی سے زیادہ ضروری تو نہیں ——"

"اوہ ممی! —— یو آر گریٹ ——"

"کیسی ہے عاشی ——" راحیلہ خاتون نے..... لوہا گرم دیکھ کر بڑی خوبصورتی سے اُسے موڑنے کی کوشش کی۔

"بڑی سوئٹ اور پیاری لڑکی ہے —— بالکل معصوم گڑیوں جیسی ——"

"تو اس سے مل چکا ہے ——"

"جی ہاں —— دو ایک بار ملاقات ہو چکی ہے" اقبال نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"ایک بات پوچھوں ——"

"پوچھئے ——"

"کیا عاشی بھی تجھے پسند کرتی ہے ——"

"مجھے اس کا صحیح طور پر اندازہ نہیں —— مگر وہ مجھ سے ہمیشہ ٹھیک طرح ملتی ہے"

"وہ —— رہتی کہاں ہے" راحیلہ خاتون نے سنبھل کر بڑی محبت سے پوچھا۔

"بیرسٹر محمود حسین کی کوٹھی میں ——"

"کیا ——" راحیلہ خاتون چونک کر بولیں "کیا عاشی بیرسٹر محمود حسین کی کوئی عزیزہ ہے ——"

"جی نہیں ——" اقبال نے قدرے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا "دراصل عاشی اپنے مدد بابا کے ساتھ کی انکسی میں رہتی ہے —— بیرسٹر صاحب ان دونوں کے ساتھ بڑی محبت کا برتاؤ کرتے ہیں اور عاشی عاشی بیرسٹر صاحب کی لڑکی کے ساتھ کالج میں پڑھتی بھی ہے —— دونوں بڑی اچھی سہیلیاں ہیں"

"یہ مدد بابا کون ہیں ——" راحیلہ خاتون نے بیٹے کو کریدتے ہوئے دریافت کیا "میرا مطلب ہے عاشی سے اُن کا کیا رشتہ ہے ——"

"مجھے ٹھیک طور پر ان باتوں کا علم نہیں لیکن ڈیڈی سب کچھ جانتے ہیں آپ اُن سے ——"

"تہیں ——" راحیلہ خاتون نے سنجیدگی سے جواب دیا "میں تمہارے ڈیڈی سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی"

"کیوں ——"

"اس لئے کہ تمہارے ڈیڈی نے اب تک مجھے بھی تاریکی میں رکھا تھا"

"میں سمجھا نہیں ——"

"کیا تمہیں علم ہے کہ عاشی تمہاری سگی ماموں زاد بہن بھی ہے ——"

"جی ——" اقبال نے حیرت سے چونکتے ہوئے کہا "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں"

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں" راحیلہ خاتون اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولیں "اسی وجہ سے تمہارے ڈیڈی کا عاشی کے سلسلے میں کچھ جھگڑا بھی ہو گیا ہے لیکن میں اس کی سزا عاشی کو نہیں دینا چاہتی وہ معصوم ہے، بن ماں کی بچی ہے اور خدا جانے کن حالات کا شکار ہو کر بیرسٹر محمود حسین کے در پر پڑی ہوئی ہے"

اقبال گنگ سا کھڑا ماں کی بات سنتا رہا، اُسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"مجھ سے ایک وعدہ کرو اقبال" راحیلہ خاتون نے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی شائستہ محبت سے "اپنے والد کو میری اور اپنی گفتگو کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے —— یہ میری انا کا مسئلہ ہے —— اگر تمہارے ڈیڈی کا سوال تو میں اُس سے خود ملوں گی اور اگر خدا کو منظور ہوا تو اُسے تمہاری دلہن بنا کر دم لوں گی لیکن شرط یہی ہے کہ جب تک میں نہ کہوں تم اپنی زبان اپنے باپ کے سامنے بند رکھو گے ——"

"ٹھیک ہے —— میں ڈیڈی سے کچھ نہیں کہوں گا ——"

"ایک بات کی تاکید اور بھی ضروری ہے" راحیلہ خاتون جرا مسکرا کر بڑے پیار سے بولیں "جب تک عاشی کا بیاہ نہ ہو جائے تمہارا اس سے زیادہ ملنا جلنا بھی مناسب نہیں ہے ——"

"اوہ ممی ——" اقبال نے شرماتے ہوئے نظریں جھکا کر کہا پھر یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا کہ اُسے کالج کی دیر ہو رہی ہے۔

اور اُس کے جانے کے بعد راحیلہ خاتون نے بڑی شدت سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔

"عا —— شی ——" اُن کے ہونٹوں کو آہستہ سے جنبش ہوئی پھر اُن کی آنکھیں چمک اٹھیں اور یہ چمک کچھ مختلف نہیں تھی جو کسی بھوکے عقاب کی خوفناک آنکھوں میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ اپنے شکار حریف کو دبوچنے کے لئے پر پھیلا کر اُس کی جانب تیزی سے لپکتا ہے ——!!

✱ —— ✱

گزشتہ رات سے مدد کو ہلکا ہلکا بخار بھی ہو گیا۔

تین روز سے وہ شدید ذہنی خلفشار میں مبتلا تھا اور اُس کی یہ ہیجانی کیفیت افتخار احمد کی وجہ سے تھی جنہوں نے تین روز قبل اُس سے اچانک ملاقات کی تھی اور اس ملاقات کے دوران جو گفتگو ہوئی اُس نے اُس کے دل و دماغ پر بڑا گہرا اثر ڈالا تھا۔

حسبِ سابق اُس روز بھی مدد نے بڑی عاجزی اور خلوص سے افتخار احمد کو خوش آمدید کہا۔ عاشی نے بھی طور پر افتخار احمد کی آؤ بھگت کی۔ پھر مدد نے افتخار احمد کے اشارے پر عاشی کو ایک کام کے بہانے شہنشاہ بیگم کی طرف بھیج دیا۔ اور ایسا کرتے ہوئے اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں، خوشی کا ایک مانوس سا احساس اُس کے دل و دماغ کو تازگی بخش گیا۔

مدد نے زندگی کے نشیب و فراز، سرد و گرم کو بہت قریب سے دیکھا تھا، وہ جانتا تھا کہ جب بڑے بوڑھے نوجوان اور کنواری لڑکیوں کو گفتگو کے وقت ہٹانے کا اشارہ کرتے ہیں تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے چنانچہ اُس کا دل بھی خوشی کے اسی احساس سے چمک اُٹھا۔

عاشی کے جانے کے بعد اُس نے افتخار احمد کی جانب پُر امید نظروں سے دیکھا، جانے کیوں وہ بہت چپ اور کھوئے کھوئے سے نظر آ رہے تھے، مدد نے اُن کی خاموشی کی وضاحت ضروری نہیں سمجھی، یوں ہی کچھ اندیشے اُن کے چہرے کے مدوجزر کو تکتا رہا —— افتخار احمد کی خاموشی اُس کے اپنے دل میں بھی طرح طرح کے وسوسوں کو جنم دے رہی تھی۔ ایک ایک لمحہ بڑا کٹھن اور گراں گزر رہا تھا۔

پھر کچھ دیر بعد افتخار احمد نے پہلو بدلتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔

"مدد —— آج میں تم سے کچھ بے حد اہم گفتگو کرنا چاہتا ہوں"

"جی ——" مدد نے مختصر جواب دیا۔

"کیا میں اُمید رکھوں کہ تم میری باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرو گے اور ——"

"اور کیا افتخار میاں ——" اُس نے افتخار احمد کی اچانک خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے جلدی سے دریافت کیا۔

"مجھے اُمید ہے کہ تم —— مجھے مایوس نہیں کرو گے"

"آپ حکم دیجئے مالک —— میری کیا مجال کہ آپ کے کسی حکم سے سرتابی کر سکوں" مدد کے دل کی دھڑکنیں

"مجھے اپنی کوتاہیوں کا بڑی شدت سے احساس ہے ——" افتخار احمد نے ایک سرد آہ بھر کر شروع کیا "جو کچھ بیت چکا ہے واپس نہیں آسکتا البتہ پچھلی غلطیوں کے بوجھ کو کچھ ہلکا ضرور کیا جاسکتا ہے۔"

ممدو نے کوئی جواب نہیں دیا، چپ چاپ بیٹھا افتخار احمد کے چہرے کو دیکھتا رہا۔

"میں نے اپنی خوشیوں کی خاطر اپنے خاندان کی مسرتوں کو کیسے فراموش کر دیا لیکن گزرے لمحوں کی ایک پل کا احساس ناسور بن کر میرے وجود کو اندر ہی اندر کچوکے لگاتا رہتا ہے —— میں نے جو دولت حاصل کی اور جو شہرت کمائی ہے وہ اوپر سے مکمن ہے بڑی بھلوس اور مستحکم نظر آتی ہو لیکن اندر سے ہے —— ریت پر تعمیر کئے گئے اس محل کی طرح جو ایک پل میں بادِ مخالف کے جھونکے سے مسمار بھی ہو کر خاک کا ڈھیر بن سکتا ہے۔"

"ایسی بُری فال زبان سے کیوں نکالتے ہیں" ممدو نے کہا "خدا کو جو کچھ منظور تھا پورا ہو گیا ——"

"میں ندامت اور شرمندگی کے بوجھ کو کچھ کم کرنا چاہتا ہوں ممدو ——" افتخار احمد نے ہاتھ کا سہارا دے کر ممدو کی جانب التجا بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے "میں —— میں چاہتا ہوں کہ عاشی کو اپنے سینے سے لگالوں —— میں آج اقبال کے لئے تم سے عاشی کا رشتہ مانگنے آیا ہوں ——"

ممدو اپنی جگہ ایک لمحے کو جیسے بے جان ہو گیا، جس خوشی کی خاطر وہ ایک طویل مدت سے رہا تھا آج وہ اُسے بالآخر مل رہی تھی —— عاشی کے مستقبل کے لئے اُس نے جس ٹھوس اور محفوظ پناہ کے لئے سوچا تھا وہ خواب آج شرمندۂ تعبیر ہو رہا تھا۔

قدرت نے اُسے اُس کی حیثیت سے بڑھ کر نواز دیا تھا، ابھی کل ہی کی تو بات تھی جب وہ کے یہاں بحیثیت مالی کے ملازم تھا لیکن آج —— قدرت نے حالات کے پیش نظر اُسے افتخار احمد کے کیا تھا —— کل تک وہ ملازم تھا، اُس کا ہاتھ پھیلا رہتا تھا اور آج —— آج شومئی قسمت سے افتخا اُس کے آگے دامن پھیلانے پر مجبور ہو گئے تھے —— کیسا عجیب انقلاب تھا۔

"کس سوچ میں گم ہو گئے ممدو" افتخار احمد نے بے چینی سے پوچھا "کیا تم اقبال کو اس قابل نہیں سمجھتے"

"مجھے گنہگار تو نہ کیجئے افتخار میاں ——" ممدو تڑپ کر بولا "آپ کو جس طرح اقبال میاں پر حق ہے طرح عاشی پر بھی پُورا پُورا اختیار ہے —— وہ آپ کا اپنا خون ہے —— لیکن....."

"لیکن کیا ——"

"وقت اور حالات نے خون کے رشتوں کے درمیان جو خلیج پیدا کر دی ہے وہ بہت طویل اور گہر ممدو نے سنجیدگی سے کہا "اگر آپ اجازت دیں تو میں کسی وقت موقع نکال کر —— عاشی سے بھی ا مرضی دریافت کر لوں۔"

"مجھے قوی اُمید ہے کہ عاشی میری خواہشات کا احترام کرے گی۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو" ممدو نے ایک طویل سانس لے کر جواب دیا "وہ بچھڑے ہوئے رشتے ایک ہ تو میری محنت بھی رائگاں نہیں جائے گی اور —— فائزہ بی بی کی رُوح کو بھی قرار آجائے گا۔"

"میں تم سے ایک درخواست اور بھی کرنا چاہتا ہوں" افتخار احمد کچھ سوچ کر بولے "اقبال اور رشتے کی بات کا علم میرے اور تمہارے سوا فی الحال کسی اور کو نہیں ہونا چاہیئے۔"

"میں —— میں سمجھا نہیں افتخار میاں" ممدو چونک اُٹھا۔

"میں تم سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا" افتخار احمد نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا "عاشی کے سلسلے نے اقبال کی ماں کو بھی ہموار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ تیار نہیں ہے ——"

"کیوں ——" ممدو نے حیرت سے پوچھا۔

"میں اُس کے خاندان کا پہلا پیوند ہوں —— وہ دوسرا پیوند برداشت کرنے کو کسی قیمت پر نہیں ہے۔"

"کیا انھیں عاشی کے بارے میں علم ہو گیا ہے ——"

"ہاں —— میں نے اُسے سب کچھ بتا دیا" افتخار احمد ایک سرد آہ بھر کر بولے "اور کیا ایسے حالات میں یہ رشتہ مناسب ہو گا" ممدو نے دھڑکتے دل سے پوچھا اس کی بوڑھی آنکھوں میں خواہشوں اور مسرتوں کے روشن چراغ اچانک ٹمٹمانے لگے تھے۔

"مجھے اقبال پر پُورا پُورا اعتماد ہے، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ راحیلہ کی مخالفت کسی طور پر بھی عاشی کی زندگی پر برا اثر انداز نہیں ہو گی" افتخار احمد ٹھوس آواز میں بولے "میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ نکاح کے فوراً بعد عاشی اور اقبال کو ملک سے باہر بھیج دوں گا —— اور —— عاشی کے مستقبل کے تحفظ کے لئے اپنی تمام جائداد منقولہ و غیر منقولہ بھی عاشی کے نام کر دوں گا ——"

"ممکن ہے آپ درست سوچ رہے ہوں لیکن میرا تجربہ ہے کہ جن خوشیوں کی بنیاد مخالفتوں پر رکھی جائے زیادہ ٹھوس اور دیرپا نہیں ہوتیں" ممدو نے دبی زبان میں کہا۔

"میں تمہاری بات کا کیا مطلب سمجھوں —— کیا راحیلہ کی مخالفت کا علم ہو جانے کے بعد تم عاشی اور اقبال کے رشتے کی بات مناسب نہیں سمجھتے ——"

"آپ —— آپ مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں افتخار میاں"

"میں —— میں فائزہ کی رُوح کو سکون پہنچانے اور عاشی کے بہتر مستقبل کے لئے اپنی زندگی کی ہر قربانی دے سکتا ہوں ——" افتخار احمد نے فیصلہ کن انداز میں کہا —— "تم کہو تو میں عاشی کی مسرتوں کی خاطر راحیلہ کو ہمیشہ کے لئے اپنی زندگی سے علیحدہ کر دوں"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ——" ممدو تیزی سے بولا "نہیں افتخار میاں —— نہیں، آپ کا یہ اقدام مخالفتوں کو ختم کرنے کے بجائے اور خطرناک بنا دے گا ——"

"پھر —— تمہارا کیا جواب ہے"

"میں دو چار دنوں میں سوچ کر ہی کوئی جواب دے سکتا ہوں" ممدو نے ہچکچاتے ہوئے کہا "مجھے عاشی کو یہ بھی بتانا ہو گا کہ اُس کا اور آپ کا کیا رشتہ ہے —— اُس کا اپنا کیا مقام ہے ——"

"ٹھیک ہے —— میں تمہیں سوچنے کی مہلت دے سکتا ہوں" افتخار احمد نے آہستہ سے کہا پھر اٹھ کر خاموشی سے رخصت ہو گئے۔

اور —— ممدو تین روز سے شب و روز اسی گتھی کو سلجھانے میں الجھا ہوا تھا کہ وہ اچانک پیدا ہونے والی صورتِ حال کا کیا حل نکالے، ایک طویل مدت تک وہ نہایت خوش اسلوبی سے عاشی کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں کو بڑی ثابت قدمی سے نبھاتا چلا آرہا تھا لیکن وقت کی ایک ہی کروٹ نے اس کے وجود کو لرزہ براندام کر دیا —— وہ کسی قیمت پر بھی عاشی کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کو تیار نہیں تھا۔

عاشی ایک امانت تھی ——

اُس کے وجود کا ایک حصہ بن گئی تھی ——

عاشی کی خاطر تو اُس نے رحیمو کی خواہشات کو بھی قدموں تلے روند دیا تھا۔

مایوس کر کے لندن واپس بھیج دیا تھا ——

اس خیال سے کہ ماضی کی یادیں عاشی کے حال کو پریشان نہ کریں، اُس کے مستقبل کو کوئی گزند نہ پہنچائیں اُس نے رحیمو اور عاشی کو آمنے سامنے بھی نہیں ہونے دیا تھا ——

پھر ——

وہ عاشی کی خوشیوں کا تاج محل مخالفتوں کی بنیادوں پر کس طرح تعمیر کر سکتا تھا۔

وہ عاشی کو کچھ بتانے سے بھی مجبور تھا ——

اور خاموشی اُس کے وجود کو گھن کی طرح اندر ہی اندر چاٹ رہی تھی۔

آج بھی وہ ان ہی پریشان خیالات میں اُلجھا ہوا تھا جب عاشی نے قریب آتے ہوئے بڑے اشتیاق سے اُس کی خیریت دریافت کی پھر اُس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو ایک دم ہی پریشان ہو گئی۔

"بابا ——— تمہیں تو بڑا تیز بخار ہے، میں ابھی فون کر کے ڈاکٹر کو بلواتی ہوں"

"دیوانی ہو رہی ہے کیا ———" ممدو بولا "ہلکی سی حرارت ہے، بخار کی دو گولیاں کھلا دے ——— ٹھیک رہے گا"

"تم ہمیشہ اپنی بیماری سے اسی طرح غفلت برتتے ہو" عاشی روٹھے انداز میں بولی

"اچھا ——— چل آج گولیاں کھلا دے ——— بخار شام تک نہ اترے تو کل سویرے ڈاکٹر کو بھی بلا لینا"

"کل تم کوئی اور بہانہ کر دو گے" اُس نے ممدو کو بڑی معصومیت سے گھورتے ہوئے کہا۔

"نہیں کروں گا کوئی بہانہ ——— وعدہ"

"یوں نہیں ——— میرے سر کی قسم کھاؤ ———"

"اچھا بابا ——— قسم کھاتا ہوں"

ممدو نے قسم کھائی تو عاشی کو اطمینان ہو گیا، جلدی سے چائے تیار کر کے اُس نے اسپرین کی دو گولیاں کھلائیں پھر سرہانے بیٹھ کر اُس کا سر آہستہ آہستہ دباتے ہوئے بولی۔

"تم نے پھر اپنے دماغ پر کوئی بوجھ ڈالا ہو گا ——— تکان کی وجہ سے بخار آ گیا"

"تو تو اچھی خاصی ڈاکٹرنی ہوتی جا رہی ہے" ممدو کے ہونٹ مسکرا اُٹھے۔

"اتنے عرصے تمہاری تیمارداری جو کی ہے" عاشی نے بڑے بھولپن سے کہا "ڈھیر ساری دواؤں کے نام تو زبانی یاد ہو گئے ہیں"

"تیرے امتحان میں کتنے دن باقی رہ گئے ہیں" ممدو نے یونہی پوچھ لیا۔

"ایک مہینے بعد چھٹی ہو جائے گی اور پھر امتحان شروع ہو جائیں گے"

"تیاری تو مکمل کر لی ہے نا ———"

"تمہاری دعائیں شاملِ حال رہیں تو اس بار بھی فرسٹ آؤں گی"

"میری تو دعا ہے کہ خدا تجھے زندگی کے ہر امتحان میں کامیاب کرے اور تجھے کبھی ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑے"

"آمین بھی تو کہا کرو ———" عاشی نے شوخی سے کہا پھر تبسم سنجیدگی سے بولی "اچھا ——— سچ سچ بتا تم نے اپنے دماغ پر کیا بوجھ ڈالا تھا جو بخار آ گیا ———"

ممدو نے عاشی کے معصوم چہرے پر ایک نظر ڈالی، دھیرے سے مسکرایا پھر کچھ سوچ کر پوچھا۔

"چار چھ روز ہو گئے ——— اقبال نہیں آیا"

"ابھی پچھلے والے پھل بھی ختم نہیں ہوئے اور تمہیں فکر لاحق ہو گئی" عاشی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"بُری بات ہے بیٹی ———" ممدو نے عاشی کے چہرے پر نظریں جماتے جاتے کہا "کسی کے خلوص کا یہ مذاق نہیں اُڑاتے ———"

"میں مذاق کب اُڑا رہی ہوں" عاشی لاپروائی سے بولی "لیکن یہ بات کبھی مجھے اچھی نہیں لگتی کہ بلاوجہ کو منوں کے حساب سے پھلوں کے بوجھ تلے دبا دیا جائے ———"

"پھر وہی بچوں جیسی بات" ممدو بولا "افتخار میاں سنیں گے تو کیا کہیں گے ———"

"سچ پوچھو بابا تو افتخار انکل ہی کی وجہ سے میں اقبال کو برداشت کر لیتی ہوں ورنہ ایسے گوندھو جانے والے لڑکے تو مجھے زہر لگتے ہیں ———" عاشی نے نہایت صاف گوئی سے کہا "یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ جب دیکھو پھلوں کے ٹوکرا اُٹھائے چلے آ رہے ہیں اور بلاوجہ چپکے بیٹھے ہیں ———"

ممدو نے بہت غور سے عاشی کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا پھر ہونٹ چبانے لگا

عاشی نے اقبال کے سلسلے میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا اُس نے ممدو کو ایک نئی سوچ میں ڈال دیا تھا اور عاشی وہ ممدو کی سوچوں سے بے خبر اُس کے سرہانے بیٹھی آہستہ آہستہ سر دباتی رہی۔!!

سہیلیوں کے جھرمٹ میں وہ کلاس رُوم سے باہر نکلی تو موسم خاصا خوشگوار تھا۔ نیلے آسمان پر اودے اودے بادل ٹکڑیاں تیر رہی تھیں اور ہوا خنک ہونے کے ساتھ بھیگی بھیگی محسوس ہو رہی تھی۔

ناجیہ نے آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا تو فرحت چپ نہ رہ سکی، آہستہ سے بولی

"کیا ارادہ ہے ———"

اُس نے آسمان سے نظر ہٹا کر فرحت کو دیکھا جس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی جواب دینا چاہتی تھی کہ نیلوفر نے موسم کا رنگ دیکھتے ہوئے کہا

"اگر بادلوں کی ٹکڑیاں اسی طرح جمع ہوتی رہیں تو بارش کے امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا"

"امکانی باتوں سے کام نہیں چلے گا" عطیہ نے نیلوفر کا جملہ پکڑتے ہوئے بڑی برجستگی سے کہا "جو کچھ کہنا ہے کہو ———"

"میں موسم کی بات کر رہی ہوں" نیلوفر نے کڑوے لہجے میں جواب دیا

"تو میں کب تمہارے دل کا بھید دریافت کر رہی ہوں" عطیہ پٹ سے بولی

"تو بہ ———" ساجدہ نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا "تم دونوں میں تو ہر وقت یوں ٹھنی رہتی ہے جیسے ایک دوسرے کی سگی بہنیں ہو"

"مجھے کیا پڑی ہے کسی کو اپنی بہن بنانے کی" نیلوفر نے سنجیدگی سے کہا۔

"اور میں تو جیسے تمہارے پیار کے بغیر زندہ ہی نہ رہ سکوں گی" عطیہ نے جان بوجھ کر سنجیدگی اختیار کر لی "خدا کے لئے رحم کرو ——— اسی کا پیار مجھ سے سنبھالے نہیں سنبھلتا ——— دوسروں کا بوجھ اُٹھانے کی عادت ہے"

"بس بھی کر ———" عاصمہ نے عطیہ کو کہنی ماری "اتنی دلیری سے تو بیاہتا لڑکیاں بھی اپنے شوہروں کی چغلی نہیں کرتیں جتنا تو زبیر کا کر رہی ہے"

"تم کیوں جل رہی ہو ———" عطیہ نے شوخی سے کہا پھر نیلوفر کو کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولی "کیا تمہارے حواسلے پہلے کچھ کم ہیں جو تم بھی میری مخالفت میں صف آرا ہو رہی ہو ———"

"تمہاری ہے میری جوتی ———" نیلوفر نے چ چ خفگی سے کہا پھر تیز تیز قدم اٹھاتی پھاٹک کی سمت چلی گئی۔

"تمہاری زیادتی ہے عطیہ" ناجیہ نے نیلوفر کے جانے کے بعد مسکراتے ہوئے کہا۔

"دیکھ لیجئے ———" عطیہ نے وضاحت چاہی۔

"جو وجہ تم ہر وقت اس بے چاری کے پیچھے پڑی رہتی ہو ———"

"ساجدہ کی وجہ سے دل کڑھتا ہے ورنہ میں تو نیلوفر سے بات بھی نہ کروں ———"

"ہائیں ——" فرحت چونکی "یہ ساجدہ کا بچہ کہاں سے آگیا"

"کوئی نئی سوجھی ہوگی" ساجدہ نے مسکرا کر کہا۔

"ابھی تمہیں میری بات کا یقین بھی نہیں آئے گا لیکن اس وقت دل کا حال پوچھوں گی جب وقار کا رویہ بدل جائے گی"

"کیا مطلب ——" ساجدہ وقار کا نام سن کر یکلخت سنجیدہ ہوگئی۔

"اسی لئے تو کہتی ہوں میری بچہ کہ آنکھیں کھلی رکھا کرو —— دوست دشمن کی تمیز کرنا سیکھو ورنہ دن سر پر ہاتھ رکھ کر روؤ گی"

"مگر ہوا کیا —— کچھ پتہ تو چلے ——"

"ابھی تو بی نیلوفر تمہارے وقار پر صرف ڈورے ڈال رہی ہیں اس لئے تم بے خبر ہو" عطیہ بدستور سے بولی "پتہ تو اس وقت چلے گا جب وقار تمہارے ہاتھوں سے نکل کر تمہارے لئے وقار کا مسئلہ بن جائے"

"خدا سمجھے گا تجھ سے ——" ساجدہ مسکرا دی۔

"نہ مانو تم —— میری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے" عطیہ نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"آج عاشی نظر نہیں آرہی ——" نادرہ نے روش عبور کرتے ہوئے پوچھا "خیریت تو ہے"

"اس کے بابا کی طبیعت علیل ہے اس لئے آج نہیں آئی" ناجیہ نے جواب دیا۔

"خیال ہے تمہارا ——" فرحت نے برا سا منہ بنا کر کہا "امتحان قریب ہیں اس لئے بابا کی بیماری بہانے گھر میں بیٹھی کتابوں کا گھوٹا لگا رہی ہوگی ——"

"نہیں —— تمہارا یہ خیال غلط ہے" ناجیہ نے خلافِ توقع عاشی کی حمایت کی "ممدو بابا کی حالت کئی دنوں سے خراب ہے، رات ڈاکٹر بھی دیکھنے آیا تھا ——"

"تم کہتی ہو تو مانے لیتی ہوں ورنہ مجھے کبھی یقین نہیں آتا"

"یار، موسم واقعی بڑا رومانٹک ہو رہا ہے" فرخندہ بولی "ہوا کی خنکی جسم کو گدگدا رہی ہے ——"

"کیا ——" عطیہ نے چونک کر فرخندہ کو دیکھا "ذرا پھر سے تو کہنا —— آج تو تم بالغوں جیسی باتیں کر رہی ہو"

"تمہاری صحبت کا اثر ہے ورنہ بندی کس قابل ہے" فرخندہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

عطیہ نے پلٹ کر کچھ کہنے کے لئے پر تولے لیکن اسی وقت سامنے سے زبیر آگیا اور وہ بولتے بولتے خاموش رہ گئی جیسے سرے سے منہ میں زبان ہی نہ رکھتی ہو۔

"بولو نا ——" فرخندہ نے زبیر کو سنانے کی خاطر قدرے اونچی آواز میں کہا "زبیر صاحب ہی تمہیں سانپ کیوں سونگھ گیا"

"تم لوگوں سے جدائی کا خیال آگیا" عطیہ نے دبی زبان سے جواب دیا۔

"جدائی؟ —— کیا مطلب ——" ناجیہ نے وضاحت چاہی

"اب تم سے کیا چھپانا ——" عطیہ نے بڑی بے باکی سے کہا "آج مجھے زبیر کے ساتھ ذرا شاپنگ جانا ہے"

"جبھی موسم انگڑائیاں لے رہا ہے ——" ساجدہ بولی۔

"سچے پیار کی یہی نشانی ہوتی ہے" عطیہ نے شوخی سے جواب دیا پھر قدم بڑھاتی زبیر کے قریب

"آج تمہارے شہباز صاحب بھی نظر نہیں آرہے" فرحت نے ناجیہ سے سرگوشی کی۔

"جانے کیا بات ہے ——" ناجیہ نے جھرجھری لیتے ہوئے جواب دیا۔

"عطیہ کے گھر والے بڑے براڈ مائنڈڈ (BROAD MINDED) ہیں" ساجدہ نے کہا "زبیر کے اس کے گھومنے پھرنے پر ذرا اعتراض نہیں کرتے"

"تم بھی وقار کے ساتھ گھوما پھرو —— منع کس نے کیا ہے" فرحت بولی

"اپنے ایسے نصیب کہاں ——" ساجدہ نے ایک سرد آہ بھری ——" میرے گھر والے اس معاملے میں زیادہ ہی قدامت پسند واقع ہوئے ہیں، اگر کسی کو وقار اور میری دوستی کی بھنک بھی مل گئی تو قیامت آجائے گی"

"پھر ——" ناجیہ نے دریافت کیا —— "تم دونوں کا بنے گا کیا"

"خدا ہی بہتر جانتا ہے ——"

ساجدہ نے اس بار کچھ ایسی حسرت سے کہا کہ سب ہی سہیلیاں بے اختیار ہنس دیں پھر یکایک کے بعد ساجدہ اور عاصمہ بس اسٹاپ کی طرف چل گئیں۔ فرحت کی گاڑی آگئی تھی اس لئے وہ نادرہ کو راستے میں اتارنے کی خاطر اپنے ساتھ لے گئی، رفعت کے بھائی اُسے لینے آئے تھے اس لئے وہ اُن کے ساتھ چل گئی تو ناجیہ پارکنگ کی طرف آگئی، موسم کی کروٹ نے اُس کے چہرے کی شگفتگی کو کچھ اور تر و تازہ کر دیا تھا۔

سن سن کرتی موسم کے اعتبار سے گنگناتی وہ قریب کھڑی کار کے پاس گئی تو یکلخت ٹھٹھک کر رہ گئی ایک لمحے کو اُس کے چہرے کے تاثرات بدلے لیکن پھر اُس نے خود پر قابو پا لیا، ہونٹوں پر قاتلانہ مسکراہٹ لئے وہ عدیل کے قریب جا کر یوں رک گئی جیسے اُسی کی منتظر ہو۔

"کہاں تھے تم ——" اُس نے شوخی سے عدیل کے اُترے اور سُتے ہوئے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے شکایت کی "کتنی دیر سے تمہیں لڑکوں کے ہجوم میں تلاش کرتی پھر رہی ہوں ——"

"کیا پروگرام ہے تمہارا —— گھر جاؤ گی یا....." عدیل نے جملہ نامکمل چھوڑ کر ناجیہ کی آنکھوں میں جھانکا۔ زندگی سے بھرپور شرارتیں رقص کرتی نظر آرہی تھیں۔

"تم کیا چاہتے ہو ——" اُس نے عدیل کو خمار بھری نگاہوں سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"میں —— میں ——" وہ گڑبڑا گیا۔

"ہاں —— میں تم ہی سے مخاطب ہوں" ناجیہ اُس کی بوکھلاہٹ پر مسکرا دی۔

"مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں"

"پھر تکلف کس بات کا ہے —— آؤ، میں تمہیں ڈراپ بھی کر دوں گی اور باتیں بھی ہو جائیں گی"

عدیل خاموشی سے اُس کے برابر اگلی نشست پر بیٹھ گیا، گیٹ پر موجود ان گنت نظریں گاڑی کو مشکوک نظروں سے دیکھ رہی تھیں لیکن ناجیہ نے کسی کی پروا نہیں کی، نہایت اعتماد سے گاڑی اسٹارٹ کی پھر اُسے ہجوم کے درمیان سے نکالتی کھلی سڑک پر لے آئی —— عدیل خلافِ توقع کچھ چپ چپ سا تھا۔

"تم —— مجھ سے کچھ ضروری باتیں کرنے والے تھے" ناجیہ نے اُسے یاد دلایا۔

"ماں کئی دنوں سے بیمار پڑی ہوئی ہیں" عدیل نے نشست پر پہلو بدلتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔

"کوئی خاص بات ——" ناجیہ نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں —— دراصل —— ماں تمہارے سلسلے میں جاننا چاہتی ہیں"

"میرے سلسلے میں —— کیا جاننا چاہتی ہیں"

"میرا مطلب ہے کہ وہ بیمار اور تمہارے بارے میں فکرمند ہیں ——"

"وہ کیوں ——"

"یہ کیا بات کہوں —— بُرا تو نہیں مانو گی"

"کہو ——" اُس نے سامنے سڑک پر نظریں جمائے ہوئے لاپروائی سے جواب دیا۔

"ماں کا خیال ہے کہ تم ——" عدیل ایک بار پھر ہچکچا گیا، اس بار بھی جملہ نامکمل رہ گیا۔

"اوہ —— کم آن عدیل" وہ بیباکی سے بولی "جو کچھ کہنا ہے کھل کر کہو —— ہم آج پہلی بار تو ایک دوسرے سے نہیں مل رہے جو تم اس قدر جھجک رہے ہو ——"

"ماں کو اس بات کا یقین نہیں ہے کہ ہم مستقبل میں ایک ہو سکیں گے" عدیل نے سپاٹ آواز میں کہا، اس کی نظریں سڑکوں کے جنازے اُٹھا رہی تھیں۔

عدیل کی بات پر وہ چونک اُٹھی، اُس نے ذرا گردن گھما کر عدیل کو دیکھا، ایک لمحے کو نجانے
پھر جانے کیوں ایک تبسم اپنے گداز ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے بولی،
" تم نے ماں سے اُن کے خیال کی وجہ دریافت نہیں کی ——— "

" کی تھی ——— "

" کیا جواب ملا ——— "

" ماں کا کہنا ہے کہ زمین اور آسمان کبھی ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے "

" تمہارا کیا خیال ہے ——— " اُس نے بڑی لاپروائی سے سوال کیا۔

" میں ——— میں تمہارے رحم و کرم پر ہوں " عدیل نے ہونٹ کاٹتے ہوئے جواب دیا " میرے مستقبل
کا فیصلہ میں نہیں، تمہارے اختیار میں ہے ——— "

" دوسروں کی انگلی پکڑ کر چلنے والے عدم اعتماد کا شکار ہو جاتے ہیں ——— "

" جذبات کی رَو میں بہنے والے ساحل تک نہیں پہنچا کرتے " وہ یکلخت سنجیدہ ہو گئی " میرا مشورہ ہے کہ تم اپنا
صرف پڑھائی پر توجہ دو ——— امتحان قریب ہیں "

" ماں کے سوال کا کیا جواب دوں ——— "

" انھیں سمجھانے کی کوشش کرو کہ مستقبل ابھی بہت دور ہے "

" کوشش کروں گا ——— " عدیل نے آہستہ سے کہا پھر خاموش ہو گیا۔

" اب کس سوچ میں گم ہو گئے ——— " ناجیہ نے اُس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا

" امتحان کے بارے میں سوچ رہا ہوں ——— " عدیل نے بات بنانے کی کوشش کی

" تیاری کرنا ہمارے اختیار کی بات ہے ——— قدرت کو کیا منظور ہے یہ قدرت ہی جانے "

" ناجیہ ——— " عدیل تڑپ اُٹھا " اگر نتیجہ ہمارے حق میں نہ نکل سکا تو ——— "

" اُمید کا دامن آخر وقت تک نہیں چھوڑنا چاہیے "

" کچھ مسافر ایسے بھی ہوتے ہیں جو منزل کے قریب پہنچ کر دم توڑ دیتے ہیں "

" عدیل ——— " ناجیہ نے یکلخت پلٹ کر تیزی سے کہا " میں تم کو پہلے بھی کئی بار سمجھا چکی ہوں کہ مجھے بد
اور مایوسی میں ڈوبی ہوئی باتیں سخت ناپسند ہیں ——— "

" شاید اس لئے کہ تم اپنی جگہ مستحکم ہو ——— "

" اور تم ——— "

" میں نے زندگی میں پہلی بار تمہاری رفاقت کے سہارے خوشیوں اور مسرتوں کے خواب دیکھے ہیں "

" اوہ ——— پلیز عدیل " وہ چڑ سی گئی پھر خود ہی گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے بولی " آجکل شہباز اکثر کالج
غیر حاضر رہنے لگا ہے ——— تمہاری کیا رپورٹ ہے "

" جسے خود اپنی خبر نہ ہو وہ بھلا دوسروں کی نشاندہی کیا کر سکتا ہے "

" عدیل ——— "

" نہیں ناجیہ نہیں ——— " وہ تڑپ اُٹھا " مجھے جذبوں کے اظہار سے مت روکو ——— "

" تمہیں میری دوستی پر اعتماد نہیں ——— " ناجیہ نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا تو ایک بار پھر بہک گیا۔

" تمہاری دوستی مجھے اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہے "

" جو چیز عزیز ہو اُسے شکوک نظروں سے دیکھنا گناہ ہے ——— " ناجیہ نے بڑے پیار سے کہا " محبت
کا نہیں پرستش کا نام ہے ——— "

" جانے کیوں میرا اپنا اعتماد بار بار ٹوٹ جاتا ہے ——— "

" صرف میری دوستی اور خلوص پر اعتماد رکھو ——— باقی سب کچھ بھول جاؤ ——— "

" سچ ناجیہ ——— "

" ہاں ——— میں تم کو یقین دلاتی ہوں کہ میری دوستی تمہارے ساتھ مرتے دم تک قائم رہے گی ——— لیکن
ایک شرط پر "

" شرط ——— میں سمجھا نہیں "

" پہلے وعدہ کرو کہ تم میری کسی بات سے انکار نہیں کرو گے "

" وعدہ ——— " عدیل نے کہا " اب بتاؤ ——— شرط کیا ہے ——— "

" تم اپنی پڑھائی میں کوئی غفلت نہیں برتو گے ——— " ناجیہ نے سنجیدگی سے کہا " امتحان میں فرسٹ
پوزیشن لاؤ گے ——— اور ——— اور اپنی ماں کے کسی حکم سے کبھی بھی سرتابی نہیں کرو گے ——— "

" مجھے منظور ہے ——— " عدیل نے مسکراتے ہوئے کہا پھر شوخ نظروں سے ناجیہ کو دیکھنے لگا اور ناجیہ ———
وہ اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہی تھی ——— اُس نے عدیل
سے نظریں گھمائیں اور پیچھے بھاگتی ہوئی سڑک پر تمام توجہ مرکوز کر دی تھی ——— !!!

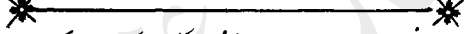

شمسہ بیگم کو عاشی کی ترجمانی ناجیہ کا عندیہ معلوم ہوا تو اُن کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ ناجیہ یوں اُن کی خوشیوں کو
پیش زبان ٹھکرا دے گی یہ بات کبھی اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں آئی تھی۔

بات صرف اُن کی اپنی خوشیوں کی ہوتی تو شاید اُنھیں صبر و قرار آجاتا لیکن انھیں صدمہ اس بات
کا تھا کہ اب وہ شائستہ بیگم کو کیا جواب دیں گی ——— کیا منہ دکھائیں گی ———

جوان لڑکی جس روش پر قدم بڑھا رہی تھی وہ شمسہ بیگم خود اپنی نگاہوں سے دیکھ چکی تھیں، معتبر اور
ذرائع سے انھوں نے عدیل کے بارے میں بھی کچھ معلومات حاصل کر لی تھیں، انھیں عدیل کی شرافت اور اُس
کے نیک نیتی کی طرف سے اطمینان تھا لیکن زمانے کی ہوا اور حالات کی گردش سے خوف زدہ تھیں ——— اس بات کا
بھی تھا کہ ناجیہ نے جس ساتھی کا انتخاب کیا تھا اُس کا اپنا مستقبل بھی غیر محفوظ تھا۔

عاشی کی بات سننے کے بعد اُن کا ذہن ایک لمحے کو جیسے گنگ ہو گیا، احساسات جیسے یکلخت منجمد ہو گئے
سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے دو چار یوں عاشی کو تکنے لگیں جیسے انھیں اپنی قوتِ سماعت پر شبہ ہو رہا تھا یا پھر شاید عاشی
نے کچھ کہا تھا وہ جھوٹ تھا۔

فریب تھا ——— !

دھوکہ تھا ——— !!

سراب تھا ——— !!!

بڑی دیر تک وہ بُت بنی بیٹھی عاشی کا منہ تکتی رہیں، خیالوں کا ہجوم اُن کے ذہن کو پریشان کرتا رہا،
اضطراب کن وسوسوں کا شکار ہو گئیں، مستقبل کے اندیشے اُن کی نمناک نگاہوں کے سامنے اُبھرے تو وہ تڑپ
کر ——— دراز پلکیں آنکھوں پر جھکا لیں مگر گھپ اندھیروں میں انھیں گھٹن کا احساس ہوا تو عجلت سے دوبارہ ....
کھول لیں ———

ابھی وقت کی رفتار اُن کے اختیار میں تھی۔

حالات ابھی بالکل بے قابو نہیں ہوئے تھے۔

ابھی تو صرف آغاز ہوا تھا۔

تباہیوں اور بربادیوں کی راہ پر ابھی پہلا سنگ میل نظر آیا تھا۔

ابھی واپسی کے امکانات ممکن تھے۔

لیکن ناجیہ سے دو بدو گفتگو کرنے کا نتیجہ خطرناک صورت بھی اختیار کر سکتا تھا۔

وہ شوخ تھی ———

خود سر تھی ———

نڈر تھی ———

اس کی تربیت میں جس غرور اور تمکنت کا خمیر ملا دیا گیا تھا وہ اُس کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔
رچ بس گیا تھا ـــــ وجود کا ایک عنصر بن گیا تھا۔
وہ اپنے وجود میں خود ایک اہم اور اٹل فیصلہ تھی۔
نرم پڑتی تو کلیوں پر بھی تھمی شبنم بھی شرما کر ڈھلک جاتی۔
گداز ہونٹوں پر تبسم جاگتا تو سبزہ زاروں کی مہک پھولوں کی خوشبو سے ہم آہنگ ہو کر پوری کائنات کو مہکا کر دیتی۔
ہر سمت رنگ و نور کے نغمے اُبلنے لگتے۔
ہواؤں کی موسیقی دلوں کو گدگدانے لگتی۔
وہ جھوم کر لبوں کو جنبش دیتی تو اُس کی آواز کا جادو پورے ماحول میں سحر گھول دیتا۔
تشنہ ساطاری ہو جاتا تھا۔
لیکن ـــــ
جب اس کی بھنوؤں کی کڑی کمان میں ایک ذرا بل آجاتا تو وقت کی رفتار سہم کر تھم جاتی تھی۔
اس کی ترچھی نظر جس جانب اُٹھتی ادھ موت کا خوف طاری ہو جاتا۔
اس کے ماتھے پر کوئی شکن اُبھرتی تو فلک کج رفتار کا سینہ بھی شق ہو جاتا۔
وہ اپنی ہستی میں ایک پوری دنیا تھی۔
مکمل کائنات تھی۔
وہ شعلہ بھی تھی اور شبنم بھی۔
اُس کے غصہ سے تو کوٹھی کے در و دیوار بھی کانپ کانپ اٹھتے تھے۔
شمسہ بیگم گم صم بیٹھی اپنے پریشان اور اُلجھے خیالات کو سلجھا رہی تھیں، محمود حسین ایک مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ وہ ہوتے تو شمسہ بیگم اُن سے کچھ کہہ سُن کر اپنے دل کا غبار ہلکا کر لیتیں باہمی مشورے کے بعد ممکن تھا کہ کوئی مناسب صورت نکل آتی ـــــ لیکن اس وقت گھر میں ان کے سوا کوئی دوسرا بڑا موجود نہیں تھا جو اُن کے ذہن پر چھی دُھند کو چھانٹ سکتا۔
عاشی بڑی دیر سے اپنی جگہ جمی بیٹھی شمسہ بیگم کے چہرے کے تاثرات سے ایک متلاطم دل کی تڑپ کا خاموش تماشہ دیکھ رہی تھی، اپنے تئیں اُس نے ناجیہ کو سمجھانے اور قائل کرنے کی ہر ممکن کوشش کر لی تھی لیکن اُسے دوٹوک جواب ملا تو اپنی حیثیت اور ناجیہ کے وقار کے پیش نظر اُس نے اپنے ہونٹ سی لئے۔
اس کے سوا اور وہ کر بھی کیا سکتی تھی ـــــ اور آج ـــــ آج جب شمسہ بیگم کے اصرار پر اُس نے دل کی زبان میں انھیں ناجیہ کے فیصلے سے آگاہ کیا تو شمسہ بیگم بھی سکتے سے دوچار ہو گئیں۔
خاموشی کے بعد بڑی حسرت بھری آواز میں عاشی سے پوچھا۔
"عاشی بیٹی ـــــ کیا تمہیں یقین ہے کہ ناجیہ نے تم سے جو کچھ کہا ہے وہ مذاق تو نہیں ـــــ" شمسہ بیگم نے طویل
"آنٹی ـــــ آپ ناجیہ کی طبیعت کو مجھ سے بہتر جانتی ہیں"
"ہاں ـــــ یہی تو افسوس ہے کہ وہ میری اپنی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کا ایک قطرہ ہے"
عاشی نے کوئی جواب نہیں دیا، دل مسوس کر رہ گئی۔
"عاشی ـــــ" کچھ دیر اپنی سوچوں میں گم رہنے کے بعد شمسہ بیگم نے اُسے پھر آواز دی
"جی ـــــ"
"ناجیہ نے فراز کے رشتے سے انکار کی کوئی وجہ نہیں بتائی ـــــ"
"جی نہیں ـــــ"
"پھر بھی ـــــ کوئی سبب تو ضرور ہوگا" شمسہ بیگم نے دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے عاشی کو کریدنے کی کوشش کی "کیا فراز کسی اعتبار سے اُسے پسند نہیں ہے"

"ناجیہ فراز کو بُرا نہیں سمجھتی ـــــ اچھا سمجھتی ہے لیکن اُسے زندگی کے ہمسفر کی حیثیت سے قبول کرنے کو تیار
"کیوں ـــــ"
"ہو سکتا ہے وہ بھی اپنی عملی زندگی کی جانب کوئی قدم اٹھانے سے گریز کر رہی ہو" عاشی نے ایک ماں کے دل کو سہارا دینے کی کوشش کی تو شمسہ بیگم کے چہرے کا کرب اور گہرا ہو گیا۔
"یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ کوئی قدم اُٹھا چکی ہو اور ہماری پسند کو اپنی خواہشات کی راہ میں رکاوٹ سمجھ رہی ہو"
"آنٹی ـــــ آپ ـــــ" عاشی چونک اُٹھی، بات ناجیہ کی تھی لیکن نہ جانے کیوں اُسے نظریں اٹھانے
نہیں ہو رہی تھی ـــــ الفاظ اُس کے حلق میں کانٹے بن کر چبھ رہے تھے۔
"ماں کا دل بڑا حساس ہوتا ہے عاشی" شمسہ بیگم ایک سرد آہ بھر کر بولیں "ضروری تو نہیں کہ جو بات کان میں
ول کی گہرائیوں تک پہنچے وہی دھڑکنوں کا سبب بنے ـــــ اکثر خدشات بھی ایک ماں کے حساس دل کو تہہ و بالا
ے ہیں"
"ناجیہ ابھی ناسمجھ ہے آنٹی ـــــ"
"اسے کب سمجھ آئے گی۔ جب پانی سر سے گزر جائے گا"
"وقت کے ساتھ ساتھ ذہن کی نشوونما بھی فروغ پاتی رہتی ہے" عاشی نے کہا "جو آج ہے وہ کل نہ ہوگا"
"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو کل ہو وہ آج سے بھی زیادہ بدتر ہو ـــــ"
"آپ ناجیہ کی طرف سے بہت زیادہ فکرمند ہیں آنٹی" عاشی بولی "کچھ اپنی صحت کا بھی خیال کیجئے ـــــ"
"تم ابھی ممتا کے تقاضوں کو نہ سمجھ سکو گی" شمسہ بیگم نے دیوار پر لگی اپنی جوانی کی ایک یادگار تصویر پر کوٹری
سے دیکھتے ہوئے کہا "بچے جب جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھتے ہیں تو والدین اپنی صحت سے زیادہ اُن کی
وں اور ضرورتوں کا خیال رکھتے ہیں ـــــ ازل سے یہی ہوتا چلا آرہا ہے"
"لیکن قسمت کو بنانا اور سنوارنا تو خدا کے اختیار میں ہوتا ہے" عاشی نے پہلو بدل کر جواب دیا "انسان
اپنے لئے کیا کر سکتا ہے"
"یہ تم کہہ رہی ہو عاشی ـــــ تم"
"آنٹی ـــــ اگر مجھ سے کوئی گستاخی سرزد ہو گئی ہو تو میں اُس کے لئے معافی کی طلب گار ہوں"
"قسمت کی لکیریں انسان کے اپنے ہاتھ میں ہوتی ہیں بیٹی" شمسہ بیگم نے بڑے پیار سے عاشی کے سر پر
پھیرتے ہوئے کہا "وہ، جو وقت کے دھاروں کے ساتھ بہہ جاتے ہیں تقدیر کے ہاتھوں کھلونا بن جاتے ہیں
وہ جو ثابت قدم رہتے ہیں خود اپنی تقدیر اپنی مرضی سے رقم کر لیتے ہیں"
"آپ ـــــ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں آنٹی لیکن احساس ہمیشہ غلطیوں کے بعد ہی ہوتا ہے"
"کچھ غلطیاں زندگی کا روگ بن جاتی ہیں" شمسہ بیگم نے عاشی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بڑی اپنائیت سے
"ناجیہ کی خیر خواہ ہو بیٹی ـــــ کسی وقت اُسے محبت سے سمجھانے کی کوشش کرنا کہ وہ جس راستے پر بڑھ رہی ہے
شکار کر رہی ہے وہ اس کیلئے صرف غیر محفوظ ہی نہیں بڑا مستحکم اور مخدوش بھی ہے ـــــ ریت کے ٹیلوں پر
انا کے محل تو تعمیر کئے جا سکتے ہیں لیکن زندگی کی بنیادیں نہیں رکھی جا سکتیں"
"میں ـــــ آپ کا اشارہ نہیں سمجھی ـــــ"
"عدیل ایک شریف گھرانے کا روشن چراغ ضرور ہے لیکن ناجیہ اور اُس کا کوئی جوڑ نہیں" شمسہ بیگم نے
ہوئی آواز میں کہا "میں حالات سے غافل نہیں ہوں عاشی ـــــ یہ اور بات ہے کہ خود ہماری محبت نے ہمیں
مجبور رکھا ہے"
"میں ـــــ میں کیا کر سکتی ہوں آنٹی؟" عاشی نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا "آپ حکم دیں ـــــ میں اس
کی آبرو کی خاطر اپنی حقیر زندگی کا نذرانہ ہر وقت پیش کر سکتی ہوں"
"مجھے معلوم ہے ـــــ تم بہت عظیم ہو بیٹی ـــــ کاش ناجیہ نے تم سے ہی کچھ سیکھ لیا ہوتا" شمسہ بیگم نے ہاتھ

ملتے ہوئے کہا۔ پھر کچھ توقف سے بولیں " ناجیہ سے فی الحال تذکرہ نہ کرنا ـــــ حجاب اور پردہ اُٹھ جائے تو پھر انسان کٹی ہوئی پتنگ کی مانند ڈولنے لگتا ہے ـــــ "

" آنٹی ـــ کیا انکل کو بھی ـــــ "

" نہیں ـــ تمہارے انکل کو ابھی حالات کا علم نہیں ہے "

" میرا خیال ہے کہ اگر آپ ناجیہ کو محبت سے حالات کی اونچ نیچ سمجھائیں تو وہ آپ کی بات ضرور مان جائے گی "

" میں تمہارے اسی خیال کے بھرم کو برقرار رکھنا چاہتی ہوں " شمسہ بیگم کے لہجے میں ممتا کی تڑپ شامل تھی

" کیا ـــــ " عاشی کے دل کو ایک دھچکہ سا لگا " کیا ناجیہ آپ کی بات بھی نہیں مانے گی "

" ابھی آزمائش کا کوئی ایسا وقت نہیں آیا جو تمہارے سوال کا جواب دے سکے "

" ایک بات پوچھوں آنٹی ـــــ "

" پوچھو ـــــ "

" اگر انکل کو حالات کا علم ہو گیا تو ـــــ "

" قیامت آجائے گی " شمسہ بیگم نے کہا " ہمیں ناجیہ کے سلسلے میں کوئی دانشمندانہ قدم نہایت سوچ سمجھ کر اُٹھانا پڑے گا ـــــ کوئی ایسا طریقہ کار جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی کو بھی کوئی گزند نہ پہنچے "

" میں آپ کی رائے سے متفق ہوں اور ـــــ "

اور قبل اس کے کہ عاشی اپنا جملہ مکمل کرتی ناجیہ کے گاڑی کے ہارن کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی اور وہ یوں اچانک سہم کر خاموش ہو گئی جیسے طوفان آگیا ہو ـــــ پھر شمسہ بیگم نے اشارہ کیا تو وہ جلدی سے اُٹھی اور تیز تیز قدم اٹھاتی کمرے سے نکلی اور پشت کے راستے سے ہو کر انکی کی طرف چلی گئی ـــــ !!

✱

محمود حسین اپنے دفتر میں بیٹھے ایک اہم دستاویز کی تیاری میں حد درجہ منہمک تھے جب چپراسی اندر داخل ہوا محمود حسین نے اس وقت دفتر کے تمام عملے کو منع کر رکھا تھا کہ انھیں کچھ دیر کے لئے بالکل تنگ نہ کیا جائے اور ملاقاتیوں کو اگلے دن طلب کیا جائے، چنانچہ چپراسی کی آمد ان کے بارخاطر پر گراں گزری، دروازہ کھلنے کی آواز نے اُن کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی تھی ـــــ انھوں نے نظریں اٹھا کر چپراسی کو دیکھا، سرزنش کرنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ چپراسی نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا

" معافی چاہتا ہوں صاحب لیکن وہ ـــــ "

" بات مختصر کرو " محمود حسین نے اپنی جھلاہٹ بمشکل ضبط کرتے ہوئے کہا

" ایک صاحب آپ سے ضروری ملاقات کرنا چاہتے ہیں "

" منتی سے کہو کہ انھیں کل کا کوئی مناسب وقت دے دے "

" منشی جی نے ان صاحب سے یہی کہا تھا جناب مگر وہ ـــــ "

" کام کی نوعیت کیا ہے " محمود حسین نے جھلاتے ہوئے پوچھا

" کچھ پرائیویٹ بات ہے " چپراسی بولا " ان صاحب نے یہی بتایا ہے "

" ان صاحب کا کوئی نام بھی ہے " محمود حسین تلملا کر بولے تو چپراسی کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا، جلدی سے اس نے ہاتھ میں دبی ہوئی کاغذ کی پرچی آگے بڑھا کر میز پر رکھ دی۔

" شہباز سرفراز علی " محمود حسین پرچی پر لکھے نام کو پڑھ کر چونکے پھر چپراسی سے کہا " ان صاحب کو عزت سے لے آؤ لیکن اب جب تک میں اجازت نہ دوں کسی اور کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہو گی "

" بہتر ہے جناب " چپراسی نے گلو خلاصی حاصل کرنے کے لئے سلام کرتے ہوئے کہا پھر اُلٹے قدموں واپس چلا گیا۔

محمود حسین نے سامنے بکھرے ہوئے کاغذات کو سمیٹ کر فائل میں بند کیا پھر اُٹھ کر صوفے کی جانب بڑھ ہی رہے تھے کہ شہباز داخل ہوا، محمود حسین نے بڑھ کر اُس کا استقبال کیا اور اپنے ساتھ ہی صوفے پر بٹھا لیا۔

" خیریت تو ہے شہباز میاں ـــــ تم اور میرے آفس میں " رسمی گفتگو کے بعد محمود حسین نے دریافت کیا۔

" کام کی نوعیت کچھ ایسی ذاتی اور اہم قسم کی تھی کہ میں نے گھر آکر آپ سے بات کرنی مناسب نہیں سمجھی " شہباز نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

اُجلے اور بے داغ سفید رنگ کے سفاری سوٹ میں اس وقت بھی اس کی شخصیت بڑی پُروقار دکھائی دے رہی تھی البتہ آنکھوں میں بار بار ابھرنے والا تجسس اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ اس وقت وہ ذہنی اُلجھنوں میں اُلجھا ہوا ہے۔

محمود حسین شہباز کی بات سُن کر چونکے، ایک لمحے کو انھوں نے شہباز کے چہرے کے تاثرات کو اپنی پُرکار نظروں سے جانچنے کی کوشش کی پھر بڑی اپنائیت سے بولے۔

" گھر بھی تمہارا ہے اور دفتر بھی، تم نے اچھا کیا جو یہاں چلے آئے "

" میں معذرت خواہ ہوں کہ اس وقت میری وجہ سے آپ کو زحمت ہوئی "

" کیا مطلب ـــــ "

" منشی جی نے مجھے باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ ـــــ "

" وہ ہدایت غیروں کے لئے تھی اپنوں کے لئے نہیں " محمود حسین نے مسکرا کر جواب دیا پھر بولے " کیا پینا پسند کرو گے، چائے، کافی یا کوئی ٹھنڈا مشروب "

" جو مناسب سمجھیں ـــــ " شہباز نے نہایت شائستگی سے کہا

محمود حسین نے اپنے خاص ملازم کو بلا کر کافی تیار کرنے کا حکم دیا پھر سنبھل کر بولے

" شہباز میاں ـــــ سب سے پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ جس مقصد سے تم یہاں آئے ہو وہ کسی عدالتی نوعیت ـــــ مطلب ہے کہ اس کا تعلق مقدمہ بازی وغیرہ سے تو نہیں ہے "

" جی نہیں ـــــ ایسی کوئی بات نہیں ہے "

" خدا کا شکر ہے ـــــ " محمود حسین نے اطمینان کا سانس لیا پھر پہلو بدل کر کہا " اب بتاؤ کہ تم تو بالکل ریت سے ہو "

" آپ بزرگوں کی دُعا ہے "

" پھر ـــــ اور کیا بات ہو سکتی ہے " محمود حسین نے بڑے خلوص سے پیار بھرے انداز میں شہباز کو ٹٹولتے ہوئے پوچھا " کہیں کوئی پرانا خاندانی مسئلہ یا جائداد کا جھگڑا تو نہیں درپیش ہے "

" جی نہیں ـــــ " شہباز نے سنجیدگی سے کہا پھر نظریں نیچی کرتے ہوئے دبی زبان میں بولا " میں جس کام سے اس وقت حاضر ہوا ہوں اُس کا تعلق صرف اور صرف میری ذات سے ہے "

" یہ کیسے ممکن ہے ـــــ " محمود حسین اپنی بزرگانہ شفقت کا اظہار کرتے ہوئے بولے " جب میں تمہارا بزرگ موجود ہوں تو تمہاری ذات صرف اور صرف کیسے ہو گئی ـــــ میرا مطلب ہے کہ میں بھی تمہارے ساتھ شریک ہوں "

" یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے انکل ـــــ "

ملازم کافی لئے داخل ہوا تو گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کے لئے منقطع ہو گیا پھر محمود حسین نے اُس کے چلنے کے بعد کہا

" شہباز میاں، اب تم بتاؤ کہ کس کام سے میرے پاس آئے ہو اور ایسی کیا بات ہے جو گھر پر نہیں ـــــ صرف اور صرف دفتر میں کی جا سکتی تھی ـــــ "

" انکل ـــــ " شہباز نے اپنی نشست پر سنبھلتے ہوئے کہا " آپ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ قدرت نے مجھے کسی بزرگ کے سایۂ شفقت سے بچپن سے محروم کر رکھا ہے ـــــ آج اگر قبلہ والد صاحب حیات ہوتے تو مجھے آپ کے پاس آنے کی ضرورت نہ پیش آتی "

" کیا تم مجھے غیر سمجھتے ہو ـــــ کیا میں تمہارا بزرگ نہیں ہوں " محمود حسین نے شکایتی انداز سے پوچھا۔

" یہ بات نہیں ہے انکل لیکن کچھ مرحلے ہر انسان کی زندگی میں ایسے نہ در آتے ہیں جب اسے اپنے کسی بزرگ کی

کمی کا بڑی شدت سے احساس ہوتا ہے ـــــ آج میں بھی اسی کربناک احساس کا شکار ہوں۔"

"خدا نہ کرے ـــــ" محمود حسین نے سنجیدگی سے کہا پھر ٹھوس آواز میں بولے "شہباز میاں، تمہارے میرے صرف دوست ہی نہیں بلکہ محسن بھی تھے اس لئے میں تم سے درخواست کروں گا کہ تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو بلا جھجک کہو اور مجھے اپنا بزرگ سمجھو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں کسی بزرگ کی کمی کا احساس نہیں ہونے دوں گا ـــــ اور اسی لئے میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ تم میری کوٹھی میں آجاؤ ـــــ تنہائی اکثر انسان کو اُلجھا دیتی ہے۔"

"مجھے اسی تنہائی کا احساس آج آپ تک لے آیا ہے۔" شہباز نے دبی زبان میں کہا

"گویا تم میرے غریب خانے کو اپنے قیام سے سرفراز کرنے کا ارادہ کر چکے ہو۔"

"میرا مقصد کچھ اور تھا انکل ـــــ"

"میں سمجھا نہیں ـــــ" محمود حسین نے وضاحت طلب انداز میں کہا۔

"میں ـــــ میں اپنا گھر آباد کرنا چاہتا ہوں اور اسی سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔" شہباز نے نظریں جھکا کر بڑے مہذب لہجے میں جواب دیا۔

محمود حسین ایک لمحے کو چونکے پھر صوفے پر پہلو بدل کر بولے،

"یہ تو بڑا نیک خیال ہے تمہارا ـــــ مگر اس سلسلے میں مجھ سے زیادہ تمہاری آنٹی تمہارے لئے مددگار ثابت ہوں گی، میرا مطلب ہے کہ اب میں اس عمر میں تمہارے لئے کہاں لڑکی تلاش کرتا پھروں گا ـــــ"

"لڑکی کا انتخاب بھی میں نے کر لیا ہے ـــــ"

"کر لیا ہے ـــــ" محمود حسین نے حیرت سے کہا پھر شہباز کو بغور گھورنے لگے۔

"جی ہاں ـــــ اور اسی رشتے کے سلسلے میں آپ سے گفتگو کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔" شہباز نے بدستور نظریں جھکائے ہوئے کہا۔

"میں تمہارا بزرگ بھی اور دوست بھی ـــــ تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو کھل کر کہو شہباز میاں۔"

"انکل میں نے اپنی زندگی کے لئے جو فیصلہ کیا ہے وہ بہت سوچ سمجھ کر اور نہایت غور و خوض کے بعد کیا ہے، اس ضمن میں اگر مجھے آپ کی تائید اور اجازت بھی حاصل ہو گئی تو میں اُسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔"

"کیا تم نے جس لڑکی کا انتخاب کیا ہے ـــــ میں اس سے واقف ہوں۔" محمود حسین نے محتاط انداز میں سوال کیا

"جی ہاں ـــــ"

"کون ہے وہ ـــــ" محمود حسین نے دبی زبان میں دریافت کیا

"عاشی ـــــ"

"عاشی ـــــ" محمود حسین یوں چونکے جیسے انھیں اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا ہو، کچھ دیر شہباز کو حیرت سے تکتے رہے پھر ہونٹ چباتے ہوئے بولے "کیا تم نے عاشی کے بارے میں معلومات حاصل کر لی ہیں ـــــ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ کون ہے، کیسی ہے، کیا ہے اور اس کا خاندانی پس منظر کیا ہے ـــــ"

"میں نے ان باتوں کی ضرورت نہیں محسوس کی لیکن اتنا ضرور محسوس کر لیا ہے کہ وہ میرے لئے ایک بہترین شریکِ زندگی ثابت ہوگی۔"

"اور تم عاشی کے سلسلے میں میری اجازت چاہتے ہو۔"

"جی ہاں ـــــ" شہباز نے نظریں بلند کرتے ہوئے جواب دیا "اس لئے کہ ابا جان مرحوم کے بعد آپ ہی میرے بزرگ ہیں۔"

"یہ تمہاری لیاقت ہے شہباز میاں جو تم نے مجھے کسی قابل سمجھا لیکن ـــــ"

"لیکن کیا انکل ـــــ" شہباز نے محمود حسین کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا "کیا آپ کو میری پسند پر کوئی اعتراض ہے ـــــ بخدا، اگر کوئی ایسی بات ہے تو آپ کھل کر اس کا اظہار کر دیں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے کسی حکم سے سرتابی نہیں کروں گا۔"

"تم میری خاموشی کا غلط نتیجہ اخذ کر رہے ہو شہباز میاں۔" محمود حسین نے اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتے

جواب دیا "میرا خدا گواہ ہے کہ میں عاشی کو ناجیہ سے کم نہیں سمجھتا مگر ممدو کی موجودگی میں ـــــ میں قطعی طور پر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا، البتہ پہلی فرصت میں تمہارے ایک بزرگ کی حیثیت سے ممدو سے بات کروں گا۔"

"مجھے یقین ہے انکل کہ ممدو بابا آپ کی کسی بات سے انکار نہیں کریں گے۔"

"تمہارا اندازہ اپنی جگہ درست ہے ـــــ لیکن جہاں اعتماد کی بنیادیں زیادہ مستحکم ہوں وہاں انسان کو محتاط رہ کر زبان کھولنی پڑتی ہے، کوئی غیر اُمیدوں کے برخلاف کسی خواہش کو رد کر دے تو اُس کا اتنا ملال نہیں ہوتا جتنا کوئی اپنا کترائے کی بھی کوشش کرے تو دل کو شدید جھٹکا سا لگتا ہے۔"

"ایک بات پوچھوں انکل ـــــ"

"کیا ـــــ"

"میں نے اپنے انتخاب میں کوئی غلطی تو نہیں کی ـــــ"

"قطعاً نہیں ـــــ" محمود حسین بڑے وثوق سے بولے "اگر تم نے ناجیہ کی بات کی ہوتی تو ہو سکتا تھا کہ تمہارے والد سے اپنے دیرینہ تعلقات کی بنا پر کچھ سوچنا پڑتا لیکن عاشی ہر اعتبار سے تمہاری شریکِ زندگی بننے کے بہترین ہے ـــــ میں تمہارے انتخاب پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔"

"ایک درخواست اور کروں گا۔" شہباز نے کچھ توقف کے بعد قدرے سنجیدگی سے کہا "اگر ممدو بابا کسی وجہ سے ہماری خوشیوں کے راستے میں حائل ہونا چاہیں تو آپ اس ذکر کو محض اپنی ذات تک محدود رکھئے گا۔"

"میں سمجھا نہیں ـــــ کیا تمہاری آنٹی کو بھی تمہاری خواہش سے مطلع کرنا نامناسب ہوگا۔"

"یہ میری ایک ادنیٰ سی درخواست ہے۔" شہباز نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔ "ہاں ـــــ اگر قسمت کو میرے سر پر رحم آجائے تو پھر آپ کو اجازت ہوگی۔"

"کچھ میں بھی دریافت کرنا چاہوں گا شہباز بیٹے۔" محمود حسین نے پیار سے پوچھا "کیا تم عاشی سے مل چکے ہو۔"

"جی ہاں ـــــ صرف ایک بار چند لمحوں کے لئے گفتگو کرنے کا موقع ملا تھا۔"

"تم نے عاشی کو ـــــ میرا مطلب ہے کہ کیا عاشی کو اس بات کا اندازہ ہے کہ تم اُسے اپنے گھر کی زینت بنانا چاہتے ہو ـــــ"

"میں نے دبی زبان میں اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا ـــــ"

"پھر ـــــ"

"عاشی میرا سوال سُن کر سکتے کی حالت سے دوچار ہو گئی اور پھر جب اُسے اپنی حیثیت اور کم مائیگی کا احساس ہوا تو اس کی آنکھوں میں قدرت کی ستم ظریفی نمی بن کر پھیل گئی۔"

"میں جانتا ہوں ـــــ وہ بڑی حساس طبیعت کی مالک ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ محض اسی وجہ سے ممدو بابا کو میری خوشیوں کی تکمیل سے منع کر دے۔"

"تم فکر مت کرو ـــــ" محمود حسین نے ایک سرد آہ بھر کر کہا "ممدو اگر رضامند نہ ہوا تو میں عاشی سے درست مل کر تمہاری وکالت کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"میں آپ کا یہ احسان تمام عمر نہیں بھولوں گا۔"

"تم اب غیروں جیسی باتیں کر رہے ہو شہباز میاں۔"

"میں اب اجازت چاہوں گا۔" شہباز نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"خدا کی ذات سے ناامید نہ ہونا ـــــ وہ جو کرے گا بہتر ہی کرے گا۔"

"شکریہ انکل ـــــ اور چلتے چلتے میں ایک بار پھر یہی درخواست کروں گا کہ میری اور آپ کی اس ملاقات کا ذکر کو اس وقت تک نہ ہو جب تک میرے حق میں کوئی فیصلہ نہ ہو جائے۔"

"میں تمہاری خوشیوں کا خیال ضرور رکھوں گا۔"

"میں بے حد ممنون ہوں گا ـــــ" شہباز نے آہستہ سے کہا پھر ہاتھ بڑھا کر رخصتی مصافحہ کیا اور دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

محمود حسین شہباز کے چلے جانے کے باوجود اپنی جگہ خاموش کھڑے خاصی دیر تک دروازے کو گھورتے رہے پھر انھوں نے میز پر آکر فائل کھول لی اور دوبارہ ان کاغذات کو دیکھنے لگے جن کی تیاری ان کے لئے بے حد اہم اور نفع بخش تھی ——— انھوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ کسی طرح اپنی توجہ کو از سرِ نو اس دستاویز کی جانب مبذول کر سکیں لیکن انھیں اپنے ارادے میں کامیابی نہیں ہوئی ——— ہر بار عاشی کا تصور اُن کے آڑے آگیا۔

عاشی ——— !

عاشی ——— !!

عاشی ——— !!!

ایک تصور ——— جس نے خیالوں کی دنیا میں ہلچل مچا دی تھی

ایک خیال ——— جو حقیقت پا لینے کے لئے مضطرب تھا ——— اور

ایک حقیقت ——— جو سامنے تھی لیکن اُس کا سراماضی کے دھندلکوں میں کہیں گم ہو کر رہ گیا تھا۔

اور آج زندگی کے یہی تانے بانے ایک بار پھر اپنے میں بڑی شدت سے گڈمڈ ہونے لگے تو محمود حسین نے جھلا کر فائل بند کر دی اور تھکے تھکے انداز میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آہستہ سے آنکھیں موند لیں۔

جانے کیوں آج صبح سے ممدو کی الٹی آنکھ رہ رہ کر پھڑک رہی تھی۔

گزشتہ کئی دنوں سے وہ سخت بخار اور نحرانی کیفیت سے دوچار تھا۔ رات ڈاکٹر نے اسے نیند کا انجکشن لگا کر سُلا دیا تھا لیکن حسبِ معمول وہ صبح سویرے اسی وقت جاگ اُٹھا جو اُس کا روزمرہ کا معمول تھا، بخار کی شدت ٹوٹ چکی تھی لیکن نقاہت نے اُس کے انگ انگ کو جیسے مفلوج کر دیا تھا۔

عاشی نے اُسے صبح کی چائے دی تو اُس نے جان بوجھ کر اپنے بوڑھے وجود پر جوانی کی ایک شوخ مگر بھدا سی مسکراہٹ سجا کر اُسے اپنی طرف سے مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔

"اب طبیعت کیسی ہے بابا ———"

"تُو جس کی تیمارداری کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ جائے وہ بھلا بیمار کیسے رہ سکتا ہے۔" ممدو نے اپنے لہجے میں اپنی جسمانی نقاہت کو چھپانے کی ناکام کوشش کر ڈالی۔ "ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھ لے ——— بخار تو نام کو نہیں ہے ———"

عاشی نے اُس کی پیشانی پر کسی ماہر ڈاکٹرنی جیسے انداز میں ہاتھ رکھا، چند لمحے سنجیدگی سے اُسے تکتی رہی پھر الفاظ چباتے ہوئے بولی

"ہاں ——— پہلے سے حالت کچھ بہتر ضرور ہے لیکن ابھی ڈاکٹر صاحب کا علاج جاری رہے گا۔"

"بلاوجہ ———" ممدو نے ضد کی "جب میں بھلا چنگا ہو گیا ہوں تو پھر ڈاکٹر کی کیا ضرورت ہے۔"

"زیادہ باتیں کرنے سے طبیعت کی گرانی اور بڑھ جاتی ہے ——— ڈاکٹر صاحب نے تمہیں سختی سے آرام کرنے کی ہدایت کی ہے۔"

"تو پھر رسّی سے جکڑ کر باندھ دے چارپائی کے ساتھ۔" ممدو جھلا گیا "بڑی آئی ڈاکٹر کی ہدایت پر سختی سے عمل کرنے والی۔"

"اچھا ——— تو پھر میں رونا شروع کر دوں ———"

عاشی نے بوکھلا کر اسے بہلانے کی کوشش کی تو ممدو کی ساری جھلاہٹ پلک جھپکتے میں کافور ہو گئی، عاشی کو بڑی والہانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے نرم آواز میں بولا۔

"روئیں میرے دشمن ——— خبردار جو تو نے پھر مجھے رونے کی دھمکی دی۔"

"تم جو علاج سے بار بار بھاگنے کو ڈراتے ہو ———"

"اچھا بابا ——— جیسا تو کہے گی ویسا ہی کروں گا۔"

"میرے اچھے اچھے ——— پیارے پیارے بابا۔" عاشی نے بڑی معصومیت سے ممدو کی کشادہ پیشانی کو چومتے ہوئے کہا پھر بڑے پیار سے اُسے اٹھا کر آرام کرسی پر بٹھایا اور ناشتہ کرانے لگی۔

مشرقی دیوار کی بڑی کھڑکی سے باہر سبزے پر لگے گل بوٹے بڑے ہی بھلے نظر آ رہے تھے اور فرفر کرتی ہوا ان کی بھینی بھینی خوشبو سے ماحول کو معطر کر رہی تھی۔

ممدو ناشتہ کر چکا تو عاشی نے جلدی سے برتن سمیٹ کر میز صاف کی پھر اُس پر تازہ پھولوں کا گلدان سجا کر جانے لگی تو ممدو نے اُسے آواز دے کر روک لیا۔

"کیا آج بھی کالج جانے کا ارادہ نہیں ہے۔"

"میں نے ناجیہ کے ہاتھوں اپنی حاضری کی معافی کی درخواست بھیج دی، ابھی دو روز اور تمہاری چوکیداری کروں گی۔" عاشی نے ممدو کو گھورتے ہوئے بڑی معصومیت سے جواب دیا پھر برتن ہاتھوں میں اٹھائے کچن کی طرف چلی گئی۔

"خدا تیرے نصیب اچھے کرے۔" ممدو نے آہستہ سے دعا دی پھر آپ ہی آپ آنکھوں کی پھڑپھڑاہٹ پر اُلجھنے لگا۔ اُسے ان فرسودہ باتوں پر کچھ زیادہ اعتبار نہیں تھا لیکن اس نے بزرگوں سے سن رکھا تھا کہ الٹی آنکھ کا پھڑکنا کچھ اچھا شگون نہیں ہوتا اور اسی رویے نے اسے عاشی کی طرف سے فکرمند کر دیا تھا۔

افتخار احمد نے جب اقبال گے لئے عاشی کا ہاتھ مانگا تھا تو ممدو کو اپنی قوتِ سماعت پر اعتبار نہیں آیا تھا، جب اُسے یقین آیا تو خوشی اور مسرتوں کے سینکڑوں دیپ اُس کی پلکوں پر جل اُٹھے لیکن جب افتخار احمد نے یہ بتایا کہ اقبال کی ماں راحیلہ خاتون اس رشتے پر آمادہ نہیں ہیں تو ممدو کی الجھنوں میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا۔

خوشیوں کی بے پناہ دولت ملنے کے فوراً بعد اُسے مسرتوں کی اوٹ سے اُٹھنے والے پھرے ہوئے طوفان کی اطلاع ملی تو وہ گنگ سا رہ گیا۔ افتخار احمد اُس کے سامنے سوالی بنے بیٹھے تھے لیکن ممدو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا فیصلہ دے ——— کیا جان بوجھ کر عاشی کے معصوم وجود کو اپنے ہاتھوں سے ان طوفانوں کی نذر کر دے جس سے فوراً رکھنے کی خاطر وہ آج تک اپنی موت کو بھی اپنے عزم سے شکست دیتا رہا تھا۔

افتخار احمد ممدو کی ذہنی حالت کو سمجھ رہے تھے اس لئے انھوں نے کسی فوری فیصلے کی ضد نہیں کی اور ممدو کو سوچنے اور سوچ سمجھ کر جواب دینے کی مہلت دے کر چلے گئے تھے اور یہی مہلت ممدو کے لئے عذابِ جان ہو گئی ——— اس مہلت کا ایک ایک لمحہ ایک ایک پل کس قدر اذیت ناک تھا اس کا اندازہ ممدو کے سوا کوئی اور نہیں لگا سکتا تھا۔

اُس نے افتخار احمد کے گھر کا نمک کھایا تھا ———

برسوں اُن کی دولت کے ساتھ وابستہ رہا تھا ——— پھر

وہ انکار بھی کس طرح کر سکتا تھا ——— ؟ ——— لیکن

راحیلہ خاتون کی مخالفت کی اطلاع نے اُس کے بوڑھے وجود کو خشک پتوں کی طرح کھڑکھڑا کر رکھ دیا تھا۔

عورت کا دردِ بیمثال عورت ہی جان سکتی ہے

مگر جب عورت ہی عورت کی دشمن بن جائے تو گھر کی چہار دیواریوں کے اندر قیامت بپا ہو جاتی ہے ——— پھر وہ اقبال اور عاشی کے رشتے کے سلسلے میں اقرار بھی کیسے کر سکتا تھا ——— ؟

حالات نے اسے وقت کے جس دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا وہ بڑا ہی مخدوش اور پُرخطر تھا۔

اس وقت بھی ممدو اپنے ذہن کی اسی گتھی کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا جو افتخار احمد کے جانے کے ہر لمحے اور اُلجھتی جا رہی تھی ——— خیالوں کی رو میں پروہ تصورات کی دنیا میں گم تھا کہ باہر سے کسی گاڑی کا ہارن سُن کر اُس کے خیالات کا شیرازہ بکھر گیا ——— آنکھوں کی پھڑکن جانے کیوں یکلخت بہت تیز ہو گئی۔

عاشی کچن سے نکل کر تیزی سے باہر گئی پھر واپس آئی تو تنہا نہیں تھی، راحیلہ خاتون بھی خود کو لئے دیئے اس کے ہمراہ تھیں اور ممدو نے راحیلہ خاتون کو اچانک اپنے سامنے دیکھا تو جیسے سکتے کی کیفیت سے دوچار ہو گیا، سر سے پاؤں تک ٹھنڈے گرم آندھیوں کی لپیٹ بن کر اُس کے ذہن میں اُبھرنے لگے۔

عاشی کو دلوں میں اٹھتے غبار کی کوئی اطلاع نہیں تھی، وہ تو راحیلہ خاتون کو افتخار احمد کی بیگم جان کر عزت و احترام کے ساتھ اندر لے آئی تھی، اس غریب کو کیا خبر تھی کہ راحیلہ خاتون کی وہاں آمد اُس کے چھوٹے

سے آباد گلشن میں خزاں کا پہلا جھونکا تھا۔

"آپ کھڑی کیوں ہیں آنٹی ——— تشریف رکھئے نا"

راحیلہ خاتون خاموش کھڑی ممدو کے ناتواں وجود کی قوت کو اپنی پُروقار شخصیت اور حشمت کے سامنے نگاہوں نگاہوں میں تول رہی تھیں' عاشی کی آواز اُن کے کانوں میں گونجی تو وہ چونک اُٹھیں۔ پلٹ کر ایک نظر اُسے دیکھا پھر ساڑی کا پلو بڑی نفاست سے سنبھالتی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ ہونٹوں پر ایک زہر یلا تبسم رہ رہ کر مچل رہا تھا۔

"افتخار انکل نہیں آئے آپ کے ساتھ" عاشی نے بڑی اپنائیت سے دریافت کیا" وہ خیریت سے تو ہیں!

"تم عاشی ہو نا ———" راحیلہ خاتون نے عاشی کے وجود میں مرحوم فائزہ کی ہو بہو تصویر کو بغور گھورتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں ———"

"تعجب ہے کہ ——— تم افتخار کو انکل کہتی ہو" راحیلہ خاتون زہر خند سے بولیں" میرا مطلب ہے کہ آج کل تو انکل صرف اُسے کہا جاتا ہے جس سے کوئی خونی تعلق نہ ہو ———"

"جی ——— میں سمجھی نہیں" عاشی نے بڑی معصومیت سے دریافت کیا

"تمہیں صبح ہی صبح بیگم صاحبہ نے کسی کام سے بلوایا تھا" ممدو نے بڑی جلدی سے بات بناتے ہوئے عاشی کو مخاطب کیا" وہ شرفو آیا تھا بلانے لیکن بات میرے ذہن سے نکل گئی ——— جا' سُن آجا کر' شاید کوئی ضروری کام ہو"

"میں چلی گئی بابا تو آنٹی کی خاطر مدارات کون کرے گا" عاشی بولی" آنٹی آج پہلی بار تو ہمارے گھر آئی ہیں"

"تم ہو آؤ عاشی ———" راحیلہ خاتون نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا" میں اتنی جلدی واپس جانے کے ارادے سے نہیں آئی ہوں"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے آنٹی ——— میں بس ابھی آئی" عاشی نے کہا پھر مسکراتی ہوئی اُلٹے قدموں باہر چلی گئی تو ممدو نے یوں اطمینان کا سانس لیا جیسے طوفان کا پہلا جھونکا بڑی آسانی سے آکر گزر گیا ہو۔

عاشی کے جانے کے بعد راحیلہ خاتون کے تیور اچانک بدل گئے' تیوری پر بل ڈال کر انھوں نے ممدو کی جانب گھور کر دیکھا تو ممدو اپنی جگہ سہم کر رہ گیا۔

راحیلہ خاتون کی نگاہوں میں غضب تھا' نفرت تھی' حقارت تھی اور انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے' ممدو ان نگاہوں کی تپش اپنے ناتواں وجود پر بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔

"تم ممدو ہی ہو نا ———" کچھ توقف کے بعد راحیلہ خاتون کی خشک آواز کمرے میں گونجی۔

"جی ——— جی ہاں" ممدو نے ہمت کر کے جواب دیا" میرا نام ممدو ہی ہے"

"مرحوم اسرار احمد کے پرانے اور وفادار ملازم ——— کیوں؟"

"جی ہاں ———"

"وہ افتخار کو انکل کے بجائے ماموں کے نام سے کیوں نہیں پکارتی" راحیلہ خاتون نے سرد لہجے میں بڑی حقارت سے دریافت کیا۔

"عاشی معصوم ہے ——— میں نے ابھی تک اُسے اس کی اصلیت اور حقیقت سے آگاہ نہیں کیا" ممدو نے تھوک نگلتے ہوئے مشکل جواب دیا۔

"اصلیت! ——— حقیقت! ———" راحیلہ خاتون زہر خند سے بولیں" کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گے کہ عاشی کی کیا حیثیت ہے ——— اور کیا حقیقت ہے جو تم ابھی تک اُسے چھپائے بیٹھے ہو"

"بیگم صاحبہ' میں ———"

"کیا تم مجھے یہ نہیں بتاؤ گے کہ عاشی کا باپ کون ہے؟ ——— کہاں ہے ———؟" راحیلہ خاتون نے ممدو کا جملہ کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا' اُن کے لہجے میں طنز تھا' ایسی حقارت تھی کہ ممدو تڑپ اُٹھا۔

"میں نے ان باتوں کو اپنے سینے کی گہرائیوں میں دفن کر رکھا ہے" ممدو ہاتھ ملتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولا

"کیوں ——— کیا وہ باتیں اس قابل نہیں ہیں کہ تم کھل کر دنیا والوں کو بتا سکو"

"بیگم صاحبہ ——— آپ اس گھر کی بہو ہیں میں نے جس کا برسوں نمک کھایا ہے" ممدو نے ذہنی توازن مجتمع کرنے کی کوشش کی۔

"مجھے یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ تم کو ابھی تک اپنی اوقات یاد ہے لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی کہ تم نے آخر روم فائزہ کی خوبصورت اور حسین بیٹی کو اپنی چھاتی سے کیوں لگا رکھا ہے" راحیلہ خاتون نے چبھتی آواز میں پوچھا۔

"ہوئی نہ کوئی وجہ ——— کچھ نہ کچھ سبب تو ضرور ہوگا"

"میں ——— وقت کا انتظار کر رہا ہوں" ممدو نے خود کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا" حالات نے فی الحال میری زبان پر تالے ڈال دیئے ہیں لیکن میں نمک حرام نہیں ہوں"

"تمہیں مالی کے بجائے تاجر ہونا چاہیئے تھا" راحیلہ خاتون نے بڑے تلخ لہجے میں کہا" اچھے تاجر کی یہی پہچان ہے کہ مناسب وقت پر ——— اور منڈی کا بھاؤ دیکھ بھال کر اپنی چیز کی قیمت متعین کرے"

"بیگم صاحبہ ———"

"ممدو ———" راحیلہ خاتون نے ایک بار پھر ممدو کے احتجاج کو اپنی امارت تلے روندتے ہوئے نہایت سخت اور کرخت انداز میں کہا" تم شاید بھول رہے ہو کہ میرا تعلق کس گھرانے سے ہے اور تمہارے افتخار صاحب کی جو عزت اور شہرت آج ہے وہ صرف میری ہی جوتیوں کے طفیل ہے ———"

"لیکن ان باتوں سے میری ذات کا کیا تعلق ہے" ممدو نے بے بسی سے دریافت کیا۔

"تمہاری ذات کا نہ سہی لیکن عاشی کا تعلق ضرور ہے اور میں اسی لئے آج پہلی اور آخری بار تمہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کرنے آئی ہوں ———" راحیلہ خاتون نے غصے سے لرزتے ہوئے کہا" کان کھول کر سُن لو کہ تم اور تمہارے افتخار احمد صاحب جو خواب دیکھ رہے ہیں وہ کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا ——— اور اگر تم نے کسی سازباز کے ذریعے اپنا مطلب پورا کرنے کی کوشش کی تو اتنا یاد رکھنا کہ میرا نام بھی راحیلہ خاتون ہے ——— میں تم کو اور عاشی کو دنیا میں کسی کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑوں گی"

"بیگم صاحبہ ———"

"اگر تم نمک حلال ہو تو میں جو کچھ کہہ رہی ہوں اُسے صرف اپنی ذات تک محدود رکھنا ——— ورنہ اگر جواب میں میری زبان بھی کھل گئی تو عاشی کے حق میں بہت بُرا ثابت ہوگا ———"

"میرا اور عاشی کا قصور کیا ہے ——— یہ تو بتا دیجئے" ممدو نے بھرائی ہوئی آواز میں ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"کیا تمہارا یہ قصور کچھ کم ہے کہ تم نے دنیا بھر کی گندگی کو میرے بیٹے کی جھولی میں ڈالنے کا خواب دیکھا ہے" راحیلہ خاتون غصے میں بل کھاتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئیں' منہ سے جھاگ اُڑاتے ہوئے بولیں" تمہاری اتنی جرأت اور یہ مجال کہ تم جھونپڑی میں دو سروں کے ٹکڑے پر پلنے کے باوجود محلوں کی جانب نظر اٹھانے کی کوشش کر رہے ہو ———"

"بس کیجئے بیگم صاحبہ ——— بس کیجئے" ممدو نے ہاتھ جوڑ دیئے' کپکپاتی اور رندھی آواز میں کہا" مجھے جو چاہے کہہ لیجئے لیکن عاشی معصوم ہے اُسے ———"

"اگر وہ معصوم ہے تو وہ اس معصومیت کے پٹارے کو اپنے ہی کو بلے سے لگائے رکھو ——— اقبال میرا خون ہے' اس کا خیال دل سے نکال دو ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا"

اور پھر قبل اس کے کہ ممدو اپنے دل کی ڈوبتی ہوئی دھڑکنوں کو سمیٹ کر کوئی جواب دیتا راحیلہ خاتون آندھی کی طرح پلٹیں اور طوفان کی طرح لہراتیں کمرے سے باہر چل گئیں ——— پھر گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز اُبھری اور بند پھاٹک دُور ہوتی چلی گئی ——— ممدو بُت بنا کھلے دروازے کو تکتا رہ گیا ——— یوں جیسے وہ گوشت پوست کا انسان نہ ہو پتھر کا کوئی بے جان مجسمہ رہا ہو جو اپنے خالق کی تخلیق پر انگشت بدنداں ہو گیا تھا۔

"بابا ——— کیا آنٹی چل گئیں ———"

کمرے میں عاشی کی آواز گونجی تو ممدو اس طرح چونکا جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھتے دیکھتے اچانک اُس کی آنکھ کھل گئی ہو ـــــ اُس نے حیرت سے پھٹی پھٹی نظروں سے عاشی کی طرف دیکھا جو اُس کے سامنے گزرے حالات کے تغیر کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"بابا ـــــ کیا بات ہے، تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو ـــــ"

"عاشی ـــــ میری بچی" ممدو نے تڑپ کر کہا پھر اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا ـــــ وہ سسک سسک کر اور بلک بلک کر رونے لگا۔

عاشی دوڑ کر بوڑھے ممدو سے لپٹ گئی ـــــ کچھ اور سمجھ میں نہ آیا تو خود بھی بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ـــــ !!

✻ ـــــ ـــــ ✻

ناجیہ شام کی تفریح کے بعد واپس لوٹی تو خاصی موڈ میں تھی۔

گاڑی پورٹیکو میں آکر رکی تو اُس کی نظریں ہی لان کی جانب اُٹھ گئیں، عاشی کو گلاب کے کنج کے قریب ایک آرام کرسی پر تنہا نیم دراز دیکھ کر اُس کی پیشانی پر آڑی ترچھی لکیریں اُبھر آئیں، عاشی کے بیٹھنے کا وہ انداز ناجیہ کے لئے تازیانے سے کم نہ تھا ـــــ کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے نہ جانے وہ کس کے خیالوں میں گم تھی۔

کہیں عاشی کے ذہن کے کسی گوشے میں شہباز کا تصور تو نہیں گنگنا رہا تھا ـــــ ؟

وہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر نیچے اُتری، اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتی عاشی کے قریب جا کر رک گئی لیکن عاشی بدستور اسی انداز میں بیٹھی رہی ـــــ ناجیہ کے ذہن میں چنگاریاں سی چٹکنے لگیں، وہ شہباز کو عاشی کے تصور میں کبھی آباد نہیں دیکھ سکتی تھی ـــــ بل کھا کر بولی

"کن خیالوں میں گم ہو ـــــ"

عاشی نے ناجیہ کی آواز سُنی تو ہڑبڑا کر سیدھی ہو گئی، اُس کی آنکھیں گلابی گلابی سی ہو رہی تھیں

"آؤ بیٹھو ناجیہ ـــــ" اُس نے تھکے تھکے لہجے میں ناجیہ کو بیٹھنے کی دعوت دی۔

"کس کے تصوّرات میں ڈوبی ہوئی تھیں" ناجیہ نے ایک طنز بھری مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیر کر پوچھا "کون ہے وہ خوش نصیب"

عاشی نے چونک کر ناجیہ کو بغور دیکھا، کچھ کہنا چاہا لیکن دل مسوس کر رہ گئی۔

"موسم کے اعتبار سے تمہاری نگاہوں کے ساغر بھی گلابی گلابی ہو رہے ہیں"

"ناجیہ ـــــ" عاشی نے آہستہ سے کہا "میں ـــــ خود اپنے ہی بارے میں سوچ رہی تھی"

"انسان جب اپنے بارے میں کچھ سوچتا ہے تو اُس کی سوچوں میں کوئی اور بھی ضرور ہوتا ہے" ناجیہ نے عاشی کی سنجیدگی کو غلط انداز میں پرکھتے ہوئے کہا "میں کئی دنوں سے محسوس کر رہی ہوں کہ تم کچھ کھوئی کھوئی سی رہتی ہو"

"شاید تم نے غلط اندازہ نہیں لگایا"

"کیا سوچتی رہتی ہو ـــــ"

"اپنے مستقبل کے بارے میں غور کرتی رہتی ہوں" عاشی کے ہونٹوں پر ایک پھیکا سا تبسم تڑپ کر نڈھال ہو گیا

"یہی تو میں دریافت کر رہی تھی کہ تمہارے مستقبل میں تمہارے علاوہ اور کون بسا ہے"

"خدا کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے ـــــ" عاشی نے ہونٹ کاٹتے ہوئے مدھم لہجے میں جواب دیا۔

"کس خدا کی بات کر رہی ہو ـــــ حقیقی یا مجازی"

"ناجیہ ـــــ" اُس نے نظریں اُٹھا کر رحم طلب انداز میں ناجیہ کو دیکھا، اُس کی گفتگو کا مفہوم بھانپ کر وہ اندر ہی اندر چھلک اُٹھی تھی ـــــ ناجیہ کے جملے اُس کے دکھے دل پر تیر و نشتر بن کر چبھ رہے تھے، اُس کی پلکوں کے گوشے بھیگنے لگے۔

"بڑے انمول ہوتے ہیں وہ آنسو جو کسی کی یاد کا سہارا لے کر دل کی گہرائیوں سے مچل کر پلکوں تک آ جاتے

نے عاشی کی بھیگتی پلکوں کو دیکھ کر ایک اور نشتر چھوڑا ـــــ "تم اگر مجھے اپنی دوست سمجھتی ہو تو مجھے اپنا حالِ سنا دو ـــــ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہارا راز صرف میری ذات تک محدود رہے گا ـــــ"

"تم ـــــ غلط سمجھ رہی ہو ناجیہ" عاشی نے بڑا ضبط کرتے ہوئے جواب دیا "میری زندگی میں ایسا کوئی راز ـــــ جیسا تم سوچ رہی ہو"

"پھر ـــــ یہ آنسو ـــــ"

"یہ میری بے بسی اور بے چارگی کا سرمایہ ہیں ناجیہ" وہ تڑپ اٹھی، دل پر چوٹ لگی تو قوتِ برداشت جواب دے گئی، دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے بولی "آج صبح سے بابا کی طبیعت سخت خراب ہے، ڈاکٹر دیکھنے آیا تھا ـــــ خیال ہے کہ بابا کے دل کو کوئی شدید صدمہ پہنچا ہے ـــــ ایسا صدمہ جس نے بابا کے ڈوبتے ڈوبتے وجود کو چراغِ بنا دیا ہے ـــــ اور میں اس سوچ میں گم ہوں کہ اگر خدانخواستہ میرے بابا کو کچھ ہو گیا تو میرا کیا بنے گا ـــــ بتاؤ ناجیہ ـــــ بابا کے سوا اور کون ہے میرا اس دنیا میں ـــــ کون ہے جو بابا کے بعد یوں اپنے دل کے زخموں کے داغوں کو چھپانے کی کوشش کرے گا جیسے بابا کر رہے ہیں

میری خاطر ناجیہ ـــــ صرف میری خاطر بابا نے اپنے سوکھے اور خشک ہونٹوں پر ایک بیمار تبسم کو سجا رکھا ہے ـــــ میری خوشی کی خاطر نہ جانے کس غم کو اندر ہی اندر جھیل رہے ہیں، برداشت کر رہے ہیں اور ڈاکٹر کا کہنا ہے اگر فوری طور پر اس صدمے کا سدِّباب نہ ہوا تو بابا کی حالت اور بگڑ جائے گی

تم نے کبھی اس چراغ پر غور کیا ہے جو بجھنے سے پہلے بڑی تیز روشنی دیتا ہے ـــــ رہ رہ کر بھڑکتا ہے لیکن پھر اس کی لَو کپکپانے لگتی ہے اور ہوا کا آنے والا ہر جھونکا اُسے اس کے وجود کی بے ثباتی اور بے یقینی کا احساس دلاتا سرسراتا ہوا گزر جاتا ہے اور پھر ـــــ"

عاشی کی آواز رندھ گئی ـــــ الفاظ اُس کے خشک حلق میں اٹک کر رہ گئے، وہ حسرت بھری نگاہوں سے ناجیہ کو دیکھ رہی تھی ـــــ ان بھیگی نگاہوں میں دنیا جہان کا غم سمٹ آیا تھا۔

اُمیدیں دم توڑتی نظر آ رہی تھیں ـــــ

حسرتیں پامال پامال تھیں ـــــ

اور ـــــ

یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ قدرت کا نہیں ـــــ کسی مصوّر کا شاہکار ہو۔

شاہکار ـــــ

جسے زندگی کی بھرپور مسرتوں اور خوشیوں سے یکسر محروم کر دیا گیا ہو۔

اور ـــــ

حسرت و یاس کے بے جان اور پھیکے رنگوں سے بنا سنوار کر نمائش کے لئے پیش کر دیا گیا ہو ـــــ !!

ناجیہ کو ایک لمحے کو اپنی غلطی کا احساس ہوا ـــــ اُس کی باتوں نے عاشی کے زخموں کو کرید کر ناسور بنا دیا تھا، بس ایک لمحے کو اُس نے نظریں جھکا کر اپنی شرمندگی کا اظہار کیا پھر ٹھوس آواز میں بولی

"مرنے والے زندہ رہنے والوں کے غموں کا اندازہ نہیں لگا سکتے ـــــ وہ خود کو زندگی کی تمام کلفتوں سے آزاد کر لیتے ہیں اور روتے دوسروں کو اپنے پیچھے روتا بلکتا چھوڑ جاتے ہیں ـــــ دادی جان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا موت نے وقتی طور پر مجھے بھی خوفزدہ کر دیا تھا ـــــ میں سہم کر رہ گئی تھی ـــــ میرا خیال تھا کہ دادی کی موت کے ساتھ ہی اپنی شخصیت کا وقار بھی برقرار نہ رہ سکے گا لیکن ایسا نہ ہوا ـــــ وقت ہر زخم کے لئے تریاق ہوتا ہے عاشی۔ ہمت سے کام لینا چاہیئے"

"تمہاری بات اور ہے ناجیہ لیکن میں ـــــ میں تو اس بھری پُری دنیا میں بالکل ہی تنہا ہوں"

"یہ تم نے کیسے سوچ لیا ـــــ ممی اور ڈیڈی جو تمہارا اتنا خیال رکھتے ہیں"

"میں اُن کی شکر گزار ہوں لیکن ـــــ"

"لیکن کیا ـــــ" ناجیہ نے یونہی سپاٹ لہجے میں پوچھا

"مجھے میرے اپنے سُراغ کی تلاش ہے ناجیہ ——" عاشی نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا "مجھے نہیں معلوم کہ میں کون ہوں —— میرے ماں باپ کون ہیں اور میرا تعلق انسانوں کے کس گروہ اور جتھے سے ہے۔"

"کیا مطلب ——" ناجیہ نے چونک کر کہا "کیا ممدو بابا نے تمہیں تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟"

"مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ اس وقت میں بہت چھوٹی اور معصوم تھی جب میری ماں کا سایہ میرے سر سے اٹھ گیا تھا —— جب میں نے ہوش سنبھالا تو ممدو بابا کو اپنا ماموں و غمخوار پایا —— میں نے متعدد بار بابا کو کریدنا چاہا اپنے بارے میں جاننے کے لئے کئی بار کوشش کی لیکن بابا نے ہر بار یہ کہہ کر ٹال دیا کہ جب کوئی مناسب وقت آئے گا وہ مجھے سب کچھ بتا دیں گے۔"

"تو کیا رحیمو تمہارے والد نہیں ہیں؟" ناجیہ نے حیرت سے پوچھا "ممدو بابا نے تو شروع میں کچھ ایسی ہی بات کی تھی جس سے یہی پتہ چلتا تھا کہ تم غالباً اُن کے بیٹے کی بیٹی ہو ——"

"ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن کیا یہ بدنصیبی میرے لئے سوہانِ روح نہیں کہ باپ کے ہوتے ہوئے بھی اس کی محبت، اُس کی شفقت اور اُس کے پیار سے محروم ہوں اور اب بابا کی حالت بھی روز بروز گرتی جا رہی ہے ——"

"خدا پر بھروسہ رکھو عاشی —— وہ جو کرے گا بہتر ہی کرے گا۔"

عاشی نے اپنی پلکوں سے ڈھلکتے آنسوؤں کو اپنے دوپٹے کے پلو میں جذب کیا، کچھ کہنا چاہتی تھی کہ محمود حسین کی گاڑی تیزی سے پھاٹک میں داخل ہوئی پھر وہ گاڑی سے اُتر کر سیدھے عاشی کی طرف آئے۔ اُن کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ انھیں ممدو کی حالت کے بارے میں فون پر اطلاع مل چکی ہے۔ عاشی کے قریب پہنچ کر انھوں نے اُس کے چہرے سے اُس کے غم اور دلی کیفیت کا اندازہ لگایا تو بڑی محبت اور پیار سے بولے

"تمہاری آنٹی نے مجھے فون پر ممدو کی کیفیت کے بارے میں بتا دیا ہے —— میں ڈاکٹر سے ملتا ہوا آ رہا ہوں، اُس کا خیال ہے کہ وقتی طور پر کسی صدمے نے ممدو کی حالت بگاڑ دی ہے لیکن فکر کی کوئی بات نہیں —— میں نے ایک دو سرے بڑے ڈاکٹر کو فون کر کے بلا لیا ہے وہ بھی کچھ دیر میں آ جائے گا —— ویسے اب تمہارے بابا کی طبیعت کیسی ہے؟"

"خدا ہی بہتر جانتا ہے انکل ——" عاشی نے لرزتی آواز میں جواب دیا، محمود حسین کے نرم لہجے نے اس کے دل میں چھپے طوفانوں کو پھر ہوا دے دی تھی۔

"ناجیہ —— تمہاری ممی کہاں ہیں ——" محمود حسین نے ناجیہ سے دریافت کیا۔

"میرا خیال ہے اندر ہوں گی۔"

"انھیں بلا لاؤ —— میں عاشی بیٹی کے ساتھ ممدو کو دیکھنے جا رہا ہوں۔"

ناجیہ کوٹھی کی طرف چلی گئی تو محمود حسین عاشی کے ساتھ اندر کی جانب قدم اٹھانے لگے، کچھ توقف کے بعد بولے۔

"بیٹی —— کیا تم نے ممدو سے دریافت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اُسے اچانک کس صدمے نے نڈھال کر دیا ہے؟"

"کئی بار پوچھ چکی ہوں لیکن بابا ہر بار یہی کہہ کر ٹال جاتے ہیں کہ انھیں کوئی صدمہ نہیں ہے ——"

"تمہارا کیا خیال ہے —— میرا مطلب ہے کہ کیا آج کوئی ایسا واقعہ پیش آیا تھا جو ممدو کے لئے صدمہ کا باعث بن گیا ہو ——"

"صبح تو بابا بالکل ٹھیک تھے۔" عاشی نے اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے کہا "لیکن جب سے آنٹی اگر گئی ہیں بابا کی حالت خراب ہو رہی ہے ——"

"آنٹی —— کون آنٹی ——"

"افتخار انکل کی بیگم —— وہ آج پہلی بار بابا سے ملنے آئی تھیں اور بابا نے مجھے بہانے سے کوٹھی میں بھیج دیا۔" عاشی نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا "میں واپس آئی تو وہ جا چکی تھیں اور بابا جانے کس صدمے سے دوچار بیٹھے تھے میں نے سبب پوچھا تو ایک دم ہی سے بلک بلک کر رونے لگے ——"

"یہ افتخار انکل کون ہیں ——" محمود حسین نے سرسری طور پر دریافت کیا

"بابا کے کوئی پرانے واقف کار ہیں۔" عاشی بولی "پہلی بار میں نے انھیں سینما ٹوریم میں دیکھا تھا۔ وہیں مجھے زبانی معلوم ہوا تھا کہ اُن کا نام افتخار احمد ہے ——"

"افتخار احمد ——" محمود حسین نے چونک کر عاشی کی طرف دیکھا پھر بولے "کہاں رہتے ہیں افتخار احمد ——"

"لاہور میں —— بابا نے یہی بتایا تھا۔"

محمود حسین چلتے چلتے ایک لمحے کو رک گئے پھر تیز تیز قدم اٹھاتے عاشی کے ہمراہ انکسی میں داخل ہوئے، راہداری سے گزر کر ممدو کے کمرے میں قدم رکھا تو دروازے پر ہی ٹھٹھک کر رہ گئے، ممدو جس انداز میں بستر پر لیٹا تھا اُسے دیکھ کر محمود حسین کا دل دھک سے رہ گیا، پہلی نظر میں انھیں یہی محسوس ہوا تھا جیسے ممدو اپنی زندگی کا سفر پورا کر چکا ہو لیکن جب ممدو نے قدموں کی آہٹ سُن کر آہستہ سے آنکھیں کھولیں تو اُن کے دل کو چین آیا، لمبے لمبے قدم اٹھاتے وہ ممدو کے قریب چلے گئے، اُس کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر بڑے پیار سے بولے

"اب تمہاری طبیعت کیسی ہے ممدو ——"

"سرکار —— مجھے —— آپ ہی کا —— انتظار تھا۔" ممدو نے درد سے نڈھال اور نحیف آواز میں کہا

"میں آ گیا ہوں ممدو —— ڈاکٹر بھی آنے والا ہے، تم فکر مت کرو، صبح تک تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"صبح —— صبح نہ جانے کب ہو گی سرکار۔" ممدو نے تڑپ کر کہا، آنسو کے دو قطرے اُس کے رخسار سے ڈھلک کر بستر میں جذب ہو گئے۔

"بابا —— خدا کے لئے اپنے آپ کو سنبھالو۔" عاشی کے لہجے میں التجا تھی "اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میرا کیا ہو گا ——"

"عاشی ——" محمود حسین کا دل بھی بھر آیا۔ انھوں نے بڑی اپنائیت سے عاشی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "کیا تم —— مجھے غیر سمجھتی ہو —— کیا تم میرے لئے ناجیہ سے کم ہو ——"

"انکل ——" عاشی نے تڑپ کر کہا پھر بے اختیار محمود حسین کے سینے پر سر رکھ کر سسکنے لگی۔

محمود حسین بڑی شفقت سے عاشی کی پیٹھ تھپتھپانے لگے اور ممدو —— اُس نے پوری شدت سے اپنا ہونٹ دانتوں تلے بھینچ لیا —— یوں جیسے وہ موت کی اذیت کو برداشت کرنے کے لئے اپنی زندگی کی تمام قوت صرف کر رہا تھا ——!!

افتخار احمد کو بیٹے کی زبانی ممدو کی علالت اور اُس کے سبب کا علم ہوا تو وہ اندر ہی اندر جھلس کر رہ گئے ہر چند کہ اقبال احمد نے انھیں صرف یہی بتایا تھا کہ راحیلہ خاتون ممدو سے مل چکی ہیں لیکن افتخار احمد بچہ نہیں تھے وہ جان چکے تھے کہ بیوی نے گڑے مردے اکھاڑنے کی خاطر ممدو کے پاس جا کر دل کی بھڑاس نکالی ہوگی وہی اس کی بیماری کا سبب بن گئی ــــ

گزرتے وقت نے افتخار احمد کے دل پر جو چرکے لگائے تھے وہی بہت تھے' وہ باپ کی شفقت اور بہن کے پیار دونوں سے محروم ہو چکے تھے' کاتبِ تقدیر نے راحیلہ خاتون کی وساطت سے کچھ ایسے جال بُنے تھے جس میں پھنس کر وہ بے دست و پا ہو گئے تھے۔

پردیس میں ماحول کی رنگینی اور دولت کی طمع نے اُن کی نگاہوں پر جو پٹی باندھ دی تھی اُس نے افتخار احمد کو دنیا کے تمام جذبوں اور رشتوں سے قطعی بے نیاز کر دیا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ جب وہ پردیس سے بڑا آدمی بن کر واپس لوٹیں گے تو باپ اور بہن کو منا لیں گے لیکن شومئی قسمت کہ نہ تو انھیں باپ کی موت کی اطلاع ملی نہ بہن کے دربدر ہونے کی تفصیل کا کوئی علم ہوا۔

دولت کے انبار سمیٹنے کے بعد وہ وطن واپس لوٹے تو اُن کا رین بسیرا اُجڑ چکا تھا ــــ ویران ہو گیا تھا اور ماضی پر حال کی دبیز گرد کی تہیں اتنی جم چکی تھیں کہ افتخار احمد خون کے آنسو بہانے کے سوا اور کچھ نہ کر سکے۔ انھیں اندازہ تھا کہ راحیلہ خاتون نے جان بوجھ کر انھیں حالات سے بے خبر رکھا ہوگا ــــ وہ چاہتے تو بیوی سے بازپرس کر سکتے تھے لیکن انھوں نے اپنے گھر کا سکون برباد کرنا مناسب نہ سمجھا۔

اپنے زخموں کو دل کے نہاں خانوں میں سجا لیا ــــ

ان آنسوؤں کو پلکوں کی اوٹ میں چھپا لیا جو طوفانوں کی صورت میں مچلے تھے ــــ

خود پر جبر کر کے حالات کے نئے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کی ــــ

وہ مسافر جو زندگی کے پُرپیچ راستوں پر گم ہو گئے تھے اُن کی تلاش بے سود تھی ــــ

وہ ہمیشہ کے لئے زندگی سے روٹھ گئے تھے ــــ

اتنے آگے نکل گئے تھے کہ موت کے سوا کوئی اُن کا تعاقب نہیں کر سکتا تھا ــــ پھر

وقت نے زخموں پر تریاق کا کام کیا ــــ

زندگی کے ہنگاموں میں یادوں کی پرچھائیاں بھی دھندلانے لگی تھیں ــــ

لیکن ــــ

حالات کی ایک ہی کروٹ نے سکون کی بساط الٹ دی ــــ

ممدو کا سراغ ملا تو افتخار احمد اپنے اُجڑے ہوئے ماضی کی داستان سننے کے لئے تڑپ اُٹھے

عاشی کی صورت میں مرحوم فائزہ کا روپ نگاہوں کے سامنے آیا تو دل کے زخم ناسور بن کر دُکھنے لگے ــــ

پھر انھوں نے اپنی کوتاہیوں اور ماضی کی غلطیوں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے عاشی کو اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کر لیا' یوں انھوں نے مرنے والوں کی بے چین روحوں کو پُرسکون رکھنے کے لئے ایک خواب دیکھا تھا لیکن راحیلہ خاتون کی اچانک مداخلت نے اُن کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا ــــ ایک ہی ٹھوکر سے منتشر کر دیا۔ انھیں پریشان کر دیا' ویران ریزوں کی کرچیاں افتخار احمد کے وجود کی گہرائیوں میں چبھ رہی تھیں ــــ

بے قرار کر رہی تھیں ــــ

اندر ہی اندر تڑپا رہی تھیں ــــ

کسی کروٹ چین نہیں لینے دے رہی تھیں ــــ

دم گھٹ کر مرنے پر مجبور کر رہی تھیں ــــ

افتخار احمد کو اپنی غلطی کا احساس وقت گزر جانے کے بعد بڑی شدت سے ہو رہا تھا ــــ انھوں نے بیوی کو اعتماد میں لے کر یقیناً بڑی غلطی کا ثبوت دیا تھا۔ اگر وہ عاشی کو بہو بنا کر خاموشی سے لے آتے تو بھی طوفان کی زد میں اپنا سر ضرور اُبھارتیں لیکن اولاد کی خوشیوں اور اُس کے مستقبل کی خاطر راحیلہ خاتون کو حالات سے مفاہمت کرنا پڑتی اور ــــ عاشی کو قبول کر لینا پڑتا۔

لیکن ــــ

وقت کی ایک ہی کروٹ نے افتخار احمد کو کانٹوں کی سیج پر تڑپنے کے لئے مجبور کر دیا' وہ جانتے تھے کہ راحیلہ خاتون عاشی اور ممدو کے کانوں میں جو زہر گھول کر آئی ہوں گی اُس کا توڑ آسان نہ ہوگا ــــ اُن کی بروقت مداخلت نے افتخار احمد کی بازی مات کر دی تھی' وہ اگر ممدو کے پاس جاتے بھی تو کیا منہ لے کر جاتے اور وہاں جا کر فی الحال ممدو کے کرب میں اضافہ بھی نہیں کرنا چاہتے تھے ــــ

ساری رات وہ ایک پل کے لئے بھی نہ سو سکے' صبح دل کا بوجھ لئے خود کو بہلانے کی خاطر باہر لان میں آئے تو راحیلہ خاتون وہاں پہلے سے چہل قدمی کر رہی تھیں' بے حد ہشاش بشاش اور مطمئن نظر آ رہی تھیں افتخار احمد کچھ سوچ کر اُلٹے قدموں واپس جانا چاہتے تھے کہ راحیلہ خاتون نے انھیں آواز دے کر روک لیا۔

"میں نے اقبال کو جہاز کی نشستوں کے لئے بھیج دیا ہے۔" انھوں نے بڑے سکون سے کہا "اگر سیٹ مل گئی تو میں آج ہی لاہور واپس چلی جاؤں گی ــــ"

"ٹھیک ہے۔" افتخار احمد نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"اقبال بھی دو چار دنوں کے لئے میرے ساتھ جا رہا ہے۔"

"کس لئے ــــ"

"مجھے اُس سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

"اب کیا باتیں باقی رہ گئی ہیں۔" افتخار احمد نے ہونٹ چباتے ہوئے پوچھا۔

"وہ ابھی بچہ ہے ــــ اُسے حالات اور زمانے کی اونچ نیچ کا اندازہ نہیں ہے۔"

افتخار احمد نے کوئی جواب نہیں دیا' خون کا گھونٹ پی کر خاموش ہو گئے۔

"کیا بات ہے' ــــ آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں ــــ"

"خیال ہے تمہارا ــــ"

"آپ کی آنکھوں سے پتہ چلتا ہے جیسے آپ رات بھر سو نہیں سکے ــــ کوئی خاص پریشانی معلوم ہوتی ہے۔"

"راحیلہ ــــ"

"فرمایئے ــــ"

"تم کل صبح کہاں گئی تھیں ــــ" افتخار احمد نے خود کو قابو میں رکھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا

"بیرسٹر محمود حسین کی کوٹھی پر ــــ"

"کیوں ــــ"

"میں نے سنا تھا کہ وہاں کوٹھی کے ایک گوشے میں کوئی نگینہ موجود ہے۔" راحیلہ خاتون زہرخند سے بولیں
"اقبال اب چشم بددور جوان ہوگیا ہے ——— ہمیں اُس کے مستقبل کی فکر ابھی سے کرنی چاہیئے ——— ورنہ ———"
"ورنہ کیا ———"
"جوان لڑکا ہے ——— بچپنے اور نادانستگی میں کوئی غلطی بھی کرسکتا ہے۔" راحیلہ خاتون نے الفاظ چباتے ہوئے کہا "ہم اُسے سیاہ وسفید سے آگاہ نہ کریں گے تو اور کون کرے گا۔"
افتخار احمد ہونٹ کاٹ کر رہ گئے، بیوی کے لہجے میں چھپے ہوئے تیر و نشتر اُن کے جذبات کو چھلنی کر رہے تھے، کچھ دیر تک گم صم کھڑے رہے پھر آہستہ سے بولے
"تم نے ممدو سے کیا کہا ہے ———"
"کچھ بھی نہیں ——— صرف اس کی حیثیت کا احساس دلا کر واپس آگئی۔"
"لیکن ——— عاشی کا کیا قصور ہے۔" افتخار احمد نے ٹوٹے لہجے میں سوال کیا۔
"اکثر والدین کی ایک ذرا سی غلطی کا خمیازہ اُن کی اولادوں کو تمام زندگی بھگتنا پڑتا ہے۔"
"راحیلہ ———"
"میری مثال بالکل سامنے کی بات ہے۔" راحیلہ خاتون نے تڑپ کر ٹھوس آواز میں کہا "میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ جس جہنم میں خود ساری زندگی بتا دی اسی میں اپنی اولاد کو بھی جھونک دوں ———"
"عاشی سے تمہاری کیا گفتگو ہوئی تھی ———"
"آپ کیا دریافت کرنا چاہتے ہیں ———"
"کیا اُسے علم ہوگیا ہے کہ میرا اور اُس کا کیا رشتہ ہے ———"
"جی نہیں ——— اس کی نوبت نہیں آسکی اس لئے کہ ممدو نے اُسے میرے سامنے سے ہٹانے میں بڑی تیزی اور چالبازی کا مظاہرہ کیا تھا ———" راحیلہ خاتون بل کھا کر بولیں۔
"ان باتوں سے کیا حاصل ہوگا ———"
"اقبال کا مستقبل تباہ و برباد ہونے سے محفوظ ہو جائے گا ———"
"تم غلط سوچ رہی ہو ———" افتخار احمد بولے "قسمت اور نصیب کے سامنے انسان بے بس ہو جاتا ہے۔"
"مجھے دوسروں کی بے بسی اور بدنصیبی سے زیادہ اپنی اولاد کا مستقبل عزیز ہے، اس لئے کہ اولاد دنیا کی سب سے زیادہ قیمتی اور انمول نعمت ہے ———"
"عاشی بھی میرے لئے اولاد سے کم نہیں ———"
"اولاد ———" راحیلہ خاتون بڑے زہریلے لہجے میں بولیں "وہ کس کی اولاد ہے اس کا پتہ تو ابھی تک اُسے خود بھی نہیں ہے ———"
"راحیلہ ———" افتخار احمد کی نگاہوں میں خون اُتر آیا، مٹھیاں بھینچ کر بولے "تم حد سے بڑھنے کی کوشش کر رہی ہو۔"
"میری بات پر یقین نہیں آتا تو جا کر اپنے پرانے اور نمک حلال ممدو سے دریافت کر لو جس نے ابھی تک تمہاری عاشی کی ولدیت کے راز کو نہ جانے کیوں راز رکھا ہوا ہے۔" راحیلہ خاتون نے تیوری پر بل ڈال کر تیزی سے کہا "اس نمک حرام نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ وہ کسی مناسب وقت کا انتظار کر رہا ہے۔"
"ہو سکتا ہے اُس نے کسی خاص مصلحت کی بنا پر تمہیں کچھ بتانے سے گریز کیا ہو۔"
"ممکن ہے اُسے ایسا کرنے کے لئے پہلے سے تاکید کر دی گئی ہو ——— لیکن میری صحت پر ان باتوں کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔" راحیلہ خاتون شناسائی جھٹکاتے ہوئے بولیں "جس گاؤں نہ جانا ہو اُس کے کوس گننے سے کیا حاصل۔"
"خون کے رشتے آسانی سے ختم نہیں ہوا کرتے۔" افتخار احمد نے کہا "عاشی بہرحال میری مرحوم بہن کی نشانی ہے۔"

"ہوا کرے ——— مجھے اور میری اولاد کو کیا۔"
"تم زیادتی سے کام لے رہی ہو ———"
"شیشے میں ایک بار بال آجائے تو تمام زندگی برقرار رہتا ہے ———"
"راحیلہ ———"
"ایک بات آپ بھی کان کھول کر سن لیجئے افتخار احمد صاحب ——— اگر آپ کو گھریلو ماحول کو خوشگوار رکھنا ہے تو کبھی میرے سامنے عاشی کا تذکرہ نہ کیجئے گا ———" راحیلہ خاتون نے خشک اور فیصلہ کن لہجے میں کہا پھر صوفے سے بل کھا کر تیز تیز قدم اُٹھاتی اندر چلی گئیں۔
افتخار احمد اپنی جگہ کھڑے ہونٹ چباتے رہے ———!

"عاشی ———"
"جی ———"
"آپ نے دوپہر سے کچھ نہیں کھایا ———"
"خواہش نہیں ہو رہی۔"
"اتنا غم وجود کی بنیادوں کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیتا ہے۔"
"دنیا والے ہر شے کو اوپر سے پرکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔" وہ اُداس آواز میں بولی "اندر سے کسی کی حقیقت کو دیکھتا ہے۔"
"دنیا میں پانچوں انگلیاں کہیں برابر بھی نہیں ہوتیں ———"
"دنیا کو دیکھنے اور پرکھنے کے لئے بڑے سکون اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے اور قدرت نے مجھے ان دونوں چیزوں سے محروم کر رکھا ہے۔"
"مایوسی گناہ ہے عاشی ———"
"میں نے بھی کتابوں میں یہی پڑھا ہے ———" وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔
پلکوں پر ٹھہرے ننھے آنسو ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں میں جھلملا رہے تھے۔
"اعتماد ڈگمگا جائے تو انسان کو بروقت سنبھل جانا لازم ہے۔"
"سنبھلنے کے لئے بھی کسی سہارے کی ضرورت ہے ———"
"میں بنوں گا آپ کا سہارا ———" شہباز کے لہجے میں عزم تھا۔
عاشی نے پلٹ کر اُسے غور سے دیکھا، آنسوؤں کے کچھ شبنمی قطرے ضبط کرنے کے باوجود اس کے نیلے سے باہر ہو کر پلکوں سے ڈھلک گئے، جلدی سے اُس نے آنچل سے بھیگی پلکوں کو خشک کیا، نظریں جھکائے کترا کر نکل جانا چاہتی تھی کہ شہباز لپک کر اُس کے سامنے آگیا۔
"عاشی ——— آپ کو شاید میرے خلوص پر شبہ ہے۔"
"یہ اندازہ آپ نے کیسے لگا لیا۔" وہ دل مسوس کر بولی۔ "میں تو روز اوّل سے دوسروں کے خلوص اور پیار کے سہارے جی رہی ہوں۔"
"وقت نے آپ کو اندر سے بہت کمزور کر دیا ہے ———"
"شاید ———"
"میں بڑے وثوق اور اعتماد سے کہہ رہا ہوں عاشی۔" شہباز نے اُس کی نمناک آنکھوں میں تڑپتی اُداسی کو محسوس کر کہا "میں زندگی کے ہر موڑ پر آپ کا سہارا بنوں گا ———"
"یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے شہباز۔" اُس نے دبی زبان میں جواب دیا۔
"یہی وقت ہے عاشی۔" اُس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا "حالات کے کٹھن لمحوں میں ہی جذبوں کی آزمائش ہوتی ہے۔"
"کچھ فیصلے زندگی کا چھٹکارا بن جاتے ہیں۔"

"زندگی انسان کے اپنے نہیں خدا کے اختیار میں ہوتی ہے ——"

"لیکن سوچنا اور سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا انسان کے اپنے اختیار کی بات ہوتی ہے ——" وہ نظریں جھکائے دوپٹے کے پلو کو بل دیتی رہی۔

"میں نے سب کچھ سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے —— اور ——"

"اور کیا ——"

"میں نے محمود انکل کو اپنا بزرگ سمجھتے ہوئے اُن پر اپنی خواہش کا اظہار بھی کر دیا ہے۔"

"یہ آپ نے اچھا نہیں کیا ——" وہ چونک کر بولی، گلابی گلابی آنکھوں میں اضطراب کا کرب بھی شامل ہو گیا۔

"کیوں —— کیا سچ بولنا گناہ ہے؟"

"ناجیہ کو آپ نے زیادہ قریب سے نہیں دیکھا، وہ ہند پر اُتر آئے تو طوفانوں سے ٹکرا جاتی ہے۔"

"میں طوفانوں سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔"

"آپ ——" وہ ایک لمحے کو ہچکچائی پھر سنبھل کر ٹھوس آواز میں بولی۔ "آپ میرے بارے میں کیا جانتے ہیں؟"

"آپ ——" شہباز نے اُسے والہانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ ایک نیک شریف اور باوقار لڑکی ہیں —— اجازت ہو تو اپنی خواہشات کا حسین تاج محل بھی کہہ لوں ——"

"تاج محل ——" اُس کے کپکپاتے لبوں پر ایک تبسم مچل اُٹھا۔ "آپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ اس عظیم یادگار کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لئے اُس کی بنیادوں میں کتنے انسانوں کا خون شامل کیا گیا ہے۔"

"میں نے محض ایک مثال دی تھی ——"

"میں آپ کے جذبات کی قدر کرتی ہوں لیکن ——"

"لیکن کیا ——" شہباز نے عاشی کی اچانک خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کچھ کہتے کہتے رک کیوں گئیں؟"

"میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتی ہوں ——"

"حکم دیجئے ——"

"آپ نے جس عزم کا ارادہ کیا ہے وہ خطرناک ہے، میرا مشورہ ہے کہ آپ اپنا راستہ بدل لیں۔"

"یہ ناممکن ہے ——"

"آپ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے شہباز ——"

"میں کچھ جاننے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا ——"

"مجھے بابا نے بتایا تھا کہ جب میں نے اس دنیا میں آنکھ کھولی تو میری ماں کا سایہ میرے سر سے اُٹھ گیا۔" اُس نے ٹوٹے لہجے میں آہستہ سے کہا۔

"میں اسے مشیت ایزدی کہوں گا ——"

"مجھے نہیں معلوم کہ —— میری ماں کون تھی۔"

"ماں —— صرف ماں ہوتی ہے۔"

"مجھے اپنے باپ کے بارے میں بھی وثوق سے کچھ نہیں معلوم۔" اُس نے شہباز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "میری زندگی کا ہر راز نہ جانے کیوں بابا کے سینے میں دفن ہو کر رہ گیا ہے ——"

"عاشی ——"

"جن کی شخصیت کے وجود کا کوئی پتہ، نشان اور سُراغ نہ ہو وہ لوگ بڑے مخدوش اور خطرناک ہوتے ہیں۔" عاشی ٹھوس لہجے میں بولی۔ "ایسے لوگوں کے ساتھ مستقبل کی خوشیاں وابستہ کرنا دانشمندانہ فیصلہ نہیں کہا جا سکتا۔"

"کچھ خواہشات ایسی اندھی بھی ہوتی ہیں جن کی تکمیل کے لئے انسان کو اپنی قسمت اور تقدیر پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔"

"میں پھر بھی آپ کو باز رہنے کا مشورہ دوں گی۔"

"آپ اگر چاہیں تو مجھے دُھتکار ضرور سکتی ہیں لیکن میری خواہشات اور میرے جذبوں کی صداقت کو نہیں رد کر سکتیں۔"

"شہباز ——" وہ بڑی بے بسی سے بولی۔ "آپ میری مجبوریوں کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟"

"مجبوریاں قدرت کی جانب سے انسان کی آزمائش کا امتحان ہوتی ہیں ——"

"لیکن میں ——"

"آپ کو میری قسم عاشی۔" شہباز نے تیزی سے کہا۔ "اپنے ماضی کو یکسر فراموش کر دیجئے —— میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کا مستقبل بے حد روشن —— بڑا تابناک ہوگا ——"

عاشی نے شہباز کے لہجے میں خلوص اور اعتماد کی شدتوں کو محسوس کیا تو ایک لمحے کو یوں محسوس ہوا جیسے صحراؤں میں بھٹکتے بھٹکتے وہ اچانک کسی نخلستان میں پہنچ گئی ہو —— اُس نے شہباز کی عظمت اور اُس کی نیکیوں کو دیکھا تو نظریں جھکا لیں۔

سرنگوں ہو گئی ——

کچھ کہنے کی جسارت نہ کر سکی ——

—— شہباز نے اُسے اپنی قسم دے رکھی تھی۔

اور ——

وہ شہباز کی قسم کا مان نہیں توڑ سکتی تھی ——

وہ مجبور ہو گئی ——

بے بس ہو گئی ——

اس لئے کہ اُس نے خود بھی شہباز کو نہ جانے کب سے اپنے خوابوں میں بسا رکھا تھا ——

وہ ان خوابوں کو کیسے توڑ دیتی ——

یہی خواب تو اُس کی زندگی کا سرمایہ تھے ——!!

کچھ لمحے یونہی بڑی خاموشی سے دبے پاؤں گزر گئے، شہباز کی نظریں عاشی کے چہرے پر مرکوز تھیں، وہ عاشی کے وجود میں اپنے جذبوں کی صداقتیں تلاش کر رہا تھا اور عاشی نظریں جھکائے اپنے دل کی دھڑکنوں کو گن رہی تھی جو آج نہ جانے کیوں اُس کے اختیار سے باہر ہو گئی تھیں۔

"عاشی ——" شہباز نے مہرِ سکوت توڑی۔

"جی ——" عاشی نے دبی زبان میں جواب دیا۔

"ایک وعدہ لینا چاہتا ہوں ——"

"کیا ——"

"آئندہ آپ کبھی مایوسی کی باتیں نہیں کریں گی ——"

"لیکن ——"

"میری خاطر —— میری خوشیوں کی خاطر۔" شہباز نے جلدی سے کہا۔ "میرے اس اعتماد کی خاطر جس نے مجھے زندگی میں پہلی بار میرے مستقبل کی مسرتوں کی نوید دی ہے ——"

شہباز کا جملہ سُن کر وہ پھر بے بس ہو گئی —— کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کہہ نہ سکی، پھر دوسرے کمرے سے محمود حسین کی آواز اُبھری تو وہ جلدی سے قدم اُٹھاتی اُدھر آ گئی، شہباز نے بھی اُس کی پیروی کی۔

محمود حسین کسی نئے ڈاکٹر کو مدو کے معائنے کی خاطر لائے تھے۔

گزشتہ چار روز سے مدو کی حالت دن بدن گرتی جا رہی تھی، ڈاکٹروں کی دوائیں بے اثر ثابت ہو رہی تھیں، ابھی تک کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا —— مدو کی خاموشی اور سکتے کا طلسم ابھی تک برقرار تھا، ابھی تک اُس نے اس کی جانب سے کسی مایوسی کا اظہار نہیں کیا تھا —— لیکن زندگی کی اُمید بھی نہیں دلائی تھی۔

جس روز سے راحیلہ خاتون آکر گئی تھیں ممدو پر زندگی کے ایک ایک لمحے بڑے کٹھن اور کربناک ہو گئے تھے ـــــ وہ گھنٹوں بیہوشی کی کیفیتوں سے دوچار رہتا ـــــ بیہوشی سے ہٹ کر اگر بیدار ہوتا تو کمرے کے در و دیوار اور تمام ساز و سامان کو یوں پھٹی پھٹی اور حسرت بھری نگاہوں سے گھورتا رہتا جیسے اُن کی بے ثباتی سے اپنے زخمی دل کے پیمانے کو ناپ رہا ہو

اردگرد جمع چہروں کو دیکھتا تو یوں پاگلوں کی طرح ٹکٹکی باندھے تکتا رہتا جیسے اُن کی شناخت اس کے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں گم ہو کر رہ گئی ہو ـــــ عاشی پر نگاہ پڑتی تو اُس کی آنکھیں پھیلنے لگتیں ہونٹ یوں کپکپانے لگتے جیسے وہ کچھ کہنے کے لئے مضطرب ہو لیکن قوتِ گویائی اُس کا ساتھ نہ دے رہی ہو ـــــ کوئی اس کو مخاطب کرتا تو وہ اُسے بڑے غور سے دیکھنے لگتا ـــــ جیسے اُس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو پھر اس کے چہرے پر تھکن اور نقاہت کے اثرات پھیل کر گہرے ہونے لگتے تو ڈاکٹروں کو اسے اس کرب سے نجات دلانے کی خاطر نیند کے خواب آور انجکشنوں کا سہارا لینا پڑتا۔

ممدو کی تیمارداری کے لئے ایک نرس کی خدمات بطورِ خاص حاصل کر لی گئی تھیں، محمود حسین اپنا بیشتر وقت انکسی میں ممدو اور عاشی کے قریب گزارتے، وہ ممدو کے علاج پر پانی کی طرح روپیہ خرچ کر رہے تھے۔

شمسہ بیگم بھی اس آڑے وقت میں عاشی کی دلجوئی میں پیش پیش رہتیں، ناجیہ بھی بھولے بھٹکے ایک آدھ چکر لگا لیتی، اکثر عاشی کی کالج کی ہم جماعتیں بھی آجاتیں اور شہباز ـــــ اسے جب سے ممدو کی مخدوش حالت کی اطلاع ملی تھی وہ اپنا زیادہ تر وقت وہیں گزارنے لگا تھا۔

جتنی دیر ڈاکٹر ممدو پر جھکا اس کا معائنہ کرتا رہا کمرے میں ایک سوگوار سی خاموشی طاری رہی، ممدو اُس وقت بیہوش نہیں تھا، آنکھیں کھولے چھت کو گھورے جا رہا تھا، نرس ڈاکٹر کے قریب کھڑی اس کے اشاروں پر عمل کر رہی تھی اور محمود حسین کی کیفیت ان سب سے مختلف تھی۔

کبھی وہ عاشی کی سمت دیکھتے تو چہرے پر اضطراب اور الجھن کے سائے لہرانے لگتے۔

شہباز پر نظر پڑتی تو اُن کی نگاہوں میں اُمید کی کرنیں جگمگا اٹھتیں۔

اور ـــــ

جب ممدو کو دیکھتے تو ہونٹ دانتوں تلے چبانے لگتے ـــــ یوں، جیسے انھیں ممدو کی صحت یابی کا سب سے زیادہ اور بڑی شدت سے انتظار ہو

جیسے ممدو کی اچانک علالت سے اُن کی اپنی زندگی کا کوئی گہرا ربط قائم ہو گیا ہو

ڈاکٹر نے ضروری معائنہ کرنے کے بعد ایک نظر محمود حسین پر ڈالی پھر انھیں ساتھ آنے کا اشارہ کر کے باہر جانے کے لئے قدم اُٹھائے تو عاشی بھی دبے قدموں ساتھ ہولی، شہباز نے اُسے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن عاشی کی آنکھوں میں تڑپنے والی خاموش التجا دیکھ کر چپ ہو گیا تھا۔

"ڈاکٹر ـــــ" محمود حسین نے انکسی کے ورانڈے میں آکر ڈاکٹر سے دریافت کیا "آپ کی کیا تشخیص ہے؟"

"میری رائے دوسرے ڈاکٹروں سے قدرے مختلف ہے ـــــ"

"کوئی تشویش کی بات تو نہیں" محمود حسین نے جلدی سے پوچھا۔

"میری ذاتی رائے بھی یہی ہے کہ مریض کو کوئی بہت ہی گہرا اور شدید ذہنی صدمہ پہنچا ہے اور جب تک اس صدمے کے اثرات ذہن میں موجود رہیں گے مریض کی حالت بہتر ہونے کے بجائے دن بدن گرتی جائے گی" ڈاکٹر نے بہت سنجیدگی سے کہا پھر کچھ سوچ کر بولا ـــــ "کیا آپ کو مریض کو پہنچنے والے صدمے کا کچھ اندازہ ہے ـــــ"

"جی ـــــ جی نہیں" محمود حسین نے ہونٹ کاٹتے ہوئے بے چینی سے کہا، ڈاکٹر کے سوال نے انھیں اور مضطرب کر دیا تھا۔

"مریض سب سے زیادہ کس سے محبت کرتا ہے ـــــ میرا مطلب ہے کوئی ایسی شخصیت جو مریض کے لئے سب سے زیادہ اہم اور قابلِ اعتماد ہو ـــــ"

"میں سمجھا نہیں ڈاکٹر ـــــ" محمود حسین نے وضاحت چاہی۔

"مریض کی خاموشی ٹوٹنی ضروری ہے اور یہ کام وہی کر سکتا ہے جو بھروسے کا آدمی ہو"

"آپ ـــــ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں ڈاکٹر ـــــ" محمود حسین چونکے "کیا ـــــ"

"جی ہاں ـــــ" ڈاکٹر نے بڑے وثوق سے جواب دیا "مریض پر جو کیفیت طاری ہے وہ قدرتی نہیں خود اپنی پیدا کردہ ہے ـــــ"

"اوہ ـــــ" محمود حسین کی پیشانی پر غور و فکر کی لکیریں اُبھر آئیں۔

"میرا یہی مشورہ ہے کہ مریض کی خاموشی جتنی جلد ٹوٹ سکے اتنا ہی اس کے حق میں بہتر ہے ـــــ دوسری صورت میں اس کی شدت حد سے تجاوز کر گئی تو مریض کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی"

"میں آپ کے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا ڈاکٹر"

محمود حسین ڈاکٹر سے باتیں کرتے اُس کی گاڑی کی جانب بڑھے تو عاشی تیزی سے دروازے کی آڑ سے نکل آئی، ڈاکٹر کی ماہرانہ رائے نے اُس کے احساس و جذبات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اُس کے معصوم ذہن میں بیسیوں کے جھکڑ چل رہے تھے، اُس کے وجود میں ایک ہلچل سی مچا دی تھی۔

ممدو کی بیماری میں اُس کا اپنا ہاتھ تھا ـــــ

مگر کیوں ـــــ؟

وہ جان بوجھ کر خود کو موت کے دہانے تک کیوں لے آیا تھا ـــــ؟

اُس نے اپنے ہونٹوں کو سی لیا تھا ـــــ

اُن پر مہرِ سکوت لگا لی تھی ـــــ

لیکن اس کا سبب کیا تھا ـــــ؟

آخر وہ کونسا ایسا راز تھا جسے اپنے سینے کی گہرائیوں میں پوشیدہ رکھنے کی خاطر وہ موت کو بھی گلے لگانے کو تیار ہو گیا تھا۔

اور ـــــ

اگر ممدو کی خاموشی کا فسوں ٹوٹ گیا تو ـــــ

تو کیا ہو گا ـــــ

کیا وہ ان باتوں کو برداشت کر سکے گی جس کی خاطر ممدو نے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی ـــــ

وہ کیا باتیں تھیں ـــــ؟

کیا راز تھا ـــــ؟

کیا حقیقت تھی جسے پردہ میں رکھا گیا تھا ـــــ؟

یہ سب کیا تھا ـــــ؟

کیوں تھا ـــــ؟

کیوں ـــــ

آخر کیوں ـــــ

اس کا معصوم ذہن بُری طرح چکرا رہا تھا، اُس کے قدم ڈگمگانے سے لگے، دراز پلکوں کے نیچے گھپ اندھیرے سے کوندنے لگے، اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کمرے کے در و دیوار گھوم رہے ہوں، اُسے اپنی آنکھوں کے سامنے بھونچال سے لگ رہے تھے

غنودگی کا احساس بڑی شدت سے اُس کے وجود کا احاطہ کر رہا تھا، اُس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی، پلکیں کھول کر ماحول کا جائزہ لینا چاہا لیکن ہر شے جیسے دُھندلکی اوٹ میں گہنا سی گئی تھی ـــــ گرد آلود روشنی تھی شاید اُس کی قوتِ بینائی اُس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی، اُس نے تیزی سے بڑھ کر دیوار کا سہارا لینا چاہا لیکن درمیان میں کھڑے کسی کمزور درخت کی مانند جڑ سے اُکھڑنے لگی ـــ

اور پھر ——

اگر شہباز نے تیزی سے لپک کر اس گرتے وجود کو سہارا نہ دیا ہوتا تو وہ شاید خود کو سنبھال نہ سکتی ——
زمیں بوس ہو جاتی —— !!

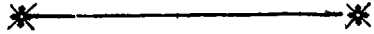

ڈاکٹر ——
نرس ——
دوائیوں کی ناخوشگوار مہک ——
ماں باپ کی شب و روز کی مصروفیات ——
اور ملازموں کی ہر وقت کی بھاگ دوڑ نے تو کوٹھی کو جیسے ہسپتال بنا دیا تھا۔
جسے دیکھو ممدو کی تیمارداری میں لگا تھا ——
ممدو کی صحت کی دعائیں مانگی جا رہی تھیں ——
منتیں مانی جا رہی تھیں ——
ماحول کے سارے رنگ —— سارے زاویے سمٹ کر جیسے ایک ممدو کی ذات میں سو گئے تھے۔
جیسے وقت کی رفتار ممدو کے وجود کے گرد آکر تھم گئی تھی۔
ممدو —— !
ممدو —— !!
ممدو —— !!!

آخر ممدو کو اتنی اہمیت کیوں دی جا رہی تھی —— اس کی خاطر ماحول کو اتنا سوگوار کیوں بنا دیا گیا تھا کہ مسکراہٹیں ہونٹوں پر سہم کر رہ گئی تھیں —— قہقہے حلق میں گھٹ کر رہ گئے تھے —— خوشیاں اور مسرتیں اُداس اُداس اور پھیکی ہو کر رہ گئی تھیں ——

سارے ہی رنگ جیسے ایک دم پھیکے پڑ گئے تھے، بس ایک رنگ باقی تھا —— زرد رنگ جو ممدو کے بیمار اور خزاں رسیدہ چہرے پر کسی بجھتے چراغ کی دم توڑتی روشنی کی مانند کپکپا رہا تھا۔

ایک زندگی کی خاطر سارے ہی لوگ جیسے دیوانے ہو گئے تھے —— آخر کیوں؟ اگر ممدو مر بھی جاتا تو کوٹھی کے ہنگاموں میں بھلا کون سی کمی آجاتی ——؟

ناجیہ کو ممدو کے وجود سے جیسے چڑ ہو گئی —— گھر کے ایک ادنیٰ سے ملازم سے لے کر محمود حسین تک سب ہی ممدو کی تیمارداری میں لگے تھے، جیسے ممدو اس گھر کا ملازم نہیں قوم کا کوئی اہم لیڈر —— کوئی خاص ہیرو تھا جس کے نہ ہونے سے ملک کے اقتصادی اور معاشی حالات کے متاثر ہونے کا خدشہ لاحق تھا۔

دو چار روز تک اُس نے ممدو کی علالت کی وجہ سے گھر کی افراتفری پر کوئی توجہ نہ دی —— اس کے پاس اتنا وقت بھی کہاں تھا جو وہ ایک ملازم کی بیماری پر غور کرتی لیکن آج صبح جب اُسے حالات کے ایک موڑ کی اہمیت کا اندازہ ہوا تو وہ تلملا کر رہ گئی اور تب ہی سے ممدو کے وجود کا تصور اُس کے ذہن میں رہ رہ کر کچوکے لگا رہا تھا۔ جیسے اچانک لو کے تھپیڑوں نے اُسے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو۔

صبح جب وہ سو کر اٹھی تو اُس کا موڈ خاصا خوشگوار تھا، حسبِ معمول وہ گنگناتی ہوئی اٹھی، باتھ روم کی سمت کھلنے والی کھڑکی کے قریب جا کر کھڑی ہوئی تو نسیمِ صبح کے معطر اور شریر جھونکے اُس کی دراز زلفوں سے چھیڑ خانی کرنے لگے، سبزے پر پڑی شبنم کی ننھی منی بوندیں بڑی ہی خوبصورت اور دلفریب لگ رہی تھیں —— اُس نے نظر گھما کر پھولوں کی کیاری کی سمت دیکھا تو دل باغ باغ ہو گیا، گلاب کے پودوں کی کئی کلیاں چٹک کر پھول بن گئی تھیں۔ اُس نے فوراً ہی ایک سفید گلاب اپنے بالوں کی زینت بڑھانے کی خاطر منتخب کر لیا۔

کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر وہ غسل خانے میں چلی گئی، گنگناتے فوارے کے نیچے کھڑی وہ دیر تک نہاتی رہی، پھر لباس تبدیل کر کے سنگھار میز کے سامنے آئی تو جانے کیوں آئینے میں خود اپنے ہی وجود کو دیکھ کر

ذہن میں گلاب کے پھولوں کا گنج اور نرم ٹہنیوں پر مچلتی ادھ کھلی کلیوں کا تصور ابھر آیا —— انجانے پن کی تپش نے منتشر جذبات کو گدگدایا تو وہ پھولوں سے لدی شاخ کی مانند آپ ہی آپ لچک کر رہ گئی۔

دراز زلفوں کو تولیے سے خشک کرتی کمرے سے باہر آئی، راہداری سنسان پڑی تھی، اُس نے شرفو کو پکارا لیکن جب شرفو کے بجائے نیا خانساماں سامنے آیا تو اُس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

"میں نے شرفو کو آواز دی تھی —— تم کیوں منہ اٹھائے چلے آئے" اُس نے حقارت اور نفرت سے خانساماں کو گھورا۔

"شرفو بیگم صاحبہ کے ساتھ ممدو بابا کی طرف گیا ہے، مجھ سے کہہ گیا تھا کہ اگر ——"

"زیادہ باتیں مت کرو" ناجیہ نے اسے جھڑک دیا، خشک لہجے میں پوچھا "آپا کہاں مر گئی ——"

"وہ تو رات ہی سے ممدو بابا کی طرف ہے"

"اور پپا ——" وہ روانی میں یوں ہی سوال کر بیٹھی

"بڑے صاحب ابھی ابھی کسی نئے ڈاکٹر کو لے کر آئے ہیں" خانساماں نے نظریں جھکائے جھکائے کہا۔ "بتا رہا تھا کہ ممدو بابا پر رات بڑی مشکل سے کٹی ہے ——"

"جاؤ —— شرفو کو بلا کر لاؤ" وہ حکمانہ لہجے میں گھرک کر بولی پھر کمرے میں آگئی۔

خانساماں نے سامنے آکر اس کا سارا موڈ سٹپٹا سا کر دیا تھا، ذہن کو جھٹک کر وہ قدِ آدم آئینے کے سامنے آگئی غصے کی شدت نے اُس کی گلابی رنگت کو سرخی مائل کر دیا تھا، خود کو بہلانے کی خاطر اُس نے یونہی پرانا گیت گنگنانا شروع کر دیا۔ بالوں کو برش کر کے ہٹی تو شرفو آگیا۔

"کہاں مرے ہوئے تھے صبح سے" اُس نے شرفو کو قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا

"وہ ممدو بابا ——"

"شٹ اپ ——" ناجیہ چیخ اٹھی "خبردار جو تم نے میرے سامنے ممدو کا نام لیا ——"

شرفو سہم کر چپ ہو گیا۔

"ممی اور پپا کہاں ہیں ——"

"وہ بھی اُدھر ——" شرفو ممدو کا نام لیتے لیتے اچانک خاموش ہو گیا۔

"اور کون کون ہے ——" ناجیہ نے بلا کر یونہی سوال کر لیا۔

"وہ —— وہ شہباز صاحب بھی ——"

"شہباز ——" ناجیہ یوں چونکی جیسے اچانک اُس کا ہاتھ بجلی کے ننگے تاروں سے چھو گیا ہو، ایک لمحے تک شرفو کو خالی خالی نظروں سے تکتی رہی پھر دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے بولی "شہباز کب آیا ——"

"وہ تو منہ اندھیرے ہی آگئے تھے ——"

"عاشی کیا کر رہی ہے ——" اُس نے شرفو کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"صبح سے رو رہی ہیں —— وہ ممدو کی حالت ——" شرفو ایک بار پھر سہم کر خاموش ہو گیا، جلدی سے کارُخ بدلتے ہوئے پوچھا "چائے لاؤں آپ کے لئے ——"

"نہیں —— دفع ہو جاؤ"

شرفو کو جھڑک کر وہ فرش پر بچھے قالین پر ٹہلنے لگی، عاشی کے قریب شہباز کی موجودگی کی اطلاع نے جیسے اندر ہی اندر جھلس اُٹھی تھی —— اُسے کسی قیمت پر شہباز اور عاشی کا ساتھ منظور نہیں تھا لیکن ممدو کی بیماری نے شہباز کو بھی عاشی کے قریب آنے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔

"اگر ممدو مر گیا ہوتا تو یہ نوبت ہی نہ آتی ——" ناجیہ نے جھلائے ہوئے ذہن سے سوچا۔

کچھ دیر تک وہ آپ ہی آپ اپنے تصور سے الجھتی رہی پھر جلدی سے نیا لباس پہنا، آخری بار آئینے سے جائزہ لے کر دیا کمرے سے نکل کر باہر آئی تو سامنے سے شمسہ بیگم آتی نظر آئیں —— خلافِ توقع وہ اس وقت بھی اداس اداس نظر آرہی تھیں۔ آنکھوں کی ویرانی اور چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے جیسے وہ دیر تک

آنسو بہانے کے بعد چپ ہوئی ہوں' ناجیہ نے ماں کو بہت غور سے دیکھا' ایک لمحے کو ماں کی کیفیت دیکھ کر اسے جھٹکا سا لگا لیکن دوسرے ہی لمحے اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

ان دھڑکنوں کا تعلق ماں کے دکھ سے نہیں ——— اُس کی اپنی خوشیوں اور مسرتوں سے تھا' ان لمحوں میں اُس کی اُمیدوں' آرزوؤں اور تمناؤں کے چراغ جھلمل جھلمل کرتے نظر آ رہے تھے ——— ایک سنٹ پرسنٹ کامیابی کی سیج پر مچل رہی تھی لیکن اب وہ یکلخت کھل اُٹھی تھی۔

ماں کے چہرے کی اُداسی' ویرانی اور پلکوں کی اوٹ میں چھپے آنسوؤں کو دیکھ کر اُس کے ذہن میں خوشیوں کے شادیانے بج اُٹھے تھے' اُس نے فوری طور پر یہی سوچا تھا کہ ———

شاید ممدو کا چراغِ زندگی ہمیشہ کے لئے بجھ گیا ———

قدرت نے اُس کی رُوح کو جسدِ خاکی سے آزاد کر دیا ———

دنیا کے ہنگاموں سے گلو خلاصی کرا دی ———

اور ———

ممدو کے مرجانے سے راہ کی دشواریاں جیسے یک دم بہت سہل ہو گئی تھیں ———

چند روز تک مرنے والے کی یاد میں آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی باقی رہے گی ———

یادوں کے زخم بھرنے میں کچھ وقت ضرور لگے گا ———

لیکن اس کے بعد ———

ناجیہ کے ہونٹوں پر فاتحانہ تبسم اُبھر آیا۔ اُس نے سوچا۔

زخموں کے بھر جانے کے بعد عاشی بھی اُس کے رحم و کرم پر ہو گی۔

شہباز اور عاشی کے درمیان جو رابطہ ممدو کی بیماری کی وجہ سے قائم ہو گیا تھا وہ ٹوٹ جائے گا۔

ہر بات اُس کے اپنے اختیار میں ہو گی۔

عاشی کو ہر قدم اُٹھانے سے پہلے اُس کی اجازت اور مرضی حاصل کرنی ہو گی۔

اور شہباز ———

اُسے عاشی تک پہنچنے کے لئے ناجیہ سے ہو کر گزرنا پڑے گا۔

اور ———

شمہ بیگم اپنے خیالوں میں گم اُس کے قریب سے گزریں تو وہ ایک دم سے اُن کے راستے میں آ گئی' اپنے دل میں خوشیوں اور مسرتوں کے مچلتے طوفانوں کو دباتے ہوئے اُس نے سپاٹ آواز میں پوچھا

"ممی ——— سب خیریت تو ہے ——— کیا ممدو بابا ———"

"نہیں ———" شمہ بیگم نے دبی زبان میں جواب دیا" لیکن اس غریب کی حالت لمحہ بہ لمحہ گرتی جا رہی ہے"

اور ماں کی زبان سے "نہیں" سُن کر اُس کے دل میں مچلتے طوفان' ایک دم تھم گئے' اُس کے ارمانوں پر اوس پڑی تو وہ اندر ہی اندر تلملا اُٹھی' خود کو سنبھالتے ہوئے بولی

"ڈاکٹروں کا کیا خیال ہے ——— کیا وہ بچ جائے گا"

"خدا کرے وہ بچ جائے ———" شمہ بیگم نے جلدی سے کہا" اس کے غم میں بے چاری عاشی کا رو رو کر بُرا حال ہو گیا ہے' اگر خدانخواستہ ممدو کو کچھ ہو گیا تو عاشی کے لئے یہ صدمہ برداشت کرنا بڑا مشکل ہو جائے گا ———

"خدا کرے ممدو بابا ———" ناجیہ کچھ کہتے کہتے اچانک رک گئی۔

اُس نے خود کو بھٹکتے بھٹکتے یکلخت سنبھال لیا تھا ——— ماں کے بیان سے متاثر ہو کر وہ بھی ممدو کی زندگی کی دُعا مانگنے لگی تھی لیکن پھر بروقت وہ انسانیت کے جذبوں سے کٹ کر اپنی ذات میں واپس بیدار ہو گئی۔

ممدو کی زندگی اس کے لئے موت سے کم نہیں تھی ———

موت اور زیست کی کشمکش میں اگر ممدو جیت گیا تو وہ ہار جائے گی ———

اور ———

اُسے اپنی شکست منظور نہیں تھی ———

اُس نے ہارنا نہیں سیکھا تھا ———

اُسے بچپنے سے جو تربیت ملی تھی وہ آج بھی اُس کے ذہن میں ٹھوس ستونوں کی طرح محفوظ و مضبوط تھی۔

اُسے نظریں جھکا کر چلنے کی تعلیم نہیں ملی تھی ———

دادی کی پُروقار شخصیت نے مرتے دم تک اُسے یہی درس دیا تھا کہ ———

خود کو ہمیشہ بلند رکھو ——— سر فراز رکھو ———

جھکو ——— لیکن اتنا بھی نہیں کہ انا کو ٹھیس پہنچے ———

اور غرور و تمکنت کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ لاحق ہو۔

اپنا حق اور اپنی بات تسلیم کرانے کے لئے دنیا کے ہر طوفان سے ٹکرا جاؤ ———

اس لئے کہ محبت اور جنگ میں تمام حربے جائز ہوتے ہیں ———

اور ناجیہ نے طے کر لیا تھا کہ محبت کی جنگ میں وہ عاشی کو ہر قیمت پر نیچا دکھا کر دم لے گی' وہ ہر ایسا ہتھیار استعمال کرے گی جو عاشی کو اس کی محرومیوں کا احساس دلا سکے اور عاشی کو اُس کے آگے سرنگوں ہونے پر مجبور کر دے۔

وہ اپنے خیالوں میں محو تھی کہ شمہ بیگم کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"تم بھی جا کر عاشی کے غم کو بانٹنے کی کوشش کرو بیٹی ——— اس موقع پر عاشی کو ہمارے پیار کی شدید ضرورت ہے"

"میں اسی طرف جا رہی ہوں ———"

وہ ماں کی بات کا سرسری جواب دیتی تیزی سے پلٹی اور لمبے لمبے قدم اُٹھاتی کوٹھی سے باہر آ گئی' لان پر کھیلیاں کرتے ہوا کے معطر جھونکوں نے اس کا بڑھ کر استقبال کیا مگر اس کے ذہن میں جو چنگاریاں آہستہ آہستہ سلگ رہی تھیں وہ راکھ ہونے کے بجائے اور بھڑک اُٹھیں۔

انکسی کے قریب پہنچی تو اُن بھڑکتے شعلوں نے آتش فشاں کا روپ دھار لیا' شہباز جس پریشانی کے عالم میں وہاں سے نکل کر اپنی گاڑی کی جانب لپکے تھے وہ اندازہ ہی ناجیہ کے قہر و غضب کو اُبھارنے کے لئے بہت کافی تھا' ایک لمحے کو وہ اپنی جگہ تھم گئی پھر قدم بڑھاتی شہباز کے قریب پہنچ گئی۔

"ہیلو شہباز ———" اُس نے زبردستی مسکراتے ہوئے اُسے وش کیا

"ہیلو ناجیہ ——— تم" شہباز اُسے دیکھ کر اخلاقاً رک گیا مگر تیور بتا رہے تھے کہ اس وقت وہ بہت جلدی میں ہے

"کیا مجھے دیکھ کر فرار ہونے کی ٹھان لی ہے" ناجیہ نے اس پر طنز کیا۔

"تمہارا اندازہ غلط ہے ———" وہ سنجیدگی سے بولا" میں ممدو بابا کے لئے ایک ضروری دوائی لینے جا رہا ہوں"

"بڑا خیال ہے تمہیں پیار کا"

"پیار کی تیمارداری عین عبادت ہے ———"

"اور عبادت میں اگر پرستش کا رنگ بھی شامل ہو تو لمحے جاوداں ہو جاتے ہیں" وہ اندر ہی اندر سلگتے ہوئے بولی

"تم نے ایک اچھی بات کہی ہے اس لئے میں تردید نہیں کروں گا" شہباز نے ٹھوس آواز میں جواب دیا

"مجھے شروع سے بتایا تھا کہ آپ آج کل اپنا زیادہ تر وقت یہیں گزار رہے ہیں" اُس نے شہباز کو گھورتے ہوئے زیرِ لب اعتراف کیا' الفاظ میں نشتر چھپے ہوئے تھے۔

"اور میں سمجھ رہا تھا کہ تمہیں کسی بات کی خبر نہیں" شہباز نے چبھتے ہوئے لہجے میں مسکرا کر کہا۔

"موقع کی نزاکت نے مجھے باخبر ہونے کے باوجود چپ رہنے پر مجبور کر دیا ہے" ناجیہ کے لہجے میں غرور تھا امارت جھلک رہی تھی۔

"میں سمجھ نہیں سکا آپ کی بات کا مقصد" شہباز نے تیکھے تیوروں سے سنبھل کر پوچھا۔

"آپ اس وقت جلدی میں ہیں ——— پھر کبھی تفصیل سے سمجھانے کی کوشش کروں گی" ناجیہ زہر خند سے بولی
"آپ کی مرضی ——— لیکن میں اتنا ناسمجھ بھی نہیں کہ اپنے اطراف سے بے خبر رہوں"
"جی ———" ناجیہ نے چونک کر شہباز کو وضاحتی نظروں سے دیکھا
"میں اس وقت ذرا جلدی میں ہوں ——— ہماری گفتگو سے ممدو بابا کی دوا زیادہ ضروری ہے" شہباز نے قدرے لاپروائی سے جواب دیا پھر گاڑی میں بیٹھ گیا ———
"واپسی کب تک ممکن ہوگی ———" ناجیہ نے سنجیدگی سے پوچھا
"آپ کے انتظار پر منحصر ہے" شہباز نے شوخی سے جواب دیا پھر گاڑی اسٹارٹ کی اور ایک جھٹکے سے آگے نکال لے گیا۔

ناجیہ کے ہونٹوں میں یکلخت کھنچاؤ سا پیدا ہوگیا' اُس کی پیشانی پر آڑی ترچھی لکیروں کا جال اُبھر آیا' نگاہوں میں خون کے ڈورے تیرنے لگے

کچھ دیر وہ اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑی شہباز کے جلوں پر غور کرتی رہی پھر اُس نے حقارت سے اُنکی جانب ایک نظر ڈالی اور پلٹ کر واپس کوٹھی کی سمت لوٹ گئی۔

شکست کے ایک مبہم سے احساس ہی نے اُسے شعلہ بنا دیا تھا ——— !!

بڑی دیر سے ممدو کے قریب بیٹھی وہ اُسے ایک ٹک تکے جا رہی تھی۔

ڈاکٹر اور محمود حسین کی گفتگو سن لینے کے بعد تو جیسے اُسے سکتہ سا ہوگیا تھا' اپنے وجود کی کھوج کے احساس اُسے خود اپنے ہی سراپا میں گم کر دیا تھا۔ بس ایک سوال رہ رہ کر اُس کے ذہن میں کچوکے لگا رہا تھا

آخر ممدو نے اپنے لبوں پر موت کا سکوت کیوں طاری کر لیا ہے ——— ؟

اُس کی خاموشی اس کے زندگی کے ٹمٹماتے چراغ کو کسی لمحے بجھا سکتی تھی۔

وہ دھواں بن کر فضاؤں میں تحلیل ہو جانے کا خطرہ مول لے رہا تھا۔

مگر کیوں ——— ؟

اُس کی چُپ اُس کے لئے موت تھی۔

وہ لب کشا ہو جاتا تو دل کا غبار چھٹ جاتا۔

بوجھ کم ہوتا تو طبیعت کی گرانی دُور ہو جاتی۔

اور ———

زندگی کی خوشیاں واپس آ سکتی تھیں۔

لیکن ———

وہ دیدہ و دانستہ خود کو موت کے گھپ اندھیروں میں دھکیل رہا تھا۔

زندگی سے منہ موڑنے پر آمادہ ہوگیا تھا۔

کس قدر عظیم تھا وہ۔

کتنا بلند تھا کہ اُس نے جانے کتنی ہستیوں کو اپنے ہونٹوں کی اوٹ میں دفن کر رکھا تھا۔

دنیا کی روش سے بغاوت کر رہا تھا۔

اپنی زندگی کو بچانے کی خاطر کسی دوسرے کو حالات کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے سے گریزاں تھا۔

شاید وہ وقت کی رفتار سے ناواقف تھا۔

زمانے کی ہوا نے اُس کے جسم کی کھردری اور سخت کھال پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔

وہ یقیناً بے حس تھا۔

جبھی تو اُسے ایک زندگی کی قیمت کا احساس نہیں تھا۔

ڈوبتا ہوا شخص تو زندگی کی تمنا میں تنکے کا سہارا بھی بہت سمجھتا ہے۔

خود کو بچانے کی خاطر دوسرے کو ڈبو دیتا ہے۔

لیکن ——— ممدو ———

وہ دیوانہ ہوگیا تھا۔

پاگل ہوگیا تھا۔

جبھی تو کسی اور کو بچانے کی خاطر ڈوب رہا تھا۔

موت اور زندگی کے درمیانی فاصلے کو بھر کر کے جا رہا تھا۔

اُس کے بوڑھے سینے میں بوڑھے سمندر سے زیادہ گہرائی تھی۔

اور ان گہرائیوں کے اندر نہ جانے کتنے راز دفن تھے۔

وہ شاید ان تمام رازوں کو اپنے ساتھ زمین کے بے رحم سینے میں دفن کر لینے کا خواہشمند تھا۔

مگر کیوں ——— ؟

آخر ——— کیوں ——— ؟؟

اور اس کیوں کے ایک سوال نے عاشی کو تصویر حیرت بنا دیا تھا' وہ ممدو کے سینے کی گہرائیوں میں دفن ان رازوں کو پا لینا چاہتی تھی جس میں اس کی اپنی شناخت بھی شامل تھی ——— رہ رہ کر وہ اپنی انگلیوں کو چٹخانے لگتی' ہونٹ زیادہ کپکپانے لگتے تو انھیں دانتوں تلے دبا لیتی اور کبھی اُس کا دل چاہتا ——— ممدو کو دونوں شانوں سے پکڑ کر دیوانوں کی طرح جھنجھوڑ ڈالے' چیخ چیخ کر اُسے آواز دے اور کہے ———

"بتا دو بابا ——— خدا کے لئے اپنی عاشی کو بتا دو کہ تم نے اپنے گرد موت کا ہالہ کیوں بنا رکھا ہے ——— وہ راز ہے جو تمہیں اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا ——— کیا دکھ ہے جس نے تمہیں موت کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے موت کے کربناک احساس نے تمہیں اس درجہ بے خود اور سرشار کر دیا ہے کہ تم زندگی کی مسرتوں کو ٹھکرانے پر تیار ہو ——— اس طلسم کو توڑ دو بابا ——— اس خاموشی کو ختم کر دو ——— موت سے منہ پھیر کر زندگی... کی طرف لوٹ آؤ کہ زندگی خدا کا وہ عطیہ ہے جو انسان کو صرف ایک بار ملتا ہے ——— اور قدرت کی کسی بھی نعمت کو ٹھکرانا کفرانِ نعمت ہے ——— میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں ——— گڑگڑا کر التجا کرتی ہوں بابا کہ مجھے بھی ان... غموں سے نجات دلا دو جو دم گھونٹ کر مجھے مارے ڈال رہے ہیں ——— اور کچھ نہیں بتا سکتے تو صرف اتنا بتا دو کہ میری ماں کون تھی ——— کون تھی وہ خوش نصیب یا بدنصیب عورت جو مجھے جنم دے کر دنیا کے ہنگاموں میں گم ہوگئی اور جو تھا وہ مرد ——— جو میرا باپ ہو کر بھی مجھ سے بے خبر ہوگیا ——— مجھے میری شناخت کرا دو بابا کہ اگر تمہاری موت ناگہانی مصیبت پر پردہ بن گئی تو میں تمام زندگی سکون کی تلاش میں بھٹکتی پھروں گی ——— کسی زندہ لاش کی طرح لوگوں کی نکیل کی خاطر زندگی کی گھڑیوں کو گن گن کر پورا کرتی رہوں گی ——— تمہیں میری ناکام حسرتوں کا واسطہ ——— اپنی اس خاموشی کے طلسم کو توڑ دو ——— توڑ دو اس جمود کو جس نے وقت کی حرارتوں کو بھی منجمد کر رکھا ہے ———

اس وقت بھی وہ ان ہی خیالوں میں گم ممدو کے بستر پر اس سے لگی بیٹھی اس کے بوڑھے چہرے کی جھریوں کو شمار کر رہی تھی جو پل پل خشک اور بے جان ہوتی جا رہی تھیں ——— شہباز اس کے قریب ہی کھڑا اُسے اجنبی کھوجی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور بستر کی دوسری جانب سفید لباس میں ملبوس نرس ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھی کتاب کے مطالعے میں گم تھی ——— یوں جیسے وہ اپنے فرائض کی ادائیگی کی خاطر خود کو بیدار رکھنا چاہتی تھی۔

سنگدل ستم ظریفی نے حالات کو سوگوار بنا دیا تھا لیکن ان سوگوار لمحوں میں بھی قدرت کے چار رنگ بڑے واضح اور روشن نظر آ رہے تھے۔

ممدو ———

جس نے انسانیت اور وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔

مہر بلب ہوگیا تھا ——— !!

عاشی ——

جو اپنی کھوج کی خاطر مضطرب تھی —— وقت نے اُسے کیسا بے بس و لاچار کر دیا تھا۔
محبتوں اور رفاقتوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ خود کو کس قدر تنہا محسوس کر رہی تھی —— !!

شہباز ——

جو عاشی کے حسن کا پرستار تھا۔
عاشی کی خوشیوں کی خاطر وہ اپنی زندگی بھی قربان کر سکتا تھا۔
بے شمار اور بے پناہ دولت کا مالک تھا۔
لیکن —— اُس کی دولت بھی عاشی کے کھوئے ہوئے سکون کو خریدنے سے قاصر تھی —— !!

اور —— نرس

جو کتاب کے مطالعہ میں محو تھی ——

وہ محمود کی تیمارداری پر معمور کی گئی تھی
جب تک محمود جاگتا رہتا —— اُس کی آنکھیں کھلی ہوتیں وہ اُس کے ایک ایک اشارے کا خیال رکھتی لیکن اُسے کسی کی موت سے کوئی غرض نہیں تھی۔
شاید اس لئے کہ وہ موت اور زندگی کے درمیان جھیل جانے والی آنکھ مچولی کی عادی ہو گئی تھی۔
جبھی تو بڑے سکون سے بیٹھی نظر آ رہی تھی —— !!

وقت بڑی تیزی سے اپنی مسافت طے کر رہا تھا، محمود دو گھنٹوں سے آنکھیں بند کئے بے حس و حرکت پڑا تھا اور عاشی نصوبر غم بنی اُس کے قریب بیٹھی ٹکٹکی باندھے اُسے تکے جا رہی تھی۔ پھر دروازے پر قدموں کی آہٹ اُبھری تو چونک اٹھی۔ آہستہ سے اُس نے نظریں گھما کر دیکھا —— محمود حسین ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس چہرے پر گہری سنجیدگی سمیٹے کمرے میں داخل ہو رہے تھے —— نرس نے انھیں دیکھا تو کتاب رکھ کر جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

شہباز اور محمود حسین کی نگاہیں ایک دوسرے سے چار ہوئیں، ایک لمحے کے لئے —— نگاہوں نگاہوں میں وقت کی نزاکت کا احساس اُبھرا پھر محمود حسین نے ایک نظر دیوار گیر گھڑی پر ڈالی۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

"عاشی بیٹی —— جاؤ، جا کر سو جاؤ —— رات زیادہ ہو گئی ہے۔"

"انکل ——" وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی، تیزی سے اٹھی اور بے اختیار محمود حسین کے کشادہ سر پر رکھ کر ہولے ہولے سسکنے لگی۔

"خدا پھر بھروسہ رکھو بیٹی —— وہ بہتر ہی کرے گا ——"

"بابا کی حالت ——" عاشی نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز رندھ کر رہ گئی۔

"مایوسی گناہ ہے ——" محمود حسین نے محمود کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے آہستہ سے کہا "موت اور زندگی خدا کے اختیار میں ہے —— اسی کے آگے ہاتھ پھیلا کر دعا مانگو۔"

محمود حسین نے شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو عاشی کا دل بھر آیا —— پلکوں کی اوٹ سے ہوئے آنسو اُمڈ اُمڈ کر بہنے کے لئے مچلنے لگے تو اُس نے جلدی سے دراز پلکیں جھکا لیں، کنکھیوں سے محمود کے بے حس و حرکت پر ایک الوداعی نظر ڈالی پھر دل کی دھڑکنوں کو سمیٹتی تیزی سے پلٹی اور کمرے سے باہر چلی گئی —— !!

شہباز نے کچھ کہنا چاہا لیکن محمود حسین کا اشارہ پا کر وہ بھی خاموشی سے باہر چلا گیا اور محمود حسین عاشی اور شہباز کے جانے کے بعد قدم اُٹھاتے محمود کے بستر کے قریب آ گئے —— چند لمحے وہ محمود کو بہت غور سے دیکھتے رہے پھر آہستہ سے اُنھوں نے ایک آرام کرسی گھسیٹی اور اس پر نیم دراز ہو گئے لیکن اُن کی نگاہیں بدستور بیمار چہرے پر جمی رہیں —— !!

رات کے کوئی دو بجے کا عمل رہا ہوگا جب محمود کے بوجھل پپوٹوں کو ہلکی سی جنبش ہوئی، اُس نے اپنی گردن کو معمولی سا گھمایا بھی تھا پھر کمرے کے سکوت میں اُس کی نقاہت سے ڈوبی آواز کپکپاتی ہوئی اُبھری۔

"پا —— نی ——"

محمود حسین تیزی سے اپنی نشست سے اُٹھے لیکن نرس بھی بے خبر نہیں تھی، اُس نے لپک کر پانی کا گلاس بھرا پھر محمود کے قریب آ گئی، بڑی مشکلوں سے اُس نے بیمار کو دو چار گھونٹ پانی پلایا تھا، محمود حسین مصلحتاً سرہانے جا کھڑے ہوئے تھے تاکہ محمود کی نظر اُن پر نہ پڑ سکے، نرس کو بھی انھوں نے اشارے سے خاموش رہنے کی تاکید کر دی تھی۔

پانی پلا کر نرس دوبارہ مریض کے قریب آئی تو وہ آنکھیں کھولے رات کے گھپ اندھیروں میں پائیں باغ والی سمت کھلنے والی کھڑکی سے باہر نہ جانے کیا گھور رہا تھا۔ بوڑھی آنکھوں میں دنیا جہان کی حسرتیں منجمد ہو کر ماتم کناں نظر آ رہی تھیں اور چہرے پر یاس ہی یاس چھائی ہوئی تھی۔

"بابا —— آپ جوس پئیں گے؟" نرس نے نہایت شفقت سے دریافت کیا
محمود نے کوئی جنبش نہ کی —— کوئی توجہ نہ دی، خلا میں ٹکٹکی باندھے تکتا رہا۔
"فریج میں ٹھنڈا اورنج جوس بھی موجود ہے۔" نرس نے اُسے دوبارہ مخاطب کیا "لاؤں ——؟"
اس بار محمود کی تھرائی ہوئی نظروں کو جنبش ہوئی، اُس نے نگاہوں کا زاویہ بدل کر نرس کو دیکھا جو اس کے قریب کھڑی نرم لہجے میں اس سے اورنج جوس کے لئے دریافت کر رہی تھی۔
"ڈاکٹر کا خیال ہے کہ آپ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے۔" نرس نے اُس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کاروباری نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی "بس ذرا کمزوری رہ گئی ہے —— وہ بھی جاتی رہے گی۔"
محمود نرس کو بدستور گھورتا رہا۔
"آج بڑے ڈاکٹر بھی آئے تھے ——" نرس نے بڑے پیار سے کہا "وہ کہہ رہے تھے کہ اب آپ کو ہنسنا بولنا چاہیئے چپ لیٹے رہنے سے طبیعت کی گرانی بڑھ جاتی ہے۔"
محمود نے کوئی جواب نہیں دیا البتہ اُس کی آنکھوں کے گوشے نمناک ہونے لگے تھے
"خود کو سنبھالنے کی کوشش کیجئے بابا۔" نرس نے اُس کا کمزور اور نحیف ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا "آپ کی بیماری کی وجہ سے عاشی بھی بہت اُداس اُداس رہتی ہے اور آج تو وہ بہت زیادہ پریشان تھیں ——"
"کیوں ——" محمود کے پپڑی جمے ہونٹ لرز کر کھل گئے —— "کیا پریشانی ہے میری عاشی کو؟"
نرس نے اتنے دنوں بعد پہلی بار محمود کو بولتے سنا تو خوش ہو گئی —— جلدی سے بولی
"میں آپ کے لئے اورنج لاتی ہوں ——"
"نہیں ——" محمود نے اُسے روک دیا، بوجھل آواز میں پوچھا "تم —— تم عاشی کی پریشانی کا ذکر کر رہی تھیں۔"
"ہاں بابا جی —— وہ آپ کی صحت کی طرف سے بہت فکرمند ہے۔"
"میں —— جانتا ہوں" محمود کے حلق سے ایک سرد آہ نکل کر فضا کے سوگوار ماحول میں گم ہو گئی۔
نرس نے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن محمود حسین نے اُسے اشارہ سے چپ رہنے کی تاکید کی پھر اُنھوں نے نرس کو باہر جانے کا اشارہ کیا —— وہ ایک لمحے کو جھجکی پھر محمود پر ایک نظر ڈالتی جانے کے لئے گھومی تو محمود نے اُسے روکتے ہوئے پوچھا۔
"نرس —— وہ —— عاشی کہاں ہے؟"
"عاشی سو گئی بابا جی ——" نرس نے پلٹ کر کہا پھر تیزی سے لمبے لمبے قدم اُٹھاتی باہر چلی گئی۔
محمود حسین دبے قدموں آگے بڑھے اور محمود کے سامنے آ گئے۔ بڑی گمبھیر آواز میں بولے
"عاشی سو گئی لیکن میں جاگ رہا ہوں ——"
محمود نے پھٹی پھٹی نظروں سے محمود حسین کو دیکھا —— یوں جیسے اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو، اُس کی آنکھوں کا اضطراب یکلخت ہی بڑھ گیا۔ کپکپاتے لبوں کو اُس نے بند کرنے کی کوشش کی تو محمود حسین

نے کہا،

" ڈاکٹروں کی ماہرانہ رائے ہے کہ تم نے جان بوجھ کر خاموشی اختیار کر لی ہے اور جب تک تمہاری اس خاموشی کا طلسم برقرار رہے گا تمہاری یہ حالت برقرار رہے گی ——— "

ممدو نے کوئی جواب نہیں دیا، مٹھیاں بھینچ کر دل کی دھڑکنوں کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔

" آج تمہیں بولنا ہوگا ممدو ——— تمہیں بتانا ہوگا کہ تم موت کو زندگی پر کیوں ترجیح دے رہے ہو "

" مالک ——— " ممدو کی آواز تھرتھرانے لگی۔

" میں تمہارا دشمن نہیں ——— دوست ہوں " محمود حسین نے نرمی سے کہا " تمہارے دل پر جو بوجھ ہے اُسے ہلکا کر دو ——— اُتار پھینکو ——— مجھے اپنا رازدار بنا لو ——— "

" مالک ——— " ممدو کی پلکوں کی اوٹ سے آنسوؤں کے قطرے اُمڈنے لگے۔

" ممدو ——— " محمود حسین نے ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد آہستہ مگر ٹھوس آواز میں کہا " میرا خیال ہے کہ میں تمہارا غم اوروں کے مقابلے میں زیادہ بہتر طور پر بانٹ سکتا ہوں "

ممدو نے بڑی سختی سے ہونٹ بھینچ لئے، وہ اپنے سینے میں چھپے اُن طوفانوں کو دبانے کی کوشش کر رہا تھا جو آج رہ رہ کر بے قابو ہوئے جا رہے تھے۔ محمود حسین خاموش کھڑے ممدو کی کیفیت کا اندازہ لگاتے ہوئے پھر بولے

" میں ——— میرا خیال ہے کہ میں نے تمہیں شناخت کر لیا ہے ——— "

" سرکار ——— مالک ——— " ممدو سسک اُٹھا

" مجھے عاشی نے بتایا تھا کہ بیگم افتخار احمد کی آمد کے بعد سے تمہاری حالت خراب ہوئی ہے " محمود حسین نے ماضی کے دُھندلکوں کو اندھیروں میں کریدتے ہوئے کہا " کیا ——— کیا تم اسرار احمد کو بھی جانتے ہو ——— "

" ہاں مالک ——— جانتا ہوں " ممدو نے بسورتے ہوئے جواب دیا " میں وہاں بھی مالی تھا سرکار ——— لیکن ——— خزاں کے جھونکوں نے اس گلشن کو تاراج کر دیا ——— "

محمود حسین پھٹی پھٹی نظروں سے ممدو کو دیکھ رہے تھے، حالات کی ابھی صرف ایک کڑی مل تھی لیکن اُن کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگی تھیں ——— ابھی اُلجھی ہوئی ڈور کا محض ایک سرا ہاتھ آیا تھا لیکن وہ بے چین ہو گئے تھے ——— تڑپ اُٹھے تھے ——— پھر قدرے سنبھل کر پوچھا

" کیا اسرار احمد ——— "

" اب وہ اُس دنیا میں نہیں ہیں مالک ——— " ممدو نے نحیف لہجے میں جواب دیا، پلکوں سے ڈھلکتے آنسو کسی طرح رُکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

" اسرار احمد کی ایک بیٹی بھی تھی ——— " محمود حسین نے بڑے ضبط سے کام لیتے ہوئے پوچھا ——— فائزہ ——— "

" تھی مالک ——— لیکن ——— "

" لیکن کیا ——— " محمود حسین نے تڑپ کر دریافت کیا

" وہ بھی روٹھ کر دنیا سے منہ موڑ گئی ——— "

محمود حسین کے دل کو شدید دھچکہ لگا تو وہ لڑکھڑا کر رہ گئے، خود کو بمشکل سنبھالتے ہوئے بولے

" فائزہ کی کوئی بیٹی بھی ہے ——— "

" جی ——— جی ہاں مالک ——— " ممدو سسک اُٹھا

" کیا نام ہے اُس کا ——— کہاں ہے وہ "

" آپ ؟ ——— کیا آپ بھی اُسے نہیں پہچان سکے مالک " ممدو نے حیرت سے پوچھا، بستر سے اٹھنے کی کوشش کی تو نقاہت سے چکرا کر رہ گیا، ایک ذرا اور اٹھتا تو بستر سے ڈھلک کر فرش پر آ جاتا۔

" عاشی ——— " محمود حسین شدتِ جذبات سے بھرپور آواز میں بولے ——— " میری بچی ——— "

" ہاں مالک ——— ہاں ——— عاشی آپ کی بچی ہے ——— آپ کا خونِ جگر ہے ——— ایک بدنصیب

ماں کی آنکھوں سے ٹپکا ہوا آنسو ——— ہو بہو اپنی ماں کی جیتی جاگتی تصویر ——— " ممدو آنسو بہاتے ہوئے بولا مجھے یقین تھا مالک کہ آپ ——— آپ اپنے خون کو ضرور پہچان لیں گے ——— "

" تم ——— " محمود حسین نے ہونٹ چباتے ہوئے سوال کیا " تم نے اتنے دنوں تک خاموشی ہوں اختیار رکھی ——— "

" مجھے ——— وقت کا انتظار تھا مالک ——— لیکن ——— میں نے فائزہ بی بی کی نشانیوں کو بہت سنبھال کر رکھا ہے ——— اپنی جان سے زیادہ حفاظت کی ہے "

" نشانیاں ——— کیسی نشانیاں ——— " محمود حسین نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

" میں ——— میں دکھاتا ہوں آپ کو ——— ہاں مالک ——— آج کا دن میرے لئے عید کا دن ہے ——— یوں اور برسوں کا دن ہے ——— آج ہی کے دن کے انتظار میں تو میں نے زندگی کے ایک ایک لمحے کو بہت سنبھال کر رکھا تھا ——— "

ممدو ہمت کر کے اُٹھا، لڑکھڑاتا ہوا الماری تک آیا پھر اُس نے الماری کا تالا کھول کر ایک صندوق نکالنے کی کوشش کی تو خود کو نہ سنبھال سکا، تیورا کر دیوار سے ٹکرا گیا،

محمود حسین نے لپک کر اُسے نہ سنبھالا ہوتا تو شاید وہ توازن برقرار نہ رکھ سکتا ——— اُس کی سانس کی رفتار بے ترتیب ہو رہی تھی، جیسے وہ بہت تھک گیا ہو ——— نڈھال ہو گیا ہو۔

محمود حسین نے اُسے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بٹھا دیا، اُس کے اشارے پر صندوق الماری سے نکالے، اس کے تالے کو کھولا، دھڑکتے ہوئے دل سے اُس کا ڈھکن اُٹھایا تو فرطِ جذبات سے آنکھیں بھر آئیں، کانپتے ہاتھوں سے ایک ایک چیز کو اُٹھا کر دیکھنے لگے ——— ماضی کی یادیں تازہ ہو رہی تھیں ——— ایک ایک بھولے بسرے لمحوں کی دلگداز یادوں سے پردہ سرکاتی جا رہی تھی۔

سہاگ کا جوڑا ——— جو آج بھی مہک رہا تھا۔

شادی چوڑیاں ———

جڑاؤ نکلس ———

کانوں کے آویزے جو ہیروں سے جگمگا رہے تھے ———

ماتھے کا ٹیکہ ——— جو ایک اُجڑے سہاگ کی نشانی تھا

سُرخ نگینے والی انگوٹھی ——— جو سہاگ کی رات کو خود محمود حسین نے فائزہ کی انگلی میں ڈالی تھی۔

ایک حسین یادگار ———

ایک خوبصورت تحفہ ——— جو آج بھی چمک رہا تھا ———

کچھ لباس تھے جن میں اُجڑی بہاروں کی مہک باقی تھی ———

اور ———

سُرخ ڈائری ——— جس میں فائزہ نے اپنے ماضی کے واقعات رقم کئے تھے۔

جب وہ دلہن بنی تھی ———

جب تقدیر نے باپ کا سایہ اُس کے سر سے جُدا کر دیا تھا ———

جب قسمت نے اُسے اپنے گھر کی دہلیز چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا ———

حالات کی منجدھار میں تنہا چھوڑ دیا تھا ———

ایک ایک کر کے سارے سہارے چھوٹ گئے تھے ——— پھر

ممدو نے اسے اپنے چھوٹے سے گھر کے کچے آنگن میں پناہ دی تھی ———

وقت نے اسی گھر میں سنبھالا لیا تھا ———

قدرت نے اُس کی تنہائیوں کو بہلانے کے لئے ایک خوبصورت کھلونا عطا کر دیا ———

عاشی ——
جو اُس کی زندگی کے لئے ایک حسین سہارا بن گئی تھی ——
لیکن تقدیر نے اُسے بھی بے سہارا کرنے کی خاطر فائزہ کو ایک موذی مرض میں مبتلا کر دیا ——
محمود حسین ڈائری کے اوراق اُلٹتے ہے، اُن کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہے..... پھر کچھ
ممدو کا خیال آیا —— ممدو، جس نے اُن کی کھوئی ہوئی خوشیاں آج اُن کی جھولی میں واپس ڈال دی تھی
وہ ممدو کی طرف پلٹے، اُس کا شکریہ ادا کرنے کی خاطر لیکن ——
ممدو کی آنکھیں اپنے حلقوں میں پتھرا کر ساکت ہو گئی تھیں —— منجمد ہو گئی تھیں ——
ممدو —— محمود حسین دیوانہ وار اُٹھ کر فون کی طرف لپکے، ڈاکٹر کو فوراً پہنچنے کی ہدایت کی، نرس کو آوازدی
ممدو کے قریب جا کر اُس کی نبض کو ٹٹولا تو دھک سے رہ گئے ——
ممدو اُن کی دسترس سے بہت دُور جا چکا تھا ——
منزل تک پہنچنے کی جدوجہد میں اُس نے کتنی ہمت اور جوانمردی سے کام لیا تھا ——
کیسے کیسے حالات کے سامنے سینہ سپر ہو گیا تھا ——
اور پھر منزل پر پہنچ کر کس قدر پُرسکون ہو گیا تھا ——
اُس کے چہرے پر کرب و اذیت کا کوئی نشان نہیں تھا ——
اطمینان اور سکون نظر آ رہا تھا ——
اپنی منزل پا لینے کے بعد وہ کس قدر خاموشی سے دبے پاؤں دنیا سے رخصت ہو گیا تھا ——
یوں ——
جیسے اُسے کسی ستائش ——
کسی صلے کی کوئی تمنا نہ ہو ——
گزرے ہوئے ایک لمحے نے اُسے کتنا عظیم بنا دیا تھا ——
کتنا بلند کر دیا تھا ——
اتنا سربلند کہ اُس کے سامنے ہر شے ہیچ نظر آ رہی تھی ——
اور ——
محمود حسین نے بھی خود کو عظمت کے اس مینار کے آگے سرنگوں کر لیا —— !!

وقت کا پنچھی لمحوں کو اپنے پروں میں دبوچے اپنی اڑان اڑتا رہا —— ساعتوں کا سفر اپنی منزلیں بدستور
اڑتا رہا —— سنگ میلوں کے نشانات اُبھرتے اور رُو نہ ہوتے رہے۔
گردش کے عمل میں کوئی ٹھہراؤ نہیں پیدا ہوا ——
کوئی جمود نہیں آیا ——
صبح اسی آب و تاب سے نمودار ہوتی رہی ——
نسیم سحر کے جھونکے بند کلیوں کی اُمنگوں کو بدستور گدگداتے رہے۔
کلیاں چٹکتی رہیں ——
چٹک کر پھول بن گئیں ——
پھولوں کی خوشبو نے پورے گلشن کو اپنے وجود کی مہک سے معطر کر دیا۔
عطر بیز ہوائیں سبزے کو پھول کی زندگی کی نوید دیتی رہیں۔
لیکن ——
یہ زندگی بڑی عارضی ثابت ہوئی۔
چڑھتے سورج کی تپش نے پھول کی شگفتگی کو گھیرا تو وہ سرنگوں ہو گیا۔
کملا گیا ——
اُس نے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی خاطر شاخوں اور پتیوں کے درمیان پناہ لینی چاہی۔
مگر ——
شام ڈھلتے ڈھلتے اُس کی جوانی بھی ڈھل گئی۔
دوسری صبح نمودار ہوئی تو وہ کسی مجبور بیوہ کی طرح کانٹوں کے درمیان مرجھایا مرجھایا نظر آ رہا تھا۔
پھیکا پھیکا سا ——
بے رنگ ——
اُس کے وجود کی مہک نے بھی اُس کا ساتھ چھوڑ دیا۔
اور پھر ——
ہوا کا ایک تیز و تند جھونکا آیا اور اُس کی پنکھڑیوں کو اپنے ساتھ اُڑا لے گیا۔
اس کی زیست کا سراغ فضاؤں میں بکھر گیا۔
منتشر ہو گیا —— ریزہ ریزہ ہو گیا۔
لیکن کائنات کی رنگینیوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔
دھوپ کے سائے بدستور منڈیر پر چڑھ کر شام کے دھندلکوں میں مدغم ہوتے رہے۔
شام کا رنگ و رُوپ رات کے تھپ اندھیروں میں محوِ خواب ہوتا رہا۔

اور ——

رات کی ویران تاریکیاں ۔ ور انکرائی لے کر صبح کے اُجالوں میں بیدار ہوتی رہیں ۔
قدرت کے نظام میں عارضی فنا اور وجود سے کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا ——!!
ساحل پر کھڑے ہو کر کوئی کنکری پانی کی خاموش سطح پر اُچھال جائے تو کچھ لمحوں کے لئے چند تبدیلیاں ضرور ہوتی ہیں۔
انتشار کی علامتیں نمودار ہوتی ہیں ۔
پانی کا ٹھہراؤ وقتی طور پر مچل اُٹھتا ہے ۔
چھوٹے چھوٹے لہریے پیدا ہوتے ہیں۔

پھر ——

یہی دائرے پھیل کر بحرِ بے کراں کی نامعلوم وسعتوں میں گم ہو جاتے ہیں۔
اپنا سراغ مٹا دیتے ہیں ۔
اپنے وجود کو کبھی نہ چھٹنے والے گھپ اندھیروں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھپا لیتے ہیں۔
لیکن ——

ان کی یادیں کبھی نہیں مٹتیں —— خوشبو بن کر فضا میں تحلیل ہو جاتی ہیں ۔
ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔
وقت کے ہنگاموں میں اُن یادوں کی شدتیں ضرور کم ہو جاتی ہیں مگر ان یادوں کے نقش کبھی نہیں دُھندلاتے ۔
دل کے نہاں خانوں میں محفوظ رہتے ہیں۔

اور ——

جب دل پر کوئی چوٹ —— کوئی ضرب کاری لگتی ہے تو یادیں پھر تازہ ہو جاتی ہیں۔
اور اکثر ——

ان یادوں کی کوئی خلش کسی اور کے وجود کو کانٹوں کی سیج پر تڑپاتی رہتی ہے ۔

ایک لمحہ ——

ایک پل سکون نہیں لینے دیتی۔
پھانس کی طرح چبھتی رہتی ہے —— ٹیسیں پیدا کرتی رہتی ہے۔
یہی کیفیت عاشی کی تھی ——
ممدو کی موت نے اُسے گنگ کر دیا تھا —— ایک سرپرست کا سایہ اچانک سر سے اٹھا تو وہ یوں سکتے کی کیفیتوں سے دوچار ہو گئی جیسے اُس کی زندگی میں کوئی انہونی ہو گئی ہو —— ممدو کی جُدائی کے ساتھ ہی اُسے اپنی بے بسی کا احساس بھی بڑی شدت سے ٹوٹ کر ہوا ۔ اچانک ہی وہ خود کو بالکل بے سہارا سمجھنے لگی اور اسی احساس اور مستقبل کے اندیشوں نے اُس کے معصوم وجود کو لرزہ بر اندام کر دیا۔
جب تک ممدو کا جنازہ آنگن کے برآمدے میں موجود رہا وہ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی، اس کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہیں گرا —— اُس نے اپنی پلکوں کی جنبش روک لی تھی —— وہ دل بھر کر ممدو کو دیکھ لینا چاہتی تھی کہ اب گھر کی چہار دیواری میں اُس کا قیام ناگزیر ہو گیا تھا —— موت کی ایک ہی جھلک نے زندہ انسانوں سے اُس کے تمام رشتے ناطے ختم کر دیئے تھے —— اب اس کی حیثیت دنیا کے ہنگاموں کے درمیان ایک خاموش تماشائی کی سی تھی جس نے تمام جذبوں سے اپنا منہ موڑ لیا تھا۔
ایک مہمان تھا —— کچھ دیر کا مہمان ۔
جو عاشی کی زندگی سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے کو تھا۔
اسی لئے تو اُس نے پلکوں کی اوٹ میں مچلتے اور سسکتے آنسوؤں کو بہنے سے روک لیا تھا،

ممدو کو آخری وقت تک اپنی آنکھوں میں بسائے رکھنا چاہتی تھی، —— ان لمحوں کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی جو اُسے ممدو سے اپنا سفر طے کر رہے تھے۔
کئی بار آنسوؤں کی نمی اس کے اور ممدو کے درمیان دُھند بن کر حائل ہوئی لیکن ہر بار اُس بے دردی سے دُھند کو صاف کر کے پھر اُس پر نظریں جما دیں، اُسے رہ رہ کر اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا —— ان آنسوؤں پر جو اٹھی جو رہ رہ کر بھیجے ہوئے طوفانوں کی طرح پلکوں کی اوٹ سے اُبھرنے کو تڑپ رہے تھے۔ وہ ان آنسوؤں کو روک رہی تھی —— انھیں دلاسے دے رہی تھی کہ اتنی جلدی بھی کیا ہے —— "بابا —— بس کچھ لمحوں کے لئے تو ساری عمر پڑی ہے ——"
اور ——

جب ممدو کا جنازہ اٹھا تو جیسے وہ اچانک دیوانی ہو گئی —— طوفانوں کی شدتیں جنھیں بڑی دیر سے جھوٹی تسلیاں اور بہلاوے دے رہی تھی یکلخت بے قابو ہو گئیں —— آنسوؤں کا سیلاب اُمڈا تو پلکوں کی طرح دوڑ کر وہ ان لوگوں کی راہ میں حائل ہونے کے لئے لپکی جو ممدو کو کاندھوں پر اٹھائے اس سے بہت دُور لئے جا رہے تھے لیکن شمسہ بیگم اور شائستہ بیگم نے اُسے پوری قوت سے جکڑ لیا۔
"صبر سے کام لو عاشی —— قدرت کو یہی منظور تھا" شائستہ بیگم اپنے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے بولیں۔
"خدا سے دعا کرو بیٹی کہ وہ تمہارے بابا کو اپنے حبیبؐ کے صدقے میں جنت میں جگہ دے" شمسہ بیگم نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا "رونے اور بین کرنے سے مرنے والے کی روح کو اذیت ہوتی ہے ——"
لیکن ممدو کی جدائی کے احساس نے اُسے جیسے گونگا کر دیا تھا —— بہرہ کر دیا تھا، وہ کسی کی بات نہیں سن رہی تھی، کسی نصیحت پر عمل کرنے کو تیار نہیں تھی —— وہ اس قابل ہی کہاں تھی کہ کچھ سوچتی یا سمجھتی، زندگی کا آخری سہارا چھن جانے کے احساس نے اُسے دیوانہ کر دیا تھا —— وہ عورتوں کے حلقے کے درمیان جنونی حالت میں چیختی رہی —— چلاتی رہی —— خود کو آزاد کرانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتی رہی۔

پھر ——

جب ممدو کا جنازہ زنانخانے سے باہر گیا تو عاشی نے پوری شدت سے حلق پھاڑ کر ایک آخری "ہائے بابا" کہہ کر اپنی بے بسی اور بے چارگی کی سمت متوجہ کرنے کی بھرپور کوشش کی پھر نڈھال ہو کر شمسہ بیگم کے بازوؤں میں ڈھلک گئی —— درد حد سے گزر کر اُس کے حق میں دوا بن گیا —— چیخے چیخے اور بین کرتے کرتے وہ نڈھال ہو کر بے ہوش ہو گئی تھی ——

—— غموں کے بادل وقتی طور پر چھٹ گئے
—— احساس منجمد ہو کر گھپ اندھیروں میں ڈوب گیا
لیکن ——
عاشی کے سُتے ہوئے ویران چہرے پر آنسوؤں کی نمی بدستور برقرار تھی ——
وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھی —— مگر
اُس کے بھیگے بھیگے ہونٹ رہ رہ کر لرز رہے تھے ——
کپکپا اٹھتے ——
یوں ——
جیسے، وہ بے ہوشی کے عالم میں بھی ممدو سے ہمکلام تھی۔
کچھ شکوے اس کے ہونٹوں پر مچل رہے تھے ——
کچھ شکایتیں تھیں جو اُس کے لبوں پر تڑپ رہی تھیں ——
"سنبھالنا شمسہ ——" شائستہ بیگم نے عاشی کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے تیزی سے کہا "عاشی بے ہوش ہو گئی ہے"
"یہ ——" شمسہ بیگم نے پلٹ کر بیٹی کو مخاطب کیا "کسی ملازم کو بھیج کر ڈاکٹر کو بلاؤ —— جلدی کرو"

ناجیہ نے ایک نظر عاشی کے مرجھائے ہوئے چہرے پر ڈالی پھر دل مسوس کر پلٹی اور ڈاکٹر کو فون کرنے کی خاطر کوٹھی کی جانب تیز تیز قدم اُٹھانے لگی۔

عورتوں نے شمسہ بیگم کا ہاتھ بٹایا۔ عاشی کو اٹھا کر بستر پر لٹا دیا گیا، شمسہ بیگم سرہانے بیٹھ کر اس کی پیشانی پر بڑی محبت اور شفقت سے ہاتھ پھیرنے لگیں ——— شائستہ بیگم نے عاشی کے تلوؤں کو سہلانا شروع کر دیا کمرے میں جو عورتیں موجود تھیں وہ عاشی کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

ہر آنکھ پُرنم تھی ———

ہر دل بیٹے کی اتھاہ گہرائیوں میں دھڑک رہا تھا ———

اور ———

وقت کا پنچھی لمحوں کو اپنے پروں میں دبوچے اپنی اڑان اُڑتا رہا ——— !!

ایک مہینہ یوں بیت گیا جیسے ابھی کل کی بات ہو ——— !!!

کوئی پالتو جانور بھی اپنی بولی بولتے بولتے اچانک پنجرے کی تیلیوں کے پیچھے دم توڑ دے تو گھر والوں کو اُس کا دکھ ضرور ہوتا ہے ———

ممدو تو بہرحال انسان تھا ———

ناجیہ کو بھی اس کی موت پر دکھ ہوا لیکن اس نے اس وقتی احساس کو اپنے وجود پر طاری کرنے کی کوشش نہیں کی ——— دادی کی موت پر اُسے زیادہ صدمہ ہوا تھا ——— دادی کی ذات اُس کے لئے ستون کی حیثیت رکھتی تھی، اسی ستون پر اس کے غرور تجبر اور ضدی طبیعت کی بنیادیں قائم تھیں ——— ایک ٹھوس اور مضبوط سہارا اچانک ختم ہو گیا تو وہ کچھ دنوں کے لئے سہم ضرور گئی تھی لیکن اُس نے دادی کی کمی اور اُن کی موت کے غم کو جان کا روگ نہیں بنایا۔ بہت جلد خود کو حالات کے نئے سانچوں میں ڈھال لیا۔

دادی سے خون کا بہت قریبی رشتہ ہونے کے باوجود اُس نے انھیں کیسر بھلا دیا تھا

پھر ——— ممدو کی کیا حیثیت تھی ——— !

ایک ملازم ہی تو تھا ——— !!

گھر میں برطرف ممدو کی موت کی وجہ سے غم کے بادل منڈلائے تو وہ بھی چند دنوں کیلئے گھٹن کا شکار ہو گئی لیکن اس گھٹن کے اندر بھی ناجیہ نے بڑے سکون کا سانس لیا تھا ——— پھر جب شمسہ بیگم نے منے والے کے سوئم کے بعد عاشی کو کوٹھی کے ایک کمرے میں منتقل کر لیا تو ناجیہ کی خوشی دوچند ہو گئی۔

عام حالات میں شاید وہ عاشی کو خود سے اتنا قریب ——— ایک ہی چھت کے نیچے دیکھنا پسند نہ کرتی لیکن شہباز کی وجہ سے وہ عاشی کو ہر وقت اپنی نظروں کے قریب رکھنا چاہتی تھی۔

شہباز ———

جسے ناجیہ نے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا ———

عاشی کی وجہ سے وہ محض تفریحاً شہباز کے قریب گئی تھی ———

لیکن ———

شہباز کی مردانہ پُروقار شخصیت نے اُسے تسخیر کر لیا ———

وہ اُسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتی تھی ———

زندگی کے ہم سفر کی حیثیت سے نہ سہی لیکن ایک دوست کی طرح ہی وہ شہباز کو اپنا گرویدہ بنانا چاہتی تھی ———

اپنی انا کی تسکین کی خاطر ———

اپنی امارت کے ستونوں کو اور بلند کرنے کی خاطر ———

اپنی سربلندی کی خاطر ———

اور اس لئے بھی کہ ———

اُسے اپنے مقابلے میں عاشی کی شکست منظور تھی ——— !!

اور ———

قسمت ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر ناجیہ کے حق میں وقتی طور پر مہربان ہو گئی ——— ممدو کی موت نے شہباز اور عاشی کے درمیان جو فاصلے پیدا کر دئے وہ ناجیہ کے لئے بے انتہا خوش کن تھے ———

شہباز نے محمود حسین کی کوٹھی پر آنا جانا کم نہیں کیا لیکن عاشی تک اس کی رسائی مشکل ہو گئی تھی۔ اس نے عاشی نے خود کو اپنی ذات کے اندر محبوس کر کے اپنے کمرے تک محدود کر لیا تھا اور شہباز ——— اس کی کیفیت بھی عین مساوی تھی جو منزل کے قریب پہنچ کر اچانک راہ بھٹک گیا ہو ——— وہ جب بھی آتا محمود حسین اور شمسہ اُسے ہاتھوں ہاتھ لیتے، اُس کی دلجوئی میں لگے رہتے ——— ناجیہ بھی گفتگو میں شریک ہو جاتی مگر وہ جلد ہی کسی بہانے کا شکار ہو کر وہاں سے اُٹھ جاتی۔

ممدو کی موت کا تذکرہ سُن سُن کر اُس کے کان پک گئے تھے ———

اگر اُس کے اختیار میں ہوتا تو وہ ممدو کی لاش کے ساتھ اُس کی یادوں کو بھی منوں مٹی کے نیچے ہمیشہ کے لئے دفن کرا دیتی ——— اکثر تو وہ اندر ہی اندر بُری طرح تلملا اٹھتی ———

واہ ——— یہ بھی کوئی بات ہوئی؛ وہ جھلا کر سوچتی 'مرنے والا تو دنیا سے رخصت ہو گیا لیکن لوگ اب اس کی یادوں کو سینے سے لگائے اس کا ماتم کر رہے ہیں ——— اِن باتوں سے حاصل بھی کیا تھا ———'

لیکن ———

جب وہ شہباز کی اُداس اُداس نگاہوں میں بے چینی اور بے بسی کی شدتوں کو محسوس کرتی تو دل ہی دل میں کڑھ اٹھتی۔

جھوم جھوم اُٹھتی ———

باتیں کرتے کرتے شہباز کی نگاہیں بار بار اِدھر اُدھر بھٹکنے لگتیں۔

عاشی کو ایک نظر دیکھ لینے کی خاطر وہ کس قدر مضطرب ہو جاتا تھا ———

اُس کے چہرے کا پھیکا پن اُس کے اضطراب کی غمازی کرتا ———

گفتگو کرتے کرتے اچانک یوں گم ہو جاتا جیسے کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو ———

فراق کی شدتیں زیادہ بے چین کرتیں تو وہ رہ رہ کر اپنی نشست پر پہلو بدلنے لگتا ———

اور ———

جب صبر و ضبط کے تمام بندھن ایک ایک کر کے ٹوٹ جاتے تو وہ نظریں جھکا کر دبی زبان میں پوچھ لیتا۔

"عاشی کی طبیعت اب کیسی ہے ———"

ایسے لمحے ——— شہباز کی تڑپ اور اُس کی لگن کو اور نمایاں کر دیتے ———

آج بھی وہ شام کو خیریت معلوم کرنے آیا تو ناجیہ گھر پر موجود تھی ——— کوٹھی کے وسیع لان پر بنے کنج کے قریب آرام کرسی پر نیم دراز وہ ایک کتاب کی ورق گردانی میں مصروف تھی ——— گاڑی کے ہارن کی آواز سُن کر یکلخت چونک اٹھی ——— نظریں گھما کر دیکھا تو شہباز کی جھلملاتی کار پورٹیکو تک پہنچ چکی تھی۔

ایک جھٹکے سے وہ کتاب سبزے پر اچھال کر کھڑی ہو گئی ——— ایک لمحے کو اُس کا دل چاہا کہ دوڑ کر شہباز کے قریب چلی جائے ——— اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تسلی آواز میں کہے

"اچھا ہوا جو تم آ گئے ——— تمہارے آ جانے سے وہ تمام کوفت دُور ہو گئی جو میرے اعصاب پر زنگ بن کر اپنا جم وسیع کر رہی تھی ——— آؤ، میرے قریب بیٹھ کر میٹھی میٹھی ——— پیاری پیاری باتیں کرو کہ رنج و ملال کی کثافتیں دُور ہو سکیں جو عاشی کے وجود سے ابھی تک کوٹھی کے در و دیوار پر مسلط ہیں ———"

دو چار قدم اُس نے جذبات سے مغلوب ہو کر تیز تیز اُٹھائے پھر خود کو سنبھال لیا، اپنی ذات اور انا کو وہ کسی قیمت پر کسی کے سامنے مجروح کرنے پر تیار نہیں تھی ——— اپنی امارت اور اپنی برتری کو بہرحال برقرار رکھنا چاہتی تھی ——— حالات اُس کے حق میں تھے ———

وقت نے اُسے مستحکم اور مضبوط بنا دیا تھا ——
اُس کی دعائیں بے اثر نہیں ہوئی تھیں ——
ممدو کا کانٹا درمیان سے نکلتے ہی اُس کی خلش کو قرار آ گیا تھا ——
گردشِ حالات نے اُسے سربلندی کا ایک اور موقع فراہم کر دیا تھا ——
پھر ——
وہ جذباتیت کا شکار ہو کر خود کو سرنگوں کیوں ہونے دیتی —— ؟؟

شہباز گاڑی سے اُتر کر اندر جانے کے لئے سیڑھیاں طے کر رہا تھا جب وہ اُس کے قریب پہنچی شہباز کی محویت اُسے سخت گراں گزری، کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوتے وقت اُس کی نظر ناجیہ پر ضرور پڑی ہوگی —— بالکل سامنے ہی تو بیٹھی تھی —— لیکن شہباز نے اُسے قابلِ توجہ نہیں سمجھا —— کتنی خوبصورتی سے نظر انداز کر کے سر جھکائے بڑی معصومیت سے اسی کی کوٹھی کے زینے طے کر رہا تھا۔

ایک تانیے کو وہ تھلبس اٹھی پھر ایک زہریلا تبسم اُس کے ہونٹوں پر برق بن کر تڑپا۔ اُس نے نہایت ٹھوس لہجے میں شہباز کو متوجہ کیا۔

"ہیلو ——"

شہباز سیڑھیاں عبور کر کے دروازے تک پہنچ گیا تھا، ناجیہ کی آواز سُن کر اُس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے —— آہستہ سے پلٹ کر اس نے ناجیہ کو دیکھا، سپاٹ آواز میں بولا۔

"تم —— تم کہاں تھیں؟"

"تمہارے سامنے ہی تھی —— لیکن تم شاید جلدی میں تھے" اُس نے زہر خند سے جواب دیا۔

"انکل کہاں ہیں ——" شہباز نے ناجیہ کے لہجے کی تلخی کو نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"ڈیڈ ابھی نہیں آئے —— اور لوگ اندر موجود ہیں" ناجیہ نے مسکرا کر طنز کیا پھر شہباز کو لے کر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

شرفو کو بلا کر اُس نے نہایت تمکنت سے چائے بنانے کا حکم صادر کیا اور یہ بھی کہا کہ شمسہ بیگم کو شہباز کی آمد سے باخبر کر دیا جائے —— شرفو کے جانے کے بعد اُس نے سپاٹ نظروں سے شہباز کو دیکھا، سادہ اور سفید لباس میں بھی اُس کی شخصیت بڑی پُروقار نظر آ رہی تھی لیکن آنکھوں سے چھلکنے والی اُداسی اور حسرتیں ناجیہ کی نگاہوں میں اُس کے کردار کی بلندیوں کی نفی کر رہی تھیں ——

وہ اُس کی اُداسی اور حسرتوں کا سبب بخوبی جانتی تھی —— چاہتی تو ببانگِ دہل شہباز سے دوٹوک فیصلہ کر سکتی تھی —— اُسے کھلے لفظوں میں باور کرا سکتی تھی کہ وہ جس منزل کی تلاش میں ہے وہ اُسے کبھی حاصل نہ ہو سکے گی۔

لیکن ——

وہ صرف مسکرا کر رہ گئی —— شاید اس لئے کہ وہ اپنی زبان کھول کر اپنی شخصیت کے وزن کو ہلکا نہیں کرنا چاہتی تھی —— یا پھر اُس نے خود کو اس لئے خاموش رکھا تھا کہ وہ شہباز کی تڑپ کا تماشہ دیکھنے کی خواہشمند تھی —— کہ بے بسی کا احساس ایک عاشق کے چہرے پر کیا کیا رنگ بکھیرتا ہے ——؟

گھٹن کی شدتیں کن اذیتوں سے اُسے دوچار کرتی ہیں ——؟

حسرتیں کس طرح پامال ہوتی ہیں ——؟

اُمیدوں، آرزوؤں اور تمناؤں کے جنازے کس انداز سے اُٹھتے ہیں ——؟

ناکامی کا احساس دیوانگی اور جنون کو کس طور پیدا کرتا ہے ——؟

اور ——

جب صبر و ضبط کے تمام بند ٹوٹ جاتے ہیں تو طوفان کی شدتیں کن کیفیتوں کو جنم دیتی ہیں ——؟؟

"آنٹی کی طبیعت اب کیسی ہے ——" شہباز نے سکوت سے اُلجھ کر گفتگو کا آغاز کیا۔

"ابھی تک وہ ممدو کے غم میں باقاعدگی سے مبتلا ہیں" اُس نے حقارت سے جواب دیا۔

"کیا انہیں عاشی سے کوئی ہمدردی نہیں" شہباز نے روکھے انداز میں سوال کیا۔

"عاشی ——" ناجیہ ہونٹ کاٹتے ہوئے سپاٹ آواز میں بولی "میرا خیال ہے کہ زیادہ ہمدردی ہمارے اور زیادہ کمزور اور بزدل بنا دیتی ہے ——"

"زخموں پر مرہم نہ رکھا جائے تو وہ ناسور بن جاتے ہیں"

"مرہم کی زیادہ مقدار بھی نئے زخموں کو پیدا کر دیتی ہے" ناجیہ نے اپنی منطق پیش کی۔

"اپنوں کی موت کا غم آسانی سے نہیں بھلایا جا سکتا" شہباز نے سنجیدگی سے کہا "زخم بھرنے میں کچھ وقت ——"

"خیال ہے اپنا اپنا ——" وہ پہلو بدل کر بولی "دادی جان کی موت پر مجھے بھی ایک خلا کا احساس ہوا تھا میں نے بہت جلد اپنے آپ کو سمجھا لیا کہ مرنے والے واپس نہیں آیا کرتے ——"

"تمہاری بات اور ہے ——"

"کیا مطلب ——" ناجیہ چونک اٹھی، جانے کیوں شہباز کے اس جملے سے اپنی تضحیک کا احساس ہوا تھا۔

"میرا مقصد تھا کہ جو لوگ مضبوط اعصاب کے مالک ہوں وہ حالات پر بہت جلد اپنی گرفت مضبوط کر لیتے ہیں"

"اوہ ——" ناجیہ مسکرا دی، تیکھے اور چبھتے لہجے میں کہا "میں تمہیں بھی بہت مضبوط اعصاب کا سمجھتی تھی ——"

"میں سمجھا نہیں ——" شہباز نے اُسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

"جو دوسروں کے غم میں خود کو بھلا دے ——"

"میرے نزدیک اُسے انسانیت کی معراج کہتے ہیں" شہباز نے ناجیہ کا جملہ کاٹتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا "انسانیت کو جذبوں کی صداقت بھی کہا جا سکتا ہے —— لیکن ——"

ناجیہ کچھ کہتے کہتے جانے کیوں یکلخت خاموش ہو گئی، اس کی نگاہوں میں حقارت کی چنگاریاں سُلگ اٹھیں، ہونٹوں پر زہر میں بجھا تبسم مچل رہا تھا ——

"لیکن کیا ——" شہباز نے تلملا کر پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ جذبوں کی صداقت اور انسانیت کے مظاہرے کسی ذاتی غرض یا دلچسپی سے یکسر پاک ہوں" وہ بدستور زہر خند سے بولی "جہاں آمیزش ہو وہاں کھرے کھوٹے کی پہچان زیادہ مشکل نہیں ہوتی"

شہباز ناجیہ کا جملہ سُن کر ایک ثانیہ کو گنگ سا رہ گیا، ناجیہ کی بات کا مفہوم سمجھ کر وہ اندر ہی اندر تلملا اٹھا، ایک لمحے کو اُس کے جی میں آئی کہ وہ کھل کر ناجیہ سے صاف صاف کہہ دے کہ —— "ہاں ..... میں اُسے پرستار ہوں —— عاشی کو پا لینا میرے لئے جینِ زندگی ہے —— میں اپنی محبت کی پاکیزگی کا یقین دلاتا ہوں لیکن یہ غلط ہے —— سراسر بہتان ہے کہ میری محبت میں کسی غرض کو دخل ہے —— میرے جذبے صادق ہیں اور میرے دل کی ایک ایک دھڑکن اس بات کی گواہ ہے کہ میں عاشی سے بے پناہ پیار کرتا ہوں ——"

جملے اُس کے ذہن میں ترتیب پاتے رہے —— زبان اُس کے دل کی ترجمانی کے لئے بے چین تھی لفظوں کو پیشِ نظر اُس نے خود پر قابو پا لیا —— وہ ناجیہ کی طبیعت اور اُس کے مزاج سے بخوبی آشنا تھا اگر وہ بھی جواب میں پلٹ کر کوئی تلخ بات زبان تک لے آتا تو پھر اُس کے اور ناجیہ کے درمیان فرق مٹ جاتا —— مجبوراً خون کے گھونٹ پی کر چپ ہو گیا۔

"کیوں ——" ناجیہ اُس کے چہرے کے تاثرات پڑھتے ہوئے بولی "میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کہی ——"

"اس کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا" اُس نے دبی زبان میں جواب دیا۔

"کچھ مرض ایسے ہوتے ہیں جن کا علاج کسی کے پاس بھی نہیں ہوتا" وہ مسکرائی "خود اپنی مثال لے لو۔ تمہارا عاشی سے دور کا بھی تعلق نہیں لیکن تم نے بھی خود کو اُس کے غم میں گھلا ڈالا ——"

"ہمارے درمیان سب سے بڑا رشتہ انسانیت کا ہے اور پھر —— ہم ایک دوسرے کے ہم جماعت بھی رہے ہیں"

"پھر وہی انسانیت ——" وہ چڑ سی گئی —— "کیا تم تفصیل اور وضاحت سے مجھے بتا سکتے ہو کہ انسانیت کا دائرہ کتنا وسیع و عریض ہوتا ہے اور اس کا پھیلاؤ کن حدبندیوں کا احاطہ کرتا ہے ——"

"کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم کوئی اور بات کریں ——" شہباز نے ہونٹ چباتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔

"مثلاً ——"

وہ اپنی فتح پر زیرِ لب مسکرا دی۔

"مثلاً یہ کہ آج کا موسم کچھ زیادہ خوشگوار نہیں" شہباز نے آہستہ سے کہا "فضا کی کثافت سے گھٹن کا احساس ہو رہا ہے ——"

ناجیہ کے ہونٹوں پر ابھرنے والی شوخ مسکراہٹ شہباز کا جواب سُن کر یکلخت معدوم ہو گئی۔ فضا کی کثافت سے اُس نے ناجیہ کی ذات پر جو چوٹ کی تھی اُسے محسوس کر کے وہ بے اختیار سلگ اٹھی' ایک نظر اُس نے شہباز کو غور سے دیکھا پھر یا ہر جانے کے ارادے سے آگے بڑھی تو شہ فوجائے کی ٹرالی لئے سامنے آگیا —— کچھ سوچ کر وہ ایک لمحہ کو رُکی پھر شہ فو کے قریب سے کتراتی ہوئی لمبے لمبے قدم اُٹھاتی ہوئی باہر نکل گئی ——

اُس کی کشادہ پیشانی پر اُبھرنے والی سلوٹیں کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ نظر آ رہی تھیں۔

✻

محمود موت کی ابدی نیند سو کر دنیا کے تمام دُکھوں، غموں اور ہنگاموں سے آزاد ہو گیا لیکن محمود حسین کی حالت زندہ ہونے کے باوجود مُردوں سے بدتر ہو گئی۔ فائزہ کی ڈائری کے اوراق محمود حسین کے لئے کا ایسا المیہ تھے جس کا اندازہ اُن کے سوا کوئی اور نہیں لگا سکتا تھا۔

فائزہ کی ڈائری نے محمود حسین کے اُس ماضی کو ہوا دے کر بکھیر دیا تھا جسے انھوں نے بڑی مشکلوں سے سمیٹ کر سینے کی گہرائیوں میں چھپا رکھا تھا' ڈائری کی ایک ایک تاریخ اُن کے ماضی کے بیتے ہوئے ایک ایک لمحے کی نقاب کشائی کر رہی تھی' اُس کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر بن کر محمود حسین کے وجود میں شیشے کے نوکیلے ٹکڑوں کی مانند پیوست ہو رہا تھا' اُن کے سکون میں انتشار پیدا کر رہا تھا اور اُن کو ماہی بے آب کی طرح تڑپا رہا تھا۔

کتنی اذیتناک تھی یہ حقیقت کہ عاشی اُن کی اپنی اولاد تھی لیکن اُن ہی کے گھر میں ملازموں کے کوارٹر میں پل کر جوان ہوئی۔

کیسے المناک تھے وہ لمحے جو بے خبری میں محمود حسین کے شب و روز سے ٹکرا کر گزر گئے ——

کس قدر تلخ واقعات تھے جن کے گزرے ہوئے لمحوں کا ایک ایک پل محمود حسین سے اُن کی سرد مہری کا حساب مانگ رہا تھا ——

اُن کے وجود کو کچوکے لگا رہا تھا ——

کسی کروٹ سکون کا ایک سانس نہیں لینے دیتا تھا ——

رہ رہ کر یادوں کی بپھری ہوئی بلا خیز موجیں طوفان کا رُوپ دھارے اٹھتیں ——

محمود حسین کے ذہن کے دریچوں سے ٹکراتیں ——

پھر ——

تڑپ کر واپس پلٹ جاتیں ——

یادوں کے لہرئے ماضی کی سوچوں پر اُبھر کر اپنا دائرہ وسیع کرتے تو وہ تڑپ اٹھتے ——

بے اختیار سسک سسک کر اپنی محرومیوں پر اشکِ ندامت بہانے لگتے ——

اور پھر فائزہ کا تصور مسکراتا ہوا اُن کے ذہن کے پردوں پر اُبھرتا ——

روشن اور حسین تصور ——

اور اس تصور کی خوبصورت اور نشیلی آنکھیں آج بھی محمود حسین کو بڑی اپنائیت سے تکتی رہتیں ——

یوں ——

جیسے انھیں اپنی کھوئی ہوئی منزل مل گئی ہو ——

ان آنکھوں میں کوئی شکوہ —— کوئی شکایت نہیں تھی ——

بے پناہ پیار تھا ——

پیار ——

جو کل بھی تشنہ رہ گیا تھا ——

آج بھی تشنہ تھا ——

اور اسی تشنگی کے احساس نے آرزوؤں اور تمناؤں کو کرید کرید کر اپنے قدموں تلے روندنا شروع کر دیا تھا۔

محمود حسین نے وقت کا تعاقب زیادہ دُور تک نہیں کیا تھا' امریکہ سے بیرسٹری کی تعلیم مکمل کر نے کے بعد جب وہ وطن واپس آئے تو انھوں نے طے کر لیا تھا کہ ماں سے پہلی فرصت میں اپنی شادی کا تذکرہ کر دیں گے، لیکن انھیں صوفیہ خاتون کی سخت گیر طبیعت اور اٹل فیصلوں کا بخوبی اندازہ تھا مگر انھیں یہ بھی اُمید تھی کہ اگر اُن کی محبتوں کی صداقت نے اُن کا ساتھ دیا اور انھوں نے سچے دل سے ماں کے آگے جھولی پھیلا کر اپنی خوشیوں کی بھیک مانگی تو ماں انھیں مایوس نہیں کریں گی۔

چنانچہ امریکہ سے واپسی کے بعد وہ فوراً اپنے دوست ذیشان سے ملنے کا بہانہ کر کے لاہور گئے لیکن جس آباد آشیانے کی تلاش تھی وہ نہ جانے کب کا اُجڑ چکا تھا —— تنکے ایک ایک کر کے طوفانوں کی زد میں آئے فضاؤں میں دور دور بکھر کر اپنا سُراغ بھی مٹاتے چلے گئے۔

محمود حسین نے اپنی کھوئی ہوئی خوشیوں کی تلاش میں ہر اُس جگہ سر مارا جہاں اُمید کی ایک ہلکی سی کرن نظر آئی لیکن ہلکی کوششیں بار آور ثابت نہیں ہوئیں —— وقت اُن کے حق میں بے رحم ہو گیا —— اسرار احمد کی دردناک موت کی اطلاع اور فائزہ کے دربدر ہونے کے احساس نے اُن کی رُوح کو جو چرکے لگائے اُن کی خلش آج بھی برقرار تھی۔

دو ماہ تک وہ متواتر فائزہ کے سُراغ میں شہروں شہروں بھٹکتے رہے لیکن کامیابی کی کوئی اُمید نظر نہ آئی تو اپنے زخموں کو اپنے وجود کے نہاں خانوں میں سمیٹے واپس گھر آ گئے۔

کچھ دنوں بعد ماں نے شادی کا ذکر نکالا تو فائزہ کی یاد نے انھیں تڑپا دیا' وہ زندگی کی ان خوشیوں سے دوبارہ کوئی رشتہ قائم نہیں کرنا چاہتے تھے جو ایک بار اُن سے روٹھ کر خرمنِ دل کو جلا کر خاکستر کر چکی تھیں —— محمود حسین نے شادی سے انکار کی خاطر ہر ممکن راستہ اختیار کیا' ان تمام حربوں کو آزمایا جو شادی کی راہ میں حائل ہو سکتے تھے لیکن صوفیہ خاتون کا فیصلہ اٹل تھا —— اور محمود حسین نے بالآخر ماں کے فیصلوں کے آگے سر جھکا لیا —— وہ اگر چاہتے تو ماں کے سامنے فائزہ سے اپنی شادی کا اعتراف کر سکتے تھے لیکن لفظوں نے گریز کیا ——

اس لئے کہ گردشِ حالات نے اُن کی خوشیوں کا سُراغ مٹا دیا تھا ——

وقت کے بے رحم ہاتھوں نے فائزہ اور اُن کے راستے الگ الگ کر دیئے تھے ——

تقدیر نے اُن کی حسرتوں کو پامال کیا تھا ——

اس بے رحمی سے روندا تھا کہ وہ اپنی بربادیوں کا جشن منانے سے بھی قاصر تھے ——

لہٰذا انھوں نے خود کو مہر بلب کر لیا ——

فائزہ کی تلاش کے دوران ناکامیوں کی بھنور میں ڈوبتے ہوئے ہر لمحہ ایک بار یہ خیال بھی اُن کے ذہن میں اُبھرا تھا کہ کہیں فائزہ نے وقت کی بے رحمیوں سے تنگ آ کر خود کو موت کے حوالے نہ کر دیا ہو —— یہ خیال بڑا اذیتناک تھا —— اس احساس کو جھٹلانے کی خاطر محمود حسین نے دیوانہ وار اُسے تلاش کیا لیکن فلک کج رفتار کو اُن

کی حالت پر کوئی رحم نہ آیا۔
مایوسی اُن کا مقدر بن گئی ——
اور ——
اسی لئے محمود حسین نے ماں کے سامنے فائزہ سے اپنی شادی کا ذکر نہیں کیا' وہ اپنی محبت اور اپنی فائزہ کی پاکیزگی کو داغدار نہیں کرنا چاہتے تھے اس لئے چپ چپاتے ماں کی خواہش کے احترام کی خاطر شمسہ بیگم کو بیاہ لائے ——
پھر وقت کی گردش تیز ہوگئی ——
زندگی کے ہنگاموں میں ماضی کی یادیں رفتہ رفتہ دھندلانے لگیں ——
بیٹے کی مصروفیات نے محمود حسین کو اپنے تانے بانوں میں اُلجھا لیا ——
ناحیہ کی پیدائش نے گھر کی چہار دیواری کے اندر ایک نئی خوشی کو جنم دیا تو ماضی کی بھول بھلیاں یادیں اور تحرد آلود ہوگئیں ——
کائنات اپنے محور کے گرد شب و روز کا چکر کاٹتی رہی ——
پھر ——
جب ممدو نے ایک معصوم بچی کے ہمراہ محمود حسین کی کوٹھی میں قدم رکھا تو حالات نے وقت کے دھاروں کا رُخ موڑ دیا —— جانے کیا بات تھی جو محمود حسین کو ممدو سے زیادہ اس معصوم بچی کا خیال آگیا جو ہر کو ملامت دے دی —— وہ دُور دُور سے اس بچی کو دیکھتے —— خون کا لگاؤ اُن کے دل میں ایک ذرا گرا پیدا کرتا لیکن وہ اپنی مصروفیات میں اُلجھ کر ان جذبوں اور رشتوں پر کوئی توجہ نہ دے سکے جو وقت کے آہستہ آہستہ پروان چڑھ رہے تھے۔
عاشی معصوم تھی تو وہ اُس کی بھولی بھولی باتوں پر مسکرا دیا کرتے ——
عاشی کا شعور بیدار ہوا تو وہ اس کی ذہانت اور سوجھ بوجھ کے مداح ہوگئے ——
پھر ——
جب عاشی نے بچپنے کی حدود سے نکل کر جوانی کی سرحدوں پر قدم رکھا اور اُس کے چہرے کے نقش و نگار اُجاگر ہونے لگے تو محمود حسین اسے دیکھ کر بے یقین سے ہو جاتے ——
پہروں اُس نقش و نگار کے سہارے میں اپنے دل کی گہرائیوں میں کچھ ٹٹولتے رہتے —— اور پھر ——
جب عاشی کا روپ سنگھی لئے پہلی بار اُن کے سامنے آیا تو وہ بے اختیار چونک اُٹھے ——
اُن کے ذہن میں ایک ہی نام اُبھرا ——
فائزہ کا نام ——
عاشی ہو بہو فائزہ کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔
ایسا واضح عکس تھی جس پر شک و شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی ——
اور اس عکس نے اُبھر کر محمود حسین کے گم گشتہ ماضی کو از سرِ نو بیدار کر دیا۔
جو یادیں سینے میں دفن تھیں پھر سے تازہ ہونے لگیں ——
وہ زخم جن پر وقت نے کھرنڈ کی دبیز تہہ جما دی تھی پھر سے ہرے ہو گئے
لیکن عاشی کون تھی —— ؟
کہاں سے آئی تھی —— ؟؟
کس کی اولاد تھی —— ممدو سے اُس کا کیا رشتہ تھا —— ؟؟؟
اِن سوالوں نے محمود حسین کو بے چین کر رکھا تھا —— اپنے خیال کی تصدیق کی خاطر انھوں نے فائزہ کی تصویر کا سہارا لیا تو دل کی دھڑکنیں اور تیز ہوگئیں —— پھر انھوں نے شائستہ بیگم سے وہی زبان میں عاشی کے چہرے کے نقوش کے بارے میں دریافت کیا تو وہ بھی اس بات سے انکار نہ کر سکیں کہ عاشی فائزہ بیگم کی منہ بولی تصویر

لبن اس خیال کے ساتھ ہی شائستہ بیگم نے یہ کہہ کر محمود حسین کو بہلانے کی کوشش بھی کی کہ دو چہرے اکثر ایک سے حیرت انگیز طور پر مماثلت رکھتے ہیں —— عاشی اور فائزہ کا ہم شکل ہونا بھی محض ایک حسین اتفاق تھا —— !
شائستہ بیگم نے ہر چند کر محمود حسین کے دل کے رِستے ناسوروں پر مرہم رکھنے کی کوشش کی لیکن اُن کے لئے بھی پریشانی کا سبب بن گئی تھی —— اِس لئے نہیں کہ انھیں عاشی سے کسی بات کی شکایت بلکہ اس لئے کہ وہ بھی اپنے دل میں فائزہ کے سلسلے میں ایک اہم راز دفن کئے بیٹھی تھیں اور انھیں اکثر یہ فکر ہتی رہتی کہ اگر واقعی عاشی فائزہ کی بیٹی ثابت ہوئی اور کسی طرح یہ راز محمود حسین پر کھل گیا کہ اُن کے امریکہ نے کے بعد —— اسرار احمد کی موت سے بے سہارا ہو کر جب فائزہ محمود حسین کی کوٹھی پر سر چھپانے کی جگہ ن کرنے آئی تھی تو صوفیہ خاتون نے کس قدر نفرت اور حقارت سے اُسے دھتکار دیا تھا اور اُس پر کیسے کیسے بنیاد اور گھناؤنے الزامات تراشے تھے ——
اُسے محمود حسین کی بیوی اور اپنی بہو سمجھ کر قبول نہیں کیا تھا ——
داشتہ اور بدچلن کے خطاب سے نواز کر ملازموں کے ذریعے اپنی دہلیز سے نکلوا دیا تھا۔
اور پھر ——
ملازموں کے علاوہ شائستہ بیگم کو بھی بڑی سختی سے تاکید کی گئی تھی کہ وہ محمود حسین کی امریکہ سے واپسی پر اِن کا تذکرہ زبان تک لانے کی جرأت نہ کریں —— اور یہی وجہ تھی کہ امریکہ سے واپسی کے فوراً بعد ہی صوفیہ خاتون محمود حسین کے سر پر سہرا سجانے کی خواہش کا اظہار بڑی شد و مد سے شروع کر دیا اور آخر کار وہ شمسہ بیگم کو اپنی مرضی مطابق اپنی بہو بنا کر بیاہ لائیں۔
بیتے وقتوں کے لمحوں نے اور ماہ و سال کی دھول نے ان باتوں کو خواب بنا دیا تھا لیکن ممدو موت نے اور فائزہ کی نشانیوں نے ہر خواب کو حقیقت کا رنگ دے دیا —— اُس کی ڈائری میں اُس کی زندگی کی داستان خود اُس کے ہاتھوں سے درج تھی جس میں اس بدنصیب کے ماضی کا ایک ایک لمحہ —— ایک ایک پل محفوظ تھا۔
محمود حسین اپنے اسٹڈی روم میں بیٹھے اس وقت بھی فائزہ کی ڈائری کے مطالعے میں محو تھے، لمحوں کی نمی اور چہرے کی ویرانی اس درد کی ترجمانی کر رہی تھی جو اُن کے وجود کے گرد حصار بن گیا تھا —— فائزہ نے ایک جگہ لکھا تھا ——

"آج زندگی کے آخری سہاروں نے بھی منہ پھیر لیا —— وہ دہلیز بھی میرے لئے اجنبی اور غیر ہوگئی جس سے آپ نے میرے مستقبل کا رشتہ جوڑا تھا —— مجھے دلہن یا بہو کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا گیا..... دھتکار دیا گیا لیکن بخدا مجھے آپ سے کوئی شکایت کوئی گلہ نہیں —— انہوں سے جو جان سے زیادہ عزیز اور پیارے ہوں شکایتیں نہیں محبت کی جاتی ہے اور میں آخر دم تک آپ سے محبت کرتی رہوں گی ——
"کیسا عظیم ہے یہ انقلاب —— کیسے خوبصورت ہیں یہ لمحات جو مجھے زندگی میں نت نئے تجربے کرا رہے ہیں —— پہلے بھائی نے جیتے جی منہ پھیر لیا پھر باپ کا شفیق سایہ بھی جانے کیوں سے اچانک اُٹھ گیا —— قدرت کو شاید میری بہتری اسی میں منظور ہو۔
"لاہور سے روانگی کے وقت گھر کے ویران اور اُداس در و دیوار دیکھ کر دل بھر آیا تو میں دل کھول کر رو لی —— کچھ غبار چھٹ گیا لیکن رشتوں کی جُدائی کے غموں کا کیا کروں جو ہر وقت نشتر بن کر چبھتے رہتے ہیں ——
"لاہور سے کراچی کا سفر بے چینیوں اور دھڑکنوں کی نذر ہوگیا —— آنے

والے لمحات کا تصور پریشان کرتا رہا ـــــ جانے میرے ساتھ میرے نئے گھر میں کیا برتاؤ کیا جائے ـــــ میں آپ سے اپنے رشتے کی شناخت کیسے کراؤں گی ـــــ یہ خیال تمام رستے مجھے پریشان کرتا رہا پھر ـــــ میں دوسروں کو دوش نہیں دیتی، شاید یہ سب کاتبِ تقدیر نے پہلے سے میری قسمت میں رقم کر دیا تھا ـــــ قصوروار دوسروں کا نہیں میرا اپنا ہے۔

"مجھے آپ کی دہلیز سے رخصت ہوتے دکھ ضرور ہوا لیکن خدا گواہ ہے کہ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ـــــ مجھے آپ کی محبت پر اعتماد ہے ـــــ آپ واپس آئیں گے تو یہ وقتی پریشانیاں دُور ہو جائیں گی اور ـــــ جب آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ آپ کی محبت کی نشانی میرے وجود میں ـــــ اللہ، کیسے لکھوں، تنہائی میں بھی شرم کا احساس پانی پانی کئے دے رہا ہے ـــــ آپ خود ہی سمجھ جائیے نا۔ کتنے اچھے ہیں آپ ـــــ

"ممدو کے کچے صحن میں نیم کے درخت کے سائے تلے بیٹھ کر میں آجکل آپ کو ہر وقت یاد کرتی رہتی ہوں ـــــ ایک بات اور بتاؤں ـــــ وعدہ کیجئے، آپ کسی اور سے نہیں کہیں گے، نہ میرا مذاق اُڑائیں گے ـــــ میں ـــــ میں نے آجکل اُون سلائیوں سے کچھ ننھے منے پیارے پیارے لباس بننے شروع کر دیئے ہیں ـــــ

"باہر سے، روبابا کی آواز سنائی دے رہی ہے، شاید رحیمو آگیا ـــــ جب بھی مجھے ڈائری لکھتے دیکھتا ہے اُلٹے سیدھے سوال شروع کر دیتا ہے لیکن ہے بڑا پُرخلوص اور ہمدرد، بالکل اپنے بھائیوں کی طرح ـــــ کاش رحیمو میرا سگا بھائی ہوتا تو میں خود کو اس قدر بے سہارا کبھی نہ سمجھتی ـــــ"

محمود حسین کی آنکھوں سے فائزہ کی حسرت بھری تحریر پر پڑھ کر آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی، رومال سے آنسوؤں کو خشک کرتے ہوئے انھوں نے کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں اور ماضی کی حسین وادیوں میں کھو گئے۔

چہرے پر خزاں رسیدہ تمناؤں کی بہاریں دم توڑتی نظر آرہی تھیں ـــــ بھیگی پلکوں کی نمی اس درد کی غماز تھی جو آنسو بن کر اُن کی پلکوں سے چھلک اُٹھا تھا ـــــ اور ہونٹ رہ رہ کر یوں کپکپا اٹھتے ـــــ جیسے خود اپنی ہی بربادیوں کا نوحہ پڑھ رہے ہوں ـــــ اسٹڈی میں بڑی حسرت ناک خاموشی طاری تھی۔

یوں جیسے پتھر کے بے جان در و دیوار بھی محمود حسین کے غم میں برابر کے شریک ہوں ـــــ بڑی دیر تک وہ آنکھیں بند کئے اپنے خیالوں کے دوش پر ماضی کے دھندلکوں میں گم سے پھر ایک سرد آہ بھری اور ڈائری کا ایک اور ورق بڑی توجہ سے پڑھنے لگے ـــــ

"عاشی ـــــ جانتے ہیں یہ نام کس کا ہے، ہماری محبت کی ہنستی مسکراتی معصوم اور... خوبصورت سی نشانی کا ـــــ یاد ہے، آپنے جاتے وقت کیا کہا تھا ـــــ ایک گول مٹول سے بیلو کی فرمائش کی تھی اور اُس کا نام بھی تجویز کیا تھا ـــــ "رونی" ـــــ لیکن میں آپ کی خواہش کا احترام نہ کر سکی ـــــ

"بہرحال لڑکیاں بھی خدا کی نعمت ہوتی ہیں اور یہ آپ کی عاشی ـــــ اُف توبہ ـــــ یہ تو ہر وقت چاہتی ہے کہ بس میں اُس سے باتیں کیا کروں ـــــ آغوں، آغوں کرو تو منہ کھول کر ہاتھ پاؤں چلانے لگتی ہے اور رحیمو تو اس کو منع کرنے کے باوجود ہر وقت گود میں لئے گھما تا رہتا ہے اور نہ جانے کیا کیا الم غلم باتیں کرتا ہے۔

"ممدو بابا تو میرا خیال اپنی بیٹی کی طرح رکھتے ہیں ـــــ اور ہاں ـــــ کل

وہ آپ کی عاشی کو گود میں لئے بیٹھے تھے جب اس شریر نے اُن کے کپڑے گیلے کر دیئے ـــــ اب تو وہ ایک ایک کو پہچاننے لگی ہے ـــــ رحیمو گود میں لیتا ہے تو میری طرف دیکھ کر ہنسنے لگتی ہے ـــــ میرے منہ میں خاک ـــــ کتنی معصوم اور پیاری پیاری حرکتیں کرتی ہے ـــــ لیکن آپ ـــــ

"میرا دل گواہی دیتا ہے کہ آپ ضرور آئیں گے ـــــ مجھے آپ کی محبت پر اعتماد ہے، خدا میرے اعتماد کی لاج رکھے ـــــ مگر

"ادھر کچھ دنوں سے میری صحت برابر گرتی جا رہی ہے جانے کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ـــــ خدا کرے میرے اندیشے غلط ثابت ہوں ـــــ میری بس ایک ہی دُعا ہے کہ خدا آپ کو سلامت رکھے ـــــ میرے لئے نہ سہی لیکن عاشی کے لئے آپ کا سایہ بہت ضروری ہے ـــــ آج صبح ہی سے میری آنکھ رہ رہ کر پھڑک رہی ہے ـــــ خدا خیر کرے ـــــ"

دروازے کے باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی تو محمود حسین نے جلدی سے فائزہ کی ڈائری بند کر کے دراز میں رکھ دی، آنسو خشک کرتے ہوئے اُن کی سمت کھلنے والی کھڑکی کے قریب چلے گئے، ہوا کا ایک خنک جھونکا اُن کے چہرے سے ٹکرایا تو انھیں قدرے سکون اور فرحت کا احساس ہوا لیکن اُن کے کان بدستور اس آہٹ پر لگے ہوئے تھے جو ہر لمحہ قریب آرہی تھی پھر ناجیہ کی آواز کانوں سے ٹکرائی ـــــ

"ڈیڈ۔ مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے ـــــ"

"کہو ـــــ" محمود حسین نے ناجیہ کی طرف دیکھے بغیر کہا

"مجھے کچھ روپے درکار ہیں"

"کوئی خاص ضرورت پیش آگئی ہے ـــــ"

"حیرت ہے ـــــ" ناجیہ قدرے تلملا کر بولی "آپ کو بھی یاد نہیں رہا کہ پرسوں میری برتھ ڈے ہے"

"ناجیہ ـــــ"

"میں جانتی ہوں ڈیڈ کہ آپ کیا کہیں گے" ناجیہ نے باپ کی بات سُنے بغیر تیزی سے کہا "مجھے بھی عاشی کا خیال ہے، اسی لئے تو اپنی برتھ ڈے پارٹی ہوٹل میں ارینج (ARRANGE) کرنا چاہتی ہوں، میں نے اپنی سہیلیوں سے وعدہ بھی کر لیا ہے"

"تمہارے امتحان بھی قریب ہیں، میرا خیال ہے کہ ـــــ"

"پلیز ڈیڈ ـــــ آپ مجھے منع مت کریں، میں اپنی فرینڈس کے ساتھ تمام پروگرام طے کر چکی ہوں"

"عاشی کیا محسوس کرے گی ـــــ" محمود حسین نے پلٹ کر ناجیہ کو گھورتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اُسے اپنے غموں سے اتنی فرصت ہی کہاں ہے کہ وہ دوسروں کی خوشیوں کے بارے میں سوچ سکے" ناجیہ نے شانے اُچکاتے ہوئے قدرے خشک لہجے میں جواب دیا۔

"ہم ایک ہی گھر میں رہتے ہیں تو ہمیں ایک دوسرے کی خوشیوں اور غمی کا احساس بھی کرنا چاہئے ـــــ تم اپنی پارٹی امتحانوں کے بعد بھی کر سکتی ہو ـــــ جب تک عاشی کے غموں کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا"

"اوہ ڈیڈ ـــــ آپ بھی ـــــ"

"ناجیہ ـــــ" محمود حسین ہونٹ چباتے ہوئے ٹھوس آواز میں بولے "میں تمہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر چکا ہوں ـــــ ممدو کے چالیسویں سے پیشتر اس قسم کی کوئی تقریب نہیں ہوگی ـــــ"

ناجیہ نے باپ کے لہجے میں پہلی بار سختی اور سرزنش محسوس کی تو تلملا اٹھی ـــــ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک ادنیٰ ملازم کی موت کا اتنا سوگ منایا جائے گا کہ وہ اپنی سالگرہ بھی نہیں منا سکے گی ـــــ چند ثانئے وہ باپ کو دیکھتی رہی پھر تیزی سے پلٹی اور بل کھاتی اسٹڈی سے باہر چلی گئی ـــــ اور

محمود حسین نے ناجیہ کے جانے کے بعد اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لئے ——— !!

محمود حسین کے روکھے جواب اور دو ٹوک فیصلے نے اُس کے اچھے خاصے موڈ کا ستیاناس کر دیا ایک حقیر ملازم کا چالیسواں اُس کی خوشیوں کے آڑے آگیا تھا ——— عاشی کے سوگ نے سارے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا ——— اسٹڈی میں داخل ہونے کے بعد اُس نے باپ کو کبھی سُست سُست اور اُداس سا محسوس کیا تھا اُن کی آواز سے اُنکے درد کا اندازہ ہو رہا تھا۔

اُن کی پلکوں پر نمی دیکھ کر وہ سمجھ گئی تھی کہ باپ نے بھی مرنے والے کے غم کو اپنے اوپر مسلط کر لیا ہے ———

لیکن کیوں ——— !

آخر کس لئے ——— !!

ممدو کی ذات میں ایسی کون سی خصوصیت تھی جس نے پورے ماحول کو اُداس اور غمگین کر دیا تھا ——— اور اگر ایسی کوئی بات تھی تو اُس نے کوئی اثر کیوں نہیں لیا ——— ؟

اُس کے دل پر غموں کے بادل کیوں نہیں منڈلائے ——— ؟؟

باپ نے برتھ ڈے پارٹی کی منسوخی کا فیصلہ سُنا کر جیسے اُس کے سارے تن بدن میں ایک آگ سی لگا دی تھی، اپنے کمرے میں جا کر وہ دبیز قالین کی سینہ کوبی کرنے لگی ——— اُس نے باپ کے حکم کو بڑی خندہ پیشانی سے سُنا تھا ——— سُن کر چپ رہ گئی ——— کوئی جواب نہیں دیا ——— لیکن اس کے وجود کی ضدی ناجیہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہی تھی۔

اس کے ذہن پر ہتھوڑے برس رہے تھے ———

شریانوں میں گردش کرتے ہوئے خون کی حدت اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ خود اس کی تپش اپنے گالوں پر محسوس کر رہی تھی ———

ٹہلتے ٹہلتے وہ ایک جھٹکے سے رک جاتی ———

چھت کو گھورتے ہوئے دانتوں تلے ہونٹ کاٹنے لگتی ———

پھر ———

تلملا کر دوبارہ ٹہلنے لگتی ———

ماں باپ کی کیفیت نے اُس کے ذہن کو بے حد پراگندہ کر دیا تھا ——— وہ اپنا زیادہ تر وقت فرحت کی طرف گزارنے لگی تھی، اُسے عاشی کی ذات سے کوئی سروکار نہیں تھا البتہ اتنا خیال ضرور تھا کہ وہ شہباز کے قریب نہ ہو سکے ——— وہ زندگی کے کسی محاذ پر اپنی شکست تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی ———

رہا ممدو ——— تو اُسے ممدو کی موت پر کوئی رنج کوئی صدمہ نہیں ہوا تھا ——— وقتی طور پر نہ جانے کس جذبے کے تحت ممدو کا جنازہ اُٹھتے وقت جب دوسروں نے تڑپ کر بین شروع کیا تو اُس کی پلکوں کے گوشے بھی بھیگ گئے تھے ——— پھر وہ پُرسکون ہو گئی تھی ——— روتی بھی تو کس لئے ——— ممدو کی موت کی دُعا تو اُس نے خود مانگی تھی۔

لیکن ممدو مرنے کے باوجود اُس کی مسرتوں کے درمیان آگیا تھا ——— !!

کمرے کے بند ماحول میں اُسے گھٹن کا احساس ہوا تو موڈ اور خراب ہو گیا ——— تیزی سے پیر پٹکتی باہر آئی تو شمسہ بیگم سے مڈبھیڑ ہو گئی ——— راہداری کے کونے پر کھڑی وہ خانساماں کو کچھ ہدایت دے رہی تھیں۔ وہ دُور کھڑی ماں کو خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی ——— جب خانساماں چلا گیا تو لمبے لمبے قدم مارتی ماں کے قریب پہنچ گئی۔

"خیریت تو ہے ———" ماں نے بیٹی کے چہرے پر زلزلے کی کیفیتوں کو محسوس کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"مجھے آپ سے ایک اہم بات کرنی ہے ———"

"تمہارے تیور ہی بتا رہے ہیں کہ بات اہم نوعیت کی ہے ——— کہو"

"پہلے آپ وعدہ کریں کہ میری بات کو رد نہیں کریں گی ———"

"لیکن بات کیا ہے ——— کچھ پتہ تو چلے ———"

"پہلے وعدہ ———" وہ مچل کر بولی۔

"بُری بات ہے ناجیہ ——— تم اب جوان ہو گئی ہو ——— یوں ہر وقت جھلاتے رہنا اچھی بات نہیں" شمسہ بیگم سنبھالتے ہوئے بولیں پھر سنجیدگی سے دریافت کیا ——— "چلو، جلدی سے بتا دو، بات کیا ہے"

"ممدو کے چالیسویں میں کتنے دن باقی ہیں ———"

شمسہ بیگم نے خلاف توقع ناجیہ کی زبان سے ایک تلخ بات سُنی تو دنگ رہ گئیں، خود کو سنبھالتے ہوئے بولیں "چار روز ——— کیوں، تمہیں ممدو کے چالیسویں کا دھیان کیسے آگیا"

"ممی ———" وہ ہاتھ مسلتے ہوئے بولی "کیا یہ ممکن نہیں ہے چالیسویں کی تقریب کل کر دی جائے ———"

"لیکن ———"

"پرسوں میری برتھ ڈے ہے ———" اُس نے ماں کو کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا، بات کاٹ کر غصے سے بولی "ڈیڈی نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا ہے کہ چالیسویں سے پہلے کوئی خوشی نہیں منائی جا سکتی ———"

"ناجیہ ——— کیا تم بالکل ہی سٹھیا گئی ہو" شمسہ بیگم نے حیرت سے کہا "کیا تمہیں عاشی ———"

"پلیز ممی ———" وہ تنک کر بولی "میں عاشی کے سلسلے میں فی الحال کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتی"

"مگر ناجیہ بیٹی ———"

"میں نے ڈیڈی سے کچھ روپے مانگے تھے لیکن انھوں نے ضرورت کی نوعیت کا علم ہونے کے بعد انکار کر دیا"

"وقت اور محل کو سمجھنے کی کوشش کرو ———"

ناجیہ نے ماں کے چہرے کو بغور دیکھا، اُس کے اندر کی ضدی ناجیہ بل کھا کر رہ گئی ——— عاشی اور ممدو کی خاطر یوں اُس کی بات رد بھی ہو سکتی ہے اُس نے کبھی خوابوں میں بھی نہیں سوچا تھا ——— ایک ثانئے کو ہاتھ ملتی رہی پھر ہونٹوں پر ایک تلخ تبسم بکھیرتے ہوئے بولی۔

"ممی ——— جب کوئی شخص بہت زیادہ عزیز ہو تو مرنے کے بعد بھی اُس کی یادوں کو ہمیشہ قائم رہنا چاہئے"

"میں تمہیں یہی سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں ——— کچھ دنوں کی تو بات ہے پھر ———"

"کیوں نہ ایسا کیا جائے کہ ممدو کی قبر کو ایک شاندار مقبرے کی شکل دے دی جائے ———"

شمسہ بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا! بیٹی کے چہرے کو خاموشی سے تکتی رہیں۔

"تاج محل اور جہانگیر کا مقبرہ جیسی نہ سہی ——— کوئی چھوٹی موٹی کوٹھری ہی تعمیر کرا دی جائے لیکن ہو سنگ سفید کی ——— منقش، محرابوں والے دروازے اور در و دیوار پر رنگ برنگے کانچ کے ٹکڑوں کا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ اُن پر سورج کی کرنیں ہمیشہ جھلملاتا رہے اور گنبد پر بھی نقش و نگار اور بیل بوٹے بنے ہوں تو کیا کہنا ———"

"ناجیہ ———"

شمسہ بیگم نے بیٹی کو ٹوکنے کی کوشش کی لیکن وہ بولتی رہی۔

"کوٹھری کے اطراف اگر چھوٹا سا احاطہ ہو اور اُس میں پھلواری بھی تو ممدو کے پیشے کی وقعت بھی ہمیشہ تازہ رہے گی"

"ناجیہ ——— تم یہ کیا واہی تباہی بک رہی ہو ———"

"اور ہر مقبرے کی طرح ہمارے گھر کے ہر دلعزیز اور مرحوم مغفور جناب ممدو صاحب کے مقبرے پر بھی ایک کتبہ ہونا ضروری ہے جس پر جلی حرفوں سے کوئی ایسا خوبصورت سا شعر بھی کندہ ہونا ضروری ہے جو مرنے والے کی یاد کو ہمیشہ تازہ رکھے ———"

"تم ——— تم گستاخ ہوتی جا رہی ہو ———" شمسہ بیگم نے اولاد کو سرزنش کرنی چاہی تو ناجیہ اور بھڑک گئی، تڑپ کر بولی،

" اپنے اپنے اظہار کا الگ الگ انداز ہوتا ہے ممی ——— جہانگیر کو دیکھ لیجئے کس شان اور کروفر سے اپنے عالیشان مقبرے کے اندر ابدی نیند سو رہے ہیں لیکن نورجہاں کے مزار پر آج بھی حسرتیں ماتم کناں ہیں۔

ع برمزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے ———"

" مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہو ———"

" صرف یہ باور کرانا چاہتی ہوں کہ نورجہاں چونکہ جہانگیر کے مقابلے میں ایک ذرہ تھی اس لئے مرنے کے بعد بھی اُسے حسبِ حیثیت اعزاز سے نوازا گیا ———"

ناجیہ کے لہجے میں تلخی کوٹ کوٹ کر بھری تھی، طنز کے تیر و نشتر نمایاں تھے اور اُس کے گلابی ہونٹوں پر مچلنے والا زہریلا تبسم عائشی کے حق میں نفرتوں اور حقارتوں کا کھلم کھلا اظہار کر رہا تھا۔

شمسہ بیگم خون کا گھونٹ پی کر برداشت کر گئیں ——— جوان اور خودسر اولاد کے سنگ کر احترام کے رہے سہے بھرم کو نہیں توڑنا چاہتی تھیں۔ آہستہ سے بولیں

" میں تمہاری باتوں کا مفہوم سمجھ رہی ہوں لیکن مصلحت بھی کوئی چیز ہوتی ہے ——— دنیا دکھاوے کے لئے بھی انسان کو اکثر اپنی مرضی کے خلاف بہت کچھ کرنا پڑتا ہے ———"

" صرف اپنوں کی خاطر ———" ناجیہ نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا ——— " غیروں کے لئے اپنی خوشی کو نہیں روندا جاتا "

" غم ہر حال میں غم ہی کہلائے گا ——— خواہ اپنوں کا ہو یا پرایوں کا ———"

" کچھ قربانیاں بہت مہنگی ثابت ہوتی ہیں " ناجیہ جھلا گئی۔

" دو چار دنوں سے کیا فرق پڑ جائے گا " شمسہ بیگم نے بیٹی کی خودسری کو محسوس کرتے ہوئے دبی زبان میں کہا " ممدو کا چہلم ہو جانے دو ——— اس کے بعد میں تمہاری سالگرہ نہایت دھوم دھام سے مناؤں گی ——— وعدہ رہا "

" بات دھوم دھام کی نہیں ——— وقت کی ہے " ناجیہ بل کھا کر بولی " وقت گزر جائے تو کبھی پلٹ کر واپس نہیں آتا ——— اور وہ ——— جو وقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں زندگی کی دوڑ میں کبھی آگے نہیں نکل سکتے ——— اور میں نے کبھی پیچھے رہنا نہیں سیکھا "

" تمہارے باپ کیا سوچیں گے ———"

" یہ ڈیڈی کا ذاتی مسئلہ ہے ——— رہی میری برتھ ڈے پارٹی تو وہ اپنے وقت پر ہی ہوگی " ناجیہ نے سر بلند کر کے فیصلہ کن آواز میں کہا پھر ہونٹ کاٹتی ہوئی تیزی سے پلٹی اور راہداری سے گزر کر باہر آ گئی جہاں گاڑی پورچ میں موجود تھی۔

اور ———

ناجیہ کے جانے کے بعد شمسہ بیگم گم صم اپنی جگہ خاموش کھڑی وقت اور حالات پر غور کرتی رہیں ——— ناجیہ کی خودسری اب حد سے تجاوز کرتی جا رہی تھی ———

وقت کی رفتار ایک دم ہی بہت تیز ہو گئی تھی ———

اور حالات ———

شمسہ بیگم کی دسترس سے باہر ہوتے جا رہے تھے ——— ایک ماں کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا ——— اور ہر دھڑکن ایک ہی سوال کو بار بار دہرا رہی تھی ———

" اگر ناجیہ کے تیور اور انداز یہی ہے تو کل کیا ہوگا ——— ؟؟؟"

ممدو کی موت کا ایک مرحلہ طے ہو گیا ———

چالیسویں کے بعد آج وہ پہلی بار بند ماحول کی گھٹن سے وقتی طور پر فرار حاصل کرنے کے لئے سبزے کے لہلہاتے آنگن میں نکل آئی ——— ایک مدت بعد کھلی فضا اور تازہ ہوا کے معطر جھونکوں نے اُسے

یان خوش آمدید کہا تو اُسے زندگی کا احساس ہوا۔

دل سے گھٹن کا غبار ذرا ہلکا ہوا تو وہ خود کو تر و تازہ محسوس کرنے لگی۔

ہنی پر ادھ کھلی کلیوں کی مانند ———

وا آہستہ آہستہ اپنے وجود کے مخفی رنگوں کو عیاں کر رہی تھیں ———

سبزے پر کچھ دیر ننگے پاؤں چہل قدمی کرنے کے بعد وہ رات کی رانی کے پودے کے قریب آ کر ں پر لاتعداد بند کلیاں وقت کے ہاتھوں کھلنے کی منتظر تھیں ——— بائیں جانب رنگ برنگے گلاب کے پودے ردا ہنی جانب سرو کے پودے سر اُٹھائے خدا کی حمد و ثنا میں مصروف تھے۔

بہت دیر تک وہ یونہی سبزے پر بیٹھی اُن غنچوں اور پودوں کو دیکھتی رہی پھر ممدو کی یاد نے ا ——— گھر کا ہر فرد ——— صبر کی تلقین کرتا ——— چھوٹے بڑے سب ہی یہی کہتے کہ وہ ماضی کی یادیں ہلانے کی کوشش کرے لیکن یہ کیسے ممکن تھا ———

ممدو کی یاد تو اس کو تھی کے ایک ایک گوشے، ایک ایک چپے سے وابستہ تھی، لہلہاتے پودوں ینبش ——— اور مرجھائے ہوئے پھولوں کی ہوگی ——— وہ کن کن چیزوں کو فراموش کرتی ——— ندا کرتی ——— کیسے ماضی کو بھول جاتی ——— یادوں کے ان گہرے نقوش کو اپنے ذہن کی سطح سے ہٹا ڈالتی جو اُس کی زندگی کا ایک حصہ بن گئے تھے ———

کی موت سے تو اُس کی زندگی کا محض ایک باب ختم ہوا تھا۔

دا کے کاتبِ تقدیر کی رقم کی ہوئی کتابِ زندگی کے نہ جانے کتنے باب طے کرنے تھے۔

اوراق پلٹنے تھے ———

نو صرف ماضی کے گھنا ٹوپ اندھیرے اُس کے سر سے چنگھاڑتے گرجتے گزرے تھے ———

وحال کے نادیدہ راستوں کا سفر باقی تھا ———

——— پھر حال سے گزر کر اُسے مستقبل کی سرحدوں میں قدم رکھنا تھا ———

بل ———

ی سے منسلک تھا ———

ہ مربوط یادوں کے بندھنوں کو بھلا کیسے توڑ سکتی تھی ———

ئی تو خود منتشر ہو جاتی ——— بکھر جاتی ———

لئے کہ ماضی کے نہ جانے کتنے اوراق اُس کی کتابِ زندگی سے گم ہو گئے تھے ———

ن گم گشتہ اوراق کے بغیر اُس کا ماضی بھی نامکمل تھا ———

ہ ڈھلمل یقین لگا تھا ———

تقبل ———

ل کے اندیشے ہی تو تھے جنھوں نے ممدو کے مرتے ہی اُسے اپنے حصار میں لے کر بے بس کر دیا تھا ———

ل کا ساری تازگی نچوڑ لی ———

ا کا تبسم چھین لیا ———

ہار کر دیا ———

الدِ یچارگی کی تلخیوں کی شدتوں نے اُس کے وجود کو اندر ہی اندر گھن کی طرح چاٹنا شروع کر دیا تھا۔

کر دیا تھا ———

ے حالات کی بدلتی روش کو محسوس کر رہی تھی ——— لیکن مہر بلب تھی ———

ل کے بوجھ تلے دبی تھی اس لئے کھل کر کوئی شکوہ ——— کوئی شکایت زبان پر نہیں لا سکتی تھی۔

ے بے رحم ہاتھوں نے اُس کے شعور کو اور بیدار کر دیا تھا ———

پہلے سے کہیں زیادہ حساس کر دیا تھا۔

ممدو کی بیماری کے ایام سے لے کر آج تک وہ ناجیہ کے بدلے ہوئے تیور اور آنکھوں کے ایک زاویوں کو محسوس کر رہی تھی ـــــ وہ ناجیہ کے ساتھ پلی بڑھی تھی اُس کی ایک ایک رگ سے واقف تھی وہ جانتی تھی کہ ناجیہ خود سر ہے ـــــ ضدی ہے ـــــ بیباک اور بے لگام ہے اسی لئے تو ممدو کی موت کے سے اُس نے خود کو گھر کی چہار دیواری کے اندر قید کر لیا تھا ـــــ باہر نکلتی تو شہباز سے آمنا سامنا ضرور ہوتا۔

شہباز ـــــ جو اُس کا ہم درد تھا

غمخوار تھا ـــــ پرستار تھا ـــــ

جس نے ممدو کی بیماری کے دوران قدم قدم پر عاشی کے دل کی ڈوبتی دھڑکنوں کو سہلا دیا تھا ـــــ

کس قدر پُرخلوص جذبوں کا اظہار کیا تھا ـــــ

کیسے بے لوث طریقے سے ملتا تھا ـــــ

اور عاشی سے شہباز کا یہی ملاپ ناجیہ کی کشادہ پیشانی پر شکن بن کر جم گیا تھا۔ وہ عاشی کے حق بن گئی تھی ـــــ غضب بن گئی تھی لیکن حالات کے پیش نظر وہ کسی آتش فشاں کی مانند اندر ہی اندر رہی تھی اور اس جوالا مکھی کی تپش عاشی کے وجود پر ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی ـــــ اکثر وہ سوچتی ـــــ یہ آتش فشاں بے قابو ہو کر اچانک پھٹ پڑا اُس دن کیا ہوگا ـــــ ؟

عاشی کو اس بات کا علم بھی تھا کہ ناجیہ نے ناں باپ کے منع کرنے کے باوجود اپنی سالگرہ کا جشن ہوٹل میں منایا تھا ـــــ شمسہ بیگم بیٹی کی خودسری پر جھلس کر رہ گئی تھیں اور محمود حسین بھی خون کا گھونٹ خاموش ہو گئے ـــــ عاشی کو یقین تھا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے اُس کی اپنی وجہ سے ہو رہا ہے، اسی لئے وہ ممدو کے بعد سے کئی بار بڑی سنجیدگی سے سوچ چکی تھی کہ وہ اپنی رہائش کا کہیں علیحدہ انتظام کر لے ـــــ وہ ناجیہ اُس کے والدین کے درمیان ایک مسئلہ بن کر حائل ہونا نہیں چاہتی تھی ـــــ بہت دُور چلی جانا چاہتی تھی ـــــ

اتنی دُور ـــــ جہاں کوئی اُس کی شناخت نہ کر سکے ـــــ جہاں احساس کی حدیں ختم ہو جہاں اس تک ماضی کی کسی یاد کی رسائی ممکن نہ ہو ـــــ ہر چیز منجمد ہو کر رہ جائے ـــــ کوئی تصور، کوئی خلش باقی رہے ـــــ اور وہ ان ہی خیالوں میں گم تھی کہ محمود حسین کی آواز سُن کر یوں چونک اٹھی جیسے وقت کا جمود یکلخت ٹوٹ گیا ہو اور ہر چیز دوبارہ متحرک ہو گئی ہو ـــــ شاید اس لئے کہ حرکت ہی کا دوسرا نام زندگی ہے۔

جلدی سے دوپٹے کا پلو سر پر ڈالتی وہ نہایت ادب سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"ناجیہ کہاں ہے ـــــ نظر نہیں آ رہی ـــــ"

"جی ـــــ وہ ابھی کچھ دیر ہوئی فرحت کی طرف گئی ہے ـــــ"

"تم بھی چلی جاتیں ـــــ ذرا طبیعت بہل جاتی" محمود حسین بڑے پیار سے بولے ـــــ

"جی ـــــ" وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی، دراز پلکیں آنکھوں پر چلمن کر کے چپ رہ گئی

"ناجیہ بتا رہی تھی کہ تمہارے امتحانات بہت جلد شروع ہونے والے ہیں"

"جی ہاں ـــــ"

"تم اپنا رول نمبر لے آئیں ـــــ" محمود حسین نے کہا "ناجیہ تو کل ہی ضروری کاغذات لے آئی تھی"

عاشی نے کوئی جواب نہیں دیا ـــــ گم صم کھڑی دل کی دھڑکنوں کا شمار کرتی رہی۔

"عاشی بیٹی ـــــ مجھے قوی اُمید ہے کہ تم امتحان میں اس بار بھی فرسٹ ڈویژن لاؤ گی"

عاشی نے پلکیں اُٹھا کر محمود حسین کو دیکھا، اس کا دل چاہا کہ پوچھ لے کہ وہ کس امتحان کی تیاریوں کی گفتگو کر رہے ہیں ـــــ قدرت اور حالات نے اُسے جس امتحان سے دوچار کر دیا تھا اس سے بڑھ کر بھی کوئی امتحان ہو سکتا تھا ـــــ لیکن اُس نے خود پر قابو پا لیا ـــــ ایک ذرا مسکرا کر بولی۔

"میرا خیال ہے کہ اس بار میں امتحان میں حصہ نہ لوں، باباکی وجہ سے کتابیں کھول کر دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا"

"میں تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں عاشی لیکن میری خوشی ہے کہ تم امتحان میں ضرور شریک ہو ـــــ ناکامی اور کامیابی تو اوپر والے کے ہاتھ میں ہے ـــــ"

"جیسا آپ کا حکم ـــــ" وہ دل پر جبر کر کے بولی

"کل ہی کالج جا کر اپنے کاغذات وغیرہ لے آنا ـــــ"

"جی اچھا ـــــ"

محمود حسین بڑی دیر تک سبزے پر کھڑے اس سے باتیں کرتے رہے اور وہ جواب میں "ہوں"..... "ہاں"..... کرتی رہی پھر جانے کہاں سے اُس میں اتنی قوت آ گئی کہ اُس نے دبی زبان میں آہستہ سے کہا۔

"انکل ـــــ میں آپ کی خوشی کے لئے ہمہ وقت تیار ہوں لیکن ـــــ ایک چھوٹی سی درخواست میری بھی ہے"

"وہ کیا ـــــ" محمود حسین نے عاشی کے چہرے کے تاثرات کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اگر ـــــ اگر آپ اور آنٹی خوشی سے اجازت دے دیں تو میں ـــــ تو میں ـــــ" وہ جملہ ادا نہ کر سکی، تمام قوتیں ایک دم جواب دے گئیں، آنکھوں کے نیچے تاریکی سی پھیلنے لگی ـــــ شاید اس لئے کہ بات میں بھرطلبانی آ رہی تھی۔

"چپ کیوں ہو گئیں عاشی ـــــ تم کچھ کہنا چاہتی تھیں ـــــ" "انکل ـــــ"

"ہاں ـــــ ہاں ـــــ کہو بیٹی" "میں چاہتی ہوں کہ کالج کے ہوسٹل میں ایک کمرہ ـــــ"

"عاشی ـــــ" محمود حسین تڑپ اُٹھے، یوں جیسے اُن کے وجود کے اندر کوئی قیمتی شے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی ہو اور اُس کی کرچیاں اُن کے رگ و پے میں خاصی گہرائی تک پیوست ہو گئی ہوں۔

"میں نے ـــــ یہ فیصلہ ـــــ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے" عاشی نے اپنے ڈولتے ڈگمگاتے وجود کو اپنے قدموں پر سنبھالتے ہوئے بڑی مشکل سے کہا ـــــ "آپ لوگوں کے احسانات ـــــ"

"عاشی ـــــ" محمود حسین ضبط نہ کر سکے تو چیخ اُٹھے، تڑپ کر بولے "قدرت کو یہی منظور تھا کہ ممدو ہم سے جُدا ہو جائے ـــــ لیکن عاشی بیٹی ـــــ تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ ممدو کے ساتھ ہم لوگ بھی مر چکے ہیں ـــــ"

"انکل ـــــ"

اُس نے محمود حسین کے جملے کی گہرائی محسوس کی تو سنبھل نہ سکی ـــــ ڈوب گئی ـــــ بے اختیار محمود حسین کے کشادہ سینے پر سر رکھ کر سسکنے لگی۔

"آئندہ ایسی کوئی بات کبھی زبان پر نہ لانا ـــــ" محمود حسین نے عاشی کی خاطر اپنے غم کی شدتوں کو چھپاتے ہوئے بڑے لاڈ سے کہا اور عاشی کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

عاشی نے اثبات میں سر کو ایک ذرا جنبش دے کر اقرار کیا پھر وہ یکلخت چونک اٹھی۔ ہڑبڑا کر محمود حسین کی کشادگی اور ٹھنڈک سے دُور ہو گئی۔

ہارن کی تیز آواز سُن کر محمود حسین بھی چونک اُٹھے ـــــ پلٹ کر دیکھا تو ناجیہ روش پر پھاٹک سے اندر اپنی کار میں بیٹھی آئس کریم کھا رہی تھی ـــــ اُس نے اپنا ہاتھ بدستور ہارن پر جما رکھا تھا۔

باپ بیٹی کی نگاہیں چار ہوئیں تو ناجیہ نے ایک نظر عاشی پر ڈالی ـــــ ہارن سے ہاتھ اُٹھا لیا، کار سے نکلی اور بل کھاتی ہوئی تیز تیز قدم اٹھاتی کوٹھی کے اندر چلی گئی۔

عاشی جانے کیوں سہم کر رہ گئی اور محمود حسین ـــــ اُن کی نگاہیں بدستور اپنی عالی شان کوٹھی کے صدر دروازے پر مرکوز تھیں جس سے گزر کر ناجیہ اندر داخل ہوئی تھی ـــــ !!

محمود حسین کے بے حد پیار نے اُسے زندگی کے ہنگاموں میں لوٹ آنے پر مجبور کر دیا۔

آج اُس کے امتحان کا پہلا دن تھا، ناجیہ کا اور اُس کا امتحانی مرکز علیحدہ علیحدہ پڑا تھا پھر بھی وہ حسب معمول جلدی تیار ہو کر پورٹیکو میں آ گئی، اُس کا سنٹر راستے میں پڑتا تھا اِس لئے خیال تھا کہ ناجیہ اُسے ڈراپ کر دے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

کچھ دیر بعد ناجیہ کوٹھی سے نمودار ہوئی تو اُس کا موڈ خاصا خوشگوار تھا لیکن عاشی کو اپنی گاڑی کے قریب کھڑا دیکھ کر اُس کی پیشانی پر آڑی ترچھی سلوٹیں اُبھر آئیں ــــ منہ بنائے تیزی سے قریب آئی، روکھے لہجے میں بولی

"تم ابھی تک یہیں موجود ہو ــــ گئیں نہیں ــــ"

"میرا خیال تھا ناجیہ کہ تم ــــ"

"سوری ــــ" ناجیہ نے اُس کی بات درمیان سے کاٹ دی "مجھے رفعت اور ساجدہ کو بھی پک اپ کرنا ہے ــــ"

عاشی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک ذرا مسکرا کر خاموش ہو گئی، جب سے ممدو نے دنیا سے منہ موڑا تھا وہ ناجیہ کے بدلے ہوئے ..... برتاؤ پر غور کر رہی تھی۔ کوٹھی کے سارے مکین ممدو کے بعد اُس کے اپنے ہو گئے تھے ــــ لیکن ناجیہ جیسے ایک دم ہی سے غیر ہو گئی ــــ جانے کیا بات تھی۔

اور ــــــــ

جب سے وہ ہمسی چھوڑ کر کوٹھی کے ایک گوشے میں منتقل ہوئی تھی ناجیہ کی خفگی اُس سے اور بڑھ گئی تھی ــــ متعدد بار اُس نے اس ضمن میں غور کیا مگر کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکی ــــ اس وقت بھی اُسے ناجیہ کے لب و لہجے پر تعجب ہوا تھا ــــ اُسے توقع نہیں تھی کہ ناجیہ اُسے یوں مکا سا جواب دے کر گاڑی میں بیٹھے گی اور فراٹے سے نکل جائے گی۔

چند لمحے وہ گم صم سی کھڑی رہی پھر دستی گھڑی پر نظر ڈال تو چونک اٹھی ــــ امتحان شروع ہونے میں صرف آدھا گھنٹہ باقی رہ گیا تھا اور ابھی اُسے بس اسٹاپ تک جا کر بس پکڑنی تھی ــــ اُس نے تیزی سے ایک دو ہی قدم آگے بڑھائے تھے کہ محمود حسین کی آواز نے اُس کے بڑھتے قدم روک لئے۔

سلیپنگ سوٹ پر ڈریسنگ گاؤن پہنے وہ اُسی کی طرف آ رہے تھے۔

"تسلیم انکل ــــ" اُس نے بڑے ادب سے ذرا جھک کر سلام کیا۔

"جیتی رہو ــــ خوش رہو" محمود حسین نے اُسے دعائیں دیتے ہوئے پوچھا "اس وقت یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو ــــ"

"آج سے ہمارے امتحانات شروع ہو رہے ہیں اس لئے ــــ"

"ارے ہاں یاد آیا ــــ" محمود حسین نے چونکتے ہوئے اطراف میں نظر ڈالی پھر تیزی سے قدم اُٹھاتے ہوئے اُس کی طرف گئے اور اپنی گاڑی نکال لائے ــــ "چلو بیٹھو جلدی سے ــــ"

وہ چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گئی تو محمود حسین نے کہا

"میں تو بھول ہی گیا تھا کہ ناجیہ کا اور تمہارا امتحانی مرکز الگ الگ ہے ــــ خیر کوئی بات نہیں، کل سے ہو تم کو چھوڑا کرے گا ــــ"

"میرا سنٹر اتنا دُور نہیں ہے ــــ" وہ آہستہ سے بولی "دس منٹ کا تو راستہ ہے ــــ میں بس سے چلی جاؤں"

"جب گھر میں گاڑی موجود ہے تو بس سے جانے کی کیا ضرورت ہے"

"جیسا آپ کا حکم ــــ" اُس نے محمود حسین کی خوشنودی کی خاطر ہونٹوں پر تبسم بکھیرتے ہوئے جواب دیا۔

"امتحانات کی تیاری تو مکمل ہو گئی ہے نا ــــ"

"جی ہاں ــــ"

"مجھے یقین ہے کہ میری بیٹی فرسٹ پوزیشن لائے گی"

"خدا کرے ایسا ہی ہو ــــ" وہ جلدی سے بولی "ناجیہ نے اس بار تیاری بھی خوب کی ہے"

"عاشی ــــ" محمود حسین تڑپ اُٹھے "تم بھی تو میری بیٹی ہو ــــ"

"یہ آپ لوگوں کی محبت ہے انکل ورنہ ....."

"میں نے اس وقت تمہاری کامیابی کی دعا مانگی تھی ــــ" محمود حسین نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔

اُس نے چونک کر محمود حسین کے چہرے کو بہت غور سے دیکھا، وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھے، تاثرات اُن کی اُلجھن کی چغلی کھا رہے تھے، وہ مضطرب ہو گئی۔ اپنے محسن کو پریشان دیکھ کر چپ کیسے رہتی

"کیا بات ہے انکل" اُس نے نرم لہجے میں دریافت کیا "آپ کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں ــــ"

"ہوں ــــ تمہارا اندازہ غلط نہیں ہے" وہ سنجیدگی سے بولے، نظریں بدستور سامنے سڑک پر جمی تھیں۔

"کوئی خاص بات ــــ"

"عاشی بیٹی ــــ" محمود حسین ایک ذرا توقف سے بولے "میں ناجیہ کے برتاؤ پر شرمندہ ہوں"

"میں سمجھی نہیں ــــ"

"میں نے تمہاری اور اُس کی گفتگو سُن لی تھی" محمود حسین نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا "ہماری تربیت میں کچھ سقم اور ہماری غفلت نے اُسے گستاخ بنا دیا ہے لیکن میں تم سے ــــ"

"انکل ــــ" وہ جلدی سے بول پڑی "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ــــ مجھے ..... مجھے تو ناجیہ سے شکایت نہیں ــــ اور ــــ وہ ــــ اُسے راستے سے رفعت اور ساجدہ کو بھی پک کرنا تھا اس لئے"

"بہت عظیم ہو عاشی ــــ بہت بلند" محمود حسین ایک لمبا سانس لے کر بولے

"اور یہ بلندیاں بھی آپ لوگوں ہی کی عنایت کی ہوئی ہیں" اُس نے آہستہ سے جواب دیا

"مجھے ایک وعدہ کرو عاشی ــــ تم کبھی ناجیہ کی کسی بات پر اپنا دل چھوٹا نہ کرنا" محمود حسین نے کچھ لمحوں کے بعد قدرے رک رک کر کہا "اس گھر پہ تمہارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا ناجیہ کا ہے بلکہ ــــ کچھ زیادہ بنتا ہے"

"آپ مطمئن رہیں انکل ــــ" اُس نے نہایت سنجیدگی سے کہا "ناجیہ کے سلسلے میں آپ کو یا آنٹی کو کوئی شکایت نہیں ہو گی"

امتحان کا مرکز آ گیا تو محمود حسین نے گاڑی روک لی۔ وہ نیچے اُترنے لگی تو بولے۔

"مجھے مایوس نہ کرنا بیٹی ــــ پوری توجہ اور لگن سے پرچہ دینا"

"دعائیں شاملِ حال ہیں تو میں ضرور کامیاب ہوں گی" وہ مسکرا دی۔

"میں ڈرائیور کو تاکید کر دوں گا کہ تمہیں لینے آجائے ——"

"تکلف کی ضرورت نہیں انکل —— میں واپسی میں عاصمہ یا نادرہ کے ساتھ آجاؤں گی" اُس نے بڑے بھولپن سے کہا پھر اُتر کر امتحانی مرکز کے احاطے میں داخل ہو گئی

تیز تیز قدم اُٹھاتی وہ نوٹس بورڈ کے قریب گئی اپنا روم نمبر دیکھا پھر کمروں پر جلی قلم سے پڑے نمبروں کو دیکھتی راہداری میں آگے بڑھنے لگی —— اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھی تو نہ جانے کیوں دل کی دھڑکنیں ہی آپ تیز ہو گئیں۔

ممدو کی موت کے بعد سے تو اُس نے کتاب اُلٹ کر بھی نہیں دیکھی تھی —— یہ خیال رہ رہ کر پریشان کر رہا تھا کہ نہ جانے پرچہ کیسا ہو —— وہ ممدو کی روح کو شرمندہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی، ——

ممدو ——

جس نے ہمیشہ اُس کی کامیابی کے لئے خدا کے حضور گڑگڑا کر ہاتھ بلند کئے تھے۔

ہمیشہ اُس کی سرخروئی اور سربلندی کی دعا مانگی تھی ——

آج ممدو دنیا میں نہیں تھا ——

لیکن اُس کی یادیں —— اُس کی باتیں پوری شدومد سے زندہ تھیں ——

اور ——

عاشی نے طے کر لیا تھا کہ وہ ہر قیمت پر ممدو کے ادھورے خوابوں کی تکمیل کرے گی ——

خود کو مٹا دے گی ——

لیکن ممدو کی روح کو بے چین اور مضطرب نہیں ہونے دے گی ——

امتحان ہال میں اُس کی شناسا لڑکیاں بھی موجود تھیں —— جب تک پرچہ تقسیم نہیں ہوا کمرہ کھسر پھسر ہوتی رہی لیکن پرچہ تقسیم ہوتے ہی مکمل خاموشی طاری ہو گئی۔

عاشی نے خدا کا نام لے کر پرچے پر نظر ڈالی پھر ممدو کی یاد کو دل میں تازہ کر کے پوری توجہ انہماک سے سوالوں کے جواب قلمبند کرنے لگی۔

پہلا سوال ——!

دوسرا سوال ——!!

تیسرا سوال ——!!!

وہ اس درجہ ڈوب گئی تھی کہ وقت اور ماحول کا احساس بھی جاتا رہا —— اُس کی نظریں کاپی پر مرکوز تھیں اور قلم پوری روانی سے چل رہا تھا۔ پھر جب وہ تمام پرچہ حل کر چکی تو اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ سستی گھڑی پر نظر ڈالی تو وقت ختم ہونے میں چالیس منٹ باقی تھے —— ایک لمحے کو اُس نے یونہی نظر گھما کر میں موجود اپنی ساتھی لڑکیوں کو دیکھا، سب ہی کے چہرے اُترے اُترے سے نظر آرہے تھے ——

شاید پرچہ خلافِ توقع کچھ زیادہ سخت تھا۔

اُس نے جلدی سے نظریں جھکا کر اپنے جوابات پر نظرِ ثانی شروع کر دی —— پوری توجہ سے ایک لفظ پڑھتی رہی پھر اُس وقت چونکی جب گھنٹی کی آواز کے ساتھ ہی انوجیلیٹر (INVEGILATOR) کمرے میں گونجی۔

"دس منٹ اور باقی رہ گئے ہیں ——"

عاشی نے نظریں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا —— ادھیڑ عمر کی خوبصورت سی عورت تھی آنکھوں اور چہرے سے اس کی کرختگی کا اظہار بھی ہو رہا تھا —— جب سے پرچہ تقسیم ہوا تھا وہ اور اُس کی ساتھی برابر نشستوں کے درمیان گردش کرتی پھر رہی تھیں —— ذرا کسی لڑکی کی توجہ اِدھر اُدھر ہوتی تو وہ سخت سے آواز لگاتی

"بُری بات ہے بی بی —— اپنی کاپی پر نظر رکھو ——"

عاشی اُسے دیکھ رہی تھی کہ وہ ٹہلتی ہوئی اُس کے قریب آگئی

"کیا بات ہے بی بی ——" اُس نے عاشی کے قریب رک کر پوچھا۔

"جی —— کچھ نہیں"

"تم نے شاید اپنا پرچہ حل کر لیا ہے ——"

"جی —— جی ہاں"

"حیرت ——" اُس نے عاشی کے چہرے پر نظر آنے والے سکون کو دیکھ کر آہستہ سے کہا پھر واپس چل گئی۔

وقت ختم ہو گیا تو لڑکیوں سے کاپیاں لے لی گئیں پھر جب لڑکیاں امتحان ہال سے باہر آئیں تو پرچے کے بارے میں اظہارِ خیال اور تبصرے شروع ہو گئے۔

"خدا ہی سمجھے گا اس ظالم کو جس نے پرچہ بنایا ہے ——"

"چھانٹ چھانٹ سارے مشکل سوالات پوچھ لئے ——"

"لکھتے لکھتے میری تو انگلیاں درد کرنے لگیں ——"

"میرا آدھا سوال باقی رہ گیا ——"

"دعا کرو کہ ممتحن نرم دل ہو ——" ایک لڑکی نے کہا "اگر وہ بھی کرخت ثابت ہوا تو پھر اپنا تو خدا ہی حافظ ہے"

عاشی سب کی باتیں سنتی پھاٹک کے قریب آئی تو نادرہ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

"سناؤ عاشی —— تمہارا پرچہ کیسا ہوا ——"

"خدا کا شکر ہے کہ ٹھیک ہو گیا ——" عاشی نے سنجیدگی سے جواب دیا پھر بولی "تمہارا کیا حال ہے ——"

"سوال تو سارے کرنے ہیں لیکن پرچہ کچھ زیادہ اچھا نہیں ہوا"

"خاصہ مشکل پرچہ تھا"

"عاصمہ تو نظر نہیں آئی ——" نادرہ نے پوچھا ہی تھا کہ عاصمہ آگئی، نادرہ نے اُس سے بھی پرچے کے بارے میں پوچھنا چاہا لیکن عاصمہ نے اس کا عندیہ بھانپتے ہی تیزی سے کہا۔

"جو سب کا حال سو اپنا —— اب تو کل کے پرچے کے بارے میں سوچو —— آج تو جو ہونا تھا ہو گیا"

"میرا تو خیال ہے کہ آج کا پرچہ کسی دل جلے نے بنایا تھا" نادرہ نے روکھے لہجے میں کہا۔

"کوئی دل جلی بھی ہو سکتی ہے ——" عاصمہ مسکرا کر بولی "ہو سکتا ہے اپنے کسی عشق کی ناکامی کا بدلہ اُس غریب مسکینوں سے لینے کی کوشش کی ہو ——"

عاشی عاصمہ کی تنقید سُن کر زیرِ لب مسکرا دی —— تینوں آپس میں باتیں کرتی باہر آگئیں، نادرہ کے بھائی گاڑی لئے موجود تھے اس لئے وہ عاصمہ کو لے کر چلی گئی۔ عاشی نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی لیکن ابھی تک کوئی گاڑی اُسے لینے نہیں آئی تھی، کچھ دیر تک وہ پھاٹک کے باہر دوسری لڑکیوں کے ساتھ کھڑی گاڑی کا انتظار کرتی رہی پھر اُسے خیال آگیا کہ اُس نے چلتے وقت محمود جیسن سے کہا تھا کہ وہ عاصمہ اور نادرہ کے ساتھ نہ جائے —— ہو سکتا ہے اسی لئے گاڑی نہ بھیجی گئی ہو، اُس نے سوچا پھر بس اسٹینڈ کی سمت قدم اٹھانے لگی۔

سیدھی سڑک عبور کر کے وہ بائیں جانب گھومی تھی کہ ایک برق رفتار گاڑی اتنی تیزی سے اُس کے قریب سے گزری کہ وہ خوف سے اچھل پڑی —— نظر گھما کر دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا۔

شہباز اُس کی نظروں کے سامنے گاڑی میں بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ عاشی اُسے دیکھ کر کچھ اور گڑبڑا گئی، شہباز اُس کے کسی ردِ عمل کا اظہار کرتی شہباز نے اگلی نشست کا دروازہ کھولتے ہوئے بڑی اپنائیت سے کہا۔

"تشریف لائیے —— غلام حاضر ہے"

ایک لمحے کو وہ پریشان ہو گئی، کنکھیوں سے آس پاس دیکھا پھر دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتی جلدی

سے آگے بڑھ کر نہ صرف گاڑی میں بیٹھ گئی بلکہ دروازہ بند کرنے میں بھی اُس نے خاصی عجلت کا ثبوت دیا تھا۔

"شکریہ ——"

شہباز نے آہستہ سے سرگوشی کی پھر گاڑی آگے بڑھا دی، کچھ دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے پھر شہباز نے پوچھا۔

"پرچہ کیسا ہوا آپ کا ——"

"شہباز ——" عاشی نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا "آپ کو اس طرح نہیں آنا چاہیئے تھا۔"

"بہتر ہے —— اگر آپ کو میرا آج کا انداز پسند نہیں آیا تو کل سے کسی نئے انداز میں حاضر خدمت ہوں گا۔"

"آپ کی گاڑی کو سب ہی پہچانتے ہیں ——"

"آئی، سی ——" شہباز نے شوخی سے جواب دیا "اگر آپ کو گاڑی پر اعتراض ہے تو کل سے ٹانگہ ہی سہی ——"

"پلیز شہباز —— آپ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔"

"میں نے آپ سے پرچے کے بارے میں دریافت کیا تھا" شہباز اُس کی بات کو نظر انداز کرتا ہوا بولا "کیسا ہوا ——"

"خدا کا شکر ہے —— خاصا اچھا ہو گیا —— لیکن ——"

"اب اخلاقی طور پر آپ کو مجھ سے دریافت کرنا چاہیئے کہ میں کیا تیر مار کر آیا ہوں۔" شہباز نے پھر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا تو وہ جھلا سی گئی —— کچھ سوچ کر آہستہ سے بولی

"مجھے یقین ہے کہ آپ کا پرچہ بہت اچھا ہوا ہوگا ——"

"اس یقین کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔"

"آپ کی زندہ دلی چغلی کھا رہی ہے ——"

"میری زندہ دلی اور خوشی کی وجہ کچھ اور بھی ہو سکتی ہے ——"

شہباز نے پلٹ کر اُس سے نگاہیں چار کیں تو وہ گڑبڑا گئی —— بدلتے حالات اور اس کی رفتار نے اُسے محتاط رہنے کا درس دیا تھا لیکن شہباز —— وہ تمام مصلحتوں کو نظر انداز کر کے اُسے چلا آیا تھا اور کیسی شوخ اور شریر نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

عاشی اُس کی بات کا مفہوم بھانپ کر شرما گئی، اپنی توجہ دوسری جانب مبذول کرتی نے تیزی سے کہا

"اچھا کیا جو آپ نے رُخ بدل لیا ورنہ ——"

"ورنہ کیا ——" عاشی نے نامکمل جملے کی وضاحت چاہی

"ورنہ شاید آپ کی نظریں بھی آپ کی کیفیت کی چغلی کھانے لگتیں ——"

اُس نے تیزی سے گھوم کر شہباز کو دیکھا پھر مسکرا کر رہ گئی

"میں کل بھی آپ کو لینے آؤں گا عاشی —— انتظار کیجئے گا۔"

"ان باتوں سے سوائے رسوائی کے اور کیا ملے گا" وہ ملول ہو گئی

"آپ کو شاید ابھی تک میرے خلوص پر اعتماد نہیں ہے۔"

"بات آپ کے خلوص اور میرے اعتماد کی نہیں ہے ——"

"پھر ——"

"مجھے وقت کی رفتار سے خوف محسوس ہوتا ہے ——" عاشی دل گرفتہ آواز میں بولی

"وقت کی رفتار نہیں —— ناجیہ ہے" شہباز نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ایک ہی بات ہے ——" وہ مدھم سُروں میں کوئی غمگین نغمہ الاپتے ہوئے بولی

"آپ کا خوف ناجیہ کو اور زیادہ بے رحم اور ظالم بنا دے گا ——" شہباز نے تلملا کر جواب دیا

"پھر —— میں کیا کروں" وہ مجسم درد بن گئی ——

"وقت کا انتظار کیجئے عاشی —— میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آنے والا کل آپ کے ہونٹوں پر صرف خوشیوں اور مسرتوں کے دیپ روشن کرے گا ——" شہباز بڑے اعتماد سے بولا "یہ میرا وعدہ ہے ——"

"وقت انسان سے زیادہ بے درد اور سنگدل ہوتا ہے" وہ دل مسوس کر بولی —— "کل کیا ہو یقین سے کون کہہ سکتا ہے۔"

"خود اعتمادی بڑی چیز ہوتی ہے ——"

"سراب کا طلسم بھی بڑا دلفریب ہوتا ہے لیکن اس سے تشنگی دُور نہیں ہوتی —— بے بسی کا احساس اور شدید ہو جاتا ہے ——"

"میں سمجھ رہا ہوں عاشی —— محرومیوں کی جدائی نے آپ کو بہت کمزور کر دیا ہے۔"

"سُتون میں دراڑیں آ جائیں تو عمارت محذوش ہو جاتی ہے" وہ ایک تلخ مسکراہٹ کپکپاتے لبوں پر سجا کر بولی "اور —— وہ جو مخدوش عمارتوں میں بسیرا کرتے ہیں دانشمند نہیں کہلاتے ——"

"عاشی ——"

"آپ آگے نکل آئے شہباز —— میری منزل پیچھے رہ گئی"

عاشی نے ٹوکا تو شہباز کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا لیکن اس کے ساتھ ہی عاشی کے جملے کی چبھن بھی اُس نے اپنے دل کے نہاں خانوں میں محسوس کی —— خاموشی سے اُس نے گاڑی واپس موڑی —— عاشی کو محمود حسین کی کوٹھی پر چھوڑا پھر باہر ہی سے دل پر ایک بوجھ لئے واپس چلا گیا۔

"کیا بات ہے ناجیہ —— اتنی تیز کہاں بھاگی جا رہی ہو ——"

ناجیہ نے پلٹ کر دیکھا —— ساجدہ لمبے لمبے قدم اٹھاتی چلی آ رہی تھی۔ مجبوراً اُسے رکنا پڑا —— خود کو نارمل ظاہر کرنے کی خاطر اُس نے ہونٹوں پر ایک ہلکا سا تبسم سجا لیا۔

"تم اب آ رہی ہو، میں تو سمجھی تھی کہ جا چکی ہوگی" ناجیہ نے ساجدہ کے قریب آنے پر کہا

"کیا مطلب ——" ساجدہ چونکی "کیا تم آج کے پرچے سے مطمئن ہو"

"ہاں —— کیوں"

"حیرت ہے —— ورنہ میرے کمرے میں تو تمام کی تمام لڑکیاں بغلیں جھانک رہی تھیں ——" ساجدہ بولی "خود میرا بھی یہی حال ہے، بڑی مشکلوں سے پورے سوال کئے ہیں۔"

"بیشتر لڑکیاں یہی شکایت کر رہی ہیں کہ پرچہ غیر متوقع آیا ہے۔"

"گویا تم نے کوئی دشواری نہیں محسوس کی"

"بالکل نہیں ——" ناجیہ نے شوخی سے جواب دیا "دشواری کس بات کی۔ ایک کتاب پوری حال پڑھائی گئی۔ سوالات بھی اسی کتاب سے آئے پھر دشواری کیسی —— ہاں، یہ کہا جا سکتا ہے کہ پرچہ بنانے والے نے اپنی قابلیت جھاڑنے کی خاطر ناک کو سیدھی طرح پکڑنے کی بجائے الٹی طرح پکڑنے کی کوشش کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ لڑکیاں بوکھلا گئیں ——"

"تم پہلی لڑکی ہو جو ایسا کہہ رہی ہو ورنہ ——"

"رفعت کہاں ہے ——" ناجیہ نے موضوع بدلنے کی خاطر پوچھا "نظر نہیں آ رہی ——"

"وہ دس منٹ پہلے ہی چلی گئی تھی ——"

"چلی گئی ——" ناجیہ نے چونک کر پوچھا "کیا اس نے تمام سوال حل کر لئے تھے ——"

"خدا ہی بہتر جانتا ہے ——"

دونوں باتیں کرتی باہر آ گئیں، ناجیہ نے گاڑی میں بیٹھ کر ساجدہ کے لئے دوسرا دروازہ کھولا

تو ساجدہ مسکراتے ہوئے بولی

"تم جاؤ ——— میں کچھ دیر سے آؤں گی ———"

"کیوں ——— کوئی خاص بات ہے؟"

"ہاں ———" اُس نے آگے بڑھ کر قدرے شرماتے ہوئے کہا "وقار نے آنے کو کہا تھا ———"

"گڈ ——— گویا تم ایک وقت میں دو دو امتحان دے رہی ہو ———" ناجیہ مسکرائی

"کیا کروں مجبوری ہے ———"

"مجبوری کس بات کی ——— کیا وقار سے ملنا ضروری ہے؟"

"ہاں ———" اس بار ساجدہ نے اکتائے ہوئے انداز کی اداکاری کرتے ہوئے کہا "زندگی جو اس کے ساتھ گزارنی ہے"

"کیا مطلب ——— کیا کوئی سلسلہ شروع ہو چکا ہے؟" ناجیہ نے جلدی سے پوچھا۔

"ہاں اُمید کی ایک کرن پھوٹی ہے" ساجدہ بولی "وقار کے ایک تایا چند روز پیشتر بیرونِ ملک سے درآمد ہوئے ہیں اور حسنِ اتفاق سے وہ میرے والد کے پرانے واقف کار ثابت ہوئے"

"پھر تو بات بڑی آسانی سے بن جائے گی ———" ناجیہ بولی "میری جانب سے پیشگی مبارکباد قبول کرو"

"شکریہ ———" ساجدہ نے کہا پھر بولی "تمہاری اور عدیل کی بات کہاں تک پہنچی ———"

"عدیل ———" ناجیہ نے عدیل کے نام کو یوں دہرایا جیسے طویل مدت بعد کوئی بھولی بسری یاد تازہ ہوگئی ہو پھر تیکھی نظروں سے ساجدہ کو تکتے ہوئے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے عدیل کے بارے میں"

"اچھا خاصا صحت مند اور معصوم جانور ہے ——— تمہارے ایک اشارے پر قربان ہونے کو تیار ہوگا ہے" ساجدہ نے جواب دیا۔

"وقار کے مقابلے میں تمہیں کیسا لگتا ہے ———"

"دونوں ہی ٹھیک ہیں اپنی اپنی جگہ ———"

"میرا خیال تھا تم وقار کو زیادہ بہتر بتاؤ گی ———" ناجیہ نے مسکرا کر کہا

"دل تو چاہا تھا ——— لیکن اس خیال سے دل پر جبر کر گئی کہ کہیں تمہاری دل شکنی نہ ہو ———"

"بڑا خیال ہے تمہیں میری دل شکنی کا ———"

"کیوں نہ ہو ——— تمہاری کلاس فیلو اور ہمجولی جو ہوں"

"ایک بات کہوں ——— مانو گی"

"کہو ———"

"پہلے وعدہ کرو کہ تم انکار نہیں کرو گی"

"وعدہ، بشرطیکہ بات میرے اختیار کی ہو ———" ساجدہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں عدیل کو وقار سے بدلنے کے بارے میں سوچ رہی ہوں"

"ایمان سے ———" ساجدہ نے برا ماننے کے بجائے نہایت مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "یہی خیال دو چار دن ہوئے میرے دل میں بھی آیا تھا ——— اچھا، یہ بتاؤ کہ کب اس تقریب کا اہتمام کرو گی"

"وقار تمہیں چھوڑنے پر آمادہ ہو جائے گا" ناجیہ نے شوخی سے پوچھا۔

"وقار کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا سکتا البتہ اگر میں نے عدیل کے سامنے چارہ ڈالا تو وہ غریب سر جھکائے میرے پیچھے پیچھے چلا آئے گا ——— بالکل پالتو مرغ کی طرح"

"شوق سے ڈالو چارہ ——— مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا"

"اچھا چھوڑو اس مذاق کو اور جلدی سے یہ بتاؤ کہ تمہارا اور عدیل کا اونٹ کب تک اور کس کروٹ بیٹھے گا"

"سچ سچ بتا دوں ———"

"ہاں ——— تمہیں میری قسم"

"مجھے عدیل سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی اس لئے میں نے اُسے مکمل طور پر آزاد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے"

"کیا مطلب ———" ساجدہ بولی "کیا تم میری قسم کے باوجود غیر سنجیدہ ہو ———"

"میں بالکل سنجیدہ ہوں مائی ڈیئر" ناجیہ سنجیدگی سے بولی "عدیل سے میری واقفیت اب صرف دوستی تک محدود رہے گی"

"اور اب تک جو کچھ ہو چکا ہے وہ کس حساب میں جائے گا"

"تجربے کی خاطر تو انسان مینڈک، خرگوش اور دوسرے جانوروں کو بھی چیر پھاڑ کر رکھ دیتا ہے میں نے ایک جانور پر تھوڑا سا تجربہ کر لیا تو کیا بُرائی ہو گئی اور پھر میں اُسے زندہ بھی تو چھوڑ رہی ہوں"

"کیا تم واقعی سنجیدہ ہو"

"ہاں ——— تیری جان کی قسم ———"

"تم اچھا نہیں کرو گی ———" ساجدہ نے جلدی سے کہا "عدیل بے حد زود حس اور سادہ طبیعت کا لڑکا ہے میرا خیال ہے کہ وہ تمہاری جُدائی کو آسانی سے برداشت نہ کر سکے گا"

"یہ میرا نہیں اُس کا معاملہ ہے ———"

"جو لوگ زیادہ حساس اور زیادہ زود رنج ہوتے ہیں وہ اپنی شکست پر اپنی موت کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں"

"ہو سکتا ہے تمہارا اندازہ ٹھیک ہو لیکن مجھے افسوس ہے کہ اب میں عدیل پر اپنا زیادہ وقت نہیں برباد کر سکتی"

"اُس کی کوئی وجہ بھی ضرور ہو گی ———"

"ہاں ———" ناجیہ مسکرا کر بولی "ہے ایک وجہ ——— عدیل سے کہیں زیادہ خوبصورت اور شاندار وجہ ———"

"گویا تم کہیں اور دل لگا بیٹھی ہو"

"ابھی ابتدا کی ہے ———" ناجیہ نے لاپروائی سے جواب دیا

"کیا عدیل کو ان باتوں کا علم ہو چکا ہے ———"

"نہیں ——— وہ ابھی تک ناواقف ہے ———"

"کون ہے وہ خوش نصیب جو بیچارے عدیل کے حق میں زہر ثابت ہو رہا ہے"

"مائی فٹ ———" ناجیہ جھلا اٹھی،

ساجدہ کا ریمارک اُسے سخت ناگوار گزرا تھا، جھلا کر اُس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور دوسری طرف کا دروازہ بند کر کے ایک دم ہی سے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔

پرچہ خراب ہو جانے کی وجہ سے اُس کا موڈ پہلے ہی خراب تھا، ساجدہ کے آخری جملے نے تو جیسے زخم پر کوئی دکھا دی ہو ——— پھر معاً اُس کے جھلاتے ذہن میں عاشی کا تصور ابھر آیا۔

عاشی ——— جو ناجیہ اور شہباز کے درمیان ایک رکاوٹ بنی کھڑی تھی۔

عاشی ——— جو ناجیہ کی خواہشات کے راستے کی دیوار بن رہی تھی۔

عاشی ———

جو زندہ تھی ——— مگر

آفتاب بننے کے خواب دیکھ رہی تھی ———

لیکن ناجیہ نے طے کر لیا تھا کہ وہ اپنے راستے کی اس کمزور اور غیر مستحکم دیوار کو ایک ہی ٹھوکر سے توڑ کر ریزہ ریزہ کر دے گی ——— شہباز کو حاصل کرنے کی خاطر وہ راستے کے ہر اس طوفان سے ٹکرا جائے گی جو اس کی راہ میں حائل ہونے کی کوشش کرے گا ——— وہ زندگی کے کسی شعبے میں بھی عاشی سے شکست قبول کرنے کو تیار نہیں تھی ——— اسی ایک احساس نے اس وقت بھی اُسے جوالا مکھی بنا دیا تھا۔

ناجیہ کا پرچہ خلافِ توقع خراب ہو گیا تھا چنانچہ اُسے یہ فکر لاحق تھی کہ کہیں عاشی امتحان کے نتیجے سے بہت نہ لے جائے ——— اسی خیال میں الجھی وہ امتحان ہال سے باہر نکلی تھی کہ ساجدہ سے ملاقات

ہوگئی ——

ساجدہ اس کی اچھی سہیلیوں میں سے تھی اُس نے ساجدہ کے ساتھ ہنس بول کر اپنا غم دور کرنا چاہا لیکن جب ساجدہ نے بھی اس کی مرضی کے خلاف عدیل کے حق میں ہمدردی کا اظہار کیا تو جھلس اٹھی ایک بار پھر اُسے اپنے پرچے کا خیال آگیا اور پھر

پھر اچانک اُسے یاد آگیا کہ آج جب وہ انتہائی خوشگوار موڈ میں امتحان کی خاطر اپنی عابدہ کوٹھی سے مسکراتی، گنگناتی، باہر نکلی تھی تو اُس کی نظر عاشی پر پڑی تھی اور اُس کا موڈ ایک دم خراب ہوگیا تھا اور اب —— اب وہ بڑی سنجیدگی سے عاشی کو اپنے پرچے کی خرابی کا ذمہ دار سمجھ رہی تھی۔

عاشی ——!

اگر صبح ہی صبح اُس کا سامنا نہ ہوتا تو ناجیہ کا پرچہ خراب نہ ہوتا —— !!

اور ——

ناجیہ کو آج پہلی بار یہ خیال آیا کہ عاشی اس کے حق میں منحوس ثابت ہو رہی ہے —— !!!

کہتے ہیں کہ وقت ہر زخم کے لئے تریاق ہوتا ہے

شمسہ بیگم اور محمود حسین کی دلجوئی اور گزرتے وقت نے عاشی کے غم کو بڑی حد تک کم کر دیا تھا لیکن اسی گزرتے وقت نے ایک زخم کو جو حالات کی رفتار کے ساتھ وقتی طور پر بھرتا نظر آرہا تھا پھر سے ہرا کر دیا۔

محمود کی موت کی وجہ سے شائستہ بیگم نے فراز اور ناجیہ کے رشتے کے سلسلے میں اپنی زبان بند کر لی تھی لیکن جب اُن کی جانب سے جواب کا تقاضہ از سرِ نو ہوا تو شمسہ بیگم ایک بار اُلجھ کر رہ گئیں۔

عاشی کی زبانی انھیں فراز کے سلسلے میں ناجیہ کا جواب مل چکا تھا۔ وہ کسی قیمت پر فراز کو زندگی کے ہم سفر کی حیثیت سے اپنانے کو تیار نہیں تھی اور دوسری جانب وہ زیادہ عرصے تک شائستہ بیگم کو نہیں ٹال سکتی تھیں۔ شمسہ بیگم کو بیٹی کی شادی کی کچھ اتنی جلدی نہیں تھی۔ اُن کا ارادہ تھا کہ ناجیہ تعلیم مکمل کرلے پھر اُس کے ہاتھ پیلے کئے جائیں مگر جب سے انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے ناجیہ اور عدیل کو ایک ساتھ ہوٹل سے نکلتے دیکھا تھا ان کی راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام ہوگیا تھا —— بات اگر اُن کی اختیار کی ہوتی تو وہ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کر ڈالتیں اور فراز کو تو انھوں نے ایک عرصے سے ناجیہ کے لئے منتخب کر رکھا تھا —— مگر —— ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا ——!

ایک ماں کی حیثیت سے وہ دن رات اسی فکر میں الجھی رہتیں کہ کسی طرح فراز اور ناجیہ کا رشتہ طے ہو جائے —— دو ایک بار انھوں نے یہ بھی سوچا کہ کھل کر ناجیہ سے اس موضوع پر گفتگو کر ڈالیں اور اُسے صاف صاف بتا دیں کہ وہ اُس کی بے راہ روی اور کھلے بندوں کالج کے لڑکوں کے ساتھ ہوٹلوں میں آنا جانا بالکل پسند نہیں کرتیں لیکن ہر بار انھوں نے مصلحتوں کے پیشِ نظر اپنی زبان بند کر لی۔

شمسہ بیگم کو یہ خوف بھی دامنگیر تھا کہ اگر ناجیہ کی زبان ایک بار اُن کے سامنے بھی کھل گئی تو جو تھوڑا سا حجاب مانع تھا وہ بھی جاتا رہے گا لیکن آج شائستہ بیگم نے اگر پھر اسی مسئلہ کو ہوا دے دی۔

دوپہر کو وہ کھانے کے بعد دو گھڑی کمر سیدھی کرنے کے ارادے سے اپنے کمرے کی سمت جا رہی تھیں کہ شائستہ بیگم بوا کریمن کے ساتھ آگئیں۔

ناجیہ اور عاشی امتحان دینے گئی تھیں، محمود حسین کچہری گئے ہوئے تھے اس لئے گھر میں شمسہ بیگم تنہا تھیں۔ انھوں نے حسبِ معمول ہاتھوں ہاتھ شائستہ بیگم کا استقبال کیا اور ڈرائنگ رُوم میں لے گئیں۔ بوا کریمن بھی ساتھ تھیں جو شمسہ بیگم کے بے حد اصرار کے باوجود قالین پر بیٹھ گئیں اور کسی طرح صوفے پر دوسروں کے برابر بیٹھنا پسند نہیں کیا۔

کچھ دیر تک شمسہ بیگم اور شائستہ بیگم کے درمیان اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر شائستہ بیگم نے گفتگو کا رُخ تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔

"عاشی اور ناجیہ تو امتحان دینے گئی ہوں گی ——"

"جی ہاں ——" شمسہ بیگم نے دیوار پر لگی گھڑی دیکھتے ہوئے جواب دیا "بس اب کچھ دیر میں آتی ہی ہوں گی۔"

"دونوں کے پرچے کیسے ہوئے ہیں ——"

"خدا کا فضل اور آپ کی دُعائیں ہیں —— ابھی تک تو ٹھیک ہو رہے ہیں۔"

"مجھے تو عاشی کا خیال ستاتا ہے ——" شائستہ بیگم بولیں "خدا جانے وہ غریب کس دل سے امتحان دے رہی ہوگی۔"

"وہ تو رضامند نہیں تھی لیکن ناجیہ کے والد کے اصرار پر مجبوراً آمادہ ہوگئی۔"

"خدا اُسے کامیاب کرے۔" شائستہ بیگم نے کہا "محمود کی موت کے بعد تو بے چاری بالکل ہی بے سہارا ہوگئی —— اگر محمود اور تم نے یوں اپنوں کی طرح دلجوئی نہ کی ہوتی تو نہ جانے غریب پر کیا گزرتی۔"

"خدا گواہ ہے کہ ہم دونوں اُسے ناجیہ سے کم نہیں سمجھتے ——"

"میں جانتی ہوں لیکن خون کے رشتے پھر اپنے ہوتے ہیں ——"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں لیکن خدا کی مرضی کے آگے انسان کی کب چلتی ہے۔"

"میں تو یہی کہتی ہوں کہ خدا کسی کو یوں بے سہارا نہ کرے جیسی عاشی ہوئی ہے ——" شائستہ بیگم نے کہا پھر توقف سے بولیں "رحیمو کو دیکھ لو —— دنیا کا خون اتنا سفید بھی ہو سکتا ہے، باپ کی موت کی اطلاع ملنے کے باوجود بھی نہیں آیا —— کم از کم عاشی ہی کی خاطر کچھ دنوں کے لئے چلا آتا ——"

"مجھے بھی اسی بات کا ملال تھا لیکن ——" شمسہ بیگم کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

"لیکن کیا ——"

"رحیمو محمد کا لڑکا ضرور ہے لیکن عاشی کا باپ نہیں ہے ——"

"باپ نہیں ہے ——" شائستہ بیگم یوں چونک اُٹھیں جیسے اس خبر سے اُن کی ذات کا کوئی گہرا تعلق ہو "تمہیں اس بات کا علم کیسے ہوا کہ رحیمو عاشی کا باپ نہیں ہے ——"

"ناجیہ کے والد بتا رہے تھے۔"

"پھر —— کچھ پتہ چلا کہ کون ہے عاشی کا باپ۔" شائستہ بیگم نے پہلو بدلتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

"خدا ہی بہتر جانے —— ہمیں تو کوئی خبر نہیں، عاشی کو بھی یہی صدمہ اندر اندر پریشان کئے رہتا ہے۔"

شائستہ بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا، کسی سوچ میں یوں گم ہوگئیں جیسے دنیا و مافیہا سے بیخبر ہوگئی ہوں۔

اُن کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو شمسہ بیگم نے بھی خاص طور پر محسوس کیا —— کچھ دیر تک وہ چپ چاپ بیٹھی شائستہ بیگم کی کیفیت کا جائزہ لیتی رہیں پھر بولیں۔

"خیریت تو ہے آپا —— آپ کس سوچ میں گم ہوگئیں ——"

"آں ——" شائستہ بیگم نے یوں ہڑبڑا کر شمسہ بیگم کی جانب دیکھا جیسے کوئی خواب دیکھتے دیکھتے... اچانک اُن کی آنکھ کھل گئی ہو پھر اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے بولیں "یوں ہی —— عاشی کے بارے میں سوچ رہی تھی قدرت نے بیٹھے بٹھائے اُسے کیسے غموں سے دوچار کر دیا ——"

"افسوس تو اسی بات کا ہے کہ وہ خود بھی اپنے ماضی سے قطعی بے خبر ہے اور حیرت اس بات کی بھی ہے کہ محمود کی موت کے بعد رحیمو بھی نہیں آیا —— وہ آتا تو ممکن تھا کہ عاشی کے بارے میں کچھ معلوم ہوتا ——"

"ہو سکتا ہے کہ وہ کسی وجہ سے جان بوجھ کر نہ آیا ہو۔" شائستہ بیگم روانی میں ایک امکانی بات کہہ گئیں۔

"کیا مطلب ——" شمسہ بیگم نے چونک کر سوال کیا۔

"میرا مطلب ہے کہ ہو سکتا ہے کہ کسی خاص وجہ سے رحیمو بھی اس راز کو راز ہی رکھنا چاہتا ہو جو محمد کے ساتھ دفن ہوگیا ہے۔"

"لیکن ایسی بھی کیا بات ہو سکتی ہے جسے چھپانے کی خاطر بیٹا باپ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے بھی نہ آسکے۔"

"یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے ——" شائستہ بیگم نے ایک سرد آہ بھر کر کہا پھر جلدی سے موضوع بدل کر۔

بولیں ——— "ناجیہ کے امتحان کب ختم ہو رہے ہیں ———"

"آج کے بعد ایک پرچہ اور رہ جائے گا" شمسہ بیگم نے کہا "دو روز بعد وہ بھی ختم ہو جائے گا"

"اس کے بعد تمہارا کیا ارادہ ہے ———"

"کیسا ارادہ آپا ———" شمسہ بیگم نے پوچھا

"اب اتنی بھولی بھی نہ بنو ———" شائستہ بیگم نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے بڑی اپنائیت سے شکوہ کیا "میں لڑکے والی ضرور ہوں لیکن اب اتنی غیر بھی نہیں کہ تم ———"

"خدا کی قسم آپا، میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکی تھی" شمسہ بیگم نے اپنی غلطی کا احساس ہو جانے کے بعد جلدی سے کہا "بات چونکہ عاشی کے متعلق ہو رہی تھی اس لئے میں آپ کا اشارہ نہیں سمجھ سکی"

"چلو کوئی فرق نہیں پڑتا ——— دیر آید درست آید ——— تم میرا اشارہ سمجھ گئی ہو تو اب بتاؤ کہ تمہارا کیا ارادہ ہے ——— کھل کر کوئی جواب دو گی یا پہلے کی طرح آج بھی ٹال دو گی"

"کیسی بات کرتی ہیں آپا ———" شمسہ بیگم نے سنبھلتے ہوئے نہایت خوبصورتی سے کہا "میرا تو روزِ اوّل ہی ایک ہی جواب ہے ——— جب ناجیہ کی بزرگ آپ خود موجود ہیں تو بھلا میں کون ہوتی ہوں فیصلہ کرنے والی"

"دیکھو شمسہ ——— آج یوں کام نہیں چلے گا" شائستہ بیگم بولیں "آج تو تمہیں کھل کر ——— ہاں، یا، نا، میں جواب دینا ہوگا"

"آپ شرمندہ کر رہی ہیں ———" شمسہ بیگم نے اپنے درد کو ایک لطیف مسکراہٹ کی آڑ میں چھپاتے ہوئے کہا "آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ آپ کوئی حکم دیں اور میں اُس سے سرتابی کی گستاخی کر سکوں"

"گویا تمہیں فراز اور ناجیہ کا رشتہ منظور ہے ———"

"پھر وہی مرغ کی ایک ٹانگ ———" شمسہ بیگم بدستور مسکراتے ہوئے بولیں "کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ ناجیہ پر بھی آپ کو اتنا ہی حق ہے جتنا فراز پر ہے ———"

"سوچ لو ——— اگر میں نے کوئی فیصلہ کر ڈالا تو بعد میں تم کوئی چوں وچرا نہیں کرو گی ———"

"یہی تو میں بھی چاہتی ہوں کہ آپ اپنے بھائی سے مل کر بات طے کر لیں اور مجھے بھی دن تاریخ سے مطلع کر دیں تاکہ میں بھی آپ سب کی خوشیوں میں شریک ہو جاؤں"

"کیا تم نے محمود حسین سے بات نہیں کی"

"بارہا کہہ چکی ہوں لیکن وہ بھی ہر بات آپ پر چھوڑ دیتے ہیں" شمسہ بیگم نے آہستہ سے کہا

"اگر یہ بات ہے تو پھر میرا حتمی فیصلہ بھی سن لو ——— شائستہ بیگم نے ٹھوس آواز میں جواب دیا "ناجیہ کے امتحان ختم ہونے کے ٹھیک پندرہ دن بعد میں اُسے منگنی کی انگوٹھی پہنا دوں گی ——— شادی کی تاریخ بعد میں طے ہوتی رہے گی"

"جیسی آپ کی مرضی"

"اور ہاں ——— محمود آج آئیں تو اُن سے کہنا کل مجھ سے ضرور مل لیں تاکہ کم از کم منگنی کی رسم کی بات طے ہو جائے"

"ضرور تاکید کر دوں گی ———"

"اچھا ——— اب چلتی ہوں" شائستہ بیگم نے اٹھتے ہوئے کہا "ناجیہ آئے تو اُسے میری طرف سے پیار کر لینا" شمسہ بیگم مسکرا دیں۔ اُنھوں نے شائستہ بیگم کی تواضع کی خاطر کچھ دیر اور رُکنے کا اصرار کیا لیکن شائستہ بیگم چونکہ جلدی میں تھیں اور بات بھی گھر کی تھی۔ اس لئے شمسہ بیگم ایک عارضی اور وقتی خوشی کی خاطر جھوٹ موٹ بھی منہ میٹھا نہ کرا سکیں

دل پر جبر کئے انھوں نے کوٹھی کے باہر تک آ کر شائستہ بیگم کو رخصت کیا لیکن اس کے بعد ضبط نہ کر سکیں ——— آنسوؤں کے وہ انمول خزینے جو ایک ماں نے اپنی اولاد کی خوشیوں پر نچھاور کرنے کی خاطر نہ جانے کب سے پلکوں کی اوٹ میں چھپا رکھے تھے ——— آج اُن کی اپنی بے بسی اور بے چارگی پر قربان ہونے کے

بے اختیار اُبل پڑے ——— اور پلکوں سے ڈھلک ڈھلک کر زمین کی بے پناہ وسعتوں میں گم ہونے لگے ...!!

فرحت کب لان پر آئی اور کب اس کے قریب آ کر کھڑی ہوئی اُسے مطلق خبر نہیں ہوئی۔ آخری پرچے کی تیاری میں وہ کچھ اس قدر انہماک سے کتاب میں غرق تھی کہ قرب و جوار سے یکسر بے نیاز ہو گئی۔

دوپہر سے وہ اپنے کمرے میں پڑھ رہی تھی، سورج کے سائے ڈھلنے لگے تو وہ ماحول کی یکسانیت سے اُکتا گئی۔ یوں بند ماحول میں بیٹھے بیٹھے اُسے گھٹن کا احساس ہونے لگا تھا چنانچہ کتاب ہاتھ میں لئے وہ لان میں آ گئی اور ایک گوشے میں جا بیٹھی ——— کھلی فضا اور تازہ ہوا کے خوشگوار جھونکوں نے اس کی طبیعت کی کسلمندی کو بڑی حد تک دُور کر دیا تھا۔

اب تک اس کے تمام پرچے نہایت شاندار ہوئے تھے لہٰذا وہ آخری پرچے کے سلسلے میں بھی پوری تیاری کر لینا چاہتی تھی کہ اسے ممدو کے خواب ہر قیمت پر پورے کرنے تھے۔ اُس نے طے کر لیا تھا کہ حالات خواہ کچھ ہی ہوں نہ ہوں وہ اپنے اس محسن کی روح کو شرمندہ نہیں ہونے دے گی۔

ممدو یہی چاہتا تھا کہ وہ ڈھیر سارا لکھ پڑھ جائے ——— پڑھ لکھ کر یوں اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے کہ کوئی طوفان اُس کے قدموں کو زمین سے اکھاڑ نہ سکے ——— وہ عاشی کو زندگی کی شاہراہوں پر بے پناہ کامیابیوں اور کامرانیوں سے ہمکنار دیکھنا چاہتا تھا۔

یہ ایک مرنے والے کی آخری خواہش تھی ———

بڑی دیرینہ تمنا تھی ———

اور عاشی نے مرنے والے کی خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔

خوشیاں اور مسرتیں اس کے اختیار میں نہیں تھیں ———

اس لئے وہ مجبور تھی ———

لیکن ———

کامیابیوں کا حصول اُس کے دائرۂ اختیار سے باہر نہیں تھا ———

وہ جانتی تھی کہ اگر قدرت نے اس کی محنت کا پھل عطا کیا تو وہ نہایت شاندار نمبروں سے کامیابی حاصل کرے گی ——— اُسے یہ بھی علم تھا کہ اُس کی کامیابی ناجیہ کی پیشانی پر شکن بن جائے گی۔

ناجیہ ——— جو اپنے مقابلے میں عاشی کو انتہائی کمتر اور حقیر گردانتی تھی ———

ناجیہ ——— جو اپنی شکست کو تسلیم کرنے کی عادی نہیں تھی ———

ناجیہ ——— جو ممدو کے مرنے کے بعد سے نہ جانے کیوں اُس سے دُور دُور رہنے لگی تھی ———

بات بات پر حقارت سے جھڑک دیتی ———

وہ سامنے جاتی تو ناجیہ نفرت سے منہ موڑ کر سر اُٹھائے، گردن میں تناؤ ڈالے دوسری طرف چلی جاتی ———

وہ کوئی بات کرتی تو اُسے نفرت اور حقارت سے اُس کا جواب دیا جاتا ———

شاید ممدو کی موت کے بعد ناجیہ اُسے اُس کی حیثیت کا احساس دلانا چاہتی تھی ———

اس مقام کی پہچان کرانا چاہتی تھی جہاں تقدیر نے اُسے لا کھڑا کیا تھا ———

لیکن وہ ایسا کیوں چاہتی تھی ——— ؟

آخر کیوں ——— ؟؟

کس لئے ——— ؟؟؟

عاشی نے تو زندگی میں کبھی بھول کر بھی ناجیہ سے برابری کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ اُسے اپنی حیثیت کا احساس بھی بخوبی تھا ——— وہ اپنے مقام سے بھی واقف تھی ——— وہ جانتی تھی کہ آسمان اور زمین کے فاصلے کبھی نہیں مٹائے جا سکتے ——— بلکہ اُس نے تو کبھی بھولے سے بھی گردن اونچی نہیں کی ——— غلطی سے بھی نظریں اٹھا کر

زمین سے فلک کی بلندیوں کی پیمائش کا اندازہ نہیں کیا تھا ـــــ وہ ایسا کر بھی کس طرح سکتی تھی ـــــ حالات اور وقت نے تو روزِ اوّل سے اُس کی قسمت میں محرومیاں رقم کر دی تھیں ـــــ اپنی تنگ دامنی اور تنگ دستی کا احساس بڑی شدتوں سے دلایا تھا ـــــ

اُس نے تو کبھی خوابوں میں بھی خود کو ناجیہ کے برابر نہیں محسوس کیا تھا ـــــ پھر ناجیہ کا برتاؤ اچانک اس قدر جارحانہ اور اذیتناک کیوں ہو گیا تھا ـــــ کیا وجہ تھی جو بدلتے موسم اور گزرتے وقت کی طرح ناجیہ کے خلوص کے طریق بھی بدل گئے تھے ـــــ

ـــــ اور پھر صرف ناجیہ ہی کیوں ـــــ ؟

محمود حسین اور شمسہ بیگم کے برتاؤ میں کوئی فرق کیوں نہیں آیا تھا ـــــ محمود کی موت کے بعد اُن کی شفقتیں عاشی کے حق میں کم ہونے کے بجائے دوچند کیوں ہو گئی تھیں ؟ ـــــ کیا وہ عاشی کی تنہائی اور بے بسی پر محض رحم کھا رہے تھے ـــــ ترس کھا کر اُسے اپنے قریب کر لیا تھا اور قابلِ التفات سمجھ لیا تھا ـــــ یا.....

محمود کی موت کے بعد سے عاشی کے ذہن میں اکثر اس قسم کے سوالات اُبھرتے، وہ پہروں ان باتوں پر غور کرتی پھر فلک کج رفتار کی جانب دیکھ کر ایک سرد آہ بھر کر خاموش ہو جاتی ـــــ اُس نے تو یہاں تک طے کر لیا تھا دوسروں پر بوجھ نہیں بنے گی ـــــ محمود کے چالیسویں کے بعد کالج کے ہوسٹل میں ایک کمرہ کرائے پر لے لے گی۔ ٹیوشن کر کے اپنے اخراجات پورے کرے گی اور پوری توجہ سے اپنی تعلیم مکمل کر کے اس مقام تک پہنچنے کی کوشش کرے گی جس کے خواب محمود اکثر دیکھا کرتا تھا!

عاشی نے اپنے ارادوں کا اظہار بھی دبی زبان میں محمود حسین کے سامنے کیا تھا لیکن محمود حسین اور شمسہ بیگم نے جس خلوص اور محبت سے اُسے روکا تھا وہ اِن جذبوں کے سامنے سرنگوں ہو گئی

احسانوں کے بوجھ تلے گردن گردن تک دھنسی ہوئی تھی

پھر محسنوں کے حکم سے انکار کی جسارت کیسے کرتی ـــــ !!

گزرتے وقت نے اُسے حالات سے سمجھوتہ کرنے کا عادی بنا دیا تھا ـــــ وہ ہر بات سے بے نیاز ہو کر پڑھائی میں گم ہو گئی ـــــ اور اس وقت بھی آخری پرچے کی تیاری میں گم تھی کہ فرحت کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

"کہاں کھوئی ہوئی ہو عاشی ـــــ"

عاشی فرحت کی آواز سُن کر ہڑبڑا سی گئی، کتاب بند کر کے احساسِ کمتری کے اظہار کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی فرحت کو تکتے ہوئے بڑے بھولپن سے بولی

"تم کب آئیں فرحت ـــــ مجھے خبر بھی نہ ہوئی"

"سچ کہا ہے کسی شاعر نے ـــــ ع ـــــ ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی۔ کچھ ہماری خبر نہیں آتی" فرحت کے لہجے میں طنز تھا۔

"مجھے افسوس ہے فرحت ـــــ" اُس نے معصومیت سے کہا "کتاب کے مطالعہ ـــــ"

"کون سی کتاب ہے جسے اتنی توجہ سے پڑھا جا رہا ہے" فرحت نے اُس کی بات کاٹی

"معاشیات کی ـــــ" اُس نے جواب دیا "کل معاشیات ہی کا تو آخری پرچہ ہے"

"خاصا خشک اور بور مضمون ہے" فرحت نے منہ بنا کر کہا پھر یکلخت اُس کی آنکھیں چمک اٹھیں، عاشی کو معنی خیز نظروں سے گھورتے ہوئے بولی "البتہ یہ ضرور ہے کہ معاشیات انسان کو اُس کی معاشی زندگی اور معاشی حیثیت کے بارے میں بہت کچھ سکھا دیتا ہے ـــــ یہ اور بات ہے کہ کوئی جان بوجھ کر انجان اور ڈھیٹ بنا رہے ـــــ تمہارا کیا خیال ہے"

"جی ـــــ" وہ محض مسکرا کر خاموش ہو گئی، فرحت کے جملے میں پوشیدہ تیر و نشتر نے اُس کی رُوح کو زخمی کیا تھا لیکن ـــــ وہ اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئی ـــــ حرفِ شکایت زبان تک نہیں لائی ـــــ

"کیا فائدہ تھا ـــــ ؟

کون سنتا ـــــ ؟"

البتہ اُسے یہ احساس ضرور ہوا کہ فرحت کو یوں اُسے ذلیل کرنے کا کوئی اختیار نہیں تھا لیکن اُس احساس کی نفی بھی کر ڈالی ـــــ ناجیہ کی قریب ترین سہیلی ہونے کے ناطے فرحت کو ہر بات کا اختیار تھا۔ اس خیال کے تحت اُس نے کوئی شکوہ ـــــ کوئی شکایت کرنے کے بجائے محض مسکرا کر درگزر کر جانے پر اکتفا کی۔

"ناجیہ کہاں ہے ـــــ" فرحت نے سنجیدگی سے دریافت کیا

"وہ ـــــ اندر ـــــ شاید اپنی اسٹڈی میں ہو گی ـــــ" عاشی نے گڑبڑا کر جواب دیا تو فرحت کے ہونٹوں پر ایک زہر ملا تبسم بیدار ہو گیا۔

"بہت خوب ـــــ" وہ زہر خند سے بولی "ایک ہی گھر میں ـــــ ایک ساتھ رہتے ہوئے بھی تم ناجیہ کے بارے میں یقین سے کوئی جواب نہیں دے سکیں ـــــ"

"تم غلط سمجھ رہی ہو فرحت ـــــ دراصل..... میں....." وہ اپنی صفائی میں کوئی معقول بہانہ تراشنا چاہتی تھی لیکن فرحت نے اُس کا موقع نہیں دیا ـــــ تیور بدل کر خشک لہجے میں ایک اور شعر جڑ بیٹھی۔

"کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار ـــــ اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں"

"میں سمجھی نہیں اس شعر کا مقصد" عاشی بے اختیار پوچھ بیٹھی

"اُردو کے معاملے میں میری معلومات کچھ زیادہ نہیں ہیں" فرحت نے بڑی شان سے کہا "ہم جس سوسائٹی میں اُٹھتے بیٹھتے ہیں وہاں اُردو کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی ـــــ ویسے تم اگر اس شعر کا مقصد اور مطلب جاننا چاہتی ہو تو اپنے شہباز صاحب سے دریافت کر لینا۔ وہ زیادہ پریکٹیکل (PRACTICAL) طور پر تمہیں سمجھا دیں گے"

"فرحت ـــــ" وہ چپ نہ رہ سکی، دبی زبان میں مگر سنجیدگی سے بولی "تمہارا الزام غلط اور بے بنیاد ہے"

"ہم سے اُلجھنے کی کوشش مت کرو عاشی" فرحت نے تنک کر تیزی سے کہا "ہم کو بہت کچھ معلوم ہے"

"کیا معلوم ہے" وہ پوچھ بیٹھی

"یہی کہ تمہیں امتحان کے بعد سنٹر سے کون پک کرتا ہے اور تمام راستے تم دونوں کے درمیان ـــــ"

"فرحت ـــــ" عاشی ضبط نہ کر سکی تو مجسم احتجاج بن گئی "تمہیں شریف انسانوں پر کیچڑ اچھالتے شرم بھی نہیں آتی"

"شریف ـــــ" فرحت نے حقارت سے کہا پھر ماتھے پر بل ڈال کر انتہائی نفرت سے بولی "شہباز کی شرافت پر ناجیہ کی طرح مجھے بھی اعتماد ہے لیکن ـــــ"

محمود حسین کی گاڑی کے ہارن کی تیز آواز اُبھری تو فرحت بھی چونک اٹھی، کچھ سوچ کر اُس نے اپنا جملہ نامکمل چھوڑ دیا ـــــ عاشی کے سراپا کو حقارت بھری نظروں سے گھورا پھر لمبے لمبے قدم اُٹھاتی اندر چلی گئی۔

اور ـــــ

عاشی کو اپنا وجود ڈولتا محسوس ہو رہا تھا۔ یوں جیسے طوفان کی پہلی ہی یلغار نے اُسے جڑ سے اکھاڑ کر آندھیوں کی زد پر اچھال دیا ہو ـــــ اُسے اپنا سر چکراتا ہوا لگ رہا تھا، جیسے پوری کائنات اچانک کسی خوفناک زلزلے کے شدید جھٹکوں سے لرز اٹھی ہو ـــــ

اور پھر عاشی نے اگر کرسی کا سہارا لے کر خود کو سنبھال نہ لیا ہوتا تو شاید اوندھے منہ زمین پر آ رہتی۔!!

✻

محمود حسین کو جب اس بات کا علم ہوا تھا کہ عاشی اُن کی اپنی بیٹی ہے، ماضی کی دُھندلائی ہوئی یادوں نے تازہ ہو کر انھیں منتشر کر دیا تھا۔ فائزہ سے کئے ہوئے وعدے اُن کے ذہن کے پردوں پر اُبھرتے تو وہ تڑپ کر رہ جاتے، کتنے ارمانوں اور کتنے چاؤ سے انھوں نے فائزہ کو اپنی زندگی کا ہم سفر انتخاب کیا تھا۔

اُن دنوں اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرونِ ملک جانے سے پہلے وہ اپنے دوست ذیشان سے ملنے لاہور گئے ہوئے تھے جہاں اچانک فائزہ سے اُن کی نگاہوں کا تصادم ہوا پھر انھوں نے اپنے بزرگوں سے مشورہ کئے بغیر ذیشان کی وساطت سے اپنی زندگی کا ایک اہم فیصلہ کر ڈالا اور اس نگینے کو اپنی زندگی میں جڑ لیا جس کی پہلی ہی جھلک نے اُن کی نگاہیں خیرہ

کر دی تھیں۔

کچھ دنوں لاہور میں فائزہ کے ساتھ رہنے کے بعد وہ کراچی واپس آئے اور پھر بیرون ملک چلے گئے جہاں اپنی تعلیم کے دوران وہ ایک لمحہ بھی اپنی شریکِ زندگی کی حسین یادوں سے بے نیاز نہیں رہے لیکن وقت اور حالات کی خلیج دو بے چین روحوں کے درمیان کچھ یوں حائل ہوئی کہ ناقابلِ عبور ہو گئی اور آج ماضی کے وہی بیتے لمحات محمود حسین کو پل پل تڑپاتے تھے۔

ایک طویل مدت کے بعد انھیں عاشی کی صورت میں اپنی زندگی کی کھوئی ہوئی سب سے زیادہ قیمتی شے مل گئی تھی لیکن وہ اپنی خوشیوں اور مسرتوں کا برملا اعلان نہیں کر سکتے تھے۔ کوئی جشن برپا نہیں کر سکتے تھے ——— اور ستم بالائے ستم یہ کہ وہ عاشی کو بھی کھل کر یہ بتانے سے خوف زدہ ہو جاتے تھے کہ وہ ان کا خونِ جگر ہے ———

ماضی کے لمحوں کی ایک حسین یاد ہے جس کی خوشبو اُن کے وجود کی اتھاہ گہرائیوں میں رچی بسی ہوئی تھی۔ اُس کی تصویر کا جیتا جاگتا عکس ہے جو اُن کے دل و دماغ پر نقش تھا۔

وقت کی گردش نے ان نقوش کو دھندلا دیا تھا لیکن ممدو کی موت نے ان نقوش کو دوبارہ اُجاگر کر دیا۔ زخم تازہ ہوں تو اُن کی خلش بھی ضرور محسوس ہوتی ہے اور پھر عاشی تو فائزہ کی ہو بہو زندہ تصویر تھی۔

جب تک یہ تصویر پردے میں تھی محمود حسین محض شبہ کی کیفیتوں سے دوچار رہتے ——— لیکن ———

جب ممدو کی موت نے تمام پردے یکے بعد دیگرے چاک کر دیئے تو شبہات نے یقین کی شکل اختیار کر لی ——— اور یقین رفتہ رفتہ اضطراب کی صورت اختیار کر رہا تھا ———

حالات نے ایک بار پھر محمود حسین کی زندگی میں کشمکش کی صورت پیدا کر دی ———

ایک جانب عاشی تھی ——— اُن کی خوشیوں کا خزانہ ———

ماضی کی خوبصورت یادوں کا حسین تاج محل ——— بے انتہا بلند ——— بے حد عظیم اور انمول ———

دوسری سمت ناجیہ تھی ———

تصویر کا دوسرا رُخ جو عاشی کی ضد تھی ———

بے انتہا خود سر ——— بیباک اور بے لگام ———

وہ پل پل رنگ بدلنے کی عادی تھی ——— اور عاشی کو اپنے مقابلے میں حقیر تر سمجھتی تھی ———

اور زندگی کا تیسرا زاویہ شمسہ بیگم تھیں ———

محمود حسین کی شریکِ زندگی ——— شریکِ غم ———

مولن و غمخوار ——— جو حالات کے بھنور میں پھنس کر دم بخود ہو گئی تھیں۔

وہ عاشی کی ہمدرد تھیں ——— لیکن ناجیہ کو ناراض بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھیں ———

اور محمود حسین ایک خاموش تماشائی کی حیثیت سے اپنے اطراف بکھرے ہوئے ان کرداروں کے رنگ ڈھنگ دیکھ رہے تھے اور خاموشی سے اپنی ماضی کی غلطیوں کا کفارہ ادا کرنے کی خاطر دن رات عاشی کی دلجوئی میں لگے رہتے لیکن وہ بچہ نہیں تھے ——— یہ بھی محسوس کر رہے تھے کہ عاشی سے اُن کا بڑھتا ہوا التفات جہاں ناجیہ کی پیشانی پر ناگوار سلوٹیں بن کر اُبھر تا رہتا ہے وہاں اکثر شمسہ بیگم کی نگاہوں میں بھی تجسس پیدا کر دیتا تھا۔

آج بھی محمود حسین جب ناجیہ اور عاشی سے فرداً فرداً کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد اپنی خوابگاہ میں آئے تو کچھ تھکے تھکے سے تھے لیکن بیوی کے چہرے پر فکر و پریشانی محسوس کر کے وہ اپنی تکان بھول گئے ——— بستر پر نیم دراز ہو کر کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر بڑی اپنائیت سے بولے

"ایک بات پوچھوں ———"

"پوچھئے ———"

"آپ اِدھر کچھ دنوں سے فکرمند نظر آ رہی ہیں اور آج ——— اگر میرا قیاس غلط نہیں تو آپ خاصی پریشان بھی ہیں۔" محمود حسین نے نہایت نرم لہجے میں پوچھا ——— "کیا بات ہے ———"

"ناجیہ کے سوا اور کیا بات ہو سکتی ہے۔" شمسہ بیگم نے سرد آہ بھر کر کہا

"کیا مطلب ——— ناجیہ کو کیا ہوا ———"

"آج آپا پھر آئی تھیں ———"

"اوہ ———" محمود حسین نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا "بس اتنی سی بات ہے جس کے سبب آپ نے سوچنا شروع کر دیا ———"

"یہی تو مشکل ہے کہ آپ بات سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔" شمسہ بیگم کروٹ بدل کر بولیں "آپا آج اپنا آخری فیصلہ بھی سنا گئی ہیں اور آپ ابھی تک اُسے اتنی سی بات سمجھ رہے ہیں۔"

"آخری فیصلہ ——— میں سمجھا نہیں۔"

"ناجیہ کے امتحان کے ٹھیک پندرہ دن بعد وہ منگنی کی رسم ادا کرنے آ رہی ہیں۔"

"پھر ——— آپ نے کیا جواب دیا۔"

"کیا جواب دیتی ———" شمسہ بیگم دل گرفتہ لہجے میں بولیں "میں نے بات آپ پر ٹال دی۔ آپا نے آپ کو کل بلایا بھی ہے۔"

"سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر آپا کو اتنی جلدی کیا ہے ——— ابھی تو فراز اور ناجیہ دونوں زیرِ تعلیم ہیں اور پھر ناجیہ کی ابھی عمر ہی کیا ہے۔"

"لیکن میں چاہتی ہوں کہ ناجیہ اور فراز کی شادی جتنی جلدی ممکن ہو ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے ———"

"پھر آپ نے بات میرے اوپر کیوں ٹال دی ——— آپ ناجیہ کی ماں ہیں، آپا کو اپنی رضامندی کے فیصلے سے آگاہ کر دیتیں ———"

"یہی تو مشکل ہے کہ میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

"کیا بات ہے بیگم ———" محمود حسین نے بیوی کے لہجے میں منتا کے کرب کو محسوس کرتے ہوئے دریافت کیا "آپ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہیں۔"

"پہلے وعدہ کیجئے کہ آپ ٹھنڈے دل سے کوئی حل تلاش کریں گے۔"

"وعدہ ——— مگر بات کیا ہے آخر۔"

"ناجیہ نے فراز سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔" شمسہ بیگم نے دبی زبان میں کہا

"انکار کر دیا ہے ———" محمود حسین یکلخت سنجیدہ ہو گئے "مجھے پہلے ہی شبہ تھا ———"

"کس بات کا شبہ ———" شمسہ بیگم نے چونکتے ہوئے پوچھا

"یہی کہ ناجیہ جیسی خود سر اور تنک مزاج لڑکی فراز جیسے سیدھے سادھے اور نیک لڑکے کو ناپسند کرے گی۔"

"مجھے ناجیہ سے اس جواب کی اُمید نہیں تھی۔"

"کیا آپ نے براہِ راست ناجیہ سے اس کا فیصلہ پوچھا تھا۔"

"نہیں ——— میں نے عاشی کے ذریعہ معلوم کرایا تھا۔"

"ناجیہ نے کوئی وجہ نہیں بتائی اپنی ناپسندیدگی کی ———"

"ناجیہ نے تو نہیں بتائی لیکن ———" شمسہ بیگم دل کی بات زبان تک لاتے لاتے یک دم خاموش ہو گئیں

"لیکن کیا ——— آپ خاموش کیوں ہو گئیں۔" محمود حسین نے تیزی سے پوچھا

"ممکن ہے میرا اندیشہ غلط ہو لیکن ہو سکتا ہے کہ ناجیہ نے اپنے لئے کسی اور لڑکے کا انتخاب کر لیا ہو۔"

"ناجیہ کو ہم نے جو آزادی اور مختاری دے رکھی ہے اُس سے کچھ بعید بھی نہیں ہے مگر میری زندگی میں ایسا نہیں ہو سکتا۔" محمود حسین نے ٹھوس آواز میں کہا "میں کسی وقت عاشی کو کریدنے کی کوشش کروں گا ——— اگر آپ کا اندیشہ درست ہے تو عاشی کو اس کا علم ضرور ہو گا ———"

"خدا کے لئے جو قدم بھی اُٹھائیں سوچ سمجھ کر اُٹھائیں ——— جوان لڑکی کا معاملہ ہے، اگر بات خراب ہو گئی تو ———"

"آپ فکرمند نہ ہوں بیگم" محمود حسین نے بیوی کو دلاسہ دیتے ہوئے نرم لہجے میں جواب دیا "خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا"

"خدا آپ کی زبان مبارک کرے ——— لیکن آپا کو کیا جواب دیا جائے گا"

"وہ بھی آپ مجھ پر چھوڑ دیں ——— میں کل واپسی میں آپا سے ملتا آؤں گا"

"کوشش یہی کیجئے گا کہ بات بگڑنے نہ پائے" شمسہ بیگم نے کہا "فراز کا رشتہ اگر ختم ہو گیا تو مجھے شدید دکھ ہو گا"

"ناجیہ کا امتحان ختم ہو لینے دیں پھر دیکھا جائے گا" محمود حسین جماہی لیتے ہوئے بولے "خدا جو کرے گا بہتر ہی کرے گا ——— اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ناجیہ نے مذاق میں فراز سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا ہو"

"عاشی پر مجھے بھرپور اعتماد ہے ——— وہ مجھ سے غلط بیانی نہیں کر سکتی"

"میرا ایک مشورہ اور بھی ہے ———" محمود حسین نے تھوڑے توقف کے بعد کہا "کسی وقت آپ بھی ذرا اشاروں میں ناجیہ کا عندیہ لینے کی کوشش کریں"

"اور اگر ناجیہ نے مجھ سے بھی کھل کر انکار کر دیا تو ———"

"تو ———" محمود حسین خاموش ہو کر ہونٹ چبانے لگے پھر ایک لمبی سانس لے کر بولے "ہمیں خود کو نئے حالات کے پیشِ نظر اپنے رویئے میں کچھ لچک پیدا کرنی پڑے گی"

"کیا مطلب ———" شمسہ بیگم نے چونک کر شوہر کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا

"انسان سے جو غلطیاں سرزد ہو جائیں وقت اُن کا کفارہ کسی نہ کسی صورت میں ضرور طلب کرتا ہے" محمود حسین نے تھکے تھکے اور نڈھال لہجے میں کہا "حقیقت کا اعتراف نہ کرنا بھی ایک غلطی ہے ——— آدمی جو بوتا ہے وہی اُسے کاٹنا بھی پڑتا ہے"

"لیکن آپ ———"

"رات زیادہ ہو چکی ہے ——— صبح کا انتظار کیجئے" محمود حسین نے بیوی کی بات کاٹتے ہوئے کہا پھر یوں ہی جماہی لیتے ہوئے کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں لیکن نیند اُن کی نگاہوں سے کوسوں دور تھی۔

اور ———

شمسہ بیگم شوہر کے آخری جملوں کا مفہوم سمجھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں ——— !!

✻———✻

صبح ہی سے اُس کی بائیں آنکھ رہ رہ کے پھڑک رہی تھی۔

گھر سے نکلتے وقت بھی اُس نے پھڑکن کو محسوس کیا تھا۔ آج آخری پرچہ تھا اس لئے وہ اس اچانک بدشگونی سے خوفزدہ ہو گئی ——— راستے میں حسبِ دستور محمود حسین اُسے کامیابیوں سے ہمکنار ہونے کی دعائیں دیتے رہے۔ بلکہ آج تو ایک انہونی بات بھی ہوئی تھی۔

گفتگو کے دوران جب اُس نے محمود حسین کو حسبِ معمول انکل کہا تو وہ ایک لمحے کے لئے چپ ہو گئے پھر بڑے شفیق لہجے میں انتہائی اپنائیت سے بولے

"عاشی بیٹی ——— ایک بات پوچھوں ———"

"جی ———" وہ ہمہ تن گوش ہو گئی

"جب میں تمہیں ہمیشہ عاشی بیٹی کہتا ہوں تو تم مجھے انکل کے بجائے ناجیہ کی طرح ڈیڈی یا ڈیڈی کیوں نہیں کہتیں"

"ناجیہ کی بات اور ہے ———" وہ ایک لمحے کو اداس ہو گئی

"کیوں ———" محمود حسین چونکے "کیا میں نے کبھی تم دونوں میں کوئی فرق سمجھا ہے"

"جی نہیں ——— میرا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا" وہ گڑبڑا گئی "دراصل ———"

"انکل کہنے کی عادت پڑ گئی ہے ———"

"جی ہاں ——— انکل" وہ انکل کہنے کے بعد خود ہی مسکرا دی

"کیا تم میری خوشی کی خاطر بھی مجھے ڈیڈی نہیں کہہ سکتیں"

"آپ میرے محسن ہیں، بجائے باپ کے ہیں، میں آپ کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتی"

"مگر ڈیڈ کہنے سے ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے ——— کیوں"

"شاید ———" وہ مدھم آواز میں بولی "لیکن اس کی وجہ میری کوتاہی یا گستاخی نہیں کہی جا سکتی بلکہ شاید ماضی ———"

"آج تمہارا آخری پرچہ ہے شاید" محمود حسین نے جلدی سے اُسے ٹوک کر بات گھما دی

"جی ہاں ———"

"تم امتحان سے فارغ ہو لو تو مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں"

"کیسی باتیں ———"

"ناجیہ کے سلسلے میں" محمود حسین نے سرسری طور پر کہا "اس کے رشتے کے سلسلے میں"

عاشی نے کوئی جواب نہیں دیا ایک نظر محمود حسین کو دیکھ کر چپ ہو گئی، محمود حسین نے بھی بڑی... بصورتی سے بات بدل دی پھر اُسے دعائیں دیتے ہوئے سنٹر پر اتار کر کچہری چلے گئے۔

امتحان ہال میں داخل ہوتے ہوئے اُسے آنکھوں کی پھڑکن کا دوبارہ احساس ہوا تو گھبرا سی گئی، ...ب تک پرچہ تقسیم نہیں ہوا اُس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے اُٹھتے رہے لیکن پرچہ ملنے کے بعد تو اُس کی خوشی کا ...ی ٹھکانا نہ رہا، سارے ہی سوالات انتہائی آسان اور سہل تھے۔

اُس نے خدا کا نام لیا اور پوری توجہ سے قلم سنبھال کر جوابات لکھنے لگی ——— دو گھنٹے کے اندر اُس نے تمام سوالوں کے جواب لکھ ڈالے پھر جوابات پر نظر ثانی کرنے لگی، وہ پوری طرح مطمئن تھی شاید اس لئے کہ پرچہ اُس کی توقعات کے برعکس بہت آسان آ گیا تھا۔

تین گھنٹے مکمل ہونے میں پندرہ منٹ باقی رہ گئے تو وہ کچھ سوچ کر اُٹھ گئی آج وہ شہباز کے پہنچنے سے پہلے ہی واپس چل جانا چاہتی تھی ——— جانے کیوں اُسے شہباز کے ساتھ تنہا گاڑی میں سفر کرنے سے ایک خوف سا محسوس ہوتا تھا ——— اُس کی وجہ صرف اُس کے اپنے واہمے تھے ورنہ شہباز تو ہر لحاظ سے نہایت قابلِ اعتبار اور ...وس کردار کا مالک تھا۔

بے حد مہذب ———

پُرخلوص ———

ہمدرد ——— اور

غمگسار ——— !

کاپی انویجیلیٹر کے حوالے کر کے وہ تیز تیز قدم اٹھاتی باہر آئی تو اکا دکا گاڑیاں موجود تھیں، اُس نے سکون کا سانس لیا، لمبے لمبے قدم مارتی بس اسٹاپ کی جانب بڑھی لیکن شہباز روزمرہ کے معمول کے مطابق اسی ...رق رفتاری سے آ گیا، حسبِ دستور ایک جھٹکے سے اُس نے گاڑی عاشی کے برابر لا کر روکی پھر دروازہ کھولتے ہوئے ...ی مخصوص انداز سے بولا

"تشریف لائیے ——— بندہ حاضر ہے"

عاشی چونک اٹھی، بائیں آنکھ کی پھڑکن کے ساتھ نہ جانے کیوں اُس کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہو گئیں، اُس کا جی چاہا کہ آج شہباز کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنے سے انکار کر دے ——— جانے کیا بات تھی جو اُسے کسی ...دیہ اور انجانے خطروں کا ادراک کرا رہا تھا۔

"کیا سوچ رہی ہیں محترمہ ——— میں آپ کا وہی پرانا خادم شہباز ہوں، کوئی اجنبی نہیں" شہباز کے لہجے میں شوخی تھی۔

عاشی نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکی پھر اس خیال سے کہ قریب و جوار سے کچھ لوگ ہمیں اس کی

جانب اُٹھ رہی ہوں گی وہ دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتی جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی ——

"کیا بات ہے ——" شہباز نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے دریافت کیا "آج خلافِ توقع کچھ گم صم نظر آ رہی ہیں ——"

"سوچ رہی تھی کہ آپ آج اتنی جلدی کیسے آ گئے" اُس نے بات بناتے ہوئے کہا "پر جو کیسا ہوا"

"خدا کا شکر ہے آپ کی دعائیں شامل تھیں اس لئے پرچہ بہت اچھا ہوا" شہباز نے مسکراتے ہوئے جواب دیا پھر بولا "کیا آپ کو آج کوئی ضروری کام درپیش تھا ——"

"جی —— نہیں تو" وہ روانی میں سچ بول گئی

"پھر پندرہ منٹ پہلے کیسے باہر آ گئیں" اُس نے بڑے خلوص سے شکوہ کیا "اگر خدانخواستہ مجھے ایک سیکنڈ کی دیر ہو جاتی تو ——"

"میں بس پیکڑ کر واپس گھر چلی جاتی" اُس نے معصومیت سے ایک حقیقت کا اعتراف کر لیا۔

"اور میں کب تک یہاں کھڑا آپ کی راہ تکتا رہتا ——" شہباز نے پلٹ کر اُسے گھورتے ہوئے پوچھا تو وہ کچھ خجل سی ہو گئی۔

"چلئے معاف کر دیجئے —— میں اپنی غلطی تسلیم کرتی ہوں" اُس نے شہباز کا دل رکھنے کی خاطر لبوں پر ایک دل آویز تبسم سجاتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ شاید بھول رہی ہیں عاشی کہ آپ بیرسٹر محمود حسین کے ہاں پلی بڑھی ہیں"

"کیا مطلب ——" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی

"غلطی بہرحال غلطی ہوتی ہے اور قانون نے ہر غلطی کی ایک مناسب اور جائز سزا بھی تجویز کر رکھی ہے!"

"اوہ ——" شہباز کی بات کا مفہوم بھانپ کر اُس نے اطمینان کا سانس لیا پھر آہستہ سے بولی "مگر آپ میری چھوٹی سی غلطی کی سزا دینے پر غور کر رہے ہیں —— اس کے باوجود کہ میں نے اعتراف کر لیا"

"بات اعتراف کی نہیں غلطی کی ہے" شہباز نے وکیلوں کی طرح جرح کا انداز اختیار کیا "اور غلطی کی سزا دی جائے تو جانبداری کا الزام بھی عائد ہو سکتا ہے"

"کیا سزا دینا چاہتے ہیں آپ ——" عاشی نے مسکراتے ہوئے سوال کیا

"پہلے وعدہ کیجئے کہ آپ سزا بھگتنے پر کوئی اعتراض کوئی احتجاج نہیں کریں گی"

"بہت خوب —— گویا آپ مجھ سے اپیل (APPEAL) کرنے کا حق پہلے ہی چھین لینا چاہتے ہیں"

"جی ہاں" شہباز خوشی سے بولا "اس لیے کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ بات ہماری عدالت سے نکل کر کہیں دوسری کچہری تک پہنچے"

"آپ کی درخواست پر غور کیا جا سکتا ہے لیکن سزا معلوم ہونے کے بعد ہی کوئی حتمی فیصلہ کر سکوں گی!"

"اور اگر میں آپ کو اس کا اختیار بھی نہ دوں تو ——"

"تو میں یہی کہوں گی کہ آپ کی عدالت نے انصاف نہیں کیا —— ایک مجبور کی بےبسی سے فائدہ اٹھایا ہے"

"پھر شروع کر دی آپ نے وہی گھسی پٹی گفتگو ——" شہباز نے سنجیدگی سے کہا پھر ایک دم ہی مسکراتے ہوئے آہستہ سے بولا "آپ نے سزا کے بارے میں نہیں پوچھا ——"

"وہی تو پوچھ رہی تھی لیکن آپ تو یک طرفہ حکم چلائے جا رہے ہیں"

"سوری —— غلطی ہو گئی"

"چلئے فیصلہ ہو گیا ——" عاشی نے ہنستے ہوئے کہا "غلطی غلطی برابر ہو گئی ——"

"لیکن میں اپنی غلطی کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں" شہباز نے آہستہ سے کہا "اگر آپ چاہیں تو مجھے عمر قید کی سزا بھی بخوشی منظور ہے —— بلکہ اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا"

عاشی نے کوئی جواب نہیں دیا، کیا جواب دیتی —— پہلے بھی متعدد بار شہباز نے اُسے اپنا ہم سفر بنانے کے لئے مختلف انداز میں اپنے خیال کا اظہار کیا تھا —— اُس کی مرضی معلوم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ہر بار دل مسوس کر رہ گئی —— حالات نے اُسے وقت کی زنجیروں میں جکڑ کر اتنا بےبس کر دیا تھا کہ وہ اپنے مستقبل کے

بارے میں بھی کھل کر فیصلہ کرنے سے قاصر تھی —— مجبور و بےبس تھی —— !

"کس سوچ میں گم ہیں ——"

"کچھ بھی نہیں ——"

"پھر خاموش کیوں ہو گئیں ——"

"یوں ہی ——"

"آپ نے میرے سوال کا ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا ——"

"کیا جواب دوں ——" وہ ہونٹ چباتے ہوئے بولی

"اقرار نہیں کر سکتیں تو انکار ہی کر دیجئے، میں اپنی قسمت کی بدنصیبی پر شاکر ہو کر آپ کے راستوں سے کہیں دور چلا جاؤں گا —— آپ کو پھر کبھی پریشان کرنے کی کوشش نہیں کروں گا"

شہباز کے لہجے میں درد تھا جس کی کسک اُس نے خود اپنے دل کی گہرائیوں تک محسوس کی —— ایک لمحے کو اُس نے خود کو اندر سے ٹوٹتا ہوا محسوس کر رہ گئی —— اُس کی دل کی ایک ایک دھڑکن شہباز کے حق میں فیصلہ دے رہی تھی —— پہلی بار اُس نے چاہا کہ دل کی دھڑکنوں کو قوتِ گویائی عطا کر دے —— اپنا دل چیر کر شہباز کے قدموں میں ڈال دے اور شرم و حیا کی تمام بندشوں کو توڑ کر ایک بار کھل کر کہہ دے کہ —— "ہاں شہباز میں بھی تمہیں دل کی تمام تر گہرائیوں سے ٹوٹ کر چاہتی ہوں —— تم سے محبت کرتی ہوں —— تمہاری پرستش کرتی ہوں —— تم بہت عظیم ہو —— بہت بلند ہو اور —— شاید اسی لئے تمہارے قریب آنے سے گریز کرتی ہوں کہ کہیں میرے حالات تمہیں بھی میری طرح دربدر نہ کر دیں —— میں، جو تنہا ہوں —— بےسہارا ہوں —— جس کا ماضی بہت پیچھے نہ جانے کہاں گم ہو گیا ہے —— جس کا حال ابھی اُس کے اختیار میں نہیں۔ پھر وہ اپنے مستقبل کے بارے میں کیا فیصلہ کر سکتی ہے —— اور —— اپنے محبوب کو اپنے ساتھ تاریک اور گھپ اندھیروں میں کیسے گم کر سکتی ہے —— یہ محبت کی معراج نہیں —— خود غرضی کہلائے گی —— اور ——

اچانک پیچھے سے آتی ہوئی ایک گاڑی شہباز کی کار کے قریب آ کر ایک لمحے کو رکی تو عاشی دھک سے رہ گئی —— ناجیہ کو دیکھ کر وہ مجرم سی بن گئی —— بےگناہ ہونے کے باوجود وہ خود کو چور محسوس کرنے لگی۔ جیسے اُسے رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا گیا ہو

ناجیہ کی خونخوار نظریں اور ان نظروں میں ابلتی ہوئی خون کی سرخیاں دیکھ کر وہ سہم گئی۔ اُسے اپنا وجود کائنات کے ساتھ خلط ملط ہو کر جکڑتا محسوس ہو رہا تھا، جلدی سے اُس نے اپنی نگاہیں چرا لیں۔

ناجیہ کی کار ایک لمحے میں فراٹے بھرتی آگے نکل گئی۔ لیکن عاشی مارے خوف کے پسینے میں شرابور ہو گئی، اُسے اپنے دل کی دھڑکنیں سینے میں کہیں ڈوبتی محسوس ہو رہی تھیں —— اُس کا سر گھوم رہا تھا —— اُس کی نگاہوں کے سامنے گھپ اندھیرے پھیل رہے تھے —— ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے —— یوں جیسے وہ اپنی جگہ منجمد ہو رہی تھی۔

احساس بھی گھپ اندھیروں میں گم ہونے لگا تو اُس نے آہستہ سے اپنا سر پیچھے نشست سے ٹیک دیا —— جانے کیسے سنگدل تھے وہ لمحات جو لپک جھپک کر اُس کی خوشیوں کو روند گئے تھے —— وہ آہستہ آہستہ بےہوشی کی کیفیتوں سے دوچار ہو رہی تھی —— دل تھا کہ ڈوبا جا رہا تھا ——

"عاشی ——"

اُسے شہباز کی آواز کہیں دُور سے آتی سنائی دی —— شہباز اُسے آوازیں دے رہا تھا لیکن پھر اُس کی آواز کی بازگشت بھی اندھیروں میں کہیں ڈوب کر رہ گئی —— !!

محمود حسین کے پاس آج چونکہ زیادہ کام نہیں تھا اس لئے جلد ہی دفتر سے اُٹھ کر شائستہ بیگم کی طرف آ گئے۔ ناجیہ اور فراز کے رشتے کے علاوہ آج وہ عاشی کے سلسلے میں بھی گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ انھیں بتانا چاہتے تھے کہ عاشی کے سلسلے میں اُن کا قیاس غلط ثابت نہیں ہوا۔ وہ اپنی زندگی کے اس اہم راز کو شائستہ بیگم کے ساتھ بانٹنا چاہتے تھے ـــــ انھیں اپنا ہم راز بنانا چاہتے تھے۔ اس لئے کہ وہی فائزہ اور محمود حسین کی شادی کے راز سے بھی واقف تھیں۔

ایک راز ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو چکا تھا ـــــ

جس کی یادیں ابھی تک محمود حسین کے دل کے نہاں خانوں میں محفوظ تھیں۔

اور ـــــ

دوسرا راز عاشی کے خوبصورت، نازک اور کومل وجود کی صورت میں ظاہر ہوا تھا۔

اس راز نے محمود حسین کے ماضی کو کرید کر دوبارہ تازہ کر دیا ـــــ

دبی دبی چنگاریاں ہوا پا کر از سرِ نو سلگ اٹھی تھیں۔

آہستہ آہستہ بھڑک رہی تھیں ـــــ

اور ـــــ

محمود حسین کی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد شائستہ بیگم کو عاشی کے راز سے آگاہ کر دیں۔

یہ بتا دیں کہ عاشی کوئی غیر نہیں ـــــ

اُن کے اپنے وجود کا ایک گم شدہ حصہ ہے ـــــ

ایک بھولی بسری یاد جسے ممدو کی موت نے حقیقت کا رُوپ دے کر ـــــ

خوشیوں اور مسرتوں کے خزانے بنا کر محمود حسین کی جھولی میں ڈال دیا ہے ـــــ

وہ کوئی غیر نہیں ـــــ

اجنبی نہیں ـــــ

ان کی اپنی بیٹی تھی ـــــ فائزہ کی نشانی ـــــ اور

محمود حسین ماضی کی داستان کو دوبارہ نہیں دہرانا چاہتے تھے کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہ تھا ـــــ

اگر خدانخواستہ ان کی آنکھ بند ہو جاتی تو عاشی بھی اپنی حرماں نصیب ماں کی طرح حالات اور زمانے کا شکار ہو سکتی تھی ـــــ

اس لئے ـــــ

وہ عاشی کی حقیقت کو دوسروں پر بھی افشا کر دینے کے لئے بے چین تھے ـــــ

عاشی ـــــ

جو ماں کی شفقتوں سے محروم ہو چکی تھی ـــــ

محمود حسین کی آرزو تھی کہ شمسہ بیگم بھی عاشی کو ماں کا پیار دیں ـــــ

وہ ناجیہ کو بھی باور کرانا چاہتے تھے کہ عاشی اُس کی بڑی بہن ہے ـــــ

لیکن ـــــ

وقت اور حالات نے محمود حسین کو بزدل بنا دیا تھا ـــــ عدالت کے روبرو کھڑے ہو کر وہ بڑے بڑے خطرناک اور سنگین مقدموں میں اپنے موکل کی پیروی بڑے جوش و خروش سے کرتے ـــــ ججوں کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر ٹھوس دلائل پیش کرتے اور حقیقت کو حقیقت کہنے سے کبھی دریغ نہ کرتے ـــــ

مگر ـــــ آج جب بات خود اُن کے مقدمے کی آئی تو اُن کے قدم ڈگمگا گئے ـــــ وہ از خود اپنے مقدمے کی پیروی سے گریز کر رہے تھے ـــــ کترا رہے تھے شاید اس لئے کہ انھیں اپنی ایک ذرا سی غلطی کا بڑی شدت سے احساس ہو چلا تھا ـــــ اگر انھوں نے شادی کے بعد شمسہ بیگم کے سامنے اپنے ماضی کی ایک زندہ حقیقت کا اظہار کر کے انھیں اپنے اعتماد میں لے لیا ہوتا تو آج وقت انھیں یوں بزدل نہ بناتا

اور اسی لئے وہ شائستہ بیگم کو اپنا وکیل بنانا چاہتے تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ جتنی جلد ممکن ہو عاشی کو اُن کی بیٹی کی حیثیت سے قبول کر لیا جائے اور پھر عاشی کو وہ پیار ـــــ وہ محبت دے سکیں جو عاشی کا جائز حق تھا اور شاید اس طرح وہ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا کفارہ بھی ادا کرنا چاہتے تھے جو فائزہ کے حق میں اُن سے نادانستگی میں بحالتِ مجبوری سرزد ہو چکی تھیں۔

اپنے خیالوں میں محو جب وہ شائستہ بیگم کے سامنے گئے تو وہ ورانڈے میں بیٹھی کرمن سے باتیں کر رہی تھیں ـــــ محمود حسین کو دیکھا تو خوشی سے نہال ہو گئیں، بڑی گرمجوشی سے اُٹھ کر اُن کا استقبال کیا اور ہاتھ پکڑ کر مختصر سے ڈرائنگ رُوم میں لے آئیں۔

کچھ دیر تک محمود حسین اور شائستہ بیگم کے درمیان فراز کی تعلیم کے سلسلے میں گفتگو ہوتی رہی۔ پھر شائستہ بیگم نے محمود حسین کے چہرے کی سنجیدگی کو مسکراتی نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے مطلب کی بات چھیڑ دی۔

"میں کل شمسہ سے ملنے گئی تھی۔"

"مجھے علم ہے ـــــ" محمود حسین سنبھل کر بولے۔

"شمسہ نے تمہیں یہ بھی بتایا ہوگا کہ ہمارے درمیان کیا باتیں ہوئی تھیں؟"

"جی ہاں ـــــ"

"پھر ـــــ تم کس سوچ میں گم ہو۔" شائستہ بیگم نے جلدی سے پوچھا "کیا تمہیں میرا فیصلہ منظور نہیں؟"

"آپ نے یہ کیسے تصور کر لیا کہ میں فراز کے مستقبل کی خوشیوں میں شریک نہ ہوں گا؟"

"گویا تمہیں یہ رشتہ منظور ہے ـــــ" شائستہ بیگم نے پہلو بدل کر دریافت کیا۔ اُن کے چہرے پر ممتا کا نور کچھ اور گہرا ہو گیا۔

"جی ہاں، مجھے اور شمسہ کو یہ رشتہ جی جان سے منظور ہے ـــــ لیکن؟"

"لیکن کیا ـــــ" شائستہ بیگم نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ محمود حسین کی اچانک خاموشی نے ایک ماں کے دل کی دھڑکنوں میں جوار بھاٹے کی کیفیت پیدا کر دی۔

"آپ ہمارے حالات سے بخوبی واقف ہیں۔" محمود حسین ایک سرد آہ بھر کر بولے "امی حضور کو خدا جنت نصیب کرے ـــــ لیکن انھوں نے ناجیہ کی تربیت جس انداز میں کی ہے اُس نے ناجیہ کو بے حد خود سر، ضدی اور بے باک بنا دیا ہے۔ اُس کی نگاہوں میں اپنے سوا کسی اور کی کوئی حیثیت نہیں ـــــ آپ کو شاید معلوم ہو کہ ناجیہ نے میڈیکل میں داخلہ منع کرنے کے باوجود اپنی سالگرہ کی تقریب ایک ہوٹل میں ایسے وقت پر کی جب ممدو کے چالیسویں میں چند دن باقی رہ گئے تھے ـــــ"

"میں ناجیہ کی طبیعت اور اُس کی تربیت سے بخوبی واقف ہوں لیکن ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔" شائستہ بیگم نے ناجیہ کی حمایت کرتے ہوئے کہا "ابھی تو اُس کے کھیلنے کودنے کے دن ہیں ـــــ جب عملی زندگی میں قدم رکھے گی ذمہ داریوں کا بوجھ سر پر پڑے گا تو حالات خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا لیکن ـــــ" محمود حسین ایک لمحے کو خاموش ہوئے پھر دبی زبان میں بولے "شمسہ

نے عاشی کے ذریعے ناجیہ کی مرضی فراز کے سلسلے میں دریافت کرائی تھی ——"

"پھر ——" شائستہ بیگم نے تیزی سے پوچھا۔

"ناجیہ نے کھل کر اس رشتے کی مخالفت کی ہے —— اُس کا کہنا ہے کہ وہ فراز کو ہر اعتبار سے پسند کرتی ہے لیکن اپنی زندگی کا ہم سفر نہیں بنا سکتی۔"

"ہو سکتا ہے ناجیہ نے عاشی سے مذاق کیا ہو ——" شائستہ بیگم نے دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے اظہارِ خیال کیا ——

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" محمود حسین بولے۔ "میں نے شمسہ سے کہا ہے کہ وہ کسی مناسب موقع پر از خود ناجیہ کو کریدنے کی کوشش کرے۔"

"اور تم اتنی سی بات پر آزردہ خاطر ہو گئے۔"

"بات میری پریشانی سے زیادہ ناجیہ کے مستقبل کی ہے۔" محمود حسین نے بہن کی دلجوئی کا اثر لیتے ہوئے کہا۔ "آج اگر وہ فراز جیسے ہیرے کو اپنے مستقبل کا محافظ بنانے سے انکار کر سکتی ہے تو کل اپنی مرضی سے کسی پتھر کا انتخاب بھی کر لے گی —— کیا آپ ایک بزرگ کی حیثیت سے ناجیہ کے کسی غلط فیصلے کو تسلیم کر لیں گی۔"

کریمن چائے کی ٹرالی گھسیٹتی اندر داخل ہوئی تو گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کے لئے منقطع ہو گیا۔

شائستہ بیگم کو خود بھی ناجیہ کا فیصلہ سن کر ملال ہوا مگر وہ محمود حسین کی کیفیت بھی محسوس کر رہی تھیں آج ایک طویل مدت کے بعد انھوں نے محمود حسین کو پھر جذباتی انداز میں پریشان پریشان سا محسوس کیا تھا چنانچہ انھوں نے فراز اور ناجیہ کے رشتے کے سلسلے میں مزید کوئی بات کرنی مناسب نہیں سمجھی —— چائے بنا کر پیش کی پھر کریمن کے جانے کے بعد بولیں

"میری مانو تو تم بھی اس سلسلے میں کچھ دنوں کے لئے خاموش ہو جاؤ —— مجھے یقین ہے کہ وقت اور زندگی کے تجربے ناجیہ کی طفلانہ طبیعت کو سُدھارنے اور سنوارنے میں ضرور معاونت کریں گے۔"

"شمسہ کو ان باتوں سے شدید صدمہ پہنچا ہے —— شاید اس لئے کہ اُس نے فراز کا انتخاب بہت پہلے سے کر لیا تھا۔"

"مایوسی گناہ ہے ——" شائستہ بیگم نے کہا "خدا پر بھروسہ رکھو —— وہ جو کرتا ہے اُس میں انسان کی کوئی نہ کوئی بہتری ضرور مضمر ہوتی ہے ——"

"ممدو کی موت کے بعد سے ناجیہ کا برتاؤ عاشی کے ساتھ بھی کچھ نامناسب ہو گیا ہے۔" محمود حسین نے چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے آہستہ سے کہا —— "وہ عاشی کو اپنے مقابلے میں بے حد حقیر اور نہایت کم تر سمجھتی ہے۔"

"میں اسے کبھی ناجیہ کا بچپنا اور نادانی کہوں گی ورنہ عاشی تو اپنی ذات کے اندر بے مثال کردار کی مالک ہے۔"

شائستہ بیگم نے ایک بار پھر ناجیہ کی طرف داری کی پھر کچھ سوچ کر بولیں "عاشی کے بارے میں مزید کچھ پتہ چلا ——"

"کیا مطلب ——" محمود حسین چونک اٹھے۔

"شمسہ بتا رہی تھیں کہ رحیمو بھی اُس کا باپ نہیں ——"

"ٹھیک کہا ہے شمسہ نے۔" محمود حسین ٹھوس آواز میں بولے پھر اُٹھ کر ٹہلنے لگے۔

اُن کے چہرے پر اضطراب اور بے چینی کی ملی جلی کیفیتیں پھیل کر گہری ہوتی جا رہی تھیں، شائستہ بیگم کچھ دیر تک خاموش تماشائی بنی بیٹھی رہیں پھر دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

"کیا تم نے عاشی کے بارے میں کچھ معلوم کیا ہے۔"

"اس کی نوبت نہیں آ سکی۔" محمود حسین تھکے تھکے لہجے میں بولے پھر خود کو ایک صوفے پر گراتے ہوئے کہا "عاشی کی شناخت اور اُس کی پہچان اُس کی ماں نے کرا دی ہے ——"

"کون ہے اُس کی ماں —— کہاں ہے وہ۔"

"وہ بدنصیب اس دنیا میں نہیں رہی لیکن اپنی زندگی کی المناک داستان کو اُس وفا شعار عورت نے ایک ڈائری کی شکل میں محفوظ کر لیا تھا اور وہ ڈائری ممدو نے مرتے وقت ایک امانت سمجھ کر میرے حوالے کر دی۔"

محمود حسین کی آواز میں دنیا جہان کا کرب موجود تھا

"کون تھی —— وہ ——"

"فائزہ ——" محمود حسین تڑپ کر بولے "اُس بدنصیب کا نام فائزہ تھا ——"

"فائزہ ——" شائستہ بیگم نے آہستہ سے کہا پھر اپنا نچلا ہونٹ سختی سے دانتوں تلے بھینچ لیا۔

"مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ عاشی کوئی غیر نہیں ——" محمود حسین نے جیب سے رومال نکال کر اپنے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے درد بھری آواز میں کہا —— "وہ —— میری بیٹی ہے —— فائزہ کی جیتی جاگتی تصویر ——"

"کیا عاشی کو بھی اس بات کا علم ہو گیا کہ تم ——"

"نہیں ——" محمود حسین بھرائی ہوئی آواز میں بولے "وہ غریب ابھی تک اس راز سے ناواقف ہے۔"

"اور شمسہ ——"

"میں نے ابھی تک شمسہ کو بھی کچھ نہیں بتایا لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس حقیقت کی نقاب کشائی جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے —— اس لئے کہ میں عاشی کو اُس کا وہ مقام دینا چاہتا ہوں جس کی وہ مستحق ہے —— بجا طور پر حق دار ہے۔"

"تم بھی حق بجانب ہو لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو —— کیا عاشی کی حقیقت کا انکشاف تمہارے گھریلو ماحول اور تمہاری اپنی زندگی پر اثر انداز نہ ہوگا ——" شائستہ بیگم نے دبی زبان میں مشورہ دیا "میرا خیال ہے کہ ——"

"نہیں آپا نہیں ——" محمود حسین تڑپ اُٹھے "مجھے کوئی ایسا مشورہ مت دینا جو میری عاشی کو مزید محرومیوں سے دوچار کر دے —— میں اب کسی قیمت پر اس کی حق تلفی نہیں ہونے دوں گا —— یہ سراسر ظلم ہوگا —— زیادتی ہوگی —— اس لئے کہ اگر کوئی غلط سرزد ہوئی ہے تو اس کا ارتکاب میں نے کیا تھا —— مجرم میں ہوں تو پھر سزا غریب عاشی کو کیوں ملے —— میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا۔"

"میں تمہاری کیفیت کا اندازہ لگا رہی ہوں۔" شائستہ بیگم بولیں "تمہارے غم میں برابر کی شریک ہوں اور اس بات کی گواہ بھی کہ تم نے کوئی جرم نہیں کیا —— مجھے اس بات کی بھی قوی اُمید ہے کہ شمسہ تمہاری عاشی کو دل و جان سے قبول کر لے گی لیکن ——"

شائستہ بیگم کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئیں تو محمود حسین نے زہر خند سے کہا

"میں آپ کی خاموشی کا مطلب سمجھ گیا —— آپ غالباً مجھے ناجیہ کے خطرے سے آگاہ کرنا چاہتی ہیں —— اس کا ڈر مجھے بھی ہے کہ وہ عاشی کی برابری اور اُس کی بڑائی کو کبھی تسلیم نہیں کرے گی —— مگر صرف ایک ناجیہ کی وجہ سے عاشی کے وجود اور اُس کی حقیقت سے انکار کبھی نہیں کیا جا سکتا ——"

"پھر —— تم نے کیا سوچا ہے ——"

"میں چاہتا ہوں کہ آپ کوئی موقع دیکھ کر پہلی فرصت میں شمسہ کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیں ——"

"کیا یہ مناسب ہوگا —— میرا مطلب ہے کہ اگر تم خود شمسہ کو پیار سے سب کچھ بتا دو تو زیادہ بہتر ہوگا۔"

"میں اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکوں گا آپا ——" محمود حسین نے گلوگیر لہجے میں کہا "اسی لئے میں آپ کے پاس یہ درخواست لے کر آیا ہوں کہ عاشی کے سلسلے میں آپ میری وکالت کے فرائض انجام دیں —— باقی تمام ذمہ داریاں میں سنبھال لوں گا۔"

شائستہ بیگم نے اقرار میں گردن کو جنبش دی پھر بولیں

"عاشی کو کون بتائے گا کہ تم اُس کے باپ ہو۔"

"یہ خونگوار فرض میں خود انجام دوں گا ——"

"جیسی تمہاری خوشی ——"

"میری خوشی ——" محمود حسین کی پلکوں کی اوٹ میں چھپے آنسو ایک بار پھر بہہ نکلے کچھ توقف کے بعد بولے "میری خوشی تو میری کوتاہیوں اور امی حضور کی ضد کے سبب نہ جانے کب کی دفن ہو چکی ہے —— اب تو

اس خوشی کی ایک یادگار باقی ہے جس کی خوشی کی خاطر ہمیں قربانیاں دینی ہیں۔"

"دل چھوٹا نہ کرو محمود ——— خدا بہتر کرے گا، وہ بہتر کرے گا۔"

محمود حسین نے شائستہ بیگم کے سامنے اپنے دل کا بوجھ اُتارا تو طبیعت پر طاری گرانی کچھ کم ہوگئی۔ لیکن عاشی کے مستقبل کا خیال اب بھی اُن کے دامن گیر تھا ———

عاشی ———

جو معصوم تھی ——— سرنگوں رہنے کی عادی تھی ———

جو مظلوم تھی ——— اور مہر لب ———

بے قصور تھی ——— اور ———

بجا طور پر ہمدردیوں اور حمایتوں کی مستحق تھی ——— !!

کمرے میں قدموں کی آہٹ اُبھری تو وہ بڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی، شمسہ بیگم قریب کھڑی اُسے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ایک لمحہ کو اُس کا ذہن چکرا کر رہ گیا۔

وہ صبح امتحان دینے گئی تھی ——— اُس کا پرچہ نہایت شاندار ہوا تھا پھر واپسی میں حسب معمول وہ شہباز کے ساتھ تھی ——— شہباز کی میٹھی میٹھی باتیں اُس کے کانوں میں رس گھول رہی تھیں۔ وہ اُس کے اشارے پر عمر قید کی سزا بھگتنے کو تیار تھا لیکن ———

دو خونخوار آنکھیں اچانک اُس کی مستیوں کے درمیان آگئیں۔ ناجیہ نے شاید ان دونوں کا تعاقب کیا تھا پھر وہ اُسے قہر آلود نظروں سے گھورتی چل گئی تھی اور ———

عاشی کو گزری باتیں یاد آئیں تو وہ محجوب سی ہوگئی، اُسے بس اتنا یاد تھا کہ ناجیہ کے خون سے اُس پر غنودگی کا غلبہ طاری ہوگیا تھا ——— وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگئی تھی۔

پھر ———

اُسے گھر تک کون لایا ——— ؟

شہباز ——— ؟؟

اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں، اِس خیال سے کہ نہ جانے شہباز نے اس کے بارے میں کیا کہا ہوا اور ناجیہ نے اُس کی اور شہباز کی ملاقات کو کیا رنگ دیا ہو، وہ اندر ہی اندر کانپ اٹھی، ایک چور نظر شمسہ بیگم پر ڈالی پھر نگاہیں جھکا لیں

"اب تمہاری کیسی طبیعت ہے عاشی بیٹی ؟"

"جی ——— اب تو ٹھیک ہوں۔" شمسہ بیگم کے لہجے میں اپنائیت محسوس کر کے وہ آہستہ سے بولی۔

"میں ——— میں شاید بیہوش ہوگئی تھی۔"

"ہاں ———" شمسہ بیگم نے نرم لہجے میں شفقت کا اظہار کیا "خدا کا شکر ہے کہ شہباز تمہیں مل گئے۔ وہی تمہیں لائے تھے ——— خدا جانتا ہے کہ تمہاری حالت دیکھ کر تو میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا تھا، مگر ڈاکٹر کا خیال ہے کہ معمولی تکان ہے، کچھ دیر آرام کرنے سے طبیعت بحال ہوجائے گی۔"

اُس نے دستی گھڑی پر نظر ڈالی، شام کے چار بج رہے تھے ——— گویا وہ تین گھنٹے تک بیہوش رہی تھی اور اس عرصے میں ڈاکٹر اُس کا معائنہ بھی کر گیا۔

"تمہارا پرچہ تو ٹھیک ہوا ہے۔" شمسہ بیگم نے محبت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دریافت کیا تو وہ دھیمے سے مسکرا دی۔

"خدا کا شکر اور آپ کی دعائیں ہیں۔" اُس نے آہستہ سے جواب دیا پھر ڈرتے ڈرتے پوچھا "ناجیہ ——— ناجیہ کہاں ہے ——— اُس کا پرچہ کیسا ہوا ؟"

"ٹھیک ہوگیا۔" شمسہ بیگم بولیں "اُس نے تو یہی بتایا ہے ——— ابھی کچھ دیر پہلے فرحت کی طرف گئی ہے۔"

شہزاد جوس کا گلاس لے کمرے میں داخل ہوا، شمسہ بیگم نے اصرار کر کے اُسے موسمی کا رس پلایا پھر آرام کی تاکید کر کے باہر چلی گئیں تو عاشی اپنی بیہوشی کے بارے میں سوچنے لگی ———

نہ جانے شہباز نے اُس کی بیہوشی کے بارے میں گھر والوں کو کیا بتایا تھا ——— شمسہ بیگم کی باتوں سے اُس نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ شہباز نے کوئی کہانی بنا کر سُنائی ہے ——— وہ اتفاقاً اُس سے راستے میں مل گیا تھا اور پھر ———

وہ آہستہ سے بستر سے اٹھی، ذہن پر ابھی تک غنودگی کا بوجھل بوجھل احساس طاری تھا، تکان دُور کرنے کی خاطر وہ غسل خانے میں چلی گئی، نہا دھو کر واپس آئی تو طبیعت کا بھاری پن دُور ہوگیا۔ ہلکے آسمانی رنگ کا شلوار سوٹ پہن کر وہ بال سنوارنے کی خاطر آئینے کے سامنے گئی تو اپنے آپ کو دیکھ کر شرما سی گئی ——— ایک شوخ سے سوٹ نے اُسے گدگدایا ——— وہ یہ سوچ کر آپ ہی آپ لجا گئی تھی کہ شہباز نے اُسے ہوش میں لانے کی خاطر آوازیں بھی دی ہوں گی ——— بازو تھام کر اُسے آہستہ سے جھنجھوڑا بھی ہوگا۔

پھر ———

اُسے اس کے کمرے تک لانے کی خاطر یقیناً اُس کے حسین وجود کو اپنے آہنی بازوؤں کے حصار میں بھی لیا ہوگا ——— اور اگر ——— عین اس وقت اُسے ہوش آجاتا تو ———

وہ جلدی سے آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی، جانے کیسا احساس تھا جو اُسے رہ رہ کر گدگدا رہا تھا ——— وہ دیر تک یوں ہی خاموش کھڑی اپنے خیالوں میں گم رہی پھر برش سے الجھے بالوں کو سلجھا کر ہلکا سا رین باندھا اور کیاری سے گزر کر ——— لان پر آگئی جہاں خنک ہوا کے عطر بیز جھونکے ادھ کھلی کلیوں کو چھیڑ رہے تھے۔

وہ آہستہ آہستہ سبزے پر چہل قدمی کرنے لگی اور خود کو ناجیہ سے ہمکلام ہونے کی خاطر اکساتی رہی ——— وہ ناجیہ کی طبیعت سے بخوبی واقف تھی ——— وہ جانتی تھی کہ ناجیہ کبھی چپکی نہ بیٹھے گی ——— شہباز اور اُس کی ملاقات کو ضرور کوئی نہ کوئی رنگ دے گی ——— اور اُسے اُس کی نظروں میں گرانے کی کوشش کرے گی۔

لیکن ———

عاشی نے طے کر لیا تھا کہ وہ ناجیہ کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر اُس کا سامنا کرے گی ——— شہباز بھی غیر بھی نہیں تھا ——— ممدو کی بیماری کے وقت تو اُس نے اپنوں سے بڑھ کر اُس کا ساتھ دیا تھا ——— ساری ساری رات پلکوں تلے گزار کر وہ ممدو کی تیمارداری اور عاشی کی دلجوئی میں لگا رہتا ——— کس قدر بے لوث اور غمگسار طبیعت کا مالک تھا۔

اور ———

اگر اُس نے عاشی کو چاہا تھا ——— پسند کیا تھا ——— اپنانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا تو یہ جرم کیا تھا ——— ؟ کونسا گناہ کیا تھا ——— ؟

محبت تو ایک پاک جذبے کا نام ہے ———

عبادت ہے ———

پرستش ہے ———

محبت ہی تو وہ عظیم جذبہ ہے جو انسان کو انسانیت کا درس دیتا ہے ———

اپنی شناخت کے طور طریقے سمجھاتا ہے ———

خدا سے روشناس کراتا ہے ———

اور محبت اگر سچی ہو تو لازوال ہوجاتی ہے ———

اُس کی بلندیوں کو کوئی اور جذبہ نہیں چھو سکتا ———

محبت کی معراج ہی نے تو ایک خاکی انسان کو فرش سے اٹھا کر عرش کی بلندیوں تک پہنچا دیا تھا۔

اگر محبت نہ ہوتی تو پھر یہ کائنات اتنی خوبصورت ———

اتنی حسین ——— اتنی رنگین کبھی نہ ہوتی ———

ریگستانوں میں نخلستانوں کا وجود کوئی اہمیت نہ رکھتا ——
انسانوں اور جانوروں میں بھلا کیا فرق باقی رہتا ——

ابھی وہ خود کو آنے والے طوفانوں سے مقابلے کے لئے تیار کر رہی تھی کہ ناجیہ کی آواز اُس کے کانوں میں گونجی اور پل بھر میں وہ ریت پر بنے کسی محل کی طرح ایک ہی جھٹکے سے مسمار ہو کر رہ گئی۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے پلٹ کر دیکھا، ناجیہ اُس کے سامنے کھڑی اُسے قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ان نگاہوں میں نفرت تھی —— حقارت تھی —— انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے —— کدورتیں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔

"کیسا ہوا آج کا پرچہ ——" ناجیہ نے تلخ لہجے میں اُسے گھورتے ہوئے پوچھا پھر تیزی سے بولی "میرا خیال ہے کہ تمہیں اپنی کامیابی کی پوری پوری اُمید ہوگی"

"ہاں ——" اُس نے خود کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا "میں خدا کی ذات سے ناامید نہیں ہوں"

"شہباز کے بارے میں کیا خیال ہے" ناجیہ نے آسمان کی بلندیوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے زہر خند سے پوچھا "کیا وہ بھی کامیابی کے خواب دیکھ رہا ہے ——"

"میں —— تمہارا مطلب نہیں سمجھی" عاشی نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔

"میرا مطلب بہت آسان اور واضح ہے —— خاک کے حقیر ذرّے طوفانوں کی شہ پاکر اپنا مقام چھوڑ کر بلندیوں کی جانب ضرور اُٹھتے ہیں لیکن آسمان تک کبھی نہیں پہنچتے —— تھک ہار کر دوبارہ پستیوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں"

"ناجیہ —— تم —— مجھے غلط سمجھ رہی ہو" اُس نے ہاتھ ملتے ہوئے جواب دیا "میں نے آسمان کی بلندیوں کو چھونے کی کوشش کبھی نہیں کی —— میں —— اپنی حیثیت کو پہچانتی ہوں"

"پھر ——" ناجیہ تنک کر بولی "تم نے شہباز کی گاڑی میں بیٹھنے کی جسارت کیسے کر ڈالی"

"وہ —— شہباز نے مجھے مجبور کیا تھا" وہ بے بسی سے بولی۔

"تم انکار کر سکتی تھیں ——"

"کیا تھا میں نے انکار لیکن شہباز کے خلوص اور اُس کے اصرار نے مجبور کر دیا"

"کیا تمہیں شہباز کے مقابلے میں اپنی حیثیت کا اندازہ ہے" ناجیہ نے نفرت سے سوال کیا۔

"میں اپنے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوں" وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

"ممی اور ڈیڈی نے تمہیں بہت زیادہ سر چڑھا رکھا ہے لیکن میں ——" ناجیہ کچھ کہتے کہتے رک گئی پھر تلملا کر بولی "میں تمہارا اور شہباز کا میل جول پسند نہیں کرتی ——"

عاشی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گم صم خاموش کھڑی اپنے دل کی دھڑکنوں کا شمار کرتی رہی۔

"میں —— میں شہباز کو پسند کرتی ہوں اس لئے بہتر ہوگا کہ تم میرے راستے سے دُور ہو جاؤ ——"

عاشی کے دل کو ایک دھچکا سا لگا —— کوئی شے اُس کے وجود کے نہاں خانوں میں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی —— اُسے اپنی قوتِ سماعت پر شبہ ہو رہا تھا —— کل تک ناجیہ اور عدیل کے چرچے عام تھے اور آج —— آج وہ کس قدر ڈھٹائی سے بیباکی سے شہباز سے اپنی محبت کا اظہار کر رہی تھی۔

"کچھ سنا تم نے —— میں کیا کہہ رہی ہوں" ناجیہ نے عاشی کی خاموشی سے الجھتے ہوئے قدرے بلند آواز میں کہا "میں —— شہباز کو پسند کرتی ہوں اس لئے تم اپنے حقیر وجود کو ہمارے درمیان سے علیحدہ کر لو ——"

"ناجیہ ——" عاشی نے نظریں اُٹھا کر ناجیہ کو بہت غور سے دیکھا، سپاٹ لہجے میں بولی "تم نے یہ کیسے محسوس کر لیا کہ میں تمہارے اور شہباز کے راستے میں حائل ہو رہی ہوں"

"پھر تمہارا اور شہباز کا ربط اور میل جول کیا معنی رکھتا ہے" وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔

"یہ غلط ہے ——" عاشی نے تیزی سے جواب دیا "میں نے شہباز سے ربط یا میل جول بڑھانے کی کوشش کبھی نہیں کی"

"گویا شہباز تمہارے حسن پر لٹو ہو رہے ہیں —— کیوں" ناجیہ نے بھڑک کر پوچھا

"اس کا جواب تم براہِ راست شہباز سے طلب کر سکتی ہو" عاشی کا لہجہ ٹھوس ہو گیا۔

"تم جواب دینے سے کیوں گھبرا رہی ہو"

"اس لئے کہ میرے پاس فضول باتوں کا کوئی جواب نہیں ——"

"شہباز کے ساتھ اُس کی گاڑی میں سیر سپاٹے کرنا ——"

"ناجیہ ——" عاشی کا چہرہ اچانک سُرخ ہو گیا "سیدھی سادھی باتوں کو غلط رنگ دینے کی کوشش مت کرو"

"بہت خوب ——" ناجیہ نے نفرت سے پیشانی پر بل ڈال کر کہا "چوری اور اُس پر سینہ زوری"

"میں —— میں تم سے اس موضوع پر مزید کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتی۔ عاشی نے ہاتھ ملتے ہوئے جواب دیا پھر تیزی سے پلٹی اور نہایت پُروقار انداز میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اندر چلی گئی اور ناجیہ —— اُس کے چہرے پر کسی آنے والے طوفان کی خوفناک شدتیں تڑپ رہی تھیں۔

✻——✻

افتخار احمد خود اپنی نگاہوں میں مجرم بن کر رہ گئے تھے۔

ممدو کی موت کی اطلاع اُن کے اُجڑے ہوئے آشیانے پر بجلی بن کر ٹوٹی —— وہ جانتے تھے کہ ممدو کی موت میں جہاں مشیتِ ایزدی کو دخل ہے وہاں راحیلہ خاتون نے بھی اپنا کردار بخوبی انجام دیا ہے۔

افتخار احمد کو اس بات کا بے حد ملال تھا کہ نہ تو وہ ممدو سے مل کر بیوی کی زیادتی کی تلافی کر سکے اور نہ ہی ممدو کی موت پر کھڑے ہو کر دو آنسو بہا سکے۔

اقبال احمد نے جب انھیں ممدو کی موت کی خبر دی تو ایک لمحے کو وہ گنگ ہو گئے۔ یوں جیسے انھیں اپنی قوتِ سماعت پر اندیشہ ہوا ہو —— انھیں فوری طور پر اس اطلاع پر یقین نہیں آسکا، جانے کیوں انھیں اس بات کی توقع نہیں تھی کہ ممدو اتنی جلدی زندگی سے یوں اچانک اور خاموشی سے منہ موڑ لے گا۔

ابھی تو ممدو کی زندگی کا مقصد ادھورا تھا ——
اس جہاد کی تکمیل باقی تھی جو ممدو نے ایک ننھی سی جان کی خاطر کیا تھا ——
اسی جدوجہد کی خاطر تو وہ ایک بار پہلے بھی موت سے ٹکرا چکا تھا ——
اُس نے شکست تسلیم نہیں کی تھی ——
قدرت نے اس عظمت کو زندگی عطا کر دی ——
وہ صحت مند ہو کر ہسپتال سے واپس لوٹا تھا ——
لیکن ——
وہ صدمہ بیماری کا تھا جسے ممدو آسانی سے جھیل گیا۔
اُس نے موت کی اذیتناک گھڑیوں کو ہنس ہنس کر کاٹا تھا۔
فنا اور بقا کی اُس جنگ میں وہ سُرخرو ہو گیا۔
مگر ——
جب اپنوں نے اُس کی بلندیوں کو پستی سے تعبیر کیا۔
اُس کی عظمتوں پر کیچڑ اچھالی —— اور ——
اُس کے اُجلے دامن کو داغدار کیا تو ممدو کے حوصلے ٹوٹ گئے۔
اپنوں کے خون کی سفیدی دیکھ کر اُس کا کلیجہ پھٹ گیا۔
وہ حرفِ شکایت زبان تک نہیں لایا۔
ایک حسرت بھری نظر حالات پر ڈال کر مہر بلب ہو گیا۔
صدموں کی یلغار کو اُس نے اپنے وجود کی وسعتوں کے اندر دفن کر لیا۔
اور پھر ——
نہایت خاموشی سے انسانیت کی معراج پا لینے کی خاطر بلندیوں کی سمت پرواز کر گیا۔
لازوال ہو گیا ——

امر ہو گیا ——

افتخار احمد کو محمود کی موت کا بے حد صدمہ تھا۔ کراچی آنے کے بعد بھی وہ کئی ہفتوں تک اس بات کا فیصلہ نہ کر سکے کہ محمود حسین کی کوٹھی تک جائیں یا نہ جائیں —— حالات کے بھنور میں پھنس کر وہ ذہنی طور پر الجھ گئے تھے، تقدیر نے انھیں جس انداز میں اُن کی کوتاہیوں کی سزا دی تھی وہ بڑی عبرتناک تھی۔

پہلے باپ کا سایہ سر سے اُٹھا —— وہ لاعلم رہے۔

پھر جوان بہن در بدر ہو کر موت سے ہمکنار ہوئی اور انھیں خبر تک نہ ہو سکی۔

دولت کی ہوس اور شہرت کی تلاش نے انھیں ہر جذبے سے بے نیاز کر دیا تھا —— لیکن جب ہوا کا رُخ بدلا تو سرتاپا لرز اُٹھے۔ تصویر کا دوسرا رُخ بڑا بھیانک تھا مگر وہ اپنوں کی جدائی کے صدموں کو برداشت کر گئے، جو کچھ بیت چکا تھا اُس پر کفِ افسوس ملنے سے حاصل بھی کیا تھا ——

افتخار احمد کو اپنی زندگی سے کوئی لگاؤ کوئی تعلق نہیں رہ گیا تھا لیکن جب فائزہ کے آخری خط نے عاشی کے ننھے وجود کی اطلاع دی تو زندگی کی حرارتیں دوبارہ بیدار ہونے لگیں —— وہ عاشی کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے، عاشی کے ذریعے وہ اپنی کوتاہیوں کے بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتے تھے —— ان غلطیوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتے تھے جو زندگی کا ناسور بن کر رہ گئی تھیں، وہ عاشی کو اپنے گھر کی عزت بنا کر بہن کی رُوح کو تسکین پہنچانے کے خواب دیکھ رہے تھے —— لیکن ——

عاشی اُن سے ملی اور مل کر بچھڑ گئی۔ ممدو کی موت نے ایک بار پھر افتخار احمد اور عاشی کے درمیانی فاصلوں کو بڑھا دیا —— عاشی کو اپنی شناخت کرانے کی خاطر انھیں از سرِ نو بہت سے مرحلے طے کرنے تھے اور ——

آج اسی احساس کو سہارا بنا کر وہ محمود حسین کی کوٹھی تک آ گئے —— عاشی کی خاطر وہ اپنی زندگی کی بڑی سے بڑی قربانی دینے کو بھی تیار تھے، وہ عاشی کو اپنے ہمراہ لے جانے کا ارادہ کر کے آئے تھے۔

لیکن ——

تقدیر پھر اُن کے آڑے آ گئی ——

محمود حسین، افتخار احمد کے نام سے ناواقف نہیں تھے، اس رشتے کی نزاکت سے بخوبی واقف تھے جو اُن کے اور افتخار احمد کے درمیان قائم تھا، انھیں یہ بھی علم تھا کہ آج وقت کی رفتار افتخار احمد کو اُن کی دہلیز تک کشاں کشاں کیوں کھینچ لائی ہے —— زندگی کے جس موڑ پر دو بچھڑے ہوئے رشتے مل رہے تھے وہ بڑا ہی مخدوش اور صبر آزما تھا۔

کچھ دیر دونوں کے درمیان رسمی گفتگو ہوتی رہی۔ پھر افتخار احمد نے ہمت کر کے عاشی کا ذکر چھیڑا تو محمود حسین نے انھیں روک دیا —— اُٹھ کر اندر گئے اور فائزہ کی ڈائری لا کر خاموشی سے اُن کے حوالے کر دی۔ افتخار احمد نے ایک نظر محمود حسین کے چہرے پر ڈالی پھر ڈائری کھولی اور ماضی کی بھولی بسری یادوں میں گم ہو کر رہ گئے۔

ڈرائنگ روم میں خاموشی طاری ہو گئی۔

وقت کی رفتار تیز ہو گئی۔

فائزہ کی ڈائری کے اوراق اُلٹتے رہے ——

ماضی کی داستان بے نقاب ہوتی رہی ——

محمود حسین سر جھکائے اپنے خیالوں میں گم صم بیٹھے تھے —— اور

افتخار احمد کے دل کی دھڑکنیں ہر لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھیں ——

پھر ——

خاموشی کا سکوت ٹوٹ گیا ——

افتخار احمد کی دبی دبی سسکیوں نے ہچکیوں کا رنگ اختیار کیا تو محمود حسین کی محویت بھی برقرار نہ رہ سکی انھوں نے چونک کر افتخار احمد کی جانب دیکھا جو دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپائے بچوں کی طرح پھوٹ

پھوٹ کر رو رہے تھے —— بلک رہے تھے ——

"ہمت سے کام لیجئے افتخار صاحب" محمود حسین نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا "عاشی ابھی تک حالات سے لاعلم ہے، اُسے اچانک واقعات کا علم ہوا تو وہ بھی ٹوٹ کر بکھر جائے گی ——"

"ہیں —— ہیں آپ کا گنہگار ہوں محمود بھائی" افتخار احمد بکھرائی ہوئی آواز میں بولے "وقت اور حالات نے مجھے زندگی کے ہر نئے موڑ پر دونوں ہاتھوں سے لوٹا ہے اور آج —— آج میرے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہا۔"

"ہمیں خدا کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ اُس نے عاشی کو ہم سے نہیں چھینا" محمود حسین نے آنکھوں کی نمناک پلکوں کو خشک کرتے ہوئے کہا "وہ ہمارے لئے کسی نعمت سے کم تو نہیں ——"

"آپ بجا فرما رہے ہیں لیکن میں ——"

"جو کچھ ہو چکا ہے اسے بھول جاؤ" محمود حسین نے افتخار احمد کے لہجے میں چھپے درد کو محسوس کرتے ہوئے تیزی سے کہا "خدا جو کچھ کرتا ہے اُس میں انسان کی کوئی نہ کوئی بہتری ضرور ہوتی ہے"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ——" افتخار احمد ایک سرد آہ بھر کر بولے "ہمیں اب صرف عاشی کی خوشیوں پر نظر رکھنی چاہیئے"

"عاشی میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے" محمود حسین نے ٹھوس آواز میں کہا "میں اس کی حفاظت میں کسی کوتاہی یا بخل سے کام نہیں لوں گا ——"

"کیا ناجیہ اور اُس کی ماں کو عاشی کی حیثیت کا علم ہو چکا ہے" افتخار احمد نے تھوڑے توقف کے بعد دبی زبان میں دریافت کیا۔

"جی نہیں —— میں نے آپ کے سوا فائزہ کی ڈائری ابھی تک کسی اور کو نہیں دکھائی"

افتخار احمد نے مزید کسی خدشے کا اظہار نہیں کیا، کچھ دیر خاموش رہے پھر پہلو بدل کر بولے۔

"کیا ممدو نے آپ کو میرے بارے میں کچھ بتایا تھا ——"

"جی نہیں —— موت نے اس غریب کو اتنا موقع ہی نہیں دیا کہ وہ کھل کر اپنے زخموں کی نقاب کشائی کر سکتا"

"اس غریب کی بربادی میں بھی میری بدنصیبی کا ہاتھ شامل رہا ہے ——"

"کیا مطلب ——" محمود حسین چونک کر بولے۔

افتخار احمد نے ایک لمحے تامل کیا پھر عاشی کے سلسلے میں اپنی خواہش اور راحیلہ خاتون کے کردار کی پوری روداد سنا ڈالی ——

محمود حسین خاموشی سے سنتے رہے، افتخار احمد نے اپنی داستان ختم کی تو بولے۔

"قدرت کو شاید یہی منظور تھا ——"

"لیکن میں عاشی کی خاطر سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں" افتخار احمد جذباتی ہو گئے "فائزہ کی روح کو سکون پہنچانے کی خاطر میں اپنی زندگی بھی داؤ پر لگا سکتا ہوں"

"مجھے یقین ہے —— لیکن ابھی ان باتوں کا وقت نہیں آیا اور پھر —— عاشی کے لئے میں بھی تو ہوں"

"خدا آپ کا سایہ عاشی کے سر پر ہمیشہ قائم رکھے ——" افتخار احمد نے گلوگیر لہجے میں کہا

"عاشی کو آپ کے پیار کی بھی ضرورت ہوگی" محمود حسین بڑی اپنائیت سے بولے۔

"کہاں ہے عاشی —— کیا میں اُس سے مل سکتا ہوں" افتخار احمد نے بے چینی کا اظہار کیا۔

"کیوں نہیں ——" محمود حسین بولے "آپ جب چاہیں —— جس وقت چاہیں یہاں آ کر عاشی سے مل سکتے ہیں —— اب آپ غیر تو نہیں —— لیکن میری درخواست ہے کہ ابھی عاشی کو —— کچھ دنوں تک ہماری اصلیت کا علم نہ ہو تو زیادہ مناسب ہوگا ——"

"کیا اس میں کوئی خاص مصلحت ہے ——"

"جی ہاں —— وقت آنے پر آپ کو اس کا بھی اندازہ ہو جائے گا"

"جیسی آپ کی مرضی ——"

"آپ آرام سے بیٹھئے، میں عاشی کو لے کر آتا ہوں"

محمود حسین اُٹھ کر ڈرائنگ روم سے چلے گئے تو افتخار احمد کچھ دیر خلا میں گھورتے رہے پھر اُنھوں نے فائزہ کی ڈائری پر نظر ڈالی جس میں ایک بدنصیب بہن کے مانسی کی پوری داستان رقم تھی ——— ایک ایک لمحہ محفوظ تھا ——— اور

کچھ سوچ کر افتخار احمد نے بہن کی اس آخری یادگار کو اُٹھا کر چوم لیا ——— جذبات میں ہلچل ہوئی تو اُن کی پلکوں پر آنسوؤں کے شبنمی قطرے پھر جھلملانے لگے ——— !!

✱———✱

انتقام کی آگ ابھی تک اُس کے وجود کو جھلسا رہی تھی۔

عاشی نے جس انداز میں اُسے ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا وہ ناجیہ کے لئے قطعی غیر متوقع تھا، اُس نے تو یہ سوچا تھا کہ ممدو کی موت کے بعد عاشی ہر طرح سے اُس کی دسترس میں ہوگی مگر ایسا نہیں ہوا، عاشی نے اُس کی باتوں پر سرنگوں ہونے کے بجائے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو کی تھی پھر پلٹ کر اندر چلی گئی تھی۔

اور ———

ناجیہ کو یوں لگا جیسے پہلی بار وہ اپنے ہی گھر کے اندر غیر سی بن کر رہ گئی ہو ——— اُس نے تو کبھی ماں باپ کے حکم کے آگے بھی جھکنا نہیں سیکھا تھا ——— عاشی تو پھر اُس کی نگاہوں میں غیر تھی ——— ایک غریب مال کی مفلوک الحال زندگی سے وابستہ ایک حقیر ذرّے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔

پھر ———

عاشی کو اتنی جرأت کیونکر ہوئی کہ وہ ناجیہ سے نظریں اُٹھا کر بات کر سکے ——— ؟ کیا ممدو کی موت نے اُس کی زبان پر پڑے قفل توڑ دیئے تھے ——— ؟ وہ اپنے حواسوں میں نہیں رہی تھی ——— ؟ یا شہباز کی محبت کی قوت کا سہارا پا کر وہ شہ زور بن گئی تھی ——— ؟

شہباز ———

یقیناً وہ شہباز کی حمایت ہی تھی جس نے عاشی کے ذہن سے اُس کی حیثیت اور ناجیہ کے مرتبے کا احساس مٹا دیا تھا ——— وہ اپنی اوقات بھول گئی تھی ——— اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھی تھی کہ زندگی کی شاہراہ پر اس کی حیثیت ایک ایسے پتھر سے زیادہ نہیں تھی جسے ٹھوکر مار کر راستے سے دُور کیا جا سکتا تھا ——— ناجیہ نے اپنے طور پر یہی اندازہ لگایا تھا اور اگر وہ چاہتی تو پل بھر میں عاشی کو اپنی دہلیز سے ذلیل و رسوا کر کے نکال سکتی تھی۔

لیکن ———

اُس نے زندگی میں پہلی بار اس جذباتی فیصلے سے گریز کیا ——— وہ شہباز کے سلسلے میں عاشی کے مقابلے میں کسی قیمت پر اپنی شکست تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی ——— اُس نے ہارنا نہیں سیکھا تھا ——— ہاتھ پھیلا کر کچھ مانگنا اُس کی فطرت کے خلاف تھا ———

وہ چھین لینے کی عادی تھی ———

جھپٹ کر قبضہ کر لینا اُس کی فطرت تھی ———

حریف کو زیر کر کے اُس کی بے بسی پر مسکرانا اُس کی سرشت میں داخل تھا ———

امارت کے احساس اور دادی کی تربیت نے اُسے حد درجہ خود سر اور مغرور بنا دیا تھا ———

مگر ———

اُس نے زندگی میں پہلی بار بڑی دور اندیشی سے کام لیا ——— وہ بارود کے دھماکے کی طرح نہیں پھٹی ——— خوفناک آتش فشاں کی طرح اندر ہی اندر سلگتی رہی ——— وہ اگر چاہتی تو پھر کر عاشی کو زیر کر سکتی تھی ——— رسوا کر کے اپنے گھر سے نکال سکتی تھی لیکن وقت اور حالات کا تقاضہ کچھ اور تھا ———

عاشی اگر اُس کی دسترس سے نکل جاتی تو پھر شہباز پر بھی اُس کی گرفت کمزور ہو جاتی ——— دونوں

برملا کھلے عام مل سکتے تھے ——— ناجیہ کو منہ چڑا سکتے تھے اور اسی مصلحت کی بنا پر ناجیہ خون کے گھونٹ پی کر خاموش رہ گئی ——— اُسے ایک مناسب وقت کا انتظار تھا ——— ایسے موقع کی تلاش تھی جو حالات کے دھاروں کا رُخ اُس کی سمت موڑ دیتا!

اُس نے وقتی طور پر عاشی کی گستاخی کو نظر انداز کر دیا لیکن اُسے فراموش نہیں کیا تھا ——— ! اُسے شہباز کے سلسلے میں اپنی سبکی کا احساس بھی ہوا تھا اور اس احساس کو اپنی فہمندی میں بدلنے کی خاطر دل لمحہ بھر چین سے نہیں بیٹھ سکتی تھی ——— ایک آہنی چہار دیواری اور ایک ہی چھت کے نیچے وہ اپنے مقابلے میں کسی اور کی برتری برداشت کر لیتی ——— یہ ناممکن تھا ——— !!

عاشی ——— !

عاشی ——— !!

عاشی ——— !!!

اُس کے ذہن میں عاشی کا نام ہر وقت صدائے بازگشت بن کر گونجتا رہتا ——— عاشی کا تصور اُس کے وجود کے لئے کسی ناسور سے کم نہیں تھا ——— ناسور، جسے ختم کر دینے کے لئے اُسے کسی ایسے نشتر کی تلاش تھی جو نہایت کاری اور تیر بہدف ثابت ہوتا ——— اتنا مؤثر کہ ہر درد کے احساس سے نجات دلا دیتا۔

آج بھی ناجیہ عاشی کے اذیتناک وجود کے احساس سے اُلجھتی ہوئی اپنے بنگلے کے احاطے میں داخل ہوئی تو شہباز کی گاڑی کھڑی دیکھ کر ایک لمحہ کو اُس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی لیکن دوسرے ہی لمحے اُس نے خود کو بڑی خوبصورتی سے سنبھال لیا، نہایت تمکنت سے اپنی کار روش پر کھڑی کر کے نیچے اتری اور پُروقار انداز میں قدم اُٹھاتی اندر داخل ہوئی۔

وہ اُس کی اپنی کوٹھی تھی۔

اپنی ملکیت تھی ——— اپنی جائیداد تھی۔

وہاں پتے پتے پر اُس کی حکمرانی تھی۔

پھر ———

اُسے ڈرکس بات کا ہو سکتا تھا ——— ؟؟

شرفو کی زبانی یہ سُن کر کہ شہباز ڈرائنگ رُوم میں بیٹھا ہے اُس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی جہاں شہباز ایک فریم کے سامنے کھڑا اس میں لگی پینٹنگ کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

ناجیہ دبے قدموں اُس کی پشت پر جا کر رُک گئی۔ شہباز کو اس کی آمد کا ایک ذرا احساس نہ ہوا جانے وہ اس پینٹنگ میں کیا تلاش کر رہا تھا جس میں سورج کو گھنے درختوں کی اوٹ میں ڈوبتے دکھایا گیا تھا درمیان میں ایک بل کھاتی نہر تھی جس کے دونوں اطراف خوبصورت درخت موجود تھے، پس منظر میں ڈوبتے سورج کی کرنوں نے آسمان پر قرمزی رنگ بکھیر دیئے تھے جہاں دودھیا بگلوں کی ایک قطار اپنے نشیمن کی جانب محوِ پرواز نظر آ رہی تھی۔

ناجیہ کچھ دیر تک شہباز کی محویت پر غور کرتی رہی، جانے وہ اس بے جان اور سستی پینٹنگ میں کیا تلاش کر رہا تھا ——— پھر اُسے ماحول پر طاری سکوت میں گھٹن کا احساس ہوا تو چپ نہ رہ سکی۔

"ہیلو ———" اُس نے شہباز کو مخاطب کیا۔

"اوہ ———" شہباز نے پلٹ کر اُسے دیکھتے ہوئے کہا ——— "آپ ———"

"جی ہاں ———" وہ طنز سے بولی "مجھے ناجیہ کہتے ہیں"

"خوشی ہوئی آپ سے مل کر" شہباز مسکرا دیا، اس کا چہرہ کسی اندرونی جذبات کی ترجمانی سے یکسر عاری تھا۔

"اس تصویر میں کیا تلاش کر رہے تھے ———" ناجیہ نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"یوں ہی ———" شہباز نے ایک صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے آہستہ سے کہا "پرندوں کی پرواز کا منظر دیکھ رہا تھا"

"میں کچھ اور سمجھی تھی ——"

"کیا ——"

"شاید آپ ڈوبتے سورج کے خون آلود منظر کی بے بسی محسوس کر رہے تھے" ناجیہ کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز تبسم اُبھر آیا۔

"میں آپ کے خیال کی تردید نہیں کروں گا" شہباز نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "مصوّر نے واقعی اپنے پیغام کو بڑی چابکدستی سے کینوس کے قالب میں اتار دیا ہے ——"

"پیغام ——" ناجیہ چونک اٹھی۔

"جی ہاں ——" شہباز نے فریم کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "ایک نئی اور خوشگوار صبح کا پیغام —— جو ڈوبتے سورج کے عقب سے نمودار ہونے والی ہے"

"بہت خوب ——" ناجیہ زہرخند سے بولی "مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ شاعری بھی کر لیتے ہیں"

"اور دنیا کا ہر شاعر کسی نہ کسی جذبے سے ضرور سرشار ہوتا ہے" شہباز نے بڑی سادگی سے کہا "جذبے صادق نہ ہوں تو کلام کا رنگ بڑا پھیکا پھیکا اور بے اثر سا لگتا ہے ——"

"شعر کا حسن اسی وقت نکھرتا ہے جب اس میں رنج والم کی آمیزش بھی ہو اور ایسے نغمے صرف اسی شاعر کے کلام سے پھوٹتے ہیں جس کا دل چوٹ کھایا ہوا ہو —— زخمی ہو؟" ناجیہ بولی —— "کیا خیال ہے آپ کا ——"

"میں آپ سے متفق ہوں لیکن اس امر کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ہر درد کا درماں ممکن ہے اور ہر زخم کے لئے قدرت نے ایک مرہم بھی بنایا ہے ——" شہباز نے پہلو بدلتے ہوئے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

"چوٹ صرف وہ کھاتے ہیں جو ثابت قدم نہیں ہوتے یا حالات سے خوف زدہ ہو کر منزل سے منہ موڑ لیتے ہیں"

"تناور درخت بڑا مغرور ہوتا ہے لیکن طوفان کی شدّتیں اُسے بھی جڑ سے اکھاڑ پھینکتی ہیں" ناجیہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی "جو چراغ ہوا کی زد پر روشن کئے جائیں وہ بہت جلدی بجھ جاتے ہیں"

"تجربے اور مشاہدے بہرحال ضروری ہیں" شہباز مسکرا دیا "اگر ایسا نہ ہو تو زندگی کی تخلیق کا مقصد فوت ہو جاتا ہے —— آپ جمود اور ٹھہراؤ کو زندگی سے عبارت تو نہیں کر سکتیں"

ناجیہ تلملا کر رہ گئی، کوئی جواب نہ بن پڑا تو مسکرا کر گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے بولی

"آپ غالباً اس وقت ڈیڈی سے ملنے آئے ہیں"

"جی ہاں ——"

"کیا پینا پسند کریں گے؟" ناجیہ نے شوخی سے پوچھا "چائے —— کافی یا شربت"

"جو آپ خوشی سے پلا دیں ——" شہباز نے سادگی سے کہا

"آپ کی یہی باتیں انسان کا دل موہ لیتی ہیں" ناجیہ نے شہباز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک خاص ادا سے جواب دیا پھر شرفو کو بلا کر کافی لانے کا حکم دیا اور باتوں میں مصروف ہو گئی۔

شرفو کافی بنا کر لایا تو ناجیہ نے خود اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے شہباز کو پیش کی۔

"بڑی خوش ذائقہ اور لذیذ کافی تیار کی ہے آپ نے" شہباز نے ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا

"خدا کا شکر ہے کہ آپ کو پسند آگئی" ناجیہ خوشی سے سرشار ہو کر بولی "میں تو سوچ رہی تھی کہ آپ پہلا گھونٹ لینے کے بعد ہی بُرا سا منہ بنا کر کہیں گے —— بڑی تلخ ہے"

"میرا خیال ہے کہ آپ کو میری پسند کا بخوبی اندازہ ہے" شہباز نے ناجیہ کا مفہوم سمجھتے ہوئے بڑی صاف گوئی سے جواب دیا پھر مزید وضاحت کی خاطر کہا "عاشی صاحبہ کا کیا حال ہے —— امتحانوں کے بعد سے نظر نہیں آئیں"

"ممدو کی موت نے اُسے بہت سارے امتحانوں سے دوچار کر دیا ہے" ناجیہ حقارت سے بولی "شاید اسی لئے اُس نے گوشہ نشینی اختیار کر لی"

"وقت اور حالات سے خوف زدہ ہو جانا بزدلی اور کم ہمتی کی علامت ہے" شہباز یکلخت سنجیدہ ہو گیا۔

"انسان کو اپنی ذات پر اعتماد ہو تو کامیابیاں خود آگے بڑھ کر اُس کے قدم چوم لیتی ہیں"

"لیکن جو ازل سے بدنصیب ہو اُس کے لئے ——"

"مس ناجیہ ——" شہباز نے ناجیہ کے جملے کو کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا "پلیز ——"

ناجیہ شہباز کی مداخلت پر تلملا کر رہ گئی، کوئی سخت جواب دینا چاہتی تھی کہ محمود حسین ڈرائنگ میں داخل ہوئے —— شہباز کے ساتھ وہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئی پھر اُس نے وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا، لباس تبدیل کرنے کا بہانہ کر کے ڈرائنگ رُوم سے باہر آگئی ——

اُس کا وجود چتا کی آگ کی مانند تپ رہا تھا —— !!

*

عاشی ——

کوئی غیر نہیں تھی ——

ممدو نے محض اپنے فرض کی ادائیگی کی خاطر اس کی پرورش کی تھی ——

اُس تک کا حق ادا کیا تھا جو اُس نے اسرار احمد کے گھر کھایا تھا ——

پھر ——

انسانیت کی تکمیل کے بعد اُس نے دنیا سے منہ موڑ لیا —— !!

چین سے ابدی نیند سو گیا ——

لیکن مرنے سے پیشتر اُس نے حقدار تک اُس کا حق پہنچا دیا تھا ——

وہ راز جو اُس کے بوڑھے سینے میں عرصۂ دراز سے دفن تھا راحیلہ خاتون کی وجہ سے اُس کی زبان تک آگیا۔

اور ——

ممدو نے مرتے وقت محمود حسین کو بتا دیا کہ عاشی کوئی غیر نہیں ——

اُن کا اپنا خون ہے ——

لہو کا ایک گرم قطرہ جو اُن کے وجود سے علیحدہ ہو گیا تھا ——

لیکن دائم و قائم تھا ——

یہ اور بات تھی کہ وقت اور حالات نے عاشی کی راہوں میں قدم قدم پر کانٹے بکھیر دیئے ——

محرومیوں کی یلغار نے اُسے مایوسی اور بے بسی کا شکار کر دیا ——

وہ خود اپنے وجود میں گھٹ کر —— سمٹ کر مقید ہو گئی ——

تن بتقدیر قسمت کے لکھے کو پورا کرتی رہی ——

اُسے اپنے ماضی —— حال —— اور مستقبل کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا ——

وہ صرف ممدو سے واقف تھی ——

ممدو ——

جس نے اُسے ماں کا پیار اور باپ کی شفقتوں سے نوازا تھا ——

زندگی کی پُرپیچ ڈگر پر انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا تھا ——

زمانے کے سرد و گرم سے آگاہ کیا تھا ——

صبر کرنے کا سبق پڑھایا تھا ——

ضبط کرنے کے انداز سکھائے تھے ——

سیرت کی پاکیزگیوں سے بنا سنوار کر پروان چڑھایا تھا ——

تہذیب اور تمدن کی باریکیوں کو ذہن نشین کرایا تھا ——

مذہب سے روشناس کرایا تھا ——

ایک معصوم پودے کو پال پوس کر بڑا کیا تھا —— پروان چڑھایا تھا ——

اپنے خونِ جگر سے سیراب کر کے تناور درخت کی صورت عطا کر دی تھی ——

عاشی ——

کوئی غیر نہیں تھی ——
محمود حسین کی اپنی بیٹی تھی ——
جس گھر کی دہلیز پر اُس نے ملازموں کی طرح زندگی گزاری تھی وہ دہلیز اُس کی اپنی دہلیز تھی۔
ناجیہ کی طرح وہ بھی محمود حسین کی تمام جائیداد منقولہ و غیر منقولہ میں برابر کی حصہ دار تھی ——
اور ——

جب شائستہ بیگم نے تھم تھم کر شمسہ بیگم کو عاشی کی بدنصیبی اور محمود حسین کی بے بسی اور لے چارگی کی طویل داستان سُنائی تو شمسہ بیگم کو جیسے سکتہ ہو گیا —— حیرت سے آنکھیں پھاڑے وہ شائستہ بیگم کا منہ تکتی رہیں، تصویر حیرت بنی بیٹھی رہیں —— اچانک شوہر کی نجی زندگی کا ایک مکمل باب اُن کے سامنے عیاں ہوا تو کچھ دیر کے لئے وہ گنگ سی ہو گئیں۔

شائستہ بیگم نے موقع محل دیکھ کر بڑی خوبصورتی سے عاشی کا ذکر چھیڑا تھا پھر محمود حسین کے ماضی کے اس حصے کو بھی بے نقاب کر دیا جو آج تک ایک راز بنا رہا تھا

وہ شمسہ بیگم کے چہرے کے تاثرات جانچتے اور بدلتے رنگوں سے اُن کی کیفیت کا اندازہ بھی لگا رہی تھیں چنانچہ جب انھوں نے شمسہ بیگم کو گم صم اور سکتے کی کیفیت سے دوچار دیکھا تو نہایت عقلمندی سے ایک لمبی آہ بھر کر بولیں

" اور اس المناک داستان کا سب سے دردناک پہلو یہ ہے کہ عاشی ابھی تک اس راز سے ناواقف ہے کہ محمود حسین اُس کے لئے کوئی غیر نہیں —— اُس کے سگے باپ ہیں "

" ایسا کیوں ہے ——" شمسہ بیگم نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا " کیا اس راز کو عاشی سے پوشیدہ رکھنے میں بھی کوئی خاص مصلحت ہے "

" میرا خیال ہے کہ محمود اپنی خوشگوار زندگی میں کوئی ہلچل پیدا کرنا نہیں چاہتے "

" میں سمجھی نہیں آپا —— آخر یہ بات کب تک چھپائی جا سکتی ہے "

" اس کا دارومدار تمہاری ذات پر ہے "

" میری ذات پر ——" شمسہ بیگم نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

" ہاں ——" شائستہ بیگم نے ایک سرد آہ لے کر کہا " محمود نہیں چاہتے کہ تمہیں اپنی زندگی کے کسی موڑ پر تنگ دامنی کا احساس ہو —— اسی لئے انھوں نے حالات کا فیصلہ تمہارے اوپر چھوڑ دیا ہے —— اگر تم نے عاشی کو قبول کر لیا تو وہ اسی گھر میں رہے گی ورنہ ——"

" ورنہ کیا ——"

" محمود حسین اُسے کالج کے ہوسٹل میں داخل کرا دیں گے اور جس طرح عاشی کی زندگی کا راز محمود کی حسرتناک موت تک قائم رہا اسی طرح اب یہ راز محمود اپنے سینے میں دفن کر لیں گے —— اُن کا یہی ارادہ ہے "

" لیکن —— غریب عاشی کا کیا قصور ہے جو اسے اتنی بڑی سزا دی جائے "

" اب عاشی کی زندگی اور اُس کے مستقبل کا فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے "

شائستہ بیگم نے جس انداز میں پوری داستان سُنائی تھی اُس نے شمسہ بیگم کی ممتا کو بھی جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا —— وہ خود بھی صاحبِ اولاد تھیں —— ایک دردمند دل کی مالک تھیں اس لئے عاشی کی اصلیت بے نقاب ہو جانے کے باوجود ان کے دل میں نہ تو حسد کا جذبہ بیدار ہوا —— نہ عاشی کے خلاف اُن کے دل میں نفرت اور حقارت کی کوئی چنگاری بھڑکی۔

یوں بھی عاشی اُن کے لئے ناجیہ سے کم نہ تھی —— پھر بھی وہ کچھ دیر تک اپنے خیالوں میں گم بدلتے حالات پر غور کرتی رہیں اس کے بعد پہلو بدل کر بولیں

" آپا —— کیا یہ حقیقت ہے کہ عاشی کی ماں اس دنیا میں نہیں ہے "

" تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں تو اپنی آنکھوں سے فائزہ کی وہ ڈائری پڑھ لو جس میں اُس کی برباد زندگی کی حسرتناک داستان خود اُس کے ہاتھوں سے مرقوم ہے "

" مجھے آپ پر بھروسہ ہے آپا لیکن ——"

" میں تمہاری کیفیت کا اندازہ لگا سکتی ہوں —— دنیا کی کوئی عورت اپنی خوشیوں اور سہاگ میں کسی اور کو حصہ دار نہیں بنا سکتی —— میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ عاشی بالکل بے سہارا ہے " شائستہ بیگم گلوگیر لہجے میں بولیں " ایک ماموں البتہ موجود ہے مگر وہ بھی اپنے حالات کے آگے مجبور ہے "

شمسہ بیگم پھر اپنے وسوسوں میں اُلجھ گئیں —— عاشی سے انھیں بے پناہ محبت تھی، وہ ناجیہ کے مقابلے میں عاشی سے زیادہ پیار کرتی تھیں —— شاید اس لئے کہ عاشی نے کبھی اُن کے حکم سے سرتابی نہیں کی تھی۔ ان کے ہر آرام کا خیال رکھا تھا اور اُن کی خاطر وہ ناجیہ کی سخت سُست بھی برداشت کر لیتی تھی۔

وہ حد درجہ نیک —— ملنسار اور خدمت گزار تھی لیکن وقت نے اچانک ناجیہ اور عاشی کے درمیان جو رشتہ پیدا کر دیا تھا اُس نے شمسہ بیگم کو غور کرنے پر مجبور کر دیا۔

شائستہ بیگم کچھ دیر تک اُن کی خاموشی کو محسوس کرتی رہیں پھر آہستہ سے بولیں

" تمہیں اگر عاشی کے سلسلے میں کوئی پس و پیش ہے تو اپنے ذہن پر زور مت ڈالو —— محمود کو تمہاری خوشیاں بیٹی سے زیادہ عزیز ہیں —— میں کوشش کروں گی کہ جتنی جلدی ممکن ہو عاشی کو کالج کے ہوسٹل میں منتقل کرا دیا جائے "

" نہیں آپا —— نہیں " شمسہ بیگم نے تیزی سے کہا " بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ باپ کے ہوتے ہوئے جوان بیٹی ہوسٹل میں رہے "

" پھر —— تمہارا کیا فیصلہ ہے "

" میں کوشش کروں گی کہ عاشی کو اُس کا کھویا ہوا سکھ چین اور ماں کی ممتا دے سکوں لیکن ——"

" لیکن کیا ——"

" کیا عاشی کبھی مجھے ماں کی حیثیت سے قبول کر لے گی " شمسہ بیگم کی آنکھوں کے گوشے نمناک ہونے لگے۔

" کیسی بات کر رہی ہو ——" شائستہ بیگم بولیں " عاشی غریب تو ازل سے پیار و محبت کی بھوکی ہے، تم نے اُس کے سر پر محبت سے ہاتھ رکھ دیا تو وہ تمام عمر احسانمند رہے گی "

" میں وعدہ کرتی ہوں کہ عاشی کو کبھی ناجیہ سے کم نہ سمجھوں گی " شمسہ بیگم کے اندر کی عورت بیدار ہو گئی، ممتا کے جذبے سے مغلوب ہو کر بولیں " خدا نے چاہا تو اب عاشی کو کبھی محرومیوں کا احساس نہ ہو گا —— میں ناجیہ سے زیادہ اُس کی خوشیوں کا خیال رکھوں گی —— آج سے وہ بھی ناجیہ کی طرح میری بیٹی ہے —— بڑی بیٹی "

" خدا تمہیں خوش رکھے شمسہ "

شائستہ بیگم نے بے اختیار شمسہ بیگم کو گلے لگاتے ہوئے کہا تو اُن کی آواز بھی بھرا گئی اور آنسوؤں کے شبنمی قطرے پلکوں پر جھلملانے لگے —— !!

آسمان پر صبح سے اُودے اُودے بادل منڈلا رہے تھے لہٰذا اُس نے اپنی بوریت دور کرنے کے لئے پکنک کا پروگرام بنا ڈالا۔ فرحت اور ساجدہ کو ساتھ لے کر تمام دن ساحل علاقوں پر گھومتی رہی۔

شام کو واپس لوٹی تو اُس کا موڈ خاصا خوشگوار تھا، ساجدہ کی دلچسپ گفتگو اور فرحت کی چھیڑ چھاڑ میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ رہا۔ ذہن پر طاری سارا غبار چھٹ گیا، وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی یوں جیسے اچانک اُس کے کاندھوں سے کوئی وزنی بوجھ اُتر گیا ہو۔

گاڑی پورٹیکو میں گھسیڑ کر کے وہ گنگناتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ ملازم کو ناشتے کے متعلق ضروری ہدایت دیتی اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ شمسہ بیگم سامنے سے آ گئیں۔ خلاف توقع اس وقت ماں کو سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر اُسے پیار آ گیا، ایک ادا سے بالوں کو جھٹک کر پیچھے اچھالتی وہ ماں کے قریب چلی گئی۔

" خیریت تو ہے ممی —— آپ آج کچھ افسردہ نظر آ رہی ہیں "

شمسہ بیگم نے بیٹی کو حیرت سے دیکھا کچھ سوچ کر بولیں

" خدا کا شکر ہے کہ تمہیں ماں کی افسردگی کا خیال تو آیا ——"

" اوہ نو ممی ـــــ ایسا کبھی کیا" اُس نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بڑے رومانی انداز میں کہا " میں تو آپ سے بے حد پیار کرتی ہوں "

" کہاں سے آرہی ہو "

" ذرا سہیلیوں کے ساتھ تفریح کو گئی تھی ـــــ پلیز ممی! کبھی آپ بھی میرے ساتھ کہیں نکل جایا کریں " وہ بڑے لاڈ سے بولی " گھومنے پھرنے سے صحت اور دل و دماغ پر نہایت خوشگوار اثر پڑتا ہے "

" میں ماں ہوں ناجیہ بیٹی " شمسہ بیگم نے کہا " میرے لئے گھر کی مصروفیات اور تم لوگوں کی دیکھ بھال کا خیال رکھنا ہی سب سے بڑی تفریح ہے ـــــ لیکن تم ابھی بچی ہو ـــــ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گی "

" آپ نے اپنی افسردگی کی وجہ نہیں بتائی " اُس نے اپنی ماں کے بالوں کو اپنی مخروطی انگلیوں سے سنوارتے ہوئے پوچھا " کیا ڈیڈی سے کسی بات پر تکرار ہوگئی "

" نہیں ـــــ "

" پھر ـــــ کیا کسی ملازم کی کمبختی آگئی جو اُس نے آپ کو تنگ کیا ہے "

" اوہو نہہ ـــــ "

" اور کیا بات ہو سکتی ہے ـــــ " ناجیہ نے پُرخیال انداز میں کہا۔

" تم بھی تو اسی گھر کی ایک فرد ہو ـــــ " شمسہ بیگم نے دبی زبان میں جواب دیا۔

" ہوں تو سہی مگر ـــــ " وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی مگر ماں کے چہرے کے تاثرات کو پڑھتے ہوئے بولی۔

" مجھے دال میں کچھ کالا نظر آرہا ہے "

شمسہ بیگم نے ناجیہ کو موڈ میں دیکھا تو اُسے بڑے لاڈ سے اپنے کمرے میں لے آئیں، کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی دلچسپ باتوں سے بیٹی کا دل بہلاتی رہیں پھر اصل مقصد کی طرف آتے ہوئے بولیں۔

" تمہاری پھوپھی اِدھر کئی بار چکر لگا چکی ہیں ـــــ "

" آئی سی " ناجیہ نے یکلخت سنجیدگی اختیار کرلی ماں کا خیال کرتے ہوئے لاپروائی سے بولی " ڈیڈی کے رشتے سے اس گھر پر پھوپھی جان کا بھی کچھ حق بنتا ہے ـــــ وہ اگر آتی ہیں تو آنے دیں ـــــ "

" ناجیہ بیٹی ـــــ " شمسہ بیگم نے ممتا بھرے لہجے میں بیٹی کو مخاطب کیا

" یس ممی ـــــ " وہ سپاٹ آواز میں بولی

" آج میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں "

" بڑے شوق سے کیجئے " وہ آہستہ سے مسکرائی " میں سن رہی ہوں "

" کیا تمہیں اس بات کا علم نہیں کہ تمہاری پھوپھی ہم سے کیا چاہتی ہیں ـــــ ؟ "

" کیا چاہتی ہیں ـــــ ؟ " اُس نے جانتے بوجھتے انجان بن کر سوال کیا۔

" میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں عاشی تم سے ـــــ "

" پلیز ممی ـــــ " ناجیہ یکلخت تیزی سے بولی " عاشی کا نام درمیان میں نہ لائیں "

" کیا بات ہے بیٹی ـــــ کیا تم دونوں کے درمیان ـــــ "

" ممی پلیز ـــــ " وہ غصے سے ہونٹ چباتے ہوئے چیخ اٹھی " میں عاشی کا نام بھی سننا پسند نہیں کرتی "

شمسہ بیگم کا دل دھک سے رہ گیا ـــــ شائستہ بیگم کی زبانی عاشی کی حیثیت کا راز معلوم ہوجانے کے بعد وہ چاہتی تھیں کہ موقع دیکھ کر ناجیہ کو بھی اپنا ہم خیال بنالیں لیکن ناجیہ نے تو عاشی کا نام سننا بھی گوارا نہیں کیا

" کہیں وہ عاشی کی اصلیت سے واقف تو نہیں ہوگئی ـــــ ؟ " شمسہ بیگم نے سوچا پھر موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے بولیں " میرا مشورہ ہے کہ تم پہلے غسل کرکے لباس تبدیل کرلو پھر اطمینان سے باتیں ہوں گی "

" آپ پھوپھی جان کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھیں " ناجیہ نے ماں کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا

" اتنی جلدی کیا ہے ـــــ کچھ کسی وقت آرام سے ـــــ "

" نو ممی ـــــ " ناجیہ نے تلملا کر ہاتھ ملتے ہوئے کہا " مسئلے جتنی جلدی حل ہوجائیں اتنا ہی بہتر ہے ـــــ آپ مجھے کھل کر بتائیں، میں کوشش کروں گی کہ آپ کے ذہن کی الجھنیں دُور ہوجائیں "

" خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے " شمسہ بیگم نے بیٹی کو ڈھیر ساری دعائیں دے ڈالیں پھر آہستہ سے بولیں۔ " آپا۔ فراز کے لئے تمہارا رشتہ مانگ رہی ہیں "

" آپ کا کیا خیال ہے ـــــ " اُس نے سپاٹ لہجے میں ماں سے سوال کیا۔

" مجھے تو فراز ہر طرح سے پسند ہے، گھر کا لڑکا ہے، دیکھا بھالا ہے اور پھر یہ کہ ـــــ "

" ڈیڈی کا کیا فیصلہ ہے ـــــ " اُس نے ماں کی بات کو کاٹتے ہوئے پوچھا۔

" تمہارے باپ چاہتے ہیں کہ ہاں کرنے سے پہلے تمہاری مرضی معلوم کرلی جائے "

" ڈیڈی زیادہ سمجھ دار ہیں " اُس نے خشک لہجے میں کہا پھر ماں کو سنتے ہوئے ٹھوس آواز میں بولی " ممی مجھے فراز پسند ضرور ہے لیکن میں اُس کے ساتھ زندگی کا سفر نہیں گزار سکتی ـــــ "

" مگر بیٹی ـــــ "

" میں آپ کو اپنا فیصلہ سُنا چکی ہوں ـــــ اور میرے فیصلے میں کسی لچک کی کوئی گنجائش نہیں "

" تمہاری پھوپھی کیا خیال کریں گی "

" محض پھوپھی جان کے خیال یا اُن کی خوشی کی خاطر میں اپنی زندگی نہیں بھینٹ کرسکتی " ناجیہ نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا پھر وہ جانے کے لئے ایڑیوں کے بل تیزی سے گھومی

" ناجیہ ـــــ " شمسہ بیگم کی ممتا کو جلال آگیا، انھوں نے تحکمانہ انداز میں آواز دی تو ناجیہ کے بڑھتے قدم تھم گئے، اُس نے آہستہ سے پلٹ کر ماں کی طرف دیکھا ـــــ لاپروائی سے ریاضت کیا

" آپ نے مجھے آواز دی ـــــ ؟ "

" میں اس گھر کی بزرگ ہوں ـــــ تمہاری ماں ہوں اس لئے کچھ فیصلے کرنے کا اختیار مجھے بھی حاصل ہے " شمسہ بیگم سخت لہجے میں بولیں۔ " کیا فیصلہ ہے آپ کا ـــــ "

" میں چاہتی ہوں کہ تمہاری شادی جلد از جلد کردی جائے "

" مجھے منظور ہے لیکن میری زندگی کا ہم سفر فراز نہیں ہوگا " ناجیہ نے بیباکی سے جواب دیا۔

" کیا مطلب ـــــ " شمسہ بیگم بیٹی کی جسارت پر تلملا اٹھیں " کیا تم اپنی مرضی اور اپنی پسند سے شادی کرنا چاہتی ہو "

" یس ممی ـــــ اور میری خواہش میں اگر آپ کی اور ڈیڈی کی رضامندی بھی شامل ہو تو مجھے .... زیادہ مسرت ہوگی "

" کیا تم نے اپنے لئے کسی ہم سفر کا انتخاب کرلیا ہے " شمسہ بیگم نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

" جی ہاں ـــــ "

" کون ہے وہ ـــــ کیا نام ہے اس کا " شمسہ بیگم نے ہاتھ ملتے ہوئے دریافت کیا ـــــ دل ہی دل میں وہ اس بات کا مصمم ارادہ کرچکی تھیں کہ اگر ناجیہ کی زبان پر عدیل کا نام آیا تو وہ کبھی چپ نہ رہیں گی اور بیٹی کو کھلے الفاظ میں بتادیں گی کہ اُن کی زندگی میں ناجیہ کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکے گا۔

" آپ اُسے بخوبی جانتی ہیں اور ڈیڈی بھی اُسے پسند کرتے ہیں "

" میں نے نام پوچھا تھا ـــــ " شمسہ بیگم سپاٹ لہجے میں بولیں۔

" شہباز ـــــ " ناجیہ نے نظریں گھما کر نہایت مختصر لہجے میں جواب دیا پھر تیزی سے پلٹ کر کمرے سے باہر چل گئی۔ اور ـــــ

شہباز کا نام سُن کر شمسہ بیگم کو حیرت بھی ہوئی اور تعجب بھی ـــــ نہیں نراز کے ہاتھ سے نکل جانے کا دُکھ ضرور تھا لیکن عدیل کا کانٹا جو اُن کے ذہن میں ایک مدت سے کھٹک رہا تھا اچانک نکل گیا تو انھیں یوں محسوس ہوا جیسے کڑی چلچلاتی دھوپ کے بعد بادل چھا گئے ہوں۔

تپتے ریگستان میں اچانک نخلستان نظر آگیا ہو ـــــ !!

ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں نے آسمان کا سینہ چاک کر دیا تھا۔
دن کا اُجالا آہستہ آہستہ شام کے ملگجے اندھیروں میں مدغم ہونے لگا لیکن وہ ابھی تک کمرے میں بیٹھی اپنے خیالوں میں گم تھی۔
ناجیہ کے بدلتے مزاج بگڑتے تیور اور دن رات کی نکتہ چینیوں نے اُس کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ وہ بخوبی سمجھ رہی تھی کہ ان باتوں کے پس پردہ کیا حقیقت کارفرما تھی ـــــ کون ساجذبہ تھا جس نے ناجیہ کو اُس کا دشمن بنا دیا تھا اور کیوں اُسے ناکردہ گناہوں کی سزا جھیلنی پڑ رہی تھی۔
جو کچھ ہو رہا تھا اُس کی وجہ شہباز کی ذات تھی ـــــ
شہباز ـــــ
جس نے اچانک اُس کی زندگی میں داخل ہو کر اُس کے شب و روز کے پُرسکون لمحوں میں تلاطم پیدا کر دیا تھا ـــــ ان انجانے احساسات کو گدگدا کر بیدار کیا تھا جن سے وہ قطعی ناواقف تھی ـــ دل کی دھڑکنوں کو ایسی لذت سے آشنا کر دیا تھا جو اُس کے وجود پر امربیل کی طرح چڑھتی چلی گئی اور وہ اس وقت چونکی جب اس کی سوچیں اُس کی اپنی نہیں رہیں ـــــ پرائی ہو چکی تھیں۔
شروع شروع میں وہ شہباز کو محض ایک دوست، ایک ہم جماعت کی حیثیت سے پہچانتی رہی۔ پھر ممدو کی بیماری نے شہباز کو اُس کے قریب کر دیا ـــــ وہ اُسے اپنا ہمدرد، مونس و غمخوار سمجھنے لگی ـــــ
اور پھر ـــــ
جب ایک روز شہباز نے نظریں جھکا کر اُس سے اپنی محبت کا اعتراف کیا اور زندگی کا ہم سفر بنانے کی خواہش کا اظہار کیا تو اُسے جیسے سکتہ ہو گیا ـــــ جانے کتنی دیر وہ شہباز کو یوں خالی خالی نظروں سے گھورتی رہی جیسے اُسے اپنی سماعت اور بصیرت پر اعتماد نہ رہا ہو ـــــ جیسے وہ جاگتے میں کوئی میٹھا اور سہانا خواب دیکھ رہی تھی۔
اُس دن اُس کا دل بڑی زور سے دھڑکا تھا ـــــ پہلی بار اُسے دل کی دھڑکنوں میں ایک انجانی مسرت کا احساس ہوا۔ وہ اس جذبے کو کوئی خوبصورت سا نام دینے سے قاصر تھی لیکن دھڑکنوں کا وہ انداز انتہا سحر انگیز، اتنا حسین تھا کہ وہ اس کے زیر و بم میں ڈوبتی چلی گئی۔
جانے کتنے دنوں تک وہ انجانی کیفیتوں سے دوچار رہی پھر جب اُس نے محسوس کیا کہ دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ساتھ شہباز کا تصور بھی اُس کے دل و دماغ پر چھانے لگا ہے تو وہ چھوئی موئی کے نرم اور معصوم پودے کی مانند اپنے وجود کے اندر سمٹ کر رہ گئی ـــــ پھر ـــــ رفتہ رفتہ ـــــ
شہباز سے اجنبیت دور ہونے لگی ـــــ اپنائیت کا احساس بڑھنے لگا، زندگی کی شاہراہوں پر ممدو کے بوڑھے اور ڈگمگاتے وجود کے سوا کوئی دوسرا اس کا اپنا نہ تھا ـــ شہباز نے اچانک اُس کا ہاتھ تھام کر سہارا دینے کی خواہش کا اظہار کیا تو جیسے زندگی میں بہار کا موسم آ گیا ـــــ خزاں کے منحوس جھونکوں نے اُس کے

وجود کو جھلسا دیا تھا لیکن شہباز کے پیار کی گھنیری چھاؤں پا کر وہ خود کو بڑا مضبوط سمجھنے لگی تھی۔
ڈوبنے والے کو تو محض ایک حقیر تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے ـــــ شہباز تو ایک تناور درخت تھا، بے حد ٹھوس اور نہایت پائیدار ـــــ بلند کردار کا مالک۔
اُس نے شہباز کی خواہش کو دھڑکتے دل سے سنا تو گنگ سی رہ گئی ـــــ کوئی جواب نہ دے پائی شاید اس لئے کہ اُسے غیر متوقع طور پر اور اچانک اتنی ڈھیر ساری مسرتیں اور خوشیاں مل گئی تھیں جن کا تصور کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں آیا تھا ـــــ دل کی دھڑکنوں کو سمیٹتی وہ سر جھکائے خاموشی سے اندر اپنے کمرے میں چلی گئی۔
پھر ـــــ
وقت نے ممدو کا سایہ اُس کے سر سے اُٹھا لیا تو تنہائی کا احساس اُسے ڈسنے لگا۔ ایک مضبوط سہارا اچانک چھن گیا تو وہ زندگی کے طویل سفر میں بالکل تنہا ـــــ بے یار و مددگار رہ گئی۔ ایسے میں شہباز نے اُس کا ہاتھ تھام کر اپنانے کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ چونک اٹھی۔
پہلی بار اُسے اپنی پستی اور شہباز کی بلندیوں کا احساس ہوا تو وہ اندر ہی اندر دل مسوس کر رہ گئی ممدو کی جدائی نے اُسے بہت حساس بنا دیا تھا ـــــ وہ اتنی بزدل ہو گئی کہ خود اپنی پرچھائیں سے ڈرنے لگی تھی۔ چنانچہ اُس نے شہباز کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا ـــــ مہر بلب ہو گئی۔
لیکن ـــــ
شہباز برابر اس کا تعاقب کرتا رہا، امتحانوں کے دوران اس نے پھر عاشی کے قریب ہونے کی کوشش کی، اُسے اپنی پُرخلوص محبت اور بے لوث خواہشات کا یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا ـــــ عاشی نے اُسے وقت کی نزاکتوں سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ـــــ اپنی بے ثباتی اور بے چارگی کا احساس دلانا چاہا ـــــ اس خلیج کی نشاندہی کی جو اس کے اور شہباز کے درمیان حائل تھی۔
اور یہ خلیج ناجیہ تھی جو عاشی کی خوشیوں کو ڈس لینے کی خاطر اُس کے اور شہباز کے درمیان حائل ہو گئی تھی ـــــ اُس نے عاشی کی پاکیزہ اور بے داغ محبت کو بدنام کرنے کی کوشش کی ـــــ اس کے دامن پر بدنامی کے داغ لگانے کے درپے ہو گئی تو عاشی لرز اٹھی ـــــ اُس نے ناجیہ کو سمجھانے کی کوشش کی، دل کی دھڑکنوں کا کلا گھونٹ کر یہ باور کرانا چاہا کہ وہ جو کچھ اُس کے اور شہباز کے بارے میں سوچ رہی ہے ـــــ سمجھ رہی ہے وہ بے بنیاد ہے۔ غلط ہے ـــــ سراسر جھوٹ ہے لیکن ناجیہ نے اُسے اور شہباز کو اپنی آنکھوں سے ایک ساتھ گاڑی میں سفر کرتے دیکھ لیا تھا اور پھر کر شعلۂ انتقام بن گئی تھی ـــــ
جانے کیوں ـــــ ؟
شاید اُسے عاشی کی خوشیاں منظور نہیں تھیں ـــــ
یا پھر ـــــ وہ محض اپنی فتح کی خاطر اُسے شکست دینے پر آمادہ ہو گئی تھی ـــــ اور مضبوط سہارے کو بھی چھین لینا چاہتی تھی جو عاشی کو شہباز کے روپ میں مل رہا تھا ـــــ
لیکن ـــــ
وہ ایسا کیوں چاہتی تھی ـــــ ؟
آخر کیوں ـــــ ؟
وہ تو عدیل کی محبت میں گم ہو کر خود کو فراموش کر دینے پر تل گئی تھی ـــــ
کالج کا ایک ایک لڑکا اور لڑکی اُس کی اور عدیل کی بے جوڑ دوستی پر دم بخود تھے ـــــ
پھر آہستہ آہستہ عدیل اور ناجیہ کے بارے میں سرگوشیاں ہونے لگیں ـــــ
اُن کے پیار اور چوری چھپے ملاقاتوں کے چرچے عام ہو گئے ـــــ
ناجیہ نے بھی ان باتوں کو اپنے کان سے سنا لیکن کوئی توجہ نہیں دی ـــــ ایک حقیر سی مسکراہٹ

ہونٹوں پر بکھیر کر خاموش ہو گئی ——

پھر یہ سارا کالج کے احاطے سے نکل کر گھر کی چہار دیواری تک پہنچ گیا ——

شمسہ بیگم کو اپنی کوٹھی کی بنیادیں ہلتی محسوس ہونے لگیں ——

اور اب ——

اب ناجیہ نے اچانک عدیل سے کنارہ کشی اختیار کر کے شہباز کو اپنانے کی ٹھان لی تھی ——

اور یہ بات کسی اور نے نہیں ——

خود شمسہ بیگم نے عاشی کو بتائی تھی ——

"ہاں بیٹی —— مجھے خوشی ہے کہ ناجیہ نے عدیل کا خیال دل سے نکال دیا" شمسہ بیگم اُس کے سامنے بیٹھی کہہ رہی تھیں "اگر یہ بات زیادہ پھیل جاتی تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے —— ناجیہ کے باپ کی عزت اور شہرت خاک میں مل جاتی"

"مجھے یقین تھا آنٹی کہ ناجیہ کوئی ایسا قدم نہیں اُٹھائے گی جو خاندان کی بدنامی کا باعث ہو" اُس نے اپنا درد چھپاتے ہوئے شمسہ بیگم کی دلجوئی کی خاطر بڑی اپنائیت سے کہا "میرا خیال ہے کہ اب فراز اور ناجیہ کی بات پکی کر دینی چاہیئے"

"میں نے بھی یہی سوچا تھا لیکن ——"

"لیکن کیا ——" عاشی نے وضاحت چاہی، شمسہ بیگم کی اچانک خاموشی سے نجانے کیوں اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔

"ناجیہ اب بھی فراز کے ساتھ شادی کرنے پر رضامند نہیں ہے"

"کیوں ——"

"اس لئے کہ وہ شہباز کو پسند کرتی ہے"

اور شمسہ بیگم کی زبان سے یہ انکشاف ہونے کے بعد وہ دم بخود رہ گئی، اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے وجود کے اندر کوئی قیمتی شے اچانک ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی ہو، جیسے دل کے ویرانوں آرزوؤں اور تمناؤں کے دوش پر جلتے تمام روشن چراغ بادِ مخالف کے ایک ہی جھونکے سے بجھ گئے ہوں اور صرف دھواں باقی رہ گیا ہو۔

دھواں ——

جس کی کثافت کے احساس سے اُس کا دم گھٹنے لگا —— لیکن وہ خود کو سنبھالے رہی، اس موقع پر اگر اُس کے قدم لڑکھڑا جاتے تو وہ شمسہ بیگم کی نظروں میں گر جاتی ——

"تمہارے خیال میں شہباز اور ناجیہ کی جوڑی کیسی رہے گی"

"جی ——" عاشی جبراً مسکراتے ہوئے بولی "بڑی خوبصورت اور شاندار جوڑی ہو گی"

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے" شمسہ بیگم نے خوش ہو کر کہا پھر عاشی کے سر پر بڑی اپنائیت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں "میں نے پہلے تمہاری مرضی جاننے کی ضرورت اس لئے محسوس کی کہ تم —— تم ناجیہ کی بڑی بہن ہو"

"آپ کی ذرہ نوازی ہے جو مجھے کسی قابل سمجھتی ہیں ورنہ ——"

"ورنہ کیا ——" شمسہ بیگم نے عاشی کو متاسبھری نگاہوں سے تکتے ہوئے پوچھا

"میں کیا اور میری اوقات کیا"

"تم کیا ہو عاشی —— اس کا اندازہ تمہیں ابھی نہیں ہے"

وہ کوئی جواب نہ دے سکی، حیرت سے آنکھیں پھاڑے شمسہ بیگم کو دیکھتی رہی

"ایک بات کہوں —— مانو گی"

"آپ حکم دیجئے آنٹی —— میری کیا مجال جو سرتابی کی جسارت کر سکوں"

"میری خواہش ہے کہ تم —— تم بھی مجھے ناجیہ کی طرح ممی کہا کرو ——"

"جی ——" اُس نے حیرت سے کہا۔

"ہاں بیٹی —— خدا گواہ ہے کہ میں نے تمہیں ناجیہ سے کم نہیں سمجھا اور —— اور اب تو بات ہی اور ہے"

"اب کیا بات ہو گئی ——" عاشی نے شمسہ بیگم سے پوچھا، وہ ابھی تک اُلجھی اُلجھی سی تھی۔

"اب —— اب میں نے تمہیں اپنی بیٹی بنا لیا ہے —— اور آئندہ سے تم مجھے آنٹی نہیں —— ممی کہو گی —— حکم ہے" شمسہ بیگم نے پیار بھرے لہجے میں جواب دبا پھر بولیں "کہو —— تم ہو نا میری بیٹی ——"

"جی —— جی ہاں" وہ یونہی مسکرا دی "کیوں نہیں"

"خدا تمہیں ہمیشہ سلامت رکھے" شمسہ بیگم نے اُٹھ کر عاشی کی بلائیں لیں پھر اُسے دعائیں دیتی ہوئی باہر چل دیں اور عاشی دم بخود سی بیٹھی بدلتے حالات پر غور کرتی رہی۔

ایک بار محمود حسین نے بھی اسی خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ انھیں انکل کے بجائے ڈیڈی کہا کرے شمسہ بیگم بھی اُس پر حد درجہ مہربان ہو گئی تھیں

آخر کیوں ——؟

ان باتوں کا سبب کیا تھا —— کیا مقصد تھا ——؟؟

کیا محبت کی بھینٹ لینے کے لئے رشتوں کی نوعیت تبدیل کرنی ضروری تھی ——؟؟؟

وہ تو یوں بھی ممنونِ احسان تھی ——

بھلا اپنے محسنوں کے کسی حکم سے انکار کی جرأت کیسے کر سکتی تھی ——

پھر ——

یہ سب کیا تھا —— کیوں تھا ——؟

عاشی کا ذہن چکرانے لگا —— وہ شہباز کو بھول کر محمود حسین اور شمسہ بیگم کی باتوں میں الجھ گئی ——!!

آج وہ بے حد خوش تھی۔

ماں سے شہباز کے سلسلے میں دو بدو گفتگو کر لینے کے بعد اُس کے ذہن پر طاری تمام کثافت جیسے دُور ہو گئی۔ اسے یقین تھا کہ اب شہباز اس کی جھولی میں ہو گا اور وہ عاشی کے سامنے فخر سے گردن اونچی کر کے اور تن تان کر چل سکے گی۔

یوں بھی اُس کا اور عاشی کا بھلا کیا مقابلہ تھا —— ذرہ کو آفتاب سے کیا نسبت ہو سکتی تھی لیکن عاشی کی خداداد قابلیت نے اُسے انتقامی جذبوں کو بروئے کار لانے پر مجبور کر دیا تھا —— تعلیمی اعتبار سے عاشی اس سے بہت آگے تھی اس لئے ناجیہ اُسے زندگی کے تمام معاملات میں اس قدر پیچھے چھوڑ دینا چاہتی تھی کہ عاشی اس کی گرد کو بھی نہ پا سکے اور اسی مقصد کے حصول کی خاطر وہ شہباز اور اُس کے درمیان آ گئی —— ورنہ اُس نے شہباز سے محبت کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

وہ خود جھکنے کے بجائے دوسروں کو اپنے آگے جھکانے کی عادی تھی۔

اُسے ہاتھ پھیلا کر مانگنے کی عادت نہیں تھی ——

چھین لینا اور جھپٹ لینا اُس کی فطرت تھی —— اور اس میں ناجیہ کا اپنا کوئی قصور نہیں تھا۔! اُس کی تربیت ہی ان اصولوں پر کی گئی تھی جو امارت، غرور اور تکبر کی بنیادوں پر قائم کردہ تھے۔

پھر وہ زمین پر کیوں نظر رکھتی ——

وہ تو آسمان کی بلندیوں کو بھی دیکھ کر اکثر اندر ہی اندر جھلس اٹھتی تھی۔

لیکن آج کل وہ حد درجہ مسرور تھی —— شہباز کو جھپٹ لینے کی آرزو کی سمت پہلا قدم اُٹھا لینے کے بعد وہ اور مغرور ہو گئی، اپنی کامیابی کی اطلاع اس نے سب سے پہلے فرحت کو دی پھر اسی کے مشورے پر وہ عاشی کے زخموں پر نمک پاشی کے لئے بھی آمادہ ہو گئی۔

اُسے فرحت کے ساتھ شاپنگ کے لئے جانا تھا، تیار ہو کر گنگناتی ہوئی اپنے کمرے سے نکلی تو ماں کو عاشی کی خوابگاہ سے نکلتا دیکھ کر آڑ میں ہو گئی —— ایک لمحے کو اُس کی پیشانی پر بل آ گئے —— وہ نہیں چاہتی تھی کہ گھر کا کوئی فرد عاشی کی دلجوئی کرے، پھر ماں اُس کے پاس کیوں گئی ——؟ اُس نے سوچا پھر اچانک اُس کے یاقوتی لبوں پر

ایک زہر ملا تبسم جاگ اٹھا ——— کچھ سوچ کر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی وہ عاشی کے کمرے میں گئی تو عاشی اپنے خیالوں میں گم خلا میں گھور رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر حزن و ملال کی کیفیتوں کو دیکھ کر ناجیہ کو یقین آگیا کہ کچھ دیر پیشتر عاشی اور شمیم کے درمیان کس قسم کی گفتگو ہوئی ہوگی۔

"کیا بات ہے عاشی ———" اُس نے لہراتے ہوئے پوچھا "کس کے تصور میں کھوئی کھوئی ہو ———"

"کچھ نہیں ———" عاشی نے چونک کر ناجیہ کو دیکھا تو جلدی سے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے بولی "یونہی ——— سوچ رہی تھی کہ نتیجہ آنے میں ابھی نہ جانے کتنے دن لگیں گے۔"

"وہ تو ابھی چکا ———" ناجیہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میں نے ممی کو کھل کر اپنی مرضی سے آگاہ کر دیا اور شاید تمہیں یہ سُن کر دکھ ہوگا کہ ممی شہباز کے سلسلے میں آمادہ ہوگئی ہیں۔"

"میں نہیں اس شاندار کامیابی پر مبارکباد پیش کرتی ہوں۔" عاشی نے بڑے خلوص سے کہا "ابھی آنٹی مجھے یہی خوشخبری سُنا کر گئی ہیں۔"

"حیرت ———" ناجیہ نے اُسے غور سے گھورتے ہوئے کہا "تمہیں اس اطلاع پر کوئی دکھ نہیں ہوا"

"دکھ! ——— وہ کس بات کا ———"

"شہباز کے چھن جانے کا۔" ناجیہ بیباکی سے بولی۔

"جو چیز اپنی نہ ہو اس پر زعم کرنا میرے نزدیک حماقت کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔"

"مجھے تم سے ہمدردی ہے عاشی۔" ناجیہ نے اُسے جلانے کی خاطر کہا "محبت میں ناکامی اور نامرادی اکثر انسانوں کو فلسفی بنا دیتی ہے ———"

"میں نے فلسفہ نہیں ——— زندگی کی ایک تلخ حقیقت کی ترجمانی کی ہے۔" عاشی سنجیدگی سے بولی

"میں بھی یہی کہہ رہی تھی کہ زندگی میں تلخیوں کا زہر سما جائے تو انسان اپنا ذہنی توازن برقرار نہیں رکھ سکتا۔"

"کہاں جا رہی ہو اس وقت۔" عاشی نے اُس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا

"یوں ہی ——— ذرا سیر و تفریح کا ارادہ ہے۔" اُس نے نفرت کا اظہار کیا۔ "بند کمرے میں بیٹھ کر اپنی محبت کی ناکامی پر آنسو بہانا کم از کم میرے اصول کے خلاف ہے۔"

"ناجیہ ———" عاشی تڑپ اُٹھی

"بائی ———" ناجیہ نے مسکراتے ہوئے ہاتھ لہرا کر کہا پھر تیزی سے پلٹ کر باہر آگئی، اُس نے عاشی کی غزالی آنکھوں میں اُبھرنے والے آنسوؤں کے ان دو انمول قطروں کو بھی نہیں دیکھا جو بے بسی کا احساس بن کر جھلملا اُٹھے تھے۔

اپنی دھن میں مست وہ گنگناتی ہوئی کوٹھی سے باہر آئی، ڈرائیور گاڑی کی صفائی میں مصروف تھا، اُسے آتا دیکھ کر جلدی سے لپکا اور دروازہ کھول دیا ——— بڑی شان سے سر بلند کئے وہ آگے بڑھ کر گاڑی میں بیٹھ گئی، ڈرائیور نے سلام کیا تو سر کی خفیف جنبش سے جواب دیتی گاڑی اسٹارٹ کرتی کوٹھی کے احاطے سے نکل کر کھلی اور کشادہ سڑک پر آگئی۔

مست ہوا کے جھونکوں نے اُس کی زلفوں کو چھیڑنا شروع کیا تو گدگدی کے احساس نے اُسے ادھ کھلے گلاب کی مانند شگفتہ کر دیا ——— یوں بھی عاشی سے شہباز کو چھین لینے کے بعد وہ بے انتہا خوش تھی۔ بے حد سرشار تھی۔

صدر کے علاقے میں پہنچ کر اُس نے گاڑی ایک بڑے اسٹور کے سامنے پارک کر دی، بکھری زلفوں کو مخروطی انگلیوں سے سنوارتی نیچے اُتری تو بے شمار نگاہیں اُس کے تعاقب میں اُٹھ گئیں ——— غرور سے سر بلند کئے وہ اسٹور میں داخل ہوئی، اُسے اپنے لئے محض نئے ہیرپن لینے تھے لیکن اپنی امارت کے اظہار کے طور پر اُس نے آلِ غلم بیشمار چیزیں خرید ڈالیں۔ پھر بیگ ہاتھوں میں لئے واپس پلٹی تو ٹھٹھک کر رک گئی۔

عدیل اُس کے سامنے سوالی بنا کھڑا تھا۔

ایک لمحے کو وہ عدیل کو یوں اپنے سامنے دیکھ کر گڑبڑا گئی لیکن دوسرے ہی لمحے خود پر قابو پاتے ہوئے

"ہیلو ———" اُس نے عدیل سے پوچھا "کیسے ہو ——— بہت دنوں بعد نظر آئے۔"

"ٹھیک ہوں" عدیل آہستہ سے بولا "آپ ——— آپ کیسی ہیں۔"

"فائن ———" وہ مسکرانے لگی "اس وقت یہاں کیا کر رہے تھے۔"

"آپ کی واپسی کا انتظار۔" عدیل کے لہجے میں حسرت ہی حسرت تھی

"آؤ ——— گاڑی میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔" اُس نے عدیل کے انداز کو محسوس کرتے ہوئے کہا پھر تعاقب ہوئی میل نظروں کے ہجوم سے نکل کر گاڑی میں جا بیٹھی، انجن اسٹارٹ کرنے میں بھی اُس نے بڑی عجلت سے کام لیا۔

عدیل بدستور چپ چپ تھا ——— ناجیہ نے گاڑی کا رُخ کلفٹن کی جانب کر دیا ——— آج پہلی بار عدیل سے مل کر شدید الجھن کا احساس ہو رہا تھا ——— وہ اُسے ٹال دینا چاہتی تھی ——— ہمیشہ کے لئے ———!!

"تمہاری خاموشی مجھے شدید بور کر رہی ہے۔" اُس نے اُکتائے انداز میں عدیل کو مخاطب کیا۔

"کیا کہوں ———" عدیل نے سرد آہ بھری تو ناجیہ کا موڈ چیں بچ آف ہوگیا

"کیا بات ہے۔" وہ تنک کر بولی "کیا کہیں سے پٹ کر آرہے ہو ———"

"ہاں ———" اُس نے ناجیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "تقدیر نے میرے ساتھ بازی مات کر دی ہے۔"

"کیا مطلب ———" اُس نے چونک کر عدیل سے دریافت کیا۔

"میری ماں نے ابتدا ہی میں میری حیثیت کا احساس دلایا تھا ——— اس حقیقت کو بار بار یاد دلانے کی کوشش تھی کہ ہم جس دنیا اور جس ماحول کے پروردہ ہیں وہاں خوشیوں کا کوئی دخل نہیں ——— حسین اور خوبصورت خواب دیکھ سکتے ہیں لیکن اس کی تعبیر ہمیشہ ہماری توقعات کے خلاف ثابت ہوتی ہے ——— اور ——— ہم تقدیر سے کوئی شکایت بھی نہیں کر سکتے۔"

عدیل کی آواز میں اس کی روح کی تڑپ بھی شامل تھی۔ چہرہ ستا ستا اور ویران نظر آرہا تھا۔

"وہاٹ نان سنس۔" ناجیہ کا موڈ عدیل کو دیکھ کر پہلے ہی خراب ہو رہا تھا، اُس کی باتیں سُن کر وہ اور سلگ اُٹھی "مجھے یہ فرسودہ اور دقیانوسی قسم کی لغویات سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی ——— جو کچھ کہنا ہے کھل کر کہو ——— حیثیت ——— احساس ——— امیری ——— غریبی ——— خواب ——— حقیقت اور تقدیر وغیرہ کا رونا مجھے بالکل پسند ہے ———"

"مجھے یقین تھا ناجیہ کہ تم میری باتوں کا یہی جواب دو گی۔" عدیل نے ایک سرد آہ بھری تو ناجیہ اور بپھر گئی

"مائی فٹ ——— کچھ پتہ بھی تو چلے کہ آخر تمہیں ہوا کیا ہے۔"

"مجھے حیرت ہے کہ یہ سوال تم کر رہی ہو۔" عدیل نے سپاٹ انداز میں کہا "کیا تمہیں میری پریشانی کا سبب معلوم نہیں۔"

"معلوم ہوتا تو دریافت کیوں کرتی۔" ناجیہ لاپروائی سے بولی۔

"اتنے دنوں سے تم کہاں غائب تھیں۔" عدیل نے پوچھا۔

"یوں ہی ——— مصروف تھی۔" ناجیہ نے تیکھے لہجے میں جواب دیا

"مجھے تمہاری مصروفیت کا علم ہو چکا ہے۔" عدیل نے بڑی حسرت سے کہا "کل وقار سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے مجھے وہ تمام باتیں بتا دی ہیں جو تم نے ساجدہ سے کہی تھیں۔"

"اوہ ———" ناجیہ نے شرمندہ ہونے کے بجائے بڑی ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے پوچھا "کیا تمہیں میری خوشیاں عزیز نہیں ہیں ——— میرا مستقبل شاندار اور تابناک ہو ——— کیا تمہیں یہ منظور نہیں ہے۔"

"میں پتھر کی بے جان مورت نہیں ہوں ناجیہ۔" عدیل تڑپ اُٹھا "میرے سینے میں بھی ایک حساس دل ہے جو سرد اور گرم کے فرق کو سمجھتا ہے ——— محسوس کرتا ہے ——— اور پھر ——— پھر ——— گوشت پوست کے ایک زندہ انسان اور بازار میں بکاؤ کھلونوں کے درمیان بڑا فرق ہوتا ہے۔"

"جب تم دو چیزوں کے درمیان کسی فرق کی تمیز کر سکتے ہو تو پھر شکوہ کس بات کا کر رہے ہو۔" ناجیہ خشک آواز میں بولی "تم خود ہی غور کرو کہ تمہارے اور شہباز کے درمیان ———"

"ناجیہ ـــــ پلیز" عدیل نے تیزی سے کہا "میرے سامنے شہباز کا نام مت لو"

"کیا کہنا چاہتے ہو تم ـــــ" ناجیہ عدیل کا جواب سُن کر آپے سے باہر ہو گئی، بریک مار کر اُس نے گاڑی کو سڑک کے کنارے روک دیا، ہونٹ چباتے ہوئے بولی "تمہیں اس بات کا حق کس نے دیا کہ میرے معاملات میں یوں دخل اندازی کرو"

"میں اپنی حیثیت کا اندازہ لگا چکا ہوں لیکن مجھے تم سے اس بے وفائی کی اُمید نہیں تھی"

ناجیہ نے گھور کر عدیل کو سخت نظروں سے دیکھا پھر حقارت سے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔

"ایک وہ وقت تھا جب تم میری شکل دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھتی تھیں"

"وہ ـــــ وہ میری بھول تھی" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"اور تمہاری بھول کی سزا صرف مجھے جھیلنی پڑے گی ـــــ یہ کہاں کا انصاف ہے"

"عدیل ـــــ" یکلخت وہ پھری ہوئی شیرنی کی طرح پلٹی "تم شاید اپنا وقات بھول کر میرے منہ لگنے کی کوشش کر رہے ہو"

"میں تمہیں پریشان نہیں کروں گا ناجیہ ـــــ مجھے اپنی اوقات کا بھی اندازہ ہے اس لئے میں تمہارے راستے سے ہمیشہ کے لئے دُور ہو جاؤں گا لیکن آتنا یاد رکھنا کہ جو دوسروں کی محبت کا مذاق اڑاتے ہیں ـــــ دوسرے کے دل کو ٹھیس پہنچاتے ہیں خود بھی کبھی سکون کا سانس نہیں لے پاتے ـــــ" عدیل نے دروازہ کھول کر ایک قدم باہر نکالتے ہوئے بڑی حسرت سے کہا "میں تم سے رخصت ہو رہا ہوں ـــــ اگر میری بات سے تمہیں کبھی کوئی دکھ پہنچا ہو ـــــ کوئی تکلیف ہوئی ہو تو معاف کر دینا ـــــ"

پھر وہ "خدا حافظ" کہتا ہوا گاڑی سے نیچے اُترا، آہستہ سے دروازہ بند کیا۔ ایک الوداعی نظر ناجیہ پر ڈالی اور کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح گردن جھکائے خاموشی سے آگے بڑھ گیا ـــــ ایک نامعلوم منزل کی سمت۔

"ایڈیٹ ـــــ ریش"

ناجیہ تلملا کر بولی، انجن اسٹارٹ کر کے اُس نے برق رفتاری سے گاڑی کو واپسی کے لئے موڑا ـــــ جھلاہٹ اتنی شدید تھی کہ وہ پشت سے آنے والی گاڑی کی رفتار کا اندازہ بھی نہ لگا سکی۔ پھر قبل اس کے کہ وہ سنبھل پاتی ایک زوردار دھماکہ ہوا اور اُس کا ذہن اچانک حادثے کی شدت کے سبب تاریکی میں ڈوب گیا۔

ہر احساس گھپ اندھیروں میں مدغم ہو گیا ـــــ !!

✱ ـــــــــــــــــــــــ ✱

وقت اپنے محور کے گرد گھومتا رہا ـــــ

زمانے کی گردش کا سلسلہ جاری و ساری تھا۔

البتہ ایک گھر کی خوشیاں اچانک حالات کے نشیب و فراز میں الجھ کر زخمی ہو گئی تھیں ـــــ

ایک غریب کے دل سے نکلی ہوئی آہ فلک کی بلندیوں تک پہنچ گئی۔

اور ـــــ

قدرت کی بے آواز لاٹھی حرکت میں آ گئی ـــــ

ناجیہ حادثے کا شکار ہو کر ہسپتال جا پہنچی

حادثہ کسی غریب اور لاوارث کو پیش آیا ہوتا تو شاید اب تک وہ مرکھپ کر مردہ خانے تک پہنچ گیا ہوتا، لیکن معاملہ شہر کے سب سے بڑے اور شہرت یافتہ بیرسٹر محمود حسین کا تھا ـــــ دولت اور امارت کے علاوہ، وہ اخلاق اور کردار کے غازی بھی تھے اس لئے ہسپتال کے ماہرین مریضہ کی زندگی بچانے کی جد و جہد میں جان توڑ کوشش کر رہے تھے

دیوار کے ایک جانب کمرے میں ناجیہ بستر پر بیہوش پڑی موت اور زندگی کے دوراہے پر کٹھن قدرت کے آخری اشارے کی منتظر تھی ـــــ اور دوسری سمت راہداری میں شمسہ بیگم، محمود حسین اور شہباز گم صم کھڑے آنے والے لمحات کے بارے میں غور کر رہے تھے۔

محمود حسین کے چہرے پر غموں کے سائے سمٹ کر تاریک ہو گئے تھے۔ خود کو سنبھالنے کی خاطر وہ راہداری میں بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے ـــــ کبھی رک کر اُس دروازے کی سمت غور سے دیکھنے لگتے جس میں ناجیہ

[illegible] کے تجربے سے گزر رہی تھی ـــــ کبھی خلا میں دیکھ کر ہونٹ کاٹنے لگتے اور کبھی اچانک پلٹ کر شمسہ بیگم [illegible] جانب گھورنے لگتے۔

شہباز کو اس حادثے کی اطلاع بعد میں ملی تھی اس لئے وہ اصل صورت حال سے پوری طرح واقف [illegible] تھا البتہ محمود حسین اور شمسہ بیگم کے چہروں پر لرزتے سایوں سے اُس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ناجیہ کی حالت مخدوش ـــــ اسی لئے ڈاکٹروں نے ابھی تک بے حد اصرار کے باوجود کسی کو مریضہ کے کمرے میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں [illegible] تھی۔

شمسہ بیگم دروازے کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھی پھٹی پھٹی نگاہوں سے ناجیہ کے کمرے کو تکے جا رہی تھیں، [illegible] کے چہرے پر ممتا کے بے چین جذبے مچل رہے تھے ـــــ امید و بیم کی کیفیتوں سے دوچار بیٹھی وہ دل ہی دل میں اولاد [illegible] زندگی کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔

وقت کی رفتار نہ جانے کیوں سست ہو گئی۔ ایک ایک لمحہ بڑا جاں گسل تھا ـــــ کب رات [illegible] کب سویرا نمودار ہوا ـــــ کسی کو اس کا احساس تک نہیں ہوا لیکن جب ناجیہ کے کمرے کا دروازہ کھلا اور ہسپتال کا [illegible] ڈاکٹر باہر نکلا تو سب کی نگاہیں اس پر جم کر رہ گئیں۔

"میرے معبود ـــــ میری بچی پر رحم کرنا" شمسہ بیگم نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا۔

محمود حسین اور شہباز تیزی سے لپک کر ڈاکٹر شیرازی کے قریب چلے گئے۔

"ڈاکٹر ـــــ" محمود حسین نے خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا "ناجیہ کیسی ہے ـــــ"

"آئی وش یو گڈ لک بیرسٹر (I WISH YOU GOOD LUCK BARISTER)" ڈاکٹر شیرازی نے [illegible] مسکراتے ہوئے جواب دیا ـــــ "آپ کی بیٹی کی زندگی اب خطرے سے باہر ہے ـــــ"

"اوہ ـــــ تھینک یو ڈاکٹر" محمود حسین کی آواز فرطِ جذبات سے بھرا گئی۔

"شکریہ تو آپ مس عاشی کا ادا کریں بیرسٹر جو بروقت یہاں پہنچ گئیں اور جن کا خون مس ناجیہ کے کام آ گیا، [illegible] ورنہ اس گروپ کا خون جو ہمیں درکار تھا مشکل سے دستیاب ہوتا"

"عاشی ـــــ"

محمود حسین کے دل کو ایک دھچکا سا لگا، ناجیہ کے حادثے کی خبر سُن کر وہ عاشی کو مطلق فراموش کر بیٹھے تھے حالانکہ اس منحوس واقعے کی اطلاع انھیں فون پر عاشی نے دی تھی، اُس نے کہا تھا کہ وہ فوری طور پر ناجیہ کے پاس ہسپتال پہنچ رہی ہے۔ اور وہ شمسہ بیگم کو لے کر پہنچیں ـــــ محمود حسین نے اسی کے مشورے پر عمل کیا تھا اور بیوی کو ساتھ لیتے ہوئے ہسپتال آ گئے تھے، پھر ہسپتال سے ہی انھوں نے شہباز کو اطلاع دی تھی ـــــ لیکن اپنی پریشانیوں میں وہ عاشی کو بالکل بھلا بیٹھے تھے اور ـــــ جب ڈاکٹر شیرازی نے بتایا کہ عاشی کے خون نے ناجیہ کی زندگی بچائی تو وہ [illegible] اندر ہی اندر تڑپ کر رہ گئے۔

"ڈاکٹر ـــــ" شہباز نے محمود حسین کو خاموش دیکھ کر ڈاکٹر سے پوچھا "کیا اب ہم مریضہ کو دیکھ سکتے ہیں"

"آپ لوگ چاہیں تو ایک ایک کر کے اندر جا سکتے ہیں مگر فی الحال مریضہ کو ڈسٹرب نہ کیا جائے ـــــ میں نے [illegible] سے نیند کا انجکشن لگا دیا ہے ـــــ دو گھنٹے بعد ہی وہ دوبارہ ہوش میں آ سکے گی"

"زخم زیادہ گہرے تو نہیں" محمود حسین نے دریافت کیا۔

"آپ پریشان نہ ہوں ـــــ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے مریضہ کو وقتی کمزوری لاحق ہو گئی ہے جو رفتہ رفتہ جاتی رہے گی ـــــ رہا زخم کا معاملہ تو خدا کا شکر ہے کہ چہرہ محفوظ ہے البتہ بازوؤں اور جسم کے کچھ دوسرے حصوں پر [illegible] زخم آئے ہیں مگر اس میں بھی تشویش کی کوئی بات نہیں ـــــ"

"میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں ڈاکٹر ـــــ"

"نو مینشن بیرسٹر ـــــ" ڈاکٹر شیرازی نے مسکراتے ہوئے بڑے خلوص سے جواب دیا "جو کچھ میں نے کیا [illegible] وہ میرے پیشے کے فرائض میں شامل ہے ـــــ"

شمسہ بیگم کو صورتِ حال کا علم ہوا تو وہیں راہداری میں سجدہ ریز ہو گئیں ـــــ بیٹی کی زندگی کا مژدہ

سُن کر اُن کی آنکھیں چھلک اُٹھیں ـــــ سجدے سے سر اُٹھایا تو دونوں ہاتھ پھیلا کر خدا سے اُس کی مہربانیوں اور کرم نوازی کا شکر ادا کرنے لگیں، محمود حسین کی پلکوں پر بھی خوشی کے آنسو جھلملا رہے تھے۔

"کیا ہم واقعی اپنی ناجیہ کو کچھ دنوں بعد گلے لگا سکیں گے؟" شمسہ بیگم نے فرش سے اُٹھتے ہوئے شوہر سے پوچھا۔

"کیوں نہیں ـــــ ڈاکٹر نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ خطرے سے بالکل باہر ہے۔"

"ہم اُس کی رحمت کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے۔" شمسہ بیگم نے چھت کی طرف ایک نظر اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔" محمود حسین نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا "وہ جو بھی کرتا ہے اس میں انسان کی کوئی نہ کوئی بہتری ضرور ہوتی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اب اگر آپا کو بھی ناجیہ کے حادثے کی اطلاع کر دیں تو مناسب ہوگا ورنہ بعد میں انھیں شکایت ہوگی۔"

"آپ فکر نہ کریں، میں آج ہی کسی وقت وہاں بھی اطلاع کر دوں گا۔"

"اور ہاں ـــــ" شمسہ بیگم نے اچانک چونکتے ہوئے کہا "گھر فون کر کے عاشی کو مطلع کر دیں کہ ناجیہ اب خطرے سے باہر ہے ـــــ جلدی میں اُسے ہم کچھ بتا نا ہی بھول گئے ـــــ خدا جانے وہ یہ خبر سُنے گی تو اُس کے دل پر کیا گزرے گی۔"

"عاشی کو حالات کی اطلاع ہو چکی ہے۔" محمود حسین دبی زبان میں بولے "حادثے کی خبر سب سے پہلے اسی نے مجھے دی تھی۔"

"عاشی نے ـــــ مگر اُس نے مجھ سے تو کچھ نہیں بتایا تھا۔" شمسہ بیگم نے تعجب سے پوچھا۔

"صرف اس لئے کہ اگر آپ کو فوری طور پر باخبر کر دیا جاتا تو آپ کی طبیعت بھی غیر ہو جاتی۔"

"لیکن وہ ہمارے ساتھ یہاں کیوں نہیں آئی ـــــ"

"وہ ـــــ ہم سے پہلے یہاں پہنچ چکی تھی ـــــ"

"یہاں پہنچ چکی ہے ـــــ" شمسہ بیگم حیرت سے بولیں "کہاں ہے وہ ـــــ"

"اندر کمرے میں ـــــ" محمود حسین نے نظریں جھکائے ہوئے افسردہ انداز میں کہا "ناجیہ کے پاس۔"

اور ـــــ"

"اور کیا ـــــ" شمسہ بیگم نے شوہر کو خاموش پا کر تیزی سے وضاحت چاہی۔

محمود حسین کے چہرے پر بکھرنے والے تاثرات دیکھ کر وہ پریشان ہو گئیں ـــــ فوری طور پر انھیں یہی خیال ہوا تھا کہ شاید ناجیہ کے بارے میں کوئی اہم بات اُن سے چھپائی جا رہی ہے۔

"ڈاکٹر شیرازی کا خیال ہے کہ اگر ناجیہ کو بر وقت خون نہ دیا جاتا تو اُس کی حالت بگڑ بھی سکتی تھی۔"

"اور وہ خون ـــــ" شمسہ بیگم کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

"عاشی نے دیا ہے۔" محمود حسین آہستہ سے بولے "اتفاق ہی تھا جو عاشی کا گروپ ناجیہ کے خون کے گروپ سے مل گیا ورنہ اس گروپ کے خون کی فراہمی میں دشواری بھی پیش آ سکتی تھی۔"

"اگر عاشی ایسا نہ کرتی تو مجھے اس سے تمام زندگی شکایت رہتی۔" شمسہ بیگم نے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا۔

"کیوں؟ ـــــ بلکہ اس لیے کہ اس پر ہمارے احسانات اور نوازشیں بے شمار ہیں۔" محمود حسین کی آواز میں درد تھا، ہلکا سا طنز تھا۔

"اس لئے نہیں ـــــ بلکہ اس لئے کہ وہ ناجیہ سے بڑی ہے ـــــ ناجیہ سے زیادہ سمجھ دار ہے ـــــ ہوشیار ہے اور ـــــ"

"اور کیا ـــــ؟"

"اور یہ کہ وہ ناجیہ کی بڑی بہن ہے۔" شمسہ بیگم متاثر لہجے میں بولیں "بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خون کو خون کا احساس نہ ہو ـــــ اور پھر ماں کی حیثیت سے عاشی پر میرا بھی بہت حق ہے۔"

"بیگم ـــــ آپ....."

"جی ہاں ـــــ" شمسہ بیگم نے شوہر کو گھورتے ہوئے پیار سے کہا "آپا نے مجھے پوری تفصیل بتا دی ہے مجھے آپ سے ـــــ"

شمسہ بیگم کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھیں لیکن شہباز جو ناجیہ کے کمرے میں چلا گیا تھا واپس آیا تو وہ خاموش ہو گئیں

"ناجیہ اور عاشی کیسی ہیں؟" محمود حسین نے شہباز سے دریافت کیا۔ پہلی بار ناجیہ اور عاشی کا نام ایک ساتھ لے کر انھیں سکون اور اطمینان نصیب ہوا تھا اس کا اندازہ اُن کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تھا۔

"فی الحال دونوں غنودگی کی کیفیتوں سے دوچار ہیں۔"

"خدا پر بھروسہ رکھو بیٹے۔ وہ بہتر ہی کرے گا۔" شمسہ بیگم نے شہباز سے کہا پھر شوہر پر ایک نظر ڈالی اور دھڑکتے ہوئے دل سے دروازہ کھول کر آہستہ سے کمرے میں داخل ہو گئیں۔

دو صاف ستھرے اور اُجلے بستروں پر ناجیہ اور عاشی لیٹی تھیں، دونوں ہی بیہوشی کی حالت سے دوچار تھیں۔ بازو میں دواؤں کی ہلکی ہلکی بوتلیں جھول رہی تھیں، ناجیہ کے قریب کھڑی نرس نے شمسہ بیگم کے چہرے سے اُن کے اور مریضہ کے رشتے کا تعلق محسوس کیا تو دُور ہی سے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموشی کی تاکید کر دی مبادا کہ مریض کے سکون میں کوئی خلل پیش آئے۔

ناجیہ کے سر پر ہلکی سی پٹی بندھی ہوئی تھی، چہرے پر ایک دو جگہ معمولی خراشیں نظر آ رہی تھیں، گلوکوز کی تھیلی بھی ایک اس کو دی جا رہی تھی۔ شمسہ بیگم نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھال رکھا تھا، نرس کے اشارے کے بعد وہ اور سنبھل گئیں۔ ہوئے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی بیٹی کے بستر کے قریب جا کر رک گئیں، ماں کی ممتا اُن کے وجود کے اندر مچل رہی تھی۔ مگر وہ مہر بلب خاموش کھڑی تھیں۔ اُن کی نگاہیں ناجیہ کے تپتے اور مرجھائے ہوئے چہرے پر مرکوز تھیں اور ذہن میں بگولے سے اُٹھ رہے تھے وہ سوچ رہی تھیں۔

ناجیہ کے ساتھ جو کچھ ہوا اُس میں جہاں دادی کی تربیت کا دخل تھا وہاں باپ کے نقشِ قدم بھی شامل تھے ـــــ محمود حسین نے بھی ماں کی مرضی کے خلاف اپنی خوشی کی خاطر چپ چپاتے شادی کر لی تھی ـــــ اس راز کو راز رکھنے کی خاطر وہ ہمیشہ گم صم رہتے ـــــ کبھی بیٹے بٹھائے لاہور کے چکر لگانے شروع کر دیتے اور کبھی پہروں اپنے خیالوں میں ڈوبے رہتے لیکن انھوں نے شمسہ بیگم کو اپنے راز میں شریک نہیں کیا تھا۔

اور یہی محمود حسین کی بھول تھی ـــــ اگر وہ شمسہ بیگم کو اپنی مرضی سے آگاہ کر دیتے تو وہ روزاوّل ہی سے محتاط ہو جاتیں ـــــ ناجیہ کی تربیت پر کڑی نگہداشت رکھتیں ـــــ اس کی شرارتوں اور خودسری کو محض بچپنے کی شیطنیوں سے تعبیر دے کر یوں خاموش نہ رہتیں۔ قدموں کے ان نشانات کو مٹانے کی حتی الامکان کوشش کرتیں جو محمود حسین کی شاہ راہوں پر چھوڑ آئے تھے ـــــ اور

اب ناجیہ ان ہی نشانوں پر چل نکلی تھی ـــــ وہ بھی باپ کی طرح ماں سے اپنی نجی زندگی کے ہنگاموں کو راز رکھنے کی عادی ہو گئی تھی ـــــ اُس نے بھی کچھ سوچے سمجھے بغیر عدیل سے ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھا لیا ـــــ پھر بالآخر وہ شہباز کا انتخاب کر بیٹھی ـــــ اور اب نہ جانے کن حالات کے تحت حادثے کا شکار ہو کر بستر پر بے سُدھ پڑی تھی۔

حالات کے نشیب و فراز اور وقت کے دھاروں نے کیسی عجیب صورت اختیار کر لی تھی ـــــ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی اور شمسہ بیگم کل کی طرح آج بھی گم صم خاموش نظروں سے گزرتے وقت کی رفتار کا اندازہ لگا رہی تھیں۔

وقت ـــــ

جس کی کھوج میں وہ ایک طویل عرصے تک بھٹکتی رہی تھیں ـــــ

جس نے بیٹی کی رگوں میں دوڑتے خون کو بھی وہی حدت بخش دی جو باپ میں رہ چکی تھی۔

جس نے شمسہ بیگم کو کل ـــــ شوہر کی طرف سے فکرمند بنا رکھا تھا ـــــ

اور آج ـــــ

بیٹی کو پیش آنے والے حادثے نے انھیں پریشان کر دیا تھا ـــــ

وہ کل بھی مجبور تھیں ـــــ اور

حالات نے آج بھی انھیں خاموش رہنے پر مجبور کر دیا تھا ـــــ

بات جوان لڑکی کی تھی ——
اگر زبان سے نکل جاتی تو افسانہ بن جاتی ——
اور پھر یہ افسانہ ناجیہ کے مستقبل پر گھٹا ٹوپ اندھیروں کی طرح پھیل سکتا تھا۔
شمسہ بیگم سراپا لرزاٹھیں پھر اُمید کی ایک کرن اُن کے ذہن میں چھوٹی —— نظروں کا زاویہ بدل کر انھوں نے عاشی کی جانب دیکھا جو دوسرے بستر پر موجود تھی —— جس نے اپنا خون دے کر ناجیہ کی زندگی بچائی تھی۔
اور اب شمسہ بیگم کے ذہن میں یہی خیال ابھر رہا تھا کہ عاشی کا خون اپنا رنگ ضرور لائے گا۔
وہ بھی محمود حسین کی بیٹی تھی، اُس کی رگوں میں اُن کا خون دوڑ رہا تھا —— لیکن وہ حد درجہ مغرور اور دُور اندیش تھی، تکبر اور غرور اُس کے ایک ذرا نام کو نہ تھا —— شاید اس لئے کہ وہ غربت کے سایوں تلے پروان چڑھی تھی۔
اُسے ناجیہ کی طرح وہ آرام اور وہ آسائشیں نہیں ملی تھیں جو انسان کو فکروں سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔
ابھی تک تو عاشی کو اس بات کی خبر نہیں ہوئی تھی کہ وہ کس گھرکا روشن چراغ ہے اور اُس کی حیثیت کیا ہے —— مگر اس کے باوجود اُس نے اپنا لہو دے کر ناجیہ کی جان بچالی تھی —— ناجیہ کی تمام سابقہ غلطیوں اور کوتاہیوں کو فراموش کر دیا تھا —— شاید اس طرح وہ ان احسانوں کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہو جو ناجیہ کے گھرانے نے اس پر کئے تھے۔
اُسے کیا معلوم تھا کہ وہ خود بھی اسی گھر کی ایک فرد ہے اور ناجیہ کی زندگی بچا کر محسن بن گئی تھی۔
شمسہ بیگم نے ممتا بھری نظروں سے عاشی کے چہرے کو دیکھا جو اس وقت بھی پُر وقار نظر آرہا تھا۔
آہستہ سے جھک کر اُنھوں نے عاشی کی کشادہ پیشانی پر اپنے لرزتے کپکپاتے ہونٹ رکھ دیئے۔ پھر اُن کے دل کے نہاں خانوں سے ایک دُعا نکل کر عرش کی بلندیوں کی جانب پرواز کر گئی۔
"اے کاش عاشی کا خون ناجیہ کے لہو میں شامل ہو کر اس کی روش بدل دے ——"

✱

غنودگی کا اثر دُور ہوا تو اُس کے احساسات آہستہ آہستہ بیدار ہونے لگے۔ بیتی باتوں کا دھندلا دھندلا عکس اُس کے ذہن کے پردوں پر بتدریج صاف ہونے لگا۔ پھر اُسے یاد آگیا ——
ناجیہ کسی حادثے سے دوچار ہوئی تھی ——
اُسے اس کی اطلاع فون پر نیلی ڈاکٹر نے دی تھی —— وہ ایک لمحے کو لرز اٹھی —— پھر ——
اُس نے فوری طور پر فون کر کے محمود حسین کو اطلاع دی اور خود ہسپتال پہنچ گئی۔
جانے کیوں اُس نے شمسہ بیگم کو کچھ نہیں بتایا تھا۔
شاید اس لئے کہ وہ ممتا کے دکھتے دل کو اور پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی —— یا
اس منحوس خبر کو وہ اپنی زبانی اُن تک نہیں پہنچانا چاہتی تھی ——
ہسپتال پہنچنے تک اُس کے ذہن میں حادثے سے متعلق ہزاروں وسوسے جاگے تھے لیکن ہسپتال پہنچ کر اُسے اتنا ہوش ہی نہ رہا کہ وہ حادثے کی وجوہ پر غور کرتی یا اس کے بارے میں دریافت کرتی۔
ناجیہ کو فوری طور پر دو بوتل خون کی ضرورت تھی۔ خون زیادہ بہہ جانے سے اُس کی حالت ڈاکٹروں کی نظروں میں مخدوش ہوتی جا رہی تھی اور مشکل یہ درپیش تھی کہ ناجیہ کو خون کے جس گروپ کی ضرورت تھی وہ ہسپتال میں موجود نہیں تھا۔ اُس نے یکلخت فیصلہ کر لیا کہ وہ ناجیہ کو اپنا خون دے گی۔ اُس نے اپنے پروردگار سے دعا مانگی کہ اُس کا خون کسی طرح ناجیہ کے کام آجائے —— وہ ہر قیمت پر ناجیہ کی زندگی بچانا اپنا فرض سمجھتی تھی۔
محمود حسین کی خاطر ——
جنھوں نے اُسے کبھی غیر نہیں سمجھا تھا ——
ہمیشہ اپنائیت کا برتاؤ کیا تھا —— !!
شمسہ بیگم کی خاطر ——
جنھوں نے اُسے فرش سے اٹھا کر عرش تک پہنچا دیا تھا ——
اچھی تعلیم حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا تھا ——

اپنے گھر —— اپنے دل میں جگہ دی تھی ——
بڑے خلوص اور پیار سے قدم قدم پر اُس کی دلجوئی کی تھی۔
اُس کے زخموں پر مرہم رکھا تھا ——
پھر ——
آج جب ناجیہ موت و زیست کی کشمکش سے دوچار تھی تو وہ بھلا کیونکر اس طرح پھر لیتی۔ اُس کے اختیار میں ہوتا تو وہ زندگی دینے سے بھی دریغ نہ کرتی۔ خون تو بڑی حقیر سی چیز تھی۔
جتنی دیر تک اُس کے خون کا معائنہ ہوتا رہا وہ خدا کے حضور یہی دعا مانگتی رہی کہ وہ ناجیہ کے کام آجائے —— جس دلیر پر اُس نے ہوش سنبھالا تھا —— جس چوکھٹ پر اُس نے بچپن سے جوانی تک کے مرحلے طے کئے تھے وہ اس گھر کی خوشیوں کو اُجڑتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔
اُس کا انگ انگ اس گھرانے کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا —— وہ اس بوجھ کو مر کر بھی دور نہیں کر سکتی تھی لیکن ہلکا ضرور کر سکتی تھی چنانچہ جب اُس کے خون کا گروپ ناجیہ کے گروپ سے مل گیا تو وہ خوشی سے جھوم جھوم اٹھی —— یوں جیسے اُسے منہ مانگی مراد مل گئی ہو —— پھر جب اُس کا خون آہستہ آہستہ ناجیہ کے جسم میں منتقل ہونا شروع ہوا تو اُس کی مسرتوں کا کوئی ٹھکانا نہ رہا —— تھکتی باندھے وہ ناجیہ کے چہرے کو دیکھتی رہی جس پر اُس وقت بھی غرور اور تکبر موجود تھا —— امارت اور دولت کا نشہ طاری تھا۔
وہ ناجیہ کو پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتی رہی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں جانے کیوں تیز ہو رہی تھیں اور ہن میں بس ایک ہی خیال رہ رہ کر تڑپ رہا تھا —— 'ناجیہ کی زندگی بچ جائے' —— اور پھر وہ ناجیہ کو بتا سکے قدرت نے جس ماحول میں اُسے پروان چڑھایا ہے وہاں انسان کچھ پا لینے کے بجائے کھو دینے کا زیادہ حوصلہ رکھتا ہے۔
وہ ناجیہ کو باور کرانا چاہتی تھی کہ اس کے دل کے نہاں خانوں میں شہباز کی تصویر ضرور موجود ہے۔
اُس نے شہباز کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔
چاہا ہے —— محبت کی ہے —— لیکن ——
زبان سے اپنی محبت کا اقرار نہیں کیا۔
اس لئے کہ محبت پرستش کا نام ہے —— عبادت کا ایک خوبصورت اور معصوم طریقہ ہے۔
دل میں پروان چڑھتی ہے تو بڑی مقدس اور پاک رہتی ہے۔
ظاہر ہو جائے تو عام ہو جاتی ہے —— رسوا ہو جاتی ہے۔
اور ——
ضروری تو نہیں کہ ہر حسین خواب کی تعبیر بھی حسین ہی ہو ——؟
اُس نے یہی سوچا تھا کہ وہ شہباز کی تصویر کو اپنے وجود میں سجائے رکھے گی لیکن ناجیہ کے درمیان سے ہٹ جائے گی۔
اپنی محبت کو بدنام نہیں ہونے دے گی۔
اپنی عبادت اور اپنی پرستش پر کوئی حرف نہ آنے دے گی۔
اور بڑے خلوص سے شہباز کو ناجیہ کی جھولی میں ڈال کر اپنی محبت کو وہ رنگ دے گی جو امر ہو جائے گا۔
جس کے نقش ہمیشہ اُس کے دل پر جگمگاتے رہیں گے۔
جتنی دیر وہ ہوش میں رہی خیالی منصوبے باندھتی رہی پھر غنودگی بڑھتی گئی۔ اس کے پپوٹے بوجھل ہوتے گئے اور ہر احساس ڈوبتے ذہن کی طرح گھپ اندھیروں میں ڈوب گیا۔
اور اب —— وہ ہوش میں آئی تو اُسے سب سے پہلے ناجیہ کا خیال آیا، چند لمحے وہ خاموش لیٹی چھت تکتی رہی پھر نظریں گھمائیں تو دھک سے رہ گئی —— شہباز آرام کرسی پر بیٹھے اُسے بڑی توجہ اور اپنائیت سے دیکھ رہے تھے، وہ ان نظروں کی تاب نہ لا سکی —— جلدی سے پلکیں جھکائیں، آہستہ سے پوچھا۔
"ناجیہ کہاں ہے ——"

"ڈاکٹروں نے اُسے دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا ہے" شہباز نے کہا

"وہ ——— وہ خیریت سے تو ہے"

"جی ہاں ——— بالکل خیریت سے ہیں" شہباز نے سنجیدگی سے جواب دیا "ڈاکٹروں نے یقین دلایا ہے کہ وہ بہت جلد روبصحت ہو کر گھر واپس جا سکتی ہیں ——— آپ کے خون نے ناجیہ کی زندگی کو تمام خطروں سے مکمل طور پر نجات دلا دی ہے ——— لیکن آپ ———"

"انکل اور آنٹی کہاں ہیں" عاشی نے شہباز کا جملہ پورا نہیں ہونے دیا

"آنٹی ناجیہ کے پاس ہیں اور انکل فراز کی امی کو اطلاع دینے گئے ہیں ———"

"آپ کو حادثے کی خبر کیسے ہوئی ———" اُس نے یونہی پوچھ لیا

"انکل کی مہربانی سمجھئے جو انھوں نے مجھے باخبر کر دیا ——— ورنہ ———"

"ورنہ کیا ———" اُس نے مدھم لہجے میں وضاحت چاہی ——— شہباز کی خاموشی نے اُسے مضطرب کر دیا تھا

"شاید میں آپ کی اس شاندار قربانی کی داد نہ دے سکتا جو آپ نے ناجیہ کو اپنا خون دے کر پیش کی ہے"

"یہ میرا فرض تھا ———" وہ ٹھوس لہجے میں بول۔

"اور یہی فرض آپ کے چہرے پر نقاہت بن کر جم گیا ہے"

"یہ عارضی باتیں ہیں" اُس نے کہا ——— "وقتی کمزوری ایک انسانی زندگی سے زیادہ قیمتی نہیں ہوتی"

"انسان کو خود سے زیادہ دوسروں کا خیال رکھنا چاہیئے ——— آپ یہی باور کرانا چاہتی ہیں نا ———؟"

"جی ہاں ———"

"پھر آپ پر میرے جذبات اور احساسات کا خیال بھی لازم ہے ———"

"شہباز ———" اُس نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن شہباز نے مہلت نہ دی تڑپ کر بولا

"میں جانتا ہوں کہ بیرسٹر محمود حسین اور اُن کے خاندان کے احسانات آپ پر بے شمار ہیں اور آپ اگر چاہیں تو مر کر بھی ان احسانوں کے بوجھ سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتیں ——— اگر یہی خیال دامنگیر ہے تو پھر ایک ہی بار اپنی زندگی کا خاتمہ کیوں نہیں کر لیتیں ——— اس طرح سسک سسک کر ——— سہم سہم کر ——— اور مر مر کر جینے سے کیا حاصل کس تمغے کی تمنا ہے آپ کو ——— کیا ملے گا آپ کو پتھروں سے سر ٹکرا کر ———"

"شہباز ——— پلیز" اُس نے دبی زبان میں احتجاج کیا۔

"ناجیہ بڑے باپ کی بیٹی ہے ——— اس کے لئے بازار سے ایک دو نہیں خون کی سینکڑوں بوتلیں خریدی جا سکتی تھیں لیکن ——— اگر آپ کو خدانخواستہ کچھ ہو جاتا تو ———" شہباز جذباتی ہو گیا، اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔

عاشی نے کوئی جواب دینے کے بجائے اُسے کنکھیوں سے دیکھا ——— شہباز کے چہرے پر اُبھرنے والے تاثرات بڑے معصوم ——— پُرخلوص اور دلکش تھے، آنکھوں میں الجھنیں تیر رہی تھیں ——— اور ہونٹ ——— بار بار یوں کپکپانے لگتے جیسے بہت کچھ کہنا چاہتے ہوں ———

کوئی ایسی بات ———

جو ابھی تک دل کی گہرائیوں میں مچل رہی تھی ———

اظہار کے لئے مضطرب تھی ———

لیکن ابھی تک ہونٹوں تک نہیں آ سکی تھی ———

ایک لمحے کو عاشی کے خیالات بھی ڈگمگانے لگے، وہ شہباز کی کھوئی کھوئی نظروں میں ڈوبنے لگی تھی مگر اُسے فوراً وقت اور حالات کا خیال آ گیا ——— جلدی سے سنبھل کر بولی۔

"مجھے کچھ نہیں ہوگا شہباز صاحب ——— اور ——— اور پھر شاید آپ کو اس بات کا اندازہ بھی نہیں کہ ناجیہ کی زندگی میری زندگی سے بہت زیادہ قیمتی ہے ——— ناجیہ کے گھر والوں کے لئے اور ——— آپ کے لئے بھی"

"میرے لئے ———" شہباز چونکا، عاشی کے چہرے پر نظریں جما کر پوچھا "ناجیہ کی زندگی کا بھلا میری ذات سے کیا تعلق؟"

"اگر نہیں ہے تو اب ہو جائے گا" عاشی دل مسوس کر بولی، نہ جانے کیوں اس بار وہ اپنے دل کی دھڑکنوں کو اپنے سینے کی گہرائیوں تک محدود نہ رکھ سکی ——— جذبات کا رنگ اُس کے لہجے میں بھی کسک بن کر اُبھر آیا۔

"عاشی ———" شہباز نے سپاٹ آواز میں کہا "میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا"

"ناجیہ ——— آپ کو پسند کرتی ہے" عاشی خود کو سنبھالتے ہوئے بولی "اُس نے آنٹی پر بھی اپنی خواہش کا اظہار کر دیا ہے اور ———

"اور تمہارا خیال ہے کہ میں بھی تمہاری طرح خاموشی سے اپنی محبت کا گلا گھونٹ کر دوسروں کی خواہشات کی تکمیل کی خاطر اپنی زندگی کی بھینٹ پیش کر دوں گا" شہباز بپھر اُٹھا، اُس کی آنکھوں میں خون کی سرخی پھیل کر گہری ہونے لگی "اس خیال کو دل سے نکال دو عاشی ——— میں تمہاری خاطر ——— اپنی محبت کی خاطر اپنی زندگی تو داؤ پر لگا سکتا ہوں لیکن اس دل کو مجبور نہیں کر سکتا جو میرے اپنے اختیار میں نہیں ہے"

"شہباز ———"

عاشی نے اُسے سہمے ہوئے لہجے میں پکارا مگر شہباز سیمابی انداز میں پلٹ کر کمرے سے باہر چلا گیا اور عاشی ——— اپنے دل کی دھڑکنوں کا شمار کرنے لگی جو کسی طرح تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھیں ——— !!

شمسہ بیگم نے جس انداز میں عاشی کو بحیثیت بیٹی کے قبول کیا اس سے محمود حسین کے سر سے ایک بڑا بوجھ اُتر گیا ——— انھیں خوشی تھی کہ اب عاشی اپنا وہ کھویا ہوا مقام حاصل کر لے گی جس کی خاطر گردشِ حالات نے اُسے بھنور کی طرح نچایا تھا ——— لیکن اس کے ساتھ ہی محمود حسین کو..... اس بات کی بھی فکر لاحق تھی کہ زندگی کے اس اہم ترین راز کا انکشاف عاشی پر کس طور کیا جائے۔

عاشی ———

جسے حالات نے دم گھٹ گھٹ کر زندہ رہنے کا عادی بنا دیا تھا ———

زخم سہہ کر مسکرانے کا درس دیا تھا ———

کیا وہ اچانک اتنی بڑی خوشخبری سُن کر اپنے حواس پر قابو پا سکے گی ———؟

کیا اُس کے دل کی دھڑکنیں اُس کے اختیار میں رہ سکیں گی ———؟

اور ———

کیا عاشی اس حقیقت سے آشنا ہو جانے کے بعد مجسم سوال نہیں بن جائے گی ———

کیا اُسے محمود حسین سے یہ پوچھنے کا اختیار نہ ہوگا کہ جو اپنے تھے اتنے پرائے کیوں بنے رہے ———؟

اُسے اتنے طویل عرصے تک باپ کی شفقت سے کیوں محروم رکھا گیا ———؟

کیا مصلحت تھی ———؟

کیوں اُسے لاوارثوں کی طرح زندہ رہنے پر مجبور کیا گیا ———؟

ان نعمتوں سے دُور رکھا گیا جس پر اُسے مکمل اختیار تھا ———

حق تھا ———

اُس کے سر پر محبت سے ہاتھ کیوں نہیں پھیرا گیا ———؟؟

ان اندھیروں کو برقرار رکھنے کی کیا ضرورت تھی جنھوں نے اُس کی روح کو بھی پابہ زنجیر کر دیا تھا ———

کیوں اُسے عرش کی بلندیوں سے فرش کی پستیوں کی جانب دھکیل دیا گیا ———

محرومیوں کا ہدف کیوں بنایا گیا۔

کیوں ———!

آخر کیوں ———!!

اور ——— اگر اُس نے محرومیوں کو اپنا مقدر اور کاتبِ تقدیر کی رضا سمجھ کر قبول کر لیا تھا تو اب اُس سے اس مجبوریوں کا اثاثہ کیوں چھینا جا رہا تھا ———

اس بات کا احساس کیوں دلایا جا رہا ہے کہ وہ اب تک جن راستوں پر سفر کرتی رہی تھی وہ انجانے راستے تھے۔
ان راستوں پر وہ اپنی مرضی سے تو آگے نہیں بڑھی تھی ——

وہ مجبور تھی ——

بے بس تھی ——

لاچار اور بے یار و مددگار تھی ——

جو کچھ اُس کے ماضی کے ساتھ بیت گیا اس میں اس کا اپنا کوئی قصور نہیں تھا ——

وہ تو بالکل بے قصور تھی ——

بے حد معصوم تھی ——

پھر ——

اسے ناکردہ گناہوں کی سزا کیوں دی جا رہی تھی ——

اگر حالات اور وقت کے تقاضوں نے خون کے رشتوں میں کوئی دراڑ —— کوئی خلیج پیدا کر دی تھی تو ——

اب اس خلیج کو پاٹنے کی کیا ضرورت تھی ——

جو تعلق گردِ سفر سے دھندلا گئے تھے —— اپنا نشان مٹا چکے تھے ——

انھیں دوبارہ اجاگر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

اور ——

اُس کی پُرسکون زندگی میں ہلچل پیدا کرنے سے دوسروں کو کیا حاصل تھا ——

وقت نے تصویر کے جس رُخ کو زمانے کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا اُسے پوشیدہ ہی رہنے دیا جاتا تو کیا حرج تھا۔

ایسا کیوں کیا جا رہا تھا ——

کیا محض اس لئے کہ اُس نے اپنا لہو دے کر ناجیہ کی زندگی کو سیراب کر دیا تھا ——

کیا اُسے اُس کے لہو کی قیمت ادا کی جا رہی تھی ——

اور اگر ایسا ہی تھا تو پھر اُسے زندگی کی نوید دینے کے بجائے اگر موت کا مژدہ سُنا دیا جاتا تو زیادہ مناسب تھا۔

اس طرح اذیت کا احساس صرف ایک بار ہوتا ——

لیکن ——

اُسے اس کی حیثیت کا یقین دلا کر، اس کے ماضی کے زخموں کو از سرِ نو تازہ کر کے، تازیست تڑپنے پر مجبور کرنا کہاں کا انصاف تھا ——

یہ کیسی بھلائی تھی جو اُس کے انگ انگ کو کچوکے لگا رہی تھی ——

اس رحم دلی کی کیا ضرورت تھی ——

وہ تو صحراؤں میں خاردار راستوں پر چلنے کی عادی ہو چکی تھی ——

پھر ——

اُسے لہلہاتے سبزہ زاروں کی جانب کیوں واپس لایا جا رہا تھا ——

آخر کیوں ——؟؟

اور یہی وہ پریشان کن احساسات تھے جو محمود حسین کو پریشان کرتے رہتے —— حالات نے زندگی کی ایک گتھی کو سلجھا دیا تو وقت نے ایک نئی الجھن پیدا کر دی —— ایک طرف ناجیہ کی حالت تیزی سے ٹھیک ہو رہی تھی اور دوسری طرف عاشی کے مسئلے نے ڈور کے دوسرے سرے کو الجھا دیا تھا۔

اس وقت بھی محمود حسین اپنے بستر پر لیٹے ان ہی خیالات میں گم تھے کہ شمسہ بیگم حسبِ دستور دودھ کا گلاس لئے خواب گاہ میں داخل ہوئیں، شوہر کے چہرے پر فکر اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات دیکھے تو مضطرب ہو گئیں، ایک لمحے اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑی شوہر کی پریشانی کے اسباب پر غور کرتی رہیں پھر قریب جا کر بڑے پیار سے بولیں۔

" میں پہلے بھی آپ کو کئی بار سمجھا چکی ہوں کہ جتنی دیر گھر کی چہار دیواری میں رہا کریں صرف گھر کے بارے میں سوچا کریں —— مقدمات کی الجھنیں اور ریشہ دوانیاں صرف فائلوں اور دفتر تک محدود رکھا کریں "

" آپ نے یہ کیسے اندازہ لگا لیا کہ میں اس وقت کسی کیس کے بارے میں فکرمند ہوں "

" آپ کے چہرے سے "

" یہ بھی تو ممکن ہے کہ میں کسی گھریلو اُلجھن شکار ہوں "

" کیا مطلب ——" شمسہ بیگم نے تعجب سے پوچھا " گھر کی بھلا کیا الجھن ہو سکتی ہے "

" کچھ نہیں ——" محمود حسین نے بیوی کو ٹالنے کی خاطر کہا " یوں ہی ذرا ذہن بھٹک گیا تھا ——"

" آپ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اُس نے آپ کی تمام دشواریاں دُور کر دیں —— عاشی آپ کو واپس مل گئی اور ناجیہ بھی خدا کے فضل و کرم سے کل تک واپس گھر آ جائے گی "

" میں بے حد شکر گزار ہوں بیگم " محمود حسین آہستہ سے بولے " خدا کا بھی جس نے عاشی کو مجھ سے ملا دیا —— اور —— آپ کا بھی "

" یہ میرا شکر یہ کس لئے ادا کیا جا رہا ہے "

" آپ نے اگر عاشی کو قبول نہ کیا ہوتا تو اس غریب کی بقیہ زندگی بھی محرومیوں اور ناکامیوں میں بسر ہوتی "

" عاشی کی بات جانے دیجئے ——" شمسہ بیگم نے مسکراتے ہوئے شکایت کی " یہ فرمایئے کہ آپ نے فائزہ اور اپنی شادی کو اتنے عرصے تک مجھ سے راز کیوں رکھا ——

" میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا "

" ایک بات کہوں —— آپ بُرا تو نہیں مانیں گے "

" کہیئے ——"

" مجھے شروع ہی سے اس کا اندازہ تھا کہ آپ نے اپنی امّی حضور کی وجہ سے مجھ سے شادی کی ہے "

" کیا مطلب ——" محمود حسین نے سنجیدگی سے پوچھا " کیا آپ کو میرے کسی برتاؤ سے کوئی تکلیف پہنچی ہے "

" جی نہیں —— آپ نے مجھے ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کی ہے اور ہر طرح سے میرا خیال رکھا ہے "

" پھر —— میرا مطلب ہے کہ ——"

" آپ پریشان نہ ہوں، میں بتاتی ہوں " شمسہ بیگم نے جلدی سے کہا پھر پہلو بدل کر بولیں " بیوی اور شوہر کے درمیان خداوند کریم نے جو تعلق رکھا ہے وہ اور تمام رشتوں سے زیادہ گہرا اور حساس ہوتا ہے چنانچہ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہے جو آپ کو اکثر گم صم کر دیا کرتی تھی —— بار بار آپ کا لاہور آ جانا —— ہنستے ہنستے اچانک سنجیدگی اختیار کر لینا اور کھوئے کھوئے رہنا —— یہ تمام باتیں اور کیفیتیں اس بات کی غماز تھیں کہ آپ کے ماضی میں کہیں نہ کہیں کوئی پھانس ضرور موجود تھی جس کی چبھن آپ کو اکثر بے کل کر دیتی تھی —— اور پھر آپ کے دوست ذیشان کے خطوط ——"

" لیکن آپ نے کبھی اس ضمن میں مجھ سے کوئی باز پرس نہیں کی " محمود حسین نے ہونٹ کاٹتے ہوئے دریافت کیا۔

" مجھے اپنی محبت اور وفاؤں پر اعتماد تھا " شمسہ بیگم نے کہا " اور اس بات کا یقین بھی کہ آپ خدانخواستہ کسی غلط چکر میں نہیں تھے ——"

محمود حسین نے کوئی جواب نہیں دیا، بیوی کو عقیدت بھری نظروں سے تکتے رہے پھر دل کے غبار کو ہلکا کرنے کے لئے اپنے گم شدہ ماضی کی تمام داستان سُنا ڈالی

" آپ نے فائزہ کے ساتھ انصاف نہیں کیا " شمسہ بیگم پوری روداد سننے کے بعد ایک سرد آہ بھر کر بولیں۔ آپ کو اپنی خوشیوں کی تلاش میں تمام زندگی سرگرداں رہنا چاہیئے تھا ——"

" کیا حاصل ہوتا ——" محمود حسین کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے تو شمسہ بیگم پریشان ہو گئیں، جلدی سے موں کا رُخ بدلتی ہوئی بولیں " اب ہمیں صرف عاشی کے بارے میں سوچنا چاہیئے —— اس فرض کی ادائیگی کی فکر کرنی ہیئے جو عاشی کی طرف سے ہم پر واجب الادا ہے ——"

" میں بھی یہی سوچ رہا تھا مگر ایک فکر پریشان کر دیتی ہے "

" وہ کیا ——"

"کیا عاشی تمام باتوں سے واقف ہو جانے کے بعد مجھے معاف کر دے گی" محمود حسین بھرائی ہوئی آواز میں بولا
"کیا وہ کوئی شکایت، کوئی شکوہ، کوئی گلہ نہیں کرے گی"

"بس، ——— اتنی سی بات پر فکر مند ہو گئے" شمہ بیگم نے کہا "یہ تمام باتیں آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے ——— میں کوئی موقع محل دیکھ کر عاشی کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کر دوں گی ——— رہا اُس کی جانب سے کوئی شکایت کا مسئلہ تو آپ اس خیال کو دل سے نکال دیجئے ——— عاشی اپنی مثال آپ ہے، مجھے یقین ہے کہ وہ آپ سے کوئی شکوہ نہیں کرے گی ——— البتہ ماں کی یاد اُسے ضرور مضطرب کرے گی ——— یہ قطعی فطری بات ہوگی کہ اُسے باپ کا پیار اچانک مل جانے کے بعد ماں کی کمی کا احساس ضرور ہوگا لیکن میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ عاشی کو ماں کی کمی کا احساس کبھی نہ ہونے دوں گی"

"مجھے آپ سے یہی توقع ہے بیگم" محمود حسین نے پلکوں سے ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کو آستین میں جذب کرتے ہوئے کہا پھر کچھ سوچ کر بولے "ناجیہ گھر آجائے تو کسی طرح اُسے بھی سمجھانے کی کوشش کیجئے گا کہ وہ عاشی کے ساتھ اپنے برتاؤ میں نرمی اور لچک پیدا کرے"

"ناجیہ کے سلسلے میں ایک بات مجھے بھی آپ سے کرنی ہے" شمہ بیگم نے موقع غنیمت سمجھتے ہوئے آہستہ سے کہا
"ایسی کیا بات ہے جو آپ کہتے ہوئے ہچکچا رہی ہیں" محمود حسین نے بیوی کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"خدا نے ناجیہ کو نئی زندگی عطا کی ہے ——— میں ناجیہ کے غسلِ صحت کا خاص اہتمام کرنا چاہتی ہوں"
"ضرور کیجئے ——— اس میں میری اجازت کی کیا ضرورت ہے" محمود حسین بولے "گھر کی اصل مالکہ تو آپ ہی ہیں جو چاہیں وہ بڑے شوق سے کیجئے ———"

"میں کچھ اور بھی سوچ رہی ہوں ———"
"وہ کیا ———"
"آپ خفا تو نہیں ہوں گے ———"
"یہ احساس آپ کو کیسے ہوا کہ میں آپ کی کسی بات پر خفا ہو جاؤں گا"
"وعدہ رہا ———"
"وعدہ ———"
"میں چاہتی ہوں کہ ناجیہ کی صحت یابی کے موقع پر اُس کی منگنی کا اعلان بھی کر دیا جائے"
"کیا مطلب ———" محمود حسین نے چونکتے ہوئے پوچھا "کیا وہ فراز کے رشتے پر آمادہ ہو گئی ہے"
"نہیں ———" شمہ بیگم دل مسوس کر بولیں "فراز کے سلسلے میں تو اُس نے قطعی طور پر انکار کر دیا ہے"
"پھر ——— آپ اور کس کے ساتھ منگنی کا اعلان کریں گی"
"ناجیہ نے اپنے لئے ایک اور رشتے کا انتخاب کیا ہے" شمہ بیگم نے دبی زبان میں کہا پھر شوہر کی نگاہوں میں اُبھرنے والے خدشے کو محسوس کرتے ہوئے تیزی سے بولیں "اگر ایسا کوئی غیر ہوتا تو مجھے بھی شدید اعتراض ہوتا لیکن ———"
"لیکن کیا ———" محمود حسین ہونٹ کاٹتے ہوئے بولے "کون ہے وہ جسے ناجیہ نے ہماری مرضی حاصل کئے بغیر پسند کیا ہے"

"میرا خیال اگر غلط نہیں ہے تو آپ بھی اسے پسند کرتے ہیں"
"میں سمجھا نہیں ———"
"میرا اشارہ شہباز کی طرف ہے"
"شہباز ———"

محمود حسین کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اچانک اُن کے دل پر نشتر چبھو دیا ہو ——— ایک جھٹکے سے مضطرب ہو کر اُٹھے اور بے چینی کے عالم میں ٹہلنے لگے ——— شہباز کے نام نے اُن کے اندر ایک ہلچل پیدا کر دی ——— ایک طوفان کو ہوا دے دی تھی۔

شہباز ———
جو محمود حسین کے محسن کا اکلوتا بیٹا تھا ———
کروڑوں کی جائداد کا تنہا وارث ——— بلند کردار اور اعلیٰ اخلاق کا مالک ———
جس نے محمود حسین کے سامنے جھول پھیلا کر عاشی کا رشتہ مانگا تھا ———
اس کی طلب سچی تھی ——— اس میں کوئی کھوٹ، کوئی ملاوٹ نہیں تھی ———
اس لئے کہ اُسے عاشی کی حیثیت کا کوئی علم نہیں تھا ———
وہ عاشی کے حسن، اُس کی عزت اور پاکیزگی کا پرستار تھا ———
اور محمود حسین نے اُس کی ہر ممکن مدد کا وعدہ کر لیا تھا ———
لیکن ———
وقت کی ایک ہی کروٹ نے حالات کا رُخ موڑ دیا ———
ناجیہ بھی شہباز کا انتخاب کر بیٹھی تھی ———
اور ——— محمود حسین بڑی سنجیدگی سے سوچ رہے تھے کہ وہ فیصلہ کس کے حق میں دیں ——؟
عاشی کے حق میں ——— ؟
جو ہمیشہ سے محرومیوں اور مجبوریوں کا شکار رہی تھی ——— !
شہباز کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جانے کے بعد اُس کا مستقبل نہایت شاندار اور محفوظ ہو سکتا تھا ———
اُس کی اُجاڑ اور ویران زندگی میں بہار آسکتی تھی ———
ہونٹوں پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹیں رقص کر سکتی تھیں ———
یا ——— محمود حسین کا فیصلہ ناجیہ کے حق میں ہوتا ——— ؟
ناجیہ ——— جو خود سر تھی ——— مغرور تھی ———
جسے زندگی کی تمام آسائشیں ——— تمام سکھ چین حاصل تھے ———
ماں کی ممتا اور پیار بھی ———
جو ہاتھ پھیلا کر مانگنے کے اصول کے خلاف تھی ———
چھین کر جھپٹ لینے کی عادی تھی ——— !!
اور ———
وہ بھی عاشی کی طرح محمود حسین کی بیٹی تھی ———
اپنا خون تھی ———
پھر ——— عاشی اور ناجیہ میں سے کس کے حق میں فیصلہ کیا جاتا ——— ؟؟

محمود حسین کا اضطراب ہر لحظہ بڑھتا جا رہا تھا اور شمہ بیگم قریب کھڑی شوہر کے دل کی کیفیت کا اندازہ لگانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں ——— !!

محمود حسین کی کوٹھی آج بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔

ناجیہ کے جشنِ صحت کے سلسلے میں خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ محمود حسین کے دوست احباب اور دیگر واقف کاروں کے علاوہ ناجیہ کی سہیلیوں کو بھی بطورِ خاص مدعو کیا گیا تھا۔ وسیع و عریض لان پر نشستوں کا انتظام نہایت سلیقے سے اس طرح کیا گیا تھا کہ ایک سمت عورتوں کے لئے بیٹھنے کا بندوبست تھا اور دوسری جانب مردوں کے لئے نیم دائروں کی شکل میں کرسیوں کو ترتیب دیا گیا تھا۔

ناجیہ نے آج نہایت قیمتی اور بھڑک دار لباس پہن رکھا تھا اور اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی خوش گپیوں میں مصروف تھی لیکن اس کے برعکس عاشی نے آج بھی سادہ لباس کو ترجیح دی تھی، دروازے پر محمود حسین آنے والے مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے اور لان پر شمسہ بیگم عاشی کے ساتھ مہمان خواتین کو ہاتھوں ہاتھ سنبھال رہی تھیں۔

شمسہ بیگم کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا، قدرت نے اُن کی کوکھ اُجڑنے سے بچالی تھی، ناجیہ کو نئی زندگی عطا کی تھی لہٰذا وہ جس قدر بھی خوش ہوتیں کم تھا، البتہ انھیں اس بات کا ملال ضرور تھا کہ محمود حسین نے اس موقع پر انھیں ناجیہ کی منگنی کے اعلان سے روک دیا تھا۔ شمسہ بیگم کو شوہر کے اس فیصلے پر تعجب ہوا لیکن محمود حسین نے انھیں یہ کہہ کر نہایت خوبصورتی سے قائل کر دیا کہ پہلے شہباز سے اس ضمن میں کھل کر باقاعدہ گفتگو کر لی جائے اس کے بعد منگنی کے اعلان کے لئے علیحدہ سے ایک شایانِ شان تقریب منعقد کی جائے۔ اِس کے علاوہ محمود حسین نے اس خیال کا اظہار بھی کیا کہ کثیر محفل میں وہ شہباز اور ناجیہ کی منگنی کا اچانک اعلان کر کے اس خوشی کے موقع پر شائستہ بیگم اور فراز کی دل شکنی بھی نہیں چاہتے اور یہ بات شمسہ بیگم کے ذہن نے بھی قبول کر لی تھی۔

پروگرام کے مطابق آٹھ بجے تک تمام مہمان آ گئے۔ محمود حسین نے اس موقع پر افتخار احمد کو بھی بلایا تھا وہ نہایت گرمجوشی سے نہ صرف اُن کا استقبال کیا بلکہ اپنے خاص دوستوں سے متعارف بھی کرایا۔ افتخار احمد محمود حسین سے مل کر لان پر آئے تو عاشی نے بڑھ کر بڑے تپاک سے اُن کا خیر مقدم کیا۔

"انکل ——— مجھے آپ ہی کا انتظار تھا۔"

"کیوں ——— مہمان تو اور بہت سارے ہیں ——— تمہیں بطورِ خاص میرا ہی انتظار کس لئے تھا؟" افتخار احمد نے پیار سے عاشی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی اپنائیت سے پوچھا۔

"بس آپ مجھے اچھے لگتے ہیں" وہ معصومیت سے بولی پھر بولی ہوگئی "بابا بھی ہر دم آپ کی تعریف کیا کرتے تھے"

"قابلِ تعریف تو تم بھی ہو عاشی بیٹی" افتخار احمد نے بچی کو آزردہ دیکھا تو جلدی سے بولے "کسی کی زندگی کی خاطر اپنی جان کی قربانی پیش کرنا بڑی بات ہے۔"

"میں سمجھی نہیں انکل ———" اُس نے سادگی سے پوچھا۔

"ناجیہ کو خون دے کر تم نے انسانیت کی جو خدمت کی ہے وہ بے مثل ہے۔"

"وہ ——— وہ تو میرا فرض تھا" ایک لمحے کو اُس نے یونہی کنکھیوں سے ناجیہ کی سمت دیکھا جو اپنی بھیجی ہوئی

کے ساتھ بیٹھی بات بات پر قہقہے بکھیر رہی تھی۔ پھر افتخار احمد سے بولی "آپ تشریف رکھیے انکل ——— میں ذرا دوسرے آنے والوں کا استقبال کروں۔"

"عاشی ———" افتخار احمد نے دبی زبان میں کہا "میں تم سے شرمندہ ہوں کہ ناجیہ کے سلسلے میں بھی تمہارے کام نہ آسکا ورنہ ———"

"ورنہ کیا ———" اُس نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری جگہ میرا خون کام آجاتا ———"

"کیوں ——— آپ کا خون کس لئے؟"

"اس لئے ——— اس لئے کہ تم ابھی بچی ہو اور میں ———"

"آپ شاید میرے خون دینے سے پریشان ہیں" عاشی مسکرادی "کچھ بھی تو نہیں ہوا مجھے ——— دیکھئے، بھلی چنگی کھڑی ہوں آپ کے سامنے ———"

"ہم ——— ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گی" افتخار احمد نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"انکل پلیز ———" عاشی جلدی سے بولی "آپ کو میری قسم جو پریشان ہوں ——— اور ——— اور میں تو بالکل تندرست و توانا ہوں ——— اور پھر خون میں نے دیا یا آپ نے، بات تو ایک ہی ہوئی۔"

"عاشی ———" افتخار احمد نے عاشی کی صورت میں مرحوم بہن کا عکس محسوس کیا تو آب دیدہ ہوگئے کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن شمسہ بیگم کے آجانے سے جلدی سے پھیگی پلکوں کو خشک کر کے خاموش رہ گئے اور قہقہے لگاتے انداز میں آگے بڑھ کر ایک خالی نشست پر براجمان ہوگئے۔

عاشی دوبارہ شمسہ بیگم کے ساتھ خواتین کی پذیرائی میں مصروف ہوگئی۔ لیکن جانے کیوں ابھی تک اُسے محفل کی رونق کچھ پھیکی پھیکی سی لگ رہی تھی ——— بار بار اُس کی نظریں کبھی صدر دروازے کی جانب اُٹھ جاتیں اور کبھی نشستوں پر بیٹھے مہمانوں کے ہجوم میں بھٹکنے لگتیں اور پھر وہ از خود چونک اٹھتی، یوں جیسے چوری کرتے ہوئے اچانک پکڑی گئی ہو ——— جلدی سے اپنی توجہ کسی اور جانب مبذول کر کے اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنبھالنے لگتی ——— خود کو سمجھاتی ——— پگلی ———

اب تجھے کسی کا انتظار کیوں ہے ———

کس لئے تیری نگاہیں بھٹک رہی ہیں ———

قربانی تو بڑے عظیم جذبے کا نام ہے ———

قربانی کی راہ میں قدم ڈگمگا جائیں تو عظمتوں کے مینار لڑکھڑا کر منہدم ہو جاتے ہیں ———

بلندیاں زمیں بوس ہو جائیں تو پستیاں بھی انھیں قبول نہیں کرتیں ———

ایثار کا مقصد فوت ہو جائے تو اس کے مفہوم بدل جاتے ہیں ———

انسان خود اپنی نگاہوں میں گر جاتا ہے ———

اور، جو اپنی نظروں میں گر جائے وہ دوبارہ کبھی نہیں سنبھل سکتا ———

تا زیست بھٹکتا رہتا ہے ———

محرومیوں کا شکار ہو کر اپنی گم کردہ منزل کے نشان تلاش کرنے میں عمر گنوا دیتا ہے ———

اس لئے ——— اب بھی وقت ہے ———

خود کو سنبھال لے پگلی ——— ورنہ ———

اس وقت بھی وہ شہباز کے سلسلے میں اپنے منتشر خیالات اور دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کو سمیٹ رہی تھی کہ یکلخت شہباز کی آواز سُن کر اُس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ پلٹ کر دیکھا تو شہباز بالکل قریب کھڑا اُسے عجیب نظروں سے تکے جا رہا تھا۔

ایک لمحے کو وہ گڑبڑا گئی ——— منزل کو اتنے قریب دیکھ کر اُس کے قدم ڈانواڈول ہونے لگے لیکن اُس نے خود کو سنبھال لیا۔ ہونٹوں پر ایک تبسم سجا کر بولی۔

"آپ ——— اتنی دیر سے تشریف لائے ——— کہاں غائب تھے؟"

"خود کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا اس لئے دیر ہوگئی" شہباز نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"آنٹی اور انکل آپ کو کئی بار پوچھ چکے ہیں"

"کیوں ———؟"

"اس لئے ——— اس لئے کہ انھیں آپ کی آمد کا انتظار تھا"

"انتظار ———" شہباز کے کپکپاتے ہونٹوں پر ایک بے جان سی مسکراہٹ تڑپ کر نڈھال ہوگئی، سرد آہ بھر کر بولا "جھوٹ ہے!"

"ناجیہ کے دل سے پوچھئے ———" وہ دبی زبان میں بولی "شاید آپ کو اپنی رائے بدلنی پڑ جائے"

"خیال ہے آپ کا" شہباز کی آواز میں زہر کی تلخیاں نمایاں ہوگئیں ——— "فریب کو زندگی سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا"

"زندگی ———" وہ ہنس دی "زندگی تو خود فریب کا دوسرا نام ہے"

"لیکن اس فریب کو آپ ایثار و قربانی کا نام نہیں دے سکتیں ———" شہباز کا لہجہ اچانک تلخ ہوگیا "عظمتوں کے مینار کسی معصوم کی لاش پر تعمیر کرنا انسانیت کی معراج نہیں ہوسکتا ———"

"شہباز ———" وہ شہباز کے لہجے کی تلخی محسوس کر کے سہم گئی، نظریں جھکا کر بولی ——— "یہ وقت ان بے سروپا باتوں کا نہیں ہے ———"

"وقت ———" شہباز زہر خند سے بولا "وقت تو گزر گیا مس عاشی ——— بہت پیچھے رہ گیا آپ کس وقت کی بات کر رہی ہیں"

"ناجیہ ——— ناجیہ آرہی ہے" عاشی نے ناجیہ کو ساجدہ اور فرحت کے ساتھ قریب آتے دیکھ کر جلدی سے سرگوشی کی "پلیز شہباز ——— میں آپ سے رحم کی درخواست کرتی ہوں"

"موت سے زندگی کی آرزو بھی خود فریبی کہلاتی ہے" شہباز کے لہجے میں درد کی شدتیں تڑپ رہی تھیں۔

"ہیلو شہباز ———" ناجیہ نے قریب آتے ہوئے شوخی سے کہا "بڑی دیر کر دی آپ نے ——— ہم کب سے آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں ———"

"چلو ——— آتو گئے" ساجدہ نے معنی خیز آواز میں کہا "دیر آید درست آید ———"

"آپ کچھ اُلجھے اُلجھے سے نظر آرہے ہیں" فرحت نے عاشی کے زخموں پر نمک پاشی کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا "کہیں راستے میں کوئی حادثہ تو نہیں پیش آگیا ———"

"ایک ذرا ٹھوکر سی لگی تھی ——— لیکن سنبھل گیا" شہباز نے زخمی انداز میں جواب دیا۔

عاشی کے دل کو ایک دھچکا سا لگا ——— اُسے شہباز سے کسی ایسے جواب کی توقع نہیں تھی۔ دراز پلکوں کو نظروں سے اُٹھا کر دیکھا تو شہباز اُس کی جانب پشت کئے کھڑا تھا اور ناجیہ کے ہونٹوں پر زہریں بھی فاتحانہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

"راستوں کے پتھر سے خدا ہی محفوظ رکھے" فرحت نے حقارت سے عاشی کو گھورتے ہوئے کہا۔

"آمین ———" ناجیہ ٹھوس آواز میں بولی پھر شہباز کو ساتھ لئے آگے بڑھ گئی اور عاشی ———

اُس نے ایک نظر آسمان کی سمت دیکھا جہاں گھپ اندھیروں کا راج تھا پھر جلدی سے نظریں جھکا لیں ——— ایک سرد آہ بھری اور خود کو سنبھالتی دوبارہ تقریب کے ہنگاموں میں گم ہوگئی ——— !!

ناجیہ کے جشنِ صحت کی تقریب آئی اور گزر گئی۔ محمود حسین نے بیوی کی خوشنودی کی خاطر اس تقریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ——— ناجیہ اُن کے لہو کا رنگ تھی، اُس کو نئی زندگی ملنے کی خوشی محمود حسین کو بھی تھی لیکن انھیں عاشی کی فکر اور اُس کے مستقبل کا خیال رہ رہ کر پریشان کر رہا تھا۔

شہباز کے مسئلے میں اُن کی اپنی شخصیت بُری طرح اُلجھ کر رہ گئی تھی، وہ اگر چاہتے تو یک جنبش زبان عاشی

کے حق میں اپنا فیصلہ سُنا سکتے تھے مگر یوں بات بگڑ جانے اور گھر کے سکون کا مسئلہ درپیش تھا۔ شمسہ بیگم محمود حسین کے ہر فیصلے کے آگے سرِ تسلیم خم کرتی چلی آئی تھیں۔ شہباز اور عاشی کے سلسلے میں بھی وہ شوہر کے حکم کو بڑی خندہ پیشانی سے ماننے کو تیار ہو جائیں ——— لیکن ناجیہ ———

اس کی تربیت جس انداز میں ہوئی تھی اُس نے اُسے خود سر اور ضدی بنا دیا تھا ——— وہ اپنے فیصلے کو کبھی ہنسی خوشی برداشت نہیں کر سکتی تھی، اس لئے کہ اُس نے شہباز کے حق میں خود اپنی پسندیدگی کا اظہار کر دیا تھا ——— اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اُس کی ہٹ دھرمی شہباز اور عاشی دونوں کے خرمنِ دل کو جلا کر خاکستر کر دے گی ——— دو محبت بھرے دل ٹوٹ جائیں گے ——— وہ اپنی پسند یا اپنی خوشیوں کی خاطر سب کچھ کر سکتی تھی ——— اس نے جھکنا نہیں سیکھا تھا، دوسروں کو اپنے سامنے جھکانا سیکھا تھا ———

اور محمود حسین نہیں چاہتے تھے کہ اُن کا کوئی فیصلہ گھر کی خوشگوار فضا کو برباد کر دے ——— لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ محض ناجیہ کی ہٹ دھرمی کی خاطر عاشی کے دل کو توڑ دیں اور ماضی کی طرح اُس کے مستقبل کو بھی محرومیوں اور ناکامیوں کی المناک گھٹن کے حوالے کر دیں۔

سبزے پر سرو کے کنج کے قریب ایک آرام کرسی پر بیٹھے وہ اپنے خیالات میں گم تھے، محویت کا یہ عالم تھا کہ انھیں بیوی کے آنے کی ایک ذرا آہٹ بھی نہیں ہوئی چنانچہ جب شمسہ بیگم نے انھیں آواز دی تو وہ یوں ہڑبڑا کر چونکے جیسے کچی نیند سے بیدار ہوگئے ہوں۔

"خیریت ———" شمسہ بیگم نے دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا "کیا سوچ رہے تھے؟"

"شہباز کے بارے میں غور کر رہا تھا" محمود حسین سنبھل کر بولے۔

"کیا مطلب ——— کیا شہباز آپ کو ناجیہ کے لئے پسند نہیں؟"

"سوال میری پسند کا نہیں بیگم ——— شہباز کی مرضی کا ہے" محمود حسین نے آسمان پر پھیلی شفق کی سُرخیوں کو تکتے ہوئے کہا "اگر اُس نے ہماری خوشیوں کے برعکس کوئی فیصلہ سُنا دیا تو ——— تو کیا ہوگا؟"

"آپ کو تو بلاوجہ سوچنے کی عادت ہوگئی ہے" شمسہ بیگم لاپروائی سے بولیں "شہباز بے حد نیک، ملنسار اور شریف لڑکا ہے، میں تو نہیں سمجھتی کہ وہ ہمارے خاندان میں شامل ہونے سے انکار کر دے گا اور پھر اگر اُس کا خیال کہیں اور ہوتا تو اُسے ہمارے ہاں آنے جانے کی کیا ضرورت تھی"

"آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟"

"میرا تو خیال ہے کہ شہباز بھی اپنی ناجیہ کو پسند کرتا ہے ——— تقریب میں بھی اُس نے اپنا زیادہ وقت ناجیہ اور اُس کی سہیلیوں کے ساتھ گزارا تھا"

"وقت گزارنے اور زندگی گزارنے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے بیگم" محمود حسین نے ٹھوس مگر مدھم آواز میں کہا پھر اچانک کچھ سوچ کر بولے "اور ——— کیا یہ بات مناسب ہوگی کہ ہم بڑی بیٹی کے ہوتے چھوٹی کی شادی پہلے کر دیں؟"

"اس بات کا خیال مجھے بھی تھا اور اسی غرض سے میں نے فی الحال صرف ناجیہ اور شہباز کی منگنی کی بات کی تھی ——— رہا شادی کا مسئلہ تو وہ دونوں بچیوں کا ایک ساتھ بھی نپٹایا جاسکتا ہے"

"جیسی آپ کی مرضی ———" محمود حسین نے خلا میں گھورتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔

"ایک بات کہوں ———" شمسہ بیگم تھوڑے توقف سے بولیں "کیوں نہ ہم آپا کو اس سلسلے میں ہموار کرنے کی کوشش کریں؟"

"کیا مطلب ———" محمود حسین نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"فراز جیسا ہیرا لڑکا اگر ہم چراغ لے کر بھی ڈھونڈیں تو نہیں ملے گا ——— میرا خیال ہے کہ اگر عاشی اور فراز کی بات چھیڑی جائے تو آپا ضرور رضامند ہو جائیں گی ——— وہ عاشی کو چاہتی بھی بہت ہیں"

"آپ کا کہنا بجا ہے لیکن عاشی ———" محمود حسین جذبات کی روانی میں بہتے بہتے معاً سنبھل گئے، بات بناتے ہوئے بولے "ہمیں عاشی کے سلسلے میں بہت سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانا ہوگا ——— ابھی تو اس غریب کو یہ بھی نہیں کہ ہم اس کے کون ہیں"

"خدا پر بھروسہ رکھیں ——" شمسہ بیگم شوہر کو دلاسہ دیتے ہوئے بولیں "وہ جو کرے گا بہتر ہی کرے گا"
"میں نے بھی قسمتوں کے تمام فیصلے اسی پر چھوڑ دیئے ہیں" محمود حسین نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔
"دلوں کا حال بھی وہی جانتا ہے —— اور —— مشکل کشا بھی اسی کی ذات ہے ——"
"شہباز کے سلسلے میں آپ نے کیا سوچا؟"
"میرا مشورہ ہے کہ آپ کسی وقت باتوں باتوں میں شہباز کا عندیہ لینے کی کوشش کریں" محمود حسین نے بیوی کے اصرار پر درمیانی راہ اختیار کی "اگر شہباز کو بھی ناجیہ پسند ہوئی تو مجھے کوئی انکار نہ ہوگا"
"کیا شہباز سے میرا بات کرنا مناسب ہوگا —— میرا مطلب ہے کہ میری بجائے آپ ——"
"نہیں ——" محمود حسین جلدی سے بولے "آپ کی بات زیادہ مناسب ہوگی"
"ٹھیک ہے میں شہباز کو کریدنے کی کوشش کروں گی اور آپ کسی وقت موقع مناسب دیکھ کر ذرا آپا جان کو بھی اپنی عاشی کے سلسلے میں ٹٹولیں ——"
عاشی اچانک چائے کی ٹرے لئے سامنے سے نمودار ہوئی تو شمسہ بیگم نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا محمود حسین بھی عاشی کی طرف متوجہ ہو گئے۔
"تم نے کیوں تکلیف کی بیٹی ——" شمسہ بیگم نے متاسفانہ انداز میں کہا "یہ شرو کہاں غائب ہو گیا"
"وہ دوسرے کاموں میں مصروف تھا اور —— میں نے سوچا کہ بیکار بیٹھے رہنے سے کچھ کام کرنا زیادہ مناسب ہوگا" عاشی نے مسکرا کر کہا پھر بیٹھ کر چائے بنانے لگی۔
"خدا تمہیں ہمیشہ سلامت رکھے" شمسہ بیگم اُسے دعائیں دیتے ہوئے بولیں "ناجیہ کہاں ہے —— بہت دیر سے نظر نہیں آئی"
"وہ فرحت کے ساتھ کسی سہیلی سے ملنے گئی ہے —— آجائے گی کچھ دیر میں"
عاشی نے چائے بنا کر بڑے سلیقے سے پیش کی پھر شمسہ بیگم سے باتیں کرنے لگی، محمود حسین اپنی کرسی پر خاموش بیٹھے بڑے والہانہ انداز میں عاشی کی معصوم باتوں کو سن رہے تھے اور اُس کے چہرے کے تقدس میں اپنے ماضی کے عکس کو دیکھ رہے تھے۔
جو دھندلا جانے کے باوجود بے حد خوبصورت حسین اور واضح نظر آرہا تھا ——
شاید اس لئے کہ قدرت نے فائزہ کی کہانی کو عاشی کے چہرے کے نقش و نگار میں سمو کر اجاگر کر دیا تھا۔
وقت اور گزرے لمحوں کی قید سے آزاد کر دیا تھا ——
فاصلے گھٹ گئے تھے ——
اور یادوں کے زخم از سر نو تازہ ہو گئے تھے ——!!
عاشی ایک مکمل داستان تھی ——
ماضی کے اُن فسانوں کی جو محمود حسین کے لئے بڑے کربناک ثابت ہوئے تھے ——
اور مستقبل ——
مستقبل کسی بدنصیب کی آخری پونجی کی طرح داؤ پر لگا ہوا تھا ——

"انکل —— آپ کی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے"
عاشی نے ٹوکا تو خیالوں کا شیرازہ ٹوٹ کر بکھر گیا۔ محمود حسین نے چونک کر بیٹی کے معصوم چہرے پر ایک نظر ڈالی پھر چائے کی پیالی اٹھا کر ہونٹوں سے لگالی ——
"پھر وہی انکل ——" شمسہ بیگم نے عاشی کو پیار بھری خفگی سے گھورتے ہوئے کہا "کیا تم ناجیہ کی طرح ہمیں ڈیڈی اور ممی نہیں کہہ سکتیں ——"
"عادت نہیں ہے اس لئے غلطی ہو جاتی ہے" وہ بڑی سادگی سے بولی "آئندہ خیال رکھوں گی"
"کس بات کا ——؟"
"آپ کو ممی اور انکل کو ڈیڈ کہنے کا ——"

"خدا تمہیں ہمیشہ سلامت اور شاد و آباد رکھے بیٹی" شمسہ بیگم نے اُسے ڈھیر ساری دعائیں دے ڈالیں پھر کچھ سوچتے ہوئے کرسی پر پہلو بدل کر بولیں "عاشی —— کیا تمہیں اپنے ماضی —— اپنے ماں باپ اور دیگر عزیز و اقارب کے بارے میں کوئی علم نہیں؟"
"جی ——" اُس نے چونک کر بڑے کرب سے شمسہ بیگم کو دیکھا پھر جلدی سے اپنے ڈگمگاتے وجود کو سنبھالتے ہوئے بولی "بابا سے پوچھا تو تھی بارہا لیکن جانے کیا مصلحت تھی جو انھوں نے کبھی کچھ بتایا ہی نہیں"
"میرا تو خیال ہے کہ تم کسی بہت بڑے خاندان کی بیٹی ہو ——"
"کیوں نہیں —— جب آپ لوگوں نے مجھے اپنا لیا ہے تو پھر میرا خاندان بھی اونچا ہو گیا" عاشی نے دبی زبان میں کہا، اُس کی آواز میں درد کی کسک بھی شامل تھی۔
"ممدو نے مرتے وقت مجھے تمہارے ایک عزیز کے بارے میں بتایا تھا" محمود حسین نے سنبھل کر کہا تو عاشی بے اختیار چونک اٹھی

یوں، جیسے کسی بھٹکے ہوئے مسافر کو اچانک منزل کا سراغ مل گیا ہو ——
جیسے کڑی دھوپ کے بعد یکلخت اُودے اُودے بادل چھا گئے ہوں ——
اور ——
جیسے ٹوٹے —— بکھرے خوابوں کو کوئی تعبیر مل گئی ہو ——

"کیا بتایا تھا بابا نے ——؟" اُس نے تیزی سے پوچھا "کون ہے میرا عزیز ——؟"
"افتخار احمد ——" محمود حسین نے بیٹی کے جذبات کو بغور محسوس کرتے ہوئے جواب دیا "وہ تمہارے سگے ماموں ہیں"
"ماموں ——" عاشی مضطرب ہو گئی "لیکن انھوں نے تو مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟"
"کوئی مصلحت ہی ہوگی —— لیکن یہ حقیقت ہے کہ افتخار صاحب تمہارے ماموں ہیں اور میں اس بات کی تصدیق بھی کر چکا ہوں"
"پھر —— پھر آپ کو یہ بھی ضرور معلوم ہوگا کہ میری ماں کہاں ہے اور میرے ابو کون ہیں؟"
"تمہاری ماں اس دنیا میں نہیں رہی بیٹی" محمود حسین اپنے آنسوؤں کو بمشکل پیتے ہوئے بولے "جب تم پیدا ہوئی تھیں اُس کے کچھ عرصے بعد ہی تمہاری ماں نے اس دنیا سے منہ موڑ لیا تھا اور —— تمہارے والد ——"
"کیا خدانخواستہ وہ بھی ——" عاشی نے دیوانوں کی طرح کچھ کہنا چاہا لیکن پھر جلدی سے خود اپنے ہی ہاتھوں سے اپنا منہ بند کر لیا۔
ماں کی موت کی خبر سن کر اُس کے دل پر قیامت ٹوٹ گئی تھی اُس کا چہرہ فق ہو گیا۔
"تمہارے والد زندہ ہیں عاشی ——" شمسہ بیگم نے وقت کی سنگین اور دردانگیز نزاکتوں کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔
"زندہ ہیں ——" عاشی خوشی سے چلا اٹھی "کہاں ہیں میرے ابو ——؟"
شمسہ بیگم شوہر کے چہرے پر پھیلتے درد کے سایوں کے ساتھ ساتھ عاشی کے اضطراب کو بھی دیکھ رہی تھیں —— انھوں نے عاشی کو سب کچھ بتا دینا چاہا لیکن قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتیں ناجیہ کی گاڑی برق رفتاری سے کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوئی پھر وہ ایک جھٹکے سے گاڑی روک کر تیزی سے نیچے اُتری اور لمبے لمبے قدم اٹھاتی ماں کے قریب آکر رک گئی۔
اُس کے تیور اچھے نہیں تھے، عاشی پر ایک نفرت اور حقارت بھری نظر ڈالتے ہوئے ماں سے بولی۔
"ممی —— کیا بیہوشی کی حالت میں مجھے خون بھی فراہم کیا گیا تھا؟"
"ہاں —— کیوں؟" شمسہ بیگم نے بیٹی کے تیور کو محسوس کرتے ہوئے حیرت سے کہا
"کس کا خون تھا وہ ——؟" ناجیہ نے ہونٹ چباتے ہوئے غصے سے دریافت کیا تو محمود حسین کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔

عاشی نے نظریں جھکالیں ـــــ ناجیہ کے چہرے پر لرزتے طوفانوں کی شدت دیکھ کر وہ سہم سی گئی۔

"تم کیا معلوم کرنا چاہتی ہو؟" شمسہ بیگم نے پوچھا۔

"صرف اتنی سی بات کہ میری رگوں میں کس کا خون شامل ہوا ہے ـــــ؟"

"تمہاری زندگی بچانے کی خاطر یہ قربانی عاشی نے پیش کی تھی۔" شمسہ بیگم سنجیدگی سے بولیں۔ "اگر یہ وقت تمہیں خون فراہم نہ کیا جاتا تو ....."

"مر جانے دیا ہوتا مجھے ـــــ" ناجیہ تلملا اٹھی "ایسی زندگی سے تو موت بہتر تھی۔"

ناجیہ نے دوسری بار حقارت سے عاشی کو گھورا تو شمسہ بیگم اُٹھ کر کھڑی ہوگئیں' بات کو درگزر کرنے کی خاطر بولیں

"ناجیہ ـــــ تم اس وقت شاید اپنے ہوش میں نہیں ہو ـــــ اندر جاکر منہ ہاتھ دھوؤ' لباس تبدیل کرو پھر ٹھنڈے دل سے ....."

"خون میں ملاوٹ ہو جائے تو انسان اپنے ہوش و حواس اور اپنی شخصیت کی بلندیوں سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔" ناجیہ نے غصے سے کہا "آج مجھے کسی نے طعنہ دیا ہے کہ میری رگوں میں بھی فاسد خون ....."

"ناجیہ ـــــ" محمود حسین ضبط نہ کر سکے تو چیخ اُٹھے "تم حد درجہ گستاخ ہوتی جا رہی ہو ـــــ بے ادبی اور بیہودگی کی بھی ایک حد ہوتی ہے ـــــ"

"ڈیڈ' میں نے کوئی غلط بات ....."

"شٹ اپ ـــــ" محمود حسین غصے سے کانپتے ہوئے بولے پھر تیزی سے اٹھے' بیوی پر ایک نظر ڈالی اور نچلا ہونٹ دانتوں تلے چباتے گھوم کر کوٹھی کی سمت چلے گئے۔

عاشی کنگ سی کھڑی سب کچھ سن رہی تھی' محسوس کر رہی تھی۔

"ناجیہ ـــــ" شمسہ بیگم نے شوہر کے جانے کے بعد بیٹی سے کہا "جاؤ اپنے باپ سے جاکر اپنی گستاخی کی معافی مانگو۔"

"یہ میرا اور ڈیڈ کا معاملہ ہے ممی' لیکن میں دوسروں کو اس بات کا کیا جواب دوں گی کہ میرے جسم میں دوڑتے ہوئے اعلیٰ خون میں کسی کا سستا اور گھٹیا خون بھی شامل ہو گیا ہے۔"

"ناجیہ ـــــ" شمسہ بیگم کی پیشانی یکلخت شکن آلود ہو گئی' ٹھوس اور سخت آواز میں بولیں "تم جس خون کو سستا اور گھٹیا کہہ رہی ہو وہ کسی غیر کا نہیں ـــــ تمہارا اپنا ہی خون ہے ـــــ ہاں' عاشی کوئی غیر نہیں' تمہاری بہن ہے ـــــ بڑی بہن ـــــ اُس کی رگوں میں بھی اسی باپ کا لہو گردش کر رہا ہے جو تمہاری رگوں میں دوڑ رہا ہے ـــــ"

ناجیہ حیرت سے چونک اٹھی' اُس نے ماں کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا ـــــ یوں' جیسے اُسے اپنی قوتِ سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا ـــــ اور عاشی۔

اُس نے اگر جلدی سے قریب رکھی ہوئی کرسی کا سہارا نہ لیا ہوتا تو شاید چکرا کر زمین پر ڈھیر ہو جاتی۔ شمسہ بیگم کی زبان سے جس حقیقت کا انکشاف ہوا تھا وہ پگھلتے سیسے کی مانند اُس کے وجود کی گہرائیوں میں اُترتا چلا گیا ـــــ اُس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی تو چکرا کر کرسی پر بیٹھ گئی ـــــ اور ـــــ گھپ اندھیرے اُس کی دراز پلکوں کے نیچے پھیل کر گہرے ہوتے چلے گئے۔

***

قدرت نے اس کے ساتھ کس قدر حسین مگر بھیانک مذاق کیا تھا۔ اُس کے کانوں میں فرخندہ کی آواز گونج اٹھی۔

"میرا مشورہ ہے کہ اب تمہیں عاشی کے سلسلے میں اپنا برتاؤ بدل لینا چاہیے۔"

"خیریت ـــــ" اُس نے لاپروائی سے دریافت کیا۔ "یہ آج بیٹھے بٹھائے جنابہ کو عاشی سے ہمدردی کیسے ہو گئی؟"

"کیوں ـــــ کیا تمہیں اس سے کوئی لگاؤ نہیں؟" فرخندہ نے تعجب سے پوچھا "تم دونوں ایک ساتھ ایک ہی گھر میں پل کر جوان ہوئی ہو ـــــ"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"کیوں نہیں پڑتا ـــــ" وہ عاشی کی حمایت میں بولی "انسان اگر کسی بے زبان پرندے کو پالتا ہے۔ تو اُس سے بھی اُنسیت پیدا ہو جاتی ہے ـــــ عاشی تو پھر انسان ہے ـــــ"

"عجیب منطق ہے تمہاری۔" ناجیہ نے حقارت سے جواب دیا "آج تم عاشی کا پارٹ لے رہی ہو' کل کہو گی کہ مجھے شرفو کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کرنا چاہیے جیسا کالج میں اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ کرتی ہوں۔"

"اس میں بظاہر کوئی حرج بھی نہیں اور جہاں تک عاشی کا تعلق ہے تو ـــــ"

"پھر وہی عاشی ـــــ" وہ جھلا گئی' تیزی سے خفگی کا اظہار کرتی ہوئی بولی "اب اگر تم نے مجھے چھیڑنے کی کوشش کی تو میں ایک منٹ بھی یہاں نہیں رکوں گی۔"

"چلو چھوڑو ـــــ یہ بتاؤ شہباز کے سلسلے میں تمہیں کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی؟" فرخندہ نے گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے دریافت کیا۔

"میں نے آج تک کبھی ہارنا نہیں سیکھا۔" وہ فخریہ گردن تان کر بولی "ممی سے میں نے نکل کر اپنی مرضی کا اظہار کر دیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ میرا کہا نہیں ٹالیں گی ـــــ"

"ایک بات کہوں ـــــ بُرا تو نہیں مانو گی۔" فرخندہ نے سنجیدگی سے کہا تو وہ تلملا گئی۔

"واٹ نان سنس۔" اس نے جھلا کر کہا "میں تمہارے ساتھ کچھ دیر ہنسنے بولنے کی خاطر آئی ہوں اور تم پر سقراط و بقراط کی سنجیدگی سوار ہے ـــــ"

"تم نہیں سننا چاہتیں تو نہ سنو ـــــ لیکن یہ حقیقت ہے کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔"

"دال میں کالا ـــــ میں سمجھی نہیں۔"

"تمہارے شہباز صاحب تم سے زیادہ عاشی میں دلچسپی لے رہے ہیں۔" فرخندہ بولی "پارٹی والے دن وہ دو دن تو ہمارے ساتھ رہے لیکن اُن کی نظریں بار بار عاشی کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔"

"یہی تو میں بھی چاہتی ہوں فرخندہ ڈارلنگ۔" ناجیہ نے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا "وہ دونوں آمنے سامنے رہیں مگر اجنبیوں کی طرح ـــــ ایک دوسرے کو دیکھیں لیکن اُن کے ہونٹ ہلنے کی جرأت نہ کر سکیں اندر ہی اندر گھٹتے رہیں۔"

"ناجیہ ـــــ" فرخندہ چونک اٹھی "تم ـــــ تم ایسا کیوں چاہتی ہو؟"

"عاشی کو نیچا دکھانے کی خاطر۔" وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے زہر خند سے بولی "تعلیم کے میدان میں وہ مجھ سے سبقت لے گئی لیکن میں اُسے زندگی کے دوسرے تمام میدانوں میں ناکام بنا دوں گی ـــــ ایسی شکست فاش دوں گی کہ میرے سامنے کبھی سر بلند کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔"

"یہ عاشی کی قربانی کا انعام نہیں ـــــ اُس کے ساتھ سراسر زیادتی ہوگی۔" فرخندہ سنجیدگی سے بولی "کیا تم نے اتنی جلدی فراموش کر دیا کہ اگر عاشی نے تمہیں بروقت اپنا خون نہ دیا ہوتا تو شاید آج تم اُسے شکست فاش دینے کے لئے زندہ نہ ہوتیں ـــــ"

"خون ـــــ؟" ناجیہ چونکی "کیسا خون ـــــ؟"

"تمہیں شاید ابھی تک علم نہیں کہ عاشی نے تمہیں بروقت اپنا خون دے کر موت کے منہ سے نکالا ہے۔" فرخندہ نے بدستور سنجیدگی سے کہا

"تمہیں یہ بات کس نے بتائی ہے؟"

"خالہ جان نے۔" فرخندہ بولی "ڈاکٹروں کو تمہاری زندگی بچانے کے لئے جو خون درکار تھا وہ ہسپتال میں موجود نہیں تھا چنانچہ عاشی نے ....."

"مائی فٹ ـــــ" وہ غصے سے بل کھاتی بولی "اگر یہ حقیقت ہے تو میں اس گندے خون کو اپنے جسم

سے نکلوا دوں گی ـــــ نہیں چاہیئے مجھے ایسا خون جو میری اہمیت کو گھٹا دے ـــــ میری حیثیت کو کم کر دے۔"

"تم اگر چاہو تو عاشی کے خون کی قیمت بھی ادا کر سکتی ہو۔"

"قیمت ـــــ وہ کیسے؟"

"شہباز اور اُس کے راستے سے ـــــ"

"فرخندہ ـــــ" ناجیہ چیخ اٹھی "اب اگر تم نے اس دو کوڑی کی لڑکی کی حمایت میں کچھ کہا تو میری اور تمہاری دوستی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔"

پھر وہ فرخندہ کے پاس زیادہ دیر نہیں رُکی ـــــ خون والی بات سُن کر وہ اندر ہی اندر جھلس اٹھی تھی، اگر وہ حادثے کے بعد ہوش میں ہوتی تو عاشی کے خون سے زندگی بچانے پر موت کو زیادہ ترجیح دیتی۔ موت کی اذیتناک گھٹن اُس کے لئے زیادہ بہتر ہوتی ـــــ وہ زندگی کی خاطر اپنی بڑائی اور امارت کے احساس کو کسی قیمت پر سرنگوں نہ ہونے دیتی۔ راستے بھر اُس کے ذہن میں بگولے رقص کرتے رہے ـــــ وہ سوچتی رہی۔

جانے عاشی کی رگوں میں دوڑنے والا خون کیسا ہو ـــــ

کیا رنگ لائے ـــــ

جس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں تھی ـــــ

کوئی مقام نہیں تھا ـــــ

اُس کے خون کی بھلا کیا حقیقت ہو گی ـــــ ؟؟

لیکن جب وہ گھر پہنچی اور رخسانہ بیگم نے فرخندہ والی بات کی تصدیق کر دی تو اُس کا خون آتش فشاں کے لاوے کی مانند کھول اُٹھا ـــــ وہ بھڑک اٹھی۔ مگر جب ماں نے اُسے بتایا کہ عاشی کوئی غیر نہیں ـــــ اُس کی اپنی بہن ہے تو اس انکشاف پر وہ حیرت سے ماں کا منہ تکتی رہ گئی ـــــ اُس کے ذہن میں ماں کے کہے ہوئے جملوں کی صدائے بازگشت گونجتی رہی۔

"عاشی کوئی غیر نہیں ـــــ تمہاری بہن ہے ـــــ

بڑی بہن ـــــ

اُس کی رگوں میں بھی اسی باپ کا لہو گردش کر رہا ہے جو تمہاری رگوں میں موجود ہے ـــــ

عاشی کوئی غیر نہیں ـــــ !

تمہاری بہن ہے ـــــ !!

بڑی بہن ـــــ !!!

تم جس خون کو سستا اور گھٹیا کہہ رہی ہو ـــــ

وہ کسی غیر کا نہیں ـــــ

تمہارا اپنا ہی خون ہے ـــــ

عاشی کوئی غیر نہیں ـــــ

تمہاری بہن ہے ـــــ

بڑی بہن ـــــ"

وہ ماہی بے آب کی طرح اپنے وجود کے اندر جھلستی رہی ـــــ جب سے اُسے عاشی سے اپنی برابری کا علم ہوا وہ خود کو پھولوں کے بستر کے بجائے کانٹوں کی سیج پر محسوس کر رہی تھی ـــــ وہ اس حقیقت کو جھٹلا دینا چاہتی تھی جس نے اُس کے تن بدن میں ایک آگ سی بھڑکا دی تھی ـــــ کسی طور پر بھی اس احسان کے بوجھ کو اپنے سر سے اتار پھینکنا چاہتی تھی جس کے احساس نے وقتی طور پر اُسے عاشی کا احسان مند ہونے پر مجبور کر دیا تھا ـــــ وہ ہمیشہ سربلند رہی تھی ـــــ پھر اچانک سرنگوں کیسے ہو جاتی ـــــ ؟؟

اپنے کمرے میں بڑی دیر تک وہ فرش پر بچھے دبیز قالین کو قدموں تلے روندتی رہی ـــــ پیچ و تاب کھاتی رہی ـــــ پھر معاً ایک خیال اندھیرے میں روشنی کی کرن بن کر اُس کے ذہن میں کھولا۔

"ممکن ہے ممی نے محض مجھے بہلانے کی خاطر غلط بیانی سے کام لیا ہو ـــــ عاشی کی قربانی کے پیش نظر جھوٹ بول دیا ہو ـــــ اس لئے کہ میں عاشی کو قبول کر لوں ـــــ اُسے حقارت سے دھتکارنے کی بجائے گلے لگا لوں اور ـــــ اُس کے احسان کو تسلیم کر لوں ـــــ"

ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ـــــ

تیزی سے بل کھاتی وہ کمرے سے باہر نکلی ـــــ لمبے لمبے قدم اُٹھاتی باپ کے کمرے تک گئی لیکن خواب گاہ خالی تھی پھر جب شوفر کی زبانی اُسے معلوم ہوا کہ محمود حسین شہباز کے ساتھ مصروف گفتگو ہیں تو وہ پلٹ کر ڈرائنگ روم کی طرف آ گئی۔

دروازے کے قریب اُس نے پردے کی آڑ سے جھانکا، محمود حسین صوفے پر گم صم اور خاموش بیٹھے تھے اور شہباز اُن کے قریب کھڑا نہایت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"آپ میرے بزرگ ہیں ـــــ آپ کے حکم پر میں اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کر سکتا ہوں لیکن ـــــ محض کسی کی خوشنودی اور جھوٹی مسرتوں کی خاطر اپنی خواہشات کا گلا نہیں گھونٹ سکتا۔"

"میں سمجھا نہیں تمہاری بات کا مقصد ـــــ" محمود حسین نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"میرا اشارہ اپنی اُس درخواست کی طرف ہے جو میں نے نہایت ادب و احترام کے ساتھ آپ کے سامنے.. آپ کے دفتر میں پیش کی تھی۔" شہباز نے کہا ـــــ "میں نے آپ کو اپنا بزرگ جان کر عاشی کے سلسلے میں آپ کی مدد طلب کی تھی لیکن ـــــ آنٹی مجھے ناجیہ کے سلسلے میں ہموار کرنا چاہتی ہیں۔"

"تمہارا کیا فیصلہ ہے ـــــ؟"

"میرا فیصلہ آج بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔" شہباز نے دبی زبان میں جواب دیا۔

"میں بھی اپنے وعدے پر قائم ہوں ـــــ میری کوشش اب بھی یہی ہو گی کہ تم اور عاشی ایک ہو جاؤ۔"

"مگر آنٹی ـــــ"

"وہ ماں ہے ـــــ ماں، جو ہمیشہ اپنی اولاد کے مستقبل کے بارے میں حسین خواب دیکھنے کی عادی ہوتی ہے۔"

"لیکن اگر آنٹی نے آپ کو مجبور کیا تو ـــــ"

"تمہارے آنے سے پہلے میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ اگر ناجیہ کی ماں نے مجھے اپنی بیٹی کی خوشیوں کی خاطر مجبور کیا تو میرا کیا فرض ہو گا۔"

"انکل ـــــ" شہباز نے محمود حسین کے لہجے میں پوشیدہ درد کی شدتوں کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کی پوزیشن سمجھ رہا ہوں ـــــ ناجیہ آپ کی بیٹی ہے اس لئے آپ کو عاشی کے مقابلے میں اس سے زیادہ لگاؤ ہونا چاہیئے۔"

محمود حسین نے نظریں اٹھا کر تیزی سے شہباز کی طرف دیکھا، کچھ کہنے کے لئے ہونٹ وا کئے لیکن کچھ سوچ کر اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور اضطرابی حالت میں ہاتھ مسلنے لگے۔

"مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ کو ذہنی خلفشار میں مبتلا ہونا پڑ رہا ہے۔" شہباز نے محمود حسین کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "کاش میرے اختیار میں ہوتا کہ میں اپنا فیصلہ تبدیل کر سکتا۔"

"شہباز ـــــ" محمود حسین تڑپ کر رہ گئے۔

"میں جا رہا ہوں انکل ـــــ اگر میری باتوں سے آپ کو کوئی دکھ یا صدمہ پہنچا ہو تو میں اُس کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔"

شہباز واپسی کے ارادے سے پلٹنا چاہتا تھا کہ محمود حسین نے آواز دے کر اُسے روکا، چند لمحے اسے خالی خالی نظروں سے گھورتے رہے پھر بولے۔

"کیا تم جانتے ہو کہ عاشی کون ہے ـــــ اُس کا خاندانی پس منظر کیا ہے ـــــ اُس کی حیثیت کیا ہے؟"

"میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ میری پسند ہے ـــــ اس کے علاوہ مجھے اور کچھ جاننے کی ضرورت نہیں۔" شہباز نے جھکا کر کھوکھلی آواز میں کہا پھر تیزی سے گھوم کر لمبے لمبے قدم اُٹھاتا ڈرائنگ روم سے باہر نکل گیا۔

"کاش ——— تم جان سکتے کہ عاشی کون ہے ——— اُس نے میرا کیا تعلق ہے ——— کیا رشتہ ہے"
شہباز کے جانے کے بعد محمود حسین نے درد بھری آواز میں کہا تو ناجیہ کی پیشانی کی سلوٹیں اور گہری ہوگئیں، پردے پر اپنی گرفت مضبوط کر کے اُس نے زور سے جھٹکا دیا تو وہ ٹوٹ کر نیچے آگیا ——— ناجیہ کا ذہن چیخ اٹھا
نہیں ——— نہیں ——— نہیں
شکست قبول کرنا میری فطرت کے خلاف ہے ——— ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ———

اندھیرے اتنی جلدی اس کی زندگی سے اپنا سایہ ہٹا لیں گے اور اُجالے اس طرح اچانک اُس کی روح کی تاریکیوں کو دُور کر دیں گے۔ یہ تو اُس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

صمد کی موت کے بعد سے وہ خود کو بالکل بے سہارا سمجھنے لگی تھی لیکن وقت کی ایک ہی کروٹ نے زمین پر اُس کے وجود کو بڑا مستحکم بنا دیا ——— اب وہ بے سہارا نہیں رہی تھی ——— اُسے اپنی گم کردہ منزل کا نشان مل گیا تھا ——— خون کے وہ رشتے اچانک اُس کے سامنے آگئے جن کی تلاش میں وہ نہ جانے کب سے سرگرداں و پریشان تھی ——— اجنبیت کا احساس لمحوں کی ایک جنبش نے ختم کر دیا۔

وہ معصوم پودے سے ایک دم تناور درخت بن گئی ——— شمسہ بیگم کے لبوں سے نکلے ہوئے چند جملوں نے اُس کی زندگی کے دھاروں کا رُخ ہی بدل دیا تھا ——— اُسے اپنی ماں کی موت کا علم ہوا تو وہ سکتے کی کیفیت سے دوچار ہوگئی ——— لیکن جب اُسے باپ کی موجودگی کا احساس ہوا تو اُس کی رُوح خوشی سے جھوم جھوم اٹھی۔

محمود حسین ——— جنہیں آج تک وہ اپنا محسن سمجھتی رہی اُس کے حقیقی باپ تھے ———
شمسہ بیگم نے ایک ماں کے روپ میں اُسے زندگی کی نوید دی تھی ———
اور ناجیہ ———
وہ بھی کوئی غیر نہیں ——— اُس کی اپنی بہن تھی ———

اتنی ڈھیر ساری خوشیاں اچانک اور خلافِ توقع اُس کی زندگی میں شامل ہوئیں تو اس کا ذہن چکرا گیا وہ خود کو سنبھال نہ سکی ——— اور جب اُسے دوبارہ ہوش آیا تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ دوزخ سے نکل کر جنت میں آگئی ہو ——— شمسہ بیگم اُس کے قریب بیٹھی اُس کا سر سہلا رہی تھیں اور محمود حسین ——— اُس کے بستر سے لگے کھڑے تھکی باندھے اُسے تکے جا رہے تھے ———

"اب تمہاری طبیعت کیسی ہے بیٹی ———" شمسہ بیگم نے اُسے ہوش میں دیکھ کر نہایت اپنائیت سے پوچھا۔
آج اُن کے لہجے میں ایک ماں کا پیار تھا ———
"بالکل ٹھیک ہوں آن ——— ممی ——— امی حضور" وہ آنٹی کہتے کہتے رُکی، جلدی سے ممی کہا پھر امی حضور کہہ کر شمسہ بیگم کو بڑی عقیدت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔
"عاشی ———"
محمود حسین کی بھرائی ہوئی آواز اُس کے کانوں میں گونجی تو جیسے اُس کے وجود میں ایک ہلچل سی مچ گئی ——— دل کی دھڑکنیں ایک انوکھے جذبے کے تحت تیز ہوگئیں ——— آہستہ سے نگاہوں کا زاویہ بدل کر اُس نے باپ کی طرف دیکھا تو ہلکا پھلکا مارتی خوشیوں کا احساس دل کی گہرائیوں سے چھلک کر اُس کی دراز پلکوں تک آگیا۔
محمود حسین کی آنکھیں بھی بھیگی بھیگی نظر آرہی تھیں۔
"اب ..... بو ——— ابو ———"
عاشی نے کپکپاتی آواز میں پہلی بار تھم تھم کر اور جذبوں کی تمام پاکیزگیوں کو اپنے لہجے میں سمو کر ایک ٹھوس اور مضبوط رشتے کو آواز دی ——— لیکن ——— خود پر قابو نہ پا سکی ——— جذبات کی فراوانی میں کسی تنکے کی طرح بہہ کر تیزی سے اٹھی ——— باپ کے سینے کی کشادگی میں سر چھپایا اور بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر

رونے لگی ——— سسکنے لگی۔
محمود حسین کی پلکوں سے بھی ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی ——— باپ بیٹی ایک دوسرے کو مضبوطی سے اپنے بازوؤں میں لئے انکھوں کی زبانی حالِ دل سناتے رہے، اور شمسہ بیگم پاس کھڑی ڈبڈبائی نگاہوں سے اس حسین اور مقدس ملاپ کو دیکھتی رہیں۔
بڑی دیر تک کمرے میں عاشی کی سسکیاں اُبھرتی رہیں، محمود حسین کی آنکھیں آنسوؤں کے موتی پروتی رہیں پھر انھوں نے اپنے آنسو پونچھے اور بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دبی آواز میں بولے
"عاشی ——— میری بچی ——— میں تم سے بے حد شرمندہ ہوں"
"ابو ———" عاشی نے جلدی سے سر اُٹھا کر باپ کی نگاہوں میں جھانکتے ہوئے کہا "آپ مجھے گنہگار کر رہے ہیں"
"میں ——— میں تمہارا مجرم ہوں بیٹی لیکن خدا گواہ ہے کہ ———"
"نہیں ابو ——— نہیں" وہ اپنی انگلیوں سے باپ کے گالوں پر تھمے ہوئے آنسوؤں کے قطروں کو صاف کرتے ہوئے معصومیت سے بولی "مجھے آپ سے کوئی شکوہ ——— کوئی شکایت نہیں ——— میں تو آپ کو اچانک پا کر سب کچھ بھول چکی ہوں ——— آپ بھی بیتی باتوں کو بھول جائیے ——— میری خاطر"
"تم ——— تم بہت عظیم ——— بہت بلند ہو میری بچی" محمود حسین نے لپکپاتی آواز میں جواب دیا پھر شہباز کی آمد کی اطلاع ملی تو بیٹی کے شانوں کو بڑی شفقت سے تھپتھپاتے ہوئے باہر چلے گئے۔
عاشی باپ کے جانے کے بعد بڑی دیر تک شمسہ بیگم سے باتوں میں مصروف رہی پھر جب شمسہ بیگم کسی کام سے باہر چلی گئیں تو عاشی بے اختیار اپنے قدموں پر گھوم گئی۔ خوشی کے جذبوں کی فراوانی سے اس کا چہرہ تپ کر کندن ہو رہا تھا ——— آنکھیں مسرتوں کے احساس سے چمکے ہی تھیں انگ انگ سے زندگی پھوٹ رہی تھی۔

اُس نے کمرے کے ماحول پر نظر ڈالی ——— کل تک جن چیزوں پر اجنبیت کی چھاپ لگی ہوئی تھی ——— آج اُن کی حیثیت بدل چکی تھی ——— وہ سب اُس کی ملکیت تھیں۔
غیریت کا احساس درمیان سے ہٹ گیا تھا ———
خزاں کے بادل چھٹ گئے ——— تو
بہار کے موسم نے بڑھ کر اُس کے قدم چوم لئے ———
اُس کے سُونے دل کو نکھار عطا کر دی ———
اُس کے اُجاڑ وجود کو مہکار بخش دی تھی ———
پلکوں پر مسکراہٹوں کے خزینے سجائے وہ کھڑکی کے قریب آکر کھڑی ہوگئی ——— سبزے پر لہلہاتے ہوئے گل رنگ پودے بھی اس کی خوشیوں میں شریک نظر آرہے تھے، وہ اُن خوبصورت اور حسین ——— تناور و معصوم درختوں اور پھولوں سے بھری کیاریوں کو دیکھنے لگی جو صمد نے اپنے ہاتھوں سے سنواری تھیں۔
صمد کا خیال آیا تو وہ دوبارہ ملول سی ہوگئی ——— اُس کی بلندیوں پر غور کرنے لگی ——— بلندیاں، جس کے سائے تلے وہ پل کر جوان ہوئی تھی جس نے اُس کے وجود کو سہارا دے کر پروان چڑھایا تھا۔ آج اگر صمد زندہ ہوتا تو وہ بڑی عقیدت سے اُس کے قدموں پر سر رکھ دیتی۔
پرستش کے انداز میں سرنگوں ہو جاتی۔
کہ وہ صرف صمد نہیں تھا ———
انسان تھا ——— !
انسانیت کی معراج تھا ——— !!
کچھ دیر تک اسے صمد کی جدائی کا احساس ستاتا رہا پھر اچانک اُسے ناجیہ کا خیال آیا تو اُس کے ایک معصوم سی بزرگانہ مسکراہٹ اُبھر آئی ——— تیزی سے قدم اُٹھاتی باہر نکلی ——— ناجیہ کے

کمرے میں لے دیکھا ـــــ اسٹڈی میں ایک نظر ڈالی ـــــ پھر شرفو سے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ وہ ـــــ طبیعت خراب ہوتے ہی کہیں چلی گئی ہے۔

چلی گئی ـــــ مجھ سے ملے بغیر ـــــ، عاشی نے حیرت سے سوچا۔
کہیں ایسا تو نہیں کہ ناجیہ نے اس کی حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہو ـــــ ؟
اور اپنی خفگی کے اظہار کے طور پر کہیں چلی گئی ہو ـــــ ؟
وہ ناجیہ کی رگ رگ سے واقف تھی ـــــ اس لئے اس سے دور دور اور الگ تھلگ رہتی تھی۔
لیکن ـــــ

اب حالات نے ایک نیا انداز اختیار کر لیا ـــــ
ناجیہ کوئی غیر نہیں تھی ـــــ اُس کی اپنی چھوٹی بہن تھی ـــــ
جسے آج تک بھول سے وہ غیر سمجھتی رہی ـــــ
سہمی سہمی اور الگ تھلگ ڈولتی رہی ـــــ
مگر ـــــ
وہ اسی کے لہو کا ایک خوبصورت رنگ تھی ـــــ
ایک ہی تصویر کا دوسرا رُخ تھی ـــــ

اور ناجیہ کے بارے میں سوچ سوچ کر وہ آپ ہی آپ اپنے تصورات میں جھومتی رہی ـــــ
اُس نے طے کر لیا تھا کہ اب وہ ہمیشہ ناجیہ کا خیال رکھے گی ـــــ اُس کی ایک ایک بات کا ـــــ ہر ضد کا ـــــ
اس لئے کہ وہ نازوں کی پلی تھی اور جب قدرت نے اُسے ناجیہ کے ناز اٹھانے کے لئے بے نقاب کر دیا تھا تو پھر وہ اس میں بخل سے کیوں کام لے۔

وہ خوابوں کے دوش پر ناجیہ کو اپنے سینے کی گہرائیوں میں چھپائے ـــــ ہاتھوں کے حلقے میں لئے اُس سے میٹھی میٹھی، پیاری پیاری باتیں کرتی رہی۔

"ناجیہ ـــــ میری منی سی پیاری پیاری بہن ـــــ اب تجھے مجھ سے کوئی شکایت ـــــ کوئی شکوہ ـــــ کوئی گلہ نہ ہوگا ـــــ تیری خوشیوں کی خاطر تیری بہن تجھ پر اپنی جان بھی نچھاور کر دے گی ـــــ تیرے ہونٹوں پر زندگی سے بھرپور تبسم جگائے رکھنے کیلئے میں کسی قربانی سے دریغ نہیں کروں گی ـــــ تیری زندگی میں خزاں کا منحوس موسم کبھی نہ آنے دوں گی ـــــ تیری مسرتوں کی خاطر میں اپنے حصّے کی تمام خوشیاں بھی تیرے قدموں میں ڈال دوں گی ـــــ

اس لئے کہ تو میری بہن ہے ـــــ میرا اپنا لہو ہے ـــــ ہم ایک طویل مدت کے بعد ملے ہیں تو اب مرتے دم تک کبھی جُدا نہ ہوں گے ـــــ مضبوطی سے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے زندگی کی حسین اور مہکتی شاہراہوں پر تازیست خوشیوں اور مسرتوں کے نغمے الاپتے پھریں گے ـــــ

اور ناجیہ ـــــ
میری پیاری بہن ـــــ
تو اپنی بہن سے کبھی بدگمان نہ ہونا ـــــ
اپنے دل میں کبھی میل نہ آنے دینا ـــــ
کبھی اپنی کشادہ اور چمکتی دمکتی پیشانی پر شکنیں نہ پیدا کر لینا ـــــ
میں ـــــ اب تجھے کبھی مایوسی سے ہمکنار نہ ہونے دوں گی ـــــ
تیری خوشی کی خاطر ـــــ
تیری ایک ادنیٰ اور حقیر سی خواہش کے لئے تیری بہن ـــــ
تیری عاشی ـــــ تیرے لئے اپنی زندگی تو کیا ـــــ

شہباز کو بھی تیری جھولی میں ڈال دے گی ـــــ

شہباز کے مسئلے نے محمود حسین کی راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کر دیا تھا۔
شمہ بیگم اور شہباز کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی اُس کا کچھ علم انھیں شہباز کی زبانی ہو چکا تھا۔ انھیں یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ شہباز نے ناجیہ کے ساتھ زندگی وابستہ کرنے کا ارادہ نہیں کیا ـــــ اس کے دل میں بدستور عاشی کی محبت اور طلب قائم تھی۔ اس نے نہایت سنجیدگی سے بڑے سادہ اور صاف انداز میں کہا تھا ـــــ
"میں محض کسی کی خوشنودی اور جھوٹی مسرتوں کی خاطر اپنی محبت کا گلا نہیں گھونٹ سکتا۔"

اور اب محمود حسین کے لئے یہ دشواری درپیش تھی کہ وہ عاشی اور شہباز کی شادی کا ذکر کس طرح چھیڑیں۔
انھیں اس بات کا خطرہ تھا کہ کہیں شمہ بیگم کے ذہن میں یہ بات گھر نہ کر لے کہ محض اپنی بچھڑی ہوئی بیٹی کی خاطر وہ ناجیہ کی راہ میں دیوار بن کر حائل ہو رہے ہیں ـــــ وہ تو کوئی ایسی تدبیر سوچ رہے تھے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے ـــــ گھر کی خوشیوں کو وہ اپنے کسی آخری اور اٹل فیصلے سے مجروح نہیں کرنا چاہتے تھے۔
انھیں شمہ بیگم کی رفاقت اور اُن کی دلجوئی بھی منظور تھی۔
وہ ناجیہ کی طبیعت سے بھی واقف تھے اس لئے یہ نہیں چاہتے تھے کہ اُن کی زبان سے نکلی ہوئی کوئی بات اُس کی پیشانی کی شکن بن جائے ـــــ
انھیں عاشی کی خوشیاں بھی بے حد عزیز تھیں ـــــ
عاشی اُن کی گم شدہ محبت کی آخری یادگار تھی۔
جو محرومیوں اور ناکامیوں کی زد میں آکر زندگی کی پُرپیچ شاہراہوں پر ایک طویل مدت تک بھٹکتی رہی۔
منزل کے سامنے پہنچ کر بھی منزل کے سراغ میں سرگرداں رہی ـــــ
اور اب جب اُسے زندگی کی نوید مل گئی تھی ـــــ
اجنبیت کا احساس دُور ہوا تھا ـــــ تو
اُس کے ہونٹوں سے مسکراہٹوں کے خزینے نوچ لینا سراسر ناانصافی تھی ـــــ
حق تلفی تھی ـــــ اور
محمود حسین نے طے کر لیا تھا کہ وہ جیتے جی کوئی ایسا فیصلہ صادر نہیں کریں گے جو عاشی کو دوبارہ تاریکیوں کے ہیبت ستاٹوں کی جانب واپس دھکیل دے ـــــ
فائزہ کے ساتھ ایک بار جو ظلم ہو چکا تھا ـــــ وہ اُسے عاشی کے سلسلے میں دہرانا نہیں چاہتے تھے۔

اس وقت بھی وہ اپنی خواب گاہ میں آرام کرسی پر بیٹھے ان ہی پریشان خیالوں میں گم تھے کہ شمہ بیگم داخل ہوئیں ـــــ قدموں کی چاپ سُن کر محمود حسین کی محویت ٹوٹ گئی ـــــ آنکھیں کھول کر انھوں نے بیوی کی طرف دیکھا تو جلدی سے سنبھل کر بیٹھ گئے۔ شمہ بیگم خلافِ توقع اس وقت بے حد اداس الجھی اور پریشان نظر آرہی تھیں۔

"کیا بات ہے بیگم ـــــ" محمود حسین نے بڑے پیار سے پوچھا "آپ کچھ ملول نظر آرہی ہیں؟"
"کوئی خاص بات نہیں ـــــ کام کی تھکن کی وجہ سے چہرے پر تکان کے اثرات نمایاں ہو گئے ہوں گے۔" شمہ بیگم نے شوہر کو ٹالتے ہوئے کہا پھر مسہری کے سرہانے دودھ کے گلاس کو جوں کا توں رکھا دیکھ کر بولیں "آپ نے ابھی تک دودھ نہیں پیا؟"
"پہلے کبھی اپنے ہاتھ سے یہ زحمت گوارا کی ہے جو آج یہ گستاخی کر بیٹھتا۔" محمود حسین نے بیوی کے چہرے کے تاثرات کو پڑھتے ہوئے قدرے شوخی سے جواب دیا۔
"آپ تو حد کرتے ہیں ـــــ" شمہ بیگم دودھ کا گلاس اُٹھا کر قریب آتے ہوئے بولیں "اتنی عمر ہونے کو آئی لیکن ابھی تک بچوں کی سی ضد نہیں گئی ـــــ"
"آپ نے عادتیں جو خراب کر دی ہیں۔"

محمود حسین نے مسکراتے ہوئے جواب دیا' دودھ کا گلاس جلدی سے ختم کیا پھر سنجیدگی سے بولے

" میں نے آپ کا حکم مان لیا ـــــ اب آپ سچ سچ بتائیے کہ پریشانی کا سبب کیا ہے ؟"

" کچھ نہیں ـــــ یوں ہی ذرا ـــــ"

" بیگم ـــــ آپ کو ہماری قسم "

محمود حسین نے اپنی قسم دی تو شمہ بیگم نے جھلا کر ایک نظر شوہر پر ڈالی پھر سنبھل کر آہستہ سے بولیں۔

" میں نے شہباز کو ناجیہ کے سلسلے میں کریدنے کی کوشش کی تھی لیکن ـــــ"

" لیکن کیا ـــــ؟"

" شہباز نے بڑی خوبصورتی سے اشاروں کنایوں میں اپنی مرضی کا اظہار کر دیا" شمہ بیگم نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا " وہ ناجیہ سے اپنا مستقبل وابستہ کرنے پر تیار نہیں ہے ـــــ"

" کیوں " محمود حسین نے پوچھا " کیا خرابی ہے ناجیہ میں ـــــ ؟"

" بات خرابی کی نہیں شہباز کی پسندگی ہے اور جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ ـــــ عاشی کو چاہتا ہے"

" اوہ ـــــ " محمود حسین نے بہت غور سے بیوی کے چہرے کو تکتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر اپنے خیالوں میں گم رہے پھر دبی زبان میں بولے ـــــ " اب کیا ارادہ ہے آپ کا ـــــ؟"

" میرے لئے عاشی اور ناجیہ دونوں برابر ہیں ـــــ اگر شہباز عاشی کو پسند کرتا ہے تو ان دونوں کی جوڑی بھی نہایت مناسب رہے گی " شمہ بیگم نے بڑی صاف گوئی سے کہا " البتہ مجھے نجانے اس بات کی ہے کہ اگر ناجیہ کو معلوم ہوا تو وہ ـــــ"

" قیامت کھڑی کرے گی " محمود حسین نے بیوی کا ادھورا جملہ مکمل کیا پھر اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگے ـــــ کچھ دیر تک خواب گاہ میں مکمل سکوت طاری رہا پھر محمود حسین بولے " مجھے یہ بات پہلے سے معلوم تھی کہ شہباز عاشی کو اپنانا چاہتا ہے ـــــ شہباز نے اپنی اس خواہش کا اظہار ممدو کی زندگی میں اس وقت کیا تھا جب مجھے عاشی کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا"

" اور آپ نے یہ بات مجھ سے اب تک پوشیدہ رکھی "

" وقت نے اتنی مہلت کہاں دی " محمود حسین نے تھکے تھکے لہجے میں کہا " اور جب حالات ذرا سازگار ہوئے تو ناجیہ نے شہباز کے سلسلے میں اپنی پسند کا اظہار کر دیا ـــــ اور ـــــ"

" اور آپ اس وجہ سے خاموش ہو گئے کہ میں کہیں ناجیہ کے مقابلے میں عاشی کی خوشیوں کو رد نہ کر دوں "

شمہ بیگم نے شکایتی انداز اختیار کیا " افسوس ـــــ آپ مجھے ابھی تک نہ سمجھ سکے "

" خدا گواہ ہے بیگم ـــــ یہ بات نہیں ہے لیکن ـــــ ذرا سوچئے' اگر آپ میری جگہ ہوتیں اور عاشی آپ کی بچھڑی ہوئی بیٹی ہوتی تو کیا آپ ـــــ"

" خیر جو ہونا تھا ہو گیا ـــــ اب یہ بتائیے کہ عاشی اور شہباز کی بات کب پکی کر رہے ہیں " شمہ بیگم بے حد خلوص اور نہایت اپنائیت سے بولیں " ایمان سے ـــــ مجھے اس رشتے سے بے حد خوشی ہو گی ـــــ ہماری عاشی کا مستقبل سنور جائے گا "

" میرا بھی یہی خیال ہے لیکن ـــــ کیا ناجیہ ہمارا فیصلہ تسلیم کرے گی ؟"

" میں ناجیہ کی ماں ہوں ـــــ جانتی ہوں کہ وہ بے حد ضدی اور خود سر ہے' مگر صرف اُس کی ضد کی خاطر ہم ... عاشی کا مستقبل تو برباد نہیں کر سکتے " شمہ بیگم نے کہا پھر کچھ سوچ کر بولیں " مجھے تو اب یہ بھی شبہ ہو رہا ہے کہ کہیں ناجیہ نے محض عاشی کی ضد میں تو شہباز سے اپنی پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا "

" جو بات بھی ہو لیکن ہمیں کوئی ایسا راستہ اختیار کرنا پڑے گا جو ہمارے گھر کے سکون کو برباد نہ ہونے دے" محمود حسین نے پُرخیال انداز میں کہا " میں اس بات کو پسند نہیں کروں گا کہ عاشی اور ناجیہ کے دل آپس میں ایک دوسرے سے کھنچ جائیں "

" یہ بات آپ مجھ پر چھوڑ دیں ـــــ " شمہ بیگم نے شوہر کی مجبوریوں کو محسوس کرتے ہوئے کہا " میں ناجیہ کو سمجھانے کی کوشش کروں گی ـــــ"

" کیا آپ کو اُمید ہے کہ ناجیہ آسانی سے ہماری خوشیوں کو تسلیم کرے گی ؟" محمود حسین کی آواز میں دہ

بے بسی تھی۔

" ایک طریقہ ممکن ہے ـــــ"

" وہ کیا ـــــ ؟"

" اگر شہباز خود ناجیہ سے انکار کر دے تو ـــــ"

" تو عاشی اور شہباز کے راستے اور محفوظ ہو جائیں گے " محمود حسین ہونٹ کاٹتے ہوئے بولے " ہمیں کچھ اور سوچنا ہو گا "

" آپ پریشان نہ ہوں ـــــ خدا نے چاہا تو کوئی نہ کوئی اسباب ضرور پیدا ہو جائیں گے' اب آپ سونے کی کوشش کریں ـــــ صبح کچہری بھی جانا ہے ـــــ"

شمہ بیگم نے شوہر کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا پھر اچانک دروازے پر کوئی آہٹ سُن کر چونک اُٹھیں ـــــ باہر راہداری میں کوئی ضرور موجود تھا ـــــ کچھ سوچ کر وہ تیزی سے آگے بڑھیں۔ خواب گاہ سے نکل کر دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا۔

عاشی پنجوں کے بل چلتی ہوئی راہداری کے آخری سرے سے اپنے کمرے کی طرف گھوم رہی تھی۔

" کیا بات ہے ـــــ " محمود حسین نے بیوی سے پوچھا " کیا کوئی باہر موجود تھا ـــــ؟"

" جی ـــــ جی نہیں' میرا وہم تھا " شمہ بیگم نے جلدی سے بات بنا دی لیکن اُن کا ذہن بدستور عاشی کے بارے میں اُلجھا ہوا تھا۔

وہ سوچ رہی تھیں ـــــ

عاشی نے تمام باتیں سُن لی ہوں گی ـــــ

نہ جانے اس غریب کے دل پر کیا قیامت گزر گئی ہو ـــــ ؟؟

والدین کی موت کے بعد قدرت نے شہباز کو کروڑوں کی جائیداد کا تنہا وارث بنا دیا تھا۔ وہ اگر دونوں ہاتھ سے دل کھول کر بھی باپ کی چھوڑی ہوئی دولت کو خرچ کرتا تو بھی زندگی نہایت عیش و آرام سے گزر جاتی لیکن ... اُس نے اپنے قدم ڈگمگانے نہیں دیئے۔ خود کو ثابت قدم رکھا۔

وقت کی رفتار اس پر مہربان تھی' حالات سازگار تھے اور قدرت نے اپنے کرم کے خزانے اس پر کھول دیئے تھے' اس کی جگہ دوسرا کوئی ہوتا تو شاید بہک جاتا ـــــ زندگی کے لمحوں کو رنگین و خوشگوار بنانے کی خاطر غلط۔ راستوں پر چل نکلتا ـــــ مگر شہباز نے خود اپنا احتساب کیا تھا۔

باپ کی وفات کے بعد تمام تر ذمہ داریاں اس پر آن پڑی تھیں جنھیں اُس نے نہایت بردباری اور خندہ پیشانی سے سنبھالا۔ اپنی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور آبائی کاروبار کی دیکھ بھال بھی کرتا رہا۔ پہلے کے مقابلے میں اُس نے خود کو زیادہ محتاط کر لیا اور اسی وجہ سے وہ کالج میں اپنے ہم جماعتوں کے لئے بھی پُراسرار بن گیا تھا۔

انتہائی خوش مزاج اور ملنسار ہونے کے باوجود وہ خود کو لئے دیئے رکھتا اور کسی سے اپنی دوستی ایک حد سے زیادہ تجاوز نہ ہونے دیتا۔ کالج کے لاتعداد لڑکے اس کی دوستی کے خواہاں رہتے ـــــ بے شمار لڑکیاں اس کے قریب ہونے کی کوشش میں لگی رہتیں ـــــ وہ سب کے ایک طرح پیش آتا کسی سے رسم و راہ کو بڑھانے کے معاملے میں ہمیشہ نہایت خوبصورتی سے کترا جاتا' مگر اپنے دل کے معاملے میں اس طرح اچانک لٹا کہ خود اُسے بھی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

ہم جماعت لڑکیوں میں ایک عاشی ہی ایسی تھی جس نے کبھی شہباز کو قریب لانے یا اس سے دوستی بڑھانے کی کوشش نہیں کی اور غالباً یہی وجہ تھی کہ وہ شہباز کی توجہ کا مرکز بن گئی اور پھر ـــــ اچانک ایک روز شہباز کو احساس ہوا کہ عاشی اس کے دل و دماغ پر پوری طرح اپنا تسلط جما چکی ہے۔ کب اور کس طرح وہ اُس کے دل کی گہرائیوں میں چور راستوں سے دبے قدموں داخل ہوئی اور کب اس کے حواسوں پر چھا گئی ـــــ شہباز کو اس کی مطلق خبر نہ ہوئی لیکن حرفانی بارش والے روز جب عاشی اس کی گاڑی میں اس کی ہم سفر بنی تو شہباز کو پہلی بار اپنے لٹنے کا احساس ہوا ـــــ وہ ششدر رہ گیا۔

اس نے عاشی سے بھی کترانے کی کوشش کی لیکن عاشی کا معصوم تصور اُس کے وجود پر ساون کے

بادلوں کی طرح چھا گیا۔

پہلے پہل یہ جان کر اُسے دکھ ہوا کہ عاشی بیرسٹر محمود حسین کے ہاں رہتی ہے لیکن جب اسے عاشی کی اصلیت کا اندازہ ہوا تو اُس نے عاشی کو اپنی زندگی کا ہم سفر بنانے کا فیصلہ کر لیا اس لئے کہ عاشی غریب تھی، خوبصورت تھی ـــــ معصوم تھی ـــــ نہایت پاکیزہ اور مہذب تھی اور اس کے علاوہ سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اُس نے خود کو حالات کے سانچوں میں ڈھال لینے کا عادی بنا لیا تھا ـــــ

حالات سے مفاہمت کرنا سیکھ لیا تھا۔ سرد و گرم سہنے کی عادی ہو گئی تھی ـــــ

زخم کھا کر مسکرانا اپنا شعار بنا لیا تھا ـــــ اور ـــــ

غرور و تکبر تو اُس کے قریب سے ہو کر بھی نہیں گزرا تھا۔

شہباز کو اپنی زندگی کے لئے ایک ایسے ہی ہم سفر کی تلاش تھی جو اُس سے قدم ملا کر زندگی کا سفر طے کر سکے اور دولت کی جھنکار اور چمک دمک دیکھ کر جس کی آنکھیں خیرہ نہ ہوں۔

عاشی ہر اعتبار سے اس کے معیار پر پوری اُتری ـــــ اُسے اپنے انتخاب پر فخر تھا۔

محمود حسین سے شہباز کے والد کے پرانے تعلقات تھے اس لئے شہباز نے وہاں آنا جانا شروع کر دیا ـــ پھر محمود کی بیماری نے اسے عاشی سے قریب ہونے کا موقع فراہم کرایا اور یوں شہباز نے ایک دن نہایت سنجیدگی اور سادگی سے عاشی پر اپنے ارادے کا اظہار کر دیا۔

عاشی خلافِ توقع شہباز کی زبان سے اعترافِ محبت سُن کر گنگ رہ گئی ـــ اُسے اپنی کم مائگی اور حیثیت کا بخوبی احساس تھا ـــ اُس نے خوابوں کی دنیا میں گم ہو کر حسین خواب دیکھنے کی کوشش بھی کبھی نہیں کی تھی اس لئے شہباز کی بات سُن کر اُس کے دل میں کوئی ہلچل نہیں پیدا ہوئی ـــ اُس نے بڑی خوبصورتی سے شہباز کو ٹالنے کی کوشش کی ـــ اپنی غربت کا احساس دلانا چاہا، اپنے وجود کے اطراف پھیلے ہوئے ان تاریک اور گھپ اندھیروں سے بھی آگاہ کر دیا جس میں اُس کے وجود کی تمام حقیقتیں گھٹ کر رہ گئی تھیں ـــ اُس نے شہباز پر اپنے آپ کو واضح کر دیا ـــ یہ بھی بتا دیا کہ اُسے خود اپنے بارے میں بھی کچھ نہیں معلوم کہ ـــــ

وہ کون ہے ـــــ ؟ کیا ہے ـــــ ؟

اور عاشی کی اسی سادگی، معصومیت اور بیباک گفتگو نے شہباز کو اپنا گرویدہ بنا لیا، عاشی نے جس قدر اُس سے کترانے کی سعی کی ـــ دُور بھاگنے کی کوشش کی ـــ وہ اتنا ہی اس سے قریب ہوتا گیا ـــ اور پھر ایک دن اُس نے محمود حسین پر اپنا عندیہ ظاہر کر کے اس خواہش کا اظہار کر دیا کہ وہ عاشی کو شریکِ زندگی بنانے کا خواہشمند ہے۔ محمود حسین نے اُسے اپنی مدد کا یقین دلایا تھا ـــــ

لیکن ـــ جب وقت نے کروٹ لی ـــــ

حالات کے دھاروں نے اپنا رُخ بدلا ـــــ

اور عاشی کی اصلیت بے نقاب ہوئی تو ناجیہ اس کے راستے میں دیوار بن گئی۔

اُس نے شمسہ بیگم پر شہباز کے سلسلے میں اپنی پسند کا اظہار کر دیا ـــــ وہ شہباز کے عشق میں دیوانی نہیں ہوئی تھی ـــ شہباز کے تصوّر نے اس کے دل میں مدوجزر کی کیفیتوں کو کبھی بیدار نہیں کیا تھا ـــ وہ تو بس عاشی کی خوشیوں کو پامال کرنے کے درپے ہو گئی تھی ـــ اسے نیچا دکھانے کی خواہشمند تھی۔

اور ـــــ یہی وہ حالات تھے جنھوں نے محمود حسین کو الجھا دیا تھا۔

شمسہ بیگم نے ناجیہ کا مستقبل سنوارنے اور اُس کی خوشنودی کی خاطر شوہر کی ایما پر شہباز کو کرید نے کی کوشش کی تو شہباز نے نہایت سنجیدگی سے صاف الفاظ میں انکار کر دیا ـــ ازاں بعد اُس نے محمود حسین کو اُن کا وہ وعدہ یاد دلانے کی کوشش کی جو انھوں نے عاشی کے سلسلے میں کیا تھا ـــ لیکن جب محمود حسین کو بھی مجبور اور بیس و پیش کرتے محسوس کیا تو اُس کا دل ٹوٹ گیا ـــ اُس نے طے کر لیا کہ وہ ان حالات سے خود کو کنارہ کش کر لے گا ـــ عاشی کی محبت اور اُس کے حسین تصوّر کو دل کی گہرائیوں میں چھپائے اتنی دور چلا جائے گا جہاں کوئی عاشی کے پیار کو اُس سے چھیننے کی کوشش نہ کر سکے ـــــ جہاں گھٹن کا احساس نہ ہو۔

کوئی مجبوری نہ ہو ـــــ !!

جہاں وقت کی نزاکتیں اور حالات کے تقاضے بھی اس کی معصوم محبت پر شبخون نہ مار سکیں۔

شہباز نے روانگی کے لئے اپنا رختِ سفر باندھ لیا، وہ کسی سے کچھ بتائے بغیر نہایت خاموشی سے بہت دور چلا جانا چاہتا تھا لیکن جانے سے پہلے وہ ایک بار عاشی سے ملنے کا خواہشمند تھا ـــ عاشی سے مل کر اُس سے آخری بار اپنا دل چیر کر دکھانا چاہتا تھا ـــ یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ اس کی پاکیزہ محبت کبھی فنا نہ ہو گی ـــ اُس کے سیہ خانۂ دل میں ہمیشہ قائم و دائم رہے گی ـــ

عاشی سے تنہائی میں ملنے کی خاطر وہ کئی بار محمود حسین کی کوٹھی کے چکر لگا چکا تھا لیکن ہر بار مایوس ہو کر دروازے سے واپس آ گیا ـــ آج بھی جب اُس نے عاشی کو تنہا سبزے پر محوِ خرام دیکھا تو خوشی سے جھوم اٹھا، گاڑی کوٹھی کے باہر چھوڑ کر وہ دبے قدموں عاشی کے قریب چلا گیا اور جب اُس نے قریب پہنچ کر اُسے سرگوشی میں آواز دی تو عاشی یوں چونک اٹھی جیسے چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہو۔ پھر اُس کے ہونٹوں پر آیا لمحہ تبسم پھیل کر گہرا ہوتا چلا گیا ـــ اُس نے شہباز کو یوں دیکھا جیسے بہت دیر سے اسی کی منتظر ہو۔

"آپ کو میرا آنا بُرا تو نہیں لگا ـــــ" شہباز نے دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

"ایک بات کہوں ـــ یقین کریں گے آپ" عاشی نے شہباز کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"کہئے ـــ میں بہت دنوں سے آپ کی راہ تک رہی تھی ـــــ"

"سچ ـــــ" شہباز کی آنکھوں میں اُمید کی کلیاں چٹکنے لگیں "کہیں میری قوتِ سماعت مجھے فریب تو نہیں دے رہی ہے" اُس نے عاشی کی نگاہوں کی گہرائیوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

"اتنے دنوں سے کہاں غائب تھے ـــــ" وہ اپنے ہونٹوں پر ایک حسین تبسم سجا کر بولی

"حالات کے نشیب و فراز میں پھنس کر بھٹک رہا تھا" شہباز نے مدھم آواز میں جواب دیا۔

"آپ اتنی جلدی ہمت چھوڑ دیں گے ـــــ مجھے اُمید نہیں تھی۔"

"عاشی ـــــ آپ ـــــ"

"آیئے میرے ساتھ" اُس نے بڑی سادگی سے کہا "ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اطمینان سے گفتگو کریں گے"

"میں ـــــ میں تنہائی میں آپ سے دو باتیں کرنا چاہتا ہوں"

"مجھے بھی آپ سے بہت کچھ کہنا ہے" اُس نے شہباز کے چہرے کے تاثرات کو محسوس کرتے ہوئے کہا پھر کوٹھی کی جانب چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھانے لگی۔

ڈرائنگ روم میں پہنچ کر عاشی نے بڑی بے تکلفی سے شہباز کو بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر خود بھی اس کے سامنے دوسرے صوفے پر سنبھل کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر تک دونوں خاموش رہے پھر عاشی نے پہل کی، مسکرا کر بولی

"اب کہئے، آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتے تھے ـــــ"

"میں ـــــ اس شہر سے دور جا رہا ہوں" شہباز نے حسرت بھرے لہجے میں آہستہ سے کہا "ہمیشہ کے لئے ـــــ"

"کوئی وجہ ـــــ" عاشی نے سنجیدگی اختیار کر لی

"یہ خیال ہے کہ وجہ آپ کو معلوم ہے ـــــ"

"ہاں ـــــ وجہ میں جانتی ہوں لیکن اس کے باوجود میں آپ سے یہی کہوں گی کہ آپ اپنا ارادہ تبدیل کر دیں"

"یہ ـــــ یہ مشورہ آپ دے رہی ہیں" شہباز نے حیرت سے دریافت کیا۔

"مستِ عبادت ہوتی ہے شہباز صاحب اور عبادت میں خلل پیدا ہو جائے تو پرستش کے تقاضے ادھورے رہ جاتے ہیں"

"کچھ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو زبان تک آ جائیں تو اپنی اہمیت کھو دیتی ہیں ـــــ"

"رشتوں کی نزاکتیں اکثر انسان کو قربانی دینے پر مجبور کر دیتی ہیں ـــــ"

"میں اس منطق کو تسلیم نہیں کرتا ـــــ" شہباز جذباتی بن گیا "ناجیہ کے گھر والوں نے آپ پر بے شمار ان گنت احسان کئے ہیں ـــــ میں مانتا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ اُن کی خوشی کی خاطر اپنی زندگی قربان کر دیں ـــــ اور ـــــ اپنے ساتھ دوسروں کی مسرتوں کو بھی روند ڈالیں ـــــ صورت میں کہ جب آپ ناجیہ سے بخوبی واقف ہیں۔"

"آپ کیا جانتے ہیں ناجیہ کے بارے میں ——؟"

"وہ انتہائی خودسر —— ضدی اور مغرور واقع ہوئی ہے —— دوسروں کے ہونٹوں سے خوشیاں چھین لینا اس کی فطرت ہے۔"

"اس کے باجود خون کے رشتوں سے منہ نہیں موڑا جا سکتا۔"

"خون کے رشتے ——" شہباز چونکا "میں سمجھا نہیں ——"

"ناجیہ میری بہن ہے —— میری چھوٹی بہن۔" عاشی نے بدستور سنجیدگی سے کہا "اور بڑی بہن ہونے کے ناطے میرا فرض ہے کہ ناجیہ کی ہر خوشی کا خیال رکھوں ——" "یہ —— یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"میں سچ کہہ رہی ہوں شہباز صاحب —— محمود حسین میرے بھی والد ہیں۔" عاشی بولی "یہ گھر میرا اپنا ہے۔ یہاں کی ایک ایک شے پر میرا حق ہے پھر —— ناجیہ کی خوشیاں میرے لئے پرائی کیسے ہو سکتی ہیں۔"

"ہو سکتا ہے آپ درست کہہ رہی ہوں لیکن میں ——"

"آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں —— مجھے اپنانا چاہتے ہیں۔" عاشی نے تیزی سے کہا پھر بڑی عاجزی سے بولی "شہباز —— اگر آپ کو واقعی مجھ سے محبت ہے تو میں ہاتھ جوڑ کر اس پاک جذبے کے مقدس نام پر آپ سے ناجیہ کی خوشیوں کی بھیک مانگتی ہوں —— آپ نے اگر میری درخواست قبول کر لی تو میرا سر فخر سے بلند ہو جائے گا —— میں اپنے گھر والوں کے سامنے سرخرو ہو سکوں گی —— لیکن اگر آپ نے میری بات رد کر دی تو میں خود اپنی نگاہوں میں گر جاؤں گی —— اور پھر —— پھر شاید میرا ضمیر تازیست مجھے ملامت کرتا رہے —— کچوکے لگاتا رہے —— گزرتا ہوا ایک ایک لمحہ —— ایک اک پل اس اذیتناک حقیقت کا احساس دلاتا ہے کہ میں اپنی بہن —— اپنی ناجیہ کی خاطر ایک چھوٹی سی قربانی بھی نہ دے سکی۔" "عاشی صاحبہ ——"

"پلیز شہباز صاحب ——" عاشی تڑپ اٹھی، اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے، بھرائی ہوئی آواز سے کہا "اگر آپ کے دل کے کسی گوشے میں میرے لئے کوئی گنجائش باقی ہے تو میری بات مان لیجئے —— ناجیہ کو اپنا لیجئے —— میں وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی —— اور اگر آپ نے میری بہن کی خوشیاں پامال کر دیں تو میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی اور —— اپنے وجود کو بھی موت کے حوالے کر دوں گی۔"

"عاشی ——" شہباز نے کچھ کہنا چاہا "آپ کو میری قسم شہباز۔"

وہ شہباز کو حسرت بھری نظروں سے تکتے ہوئے تیزی سے اٹھی، دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپے باہر کی طرف لپکی، ڈرائنگ روم سے نکلتے ہوئے دروازے کی اوٹ میں کھڑی ناجیہ سے ٹکرا کر ایک لمحہ کو رکی پھر بھاگتی ہوئی اپنی خواب گاہ میں آئی اور بستر پر گر کر بے اختیار سسکنے لگی۔

سمٹ سمٹا کر اتنا رونی کہ ہچکیاں بندھ گئیں ——!!

ناجیہ کے ذہن میں آج پہلی بار آندھیوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔

عاشی اور شہباز کی گفتگو سن لینے کے بعد اسے یوں محسوس ہوا جیسے گھنگھور گھٹائیں برسے بغیر گھٹا ٹوپ اندھیروں کو اپنے دامن میں سمیٹے دبے قدموں خاموشی سے گزر گئی ہوں —— نہ ہواؤں کی شدت نے طوفانی شکل اختیار کی —— نہ بارش کے ریلوں نے بسی بسائی آبادیوں کو برباد کیا —— کوئی جان ضائع نہیں گئی —— نہ کسی نشیمن پر بجلی گری اور نہ کوئی تناور درخت ٹوٹ کر زمین بوس ہوا ——

ہر شے جوں کی توں اپنی جگہ قائم تھی ——

پرسکون تھی ——

لیکن ناجیہ ——

اس کے دل و دماغ میں جو طوفان اٹھ رہا تھا اس کی شدتیں ہر لحظہ تیزی اختیار کرتی جا رہی تھیں —— وہ اندر ہی اندر جھلس رہی تھی —— اپنی شکست کے احساس سے کانٹوں پر لوٹ رہی تھی۔

عاشی ——! عاشی ——!! عاشی ——!!!

اس کے ذہن میں بس ایک ہی نام کی صدائے بازگشت گونج رہی تھی —— عاشی!

جس نے اس کے سارے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا —— اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا —— کتنی آسانی اور خاموشی سے اس کے اور شہباز کے راستے سے نہ صرف یہ کہ کنارہ کش ہو گئی تھی بلکہ اپنی محبت کے نام پر شہباز سے درخواست کی تھی کہ وہ ناجیہ کو اپنا لے۔

"مائی فٹ ——" وہ چیخ اٹھی "بھلا عاشی کون ہوتی ہے میرے معاملات میں دخل دینے والی —— کیا وہ شہباز کے سلسلے میں اتنی صاحب اختیار تھی کہ اسے اپنے اشاروں پر چلا سکے —— اور کیا وہ شہباز کو میری جھولی میں ڈال کر دنیا والوں کے سامنے اپنی عظمت کے بلند و بالا تعمیر کرنے کی خواہشمند ہے —— نہیں! —— ہیں! میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گی —— مجھے بھیک نہیں عاشی کی دل سوزی منظور تھی ——"

وقت کی ایک ہی کروٹ نے حالات کی صورت کیسی مسخ کر دی تھی —— کل تک اس نے عاشی کی زندگی روندنے —— اس کی خوشیوں اور تمناؤں کو اپنے قدموں تلے مسل ڈالنے کے کیا کیا انداز سوچے تھے —— کیسے کیسے طریقوں پر عمل کرنے کی ٹھانی تھی مگر —— عاشی کی ایک ہی چال نے اس کی بازی مات کر دی۔ بساط الٹ دی۔ وہ خون کے گھونٹ پیتی رہی —— اپنے دل کی ان بے ترتیب دھڑکنوں کو شمار کرتی رہی جو کسی طرح رکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں —— اس کے قابو سے باہر ہوئی جا رہی تھیں —— جانے کیا بات تھی جو آج وہ آپے سے باہر نہیں ہوئی ورنہ اگر چاہتی تو عاشی کو شہباز کی موجودگی ہی میں ذلیل کر سکتی تھی —— اس نے کئی بار ایسا کرنا چاہا تھا لیکن نہ جانے وہ کون سا جذبہ تھا جو بار بار اس کے آڑے آ جاتا۔

اس کا نام ناجیہ تھا —— اس نے زندگی میں کبھی کسی کے سامنے جھکنا نہیں سیکھا تھا —— وہ دوسروں پر حکومت کرنے کی عادی تھی —— اپنی شان و شوکت اور وقار کی بلندیوں کی خاطر وہ کسی لمحے —— کسی کی بھی پگڑی اچھال سکتی تھی —— دوسروں کو حقیر سمجھنا اس کی فطرت تھی۔

پھر —— وہ اتنی آسانی سے اپنی شکست کیسے تسلیم کر لیتی —— وہ شہباز کو عاشی سے مانگنا نہیں چاہتی تھی —— چھین لینے کی خواہشمند تھی مگر وقت نے اس کی تمام خواہشات کا گلا گھونٹ دیا —— اس کے اندر کے لاوے کو کچلیں لگا تو وہ کسی سوئے ہوئے آتش فشاں کی طرح بیدار ہو گئی —— اس کے وجود کا انگ انگ جیسے بیڑیوں کی الی پر تڑپ رہا تھا۔

کسی چوٹ کھائے ہوئے زخمی درندے کی مانند وہ فرش پر بچھے دبیز قالین کی سینہ کوبی کرتی رہی پھر اچانک اس کے ذہن میں عدیل کا تصور ابھر آیا —— عدیل نے آخری ملاقات کے وقت جو جملے کہے تھے وہ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔

"مجھے اپنی اوقات کا احساس ہو گیا ہے اس لئے میں تمہارے راستے سے ہمیشہ کے لئے دور ہو جاؤں گا —— لیکن اتنا یاد رکھنا کہ جو دوسروں کی محبت کا مذاق اڑاتے ہیں —— دوسروں کے دل کو ٹھیس پہنچاتے ہیں —— خود بھی کبھی سکون کا سانس نہیں لے پاتے ——"

عدیل کے تصور نے جیسے اسے سوتے سے جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا —— دل کے نہاں خانوں سے ابھرنے والے کسی جذبے کی شدت کو روکنے کے لئے اس نے اپنا ہونٹ سختی سے دانتوں تلے بھینچ لیا —— ماضی کے آئینے سے کچھ دھندلے دھندلے عکس اجاگر ہو کر اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے —— وہ اپنے گزرے ہوئے شب و روز کا شمار کرنے لگی۔

دادی کی تربیت نے اسے خودسر بنا دیا تھا —— وہ اپنے والدین کو بھی خاطر میں نہیں لاتی تھی —— دولت کی ریل پیل نے اس کے کچے ذہن میں امارت کا جو احساس پیدا کر دیا تھا وہ اتنا بلند اور ٹھوس تھا جس کے آگے تمام دوسری باتیں ہیچ تھیں —— وہ طوفان بن کر زندگی کے پرپیچ راستوں سے گزر جانے کی آرزومند تھی۔ پہلے وہ عدیل کی غربت سے کھیلتی رہی —— اس کا مذاق اڑاتی رہی —— بڑی سنجیدگی سے اسے احساس دلاتی رہی کہ وہ اس کی زندگی کا سہارا بنے گی لیکن ایک موڑ پر آ کر اس کا دل بھر گیا —— وہ اکتا گئی —— اس نے عدیل کو دھتکار کر اپنی زندگی سے دور کر دیا —— پھر فراز نے اس کی زندگی میں داخل ہونے کی کوشش کی —— شائستہ بیگم نے اسے بہو بنانے کا خیال ظاہر کیا تو اس نے کھلے لفظوں میں انکار کر دیا —— اس لئے نہیں کہ فراز اسے ناپسند تھا —— بلکہ صرف اس لئے کہ وہ دوسروں کی پسند پر اپنی مرضی کو فوقیت دینے؟

عادی ہوگئی تھی" ۔ فراز سے کترا کر وہ شہباز کے راستے میں حائل ہوگئی۔

شہباز ـــــ جو پُراسرار شخصیت کا مالک مشہور تھا، جو روز نئی نئی اور قیمتی گاڑیوں میں بیٹھ کر کالج آتا تھا ـــــ جو لڑکیوں کے قریب سے گزرتا تو یوں اپنی نگاہیں پھیر لیتا جیسے وہ انھیں قابلِ دید نہیں بلکہ قابلِ نفرت سمجھتا ہو ـــــ جانے وہ کیا تھا ـــــ کیا سمجھتا تھا اپنے آپ کو ـــــ ؟

شروع شروع میں وہ اسے نظر انداز کرتی رہی لیکن جب اُسے عاشی اور شہباز کے بارے میں حالات کا علم ہوا تو برداشت نہ کر سکی ـــــ عاشی تعلیم کے میدان میں اُس سے بہت آگے تھی لیکن شہباز کے معاملے میں اُس نے عاشی کو نیچا دکھانے کا فیصلہ کر لیا ـــــ اُس نے سوچا تھا ـــــ

عاشی کو شکست دینے کی خاطر وہ شہباز کو چھین لے گی۔

اُسے اپنائے گی ـــــ پھر

کسی موڑ پر اچانک کنارہ کش ہو کر اُسے بھی شکار کئے ہوئے زخمی پرندے کی مانند تڑپتا چھوڑ دے گی۔

تیز و تند ندی کی سرکش موجوں کے انداز میں آگے گزر جائے گی۔

لیکن ـــــ اس کی تدبیریں تقدیر کے بُنے ہوئے تانوں بانوں میں اُلجھ کر رہ گئیں۔

عاشی ایک ہی جست میں اس سے بہت آگے نکل گئی ـــــ

زندگی میں پہلی بار اُسے شکست کا سامنا کرنا پڑا تو وہ تلملا اٹھی ـــــ انتقام کے شعلے بھڑک اُٹھے۔

نفرتوں اور حقارتوں کے ملے جلے احساس نے اُسے قہر بنا دیا ـــــ وہ بجلی بن کر عاشی کے نشیمن کو جلا کر خاک کر دینا چاہتی تھی لیکن نہ جانے کیوں وہ بہت کچھ چاہنے کے باوجود کچھ نہ کر سکی۔

آج اُس کی سوچیں بھی اُس سے باغی ہوگئی تھیں ـــــ ہر موڑ اور ہر راستے پر عاشی کا وجود اُس کے سامنے سینہ سپر ہوگیا ـــــ مگر یہ وہ عاشی نہیں تھی جسے ناجیہ نے بلندیوں سے پستیوں کی سمت دھکیلنے کا ارادہ کیا تھا۔

یہ دوسری عاشی تھی ـــــ یہ عاشی اس کی بہن تھی ـــــ بڑی بہن، جس نے ناجیہ کی خوشیوں کی خاطر اپنی بخت اس کے حوالے کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا ـــــ جس نے ناجیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں سجانے کی خاطر اپنی پلکوں پر آنسوؤں کے موتی پرو لئے تھے ـــــ اور جس نے اپنا خون دے کر اُسے موت کے اذیتناک لمحوں سے نجات دلائی تھی ـــــ ناجیہ کی بجھتی زندگی کے چراغ کو روشن رکھنے کی خاطر اپنی جان پر کھیل گئی تھی۔

یہ عاشی بہت بلند ہوگئی ـــــ

اتنی بلند کہ ناجیہ اُس کی گرد کو بھی نہیں چھو سکتی تھی ـــــ

شاید اس لئے کہ ان بلندیوں میں خون کا رنگ اور رشتوں کا تقدس بھی شامل تھا۔

ناجیہ کے وجود کے اندر سوئی ہوئی عورت آہستہ آہستہ بیدار ہوئی تو اُس کی پیشانی پر شکنوں کا کھنچاؤ بھی بتدریج کم ہوگیا ـــــ انتقام کی آگ سرد پڑنے لگی ـــــ نفرتوں اور حقارتوں کا احساس ندامت کے سایوں میں ڈھلنے لگا ـــــ دل کی دھڑکنوں میں ایک نیا جذبہ سر اُبھارنے لگا۔

کچھ سوچ کر وہ آہستہ سے پلٹی ـــــ ایک لمحے کو اُس کے دل میں یہ خواہش بڑی شدت سے ابھری کہ دوڑتی ہوئی جائے اور عاشی کی کشادہ بانہوں میں سمٹ کر رہ جائے لیکن پھر اُس کی انا قدموں کی زنجیر بن گئی ـــــ اُس نے طے کر لیا کہ وہ دو محبت بھرے دلوں کی جُدائی کا سبب نہیں بنے گی ـــــ

عاشی کا پیار اُسے واپس لوٹا لے گی ـــــ

اُس کی عظمتوں کو دُور سے سلام کرتی رہے گی ـــــ

لیکن ـــــ اُس کے آگے جھکنا گوارا نہیں کرے گی ـــــ

اور پھر وہ پلٹ کر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی باہر سبزے پر آگئی جہاں پھولوں کی بھینی بھینی مہک ماحول کو معطر کر رہی تھی ـــــ سرو کے کنج کے قریب جا کر وہ تھکے تھکے انداز میں ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہوگئی اور آسمان کے دور پار خلاؤں میں جھانکنے لگی جہاں دودھیا پرندے قطار در قطار اپنے اپنے نشیمن کی طرف محوِ پرواز تھے!!

کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے، کسی نہ کسی طور اُن کی بھنک دوسروں کے کانوں تک ضرور پہنچ جاتی ہے ـــــ شائستہ بیگم تو پھر اپنی تھیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ ناجیہ اور شہباز کی سُن گن اُن تک نہ پہنچتی اور اسی خبر کی تصدیق کی خاطر وہ اس وقت محمود حسین اور شمسہ بیگم کو ٹٹولنے آئی تھیں۔

شائستہ بیگم کو اس خبر سے جو ذہنی اور قلبی دکھ ہوا اس کا اندازہ اُن کے سوا کوئی دوسرا نہیں لگا سکتا تھا ـــــ وہ ناجیہ کی تربیت اور طبیعت دونوں سے واقف تھیں چنانچہ جب انھیں ناجیہ کے انکار سے باخبر کیا گیا تو انھیں کوئی ملال نہیں ہوا ـــــ انھیں یقین تھا کہ ناجیہ ابھی کم سن ہے، بچی ہے مگر وقت کے ساتھ ساتھ اُس کے خیالات بھی سنور جائیں گے اور خیالات کے ساتھ ساتھ فراز اور ناجیہ کے باہمی رشتے کی بات بھی طے ہو جائے گی ـــــ لیکن، جب انھیں اچانک ناجیہ اور شہباز کے سلسلے کی اطلاع ملی تو اُن کے ذہن میں یہی خیال گزرا کہ محمود حسین نے انھیں بڑی خوبصورتی سے ٹال دیا ہے ـــــ

اس لئے کہ وہ غریب تھیں ـــــ

فراز اور ناجیہ کے حالات میں زمین و آسمان کا فرق تھا ـــــ

ایک قرابت داری کو درمیان سے علیحدہ کر دیا جاتا تو درمیانی کڑیوں کی کوئی حیثیت باقی نہ رہتی ـــــ

وہ محمود حسین کی منہ بولی بہن ہی تھیں ـــــ

کوئی خونی رشتہ دار تو نہ تھیں ـــــ لیکن

اس کے باوجود شائستہ بیگم کو اس خبر سے شدید صدمہ پہنچا، اگر انھیں دوٹوک فیصلے سے آگاہ کر دیا جاتا تو اور بات تھی لیکن جس انداز سے انھیں تاریکی میں رکھا گیا اور اب دودھ کی مکھی کی طرح علیحدہ کیا جا رہا تھا وہ انداز اُن کے وجود میں کانٹوں کی طرح چبھ گیا۔

آج چھٹی کا دن تھا اس لئے محمود حسین بھی گھر پر موجود تھے۔ شمسہ بیگم اور محمود حسین نے حسبِ معمول بڑی شادہ دلی سے شائستہ بیگم کا خیر مقدم کیا، عاشی نے اُن کی آمد کا سنا تو وہ بھی ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔

کچھ دیر تک رسمی باتیں ہوتی رہیں پھر شائستہ بیگم نے سنبھل کر دبی زبان میں پوچھا۔

"شمسہ، کیا یہ درست ہے کہ آج کل ناجیہ اور شہباز کا مسئلہ زیرِ غور ہے؟"

شائستہ بیگم کی بات پر محمود حسین بھی چونکے بغیر نہ رہ سکے، عاشی کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں، شمسہ بیگم تو جیسے گنگ رہ گئیں۔

"آپ کی اطلاع کسی حد تک درست ہے" محمود حسین نے اپنی نشست پر پہلو بدلتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "ناجیہ نے شہباز کے سلسلے میں اپنی پسندیدگی کا اظہار ضرور کیا ہے لیکن ابھی تک ہم نے کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا۔"

"میرا تو مشورہ ہے کہ تمہیں نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے" شائستہ بیگم حسرت بھری آواز میں بولیں۔ "شہباز کا رشتہ تمہارے حسبِ حیثیت بھی ہے اور پھر جب ناجیہ نے بھی اسے پسند کر لیا ہے تو بلاوجہ دیر کرنے سے کیا حاصل"

"آپ ہمیں غلط سمجھ رہی ہیں آپا" شمسہ بیگم نے وضاحت کرنی چاہی ـــــ "خدا گواہ ہے کہ ہم نے اس رشتے کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا لیکن ....."

"اچھے رشتے قسمت والوں ہی کو ملتے ہیں شمسہ ـــــ" شائستہ بیگم نے قدرے ناگواری سے کہا۔ "میری طرف سے پیشگی مبارکباد قبول کرو ـــــ"

"آپ غالباً ہم سے بہت زیادہ خفا ہیں" محمود حسین بہن کے جذبات کو محسوس کرتے ہوئے بولے۔

"اس میں بھلا خفگی کی کیا بات ہے، رشتوں کا فیصلہ تو اوپر آسمانوں پر ہو جاتا ہے ـــــ" شائستہ بیگم نے سنجیدگی سے جواب دیا "ناجیہ کی خوشی ہم سب کی خوشی ہے مگر ملال تو اس بات کا ہے کہ مجھے حالات سے بے خبر رکھا گیا ـــــ مجھے اس کی اُمید نہیں تھی"

آخری جملہ کہتے ہوئے شائستہ بیگم کی آواز بھرا گئی، محمود حسین اُن کی دلی کیفیت اور جذبات کو محسوس کر رہے تھے لیکن عاشی کی موجودگی میں وہ کھل کر حالات کی وضاحت نہیں کر سکتے تھے ـــــ پھر بھی بہن کی خاطر بولے

"آپ اپنی جگہ حق بجانب ہیں مگر آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ ہم آپ کی مرضی کے بغیر اپنی کسی خوشی کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔"

"بس رہنے دو محمود ـــــ یہ سب دنیا دکھاوے کی باتیں ہیں۔" شائستہ بیگم گلوگیر آواز میں بولیں، وہ کچھ اور بھی گلے شکوے کرنا چاہتی تھیں لیکن ناجیہ کے اچانک ڈرائنگ روم میں داخل ہونے کے سبب دل مسوس کر رہ گئیں۔

"گڈ مارننگ بھوپی جان ـــــ" ناجیہ نے خلافِ معمول بڑی اپنائیت سے کہا پھر شائستہ بیگم کے برابر بیٹھتے ہوئے بولی "آپ کب آئیں ـــــ مجھے تو خبر بھی نہیں ہوئی۔"

"ابھی کچھ دیر پہلے آئی ہوں ـــــ" شائستہ بیگم نے رسماً پوچھ لیا "تم سناؤ کیسی ہو؟"

"آپ کی دعائیں ہیں ـــــ" ناجیہ شوخی سے بولی پھر چونکتے ہوئے پوچھا "آپ کیا اکیلی آئی ہیں ـــــ میرا مطلب ہے کہ فراز نظر نہیں آ رہا ـــــ بہت دن ہو گئے اُسے دیکھے ہوئے۔"

"اپنی پڑھائی میں مصروف تھا اس لئے ساتھ نہیں لائی ـــــ لیکن وہ تمہاری شادی میں ضرور شریک ہوگا۔" شائستہ بیگم جذبات کی روانی میں کہہ گئیں ـــــ وہ ناجیہ کو کبھی باور کرانا چاہتی تھیں کہ انھیں اس کے فیصلے سے دکھ پہنچا ہے۔

"میری شادی ـــــ" ناجیہ نے حیرت سے سوال کیا پھر والدین کے چہروں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے مسکرا کر بولی "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں آنٹی ـــــ بڑی بہن کی موجودگی میں چھوٹی کا نمبر کیسے آ سکتا ہے ـــــ پہلے تو عاشی کی شادی ہوگی۔"

"خدا تم دونوں بہنوں کو ہمیشہ سلامت رکھے۔" شائستہ بیگم نے خلوصِ دل سے دعا دی۔

"اور شہباز صاحب کو بھی تو دعائیں دیجئے جو عاشی پر دانت جمائے بیٹھے ہیں۔" ناجیہ نے شوخی سے کہا تو سب ہی چونک اُٹھے۔

محمود حسین اور شمسہ بیگم نے ناجیہ کو حیرت سے گھورا ـــــ عاشی اپنے وجود میں سمٹ کر چور سی بن گئی اور شائستہ بیگم کو تو جیسے اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا، ناجیہ کو غور سے تکتے ہوئے بولیں

"میں نے تو کچھ اور سنا تھا ـــــ"

"سنی سنائی باتوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہیئے۔" ناجیہ مسکراتی رہی پھر اُس نے باپ کی سمت دیکھ کر بلکنت سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے پوچھا ـــــ "ڈیڈی ـــــ کیا آپ نے آنٹی کو نہیں بتایا کہ عاشی اور شہباز بہت جلد ایک ہونے والے ہیں۔"

"ناجیہ ـــــ" شمسہ بیگم نے بیٹی کو گھورتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں مخاطب کیا "تمہیں بزرگوں کی موجودگی میں اس قسم کی باتیں زیب نہیں دیتیں ـــــ"

"کیوں ممی ـــــ" اُس نے بڑی معصومیت سے پوچھا "کیا چھوٹی بہن کو بڑی بہن کی خوشی میں شریک ہونے کا کوئی حق نہیں۔"

"کیوں نہیں ہے بیٹی لیکن تم ـــــ" محمود حسین کچھ کہتے کہتے سٹپٹا کر خاموش ہو گئے ـــــ تو ناجیہ بے اختیار مسکرا دی پھر بڑی بے باکی سے بولی

"ڈیڈ ـــــ میں نے آنٹی اور آپ لوگوں کی گفتگو سن لی ہے اس لئے اب چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ رہا شہباز کے سلسلے میں میری پسند کا سوال تو وہ محض ایک مذاق تھا ـــــ میں نے عاشی کو تنگ کرنے کی خاطر یونہی ایک شوشہ چھوڑ دیا تھا۔"

"ناجیہ ـــــ" شمسہ بیگم ہونٹ کاٹ کر رہ گئیں۔

"یس ممی، دیکھ رہی ہوں ـــــ" اُس نے ماں سے کہا پھر ایک نظر سہمی ہوئی عاشی پر ڈال کر بولی "شہباز اور ہماری جوڑی جوڑی بڑی خوبصورت رہے گی، میں اپنی مرضی سے عاشی کا راستہ صاف کر رہی ہوں ـــــ"

عاشی نے کنکھیوں سے ناجیہ کی طرف دیکھا ـــ آج پہلی بار اُسے ناجیہ کی نگاہوں میں اپنائیت کے جذبے مچلتے نظر آ رہے تھے ـــ اُس کا انگ انگ خوشی سے جھوم اٹھا ـــ اُس کا دل چاہا اُٹھ کر ناجیہ کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر چوم لے، لیکن شہباز کے تذکرے نے تو جیسے اُسے چھوئی موئی کے پودے کی طرح اپنے وجود کے اندر سمٹ جانے پر مجبور کر دیا تھا ـــ وہ بڑی تیزی سے اٹھی نظریں جھکائے لمبے لمبے قدم اٹھاتی ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی۔

ناجیہ اپنی جگہ بڑے پُروقار انداز میں بیٹھی مسکراتی رہی ـــ اُس کے ہونٹوں پر فاتحانہ تبسم رقص کر رہا تھا شاید اس لئے کہ اُس نے عاشی کا احسان نہیں لیا تھا اور بڑی فراخدلی سے شہباز کے حق سے دستبردار ہو کر اپنا کو بھی ـــ کوئی ٹھیس نہیں لگنے دی تھی۔

"ناجیہ ـــ" عاشی کے جانے کے بعد محمود حسین نے موقع غنیمت سمجھتے ہوئے کہا "جانتی ہو تمہاری آنٹی آج کس لئے آئی ہیں؟"

"آپ سے شکوہ کرنے ـــ" ناجیہ سادگی سے بولی "اگر میں درمیان نہ آ جاتی تو آنٹی آپ دونوں سے روٹھ کر چلی جاتیں ـــ کیوں آنٹی میں غلط تو نہیں کہہ رہی ـــ"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹی ـــ" شائستہ بیگم نے ناجیہ کے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "اگر تم نے مجھے اصلیت سے آگاہ نہ کیا ہوتا تو میں محمود اور شمسہ دونوں سے خفا ہو کر واپس چلی ـــ"

"ناجیہ بیٹی ـــ" محمود حسین کچھ سوچ کر دبی زبان میں بولے "آج ـــ میں بھی تم سے براہ راست کچھ پوچھنا چاہتا ہوں ـــ"

"یس ڈیڈ ـــ پوچھئے کیا بات ہے؟"

"فراز کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے ـــ میرا مقصد یہ ہے کہ وہ تمہیں کیسا لگتا ہے ـــ؟"

"سچ سچ بتا دوں ـــ" ناجیہ نے شوخی سے کہا۔

"ہاں ـــ"

"آپ اسے بھونڈا کہنا چھوڑ دیں۔" ناجیہ نے مسکراتے ہوئے بیباکی سے جواب دیا پھر جب عورت فطری حیا اُس کے وجود پر طاری ہوئی تو وہ لجاتے ہوئے تیزی سے اٹھی ـــ دوڑتی ہوئی باہر چلی گئی۔

شمسہ بیگم کی پلکوں پر بیٹی کا جواب سُن کر مسرتوں کے ہزاروں دیپ جل اٹھے۔

شائستہ بیگم کی نگاہیں معبودِ حقیقی کا شکر یہ ادا کرنے کی خاطر بے اختیار چھت کی جانب اٹھ گئیں۔

اور ـــــ

محمود حسین نے یوں سکون کا ایک لمبا سانس لیا جیسے اُن کے سر سے کوئی بوجھ اُتر گیا ہو ـــ!!